جلد نمبر ۱۰۱ ماہ جنوری سنہ ۱۹۵[illegible]ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی مرحوم

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت [illegible] سالانہ

مطبع معارف اعظم گڑھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیسا تھ اسکی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۹۵ صفحے قیمت: ...

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۴۶۳ صفحے

قیمت:- ...

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحٰق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ،

قیمت ...

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مکتفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ...

قیمت:- ...

جلد ۶۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افسوس کہ آج قلم کو اس ہستی کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے جو ساری عمر قوم و ملت کی غم گسار رہی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کا سانحہ نہ صرف پاکستان بلکہ علمی و مذہبی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے جلیل القدر عالم، متبحر فاضل، نامور خطیب اور صاحب بصیرت مدبر تھے، دینی علوم مین ان کا پایہ بہت بلند تھا، انکی ساری عمر ان کی خدمت مین گذری، برسون دارالعلوم دیوبند مین ان کا علمی فیض جاری رہا۔ پھر ڈابھیل (سورت) کی مشہور دینی درسگاہ مین چلے گئے، اور وہان کئی سال تک ان کے درس و افاضہ کا سلسلہ قائم رہا۔ قرآن مجید پر انکا اردو حاشیہ موضح الفرقان اور صحیح مسلم کی ضخیم عربی شرح فتح الملہم ان کا بڑا علمی و دینی کارنامہ ہے، اسکے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی تصانیف بھی اُن کی یادگار ہین،

ملکی اور قومی کامون مین بھی ان کا حصہ رہا ہے، وہ عرصہ تک جمعیۃ العلماء کے شریک کار رہے، پھر پاکستان کی تحریک کے بعد مسلم لیگ مین شامل ہو گئے، اور جمعیۃ علماء اسلام کے صدر منتخب ہوئے، اور پاکستان کی تبلیغ و اشاعت مین بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، اس کے چند ممتاز بانیون مین سے ایک وہ بھی تھے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، اور اُسکی دستور ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے، پاکستان مین اُن کی حیثیت مذہبی مشیر کی تھی، اور حکومت کے ارکان پر اُن کے علم و عمل تقوی و دیانت فہم و فراست اخلاق و سیرت اور استغنا و بے نیازی کا بڑا اثر تھا، اور اُن کی ذات سے پاکستان کی مذہبی اصلاح کی بڑی امیدین وابستہ تھین، لیکن افسوس موت نے اس کا موقع نہ دیا، اور گذشتہ ۱۳ ردسمبر کو بغداد الجدید ریاست بہاولپور مین علم و عمل کی یہ شمع دفعۃً خاموش ہو گئی اس حادثہ سے علمی و مذہبی دنیا ایک جلیل القدر عالم سے محروم ہو گئی، اللہ تعالی اس خادم دین و ملت کو اپنی رحمتون اور برکتون سے نوازے،

دوسرا علمی حادثہ دنیائے اسلام کے مشہور عالم موسیٰ جار اللہ کی وفات ہے، ان کا وطن روسی ترکستان تھا، وہ بڑے وسیع النظر عالم اور زندہ کتب خانہ تھے، اور ہر موضوع اور ہر فن پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے، روسی ترکی اور عربی فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بول لیتے تھے، ایک زمانہ تک لینن کے رفیق اور شریک کار رہے، پھر کسی اختلاف کی بنا پر جلاوطن کر دیئے گئے، جلاوطنی کے زمانہ میں انھوں نے تمام اسلامی ملکوں کی سیاحت کی، اس سلسلہ میں ہندوستان بھی آئے، اور کئی سال تک دہلی اور بھوپال میں مقیم رہے، چودہ پندرہ سال ہوئے دار المصنفین بھی آئے تھے اور ہفتہ عشرہ قیام رہا تھا، اُن کے علمی شغف و انہماک کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، اُن کا سارا وقت اور رات کا بڑا حصہ مطالعہ میں گذرتا تھا، انھوں نے اس مختصر قیام میں دار المصنفین کے پورے کتب خانہ کا جائزہ لے لیا تھا، تالیف و تصنیف کا شغل بھی تھا، عربی میں اُن کی بہت سی تصانیف مسودہ کی صورت میں تھیں لیکن چند مختصر رسالوں کے علاوہ کسی بڑی تصنیف کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی، جب سے وہ وطن سے نکلے پھر دوبارہ جانا نصیب نہیں ہوا، اور عالم غربت ہی میں گذشتہ مہینہ مصر میں سفر آخرت کیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

کانگریسی حلقہ میں بابو راجندر پرشاد گاندھی جی کے خاص چیلے اور بڑے مقلد سمجھے جاتے ہیں لیکن زبان کے بارہ میں اُن کا رویہ سب سے زیادہ حیرت انگیز رہا ہے، ایک زمانہ میں وہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق ہندوستانی کے بڑے حامی تھے، اور دس بارہ سال پہلے پٹنہ میں زبان کے مسئلہ میں جو سمجھوتہ ہوا تھا، وہ "راجندر عبدالحق پیکٹ" کے نام سے موسوم تھا، یہ تو خیر پرانا قصہ ہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد جب ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت کا طوفان اٹھا اس وقت بھی وہ ہندوستانی کی حمایت پر قائم رہے لیکن جب دستور ساز اسمبلی میں زبان کا مسئلہ پیش ہوا، تو وہ دفعتہً ہندی کے حامی بن گئے، اور جب ہندی حکومت کی زبان قرار پا گئی تو سب سے زیادہ مسرت کا اظہار انہی نے کیا، اور اس کو بڑا قومی کارنامہ اور ملک کی بہت بڑی خدمت قرار دیا، تاہم اس وقت انھوں نے ہندی کی جو تعریف کی تھی، وہ ہندوستانی سے قریب تھی، یعنی ایسی سہل ہندی جس کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے، اور جس کا دامن ہندوستان کی تمام زبانوں کے آسان اور عام فہم الفاظ کے لئے وسیع ہو، لیکن انھوں نے خود اس زبان کا جو نمونہ پیش کیا، اور گذشتہ مہینہ لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ اس کو بہت کم لوگ سمجھ سکے، یہ ساری سرگذشت اخباروں میں موجود ہے، جب گاندھی جی کے خاص مقلدوں کا یہ حال ہے، تو عام لوگوں کا کیا ذکر ہے :- قیاس کن زگلستان من بہار مرا،

لیکن اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرنا ناانصافی ہوگی کہ گاندھی جی کے سچے مقلدوں میں آج بھی ایسے حق پرست
اور حق گو موجود ہیں جن کو اس حقیقت کے اعتراف میں باک نہیں کہ اردو ہی ملک کی عام اور مشترک زبان ہے، چنانچہ
پنڈت سندرلال نے حال ہی میں اردو مجلس حیدرآباد کے ایک جلسہ میں نہایت واضح اور صریح الفاظ میں اس کا
اظہار کیا کہ میں نے ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں گشت کیا ہے، ہر جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابی اردو عام
زبان ہے لیکن کتابی ہندی عام زبان نہیں ہے، اور نہ یہ عام زبان بن سکتی ہے، اردو میری ماں اور میری دادی کی بھی
مادری زبان تھی، ..... ہندی کے نام سے جو زبان گڑھی جا رہی ہے وہ چلنے والی نہیں ہے"، اسی کے ساتھ انھوں نے
مسلمانوں کو بھی زبان کے بارہ میں مفید مشورے دیئے ہیں، جو اُن کے لئے قابلِ غور ہیں، لیکن ہندی کے
نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے،

اخبارات کے نامہ نگاروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو خبروں کے گڑھنے میں جو کمال حاصل ہے اس کا تازہ
نمونہ یہ ہے کہ ان کے حوالہ سے کئی ذمہ دار اخباروں میں جلی سرخیوں سے یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرۃ الاستاذ مولینا
سید سلیمان ندوی مدظلہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے شعبۂ مذہبی کے مشیر کی حیثیت سے بھوپال سے قطع تعلق
کرکے پاکستان چلے گئے، اور اس وقت کراچی میں مقیم ہیں، اور یہ خبر اتنی جزوی تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی کہ ناواقف
آدمیوں کو اس کے یقین کرنے میں شک و شبہہ نہ ہو، حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں تھی، واقعہ صرف اتنا تھا
کہ موصوف حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور واپسی میں دیر اس لئے ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ میں زیادہ قیام رہا تھا،
اور اب وہ ۲۹ دسمبر کے جہاز سے مع الخیر ہندوستان واپس آگئے، اور اس وقت بھوپال میں مقیم ہیں،

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مالی لین دین کا سلسلہ بند ہونے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے
درمیان وی پی بھی نہیں جاسکتے، اس لئے پاکستان کے معارف کے خریداروں اور قدردانوں کو بڑی
تشویش ہے، اور ان کے بکثرت خطوط آرہے ہیں، ان کو اطمینان رکھنا چاہئے، انشاء اللہ معارف
اُن کے نام جاری رہے گا، جب سکہ کے تبادلہ کا مسئلہ حل ہوجائے گا تو وہ چندہ بھیج دیں گے،

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڈھ) کے پرانے اخبار ہماری زبان کا پہلا نمبر نکل گیا ہے، اسمیں ہندوستان میں
اردو زبان کی نوعیت و حیثیت اور اس کی خدمت کے بارہ میں انجمن کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اردو زبان کے متعلق
متفرق خبریں ہیں، دو چار نمبر دیکھنے کے بعد اس کا صحیح اندازہ ہو سکے گا، پرچہ کی ضخامت ۸ صفحے ہے اور خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے،
سالانہ قیمت دو روپیہ ہے، اردو زبان کے حامیوں اور ہمدردوں کو اس کی اشاعت میں پوری کوشش کرنا چاہئے،

مقالات

ہندوستان مین توپ کی تاریخ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۲)

.... ویر کے بیانات سے یہ بات توضاحت طور پر ظاہر ہوگئی کہ مغل سلطنت کے بانی بابر کے ہندوستان مین آنے اور پانی پت کی جنگ سے قبل ہندوستان کے مختلف صوبون مین توپ کا رواج ہو چکا تھا، اس لئے بابر کو ہندوستان مین پہلا توپ استعمال کرنے والا قرار دینا صحیح نہین ہے،

بابری توپین بابر کے پاس پانی پت کے میدان مین توپین ضرور تھین، مگر سب معمولی اور اس کا توپخانہ گجرات اور دکن کے توپ خانون جیسا ترقی یافتہ نہ تھا،

بابر ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء کے حالات مین مختلف مقامات پر توپ کا ذکر کرتا ہے، ہندوستان پر حملہ کے وقت جب اُس نے لشکر شماری کی، اور اُس کے گمان سے فوج کی تعداد کم نکلی، تو اس کو محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے وہی رومی طریقہ اختیار کیا، ایک جگہ لکھتا ہے :-

" مین اپنے لشکر کو جس قدر سمجھتا تھا، تخمینہ کے وقت اس قدر نہ نکلا، اُسی منزل مین توقف کیا تاکہ جسقدر ہو سکے ارابہ تیار کرلین، سات سو گاڑیان ارابہ تیار ہوئین، استاد قلی کو حکم دیا

کہ رومی طریقہ سے گاڑیون کو زنجیر کے بدلے رسیون سے باندھ دین، ہر جگہ دو گاڑیون کے بیچ مین چھ سات جالی کے خانہ ہون، گونہ انداز ان چھکڑون اور گاڑیون کے آڑ مین کھڑے ہو کر گولہ ماریں[۵۱]؛

پانی پت کی جنگ مین اُس نے توپ کا استعمال جس طرح کیا، وہ اس کی دلیل ہے کہ بابر ایک جنگ آزمودہ تجربہ کار، اور ماہر فن جنرل تھا، اُس نے فوج سے غنیم کو مشغول رکھ کر توپ سے دشمن کو تباہ کر ڈالا، چنانچہ لکھتا ہے:

"محمدی کوکلتاش، برلاس، اور یونس کو حکم دیا کہ قول (قلب) سے بڑھ کر لڑائی شروع کر دین، استاد علی قلی (بندوقچی) بھی قول کے آگے آکر فیر کرنے لگا، مصطفیٰ توپچی دست چپ سے خوب گولے مارنے لگا، تو تنغہ والون نے چارون طرف سے غنیم کو گھیر لیا .... وہ بے شمار لشکر دوپہر تک کے عرصہ مین خاک مین مل گیا[۵۲]"

توپ ڈھالنے کا کارخانہ ۹۳۳ھ کے حالات مین توپ ڈھالنے کا حال بہ تفصیل اس طرح لکھتا ہے،

"بیانہ کے قلعہ اور دوسرے قلعون کے خیال سے جو ہنوز فتح نہین ہوئے تھے، استاد علی قلی کو ایک بڑی توپ ڈھالنے کا حکم دیا، علی قلی نے بھٹی وغیرہ تیار کر کے مجھے اطلاع دی، ۲۵ محرم یوم دوشنبہ کو توپ ڈھلنے کا تماشا دیکھنے گیا"

"جہان توپ ڈھلنے کا سانچا تھا وہان آٹھ بھٹیان لگائی تھین، ہر بھٹی کے نیچے سے ایک نالی سانچے تک بنا دی تھی، بھٹیون کی نالیون کا منہ کھلتے ہی نالیون سے مصالحہ پانی کی طرح بہ کر آیا، لیکن سانچا پورا نہ بھرا تھا، کہ مصالحہ کا آنا رک گیا، یا تو بھٹیون مین کوئی خرابی تھی، یا مصالحہ مین، استاد قلی اتنا شرمندہ ہوا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ پگھلے ہوئے تانبے

---

[۵۱] تزک بابری ۹۳۲ھ کے حالات۔ [۵۲] ایضاً

میں کود پڑے، لیکن میں نے اس کی دلجوئی کی، اور خلعت دے کر اس کی شرمساری کو دور کیا،
قالب خشک ہونے اور مٹی وغیرہ ہٹانے کے بعد خوشی خوشی کھلا بھیجا کہ توپ کے گولہ کا
گھر بہت خاصہ ہو، اس کا درست کر لینا سہل ہے، اس کو نکال کر درست کرنے کے لئے اوروں
کے حوالہ کیا، اور آپ باقی کے بنانے میں مشغول ہوا[۱]،

اسی توپ کی نسبت آگے چل کر تحریر کرتا ہے،

"استاد علی قلی نے وہ توپ ڈھال کر تیار کر لی تھی جس کے گولہ کا گھر پہلے ہی ڈھل
چکا تھا، اس کی نال بعد میں درست ہوئی، ہفتہ کے دن بیسویں تاریخ کو اس کے چھوٹنے کا
تماشا دیکھنے گیا، عصر کے وقت اس کو چھوڑا، چھ سو قدم تک اس کا گولہ پہنچا، استاد کو میں نے
خنجر اور خلعت انعام میں دیا[۲]،

۹۳۴ھ کے ابتدائی حالات تحریر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"اتوار کے دن استاد علی قلی نے بڑی توپ چھوڑی، اگرچہ گولہ دور تک گیا، لیکن توپ کے
ٹکڑے اڑ گئے، اس کا ہر ٹکڑا ادھر ادھر لوگوں میں جا کر گرا، آٹھ آدمی مرے،

جنگ رانا سانگا اور چندیری کے محاصرہ میں بھی توپ اور بندوق کے استعمال سے بابر ہر جگہ کامیاب
رہا، قنوج کے پاس گنگا کے پار اترتے وقت بابر نے ایک پل بنانے کا حکم دیا، دشمن اس میں ہارج ہوا،
استاد علی قلی نے توپ سے اس طرح مدافعت کی کہ دشمن پاس نہ آسکا، اور پل تیار ہو گیا، بابر لکھتا ہے :-

"ملک قاسم اس لڑائی میں کام آیا، پل بندھنے تک استاد علی قلی نے خوب گولہ باری کی،
پہلے دن آٹھ گولے مارے، دوسرے دن اٹھارہ گولے برسائے، تین چار دن تک اسی طرح
گولہ باری کی، یہ گولے "غازی" نام توپ سے مارتے تھے، اسی توپ سے راجہ سانگا کی لڑائی

---

[۱] تزک بابری ۹۳۳ھ کے حالات [۲] ایضاً ابتدا جنگ رانا سانگا،

میں کام لیا تھا، اور لڑائی فتح ہونے کے بعد اس کا نام غازی رکھا، (پہلے اس کا نام بابری تھا) ایک توپ اس سے بڑی تھی، جو ایک ہی دفعہ چھٹ کر پھٹ گئی، بندوقچیوں نے بھی گولیوں کی خوب بوچھار کی،[1]

معلوم ہوتا ہے غنیم کے پاس توپیں نہ تھیں، کیونکہ فتح پانی پت کے بعد مالِ غنیمت کی فہرست میں بابر نے توپوں کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، اس کے علاوہ قنوج کے پاس پل باندھنے تک غنیم توپ کا جواب توپ دینے کے بجائے گولہ اندازی پر ہنستا تھا، جیسا کہ بابر نے تزک میں اس کا تذکرہ کیا ہے، رانا سانگا کے پاس مالوہ سے حاصل کردہ توپیں ضرور ہوں گی مگر وہ صرف قلعہ شکن ہونگی یا کوئی اچھا ماہر گولہ انداز اس کے پاس نہ ہوگا، جو بابر کے گولہ انداز کا مقابلہ کرسکتا ہے ۹۳۵ھ کے حالات میں ایک جگہ تحریر کرتا ہے :-

"یہ بات قرار پائی کہ دریائے گنگ اور سرور کے درمیان کسی بلند جگہ استاد علی قلی رومی اور ہندوستانی توپیں کھڑی کرے، بہت سے بندوقچی اس کے ہمراہ ہوں، وہاں سے گولوں اور گولیوں کا مینہ برسائے، جہاں دونوں دریا ملتے ہیں، اس سے نیچے کی جانب اس مقام کے سامنے جس مقام پر بہار کی طرف گنگا میں بہت سی کشتیاں کھڑی ہیں، مصطفےٰ اپنے توپخانہ کو درست کرکے لڑائی میں مشغول ہو، اس کے ساتھ بھی بہت سے ..... بندوقچی ہوں، محمد زمان مرزا وغیرہ مصطفےٰ کے پیچھے کمک پر رہیں، استاد علی قلی اور مصطفےٰ کی توپوں کے لئے مورچے قائم کئے جائیں"[2]

پھر جب اس مشورہ پر عمل ہوا اور بابر گنگا پار اتر کر توپ خانہ کے پاس آیا، تو رومی توپوں کی نسبت تحریر کرتا ہے :-

---

[1] توزک بابری ۹۳۲ھ کے حالات بیان پورب کے باغی [2] تزک بابری بنگالیوں سے مقابلہ،

"میں نے جا کر استاد علی قلی کی گولہ باری کا تماشا دیکھا، آج ہی اُس نے رومی توپوں کے گولہ سے دو کشتیوں کو توڑ کر غرق کر دیا، میدان جنگ میں بڑی توپ لیجانے، اور اس کے واسطے جگہ درست کرنے کو ملّا غلام کو مقرر کیا،

ان بیانات سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صرف بابر کے پاس توپ تھی، اور غنیم خالی ہاتھ تھا، بنگالی ہر طرح سے بارود کا استعمال کر رہے تھے، اور اپنے دشمن پر برابر آگ برسا رہے تھے جس سے اس کو نقصان بھی پہونچا تھا، بابر خود اس کا اقرار کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"ظہر کے وقت اُستاد کے پاس سے آدمی آیا، اور کہا کہ گولہ تیار ہو گیا ہے، کیا حکم ہوتا ہے؟ میں نے حکم دیا کہ اس کو رہنے دو، اور میرے آنے تک دوسرا تیار کر رکھو، عصر کے وقت ایک بنگالی ڈونگہ میں سوار ہو کر مورچہ پر پہنچا، استاد نے ایک بار بڑا گولہ مارا، پھر کئی دفعہ رومی گولے مارے، بنگالی آگ برسانے میں مشہور تھے، اس دفعہ میں نے اُن کو خوب دیکھا، ایک جگہ سے آتش بازی نہیں کرتے، بلکہ مختلف مقامات سے کرتے ہیں......... ہم نے دیکھا کہ بنگالی کشتیاں جمع کئے ہوئے ایک تنگ مقام پر آمادۂ جنگ ہیں، ہماری ایک پچھلی کشتی کے پاؤں میں گولہ لگا، اس کا پاؤں ٹوٹ گیا، اور ہم آگے نہ جا سکے[1]"

آخر زمانہ میں بابر نے توپ کا نام "ضرب زن" رکھا تھا، مگر اس لفظ کو قبول عام حاصل ہوا، شیرشاہ کا عہد نہایت مختصر رہا، اس لئے وہ اس محکمہ میں کوئی خاص ایجاد و اضافہ نہ کر سکا، اس کے پاس جو توپ خانہ تھا اس میں کچھ توپیں تو بابر کی تھیں، اور کچھ وہ گجراتی توپیں تھیں، جو ہمایوں اور مالوہ سے اٹھا لایا تھا، اگر شیرشاہ کو موت نے مہلت دی ہوتی، تو وہ دوسرے محکموں کی طرح اس کو بھی بہت ترقی دیتا[2]، شیرشاہ کے بعد پھر کسی کو خانہ جنگیوں سے فرصت نہ ملی کہ اس کی

---

[1] حالات مذکور ۹۳۵ھ [2] صولت شیرشاہی کے مصنف نے ایک جگہ لکھا ہو کہ قلعہ رائسین میں ایک ہزار توپچی رہتے، اسی طرح غالباً دوسرے قلعوں میں بھی ہوں گے،

توجہ کرکے اس کو ترقی دیتا،

دکنی توپین | نوین صدی کے اختتام پر سلطنت بہمنیہ کے مختلف اضلاع پر بڑے بڑے امرا قابض ہو گئے تھے، ان میں تین سب سے زیادہ طاقتور تھے، یوسف عادل شاہ، نظام شاہ، قطب شاہ اور چوتھا منبر برید شاہ کا تھا،

عادل شاہیون کا پایۂ تخت بیجاپور تھا، اُن کی سلطنت دو سو برس ۸۹۶ھ سے ۱۰۹۷ھ تک رہی، انھون نے دوسرے شعبون کی طرح فوجی نظام کو بھی ترقی دی، اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایک طرف تو بیجانگر کی ہندو ریاست سے اُن کی جنگ رہتی، اور دوسری طرف اسلامی ریاستین اُن کو چین نہ لینے دیتین، اس کے علاوہ ترک، عرب اور ایران سے اُن کے تعلقات براہ راست آخر تک قائم رہے، اس لئے اس کا توپ خانہ بڑا مکمل تھا، توپ سازی کا ایک کارخانہ بھی تھا، جہان توپین ڈھلتی تھین، اسی طرح نظام شاہ کے پاس بھی توپ سازی کا کارخانہ تھا، اس مین ایسی ایسی توپین بنائی گئین، جو آج تک یادگار ہین، ان توپون کا کچھ مختصر حال تحریر کیا جاتا ہے[۱]،

قلعۂ اودگیر (مملکت نظام) کے ایک برج پر "شیر بچہ" نامی ایک توپ نصب ہے جس کا طول سات فٹ اور دہانے کا قطر ۹ انچ ہے، اسی کے دوسرے برج پر ایک خوبصورت پیچ رسی توپ چڑھی ہے، یہ ۱۱ فٹ لمبی اور نو انچ دہانہ کا قطر ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شکل گمر کی سی ہے،

نظام شاہی توپین | قلعہ اوسا (نظام) میں گیارہ توپین تھین، ان مین سے بعض کے نام یہ ہین، نظام شاہی، بہتری، کڑاک بجلی، لہری، شیر دہان، لم چھڑی، کالا پہاڑ وغیرہ،

نظام شاہی توپ ۸ فیٹ طویل ہے اور دس انچ دہانہ کا قطر ہے، پتھر کے گولہ کے علاوہ ایک گولہ آہنی مجوف خاص اس کے لئے تیار کیا گیا تھا، اس مین ایک سوراخ ہے، جنگ کے وقت اس مین نشتر، چاقو، قینچی، پیسہ وغیرہ بھر کر فیر کرتے تھے، اس کا وزن ۵۵ سیر ہے، توپ پر یہ عبارت کندہ ہے، "ابو الغازی

[۱] دکن کی توپون کا حال مین نے تاریخ مملکت بیجاپور مطبوعہ آگرہ سے لیا ہے اور کچھ میری خود چشم دید ہین،

شاہ نظام، عمل استاد محمدان حسین[۵] رومیؒ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے توپ ساز عموماً رومی، (ترکی) ہوتے تھے، دوسرے کتبون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،

بہمنی توپین | ایک اور توپ قلعہ اوسا کے "چاندی برج" پہ ہے، جو دس فیٹ طویل اور چھ انچ دہانہ کی ہے، اسی کے ساتھ دوسری ½۲ فیٹ طویل اور نو انچ دہانہ والی ہے، اس پر عربی مین کچھ عبارت کندہ ہے، جو افسوس ہے کہ پڑھی نہین جا سکی، اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ توپ غالباً بہمنی عہد کی ہے، کیونکہ اس عہد مین عموماً ہر قسم کے کتبے عربی مین ہوتے تھے،

بریدشاہی توپین | قلعہ بیدر کے فتح برج پر ایک توپ رکھی ہے جس کا نام "فتح لشکر" ہے، پنچ رسی دھات کی بنی ہوئی ہے، اس دھات کو بنگڑی کہتے تھے، یہ توپ ڈھلی ہوئی ہے، اس کا طول ½۱۱ فیٹ، قطر ۲ فیٹ تین انچ اور دہانہ کا قطر ایک فیٹ دو انچ ہے، اس پر بسم اللہ کے بعد یہ عبارت کندہ ہے:-

"اس توپ مین ایک من دس سیر بارود اور ½۵ من کا گولہ دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص چاہے تو دس سیر بارود اور زیادہ کر سکتا ہے، پھر سورۂ فتح کی ابتدائی آیتون کے بعد لکھا ہے:-

"توپ ظفر پیکر مسمی بہ فتح لشکر، در زمان دولت اعلیٰ حضرت عالیجاہ میرزا شاہ محمود المخاطب بہ ہمایون اکرم بریدشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ، فی التاریخ ۹۸۸ھ پھر فارسی کے یہ دو شعر ہین،

فتح لشکر کہ ز ہیبش دل اعداء حزین | راست چون برق فرود آمدہ بر روئے زمین
تند چون در دہن اژدر کہ پئے جنگ بود | اژدہاے کہ سر خصم فرو برد بہ کین

آخر مین قرآن کے تمام حروف مقطعات کے بعد نادعلی کندہ ہے،

محمودی توپ | اس شہر کے منڈلہ برج پر "محمودی توپ" رکھی ہے، جو ۹۰۵ھ کی بنی ہوئی ہے، اس پر

---

۵ غالباً محمد حسین رومی ہے،

مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہین،

حبذا توپے پُر آشوبے زآوازے بلند گر کند گوشے فلک را بر کند کوہ از دہن
شاہ کسریٰ معدلت قاسم برید بادشاہ ہند و سند و مالک ملک دکن
اختتام توپ در شہر محرم بودہ است توپ محمودی کہ نامش شد زشاہ صف شکن
فضلی بی جست تاریخش سروش غیب گفت توپ بے مثل بود تعریف او ... ہر قرن

ہفت گزی ایک اور توپ قلعہ بیدر کے ایک برج پر رکھی ہوئی ہے، اس کا نام ہفت گزی ہے، یہ علی برید شاہ کے عہد ۹۵۵ھ مین تیار ہوئی، یہ ۳۱ فیٹ طویل اور ۲۳ فیٹ مدور ہے، اور پیچ رسی نیلگون دھاتی ہے، اس پر ایسی جلا ہے کہ انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، یہ توپ دولت آباد اور بیجاپور کی توپون کے ہم پلہ ہے، اس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے:

تیکے از عزائب علامات کارخانہ الٰہی توپ شاہی وضع خاصہ حضرت نواب ہمایون اکرم علی برید شاہی تمت فی التاریخ ۹۵۵ھ ہجرۃ النبویہ،

غلولہ دہ من نیم دار و دو من ونیم، اگر خواہد ازین زیادہ کند صافی کند، دہ آثار زیادہ اندازد،

قلعہ پرینڈہ کے ایک برج پر ایک توپ رکھی ہے، اس کو "لانڈے قصاب" کہتے ہین، یہ توپ ڈھلی ہوئی نہین ہے، بلکہ لوہے کے پتر جوڑ کر بنائی گئی ہے، یہ ۱۸ فیٹ دو انچ طویل ہے، اس کے کان کے پاس کا دور سات فیٹ دو انچ، اور دہانے کا چھ فیٹ گیارہ انچ ہے،

قلعہ رائچور (مملکت نظام) مین ایک توپ رکھی ہے جس کا دنبالہ ٹوٹ گیا ہے، یہ ۲۰ فیٹ ۱۰ انچ طویل ہے، اس کی ساخت اس طرح کی ہے کہ فولادی پٹیان جما کر اوپر سے فولادی پیچ کس دیئے گئے ہین، اس توپ کے نیچے اس کو گھمانے کی جو کل لگی ہے، جسے انگریزی مین (ٹرنین) کہتے ہین، وہ امتداد زمانہ

کے باوجود اب بھی اچھی حالت میں ہے، اتنی بڑی بھاری توپ کو اس کی مدد سے جدھر چاہیں آسانی سے پھرا سکتے ہیں،

ضلع رائچور کے قلعہ انتور میں بہت سی توپیں تھیں، جو انگریزوں نے ضائع کردیں، اس وقت صرف ایک توپ ہے جو نو ہاتھ لمبی اور اس کے دہانہ کا دور ایک ہاتھ ہے، اس کو برج پر سے کسی نے لڑھکا دیا ہے، اور اب وہ خندق میں پڑی ہے یہ بہت بھاری ہے اس کا جگہ سے ہلنا بھی دشوار ہے،

کالا پہاڑ | دولت آباد کے قلعہ میں بارہ دری کے اوپر بالا حصار میں ایک بھاری توپ رکھی ہے، اس کا نام "کالا پہاڑ" ہے، یہ توپ بارہ فیٹ ساڑھے آٹھ انچ لمبی ہے، کان کے پاس کا دور چار فیٹ دس انچ اور دہانہ کا دور تین فیٹ ساڑھے نو انچ ہے، افسوس ہے کہ ان توپوں پر کوئی تحریر نہیں ہے، مگر ان کی ساخت اور طرز سے نظام شاہی توپوں کا قیاس ہوتا ہے،

چار گزی | قلعہ گلبرگہ میں ایک برج پر تین توپیں ہیں، ایک توپ چار گز کی ہے، اس پر چہار منی عادلشاہی کندہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا گولہ چار من عادلشاہی کا ہوتا تھا، بقیہ دو توپیں ۱۴-۱۴ فیٹ لمبی ہیں، ان کا قطر سوا سو فیٹ کا ہے،

یہ سب توپیں غالباً عادل شاہی عہد حکومت میں بیجاپور میں تیار کی گئیں،

عادلشاہی ۱۲ گزی توپ | گلبرگہ کے نورس برج پر ایک توپ رکھی ہے جس کو بارہ گزی کہتے ہیں، اس کا طول اٹھارہ ہاتھ ہے، اس کے پاس ہی سنگ سرخ پر جو کتبہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم عادلشاہ کے عہد میں ملک صندل نے ۱۰۳۴ھ میں تیار کی تھی،

سکندر برج پر جو توپ رکھی ہوئی ہے، وہ سکندر عادل شاہ کے عہد ۱۰۷۳ھ کی ہے، غرض ان تمام برجوں پر کل ۲۶ توپیں رکھی ہوئی ہیں،

قلعہ مدگل میں بہت سی توپیں تھیں جن میں سے اکثر بڑی توپیں انگریز اٹھالے گئے، کچھ حیدرآباد

چلی گئیں، فی الحال پانچ سات توپیں پڑی ہیں جس کا پیمانہ حسب ذیل ہے،

نمبر	طول	دہانہ
۱	۹ فیٹ ½۹ انچ طول	۲ فیٹ ½۵ انچ دہانہ
۲	۳ " ۹ " "	۴ " ½۶ " "
۳	۱۲ " ۹ " "	۵ " ½۶ " "
۴	۱۲ " ۶ " "	۴ " ۱۰ " "
۵	۸ " " "	۳ "
۶	۴ " " "	۴ " ½۶ " "
۷	۴ " " "	

ان میں سے اوّل الذکر چار توپیں پتر جوڑ کر تیار کی گئی ہیں، باقی ڈھلی ہوئی ہیں،

قلعہ نل درگ (واقع مملکت نظام) کے ایک برج پر دو توپیں تانبے کی بنی ہوئی ہیں، اور اسی کے ایک چھوٹے برج پر ایک سیاہ دھات کی توپ ہے، سنگرام برج پر ایک پچ رسی توپ ہاتھی کی شکل کی ہے اور دوسری مگر کی شکل کی، قلعہ کے تمام برجوں پر بارہ بڑی بڑی اور ۳۲ چھوٹی توپیں ہیں،

نظام شاہی توپیں ملک میدان بیجاپور دکن کے شرزہ برج پر ایک مشہور توپ "ملک میدان" نامی رکھی ہے، "لنڈے قصاب" نامی توپ کے بعد یہ سب سے بڑی توپ ہے، اور اس کی ساخت دوسری توپوں سے بالکل مختلف ہے، یہ توپ پنچ رسی ڈھلی ہوئی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا طول تو کم ہے مگر جوف بہت بڑا ہے جس سے دیکھنے میں چھوٹی معلوم ہوتی ہے اور جس سے ظاہر ہے، کہ اس کا گولہ دور نہیں جا سکتا، اس کا دہانہ اژدہے کے سر جیسا ہے، جو جبڑا پھیلائے ہوئے ہے، اس کے دانتوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے دو ہاتھی دہانے کے دائیں اور بائیں طرف بنے ہوئے ہیں، اس پر مندرجۂ ذیل عبارت کندہ ہے:-

" عمل محمد حسن رومی "

ابو الغازی نظام شاہ خادم اہل بیت رسول اللہ

اللہ ماسواہ فی ۳۰ سنہ جلوس والا مطابق ۱۰۹۷ھ

شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دین پناہ ۔۔۔ آن کہ داد عدل داد و ملک شاہان راگرفت

فتح بیجاپور کرد بہر تاریخ ظفر...... ۔۔۔ رو نمود اقبال گفتہ "ملک میدان راگرفت"

یہ کتبہ اس وقت کا ہے، جب عالمگیر بادشاہ نے بیجاپور فتح کیا تھا، ورنہ درحقیقت یہ توپ احمد نگر بن نظام شاہ کے عہد مین ڈھالی گئی، اور جس جگہ تیار کی گئی تھی، وہ اب بھی موجود ہے، احمد نگر سے اکر قلعہ پرینڈہ پر چڑھائی گئی تھی، جو اس زمانہ مین نظام شاہ کے قبضہ مین تھا، سنہ ۱۶۳۲ء مین جب محمد عادل شاہ نے اس قلعہ کو فتح کر لیا، تو بادشاہ نے اس توپ کو بیجاپور منتقل کرنے کا حکم دیا، وہ وہان سے ایک سو میل دور تھا، اور یہ بھاری اور وزنی توپ اتنے فاصلے سے بیجاپور لائی گئی، اور سنہ ۱۰۴۱ھ مین شرزہ برج پر چڑھائی گئی، اس کا وزن چار سو من طول ۱۴ فیٹ چار انچ، دہانہ دو فیٹ چار انچ، اور کان کے پاس کا قطر دو فیٹ دو انچ ہے، اس کا جوف اس قدر وسیع ہے کہ اس مین آدمی پالتی مار کر نہ صرف بیٹھ سکتا ہے، بلکہ پگڑی بھی باندھ سکتا ہے، یہ توپ محمد بن حسن رومی نے ۹۵۶ھ ۱۵۴۹ء مین تیار کی،

مشین گن | دہانہ اور توپ کے آخری حصہ کی پیمایش سے معلوم ہوتا ہے کہ دہانہ کے پاس گولہ کے علاوہ ہوا کے لئے قریب قریب ایک انچ کی گنجایش چھوڑی گئی، یہ توپ گولہ مارنے کے کام کی نہ تھی بلکہ اس سے وہ کام لیا جاتا تھا، جو آج کل مشین گن سے لیا جاتا ہے یعنی جب غنیم نزدیک آجاتا اور تھوڑے فاصلہ پر ہوتا، تو اس مین پیسے بھر کر جو تھیلیون مین بندھے ہوتے، دشمن پر چھوڑتے تھے جس سے اُن کے بدن چھلنی ہو جاتے،

دکن کی مشہور جنگ تالی کوٹہ ۱۵۶۵ء میں جب دیجا نگر کی فوج نے نظام شاہ پر یورش کی تو اسی مشین گن سے کام لیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی سی دیر میں اس توپخانہ کے سامنے پانچ ہزار سپاہیوں کی لاشیں ڈھیر ہو گئیں، یہ دیکھ کر غنیم پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سپاہی منتشر ہو کر بھاگ نکلے،

اردن صاحب نے اپنی کتاب "نظام فوج" میں لکھا ہے کہ ملک میدان کے گولہ کا وزن ۲۶۴۶ پونڈ یعنی ۳۳ من ۲۲ سیر تھا،[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس توپ سے گولہ اندازی کا بھی کام لیا جاتا تھا، اور اس کی تائید اقبال نامہ سے بھی ہوتی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے،

روزے در ایام محاصرہ احمد نگر توپ	ایک دن احمد نگر کے محاصرہ کے
ملک میدان را کہ از غایت اشتہار محتاج	زمانہ میں مشہور توپ ملک میدان
بہ تعریف و توصیف نیست بجانب اردو	شاہزادہ کے لشکر کی طرف چھوڑی
شاہزادہ بجرا گرفتہ آتش دادند، غلولہ قریب	گئی، اس کا گولہ دولت خانہ کے قریب
بدولت خانہ ایشان رسید، ازآنجا باز گنبد	پہنچا، وہاں سے گھوم کر قاضی بایزید
شدہ، پہلوے خانہ قاضی بایزید کہ از	کے گھر کے پاس جو شاہزادہ دانیال
مصاحبان شاہزادہ دانیال بود افتاد،	کے مصاحبوں میں تھا، گرا، اس کے
اتفاقاً اسپ قاضی سہ چہار گز دور تر	گرنے کے ساتھ ہی اس کی خوفناک
ازآنجا بستہ بود، بمجرد رسیدن غلولہ بزمین	آواز سے قاضی صاحب کے گھوڑے
از صلابت صداے آن، زبان اسپ	کی زبان جڑ سے کٹ کر باہر آپڑی،
قاضی از بیخ کندہ شدہ، بیرون افتاد،	گولہ پتھر کا تھا جس کا وزن دس من
غلولہ اش از سنگ بود، بوزن دہ من	اکبری تھا جس کے اسی من خراسانی

[1] نظام فوج مصنفہ اردن صاحب لندن ص ۱۲۷،

متوارف حال (اکبری) کہ ہشتاد من بوزن خراسان باشد، و توپ مذکور بشان کلان است کہ شخصے مستوی الخلقت درمیان آن درست می تواند نشست[1]،

ہوتے ہین، توپ اس قدر بڑی ہے کہ ایک شخص سیدھے طور پر اس کے درمیان بیٹھ سکتا ہے،

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ عہد اکبری و جہانگیری مین یہ توپ کارآمد رہی ہے، اور اس وقت تک نظام شاہی اس پر قابض تھے، اور اس سے گولہ اندازی کا کام لیتے تھے، اس سے اردن صاحب کے قول کی تصحیح بھی ہوگئی یعنی کہ اس کا گولہ دس من اکبری کا ہوتا تھا، ان دونون بیانون مین تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس توپ سے دونون کام لئے جاتے ہون گے، دور کی مار کے لئے گولہ استعمال مین آتا ہوگا، جیسا کہ اقبال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے، اور نزدیک کے لئے پیسہ ڈال کر دشمنون پر چلاتے ہون گے، جس سے دشمنون کا بدن چھلنی ہو جاتا ہوگا،

دوسری توپون کی طرح یہ بھی چبوترہ پر رکھی ہے، جس گاڑی پر یہ توپ چڑھائی جاتی تھی، اس کا پتہ نہین ہے، ممکن ہے سڑ گل گئی ہو، یا مرہٹہ گردی مین غائب ہوگئی ہو، اور جس طرح بیجاپور کی ایک ایک اینٹ پونہ پہنچائی گئی، یہ بھی پہنچ گئی ہو، اب یہ توپ دو بڑے شہتیرون پر رکھی ہوئی ہے،

اس توپ کے نیچے مین آہنی چول اور دو چار کاریان بھی ہین، جن پر اس گاڑی کے پہیے چکر کھاتے تھے، توپ کے پیچھے نصف دائرے کی ایک مضبوط دیوار بھی بنی ہوئی ہے، جو توپ کے تصادم کو روکتی تھی،

ملک میدان کے جوڑ کی دو توپین اور بھی ہین، جن مین سے ایک قلعہ بیدر کے شرقی برج پر اور دوسری قلعہ دولت آباد کا لاحصار برج پر رکھی ہے، لیکن یہ دونون ملک میدان سے کم تر ہین، یہ خیال بھی صحیح نہین ہے کہ اس نام کی صرف یہی ایک توپ ہے، قلعہ پرینڈہ مین بھی دو جوڑ وان توپین ہین

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۶۳ مطبوعہ کلکتہ،

جن مین سے ایک کا نام "ملک میدان" اور دوسرے کا "اژدھا پیکر" ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ توپ ساز نے جو سانچہ تیار کیا تھا، اس سے صرف دو ہی توپین ڈھالی جا سکین جن مین سے ایک یہی ملک میدان بیجاپوری ہے، اور دوسری "کڑک بجلی" نامی تھی، جنگ تالی کوٹہ مین یہ دونون مصروف پیکار رہین، بدقسمتی سے واپسی کے وقت "کڑک بجلی" دریاے کرشنا مین غرق ہو گئی، یہ توپ ۹۵۵ھ مین محمد بن حسن نے تیار کی تھی،

ملک میدان ہر طرح سے فاتح ثابت ہوئی، میدان جنگ مین کامیاب رہی، دریا مین غرق ہونے سے بچی، اور آخری دفعہ ایک انگریز کے حماقت آمیز حکم سے بھی محفوظ رہی،

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۴ء مین ستارہ کے کمشنر نے حکم دیا کہ تمام قدیم اور نادر چیزین جو بیجاپور کے قلعہ مین پڑی ہین، نیلام کر دیجائین، چنانچہ اُن کے ساتھ یہ توپ بھی نیلام کر دی گئی، ۱۵۰ روپیے قیمت لگی،

نیلام کنندہ تحصیلدار صاحب کو یہ قیمت بہت کم معلوم ہوئی، اور شاید کسی سمجھدار آدمی کے سمجھانے سے انھون نے یہ رپورٹ کی کہ اس سے زیادہ دام نہین لگتے اور لوگ اس قدیم یادگار کو اس طرح ضائع کرنا پسند نہین کرتے، اس رپورٹ پر کمشنر موصوف نے اپنا حکم واپس لے لیا، اس کے بعد یہ تجویز کی گئی کہ اس توپ کو کلکتہ میوزیم مین رکھا جائے، مگر بعض وجوہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا، اور اس طرح اس توپ کو روحانی فتح بھی حاصل ہوئی،

کہتے ہین کہ یہ توپ ملک میدان سُرخ رنگ کی تھی، اور ہندو (عوام) اس کی پوجا کرتے تھے،

پچھلی عادلشاہی بیجاپور کے حیدر برج پر دو توپین رکھی ہین، یہ دونون اتنی لمبی تھین کہ جو کسی دوسرے معمولی برج پر نہین آسکتی تھین، اس لئے خاص طور پر حیدر بُرج تیار کیا گیا، ان دونون کی لمبائی، اور چھوٹے دہانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دور کی مار کے لئے تیار کی گئی تھین، اس وقت بھی ان دونون

کے اچھلنے کی روک کی، دیواریں اور گاڑی کے پھرانے اور پلٹانے کی چالکاریاں موجود ہیں، ان میں سے لم چھڑی ۳۰ فٹ آٹھ انچ لمبی ہے، اور دہانہ کا قطر ایک فٹ ہے،

یہ توپ آہنی کڑیوں سے بنائی گئی ہے، اور اوپر سے لوہے کی موٹی موٹی پٹیوں سے کس دیا گیا ہے، توپ کے طول میں اس طرح کے ڈیڑھ سو حلقے چڑھائے گئے ہیں، اور مضبوطی کے لئے توپ کی گدی پر دوہرے حلقے چڑھائے گئے ہیں، اور دہانہ پر بھی خوبصورتی اور گرز نکالنے کے واسطے چند زائد حلقے لگا دیئے گئے ہیں۔

دل کھندل عادل شاہی | علی مد و برج پر یہ توپ رکھی ہوئی ہے، اس کا نام دل کھندل ہے، یہ توپ کسی اور مقام پر تھی، جمادی الآخر ۱۰۹۲ھ میں سکندر عادل شاہ کے حکم سے ملک صندل نے اس کو بیجاپور بھیجا، جیسا کہ ایک کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے،

دوازدہ امام عادل شاہی | اس توپ کا نام دوازدہ امام ہے، یہ پہلے بیجاپور کے مکی دروازہ پر تھی، اب بیجاپور کے میوزیم کے میدان میں رکھی ہوئی ہے، یہ توپ بہت بڑی اور قابل دید ہے، اس پر علاوہ اسمائے کتابت کے بارہ اماموں کے نام بھی دہانہ پر کندہ ہیں، یہ توپ ابراہیم عادل شاہ کے عہد ۹۸۶ھ کی ہے، اور غالباً بیجاپور ہی میں عادل شاہیوں کے حکم سے بنائی گئی ہے، اسی سے اس پر بارہ اماموں کے نام درج ہیں،

لنڈے قصاب | اس نام کی یہ دوسری توپ ہے جو بیجاپور کے نعمت برج پر ہے، یہ سب سے بڑی توپ ہے، ملک میدان بھی اس کے مقابلہ میں دوسرے نمبر کی توپ ہے،

یہ توپ اکیس فیٹ سات انچ لمبی ہے، اس کے وسط کا دور چار فیٹ چار انچ، اور دہانہ کا دور چار فٹ پانچ انچ ہے، خود دہانہ ایک فٹ ۱/۲ ۶ انچ ہے، اس کا وزن ۴۷ ٹن یعنی ۱۲۶۹ من ہے، اسکی ساخت بھی لم چھڑی توپ کی جیسی ہے، اس توپ کے پاس ہی ایک بہت بڑی دوسری ناتمام توپ کا سانچا پڑا ہوا ہے،

مغلیہ توپیں | جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ بابر بادشاہ نے ایک کارخانہ توپ سازی کا مصطفٰے خان رومی

کے ماتحت قائم کیا تھا، ابتدا میں اس کارخانہ کی بنی ہوئی توپیں بہت زیادہ کارآمد نہ تھیں، ان کا گولہ صرف چھ سو قدم تک جاتا تھا لیکن آخری دنوں میں توپ سازی نے کافی ترقی کر لی تھی، اور ان کا گولہ ۱۶۰۰ سو قدم تک جانے لگا تھا، بابر کا دماغ ایسے کاموں کے لئے بہت موزوں تھا، اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہ جاتا، تو اس کا توپخانہ ہندوستان میں بے نظیر ہوتا، لیکن اس کی موت نے اس کا موقع نہ دیا،

ہمایوں کو اول تو کبھی اطمینان قلب سے سلطنت کرنا نصیب نہیں ہوا، دوسرے اس کے دماغ میں ایجاد کی قابلیت نہیں تھی، لودی اور سوری امرا پر جو فتوحات اس نے حاصل کیں وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی ہیں، اس کا مقابلہ جب دو منظم سلطنتوں سے ہوا تو کسی میں اس کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

پہلا مقابلہ سلطان بہادر گجراتی سے ہوا تھا، جس نے توپوں کا قلعہ بنا کر فوج کو محفوظ کرنا چاہا تھا، ہمایوں کے پاس کوئی ایسا توپخانہ نہ تھا، جو اس کے توپ خانہ کا مقابلہ کر سکتا، اگر رومی خان میر آتش نے سلطان بہادر شاہ سے غداری کی ہوتی تو شاید ہمایوں کو دہلی واپس جانا بھی نصیب نہ ہوتا، چنانچہ رومی خان نمک حرام کے چلے جانے پر سلطان بہادر شاہ نے گجرات ہمایوں سے واپس لے لیا،

دوسری جنگ شیر شاہ سے ہوئی جس میں ہمایوں نے بہادر شاہ کا توپ خانہ استعمال کیا، جس کو مال غنیمت میں اس نے حاصل کیا تھا، مگر کچھ اپنی سوء تدبیری اور کچھ بھائیوں کی غداری سے اسے یہاں بھی قسمت نے کامیاب نہ ہونے دیا،

جنگ قنوج میں ہمایوں نے جو توپ خانہ استعمال کیا، اس میں ۷۰۰ توپیں تھیں، ان میں سے ۲۱ بڑی تھیں، جن کو ۱۶۰۰ بیل کھینچتے تھے، باقی چھوٹی تھیں، جن کو آٹھ آٹھ بیل لیجاتے تھے،[1]

---

[1] فن حرب مصنفہ ارون صاحب مطبوعہ لندن،

اکبر بادشاہ نے جہاں اپنے دادا بابر کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی وراثت میں پائی تھی، وہیں اس کا دماغ بھی ایجاد کرنے میں بے نظیر تھا، اس لئے اس کے عہد میں توپخانہ کو زیادہ ترقی ہوئی، اس کے کارخانہ میں مختلف قسم کی توپیں بنائی جاتی تھیں، ان میں سے بھاری بھی ہوتی تھیں، اور ہلکی بھی بعض اس قدر ہلکی ہوتی تھیں کہ ان کو ایک آدمی آسانی سے اٹھا کرلے جا سکتا تھا، ان میں مندرجۂ ذیل قسم کی توپیں تھیں، (۱) برجی (۲) فیل کش (۳) گاؤکش (۴) مردم کش،

۱- **برجی توپ**: بہت وزنی اور بڑی مار کی توپ ہوتی تھی، اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا مشکل ہوتا تھا، اس لئے زیادہ تر قلعہ کے برجوں پر رکھی جاتی تھی، اور غنیم کے محاصرہ اور حملہ کے وقت بڑی کارآمد ثابت ہوتی، اس کا گولہ بھی زیادہ وزنی ہوتا تھا، اکبری عہد میں آگرہ کے برج پر اسی قسم کی توپ تھی جس کی تصویر آئین اکبری میں ابوالفضل نے دی ہے،

۲- **فیل کش**: یہ بہت وزنی ہوتی تھی، اس کو ہاتھی کھینچتے تھے، یہ قلعہ شکن اور میدانی دونوں قسم کی ہوتی تھی،

۳- **گاؤکش**: ان کو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بیل کھینچتے تھے انمیں بھی بعض وزنی اور بعض ہلکی ہوتیں، ابوالفضل نے لکھا کہ بعض اس قدر وزنی تھیں کہ ہزار بیل ان کو لیجاتے تھے، اس کی تصدیق ان بیانات سے ہوتی ہے جن کو سیاحوں نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے، اس کا ذکر عنقریب آئے گا، لیکن اکثر ایسی ہوتی تھیں کہ دو چار جوڑی بیل بآسانی جہاں چاہتے لیجاتے،

۴- **مردم کش** یہ توپ چھوٹی اور ہلکی ہوتی تھی، ایک آدمی آسانی کے ساتھ سر پر رکھ کر لیجا سکتا تھا، اس توپ کا نام "نرنال" تھا، باربرداری کی سہولت کے خیال سے ایسی توپیں بکثرت بنائی جاتی تھیں، اور ان کا استعمال بہت زیادہ فوج میں ہو گیا تھا، نرنال ایسی بھی ہوتی تھیں، جن کا وزن کچھ زیادہ ہوتا تھا، اور کئی کئی آدمی مل کر اٹھاتے تھے، بادشاہ کی ہمرکابی میں اکثر ایسی ہی توپیں رہتی تھیں، جن کو حاضر توپ

کہتے تھے،

۵- اکبری مشین گن : احمد نگر کے نظام شاہیوں نے بعض توپیں ایسی ایجاد کی تھیں جن میں ضرورت کے وقت پیسے بھر کر غنیم پر چھوڑتے اور جو موجودہ مشین گن کی طرح غنیم کا صفایا کر دیتی تھیں، یہ گویا مشین گن کا ابتدائی "تخیل" تھا، اکبری عہد میں اس تخیل نے عملی صورت اختیار کر لی، اور ایک طرح کی مشین گن ایجاد کی گئی، اس میں چھوٹی چھوٹی سترہ توپیں ایک ساتھ اس طرح بنائی گئیں کہ ایک فتیلہ سے سب کے منہ کھل جاتے، اور بہ یک وقت سترہ فیر ہوتے، اور یہ ہلکی اس قدر تھیں کہ ایک ہاتھی بآسانی کھینچ سکتا تھا[۵]

یہ ایجاد آج سے ۴۰۰ سو برس پہلے کی ہے جب کہ غالباً یورپ میں اس کا تخیل بھی نہ تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا موجد ابو الفتح گیلانی ہے،

ساخت کے اعتبار سے بھی یہ توپیں مختلف قسم کی تھیں (۱) ڈھلی ہوئی ہوتیں اور بغیر گاڑی کے استعمال کیجاتیں، ان کو اٹھا کر کسی بلند جگہ پر یا دو شہتیروں کو کھڑا کرکے اس پر نصب کر دیتے لیکن ان کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہو گیا،

۲- یہ توپ گاڑی پر اس طرح جمی ہوتی تھی کہ اس سے الگ نہیں کر سکتے تھے، اور گاڑی پر جہاں چاہتے لیجا سکتے تھے، اس قسم کی توپیں زیادہ تر وزنی ہوتی تھیں، اور قلعہ شکنی کے کام میں ان کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا، ان کو ہاتھی یا بیل کھینچتے تھے، میدانی لڑائیوں میں بھی ان کا استعمال ہوتا تھا، اور بہت کارآمد ثابت ہوتی تھیں،

(۳)- یہ توپ بھی گاڑی پر ہوتی تھی، مگر اتنی ہلکی ہوتی تھی کہ جہاں چاہتے گاڑی سے الگ کرکے استعمال کر سکتے تھے، اور پھر جب ضرورت ہوتی، گاڑی پر رکھ کر کام چلاتے، یہ تمام قسمیں ڈھلی

---

[۵] آئین اکبری جلد اول ص ۸۲ نولکشور لکھنؤ،

ہوتی تھیں،

۴۔ بعض ایسی توپیں بھی تھیں جن کے ٹکڑے الگ ہو سکتے تھے، اور بوقت ضرورت گاڑیوں پر رکھکر اُن کو جوڑ لیا جاتا، اس نے بڑی وزنی توپوں کو ٹکڑے کرکے جہاں چاہتے لیجاتے، اور کسی قسم کی دقت نہ محسوس ہوتی، ان کی ایجاد سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ شکست یا تنگیٔ وقت کے باعث جب کہ غنیم سر پر آگیا ہو، وزنی توپوں کو اپنے ساتھ نہ لیجا سکتے تھے، ایسی صورت میں یا تو ان کو کیل مار کر بیکار کر دیتے تھے، یا پھر نصیب دشمنان ہو جاتیں، ان توپوں کی ایجاد سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ منتقل ہو سکتی تھیں، اور غنیم کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہ جاتیں،

یہ جوڑ دار توپیں مختلف سائز کی ہوتی تھیں، بعض کے جوڑ نو یا دس ہوتے، بعض کے اس سے کم، کم سے کم تین جوڑ ہوتے تھے، ایک آگے کا حصہ، دوسرا اوسط، اور تیسرا آخر کا، اس کو وصل کرکے پیچ کے ذریعہ سے کس دیتے تھے،

ان توپوں کے گولے بھی مختلف وزن کے ہوتے تھے، ۲۵ - ۳۰ سیر سے لیکر بارہ من وزن تک کے گولے ان میں استعمال کئے جاتے تھے، یہ گولے پتھر اور لوہے کے ہوتے، اکبری عہد کے توپ سازی کے کارخانہ کے عہدہ دار کو میر آتش (داروغہ توپخانہ) کہتے تھے، اور اس کا شمار منصب داروں میں ہوتا، اور دوسرے عہدہ داروں کے طرح اُن کی بھی بڑی عزت افزائی ہوتی تھی، اور خلعت و جاگیر سے سرفراز کئے جاتے تھے، اس زمانہ میں عام سپاہیوں کی تنخواہ دس روپیے تک ہوتی تھی[۱] (باقی)

---

[۱] آئین اکبری ص ۴۳ ج اول نولکشوری،

سیر الصحابہ جلد اوّل

(خلفائے راشدین)

اس میں خلفائے راشدین کے ذاتی حالات، فضائل اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا مفصل بیان قیمت ۵ر منیجر

عربی نظم و نثر کی تاریخ

نثر

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۲)

نثر دورِ جاہلیت — اہلِ جاہلیت کی نثر دو قسمون مین منقسم ہے :-

۱- ایک تو ان کی عام بول چال کی زبان جس مین وہ روزمرہ گفتگو کرتے تھے،

۲- دوسری وہ نثر جو لفظی تراش و خراش کے ذریعہ سے ادبی قالب مین ڈھالی جاتی تھی، اور اُس کے ذریعہ جذبات کو ابھارا جاتا تھا لیکن اس ادبی نثر کا درجہ شعر سے کم تھا، کیونکہ شعر خیال کی اور نثر عقل کی پیداوار ہے، اور ہر قوم کے ابتدائی زمانہ مین خیال عقل پر غالب رہتا ہے، اس کے ساتھ اس قسم کی ادبی نثر سے زیادہ تر تحریر و کتابت مین کام لیا جاتا ہے، اور جاہلیت کے زمانہ مین اہلِ عرب مین پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے، ان تمام باتون کے ساتھ اہلِ عرب کی نثر کا ذخیرہ ہم تک بہ نسبت شعر کے بہت کم پہنچا ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت کا ادبی سرمایہ ہم تک بذریعہ روایت کے پہنچا ہے، اور قوت حافظہ بہ نسبت نثر کے نظم کو زیادہ محفوظ رکھتی ہے، اور اگر کہین غلطی کرتی ہے، تو ایک دو لفظ یا دو ایک فقرے مین کرتی ہے، باقی اصل قصیدہ اپنی اصلی صورت مین قائم رہتا ہے لیکن نثر کی یہ حالت نہین ہے،

بہر حال اہلِ جاہلیت کی ادبی نثر کا جو سرمایہ ہم تک بذریعہ روایت کے پہنچا ہے، وہ چند قسموں مین منقسم ہے،

۱- چند قصے جو زیادہ تر کتاب الاغانی مین مذکور ہین، اُن کے تاریخی حالات اور جنگ و مفاخرت سے تعلق رکھتے ہین لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی روایت بالمعنی کی گئی ہے، اور راوی نے واقعات کو اپنے الفاظ مین بیان کر دیا ہے، گیارہ عورتون کا ایک قصہ صحیح بخاری مین بھی مذکور ہے، جس مین سب نے اپنے اپنے شوہرون کے حالات بیان کئے ہین لیکن اُن کی زبان اس قدر مشکل ہے کہ اس قصہ کی مستقل شرحین لکھی گئی ہین، ان مین سے چند عورتون کے فقرے یہ ہین۔

۱- زوجی لحم جمل، غث علی راس جبل، لا سہل فیرتقی ولا سمین فینتقل"

۲- زوجی العشنق ان انطق اطلق وان اسکت اعلق،

۳- زوجی ان اکل لف وان شرب اشتف وان اضطجع التف ولا یولج الکف لیعلم البث

۴- زوجی رفیع العماد، طویل النجاد، عظیم الرماد، قریب البیت من الناد"

کاہنون کے چند فقرے جو حدیث کی کتابون مین مذکور ہین، وہ بھی اسی طرح مسجع و مقفی ہین،

۲- دینی وعظ و پند: اس سلسلہ مین قس بن ساعدہ کے چند دینی مواعظ نقل کئے گئے ہین جن کے چند فقرے یہ ہین:-

"ایھا الناس اسمعوا و عوا واذا وعیتم فانتفعوا، انہ من عاش مات ومن مات فات، وکل ما ھو آت آت مطر و نبات،

لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور جعلی ہین، ان کے رواۃ عموماً ناقابلِ سند بلکہ کذاب ہین تاہم ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی انشاپردازانہ نثر عموماً مسجع و مقفیٰ ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی مسجع و مقفیٰ آیتون سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ مین یہی طرز موثر اور مقبول تھا،

۳- تقریر و خطابت جس کی ترقی آزاد اور خود مختار قومون مین خاص طور پر ہوتی ہے، بالخصوص جب ان قومون مین باہم جنگ خونریزی کا بازار گرم رہتا ہے، تو اس کو اور بھی زیادہ ترقی ہوتی ہے، اور زمانۂ جاہلیت مین یہ دونون باتین نہایت شدت سے پائی جاتی تھین، اس لئے وہان فصیح و بلیغ خطیبون کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا تھا، اور شعراء کی طرح ہر قبیلہ اپنے خطیبون پر بھی فخر کرتا تھا،

دورِ جاہلیت کی نثر مین یہ خطبات زیادہ تر نقل کئے گئے ہین، اور وہ اکثر دو باتون سے تعلق رکھتے ہین:-

۱- منافرت یعنی دو شخص یا دو قبیلے باہم مفاخرت کرتے تھے، اور اپنے اپنے مفاخر بیان کرنے کے بعد اُن کو ایک حکم کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے پیش کرتے تھے،

۲- وفد مختلف اغراض سے اہلِ عرب کے وفود امرا و سلاطین کی خدمت مین حاضر ہوتے تھے، اور تقریر و خطابت کے ذریعہ سے اپنے اغراض کو اُن کے سامنے نہایت انشاپردازانہ الفاظ مین پیش کرتے تھے،

ان دونون امور کے متعلق اُن کے جو خطبات منقول ہین، ان مین بڑا زور و اثر پایا جاتا تھا، بہت سے معانی تھوڑے سے الفاظ مین بیان کئے جاتے تھے، ابتدائے اسلام مین خلفائے راشدین وغیرہ نے جو خطبے دیئے ہین، وہ معانی و مطالب کے لحاظ سے اگرچہ اسلام سے متاثر ہین، لیکن ان کا اسلوب بالکل دورِ جاہلیت کے خطبات کا ہے،

۴۔ ضرب الامثال، ضرب المثل کے معنی یہ ہیں کہ کسی قوم کے تجربات کو چند مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے، اور اس کا امتیازی خاصہ یہ ہے کہ وہ صرف شعراء جیسے ترقی یافتہ گروہ کی ذہنیت کا اظہار نہیں کرتی، بلکہ پوری قوم کی ذہنیت کو ظاہر کرتی ہے،

قوموں کی اجتماعی زندگی کے اختلاف سے اُن کی ضرب المثلوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً ساحلی قوموں کی ضرب المثلیں بحری زندگی سے اور صحرائی قوموں کی ضرب المثلیں صحرائی زندگی کے ماحول سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ان میں ان کے اثرات ہوتے ہیں، اہل عرب کے یہاں ضرب المثلوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جن کی مختلف قسمیں تھیں، ایک تو حکیمانہ تھیں، اور اس قسم کی ضرب المثلیں نظم میں زہیر بن ابی سلمیٰ کے یہاں اور نثر میں اکثم بن صیفی کے یہاں بہ کثرت ملتی ہیں، دوسری قسم کی ضرب المثلیں وہ تھیں جو ہر رنگ واقعات سے تعلق رکھتی تھیں، عربی ضرب المثلیں بہت سی کتابوں میں جمع کیگئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور میدانی کی کتاب الامثال ہے لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ ہر زمانہ کی ضرب المثلیں علٰحدہ علٰحدہ نہیں جمع کی گئی ہیں، بلکہ زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کی ضرب المثلیں باہم گڈمڈ ہو گئی ہیں، اس لئے کبھی تو آسانی سے اُن کے زمانہ کا پتہ چل جاتا ہے، اور کبھی نہیں چلتا، اور یہ دشواری زیادہ تر حکیمانہ ضرب المثلوں میں پیش آتی ہے،

نثر دورِ اسلام | خطابت انشا پردازانہ نثر کی ایک قسم ہے جس کے ذریعہ ایک شخص جماعت پر اثر ڈالتا ہے اور اس کو ایک کام پر ابھارتا ہے، بہت سے محرکات اور بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں، جہاں بڑے بڑے قصائد اور بڑے بڑے رسالے بیکار ہو جاتے ہیں، اور صرف تقریر و خطابت سے کام چلتا ہے، اس قسم کے محرکات زیادہ تر کسی دینی یا سیاسی یا اجتماعی انقلاب کے زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں چونکہ اسلام اور اسلام کی اشاعت دنیا کا سب سے بڑا انقلاب تھا جس نے مختلف مذاہب کو منسوخ کر دیا، پرانے اجتماعی نظام کی بنیادیں ہلا دیں، اور بہت سی قوموں کی سلطنتوں کو مٹا کر ایک دوسری

قوم کی سلطنت قائم کر دی، اس لئے اسلامی دور مین خطابت کی ترقی کے بہ کثرت محرکات پیدا ہو گئے، مثلاً:-

(۱) اسلام ایک ان پڑھ قوم مین آیا، اور اس کی اشاعت ایک ایسے پیغمبر کے ذریعہ سے ہوئی جو خود اس قوم کی طرح امی تھا، اور ایک ان پڑھ قوم پر سب سے زیادہ اثر خطابت کا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفاء اور آپ کے فوجی سردارون نے اپنی دعوت مین صرف خطابت سے کام لیا،

(۲) اسلام سے پہلے اور اسلام کے آغاز مین اہل عرب کے نزدیک خطابت ایک مقبول عام چیز تھی، اور شاعری کسب مال کا ذریعہ بن کر ایک ذلیل چیز ہو گئی تھی اس کے ساتھ شاعری کا میدان محدود تھا، اور خطابت کے ذریعہ سے ہر قسم کے خیالات ظاہر کئے جا سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اسلام کی تائید مین جو خطبے دئیے، اہل عرب پر ان کا شدت کیساتھ اثر پڑا،

(۳) ابتداے اسلام مین مسلمان بہت تھوڑے سے تھے، جن کو ایک جگہ آسانی کے ساتھ جمع کیا جا سکتا تھا، اور اس حالت مین خطیب کی شکل و صورت اس کی آواز اور اس کے اشارے انکو بہت زیادہ متاثر کر سکتے تھے لیکن ایک بہت بڑی جماعت جو بڑے بڑے شہرون مین پھیل جاتی ہے اس پر اثر ڈالنے کے لئے لکھے ہوئے فرمانون کی ضرورت ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ مین خطبات کے موضوع یہ ہوتے تھے،

۱- اسلام کی دعوت، توحید کی ترغیب، شرک و بت پرستی سے اجتناب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، غرض اسی قسم کے مختلف دینی امور، یہی وجہ ہے کہ ہر دینی اجتماع، مثلاً جمعہ، عیدین اور حج کے بعض مقامات مین خطبہ ایک ضروری چیز قرار دیا گیا ہے، اور اسی لئے داعیانِ اسلام، سپہ سالارانِ فوج، خلفاء اور ان کے افسران سب کے سب زبان آور خطیب ہوتے تھے،

۲۔ فوجون کی روانگی کے وقت اُن کو آمادۂ جنگ کرنا اور مختلف فوجی معاملات کے متعلق اُنکو نصیحت کرنا،

۳۔ مختلف سیاسی معاملات مثلاً کسی پالیسی کی توضیح، کسی کی بیعت کی تائید، کسی سیاسی شبہہ کا ازالہ، اور کسی کی معافی کا اعلان،

ابتداے اسلام مین خطابت کے اسلوب بیان مین بھی مختلف تغیرات پیدا ہوئے، الفاظ پر زور اور آسان استعمال کئے جانے لگے، سجع و قافیہ کی پابندی جیسا کہ کاہنون کا طریقہ تھا، باقی نہ رہی، خدا کی حمد و ستایش سے خطبات کی ابتدا کیجانے لگی، اور قرآن مجید کا اسلوب بیان اختیار کیا گیا، اور قرآن مجید کی بہ کثرت آیتون کا اقتباس کیا جانے لگا،

عربی شاعری عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ مین

زمانۂ جاہلیت مین اہلِ عرب کی شاعری، اُن کی بدویانہ زندگی کا آئینہ تھی جس مین اُن کے احساسات، جذبات اور اخلاق و عادات کی تصویر نظر آتی تھی، لیکن جب اسلام نے اُن کی مذہبی، عقلی، اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی زندگی مین ایک عام انقلاب پیدا کردیا تو عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کی شاعری جاہلیت اور اسلام دونون کی زندگی کا مجموعہ بن گئی، اسی لیے اس دور کے شعراء کو مخضرمین کہا جاتا ہے، جس کے معنی اس چیز کے ہین، جو دو چیزون کے درمیان مین رکھی جاتی ہے، اور ان مین جو شعراء اسلام لائے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین رہ کر آپ کی حمایت کی، اُن کے اشعار مین اسلامی رنگ نمایان ہو، مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور کعب بن مالکؓ اسی قسم کے شعراء ہین لیکن حطیہ وغیرہ کے کلام مین اسلامی رنگ واضح طور پر نمایان نہین، کیونکہ یہ لوگ صحرا مین بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے،

مشرکینِ مکہ کی عداوت نے اُن کو ہر ممکن طریقہ سے اسلام کے مقابلہ پر آمادہ کیا، اس لئے ان مین بہت سے شعراء ایسے پیدا ہوگئے، جو اس سے پہلے شاعری مین کوئی شہرت نہین رکھتے تھے، ان شعرا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو مین اشعار لکھے لیکن جب اسلام لائے، تو شاعری کو بالکل چھوڑ دیا

عبد اللہ بن زبعری، ابوسفیان بن حارث، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص اسی قسم کے لوگ تھے، اس کے ساتھ بہت سے شعرا نے جب یہ آیت سُنی:-

"الشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ"

تو شاعری کو بنظر حقارت دیکھنے لگے، اصحاب معلقات مین لبید اسی قسم کے لوگون مین تھے، لیکن بہرحال اس دور نے شاعری کے اسلوب اور مقاصد پر مختلف قسم کے اثرات ڈالے جو حسب ذیل تھے،

۱- پرہیزگار شعراء نے شاعری کے ان تمام مقاصد کو چھوڑ دیا، جو گمراہی و ضلالت پیدا کرتے تھے مثلاً عریان غزل گوئی اور اس کے محرکات، تملق آمیز مداحی، ہجو و بدگوئی، فخاری، شراب و کباب، اور اس کے لوازمات، مثلاً مغنیہ عورتون کا رقص و سرود اور احباب کی رنگین صحبتون کا ذکر، شیر شکار وغیرہ جن کو ایک مسلمان لہو و لعب کی چیز سمجھتا ہے، لیکن حطیہ جیسے رند مزاج یا عیسائی شعراء کا کلام قریب قریب جاہلیت ہی کے طرز پر قائم رہا،

۲- دوسرے مسلمان شعراء نے مشرکین کی ہجوؤن کا جواب دینا شروع کیا اور اس مین یہ جدت پیدا کی کہ مشرکین پر کفر اور بت پرستی کا الزام لگایا، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کی ہجوون کی یہی خصوصیت تھی، لیکن جب تک کفار مکہ کفر کی حالت مین رہے، اُن پر اُن کی ہجوؤن کا بہت کم اثر پڑا، البتہ جب وہ مسلمان ہوگئے، تو وہ اُن کے لئے تیر و نشتر بن گئین،

۳- تیسرے یہ کہ شاعری سے دعوتِ اسلام کی تائید کا کام لیا گیا، اعمالِ صالحہ کی ترغیب دیگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے انصار کی مدح کی گئی، شہداء کے مرثیے لکھے گئے، اور لوگون کو جہاد پر آمادہ کیا گیا،

۴- چوتھے یہ کہ جن شعراء نے اسلامی فتوحات مین حصہ لیا تھا، انھون نے اپنے غلبہ و اقتدار

مسلمان بہادرون کی شجاعت، قلعے، آلاتِ جنگ، برف پوش پہاڑون، نہرون اور جہازون کے وصف مین اشعار کہے لیکن اس قسم کے اشعار رجزیہ ہیں اور مغازی کی کتابون مین زیادہ ملتے ہین،

الفاظ، معانی اور اسلوب بیان کے لحاظ سے قدیم اہلِ ادب نے مخضرمی شعراء کے دو گروہ قائم کئے ہین،

۱- ایک تو صحرا نشین شعراء مثلاً نجد و یمامہ کے بدو جن کے الفاظ مین جزالت و متانت اور اسلوب بیان مین تنوع ہے لیکن اسی کے ساتھ غیر مانوس اور ثقیل الفاظ بھی پائے جاتے ہین، اور دورِ جاہلیت کے ممتاز شعراء انھی لوگون مین پیدا ہوئے ہین،

۲- دوسرے شہری شعراء جو مدینہ، مکہ، طائف اور حیرہ مین رہتے تھے، ان کے کلام مین تمدنی ترقی نے لطافت و نزاکت پیدا کردی تھی، اور اہلِ مدینہ ان سب مین سب سے زیادہ شاعرانہ حیثیت سے ممتاز تھے، اور جن شعراء نے کفار قریش کی ہجو ون کا جواب دیا، وہ مدینہ ہی کے رہنے والے تھے البتہ ان شعراء نے دورِ جاہلیت کے الفاظ کی جزالت اور معانی کی قوت کو بالکل زائل کردیا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جو اسباب شاعرانہ جذبات مین اشتعال پیدا کرتے تھے، اسلام نے اُن سب کو ختم کردیا مثلاً عصبیت جاہلیہ، بغض و انتقام، ہجو و بدگوئی، رندی و شرابخواری وغیرہ پر شعرائے جاہلیت کے کلام کے زور و اثر کا دار و مدار تھا، اور اسلام نے ان سب کو یک قلم مٹا دیا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب بیان نے خود شعراء کی نگاہون مین شاعری کی قدر و قیمت کو کم کردیا تھا، اس لئے شاعری اپنے درجہ سے بالکل گرگئی یہان تک کہ لبید عامری نے جو زمانۂ جاہلیت کا ممتاز شاعر تھا، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت سے مبہوت ہوکر شعر ہی کہنا چھوڑ دیا، حضرت حسان بن ثابتؓ بھی زمانۂ جاہلیت کے نامور شاعر تھے، لیکن دور اسلام مین اُن کا کلام بھی اپنے پایہ سے گرگیا البتہ جو شعراء بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ قرآن مجید سے بہت کم متاثر ہوئے، اور ان کا کلام جاہلیت ہی

کے طرز پر قائم رہا، مثلاً حطیئہ اور کعب بن زہیر اسی قسم کے شاعر تھے، لیکن بہت سے نقادان فن شعر کا خیال ہے کہ مکہ، مدینہ اور طائف کے شعراء کا جو بچا کھچا کلام موجود ہے، وہ بالکل جعلی ہے اور لوگون نے مذہبی اور تفریحی مقاصد سے اس قسم کے جعلی اشعار بنا کر ان شعرا کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن بہرحال شعرائے مخضرمین بالخصوص صحابہ کا جو کلام موجود ہے، اس مین صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ، جنت و دوزخ، ثواب و عذاب، حشر و نشر اور بہت سے فرشتون اور پیغمبرون کا نام آیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر قرآن و حدیث کا اثر پڑا ہے،

دور بنو امیہ ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت اور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت تک نبوت اور خلفائے راشدینؓ کا دور ختم ہوگیا، اس لئے غزوات نبوی اور مرتدون کی جنگ کا زمانہ بھی گذر گیا، اور بہت سے ملک اسلام کے اقتدار مین آگئے، یہ اسلامی زندگی کا ایک نیا دور تھا جس مین اہل عرب کی زندگی کے اطوار عقلی، مذہبی، اور سیاسی حیثیت سے دور جاہلیت کی زندگی سے مختلف ہوگئے، جس مین اہل عرب کے جذبات، احساسات اور اخلاق و عادات مین اسلامی روح کے ساتھ غلبہ و اقتدار کی آمیزش بھی شامل ہوگئی، اور شعر، رجز، خطبات، خطوط اور عہدنامون کے آئینے مین اس نئی زندگی کا پرتو سنجیدگی، وقار، دور اندیشی اور حق و مذہب کی تائید کی صورت مین نظر آنے لگا،

چونکہ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کا طویل زمانہ، سیاسی تدبر کا زمانہ تھا، اس لئے وہ دوست و دشمن دونون کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل عرب کی زندگی نے دو متضاد روش اختیار کی،

ا- ایک روش تو ان جاگیردارون کی تھی، جو فاتحین کی اولاد تھے، یہ لوگ بنو امیہ کی پارٹی مین شامل تھے، اور شام، جزیرہ اور مصر کے بعض حصون مین رہتے تھے، لیکن علویون کی پارٹی

ونا گواری کے ساتھ بنو امیہ کی حکومت پر راضی ہو گئی تھی، عراق میں رہتی تھی، اور دونوں پارٹیاں متمدنی زندگی بسر کرتی تھیں، اور غلامی کے رواج کی وجہ سے عجمیوں کے ساتھ میل جول رکھتی تھیں لیکن چونکہ ان لوگوں کو مختلف لڑائیوں میں حضرت امیر معاویہؓ کی حمایت اور اُن کی جانب سے مدافعت کرنی پڑی تھی، اس لئے اس تمدنی زندگی میں فوجی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا، پھر حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید، مروان اور عبدالملک کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بھی، اُن کو شامل ہونا پڑا، اس طرح قحطانی، مضری، زبیری، مروانی شیعی اور خوارج کی مختلف پارٹیاں قائم ہو گئیں، اور کوفہ و بصرہ اس نئی زندگی کے سب سے بڑے مرکز بن گئے،

۲- دوسری روش ان مہاجرین و انصار کی تھی، جو صرف جزیرۂ عرب میں رہتے تھے، ان میں حجاز کے اکثر باشندے صحابہ، خلفاء اور بنو ہاشم کے خاندان سے تھے، جو حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کو دل سے تو ناپسند کرتے تھے، لیکن اسلامی مصالح کی بنا پر علانیہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، اور چونکہ دولت کا خاندانی سرمایہ اُن کے لئے کافی تھا، اس لئے عسکری ملازمت سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے، ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو حضرت امیر معاویہؓ وظائف اور عطیے دیکر خوش رکھنا چاہتے تھے، اس لئے دو متضاد گروہ پیدا ہو گئے جن کے اطوارِ زندگی باہم مختلف تھے، زیادہ تر لوگ تو عبادت اور قرآن و حدیث، فقہ، اور سیر و مغازی کے درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے لیکن بعض دولت مند نوجوانوں نے عیش پرستی کی زندگی اختیار کر لی، اور عجمی غلاموں اور گانے بجانے والی لونڈیوں نے گا بجا کر، اور رند مزاج شعراء نے عاشقانہ غزلیں سُنا سُنا کر اُن کو اور متوالا کر دیا، لیکن صحرا نشین بدوؤں کی زندگی، اس حیثیت سے تو زمانہ جاہلیت کی زندگی سے مشابہ تھی، کہ یہ لوگ بھی جنگلوں اور چراگاہوں میں گھوم پھر کر اونٹ اور بکریاں چراتے تھے، اور باہم مفاخرت اور ہجو گوئی کرتے تھے، البتہ چونکہ ایمان لا چکے تھے، اس لئے لوٹ مار نہیں کرتے تھے،

ان مین بعض قبائل کی عورتین حسین وجمیل ہوتی تھین، اور جب ان کے مرد جنگ یا تجارت وغیرہ کے لئے نکل جاتے تھے، اور گھرون مین صرف عورتین، بوڑھے اور بچے رہ جاتے تو اس قبیلہ یا اس کے پڑوس مین رہنے والے قبیلہ کے نوجوانون کے لئے میدان صاف ہوجاتا تھا، اور چونکہ بدوون مین پردے کا رواج بہت کم تھا، اس لئے ان نوجوانون کو نوجوان لڑکیون سے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے کا پورا موقع ملتا تھا، اس سے ان مین باہم پاک محبت پیدا ہوجاتی تھی، اور اس پاک محبت مین زیادہ تر قبیلۂ بنو عذرہ اور نجد وحجاز کے لوگ مبتلا ہوتے تھے،

پھر جب ان قبائل کے لوگ سفر سے واپس آتے تھے، اور ان کو اپنی لڑکیون کے عشق ومحبت کا حال معلوم ہوتا تھا، تو وہ ان کو پردے مین بٹھا دیتے تھے، اور ان کے عشاق کی گھات مین لگے رہتے، اگر عاشق کا قبیلہ طاقتور ہوتا، تو اپنے یہان کے سرکاری عامل سے فریادی ہوتا، جو عاشق سے توبہ کراتا تھا یا اس کو قید کردیتا تھا،

ان اسباب کا قدرتی نتیجہ اس زمانہ کے ادب پر بھی پڑا، یعنی جو لوگ شہری تھے، اُن کا ادب اُن کی مخصوص زندگی کے قالب مین ڈھل گیا، اور ہر سیاسی اور مذہبی گروہ مین ایسے خطبا اور شعرا پیدا ہوگئے جو تقریر اور شاعری کے ذریعہ سے اپنے اپنے سیاسی اور مذہبی مسلک کی تائید کرتے تھے، اور بصرہ کا مربد اور کوفہ کی مسجدین گویا ان شعراء وخطباء کا بازار عکاظ تھین،

اسی طرح حجاز مین وہان کے دولت مند نوجوانون کا اثر بھی شاعری پر پڑا، اور حجاز مین لطافت آمیز اور لوچدار غزل کو ترقی ہوئی جس نے رفتہ رفتہ زمانہ اور ظریفانہ شکل اختیار کرلی، بدوون کی خشک اور باوقار زندگی نے فخر ومباہات، ہجو وبدگوئی اور مدح ومرثیہ کے مضامین باندھے، اور عاشق مزاج شعرا نے پاکیزہ غزلین کہین جس کو قدیم اہل ادب پاکیزہ تغزل کا بہترین نمونہ سمجھتے ہین، ان اجمالی خصوصیات کے بعد ہم دور بنو امیہ کی شاعری کے انواع، مضامین اور اسلوب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہین،

ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ مخضرمین یعنی ان شعراء کا کلام جنھوں نے اسلام اور جاہلیت دونوں کا زمانہ پایا ہے، دوگونہ خصوصیت رکھتا ہے، ایک طرف تو انھوں نے زمانۂ جاہلیت میں جو کچھ کہا ہے، وہ دورِ جاہلیت کی زندگی کو نمایاں کرتا ہے، اور دوسری طرف زمانۂ اسلام میں جو کچھ کہا ہے، اس میں اسلام کی ابتدائی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں،

لیکن دورِ بنو امیہ کی شاعری اس اسلامی زندگی کا مرقع پیش کرتی ہے، جو زمانۂ جاہلیت کے بت پرستانہ اثرات سے الگ ہوکر اسلامی اقتدار کے سامنے سربسجود ہوگئی تھی، اس کے ساتھ بہت سے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی انقلابات نے اس کو عہدِ نبوت اور عہدِ خلفاے راشدین کی شاعری سے ممتاز کردیا تھا، اس لئے اگرچہ اسلوب اور طرزِ بیان کے لحاظ سے وہ مخضرمین کی شاعری سے مختلف ہوگئی تھی، لیکن وزن، قافیہ اور دوسری حیثیتوں سے اس کا قالب وہی رہا۔ جو دورِ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں تھا، البتہ بنو امیہ کے دور میں رجز کی طرف خاص توجہ کی گئی، اور اس میں تقریباً قصائد کی تمام خصوصیتیں پیدا ہوگئیں، بادیہ نشین شعراء ہرن، شترمرغ کے بچے، اور نیل گاؤ وغیرہ کی شان میں رجز کے چند شعر کہتے تھے، لیکن اس دور میں چند رجز گو شعراء نے قصائد کی طرح طویل رجز لکھے، اور اس میں مدح، فخر، ہجو اور مرثیہ کے مضامین شامل کردیئے، اور شعراے جاہلیت کی طرح اس کی ابتدا تشبیب سے کی، اور ان رجز گو شعراء میں ابوالنجم عجلی عجاج تمیمی اور اس کے فرزند روبہ نے زیادہ شہرت حاصل کی،

اس دور کی شاعری میں نئے نئے برگ و بار پیدا ہوگئے، اور وہ خاص طور پر شعراء کا ذریعۂ معاش بن گئی، لمبے لمبے قصیدے اور رجز کہے جانے لگے، وزن اور قافیہ کے عیوب کم ہوگئے، معانی میں نزاکت پیدا ہوگئی، تشبیب اور غزل کے الفاظ اور اسلوب بیان میں لوچ پیدا ہوگیا، اور ان کا بہت سا حصہ بزم طرب میں گانے بجانے کے قابل ہوگیا، اس لئے اموی خلفاء، امراء اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں

کی نگاہ میں شاعری کی قدر وقیمت بہت زیادہ بڑھ گئی، اور انھوں نے شاعری کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا، اور اس کی وہی حیثیت ہو گئی، جو اس زمانہ میں مختلف پارٹیوں کے اخبارات کی ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا جن لوگوں کی حمایت کرتے تھے، اُن کی نگاہ میں اُن کی وقعت بہت زیادہ بڑھ گئی، اور جن لوگوں کی مخالفت کرتے تھے، وہ ان کے دشمن ہو گئے،

غرض جو مختلف سیاسی پارٹیاں قائم ہو گئی تھیں، اُن سب کے الگ الگ شعراء تھے، جن میں باہم معرکہ آرائی رہتی تھی، اور اس معرکہ آرائی میں لغت اور ادب کے علما بھی اس طرح شریک ہو جاتے تھے کہ ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر ترجیح دیتے تھے، اور اُن کے کلام پر تنقید کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء نے ان نقادانِ فن کی تنقید کے خوف سے اپنے کلام کو ہر ممکن طریقہ سے بہتر بنانے کی کوشش کی اس لئے مخضرمین اور اس دور کے آغاز میں قافیے کے جو عیوب عام طور پر شعراء کے کلام میں پائے جاتے تھے، وہ دور ہو گئے، اور خلفاء کی مدح اور ان کے مستحق خلافت ثابت کرنے کی وجہ سے شاعری سیکڑوں شعراء کا ذریعۂ معاش بن گئی،

اس طرح عربی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا اور مضامین اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اس میں جو خصوصیتیں پیدا ہوئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں،

۱۔ مدّاحی:۔ زمانۂ جاہلیت سے مدّاحی شاعری کا خاص موضوع تھی، لیکن ابتداء میں ذریعۂ معاش نہ تھی، البتہ آخری دور کے اخیر میں مالی منفعت کا ذریعہ بن گئی، اسلام کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوتِ اسلام کی تائید کے لئے مدحیہ قصائد کی اجازت دی، لیکن یہ مدح صرف امورِ رسالت تک محدود تھی، اس کے علاوہ محض ایک شخص کی جا و بیجا مدح کرنے کی آپ نے ممانعت کی تھی، خلفائے راشدینؓ کا طرزِ عمل بھی یہی رہا۔ اس لئے ایک مدت تک شاعری ذریعۂ معاش نہ بن سکی، بنو امیہ کا دور شروع ہوا، تو حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی دعوت کی تائید کے لئے کسو، قدر

مداحانہ قصائد کو پسند کیا، اس کے بعد بنو مروان نے ہر قسم کی جائز و ناجائز مداحی کی حوصلہ افزائی کی، اور اس پر شعراء کو گران قدر صلے دیئے، اُن کے عمال اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں نے بھی یہی روش اختیار کی، اور شعراء نے اس سلسلہ میں ایسے ایسے عجیب و غریب مضامین پیدا کئے جن کو اُن کے بعد کے شعراء نے نہایت مبالغہ آمیز بنا دیا،

۲- ھجو:- ابتدائے اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو صرف مشرکین کی ہجو کی اجازت دی تھی، ان کے علاوہ کسی اور کی ہجو کی اجازت نہ تھی، بلکہ حضرت عمرؓ نے حطیئہ کو ہجو گوئی کے جرم میں قید کر دیا تھا، لیکن سیاسی معاملات میں جو مسلمان بنو امیہ کے مخالف تھے، ان کی ہجو سے بنو امیہ نے چشم پوشی کی، اس لئے ہجو گوئی کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو گیا، اور زمانۂ جاہلیت سے بھی زیادہ اُس نے ترقی کی، اگر بنو امیہ نے اس پر سزائیں دی ہوتیں، تو عربی شاعری ایک مدت تک فحاشی اور بدزبانی سے محفوظ رہتی،

۳- فخر:- اسلام نے خداوند تعالیٰ کے احسانات، مشرکین پر غلبہ اور اسلامی فضائل کے ساتھ متصف ہونے پر فخر کرنے کو جائز رکھا تھا، لیکن بنو امیہ کے زمانہ میں شعراء نے زمانۂ جاہلیت کے جنگی واقعات اور فتوحات پر فخر کرنا شروع کیا، اس سے زمانۂ جاہلیت کی عصبیت جس کی اسلام نے ممانعت کی تھی، دوبارہ زندہ ہو گئی، اسی سلسلے میں انھوں نے مسرفین کی فیاضیوں پر بھی فخر و مباہات کیا، اگرچہ اس قسم کی فخاریاں اسلام میں ناجائز تھیں، تاہم اُن کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دورِ جاہلیت کے تاریخی واقعات محفوظ رہ گئے،

۴- سیاسی شاعری اس قسم کی شاعری اگرچہ زمانۂ جاہلیت اور ابتدائے اسلام بالخصوص حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن بنو امیہ کے زمانہ میں اس کا دائرہ اور وسیع ہو گیا، اور وہ صرف بنو ہاشم اور بنو امیہ کی تائید و حمایت تک محدود نہیں رہی، بلکہ دوسری سیاسی پارٹیوں

کی تائید و حمایت بھی اس میں شامل ہو گئی، بنو امیہ کی حمایت جن شعراء نے کی، ان میں اخطل، جریر، فرزدق اور نصیب زیادہ مشہور ہیں، زبیریہ پارٹی کے حامیوں میں عبد اللہ بن قیس الرقیات، خوارج کے حامیوں میں عمران بن حطان اور طرماح بن حکیم اور شیعوں کے حامیوں میں کمیت اسدی زیادہ شہرت رکھتے ہیں،

۵۔ غزل اس کی دو قسمیں رائج ہوئیں، ایک تو عریان غزلگوئی جس کا رواج حجاز کے شہری زر دولت مندوں میں جو مہاجرین، انصار اور مجاہدین کی اولاد سے تھے، ہوا، ان میں بہت سے شعراء، مغنی اور مسخرے پیدا ہو گئے، اور غزل کے سوا اس طبقہ کو دوسرے اصناف شعر سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی، اس قسم کے غزل گو شعراء میں احوص اور عمر بن ابی ربیعہ نے زیادہ شہرت حاصل کی، لیکن ان دونوں میں عمر بن ابی ربیعہ کی غزلوں میں زیادہ عریانی پائی جاتی ہے، وہ اپنی غزلوں میں علانیہ عورتوں کا نام لیتا ہے، اور ان کے ساتھ جو عاشقانہ واقعات بیان کرتا ہے، وہ زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں، اس نے ایک بہت بڑا دیوان مرتب کیا، جس میں تمام تر اسی قسم کی غزلیں پائی جاتی ہیں، دوسری قسم کی سنجیدہ، اور حقیقی عشق و محبت کے جذبات سے لبریز غزل گوئی حجاز کے صحرا نشین نوجوان بدوؤں میں پیدا ہوئی، جو قبیلہ بنو عذرہ اور قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے، اس قسم کے غزل گو شعراء میں جمیل بن معمر نے جو بثینہ کا عاشق صادق تھا، اور کثیر نے جو عزہ پر فریفتہ تھا، زیادہ شہرت حاصل کی، اس قسم کی غزلگوئی میں بڑے بڑے قصائد بلکہ دیوان کے دیوان لکھے گئے، جس کی نظیر زمانۂ جاہلیت اور آغاز اسلام میں نہیں پائی جاتی، اور وہ صرف مسلمان بدوؤں کے دماغ کی پیداوار ہے،

اسلوب بیان کے لحاظ سے اس دور کی شاعری کا وہی انداز قائم رہا، جو زمانۂ جاہلیت اور آغاز اسلام میں تھا، شعراء قصائد کی ابتداء تشبیب سے کرتے تھے، جس میں معشوقوں کے کھنڈر اور سفر وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا، پھر اپنی اور اپنی قوم کی مدح میں چند شعر کہتے تھے، اس کے بعد قصیدہ کے

ل موضوع یعنی مدح یا ہجو پر آتے تھے، اگرچہ تشبیب مرثیہ کے لئے موزون نہ تھی، تاہم مرثیون کی ابتداء
ہی تشبیب ہی سے کرتے تھے، کیونکہ یہ ایک تقلیدی اور رسمی چیز تھی، اس کو درحقیقت عشق و محبت
کوئی تعلق نہ تھا،

جہان تک الفاظ کا تعلق تھا، مدح، فخر اور سیر و شکار وغیرہ کے بیان مین شاندار، پرشکوہ
ور نامانوس الفاظ لاتے تھے، بلکہ فرزدق ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نامانوس الفاظ لاتا تھا، تاکہ اہل نحو
ور اہل لغت اس کے کلام کے ساتھ زیادہ اعتناء کرین، البتہ دونون قسم کی غزلون مین نرم شیرین
ور سادہ الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، مختصر یہ کہ صحت اور فصاحت دونون حیثیتون سے اس دور
مین عربی شاعری منتہائے کمال تک پہنچ گئی، یہان تک کہ بعض قدیم اہل ادب نے اس کو جاہلیت
ور مخضرمین دونون کی شاعری پر ترجیح دی ہے،

خطابت | بنو امیہ کے دور حکومت مین خطابت کے محرکات عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ
سے بہت زیادہ بڑھ گئے، کیونکہ خانہ جنگیون اور بغاوتون کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا، بہت سی
مذہبی اور سیاسی پارٹیان قائم ہو گئی تھین، فتوحات اسلامیہ کا دائرہ خراسان، ترکستان اور
سندھ تک پہنچ گیا تھا اور چونکہ حاکم و محکوم دونون کی زبان ایک تھی، اور بہت سے مواقع ایسے پیدا ہوگئے
تھے، جہان تقریر سے کام چل سکتا تھا، اور چونکہ اہل عرب پر فصاحت و بلاغت کا بہت زیادہ
اثر پڑتا تھا، اس لئے اس دور مین تقریر و خطابت کو بہت زیادہ ترقی ہوئی،

تمام خلفائے بنو امیہ کا دستور تھا کہ اپنے بچون کو صحرا نشین بدوؤن مین بھیج دیتے تھے،
کہ وہ فصاحت اور شہسواری مین کمال پیدا کرین، اور موٹی جھوٹی زندگی بسر کرنے کے عادی ہون
صرف ولید بن عبد الملک تربیت کے اس طریقہ سے محروم رہا، اس لئے اس کی گفتگو مین زبان
کی بعض غلطیان پائی جاتی ہین، اس زمانہ مین گورنری اور سپہ سالاری کے عہدے قریش ہی تک

محدود نہین رہے، بلکہ تمام اہلِ عرب کو ملنے لگے تھے، اس لئے ان سب مین بڑے بڑے زبان آور خطیب پیدا ہونے لگے،

مذہبی، سیاسی اور اجتماعی حیثیت سے نئی نئی باتین پیدا ہوئین، اس لئے خطابت کے بھی نئے نئے موضوع پیدا ہو گئے، مثلاً

(۱) شیعون اور خارجیون کے فرقے دوسرون کو اپنے مذہب کی دعوت تقریر کے ذریعہ سے دینے لگے،

(۲) خطابت سیاسی پروپگنڈا کا ایک بڑا ذریعہ بن گئی،

(۳) مختلف قبیلون اور اہلِ عرب اور فرقۂ شعوبیہ مین جو باہمی تعصب پیدا ہو گیا تھا، اس کا اظہار فخر اور ہجو کی صورت مین تقریر کے ذریعہ سے ہونے لگا،

(۴) خلفائے بنو امیہ نے اس کو دھمکی کا ایک بڑا ذریعہ بنا لیا،

ان تمام صورتون کے علاوہ زمانۂ جاہلیت اور آغاز اسلام مین تقریر و خطابت کے ذریعہ سے جو کام لئے جاتے تھے، مثلاً جنگ کے ذریعہ لوگون کو ابھارنا، کسی نیک کام کی نصیحت کرنا، کسی شرعی حکم کی وضاحت کرنا، جمعۂ عیدین اور زمانۂ حج مین خطبہ دینا، ان مین بدستور خطابت سے کام لیا جانے لگا،

خطبات کی ابتدا ہمیشہ حمد و نعت سے کی جاتی تھی، چنانچہ زیاد بن ابیہ جب بصرہ مین گورنر ہو کر آیا، اور باغیون کے ڈرانے کے لئے اپنی تقریر مین اس اسلوب کی خلاف ورزی کی تو اس پر لوگون نے اعتراض کیا، اور اس کے خطبہ کو بتراء کا لقب دیا یعنی بے سر کا خطبہ، حمد و نعت کے بعد خطیب اپنے مقاصد بیان کرتا تھا، اخیر مین خطبہ ان الفاظ پر ختم کرتا تھا، اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم، بعض اوقات اس کے بعد بھی جمعہ اور موسمِ حج مین حمد و نعت کا اضافہ کرتا تھا، اور خلیفہ کو بھی دعا دیتا تھا، خلفائے بنو امیہ

اور اُن کے گورنر کسی شورش کے فرو ہو جانے کے بعد اہلِ شہر کے سامنے جو خطبے دیتے تھے، ان میں دھمکی اور سب وشتم کے الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کرتے تھے، اور ایسے اشعار پڑھتے تھے، جن سے اُن کے دلوں میں رعب وداب کا اثر پڑے، اور قرآن مجید کی وہ آیتیں پڑھتے تھے جن میں باغیوں کے انجام بد کا تذکرہ ہوتا، جب بدوؤں یا فصحا کے سامنے خطبے دیتے تھے تو بہت سے نامانوس الفاظ استعمال کرتے تھے تاکہ اُن کی نگاہوں میں اُن کی وقعت بڑھ جائے، اور ان کے خطبات شاندار بن جائیں،

خطبہ دیتے وقت بالکل اہلِ عرب کی وضع اختیار کرتے تھے، یعنی کھڑے ہوکر کمان یا تلوار کے قبضہ یا عصا پر ٹیک لگاکر خطبہ دیتے تھے، اسی بنا پر جب ایک بار ولید بن عبد الملک نے بیٹھکر خطبہ دیا تو اس کو ناپسندیدہ خیال کیا گیا،

مختصر یہ کہ اس دور میں خطابت منتہائے کمال کو پہنچ گئی، کیونکہ عربیت کو اس زمانے کے بڑے بڑے فصحا نے اپنی اصلی حالت میں قائم رکھا تھا، اور یہ حالت خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں بھی ایک صدی تک قائم رہی، اور اس دور میں بھی بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے،

فنِ انشاء | زمانۂ جاہلیت میں مضر کے اکثر قبیلے ان پڑھ اور بدو تھے لیکن جب ان میں شہری باشندوں نے یمن شام اور عراق کے باشندوں سے تجارتی سلسلہ قائم کیا، تو مجبوراً ان کو انبار کے باشندوں سے لکھنا پڑھنا سیکھنا پڑا، اور سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ کے دادا حرب بن امیہ نے اُن سے لکھنا پڑھنا سیکھا، اسلام آیا تو اہلِ مکہ کا ایک گروہ لکھنا پڑھنا سیکھ چکا تھا جس میں بعض لوگوں نے اسلام کو قبول کرکے ہجرت کی، اور انصار نے بھی ان سے اور اسیرانِ بدر سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دی، اور مہاجرین وانصار میں بہت سے لکھنے پڑھنے والے پیدا ہوگئے، آپ امرا وسلاطین کے نام جو خط بھیجتے تھے، جو قبیلے اسلام

لاتے تھے، ان کے ساتھ معاہدے، جنگجو فرقون سے جو مصالحت کرتے تھے، ان سب کو یہی لوگ لکھتے تھے، اس بنا پر اب لکھنے کے معنی خطوط، معاہدے اور دفتری کاروبار کے لکھنے کے ہوگئے،

سب سے پہلے خلافت کے کاروبار کے متعلق حضرت عمرؓ کے زمانہ مین تحریری کام لیا گیا، کیونکہ فتوحات، مالِ غنیمت اور فوجی نظام نے اُن کے زمانہ مین بڑی وسعت حاصل کی اسی لئے انھون نے ایک فوجی دفتر قائم کیا جس مین سپاہیون کے نام و نسب اور ان کی تنخواہین لکھی جاتی تھین، اُن کے بعد اور خلفا نے بھی اُن کی تقلید کی یہان تک کہ جب بنو اُمیہ کا دورِ خلافت شروع ہوا، تو حضرت امیر معاویہؓ نے الگ الگ اور بھی متعدد دفتر مثلاً دفترِ خراج، دفترِ خاتم، دفترِ خط و کتابت قائم کئے، اُن مین پہلے تو رومی فارسی اور قبطی زبان اور رسم خط کا رواج تھا، لیکن رفتہ رفتہ اُن کی جگہ عربی زبان اور عربی رسم خط نے لیلی، اور اب ہر قسم کے دفترون مین عربی زبان اور عربی رسم خط کا رواج ہوگیا،

پہلے تو تمام خطوط و فرمان وغیرہ روز مرہ کی بول چال مین لکھے جاتے تھے، اور اصل مقصد کو مختصر الفاظ مین بیان کیا جاتا تھا اور خلفا، گورنر اور سپہ سالار چونکہ خود فصیح و بلیغ ہوتے تھے اسلئے وہ خود بولتے جاتے تھے اور لکھنے والے ان کو لکھتے جاتے تھے لیکن جب شام، عراق اور مصر کے عربون کی اولاد اور ایران، روم اور قبط کے مجمیون سے جو عرب ہوگئے تھے، یہ کام لیا جانے لگا، تو انھون نے اسکو ایک مستقل فن بنا لیا اور اس مین عبارت آرائی کرنے لگے، اور اس کیلئے علم ادب، حفظ قرآن اور اشعار عرب کی تعلیم حاصل کی، اور اُن کے اقتباسات اور شاعرانہ تشبیہات اور ضرب الامثال وغیرہ سے کام لیا، اور ایرانی اور رومی اسلوب بیان کا ترجمہ عربی زبان مین کیا، اور ہشام کے زمانہ مین اس کے آزاد شدہ غلام ابو العلاء سالم نے اس فن کی تکمیل کی جو عربی اور رومی دونون زبانون سے اچھی طرح واقف تھا، اس کے داماد عبدالحمید بن یحیٰی نے اس سے اس کی تعلیم حاصل کی اور فنِ انشا کو ایک مستقل بنا دیا،

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے ؟

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

اقبال کی شاعری کا موضوع بہت پامال ہو چکا ہے اور اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس کا
وئی پہلو مشکل سے تشنہ باقی ہوگا، اور اب اس پر لکھنے کی بہت کم گنجایش ہے لیکن جن لوگون کی نظر
نکے پورے کلام اور اس کی غرض و غایت پر نہین ہے، اُن کی جانب سے اُن پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا
اتا ہے کہ وہ فرقہ پرست شاعر تھے، ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے خالی تھا، انھون نے
میت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے، اُن کی تعلیمات اور اُن کے پیام مین عالمگیریت نہین ہے انھون نے
الم انسانیت یا کم از کم ہندوستانی قوم کو مخاطب بنانے کے بجاے، صرف مسلمانون سے خطاب کیا ہے اور
نی شاعری مین صرف اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، وہ اسلامی حکومت کے قیام کے داعی اور صرف
سلمانون کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے، ان کی فرقہ پرستی کے ثبوت مین اور بھی اسی قبیل کے اعتراضات کئے جاتے ہین
لیکن یہ تمام اعتراضات اقبال کے افکار و تصورات، اُن کے نصب العین، اُن کے مقصد شاعری
ذہب کی سیاست، مذہب اسلام، مشرقی قومون خصوصاً مسلمانون کے نزد ان کی تاریخ سے ناواقفیت
ور کلام اقبال پر محدود نظر کا نتیجہ ہین، اگر ان امور کی روشنی مین اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جاے تو یہ سارے
اعتراضات خود بخود دفع ہو جائین گے،

اقبال کے دل مین قوم و وطن کی محبت بھی تھی، لیکن اُن کی قومیت و وطنیت کا تصور محدود

نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی اخوت تھا، اور وہ نسل و وطن کے محدود دائرون کو توڑ کر تمام انسانون کو اخوت کے رشتہ مین منسلک کرنا چاہتے تھے، اور اس کے لئے نسلی اور وطنی قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کی اصلاح ضروری تھی، گو انھون نے جابجا مسلمانون کو مخاطب کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا پیام عالمگیر تھا، ان دونون مین کوئی تضاد نہین ہے، انھون نے جارحانہ جنگ مقابلہ کی کہین تعلیم نہین دی ہے، وہ موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانون کا سیاسی غلبہ و اقتدار نہین چاہتے تھے، اور نہ ان معنون مین اسلامی حکومت کے داعی تھے، بلکہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت سے ان کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت تھی، آیندہ سطور مین ان مسائل پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے گی،

اقبال اور حب قوم و وطن | قوم و وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جس سے انسان کیا حیوان بھی خالی نہین ہین، اس لئے اسلام نے بھی اس کی تعلیم دی ہے جس پر عرب کے فضائل کی حدیثین اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شاہد ہے، بعض ضعیف روایتون مین تو وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربون کی ہدایت و اصلاح کے لئے جو کوششین فرمائین، اور اس راہ مین جو جو سختیان جھیلین، اس سے ہر تاریخ دان واقف ہے، اس سے بڑھ کر آپ کے حب قوم و وطن کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عربون کے انتہائی جور و ستم پر بھی اُن کے لئے آپ کی زبان سے یہی دعا نکلتی تھی، کہ خدایا میری قوم کو راہ راست دکھا کہ وہ اپنا اچھا بُرا نہین سمجھتے، قوم و وطن سے رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام کی محبت کے بہت سے واقعات حدیثون مین موجود ہین، یہ ایک ایسا مسلم مسئلہ ہے جس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہین، اس لئے اگر اقبال کو اسلامی شاعر مان لیا جائے، تو ان کا کلام اور بھی قوم و وطن کی محبت سے خالی نہین ہو سکتا، ورنہ پھر انھین اسلامی شاعر کہنا صحیح نہ ہوگا،

ابتدائی دور مین تو ان پر قومیت اور وطنیت کا اتنا غلبہ تھا کہ انھون نے "نیا شوالہ" اور

ہندی" جیسی حب قوم و وطن مین ڈوبی ہوئی نظمین کہین لیکن پھر موجودہ زمانہ کی نیشنلزم کے نتائج
دیکھنے کے بعد جس کی تفصیل آئندہ آئے گی، اُن کے خیالات بدل گئے، اور انھون نے نسلی اور جغرافی قومیت
وطنیت کے بجائے افکار و تصورات کی وحدت اور انسانی اخوت کی بنیاد پر عالمگیر قومیت و وطنیت
دعوت شروع کی،

لیکن اس کا یہ مقصد نہین تھا کہ ان کی نگاہ مین نسلی اور جغرافی قوم و وطن کی کوئی حیثیت نہین
تھی، اور ان کا دل اس کی محبت سے خالی ہو گیا، اور انھون نے اس کے حقوق نظرانداز کر دیئے
انھون نے اس کے حدود مقرر کر دیئے، اور اس حد کے اندر ان کے دل مین اپنے ملک و قوم کی پوری
ت و محبت تھی، اور وہ ہندوستان کی غلامی پر ویسا ہی دردمند اور اس کی آزادی کے لئے تڑپتا تھا
ی قدر ایک بڑے سے بڑے قوم پرور کا دل تڑپ سکتا ہے، اور یہ محبت و عظمت ہر دور مین یکسان
م ہری نسلی اور جغرافی وطنیت کے بارہ مین اُن کے خیالات ۱۹۱۰ء کے بعد بدل چکے تھے جیسا کہ انکی
مشہور نظم وطن سے ظاہر ہوتا ہے،

اس دور مین مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔۔۔ ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ۔۔۔ تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤن مین بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ہندوستان کی عظمت و محبت | لیکن اس کے بعد بھی قوم و وطن کی محبت انکے دل مین پوری طرح موجود تھی،
کا ثبوت ان کے آخری دور کا کلام ہے، اس دور کا کلام بھی حب قوم و وطن سے خالی نہین ہے، چنانچہ جاوید نامہ مین جو
کی نہایت اہم تصنیف ہے، اور ان کی وفات سے صرف چند سال پہلے لکھی گئی ہے، ہندوستان کے متعلق
نظمین مین جن کے لفظ لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے، ذیل کی نظم مین ہندوستان کی عظمت و محبت

کا کس موثر الفاظ مین اظہار کرتے ہین،

بازگو از ہند و از ہندوستان — آنکہ با کاہش نیرزد آسمان
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خون کردہ ایم — آنکہ یادش را بجان پروردہ ایم

از غم ما کن غم او را قیاس
آہ از معشوق عاشق ناشناس

ان اشعار مین پہلے اور دوسرے شعر خاص طور سے قابلِ توجہ ہین، جن مین ہندو مسلمانون دونون کی زبون حالی کا ماتم ہے،

ہندوستان کی غلامی کا ماتم | ایک دوسری نظم مین ہندوستان کی عظمت کے ذکر کے ساتھ کس درد سے اس کی غلامی پر آنسو بہائے ہین،

می ندانی خطۂ ہندوستان — آن عزیزِ خاطرِ صاحب دلان
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز — درمیانِ خاک و خون غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت — این ہمہ کردارِ آن ارواحِ زشت

اسی نظم مین یہ مشہور شعر ہے،

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن

جاوید نامہ مین عالم بالا مین جو تمثیلی مناظر دکھائے گئے ہین، ان مین ہندوستان کی روح یا مادرِ وطن کی تصویر ان الفاظ مین کھینچی ہے،

آسمان شق گشت و حور پاک زاد — پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نارو نورے لایزال — در دو چشم او سرورِ لایزال

حلۂ در بر سبک تر از سحاب — تار و پودش از رگِ برگِ گلاب

با چنین خوبی نصیبش طوق و بند — بر لبِ او نالہاے دردمند

کیا مادرِ ہند کی اس سے زیادہ پاکیزہ اور محزون تصویر کھینچنا ممکن ہے، اس کے بعد مادرِ ہند کی زبان سے ہندوستان کی غلامی اور غداران وطن کی غداری کا ماتم ہے، یہ نظم طویل ہے، اس لئے صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں، مادرِ ہند نالہ کرتی ہے،

مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش

بر زمانہ رفتہ می بندد نظر — ز آتشِ افسردہ می سوزد جگر

بندہا بر دست و پاے من ازوست — نالہاے نارساے من ازوست

خویشتن را از خودی پرداختہ — از رسومِ کہنہ زندان ساختہ

کے شبِ ہندوستان آید بروز — مرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز

تا ز قیدِ یک بدن وا می رہد — آشیان اندر تنِ دیگر نہد

دینِ او آئینِ او سوداگریست — عنتری اندر لباسِ حیدریست

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر — رسمِ او آئینِ او گردد دگر

از نفاقش وحدتِ قومے دونیم — ملتِ او از وجودِ او لئیم

ملتے را ہر کجا غارتگریست — اصلِ او از صادقے یا جعفریست

الاماں از روحِ جعفر الاماں

الاماں از جعفرانِ این زماں

ہندوستان کی غلامی کے ماتم میں اُن کی بہت سی نظمیں ہیں، ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے، اس لئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا،

ہندو مسلم اختلاف کا غم | اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے، حالانکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی تھے، اور ان کے اختلاف پر ان کا دل غمگین تھا، ایک مستقل نظم میں ہندو مسلمانوں کے اختلاف پر آنسو بہائے ہیں، اور اس کو ہندوستان کی غلامی کا سبب قرار دیا ہے، چند اشعار یہ ہیں،

اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ — زیستن تا کے چنان بے آب و رنگ
پیر مردان از فراست بے نصیب — نوجوانان از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر — خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگران — جاودان مرگ است نے خواب گران
نیست این مرگے کہ آید از آسمان — تخم او بالید از اعماق جان
تا فرنگی قومے از مغرب زمین — ثالث آمد در نزاع کفر و دین
کس نداند جلوۂ آب از سراب — انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

کشمیر اور دوسرے خطوں کی مدح | ہندوستان اور اس کے مختلف خطوں کے فضائل اور تعریف میں بہت سی نظمیں ہیں، ایک نظم میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی

ہند را این ذوق آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد
این برہمن زادگان زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شان خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامنگیر ماست — مطلع این اختران کشمیر ماست

گو اقبال خود نو مسلم کشمیری برہمن[1] تھے، لیکن موتی لال اور جواہر لال بھی کشمیری برہمن ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اس دعوی کی صداقت میں کیا شبہہ کیا جا سکتا ہے،

---

[1] نو مسلم سے مراد یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد کسی زمانہ میں مسلمان ہوئے، ان کو اپنی برہمنیت کا خود اعتراف ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

ہندوستان کے مسلمان شعراء کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ جیحون و فرات کی روانی پر رہتی ہے، لیکن اقبال کی نگاہ میں دریا ے کاویری جیحون و فرات سے زیادہ عزیز تھا، سلطان ٹیپو کی زبان سے کہتے ہین،

رود کاویری یکے نرمک خرام | خستہ، شاید کہ از سیر دوام
در کہستان عمر ہا نالیدۂ | راہِ خود را بہ مژہ کاویدۂ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات | اے دکن را آب تو آبِ حیات

ہندوستان کے صلحار و اخیار سے عقیدت

اقبال کے دل مین ہندوستان کے صلحار و اخیار کی بھی پوری عظمت و عقیدت تھی، جس پر راجچندر جی گوتم بدھ اور گرونانک کی شان مین ان کی نظمین شاہد ہین، راجچندر جی کی عظمت ملاحظہ ہو،

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند | سب فلسفی ہین خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیون کی فکر فلک رس کا ہے اثر | رفعت مین آسمان سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس مین ہوئے ہین ہزارون ملک سرشت | مشہور جن کے نام سے دنیا مین نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز | اہلِ نظر سمجھتے ہین اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی | روشن تر از سحر ہے زمانہ مین شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت مین فرد تھا
پاکیزگی مین جوشِ شجاعت مین فرد تھا

جاوید نامہ مین دوسری پیغمبرون اور صلحار و اخیار کی تعلیمات کے ساتھ گوتم بدھ کی تعلیمات کو بھی اُن کی زبان سے پیش کیا گیا ہے، وہ ایک زنِ رقاصہ کو نصیحت کرتے ہین،

مے دیرینہ و معشوق جوان چیزے نیست | پیشِ صاحب نظران حور جنان چیزے نیست

هرچه از محکم و پاینده شناسی گذرد — کوه و صحرا و بر و بحر کران چیزے نیست

دانش مغربیان فلسفهٔ مشرقیان — همه بتخانه و در طوف بتان چیزے نیست

از خود اندیش و ازین بادیه ترسان مگذر — که تو هستی و وجود دو جهان چیزے نیست

در طریقیکه بنوک مژه کاویدم من — منزل و قافله و ریگ روان چیزے نیست

بگذر از غیب که این وهم و گمان چیزے نیست — در جهان بودن و رستن ز جهان چیزے هست

آن بهشتے که خدائے بتو بخشد همه هیچ — تا جزائے عمل تست جنان چیزے هست

راحت جان طلبی راحت جان چیزے نیست — در غم هم نفسان اشک روان چیزے هست

چشم مخمور و نگاه غلط انداز و سرود — همه خوب است ولی خوشتر ازان چیزے هست

حسن رخسار دمے هست و دمے دیگر نیست

حسن کردار و خیالات خوشان چیزے هست

قدیم ہندوستان کے تاریک دور میں یہاں کی افسوسناک حالت کا نقشہ اور گوتم اور گرو نانک کی اصلاحی کوششیں اور اُن کی روحانی تعلیمات ملاحظہ ہوں،

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یکدانہ کی

آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا — ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی — بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے — دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں — شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا — نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل[1] نے جگایا خواب سے

سوامی رام تیرتھ کی عظمت،

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا

نفسِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے

توڑ دیتا ہے بُتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

جاوید نامہ میں کائنات کے مختلف مسائل وحقائق کے متعلق مولانا روم سے ایک عارف ہندی (جوگی) کے سوالات اور مولانا کے جوابات کا ذکر ہے، یہ مکالمہ بہت طویل ہے لیکن کم سے کم عارف ہندی کے جمال کا درشن کر لیجئے،

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد

موے بر سر بستہ و عریاں بدن
گرد اُو مارے سفیدے حلقہ زن

آدمی از آب و گل بالاترے
عالم از دیر خیالش پیکرے

وقتِ او را گردشِ ایام نے
کار او با چرخِ نیلی فام نے

---

[1] گرو نانک

ان اسرار و حقائق کے متعلق عارف ہندی کے سوالات اور مولانا روم کے جوابات بڑے حکیمانہ ہیں لیکن طوالت کے خیال سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور فلسفی شاعر برتری ہری کی زبان سے اس کا یہ فلسفۂ عمل بیان کیا گیا ہے:

ای خدایانِ تنک مایہ ز سنگ اند و ز خشت | برتر ے ہست کہ دور است ز دیر و ز کنشت
سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نہ رسد | زندگانی ہمہ کردار و چہ زیبا و چہ زشت
فاش گویم بہ تو حرفے کہ ندانذ ہمہ کس | ای خوش آن بندہ کہ بر لوحِ دل او را بنوشت
این جہانے کہ تو بینی اثرِ یزدان نیست | چرخ از تست و ہم آن رشتہ کہ بر دوک تو رشت
پیشِ آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گذار | زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

یہ واضح رہے کہ یہ تمام نظمیں اس دور کی ہیں جب وطنیت اور قومیت کے متعلق اقبال کے خیالات بدل چکے تھے، اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا دل قوم و وطن کی محبت سے خالی تھا لیکن کیا ان نظموں کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا؟

اقبال اور مشرق اقبال کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا سے محبت تھی، اور اس کا دل اس کی زبون حالی پر بھی تڑپتا تھا، انھوں نے ایک مثنوی بھی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے نام سے لکھی ہے جس میں مشرقی قوموں کو خطاب کیا ہے، ایک نظم میں کس جوش و خروش سے ایشیا کے شاندار ماضی، اس کے فضائل و مناقب اور کارناموں اور عالمِ انسانیت پر اس کے احسانات کا ذکر کیا ہے، اور اس کو دنیا کی ہدایت و رہنمائی کرنے کی دعوت دی ہے؛

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست | ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم | شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دین ز خاکِ خاور است | رشکِ گردون خاکِ پاکِ خاور است

وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب | آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
ہر صدف را گوہر نیسان ز ماست | شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست
روح خود در سوز بلبل دیدہ ایم | خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود | زد نخستین زخمہ بر تارِ وجود
داشتیم اندر میانِ سینہ داغ | بر سرِ راہے نہادیم این چراغ
اے زمینِ دولت و تہذیب و دین | آن یدِ بیضا برآر از آستین
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ | نشۂ افرنگ را از سر بنہ

نقشے از جمعیتِ خاور فگن

واستان خود را ز دستِ اہرمن

ذیل کی نظم مین یورپ کی مادیت، لادینی، فریب سیاست اور انسانیت پر اسکے جور و ستم کا پردہ فاش کیا ہے، اور ایشیا کی بیداری اور آزادی کا مژدہ سنایا ہے،

آدمیت زار نالید از فرنگ | زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق | باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید | شب گذشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد | زیرِ گردون رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برہ | ہر زمان اندر کمینِ برہ
مشکلاتِ حضرتِ انسان ازوست | آدمیت را غمِ پنہان ازوست
در نگاہش آدمی آب و گل است | کاروانِ زندگی بے منزل است

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب مین جس مین مشرق کو خطاب کیا گیا تھا

تو کوئی صدا نہ اٹھی، اور بالآخر ایک صدی کے بعد اسی فرزند مشرق نے اس کا جواب دیا، اور بتایا،

ز جانِ بے قرار آتش کشادم | دلے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ او شعلہ زار از نالۂ من | چو برق اندر وجودِ او فتادم

اُن کا دل جس طرح عالم اسلامی اور ہندوستان کی غلامی پر دردمند تھا، اسی طرح ابی سینیا کی غلامی پر رنجیدہ اور پُرغم تھا، چنانچہ اٹلی کو اس کے ظلم پر اس طرح ملامت کرتے ہیں،

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر | ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال | غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ | روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش

اُن کی ان نظموں میں بھی جو خالص ملّی ہیں، مشرق کی محبت کی چنگاریاں نظر آتی ہیں چنانچہ سمرنا کی فتح اور ترکوں کی نشاۃ ثانیہ کو وہ تنہا ایک اسلامی حکومت کی کامیابی نہیں سمجھتے، بلکہ اس میں اُن کو مشرق کی بیداری کے آثار نظر آتے ہیں،

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا | سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی | زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

وہ یورپ کی جمعیت اقوام کی طرح مشرقی قوموں کی جمعیت بنانے کی تعلیم دیتے ہیں، اور اس میں دنیا کی فلاح سمجھتے ہیں،

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر | کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

طہران ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل مین نہ صرف اپنے ملک اور قوم بلکہ پورے ایشیا اور مشرق کی محبت تھی، اور وہ نہ صرف مسلمانون بلکہ ایشیائی قومون کی آزادی اور ترقی کے آرزومند تھے،

یورپ کی نیشنلزم کی مخالفت کے اسباب

البتہ وہ یورپ کی پیدا کردہ نیشنلزم کے جس کی بنیاد نسلی اور جغرافی قومیت و وطنیت بلکہ قوم و وطن پرستی پر ہے، ضرور خلاف تھے، اس لئے کہ یہ قومیت اور وطنیت عالم انسانیت کی دشمن ہے، اور اس سے انسانی وحدت کے بجائے ان مین تفریق اور گروہ بندی پیدا ہوئی ہے، خواہ اس کی ظاہری شکل کتنی ہی دلفریب ہو، لیکن اس کی بنیاد نسلی احساس برتری اور قومی خود غرضی پر ہے، جس کا لازمی نتیجہ کمزور قومون کے حقوق کی پامالی، اُن کی تباہی اور جنگ و خونریزی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طاقتور اور ترقی یافتہ قوم اپنے مقابلہ مین دوسری کمزور قومون کو حقیر اور اس پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتی ہے، اس نسلی قومیت کے جو خونین تماشے صدیون سے دنیا مین ہو رہے ہین، اُن سے ہر شخص واقف ہے، گذشتہ ہولناک جنگ جس کی تباہیون سے اب تک دنیا کو نجات نہین ملی ہٹلر کے نسلی برتری ہی کے نعرہ کا نتیجہ تھی، اس نسلی برتری کے تصور اور قوم پرستی نے نہ صرف مختلف ملکون اور قومون بلکہ ایک ہی قوم مین اشرف و اعلیٰ اور پست و بلند طبقات قائم کردیئے ہین، یورپ اپنے کو ایشیا سے افضل سمجھتا ہے، ایشیا والون کو اہل افریقہ کے مقابلہ مین برتری کا احساس ہے، ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم مین مختلف پست و بلند طبقون کی سب سے بڑی مثال ہندوستان ہے،

دوسرا نتیجہ بین الاقوامی اقتصادی کشمکش ہے، آج ہر طاقتور قوم اپنی اقتصادی اور تمدنی برتری قائم رکھنے کے لئے کمزور قومون کو غلام رکھنا چاہتی ہے، گذشتہ ساری لڑائیان اسی کا نتیجہ تھین،

اسی کے بدولت ایشیا صدیوں تک یورپ کا غلام رہا، اور آج بھی جب کہ یورپ کی سیاسی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اسکو یورپ کی اقتصادی غلامی سے نجات نہیں ملی ہے، اور یہ کشمکش نہ صرف یورپ ایشیا اور افریقہ کے درمیان بلکہ خود ان براعظموں کے مختلف ملکوں اور قوموں کے درمیان بھی اسی طرح جاری ہے، گذشتہ جنگ عظیم میں یورپ اور امریکہ کی حکومتیں جس طرح آپس میں ٹکرائیں، اور جاپان نے اپنے پڑوسی چین کے ساتھ جو کچھ کیا، اور آج یورپین طاقتوں میں جو کشمکش برپا ہے جس نے دنیا کے امن و امان کو خطرہ میں ڈال رکھا ہے، وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہے، اقبال نے اسی دشمن انسانیت قومیت اور وطنیت کی مخالفت کی ہے،

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وحدت و اخوت کی عالمگیر دعوت

اس بنا پر انھوں نے نسلی و جغرافی قومیت اور وطنیت کے بجائے عالمگیر انسانی وحدت اور اخوت و محبت کی دعوت دی جس سے اُن کی کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے، مختلف نظموں کے مختلف اشعار ملاحظہ ہوں،

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم

تیز رنگ و بو بر احرام است که ما پر وردۂ یک شاخساریم

اس سے ظاہر ہو کہ ان کا پیام عالمگیر تھا، اور یہ اعتراض دور ہو گیا کہ اُن کے پیام
[میں] عالمگیریت نہیں ہے اور انھوں نے صرف مسلمانوں کو مخاطب بنایا ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ اُن
[کے] کلام میں جابجا مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ خطاب ہو لیکن اس سے اُن کی تعلیم کی عالمگیریت
[میں] فرق نہیں آتا، اس لئے کہ بعض مخصوص نظموں کے علاوہ جو خاص مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اور
[ان] کی تعداد بہت کم ہے، اُن کی وہ نظمیں بھی جن میں مسلمانوں سے خطاب ہے، اپنے فائدہ کے لحاظ
[س]ے عام ہیں، مثلاً اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ قوموں کے عروج زوال ترقی و تنزل اور موت و
[حی]ات کے فلسفہ پر مشتمل ہے، اس میں اگرچہ مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے لیکن وہ اصول سب قوموں
[کے] لئے یکساں ہیں، انھوں نے خود بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہو کہ ع مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور
یعنی ان اصولوں پر جو بھی عمل کرے گا، وہ کامیاب ہو گا، اس میں مسلم و کافر کی تخصیص نہیں،

اس قسم کی عام تعلیمات سے ان کا کلام معمور ہے اور اس سے ان کے کلام پر نگاہ رکھنے والے
[اچھی] طرح واقف ہیں، اس لئے اس کی مثالوں کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے تاہم اس سے
[انکا]ر نہیں کہ اُن کی بعض تعلیمات مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں، اس کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ
[گذ]شتہ چند صدیوں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیاے اسلام کے مسلمانوں پر عام زوال طاری
[ہو گ]یا تھا، اُن کی حکومتیں مٹ گئی تھیں جو باقی تھیں، وہ بھی با حال زبوں یورپین طاقتوں کے
[پنج]وں میں اسیر تھیں، سیاسی زوال کے ساتھ اُن سے مذہبی روح بھی رخصت ہو گئی تھی، اور اُن
[کی ح]یثیت ایک پسماندہ قوم کی ہو کر رہ گئی تھی، اس لئے اقبال نے اُن کی مذہبی تجدید و اصلاح اور
[سیا]سی حیثیت سے ان کو ابھارنے کی بھی کوشش کی، جو نہ کوئی اخلاقی جرم ہے، اور نہ عالمگیر انسانی
[اخو]ت کے خلاف ہو گاندھی جی سب قوموں کے دوست تھے، ان کا پیام اخوت عالمگیر تھا لیکن اسکے

باوجودہ ہندو قوم اور ہندو مذہب کے سب سے بڑے محسن تھے، اور انھون نے ان دونون مین دوبارہ جان ڈالی، اس لئے اقبال کی مسلمانون کی مذہبی و سیاسی تجدید و اصلاح کی کوشش کیون فرقہ پرستی پر محمول کیا جائے جب کہ ان کے کلام مین عالمگیر انسانی اخوت کی دعوت بھی موجود ہے، دوسرا سبب آخر مین بیان کیا جائیگا

کیا اقبال نے مسلمانون کے حصول قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی، یہ اعتراض بھی کہ اقبال نے اس زمانہ مین جب کہ دنیا امن و سکون کو ترستی ہے، مسلمانون کو حصول قوت اور جنگ و خونریزی کی تعلیم دی بالکل غلط یا کم از کم غلط فہمی پر مبنی ہے، ان کے بعض اشعار سے جو خاص مقصد کے ماتحت کہے گئے ہین کلیۃً قاعدہ بنا لینا صحیح نہین ہے، اگر کچھ اشعار مین حصول قوت اور جنگ و مبارزت کی تعلیم ہے، تو سیکڑون اشعار مین اخوت و محبت اور امن و صلح کی بھی دعوت ہے، اولاً حصول قوت اور جنگ و مبارزت دو الگ الگ چیزین ہین، حصول قوت کے معنی جنگ کے نہین ہین، انھون نے مسلمانون کو حصول قوت کی ضرور تعلیم دی ہے، لیکن اس کا سبب مسلمانون کا زوال اور ان کی تباہی ہے جس کے اور اسباب مین سے ایک بڑا سبب ان کا ضعف بھی ہے، اس لئے حصول قوت کی تعلیم جنگ و مبارزت کیلئے نہین بلکہ بقاے حیات کے لئے ہے، اس کو جارحانہ قوت پر محمول کرنا صحیح نہین صدیون کے زوال سے مسلمانون کے قوائے عمل بالکل شل ہو گئے تھے، ان مین جان ڈالے بغیر مسلمان زندہ نہین رہ سکتے تھے، یہ تو نہ صرف سیاسی بلکہ طبعی مسلمات مین سے ہے، کہ کوئی قوم، بلکہ دنیا کی کوئی ہستی قوت کے بغیر زندہ نہین رہ سکتی،

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوی ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

دوسرے ہر شر اور بدی کا مقابلہ ہمیشہ وعظ و پند اور نیکی و اخلاق سے نہین کیا جا سکتا، اور کبھی کبھی علاج بالمثل ناگزیر ہو جاتا ہے، بدی کے بدلہ مین نیکی اور دشمنی کے بدلہ مین محبت کا اصول کتنا ہی روحانی اور دلفریب کیون نہ ہو، ہر موقع پر کامیاب نہین ہو سکتا، دنیا مین کتنے انسانون نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم پر عمل کیا، آج بھی امن و صلح کی زبانی تجویزون کا حشر سب کو معلوم ہے، درحقیقت

جب شر اور بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں اخلاقی وعظ و پند سے نہ رکیں تو اُن کا مقابلہ قوت سے ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، شر کے مقابلہ کے لئے شر کی بظاہر جو شکل اختیار کی جاتی ہو وہ شر نہیں بلکہ درحقیقت خیر بن جاتی ہے، تندرست انسانی جسم میں سوئی چبھونا بھی جرم ہے لیکن جب جسم کا کوئی حصہ ماؤف ہو جائے، تو پوری جسم کی حفاظت کے لئے ماؤف حصہ میں نشتر دینا بلکہ بعض اوقات اس کو کاٹ کر الگ کر دینا ضروری ہو جاتا ہے، اور یہ شر انسان کے لئے خیر بنجاتا ہے، یہی اصول اقوام کے خیر و شر کے لئے بھی ہے، اس لئے اگر بدی اور ظلم و جور کی طاقتیں آمادہ فساد ہوں تو انسانیت کی بھلائی کے لئے اس کا مقابلہ طاقت سے ضروری ہے، ہٹلر اور مسولینی کو دنیا نے مسیحیت کا ایک وعظ بھی شر و فساد سے نہ روک سکا، اور بالآخر قوت ہی سے اُن کو زیر کرنا پڑا، اس لئے حصول قوت اور خاص ناگزیر حالات میں جنگ و مقابلہ کی تعلیم امن و صلح کے خلاف نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے، اس لئے اقبال نے اخوت اور محبت اور امن و صلح کی بھی تعلیم دی ہے، اور حصول قوت کی بھی اور شر اور ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی، دونوں دو مختلف حالتوں کے لئے ہیں، دوستوں امن پسندوں اور نیکی اور بھلائی کے مقابلہ میں مہر و محبت اور امن و صلح کی تعلیم ہے،

> اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
> یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
>
> اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشان کو
> وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
>
> بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
> سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

اُن کے کلام میں اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں لیکن ظلم و جور کے مقابلہ میں جنگ و مقابلہ کی بھی تعلیم ہے،

> اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
> کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
>
> گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے
> کنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

کیا انھوں نے جہاں بھی جنگ و مقابلہ کی تعلیم دی ہے ہمیشہ ظلم و جور کے مقابلہ میں ہے امن و صلح کے مقابلہ میں نہیں ہے، مہر و محبت، امن و صلح اور جنگ و مبارزت کے بارہ میں اُن کا اصول حسب ذیل اشعار سے واضح ہوگا،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس توازن کے بغیر حق و انصاف، امن و امان بلکہ دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، حضرت مسیح علیہ السلام کی محض امن و صلح اور مہر و محبت کی تعلیم کی سب سے زیادہ مخالفت خود اُن کی امت کر رہی ہے، اس لئے کہ یہ تعلیم خلافِ فطرت ہے،

لیکن جس طرح مطلق مہر و محبت کی تعلیم خلافِ فطرت ہے، اسی طرح مطلق قوت بھی مضر ہے، اس لئے اقبال اس کیلئے اخلاقی قیود کا پابند ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اور مطلق طاقت کو وہ چنگیزی اور زہرِ ہلاہل سے تعبیر کرتے ہیں،

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس لئے وہ قوت کو مذہب و اخلاق کا پابند بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کو شجاعت کے ساتھ

عدل و صداقت کی بھی تعلیم دیتے ہیں،

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس سے ظاہر ہوا کہ اُن کے نزدیک شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت ضروری ہے، اور ایسی شجاعت

ہی دنیا کے لیے سراسر خیر و برکت ہے، ان کے نزدیک اصل قوت ایمان عمل اور محبت ہے،

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اُن کی تعلیم قوت کے سلسلہ میں اُن کے تمثیلی پرند شاہین پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے

نوجوانوں کو شاہین بننے کی تلقین کی ہے، جو ایک شکاری پرندہ ہے، لیکن درحقیقت اس تمثیل کا مقصد

قناعت طلبی و تن آسانی عیش و تنعم اور جمود و تعطل کی مخالفت اور جہد و عمل، سادگی و جفاکشی، اور بلند حوصلگی

کی تعلیم ہے، جیسا کہ خود اُن کی نظم شاہین سے ظاہر ہے۔

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا　　جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو　　ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل　　نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم　　ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں　　کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا　　مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

یہ اشعار خود اپنے مقصد کے ترجمان ہیں، ان کے بعد کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہجاتی یہ اقبال

کے کلام سے اس اعتراض کا جواب ہوا، انھون نے ایک خط مین بھی اس کا جواب دیا ہے، مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کو کسی اعتراض کے جواب مین لکھتے ہین،

"معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی مین جنگ کا حامی ہے، غلط ہے، مین جنگ کا حامی نہین ہون، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے، قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتین ہین، محافظانہ اور مصلحانہ، پہلی صورت مین یعنی اس صورت مین جب کہ مسلمانون پر ظلم کیا جائے، اور ان کو گھرون سے نکالا جائے، تو مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ کہ حکم، دوسری صورت جس مین جہاد کا حکم ہے، ۹-۴۹ مین بیان ہوئی ہے، ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس مین (Collective Security) کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے، اگر گذشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین ان آیات پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا مین جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج صدیان گذر گئی ہوتین، جمعیت اقوام جو زمانہ حال مین بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے، کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو، امن عالم کی کوئی سبیل نہین نکل سکتی، جنگ کی مذکورۂ بالا صورتون کے سوا مین اور کسی جنگ کو نہین جانتا، جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا اسلام مین حرام ہے، علیٰ ہذا دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے، شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہین، اس جانور مین اسلامی فقر کے تمام خصائص پائے جاتے ہین، خوددار و غیرتمند ہے، کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہین کھاتا، بے تعلق ہے، کہ آشیانہ نہین بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے" (مکاتیب اقبال جلد اول ص ۲۰۳، ۲۰۵)

ان تصریحات سے حصول قوت اور جنگ و مقابلہ کے بارہ مین اقبال کا نقطۂ نظر پوری طرح ا ہو جاتا ہے،

(باقی)

ایک علمی خوشخبری

عربی ادب کے ایک نایاب گنجینے کی دستیابی

از

مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

دوسری صدی ہجری کے اعلیٰ درجہ کے شعراء مین بشار بن برد مادرزاد نابینا ہوتے ہوئے بھی …رین شاعر تسلیم کیا گیا ہے، وہ کثیر الشعر بھی تھا، اور اس کا کلام بھی مقبول ہوا، لیکن وہ اعتنا… …ل نہ کرسکا، جس کا وہ مستحق تھا، اس کا سبب اس کی لامذہبی کا چرچا، بیباکی اور برسراقتدار جماعت …ساتھ اس کا سیاسی اختلاف تھا، اس لئے اس کے اشعار کی پوری حفاظت نہین ہوئی، اور اس کے دیوان کا وجود مشکوک ہی رہا، سیف الدولہ کے دربار کے دو شاعرون نے جو بھائی بھائی تھے، اور …یان لکھے جاتے تھے، اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا، جس کی شرح پانچوین صدی کے ایک ادیب …ل بن احمد نے لکھی تھی، یہ متن اور شرح بھی گوشۂ گمنامی مین پڑگئے، اور بجز کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد …ی کے کہین ان کا سراغ نہین ملتا، راقم الحروف نے اس مجموعے کی خدمت کی، اور مصر کی لجنۃ التالیف نے ۱۹۳…ء مین اس کو شرح المختار من شعر بشار کے نام سے شائع کیا،[1]

جیسے ہی یہ کتاب شائع ہوئی، میرے محترم دوست اور نامور مستشرق ڈاکٹر کرنیکو نے کیمبرج سے

---

[1] …ریویو کے لئے ملاحظہ ہو معارف ماہ اپریل ۱۹۳۶ء

مجھے بشار کے دیوان کے وجود کی خوشخبری سنائی، اُن کے خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء کا اقتباس درج ذیل ہے :-

"آج مجھے ٹیونس کے شیخ الاسلام اور وزیر عدالت سیدی محمد الطاہر بن عاشور کا خط ملا ہے، انھوں نے شرح المختار کا ایک نسخہ خریدا ہے اور ان کے ذاتی کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ دیوان بشار کا موجود ہے، جس کی وہ شرح لکھ رہے ہیں، مشکوک مقامات پر وہ میری مدد کے خواہاں ہیں اور شرح کی تکمیل کر کے جلد شائع کرنے کا قصد ہے"

اس اطلاع پر میں نے براہ راست شیخ کو دیوان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے خط لکھا غالباً یہ وہی دیوان ہے جس کا ذکر دمشق کے مجلۃ المجمع العلمی العربی ماہ کانون اول ۱۹۲۹ء میں آیا تھا، (ملاحظہ ہو ص ۱۲-۱۱۷) لیکن اس وقت میری تمام کوششیں مزید معلومات کے حصول میں بے سود ثابت ہوئیں، تاہم شیخ نے میرے خط کا جواب دیا، اور میری ان کی خط و کتابت جاری ہو گئی، اپنی کچھ تصانیف بھی انھوں نے بھیجیں، جو قدیم طرز پر بعض قصائد کی شروح تھیں، بشار کے دیوان پر میرے کام کی نوعیت شیخ کے کام سے مختلف ہونے کی بنا پر میں نے اُن سے عرض کیا کہ اس میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے اسلئے وہ اس کی نقل یا عکس مجھ کو دیدیں، شیخ اس کو ملطائف الحیل ٹالتے رہے، اور میں اصرار کرتا رہا کہ اس میں چار سال گذر گئے، اسی درمیان میں جنگ عظیم شروع ہو گئی، اور غیر ممالک سے کلی انقطاع ہو گیا، جنگ کے ختم ہونے پر پھر مجھے دیوان بشار کی یاد تازہ ہوئی، اس کے لئے شیخ کا حال معلوم کرنا ضروری تھا، چنانچہ متعدد ذرائع سے پتہ چلانا چاہا۔ مگر جب کامیابی نہ ہوئی، تو خود اُنہی کے نام سابق پتہ پر خط لکھا جس کا جواب انھوں نے دیا، اور لکھا کہ اب وہ شیخ الجامعۃ الزیتونیہ ہیں، اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر کے خوشی ہوئی، یہ وقت تھا، کہ میرا مرتب کردہ دیوان ابن ورید مصر کی لجنۃ التالیف میں زیر طبع تھا، اس کا ایک نسخہ

شیخ کو نذر کرنے کا وعدہ کرکے پھر اپنی پرانی خواہش کا اعادہ کیا، اس پر انھون نے اپنی تصنیف مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ مجھے بھیجی، اور دیوان کے متعلق لکھا کہ اُن کی شرح چھپنے کے لئے لجنۃ التالیف مین گئی ہے، اصل دیوان بھی اسی کے ساتھ ہے، اور فوٹو کی انھون نے اجازت دے دی، اُن کی ہدایت کے موافق مین نے لجنۃ کے صدر پروفیسر احمد امین کے نام متعدد خطوط بھیجے، جو سب کے سب ضائع ہوگئے، مجبوراً دہلی کے سفیر مصر کا ذریعہ اختیار کیا، اس ذریعہ سے شیخ کو خط مل گیا، اور اسی کے جواب مین انھون نے لکھا کہ اس سے پیشتر میرا کوئی خط اُن کو نہین ملا، اور دیوان کا فوٹو بخوشی تیار کرنا منظور کیا، مین نے شیخ کی یہ تحریری اجازت لجنۃ التالیف کے پاس بھیج دی، اور جولائی ۱۹۴۹ء مین فوٹو لینے کا کام شروع ہوگیا، خدا کا شکر ہے کہ پندرہ سال کے بعد یہ علمی آرزو پوری ہوئی، اور ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو دیوان بشار کا عکسی نسخہ میرے ہاتھ مین آگیا،

الحمد للہ ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آمد آخر زپس پردۂ تقدیر پدید

بشار کا دیوان معدوم ہونے کا خیال مختلف اشخاص کے لئے اس کے اشعار جمع کرنے کا باعث ہوتا رہا۔ دور حاضر مین آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے اپنا وقت اس کام مین صرف کیا تھا، انھون نے اپنا مجموعہ بعینہٖ مجھکو دینے کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن ایفا سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا، شیخ محمد الطاہر نے مجھے لکھا تھا کہ آٹھ سو اکیاون [۸۵۱] اشعار انھون نے جمع کئے ہین، اور دو مجموعے مصر سے بھی شائع ہوئے، ایک احمد حسنین القرنی کا جس کے اشعار کی تخریج ڈاکٹر کرنکوتے کی تھی، اور دوسرا حسین منصور کا، شرح المختار کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مین نے بھی تمام عربی لٹریچر کو کھنگال کر تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار جمع کئے،

شیخ کے شمار کے مطابق اس دیوان کے دو سو چھبیس اوراق مین جو سات ہزار آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہین،

خط قدیم مصری ہے، کوئی تاریخ درج نہیں، مگر خط کا انداز شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر کی تحریر ہے، شروع میں نہ کسی روایت کا پتہ ہے اور نہ کوئی سند درج ہے، بشار کے نسب سے کلام کا آغاز بترتیب قوافی کیا ہے، بحیثیت مجموعی نسخہ صاف ہے، بعض مقامات پر پانی پہنچ جانے کی وجہ سے حروف کچھ مٹ گئے ہیں، بیچ میں قدرے خرم بھی ہے، سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ صرف قافیۃ الراء تک ہے، جہاں جلد اول تمام ہوتی ہے، لیکن موجودہ حالات میں جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے کیونکہ تقریباً آٹھ ہزار اشعار کا مہیا ہو جانا کہیں اور سے غیر ممکن ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر کرینکو اور مصر کے نامور اور جامع صاحب قلم مختلف حیثیتوں کے جامع اللہ قدیم محترم دوست پروفیسر ڈاکٹر احمد امین بک مدیر ادارہ ثقافیہ جامع الدول العربیہ کا شکر ادا کرنا لازم ہے، اور مسلم یونیورسٹی کے علم دوست وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کا شکر ادا کرنا بھی میرے لئے ضروری ہے، جنھوں نے انداہ ادب نوازی فوٹوگراف کا خرچ منظور فرمایا،

تلخیص و تبصرہ

فن خطابت

ذیل کارنیجی امریکہ کا مشہور و معروف ماہر نفسیات ہے اس کے ایک تازہ مقالہ کی تلخیص جو فن خطابت پر ہے، ذیل مین درج کی جاتی ہے،

جب کسی مقرر کا کسی موضوع پر بولنے کا ارادہ ہو تو وہ اس وقت تک نہ بولے جب تک کہ اس کو اس موضوع سے پوری واقفیت نہ ہو، اور پوری واقفیت ہی رکھنا کافی نہین ہے، بلکہ اس موضوع سے اس کو پوری دلچسپی بھی ہو، اور ایسی دلچسپی کہ اس موضوع کے متعلق جو کچھ بھی جانتا ہو، اس کو سامعین تک پہنچانے کے لئے غیر معمولی خواہش بھی رکھتا ہو،

کوئی تقریر بھی دس منٹ یا دس گھنٹے مین تیار نہین کی جاسکتی ہی اس کے لئے دس سال چاہئین،

ایک خاتون نے فن خطابت کے درجہ مین داخلہ لیا، کچھ ہی دنون کے بعد اس کو تقریر کرنے کے لئے کہا گیا، لیکن وہ کسی عام مجمع مین تقریر کرنے سے گھبرائی، اس کا خیال تھا کہ کسی مجمع مین تقریر کرنے کیلئے غیر معمولی صلاحیتین چاہئین، جو اس مین موجود نہین ہین، لیکن اس کے باوجود اس کو ایک برجستہ تقریر کرنے کے لئے کہا گیا، اور جب وہ تقریر کرنے لگی، تو تقریر کے دوران مین سامعین مبہوت اور دم بخود سے ہو گئے، اس کا موضوع "میری زندگی کا عظیم ترین تاسف" تھا، تقریر کو مشکل سے چھ منٹ گذرے تھے کہ سامعین کی آنکھین اشکبار ہوگئین، خاتون نے تقریر مین کہا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا افسوسناک واقعہ یہ کہ مین ماں کی محبت و شفقت سے محروم رہی، میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب مین چھ سال کی تھی، میری پرورش میرے مختلف رشتہ دارون نے کی جو اپنے بچون کی دیکھ بھال مین ایسے منہمک رہتے تھے

کہ میری طرف ان کو توجہ کرنے کی مطلق فرصت نہ ملتی تھی، ان رشتہ دارون مین سے کسی ایک کے پاس زیادہ دنون تک نہین رہ سکی، اس لئے کہ ان مین سے کسی کو بھی میری ذات سے کوئی دلچسپی نہین تھی، اور نہ کسی نے مجھ سے کسی قسم کی شفقت کا اظہار کیا، اور مین محسوس کرتی تھی کہ مین اپنے رشتہ دارون پر بار ہون، جب مین سونے کو جاتی، تو تنہا ہوتی، اپنی تنہائی سے گھبرا کر رونے لگتی، میری بے حد خواہش ہوتی کہ اسکول سے میرے متعلق جو رپوٹ آتی اس کو کوئی دیکھنے والا ہوتا، لیکن کوئی اس کو نہ دیکھتا، اور نہ کسی کو اس کی پروا ہوتی، ایک چھوٹی بچی کی حیثیت سے مجھ مین یہ جذبہ پیدا ہوتا کہ کوئی مجھ کو پیار کرتا، کوئی محبت سے پیش آتا، کوئی شفقت کا اظہار کرتا، لیکن ان تمام باتون سے محروم رہی،

یہ سوچنے کی بات ہو کہ اس خاتون نے اس تقریر کی تیاری مین دس سال بلکہ بیس سال صرف کئے، اور جب وہ بچپن مین سوتے وقت تنہائی مین رویا کرتی تھی، تو گویا اسی وقت سے وہ اس کی تیاری کر رہی تھی کہ جب اس کو موقع ملے گا تو اپنے ان جذبات کا اظہار کرے گی، چنانچہ جب اس کو موقع ملا، تو اس کے یہ اندرونی جذبات تقریر مین اس طرح ظاہر ہوئے کہ سامعین مسحور ہو کر رہ گئے،

عام طور پر وہی تقریر بے جان ہوتی ہے جو لکھ کر یاد کی جاتی ہے، اور اس کے یاد کرنے مین پسینہ بہایا جاتا ہے، ایسی تقریر حصول مقصد مین بے کار ثابت ہوتی ہے، بہت ممکن ہو کہ ایک شخص جس مین تقریر کرنے کی بالکل صلاحیت نہ ہو، اگر ایسے موضوع پر بولنے کی کوشش کرے جس مین وہ خاص طور پر متاثر ہے، تو عجب نہین کہ وہ ایک موثر اور کامیاب تقریر کر سکے،

مبتدی مقررون کو ان باتون کا لحاظ مطلق نہین ہوتا، وہ اپنے موضوع کی تلاش کسی کتاب یا رسالے مین کرتے ہین، ایک اور خاتون نے فنِ خطابت کے درجہ مین داخلہ لیا، لیکن وہ اس مین کوئی ترقی نہین کر سکی تو اس نے ایک ماہرِ فن سے اپنی بددلی کا اظہار کیا، ماہرِ فن نے پوچھا کہ آخر بار اس نے کس چیز پر تقریر کی تھی، خاتون نے جواب دیا کہ اس کا موضوع تھا کہ کیا مسولینی حبش پر حملہ کرنے مین حق بجانب تھا، ماہرِ فن نے

...ل کیا کہ اس موضوع سے اس کو کوئی دلچسپی بھی تھی، اُس نے نفی میں جواب دیا، پوچھا گیا تو پھر اس پر
...نے تقریر ہی کیوں کی، بولی کہ مجھکو آخر کسی چیز پر بولنا ہی تھا، اس لئے یہی موضوع منتخب کر لیا، ماہر فن
...نا کہ اگر اس کو بولنا ہی تھا، تو اس کے لئے یہ زیادہ مناسب موضوع ہوتا کہ وہ بچوں کی پرورش کس
...ح کر سکتی ہے، یا خریداری کے وقت روپیوں کا بہترین مصرف کس طریقہ سے لے سکتی ہے، اس کو سنکر
...ین زیادہ متاثر ہو سکتے تھے، کیونکہ ان کو اس کا پورا احساس تھا کہ وہ خود مسولینی کے حبشہ پر حملہ کے
...کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھ سکتی ہو، اس لئے ان کو تقریر سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی،

عام طور پر مبتدی مقرروں کا حال مذکورۂ بالا خاتون ہی کی طرح ہوتا ہے، وہ ہر موضوع پر بولنے
...شش کرتے ہیں، اس کا لحاظ مطلق نہیں رکھتے کہ ایسے ہی موضوع پر بولیں جس سے یا توان کو
...ی واقفیت ہو، یا جو کچھ کہیں اس پر اُن کو خود پورا یقین وعقیدہ ہو،

اگر واقعی کوئی شخص فن خطابت میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کو اپنے خاص خاص تجربات
...نے کی کوشش کرنا چاہئے، مثلاً "میری زندگی کا عظیم ترین ناسست" "میرا عظیم ترین حوصلہ" "مجھکو اسکول کی
... کیوں پسند یا نا پسند تھی" یا اور اسی طرح کے موضوع زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں، جو شخص اس قسم کے
...ع پر بولنا شروع کرے گا تو بہت جلد اس میں خود اعتمادی اور جرأت پیدا ہوتی جائے گی، اس
...فتہ وہ دوسرے موضوع پر آسانی سے تقریر کر سکے گا، پھر اس کو موضوع کی تلاش کرنے کی
...ت نہیں ہوگی،

ایک بار ایک ٹیلیفون کمپنی کے کام کرنے والوں سے یہ کہا گیا کہ اُن کے ذہن میں جو بھی خیال
...اس کو تقریر میں پھیلا کر بیان کریں، اُن میں سے ایک شخص سے جس نے کلنڈر میں یوم تشکر کے کچھ
...کو تھے جب تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تو اُس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کن کن چیزوں پر وہ
...اظہار تشکر کر سکتا ہے، ایک دوسرے شخص نے سڑک پر کچھ کبوتروں کو دیکھا تھا، اس کو کبوتر پر

تقریر کرنے کا شوق ہوا، چنانچہ اس نے کبوتروں کے متعلق بہت سی معلومات جمع کیں، اور جب اس موضوع پر اس نے تقریر کی تو کبوتروں سے متعلق اتنی باتیں اور ایسے دلچسپ انداز میں بتائیں کہ سامعین کبھی نہیں بھولے ہوں گے، لیکن ان تمام تقریروں میں جس شخص کی تقریر پر انعام ملا اس کا موضوع "کھٹمل" تھا، اس نے ایک شخص کے کالر پر "کھٹمل رینگتے" دیکھا، اس لئے اس کو کھٹمل سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ اس نے کھٹمل کے متعلق کتابیں دیکھ کر اتنی باتیں معلوم کر لیں کہ جب اس کی تقریر ہوئی تو اتنی پسند کی گئی کہ لوگ اس کو کبھی نہیں بھول سکتے،

شروع میں دنیا کے اہم مسائل مثلاً ایٹم بم وغیرہ پر تقریر کرنے کی کوشش کرنا بالکل بے کار ہے ابتدائی دور میں سیدھے سادے موضوع پر بولنا چاہئے، موضوع ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے، جس سے بولنے والے کو واقعی دلچسپی ہو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ طبیعت پر جبر کرکے دلچسپی پیدا کی گئی ہو،

فن خطابت میں حسب ذیل سات چیزوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱۔ کسی تقریر کو کبھی لکھنا نہ چاہئے، جب لکھی جائے گی تو اس میں روزمرہ بول چال کے سادہ آسان الفاظ کے بجائے، ادب و انشاء کے الفاظ و فقرے منہ سے نکلیں گے، اس کے علاوہ جب کوئی شخص رٹی ہوئی تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے، تو اس کے ذہن پر یہ بڑا بار ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ یاد کیا ہے وہ حافظہ میں محفوظ رہے، اور سامعین کو سنا دے، اس طرح تقریر فطری اور برجستہ نہیں ہو سکتی،

۲۔ اگر تقریر یاد بھی کی جائے تو اس کو لفظ بہ لفظ نہیں رٹنا چاہئے، اس طرح کی رٹی ہوئی تقریر کا بھول جانا یقینی ہے، اور جب کوئی مقرر رٹی ہوئی تقریر بھول جاتا ہے تو سامعین ہنستے ہیں، کیونکہ وہ مصنوعی تقریر کا سننا پسند نہیں کرتے ہیں، اور اگر رٹی ہوئی تقریر نہ بھی بھولے تو بھی سامعین کو اس کی آنکھوں اور اس کی آواز سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوتے پاتا۔ ہاں اگر اس کا شبہ ہو کہ تقریر کرتے وقت بعض باتیں ذہن سے اتر جائیں گی، تو ایک کاغذ پر وہ خاص خاص باتیں نوٹ کرنے میں مضائقہ

نہیں اور تقریر کے دوران میں اس پر سرسری نظر ڈالتے رہنا چاہئے،

۳۔ اگر تقریر کو دلچسپ بنانا ہو تو اس کے لئے دلچسپ مثالیں اور قصے بیان کرنا ضروری ہے،

۴۔ جب کوئی شخص کسی موضوع پر تقریر کرنا چاہے، تو اس پر اس کے معلومات بہت ہی وسیع ہونے چاہئیں تاکہ سامعین کو یہ اندازہ ہو کہ مقرر کے پاس موضوع سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے، اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بہت مستند ہے،

۵۔ تقریر کرنے سے پہلے اس کی تیاری اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس موضوع پر بے تکلف دوستوں سے بار بار گفتگو کی جائے، اس گفت گو سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ کن باتوں سے سامعین دلچسپی لیتے ہیں کس قسم کی رائے سے وہ متاثر ہوتے ہیں، اور کس قسم کی ظرافت سے لطف اٹھاتے ہیں، جو تقریر غسلخانے کے آئینہ کے سامنے تیار کی جاتی ہے، اس سے سامعین کی نفسیات کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے،

۶۔ تقریر شروع کرتے وقت اس کا خیال مطلق نہیں کرنا چاہئے کہ لب ولہجہ کیسا ہونا چاہئے، طریقہ کیا ہو، چہرہ کا انداز کیا ہو، آواز کیسی ہو، آواز میں کہاں پر گرمی اور کہاں پر نرمی ہو، ان باتوں کو سوچنا فضول ہے، گو ان پہلوؤں پر بھی بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن یہ سب لغو ہے تقریر کرتے وقت ان تمام باتوں کو بھول جانا چاہئے، صرف یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تقریر میں کیا کہنا ہے،

سامعین کے سامنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے برسوں تعلیم وتربیت کی ضرورت نہیں، جب کبھی مقرر کو کسی بات پر غصہ آجاتا ہے یا وہ کسی بات پر اپنی ذلت محسوس کرتا ہے یا اس کو تنگ کیا جاتا ہے، تو اس کی تقریر خود بخود عمدہ ہو جاتی ہے، اس لئے جذبات کے اظہار کا لب ولہجہ کھڑے ہونے کا انداز اور چہرہ کی رنگت خود بخود درست ہو جاتی ہے،

امریکہ کے ایک بحری افسر نے تقریر کے درجہ میں داخلہ کرایا، وہ بڑی سے بڑی بحری لڑائی لڑنے میں بالکل نڈر رہتا لیکن مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنے میں بے حد خوفزدہ ہو جاتا، اپنے درجہ

مین بھی اس کو تقریر کی ہمت نہ ہوتی، اس کے استادون کے ذہن مین اس کی اصلاح کے لئے یہ بات بن آئی کہ درجہ مین ایک اشتمالی (کمیونسٹ) بھی تھا، استادون نے چپکے سے اشتمالی سے کہدیا کہ تم درجہ مین یہ تقریر کرو کہ امریکہ کی ریاستہاے متحدہ مین ایک انقلاب کی ضرورت ہے، اس انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلحہ لیکر واشنگٹن کی طرف کوچ کرین اور صدر کو گولی مار کر اشتمالی حکومت قائم کرین" اشتمالی نے موثر طریقہ سے یہ تقریر کر دی، بحری افسر کو تقریر سنتے وقت غصہ آگیا، اور تقریر کے درمیان ہی مین یہ کہکر اشتمالی کو روکا کہ یہ صریحًا باغیانہ تقریر ہے، جو کسی حال مین برداشت نہین کیجا سکتی، پھر وہ مسلسل بولنے لگا کہ ریاستہاے متحدہ کے صدر نے اس ملک اور اس آزادی کے لئے کیا کچھ نہین کیا ہے، اس کی تقریر بڑی آتشین ہورہی تھی، اسی درمیان مین بحری افسر کے استاد نے کہا، امیرالبحر مبارک ہو کیسی عمدہ تقریر تم کر رہے ہو، بحری افسر جھجکا، اور اس نے کہا مین کوئی تقریر نہین کر رہا ہون، بلکہ اس اشتمالی کو سبق دے رہا ہون۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب مقرر کو غصہ آجاتا ہے تو مجمع کا رعب اور خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے، اور وہ لب ولہجہ کے خیال سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور جن چیزون سے لب ولہجہ درست ہوتا ہے وہ اندرونی طور پر خود کار فرما ہو جاتی ہین،

۷۔ تقریر کرتے وقت کسی مقرر کی ریس کرنے کی کوشش کرنا بالکل فضول ہے، جس تقریر سے مقرر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے، وہ زیادہ موثر ہوتی ہے، آج تک کوئی شخص کسی کی پوری نقالی نہین کرسکا ہے، اس لئے تقریر اچھی ہو یا بری، اپنی شخصیت کی آئینہ دار ہونا چاہئے، اگر یہ اپنے تجربات اور معتقدات پر مبنی ہے تو بہت بہتر ہے،

"ص ع"

موت العالم

از مولانا سید محمد یوسف بنوری مدرس دار العلوم ڈابھیل

"مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری مدرس دار العلوم ڈابھیل عربی زبان کے ممتاز ادیب ہیں، ان کو اس کی نثر و نظم پر پوری قدرت حاصل ہے کئی سال ہوئے انھوں نے نفحۃ العنبر کے نام سے حضرت شیخ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری عربی مین لکھی تھی، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے وہ تلمیذ رشید ہیں، اس لئے ان کی وفات پر انھوں نے اپنے تاثرات عربی نظم مین ظاہر کئے ہیں، اس تاریخی مرثیہ کو ان ناظرین کیلئے جنکو عربی زبان و ادب سے ذوق ہے شائع کیا جاتا ہے، اس کے ترجمہ سے صفحات کی تعداد دونی ہو جاتی جس کی گنجایش نہین ہے، اور جس طبقہ کے لئے اسکو شائع کیا جاتا ہے اسکے لئے ترجمہ کی ضرورت بھی نہین ہے" (م)

یا عین جودی بفیض الدمع کالدیر	جودی بدمع فلا تبقی ولا تذر
جودی بدمع غزیر هامر هطل	یزری بمزن همی من صیب المطر
جودی بدمع سخی هائم قلق	جودی بفیض شئون غیر مدخر
أحری العیون بأن تذری مدامعها	عین بکت خطبها من غیر مصطبر
انعی الیک اماماً عالماً فطناً	شیخاً کبیراً جلیل القدر والخطر
انعی الیک وحید الدهر عالمه	بحراً محیطاً ملیئ القعر بالدرر
شبیر احمد شیخ القوم قدوتهم	دعاه رب کریم واسع القدر

لبّا الأہا کو نیّما اذ دعاہ ضحیً　　ضیفاً نزیلاً غریباً راح فی سفر

محدّثٌ بارعٌ مفسّرٌ مدرّسٌ　　حبرٌ کبیرٌ دقیقُ البحث والفکر

علامۃٌ ذکیٌ فہامۃٌ لسنٌ　　روض انیق جمیل النَّور والزّہر

محقق العصر فی علم وفی حکم　　محنک الدہر فی صعب وفی حصر

فی قلبہ علم قرآن وحکمتہ　　یبدی معارفہ فی کل محتضر

کم من مشاکل علم غاص لجتہا　　وحلہا بدقیق الفکر غیر مقتصر

کم من دقائق بحث قام یکشفہا　　کم من حقائق ابدت دقۃ النظر

اذا ارتقی فی أعالی الراح لہ　　مافی الضیوب ھُنا من کل مستتر

تریک نور اللہ کا سیماء غرتہ　　اذا تبلج فی مستصعب الخبر

مفکر طال ما اشجت بدائعہ　　أولی النُّھی ببدیع الرأی کالزہر

مدبر طالما ازھت محاسنہ　　فی کل معترک من کل مُستَعر

حلم ووقار أناءۃ تزینہ　　خطابۃ منطق کاللؤلؤ المنتثر

غور و فکر فراستہ وحلیتہ　　خطابہ فی الندی عقد من الدرر

اضحت لخطبۃ الالباب حائرۃ　　تری سکاری رحیق النطق من سکر

یموج موجاً کموج البحر ملتطماً　　اذ قام حبراً خطیباً ناشر الحبر

اضحت عبارتہ من حسن عارضۃ　　تجلو الغیاہب والاوہام کالقمر

بالفضل متسم بالنبل مرتسم　　بالصدق معتصم فی کل مشتجر

بالعلم مدثر بالفہم متزر　　بالحزم مشتمل فی کل معتمر

جلا الظلام بنور راق منظرہ　　بفتح ملہمہ فی خد متالالئ

فاحت بلاد بعرف من فوائدہ　　جاءت کل رتیم غالی الدرر

تجلو غیاهب ذی زیغ إذا تو أت — بحسن فکر و طبع صافی الکدر

حاز المفاخر و العلیاء مرتدیا — بثوب عز رفیع طیب عطر

له المفاخر فی الاعیان ناطقة — له المآثر فی زهو و فی نضر

له البدائع فی الافکار بادیة — له الروائح تترى عند ذی النظر

سل ارض هند فسند من مفاخره — جاءتك ناطقة من جل مفتخر

سل دولة فی بسیط السند قائمة — تنبیك دستوره بالدین فاعتبر

هو المشمر فی تاثیل مقصده — حتی تاکد منه العقل بالبصر

خطب الم علی الاسلام حین قضی — نجباء امر الوری لم یقض بالوطر

فالقلب فی عمد و الروح فی کمد — و النفس فی کبد و العین فی همر

هذا الذی ملاء الآفاق سمعته — درسا و تالیف کتب خیر مدخر

ترثیه جامعة تبکیه عاصمة — جدیدة کملا فی صیب الحبر

ترثیه اقلام علم ثم محبرة — مدارس کتب مکاتب الزبر

یرثیه منبرهم یبکیه جامعهم — ترثیه حفلتهم فی البدو و الحضر

یا قلب مه هذه دنیا و نعمتها — تفنی سریعا و قد جاءتك بالعبر

یبقی الاله و لا یبقی بریته — فاصبر بصبر جمیل و ارض بالقدر

فکل حی من الدنیا مفارقها — و کل جاء غریب جاء للسفر

یا رب انزل علیه صوب غادیة — و طفاء تسقی تراه فائض الدرر

و ارفع عندك فی الفردوس منزلة — یأوی الی کنف فی غایة الحضر

و طفاء دیمتك الملدار رائفة — ترجی لمحل من الغبراء مفتقر

ثم الصلوة علی خیر الوری ابدا — من جاء بالنور فی الظلماء للبشر

مطبوعات جدیدہ

اشتراکیت اور اسلام از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے،

کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- مکتبہ چراغ راہ کراچی نمبرا،

مذکورۂ بالا کتاب فاضل مصنف کی مشہور ومقبول تصنیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال ہوئے دار المصنفین سے شائع ہوا تھا، مصنف کے قلم سے ترمیم واضافہ کے بعد اب دوسرا اڈیشن مکتبۂ چراغ راہ نے شائع کیا ہے، جو لوگ اشتراکیت کی حقیقت سے ناواقف ہیں، وہ اس کے اور اسلام کے درمیان انسانی حقوق کی مساوات، طبقاتی تقسیم کی مخالفت اور معاشی نظام کے بعض پہلوؤں میں اشتراک وتشابہ دیکھ کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب اور کارل مارکس اور لینن کے پرستار اشتراکی نظام کو حریت وآزادی اور عالمگیر انسانی اخوت ومساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور دنیا کے تمام سیاسی ومعاشی مسائل کا مشکل کشا سمجھتے ہیں، یہ دونوں خیال حقیقت سے بہت دور ہیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں اس کی مفصل ومدلل تردید کی ہے اور اشتراکیت کی پیدائش کے اسباب اور اسکی ترقی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور کارل مارکس کے فلسفہ اور معاشی نظام پر بحث وتنقید کرکے اس کی خامیاں دکھائی گئی ہیں، اور روس میں اسکے عملی تجربہ کی مختصر سرگذشت لکھ کر دکھایا ہے کہ مارکسی اشتراکیت اور مذہب دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اشتراکیت محض ایک سیاسی اور معاشی نظام نہیں، بلکہ زندگی کا ایک مستقل فلسفہ اور پورا دستور العمل ہے جس کی بنیاد تمامتر مادیت اور الحاد پر ہے، وہ دنیا کے سارے مذاہب کا دشمن ہے، اس میں خدا، مذہب اور اخلاق وروحانیت کا گذر نہیں ہے، اس کا مقصد تمام مابعد الطبیعی تصورات وعقائد

جاتا ہے اس میں معمولی اخلاقیات کی گنجائش نہیں ہے، اور حصولِ مقصد کے لئے ہر قسم کا فریب، اور جور و ظلم روا ہے، آخر میں دکھایا ہے کہ جس اشتراکیت کا تجربہ روس میں ہو رہا ہے، وہ مارکس کے بہت سے اصولوں سے ہٹ گئی ہے، لینن ہی نے اس میں بعض تبدیلیاں کر دی تھیں، اور اسٹالن نے تو اس کے بنیادی اصولوں کو توڑ کر اشتراکیت کی روح ہی ختم کر دی ہے، اور اب وہ حریت و آزادی اور معاشی حقوق میں مساوات کی عالمگیر انقلابی دعوت نہیں رہی، بلکہ بدترین قسم کی آمریت اور استبداد بن گئی ہے، اس میں نسلی و جغرافی قوم و وطن پرستی کی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں، اس نے ذاتی ملکیت کے بھی بہت سے حقوق مان لئے ہیں، اور اسٹالنی اشتراکیت میں مارکسی اشتراکیت کی مادی خصوصیات بھی ختم ہو گئی ہیں، اور اب وہ محض ایک آمرانہ نظام رہ گیا ہے، کتاب کے آخر میں اختصار کے ساتھ اسلام کا معاشی نظام پیش کیا گیا ہے، اور اس کی خصوصیات اور خوبیاں دکھائی گئی ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے اشتراکیت کا مصنوعی چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے، اور اس کے اصلی خط و خال نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں، لائق مصنف نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ مشہور اور مستند اشتراکی مصنفین کی کتابوں سے لکھا ہے، اس لئے یہ کتاب اشتراکیت سے حسنِ ظن رکھنے والوں خصوصاً ان گم کردہ راہ مسلمان نوجوانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہیں،

وقائع عالم شاہی (فارسی) بہ تصحیح و تحشیہ جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی،

ضخامت: ۲۳۲ صفحے کاغذ، بہتر ٹائپ خوبصورت مجلد قیمت رقم نہیں، پتہ: کتب خانہ ریاست رامپور،

اس کتاب کا مصنف کنور پریم کشور فراقی، راجہ جگل کشور کا پوتا تھا، راجہ جگل کشور، مرشد آباد کا جاگیردار اور بنگال کے صوبہ دار مہابت جنگ کی جانب سے محمد شاہی دربار میں وکیل تھا، اس نے اس زمانہ کے امیرزادوں کی طرح کنور پریم کشور کی بھی اچھی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، اور وہ اس عہد کے تمام مروجہ فنون میں ماہر اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھا، لیکن والد کی غلط بخشیوں سے اس کی زندگی ہی میں دولت و امارت ختم ہو گئی

تھی، اس لئے فراقی کو تلاش معاش کے لئے گھر سے نکلنا پڑا، اور مرہٹہ گردی کے زمانہ مین جب شاہ عالم ثانی نجف خان کے بلاوے پر دلی سے آگرہ کے لئے روانہ ہوا تو فراقی بھی راستہ مین شاہی لشکر میں داخل ہو گیا، اور کئی مہینہ تک بادشاہ کے ہمرکاب رہا، اور بعض متوسلین شاہی کی فرمایش پر اس نے ۱۲ محرم ۱۱۹۹ھ سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا، جس کا سلسلہ ۱۱ ربیع الاول سنہ مذکور تک جاری رہا۔ مذکورہ بالا کتاب یہی روزنامچہ ہے، اس کی تمہید مین مصنف نے احمد شاہ کے نابینا کئے جانے کے واقعہ سے لیکر شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی تک کے مختصر واقعات بھی لکھدیئے ہین، اسطرح یہ کتاب دو حصون مین تقسیم ہو گئی ہے، ایک حصہ تاریخ کا، دوسرا روزنامچہ کا، اگرچہ یہ روزنامچہ بہت مختصر ہے، یعنی اس مین کل دو مہینون کی روداد ہے، لیکن یہ زمانہ اس حیثیت سے نہایت اہم ہے کہ اسی زمانہ مین مرہٹہ گردی شروع ہوئی، افراسیاب خان مارا گیا، اور مہاجی سندھیا پٹیل کا اقتدار شروع ہوا، اور چونکہ فراقی نے واقعات غیر جانبدارانہ لکھے ہین، اور ان کی شکل روزنامچہ کی ہے، اس لئے اس مین اس زمانہ کے بہت سے ایسے واقعات مذکور ہین، جو دوسری تاریخون مین نہین مل سکتے، اور فاضل مصحح کے بقول "اس سے شاہ عالم ثانی کی بے بسی، مرہٹون، جاٹون، اور راجپوتون کے متعلق بہت سی جزئیات کا پتہ چلتا ہے" یہ روزنامچہ نایاب اور ہندوستان کے بڑے بڑے مورخون کی نگاہون سے اوجھل تھا، چنانچہ ایلیٹ نے بھی اس کا تذکرہ نہین کیا ہے، اس کا صرف ایک نسخہ رامپور کے کتب خانہ مین تھا، اس لئے اس کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے فاضل مصحح نے اس کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ روزنامچہ بھی ان کی تصحیح کردہ دوسری کتابون کی طرح تصحیح و ترتیب کی تمام خوبیون سے آراستہ ہے، کتاب کے شروع مین ان کے قلم سے فراقی کی ذات و خاندانی حالات، روزنامچہ کے قلمی نسخہ کی کیفیت اور اس کے مندرجات اور خصوصیات پر تبصرہ ہے، کتاب کا پہلا جز یعنی تاریخ کا حصہ بہت تشنہ تھا، اس لئے مرتب نے کتاب کے آخر مین اس کے متعلق دوسرے معاصر مورخین کے بیانات حاشیہ کے طور پر نقل کر دیئے ہین، یہ تحشیہ

مرتب کی محنت اور تلاش و جستجو کا نمونہ ہے جس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، آخر میں کتاب کے اسمار و اعلام کا اشاریہ ہے، یہ کتاب گو مختصر ہے، لیکن تاریخ ہند کے طالب علمون کے لئے بڑی کارآمد ہے،

اسلام کا نظریۂ جہاد از مولانا حیدر زمان صاحب صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عا، پتہ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور،

اسلامی مسائل مین سب سے زیادہ غلط فہمی جہاد کے متعلق ہے، اس کے معنی عموماً یہ سمجھے جاتے ہین کہ غیر مسلمون کے ملک پر قبضہ کرنے اور ان کو زبردستی مسلمان بنانے کیلئے ننگی تلوارین لیکر چڑھ دوڑنا، اور جو شخص اسلام سے انکار کرے، اس کو بے دریغ قتل کر دینا جہاد کی اس سے زیادہ غلط تعبیر نہین ہو سکتی، اولاً جہاد کے معنی محض جنگ و مقاتلہ کے نہین ہین، بلکہ ہر وہ کوشش جو کسی نیک مقصد کے لئے خدا کی راہ مین کی جائے جہاد ہے، حتی کہ اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش بھی جہاد ہے، دوسرے جنگ و قتال کے معنی مین بھی جہاد کے معنی مطلق جنگ کے نہین ہین، بلکہ اس سے مراد وہ جنگ ہے، جو اسلام کے بلند مقاصد کے تحفظ اور انسان کی فلاح و سعادت کے لئے ان دشمنان اسلام کے مقابلہ مین کیجائے جو اسلام اور مسلمانون کے مٹانے کے درپے اور فتنہ و شر کے لئے آمادہ ہون، ملک گیری اور دوسری قومون کو محکوم بنانے کے لئے جنگ کرنا جہاد نہین ہے، اس کے مقاصد اتنے بلند و پاکیزہ اور اس کے شرائط اتنے سخت ہین کہ اگر ان کے مطابق جہاد کیا جائے، تو وہ جنگ نہین رہ جاتا، بلکہ ایک مقدس عبادت بن جاتا ہے، اس کے لئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ خالصۃً لوجہ اللہ ہو، اس مین کوئی دنیاوی غرض شامل نہ ہو، اس سے ساری دنیاوی لڑائیان جہاد سے خارج ہو جاتی ہین، اور وہی لڑائیان جہاد کہی جائین گی، جو خدا کی خوشنودی کے حصول، فتنہ و شر کے استیصال اور نیکی اور بھلائی کی اشاعت کے لئے کیجائین، اس لئے جہاد حقیقت و انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، پھر اس کے جنگی پہلو مین بھی اسلام نے اس قدر اصلاح کر دی ہے کہ اس سے جنگ و مقاتلہ کی ساری برائیان دور ہو گئی ہین، فاضل مصنف نے اس

کتاب مین اسی نقطہ نظر سے اسلامی جہاد پر بحث کی ہے، اور جہاد کے مقاصد، اس کے شرائط، دنیاوی لڑائیون اور جہاد کے فرق، اس کی حربی اصلاحات وغیرہ کو تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے، اور اس کے متعلق تمام غلط فہمیون کو دور کرکے اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب نہایت مفید اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگون کے مطالعہ کے لائق ہے، جو جہاد کو بھی دنیاوی جنگ سمجھتے ہین،

حرف اول و سیاست نامۂ عالم از جناب نگہت شاہجہان پوری تقطیع اوسط ضخامت علی الترتیب ۱۲۲، اور ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے رپتہ مکتبہ سلطانیہ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی نمبر ۳

مصنف علمی و ادبی حلقہ مین بیگانہ نہین، وہ ایک قادر الکلام شاعر اور سنجیدہ نگار صاحب قلم ہین، ان کی نظم و نثر کی متعدد قابلِ قدر تصنیفین شائع ہو چکی ہین، زیر نظر کتاب اُن کے کلام کا نیا مجموعہ ہے، مصنف کا ذوق بڑا متنوع اور ہمہ گیر ہے اور شاعری کی ہر صنف مین ان کو یکسان قدرت حاصل ہے، چنانچہ یہ مجموعہ بھی غزلی، مذہبی و ملی، قومی و سیاسی، جذباتی و وجدانی، اخلاقی و حکیمانہ، عارفانہ و صوفیانہ مختلف النوع منظومات کا بوقلمون گلدستہ ہے، بڑا حصہ نظمون کا ہے، غزلین برائے نام ہین، یہ تمام نظمین زبان و بیان کی خوبی اور خیالات کی بلندی و پاکیزگی جملہ ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ اور بیشتر نظمین مصنف کے دینی جذبات کا آئینہ ہین، خصوصاً سیاست نامۂ عالم ان کی قادر الکلامی کا بہت اچھا نمونہ ہے، یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جس مین بارگاہ ایزدی مین اقوام عالم کی پیشی کی تمثیل مین ان قومون کی زبان سے ان کے حالات، اعمال اور اُن کی سیاست پر نہایت دلچسپ اور مفید تبصرہ ہے، حرف اول کے شروع مین جناب سراج احمد صاحب علوی پروفیسر گاندھی فیض عام کالج شاہجہان پور کا مقدمہ اور سیاست نامۂ عالم کے آغاز مین فیض الاسلام صاحب پروفیسر سیاسیات جی ان کالج شاہجہان پور کی تقریظ ہے، دونون کتابین اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہین،

"م"

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ حضرت برہان الدین غریبؒ حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات، و تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے سلاطین کے عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ ملک گیری میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین لوگوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح متاثر کیا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت :- عـہ

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

(طابع و ناشر صدیق احمد) "منیجر"

جلد ۶۵ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۰ء عدد ۲

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۵۹ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۷ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات

شذرات

ہندوستان کی تاریخ میں بالآخر وہ مبارک دن بھی آگیا کہ آزاد و عوامی جمہوریہ قائم ہوگئی، اور ۲۶ جنوری سنہ ۵۰ء کو ہندوستان مکمل طور سے خودمختار ملک بن گیا، اس تاریخی واقعہ پر جس قدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے، لیکن آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں لاتی ہے، جمہوریت کا قیام ترقی کی راہ کا ایک مرحلہ ہے، آخری منزل نہیں، حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے، اصل مقصد نہیں، اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ترقی کے راستہ کی رکاوٹیں دور ہوگئیں، لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنا ابھی باقی ہے، آزادی اور جمہوریت کا صرف یہ مقصد نہیں ہے کہ ہندوستان میں بیرونی طاقت کا اقتدار ختم اور خود ہندوستانیوں کو اپنے ملک پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا، بلکہ حقیقی جمہوریت یہ ہے کہ ملک ترقی کے راستہ پر گامزن اور امن و خوشحالی عام ہو، ہر طبقہ اور ہر شخص مطمئن اور جمہوریت کے فوائد اور برکتوں کو محسوس کرے،

آزادی اور جمہوریت خدا کی نعمت و امانت ہے، جو انہی قوموں کے سپرد ہوتی ہے جو اس کا حق ادا اور اس کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہیں، اس کا سب سے بڑا حق بلا امتیاز ملک کے ہر باشندے کے ساتھ عدل و انصاف ہے، جب تک یہ حق ادا ہوتا رہے گا حکومت بھی باقی رہے گی، ورنہ واپس لے لی جائے گی، عدل کا لازمی نتیجہ سکون و اطمینان، امن و خوشحالی اور ترقی ہے، اور بے انصافی کا بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار، بدامنی اور تباہی، اس لئے دنیاوی حیثیت سے بھی حکومت کی بقا اور ترقی کا مدار بھی عدل ہی پر ہے، حکومت کو دنیا کے موجودہ انقلابات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لئے اپنی جمہوریت کو حقیقی جمہوریت بنانا، حکومت کا اور اس کی کامیابی کے لیے مدد کرنا ہر محب وطن کا فرض ہے،

بابری مسجد کے معاملہ میں حکومت بڑی بے توجہی سے کام لے رہی ہے، مسلمانوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک اس نے کوئی توجہ نہیں کی، اگر اس معاملہ میں اس نے غفلت برتی تو کوئی مسجد بھی محفوظ نہ رہ جائے گی، اور مسجدوں کو مندر بنانے کا دروازہ کھل جائے گا، یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اصول کا سوال ہے،

کہ ایک سیکولر حکومت میں کسی فرقہ کی عبادت گاہیں کہاں تک محفوظ ہیں، اگر بابری مسجد مسلمانوں کو واپس نہ کی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مذہب محفوظ نہیں ہے، اس کے بعد حکومت کس منہ سے دنیا کے سامنے اپنے غیر مذہبی ہونے کا دعوی کر سکے گی، اگر الیکشن کے مصالح کی بنا پر حکومت نے اس معاملہ میں کمزوری دکھائی تو فرقہ پرست اس کو لے ڈوبیں گے۔

کانپور کی مسجد کا واقعہ جو صرف ایک غسل خانہ کا معاملہ تھا، ابھی بھولا نہ ہوگا، مذہب کے معاملہ میں آج بھی مسلمانوں کے جذبات وہی ہیں، اور مسلمان کیا کوئی فرقہ بھی اس طرح اپنی عبادت گاہ کی توہین گوارا نہیں کر سکتا اور نہ اس کی ایک چیز بھی چھوڑ سکتا ہے، تاہم مسلمانوں کو حکومت کے اعتماد پر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے جب تک اس سے مایوسی نہ ہو جائے، لیکن حکومت کی غفلت پر ماتم کے ساتھ اسکی خوشی بھی ہے کہ بعض منصف مزاج اور حق پرست ہندوؤں نے بڑی جرأت اور سچائی کے ساتھ حکومت کی غفلت اور فرقہ پرستوں کی زیادتیوں کا اعتراف کیا ہے، خصوصاً فیض آباد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے صدر اکشے سوامی مہراج نے جو اجودھیا کے ایک مندر کے پجاری بھی ہیں، جس اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ سب کے لیے قابل تقلید نمونہ اور اس کا ثبوت ہے کہ اس اندھیر نگری میں سچائی کا چراغ گل نہیں ہو گیا ہے، اور اس سے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ فرقہ پرستوں کی شر انگیزی کامیاب نہ ہوگی اور مسلمانوں کی مسجد ان کو واپس ملے گی۔

اس گئی گذری حالت میں بھی مذہب میں اتنی طاقت ہے کہ آج بھی وہ قومیں جن کو مذہب سے عملاً کوئی تعلق نہیں ہے، بعض مواقع پر حصول مقصد کے لیے مذہب کو وسیلہ بنانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، چنانچہ کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کے لیے سیاسی محاذ کے ساتھ مذہب کے نام سے بھی کام لیا جا رہا ہے، ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب ترکوں کے ساتھ عالم اسلامی کی ہمدردی کو ختم کرنے کے لیے ان کی بے دینی کے افسانے اتنے مشہور کیے گئے کہ معلوم ہوتا تھا، ان کو اسلام سے کوئی علاقہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے، (جس کو آج تک لندن بھی موقع بے موقع ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبیت کے خلاف استعمال کرتے رہتے ہیں)

لیکن جب کمیونزم کے مقابلہ کے لیے مذہب کی امداد کی ضرورت پیش آئی تو پھر ترک دفعۃً مذہبی بنا دیے گئے اور ان کی مذہبیت کی خبریں آنے لگیں، حالانکہ ترک من حیث القوم کبھی بے دین نہ تھے، اور نہ آج پوری قوم بے دین ہو گئی ہے۔ مذہب میں ان کی بے اعتدالیاں زیادہ تر انقلاب کے اثرات اور بعض حکومت طبقہ کی مغرب زدگی کا نتیجہ تھیں جس سے کوئی ملک بھی مستثنیٰ نہیں ہے، چنانچہ جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے اور انقلاب کے اثرات کم ہوتے جاتے ہیں، مذہب اپنی جگہ لیتا جاتا ہے جس کی تصدیق اخبارات کے علاوہ دوسرے معتبر ذرائع سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ اس سال چھ ہزار ترک حج کے لیے آئے تھے، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے ایک خط میں جو مدینہ منورہ سے لکھا تھا، ترکوں کی مذہبی حالت کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کیے تھے، یہ خط بہت دیر میں پہنچا، تاہم اسکے بعض حصے ناظرین معارف تک پہنچانے کے لائق ہیں، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"ماشاءاللہ امسال کا حج بہت اچھا رہا، چار لاکھ حاجیوں کا شمار اخبارات میں چھپا تھا جس میں فلپائن اور نائجیریا تک کے حاجی تھے، ۱۵ ہزار ہندوستان کے، ۱۴ ہزار پاکستان کے، ۱۲ ہزار مصر کے اور اسی کے قریب جاوی ہوں گے، امسال ترک بھی بہت آئے تھے، چھ ہزار کے قریب تھے، ان کو دیکھکر بڑی خوشی ہوئی، انکی بے دینی کی نسبت جتنی خبریں ہندوستان میں پڑھی تھیں، سب غلط معلوم ہوئیں، تمام اقوام عالم میں سب سے زیادہ میں نے انکو باادب سنجیدہ اور متین پایا، اور حرم کا خاص احترام ان کے قلوب میں پایا، ان میں بعض نقشبندی شیوخ بھی تھے، سب کے چہروں پر ماشاءاللہ داڑھی تھی، ورنہ داڑھی تو اب عالم اسلام کے چہرہ سے غائب نظر آتی ہے، نجدیوں اور مصری عالموں تک کے چہرے صاف تھے۔"

یہ وہی ترک ہیں جنکے متعلق عام شہرت تھی کہ انھوں نے حج بند کر دیا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ ترکی کی آبادی دو کروڑ بھی نہیں ہے، اسلیے آبادی کے تناسب سے ترک حجاج کی تعداد ہندوستانی حجاج سے کچھ ہی کم ہے، پاکستان کے حاجیوں سے اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں نہ صرف مذہب بلکہ تصوف کا سلسلہ بھی قائم ہے۔

مقالات

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کی دعوت سے اقبال کا مقصد

آخر میں سب سے بڑا اعتراض یہ رہ جاتا ہے کہ اقبال نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، اور دنیا کو اس کے قبول کرنے اور اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت دی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے،

یہ اعتراض موجودہ مذاق کے لحاظ سے بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صحیح نہیں، اس بارہ میں اقبال کے نقطۂ نظر اور ان کے مقصد و منشار کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت بھی کی ہے اور دنیا کو اسلامی نظام قبول کرنے کی دعوت بھی دی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان تھے، اور ان کا مذہب اسلام تھا، اس لئے وہ ساری دنیا سے اس کو منوانا .... اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے

بلکہ اس لئے اسلامی اصولون کی دعوت دیتے تھے کہ اُن کے نزدیک انہی کے ذریعہ انسانیت کی فلاح اور موجودہ دور کی تمام مشکلات و مسائل کا حل ہو سکتا تھا،

اس سے دوسرے مذہبون کی تنقیص لازم نہین آتی، اس لئے کہ جیسا کہ قرآن مجید مین بار بار کہا گیا ہے اسلام کوئی نیا مذہب نہین ہے، بلکہ وہی دین فطرت ہے جس کی تعلیم خدا کے تمام سچے پیغمبر شروع سے اب تک دیتے چلے آئے ہین، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اسلام، ان مذاہب کی اصلاح شدہ اور ان کی آخری تکمیلی شکل ہے، اسی لئے اسلام نے خدا کے تمام سچے پیغمبرون اور ان کی لائی ہوئی الہامی کتابون کی تصدیق کو ایمان کا جز قرار دیا ہے، اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہین ہو سکتا، گویا اسلام تمام سچے مذاہب کا مصدق اور اُن کی اچھی تعلیمات کا مجموعہ ہے، مذاہب کی اصلاح سے یہ مراد ہے کہ پرانے مذاہب کی تعلیمات مین امتداد زمانہ اور انسانی تصرفات سے جو تبدیلیان ہو گئی تھین جن سے اُن کی ہدایت کی روشنی دھندھلی پڑگئی تھی اسلام نے ان آمیزشون اور تغیرات کو دور کرکے اُن کی تعلیمات کو اصلی شکل مین جلوہ گر کر دیا، اور تکمیل کا یہ مطلب ہے کہ تمام گذشتہ مذاہب اپنے زمانہ کے انسانون کے درجۂ ارتقار اور اُن کی ضروریات و حالات کے مطابق تھے، اس لئے اُن کی تعلیمات بھی سادہ اور محدود اور عموماً صرف موٹی موٹی اخلاقی و روحانی امور پر مشتمل تھین جو ترقی یافتہ انسانی زندگی کی ہدایت کیلئے کافی نہین، اسلام نے گذشتہ مذاہب کی اصلاح کے ساتھ انسانون کیلئے ایک جامع اور مکمل دستور العمل بھی بنا دیا، اس کو تمثیل سے یون سمجھا جا سکتا ہے کہ مذہب انسانیت کی تعلیم و تہذیب کا نصاب ہے، اور نصاب پڑھنے والے کی عمر عقل و فہم کے مطابق ہوتا ہے اور اس مین تغیر و ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اسلئے مذاہب کا نصاب بھی انسانی عقل و شعور کی ترقی اور اسکی ضروریات کے لحاظ سے بدلتا رہا اور مذہب اسلام انسانی عقل و فہم کے بلوغ اور اسکی ترقی کا آخری تکمیلی نصاب ہے اسلئے وہ تمام گذشتہ مذہبی نصابون سے زیادہ جامع اور مکمل ہے پرانے نصاب یعنی گذشتہ سچے مذاہب بھی برحق اور اپنے زمانہ کے لئے ضروری اور مفید تھے لیکن وہ انسانی ترقی کی ضروریات کا ساتھ نہین دے سکتے تھے اور اسلام کے بعد ان کی ضرورت اس لئے باقی نہین رہی کہ اسلام ان سب کی اچھی تعلیمات کا جامع ہے،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو مذاہب جس قدر قدیم ہیں، ان کی تعلیمات اتنی ہی محدود ہیں، اور جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی ہے، اتنی ہی نئے مذاہب کی تعلیمات میں وسعت اور گہرائی آتی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت کے ابتدائی دور میں انسانوں کی عقلیں سادہ اور ضروریات محدود تھیں، اس لئے اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو مذاہب آئے تو وہ بھی سادہ اور محدود تھے، ان کو زیادہ تر خدا اور بندے کے تعلق یعنی عقائد و عبادات سے بحث تھی، یا کچھ موٹی موٹی اخلاقی تعلیمات تھیں، اُن کو انسانوں کی دنیاوی زندگی سے بہت کم علاقہ تھا، اس لئے تمام پرانے مذاہب میں یا دنیاوی اور مادی زندگی کے قوانین سرے سے ہی نہیں ہیں، اور اگر کسی مذہب میں ہیں بھی تو بہت محدود اور ناکمل شکل میں ان کے مقابلہ میں اسلام چونکہ انسانی عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے زمانہ کا مذہب ہے، اس لئے اس کی تعلیمات تمام گذشتہ مذاہب سے زیادہ جامع اور مکمل ہیں، مثلاً گذشتہ مذاہب خاص خاص قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آئے تھے، ایک خاص زمانہ تک کے لئے تھے، اُن کا مقصد عموماً صرف اخلاقی اصلاح تک محدود تھا، اس لئے ان کی تعلیمات بھی اُنہی تک محدود تھیں، اُن کے مقابلہ میں اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ ساری دنیا کی ہدایت و رہنمائی اور ابد تک کے لئے آیا ہے، اور اس کا مقصد زندگی کے کسی خاص شعبہ اور خاص پہلو کی نہیں، بلکہ پورے نظام زندگی کی ہدایت و اصلاح ہے، جس سے دین و دنیا کا کوئی شعبہ بھی مستثنیٰ نہیں، اسلئے اس کی تعلیمات دنیوی اور اُخروی تمام ضروریات پر حاوی ہیں، یہ جامعیت و ہمہ گیری اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تعلیمات میں نہیں ہے، اس کی تفصیلی بحث نہ ہمارا مقصد ہے، اور نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے، لیکن اس کے بغیر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کے قیام کی دعوت کے بارہ میں اقبال کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہو سکتا، اور اصل اعتراض باقی رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس کا ازالہ بھی ضروری ہے، اس لئے اس کے اہم پہلوؤں پر مختصراً نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی خالی نہیں ہے، اور ان میں بہت سی تعلیمات

مشترک ہیں، گو اسلام کی ان تعلیمات کو بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اور جو اعتدال و توازن اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات میں ہے، وہ کسی مذہب میں نہیں ہے لیکن اس زمانہ میں کسی نظام اور کسی قانون کے نقص و کمال اور عیب و ہنر کا خواہ وہ دنیاوی ہو یا مذہبی معیار یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اس نے انسان کی دنیاوی زندگی کے مسائل اور مشکلات کا کیا حل پیش کیا ہے، دنیا کی موجودہ مشکلات نے اس سوال کو اور زیادہ اہم بنا دیا ہے، اس لئے آیندہ سطور میں اسی پہلو اور نقطۂ نظر سے اسلامی نظام پر تبصرہ کیا جائیگا،

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دین کامل ہے، اور ابد تک کے لئے آیا ہے، اور اس کا بنانے والا علیم خبیر ہے، جس کی نگاہ سے حال و مستقبل کوئی زمانہ بھی پوشیدہ نہیں ہے لیکن اصول ارتقا بھی اسی کا بنایا ہوا ہے، اور یہ اس کے علم میں تھا کہ زمانہ کی رفتار اور ترقی کے ساتھ انسانوں کی ضروریات بدلتی اور بڑھتی رہینگی، اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، اس لئے اپنے جامع اور مکمل قانون کے باوجود اسلام نے نئے مسائل میں علما رکو اجتہاد کی اجازت دی یعنی ان مسائل میں جو عہد رسالت میں موجود نہیں تھے، اور جن کے متعلق قرآن حدیث میں احکام نہیں ہیں، اسلام کی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے نئے قوانین کے بنانے اور پرانے فقہی جزئیات میں ضرورت کے مطابق ترمیم کرنے کا اختیار دیا، چنانچہ عہد فاروقی میں اور اس کے بعد بھی جب اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوئے، تو اس قسم کے بہت سے نئے قوانین بنائے گئے، اس اصول سے اسلام کا دامن ہر زمانہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسیع ہو گیا، لیکن یہ کام انہی علما کا ہے جن میں علم و اجتہاد کے ساتھ تقوی و دیانت کا بھی اجتماع ہو، اس تمہید کے بعد موجودہ اہم مسائل پر نظر ڈالی جاتی ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم پیچیدہ اور مشکل مسئلہ سیاسی اور معاشی کشمکش کا ہے جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ میں ڈال دیا ہے، ان دونوں مسئلوں کا اصل اور بنیادی سبب نسلی اور جغرافی قوم و وطن پرستی اور لادینی سیاست ہے یعنی ہر قوم تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر صرف اپنی قوم کی سیاسی اور معاشی برتری چاہتی ہے جس کا لازمی نتیجہ قوموں کی کشمکش اور بدامنی ہے، اس کا حل اسلام نے ایک تو یہ کیا ہے کہ نسلی اور جغرافی گروہ بندی

کو مٹا کر عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی تعلیم دی ہے، حدیثوں میں اس قسم کی بکثرت تعلیمات ہیں مثلاً

"آپس میں ایک دوسرے سے کینہ اور حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے روگردانی کرو، اور خدا کے سب بندے مل کر بھائی بھائی بن جاؤ" (بخاری)

"ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے" (ابوداؤد)

"عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ قوموں کو سیاہ قوموں پر اور سیاہ قوموں کو سرخ قوموں پر کوئی فضیلت نہیں مگر خدا ترسی کی بنا پر" (مسند احمد بن حنبل)

تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لطف و محبت اور رحم و کرم کی تلقین ہے کہ "تم (انسان) زمین والوں پر رحم کرو، تو آسمان والا (خدا) تم پر رحم کرے گا" (مستدرک حاکم) اسی مفہوم کی دوسری حدیث ہے کہ "جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا رحم نہیں کرتا" (بخاری)

ترمذی میں ہے کہ "جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے پسند کرو تب مسلمان ہو گے"

ان تعلیمات میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں اور اس میں کافر و مسلمان سب برابر ہیں، قرآن مجید نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے،

"کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، ہر حال میں انصاف کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے" (مائدہ)

اس سے زیادہ عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے ؟

اس کی دوسری تدبیر یہ کی کہ انسانی اخوت کی بنیاد نسل اور وطن کے بجائے افکار و تصورات کے اشتراک پر رکھی، اس حقیقت کو اب بڑے بڑے مفکرین و مدبرین مانتے ہیں کہ عالمگیر انسانی اخوت کا ذریعہ ان میں افکار و تصورات کا اشتراک اور مقاصد و نصب العین کی وحدت ہے، جس کو ان الفاظ میں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ جب تک انسانی فلاح و سعادت کے اساسی اصولوں اور اُن کے بنیادی حقوق کو تمام قومیں نہ مان لیں گی، اس وقت تک نہ ان میں اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ امن و اماں کا قیام ممکن ہے

اس کی تدبیریں بھی ہوتی رہتی ہیں، پرانی جمعیۃ الاقوام اور نیا ادارہ اقوام متحدہ (یو۔ان۔او) سب اسی کی تدبیریں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قومی اور وطنی خود غرضی سے پاک نہیں، اور وہ صرف بڑی قومون کا آلۂ کار ہیں، اس لئے ان کے ذریعہ اصل مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکتی، لیگ آف نیشنز کا حشر سب کو معلوم ہے، جغرافی و نسلی قومیت اور وطنیت کے تصور کے ساتھ انسانی فلاح کی کوئی تدبیر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، اس کا صحیح علاج عالمگیر انسانی اخوت و مساوات ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، بقول اقبال

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود   اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام   جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

جب تک قوموں میں قومی اور وطنی تفریق قائم رہے گی، اس وقت تک قومی اور نسلی تفوق و برتری کا جذبہ بھی باقی رہے گا،

معاشی کشمکش کا اصل سبب بھی در اصل یہی تفریق ہے، اس لئے اس کا علاج بھی انسانی اخوت و مساوات ہے، جب ہر قوم دوسری قوم کو اپنے برابر سمجھنے لگے گی، اور اپنے تفوق و امتیاز کے لئے دوسرون کے حقوق غصب نہ کرے گی، تو معاشی کشمکش بھی نہ پیدا ہوگی، اس اصولی علاج کے علاوہ اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا متوازن بنایا ہے کہ اگر اس پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو نہ غیر معمولی ثروت ایک شخص یا ایک طبقہ کے پاس جمع ہوگی، جسے سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ غربت و افلاس پیدا ہوگا جو معاشی کشمکش کا اصل سبب ہے، اس لئے اسلامی نظام معاشیات میں غیر معمولی ناہمواری کا امکان ہی نہیں ہے کہ ایک شخص تو قارون بن جائے، اور دوسرے کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہو، اس موقع پر اس کی تصریح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے ذاتی املاک اور جائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی دولت کو منع نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی خرابیاں دور کرکے اس کی اصلاح کر دی ہے، اسلام میں صرف وہ سرمایہ داری

حرام ہے، جس میں خدا اور بندوں کے حقوق نہ ادا کئے گئے ہوں، لیکن اگر ان حقوق کو ادا کیا جائے تو غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہی نہیں ہو سکتی،

سرمایہ داری کی اصلاح اور اسکی خرابیوں کو دور کرنے کی اسلام نے قانونی اور اخلاقی دونوں شکلیں اختیار کی ہیں، ان پر تفصیلی بحث بہت طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس نے دولت میں خدا، رسول، ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین، پڑوسی اور دوسرے تمام ضرورتمند اور اہلِ حاجت کا حق رکھا ہے، اور اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے کہ

کے لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ — یعنی تاکہ دولت محض چند دولت مندوں میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ گردش کرتی رہے۔

اقتصادی ناہمواری اور معاشی کشمکش کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند دولتمندوں میں خواہ وہ اشخاص ہوں یا طبقات گھر کر رہ جاتی ہے، اگر وہ تمام طبقوں میں پھیلا دی جائے، تو خود بخود اقتصادی ناہمواری ختم ہو جائے گی، اس لئے اسلامی مالیات کے اس بنیادی اصول پر عمل کرنے سے ساری دنیا کی اقتصادی گتھی سلجھ سکتی ہے، اسلامی تعلیمات کی دو حیثیتیں یا دو درجے ہیں، ایک قانونی جس کو اصطلاح میں شریعت کہتے ہیں، دوسرے اخلاقی جس کو احسان سے تعبیر کرتے ہیں، شریعت کے قوانین کی پابندی ہر مسلمان پر ضروری ہے یعنی جو اس سے سرتابی کرے گا، حکومت اس سے بجبر منوائے گی لیکن کچھ اخلاقی تعلیمات ایسی ہیں جن کی حیثیت قانون کی تو نہیں ہے یعنی حکومت اُن کی پابندی پر مجبور نہ کرے گی، لیکن ان پر عمل کے بغیر کوئی مسلمان مومن کامل نہیں ہو سکتا، اسلام نے ان دو طریقوں سے سرمایہ داری کی خرابیوں کی اصلاح کی ہے، اور اس کے لئے قانونی شکلیں یہ اختیار کیں،

(۱) ہر مسلمان کی املاک میں اسکے مرنے کے بعد وراثت جاری کی جس سے اشخاص کی دولت ہمیشہ تقسیم ہوتی رہے گی (۲) زمین کو حکومت کی ملک قرار دیا جس سے جاگیرداری کا انسداد ہو گیا (۳) سونا چاندی کا

نقد سکہ سونا چاندی اور ان کے زیورات اور ہر قسم کے تجارتی مال پر مسلمانوں کے لئے زکاۃ فرض کی، جس کی شرحین مختلف ہین (۴) زرعی پیداوار مین مسلمانون پر زکاۃ جس کو عشر کہتے ہین، فرض کی، اور غیر مسلمون پر خراج مقرر کیا (۵) تجارتی مال کی برآمد پر عشور یعنی چنگی اور ڈیوٹی لگائی (۶) معدنیات اور زمین کے تمام دفینون مین پانچوان حصہ حکومت کا قرار دیا (۷) اسی طریقہ سے مال غنیمت مین خمس مقرر کیا، (۸) سود کو جو سرمایہ داری کا بڑا ذریعہ ہے، حرام مطلق قرار دیا (۹) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی اور اس قسم کی تمام دوسری ناجائز تجارتون کو جن سے سرمایہ داری کو ترقی ہوتی ہے، اور عوام کو نقصان پہنچتا ہے، حرام قرار دیا،

یہ وہ قوانین ہین جن کی پابندی ہر ہر مسلمان قانوناً مجبور ہے اور ان ٹیکسونکو حکومت وصول کرے گی، ان مین سے صدقات وزکاۃ کی آمدنی کے مصارف مین بڑا مصرف غربا و مساکین ہین، صدقات کا مصرف خود قرآن پاک نے متعین کر دیا ہے جن مین فقراء و مساکین بھی ہین، انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ، زکاۃ کے متعلق بخاری مین ہے کہ

توخذ من اغنیا ئھم وترد علی	یعنی دولتمندون سے وصول کی جائے گی
فقرائھم،	اور غربا مین تقسیم کی جائے گی،

چنانچہ بیت المال کی زکاۃ و صدقات کی آمدنی کا ایک حصہ غربا و مساکین کے لئے مخصوص ہوگا، جو بلا امتیاز مسلم وغیر مسلم تمام حاجتمندون مین صرف کیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ مین معذور و مجبور یہودیون اور عیسائیون کے روزینے بھی بیت المال سے مقرر کر دیئے تھے، کیونکہ آپ کے نزدیک کلام مجید کی اس آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ مین فقرا سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہین (کتاب الخراج امام ابو یوسف) یہ طریقہ بنی اُمیّہ کے زمانہ مین بھی جن کی حکومت خالص دنیاوی تھی، جاری رہا۔ چنانچہ ولید بن عبد الملک کے زمانہ مین پوری اسلامی قلمرو

کے معذور، ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے اور اندھوں کی رہنمائی، اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے آدمی مقرر تھے[۹۱] اسلامی بیت المال میں نادار لوگوں کے قرض کی ادائگی کی بھی ایک مد ہے،

یہ تو سرمایہ داری کی اصلاح کی قانونی شکلیں اور سرمایہ داروں کی دولت میں غریبوں کے قانونی حقوق ہیں، اس کے علاوہ اسلام نے اس کے اخلاقی طریقے بھی اختیار کئے، چنانچہ ایک طرف تو اس نے جائز طریقہ سے کسب دولت کی ممانعت نہیں کی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، دوسری طرف دولت کی محبت اور اس کو خزانہ بنانے کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ کلام مجید اور احادیث نبوی میں اسکی بڑی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات اور خیرات کی بڑی تاکید ہے، اور دولتمندوں پر اتنی اخلاقی ذمہ داریاں عائد کردی ہیں، کہ اگر وہ ان کو پوری کریں، تو دولت مشکل ہی سے جمع ہو سکتی ہے، یا کم از کم کوئی انسان ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا، ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ جو شخص خود شکم سیر ہو کر سوئے، اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے، تو وہ مومن نہیں ہے[۹۲] اس کے علاوہ دولت کی برائیوں کی اصلاح اور افلاس و غربت کو مٹانے کے متعلق بہت سے احکام اور تعلیمات ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کی اس مختصر بحث میں گنجایش نہیں ہے،

اسی کے ساتھ گداگری اور مفت خوری کے تدارک کیلئے اسلام نے تندرست آدمیوں کو گداگری کی ممانعت اور قوت بازو کے ذریعہ معاش پیدا کرنے کی تاکید کی ہے، اور توانا و تندرست آدمیوں کے لئے صدقہ لینا ناجائز قرار دیا، ترمذی میں ہے کہ صحیح و تندرست اور غیر محتاج کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں ہے[۹۳]

مختلف پیرایوں میں صدقہ و خیرات سے بچنے کی تعلیم دی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ صدقہ لوگوں کے ہاتھ کا میل ہے[۹۴] ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ اوپر کا ہاتھ یعنی دینے والا نیچے کے ہاتھ یعنی لینے والے سے بہتر ہے[۹۵]"

---

[۹۱] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۲ و طبری ج ۵ ص ۱۲۰۱ [۹۲] مشکوٰۃ و ادب المفرد امام بخاری [۹۳] ترمذی کتاب الزکوٰۃ [۹۴] مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ [۹۵] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ،

گداگری کی سخت مذمت کی ہے کہ جو شخص ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا[1] یعنی وہ دنیا میں گداگری کرکے اپنے چہرہ کی رونق و آبرو کھو چکا ہے،

اور محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے والے کو صدقہ لینے والے سے بہتر قرار دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا رسی لیکر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے کہیں بہتر ہے، کہ وہ کسی سے بھیک مانگے جس کو اختیار ہو کہ دے یا نہ دے[2]

ایک مرتبہ ایک حاجتمند صحابی نے آپ سے خیرات مانگی، آپ نے اُن سے پوچھا تمھارے پاس کچھ ہے؟ انھوں نے جواب دیا، ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے آپ نے اس کو منگا کر خود نیلام فرمایا، اور اس کی قیمت سے سائل کو ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بیچو، انھوں نے اس پر عمل کیا، اُن کی محنت مین خدا نے اتنی برکت دی کہ اُن کو پھر کبھی احتیاج نہین ہوئی[3]

لیکن اگر ان تدبیرون کے بعد بھی کچھ معذور و مجبور اشخاص صدقہ و خیرات کے مستحق باقی رہ جائین تو اُن کو بھی عزت نفس و خودداری قائم رکھنے کی تعلیم ہے، حدیث مین ہو کہ مسکین وہ نہین ہے جس کو ایک لقمہ دو لقمے دیکر لوٹا دیتے ہین، بلکہ مسکین وہ ہو جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے سے حجاب کرتا ہو، لوگون سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا[4]

غیور و خوددار محتاجون کی خود قرآن نے مدح کی ہے، کہ وہ ایسے ہوتے ہین کہ ناواقف لوگ اُن کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہین، اور تم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کو بشرہ سے پہچانتے ہو یہ لوگون سے لپٹ کر نہین مانگتے، (بقرہ۔ ۳۷)

غریبون کو ذلت نفس سے بچانے کے لئے دولت مندون کو حکم دیا کہ اگر تم علانیہ صدقہ دو تو بھی بہتر ہے لیکن فقراء کو چھپا کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، (بقرہ ۳۷)

[1] ایضاً من سأل الناس
[2] ایضاً کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسألۃ
[3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ
[4] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ لا یسئلون الناس الحافا

حدیث مین مخفی صدقہ کے بڑے فضائل ہین، مسلم مین ہو کہ بہترین صدقہ وہ ہے، جو اس طرح دیا جائے کہ داہنے ہاتھ سے دیا جائے اور بائین ہاتھ کو خبر نہ ہو[1]۔

نمایش کے لئے صدقہ دینے صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے، طعنہ دینے ایذا پہنچانے اور ان تمام طریقون کی جس سے غریبون کی خودداری مجروح ہوتی ہو، بڑی مذمت ہی،

غرض اسلام نے ہر پہلو سے سرمایہ اور غربت دونون کی اصلاح اور برائیان دور کرنے کی کوشش کی ہو، اگر ان تمام قوانین اور تعلیمات پر پورا عمل کیا جائے، تو نہ غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کوئی غریب ننگا، بھوکا رہ سکتا ہے، خلفاے راشدین کے مقدس دور کا ذکر نہین، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے زمانہ مین جنھون نے اسلامی نظام حکومت کے احیاء کی کوشش کی تھی، اور ان کو کل دو سال اس کا موقع ملا تھا، ملک مین اتنی آسودہ حالی پیدا ہو گئی کہ اسلامی مملکت مین صدقہ لینے والے نہین ملتے تھے، اور غربا و مساکین خود صدقہ ادا کرنے کے لائق ہو گئے تھے[2]،

لیکن بہتر سے بہتر قوانین اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بغیر عمل کے بالکل بے کار ہے، اور عمل کی دو ہی صورتین ہو سکتی ہین، ایک یہ کہ وعظ و پند اور تعلیم و تلقین کے ذریعہ لوگون مین عمل کی روح پیدا کی جائے، دوسرے یہ کہ نہ ماننے والون کو جبر و قوت سے منوایا جائے، پہلی صورت صالح اور سلیم الفطرت انسانون کے لئے ہے، عام لوگون کیلئے قانونی مواخذہ کا خوف ضروری ہے، ورنہ دنیا کا کوئی نظام بھی قائم نہین رہ سکتا، اسلئے اسلام نے ان دونون طریقون کو اختیار کیا، اور دوسرے طریقہ کے لئے قوت نافذہ یعنی حکومت ضروری ہے، اقبال نے اسی نقطۂ نظر سے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دی ہی، مسلمانون کو بھی انھون نے اسی لئے مخاطب کیا ہے، کہ پہلے خود ان مین عمل کی روح پیدا کی جائے، پھر ان کو نمونۂ عمل بنا کر ان کے ذریعہ اسلامی نظام کا احیا کیا جائے،

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفار الصدقہ [2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی ص ۸۵،

لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اقبال کی حکومتِ الٰہیہ کا تصور زمین کے کسی خطہ مین مسلمان قوم کی سیاسی حکومت نہین، بلکہ صحیح اسلامی حکومت ہو، جس کا نظام قرآنی قوانین و احکام اور احادیث نبوگ پر مبنی ہو، ورنہ دنیا مین مسلمانون کی سیاسی حکومتون کی تو آج بھی کمی نہین، اس کے لئے نئی دعوت کی کیا ضرورت تھی، اقبال نے اسلامی حکومت کے اصلی تصور کو خود اپنی نظم حکومتِ الٰہیہ مین واضح کیا ہے،

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام	نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مرد آزاد است و بس	ملک و آئینش خدا داد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش زحق	زشت و خوب و تلخ و نوشینش زحق
عقل خود بین غافل از بہبود غیر	سود خود بیند نہ بیند سود غیر
وحی حق بینندۂ سود ہمہ	در نگاہش سود و بہبود ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف	وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

بندۂ حق یعنی حکومتِ الٰہیہ کا حکمران یا خلیفہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہوتا ہے، نہ خود وہ کسی کا غلام ہوتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو غلام بناتا ہے، وہ ایک آزاد انسان ہوتا ہے، اس کا ملک اور اس کے آئین و قوانین سب خدا کا عطیہ ہوتے ہین، اس کی رسم و راہ اس کا دین و مذہب اس کے آئین و قوانین، اس کی بُرائی و بھلائی، اس کی تلخی و شیرینی سب منجانب اللہ ہوتی ہے، اس لئے کہ عقل خود بین مین یہ خرابی ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اپنے فائدہ پر رہتی ہے، خواہ وہ شخصی ہو یا قومی، اس کے مقابلہ مین خدا کی وحی کی نظر سارے انسانون کے فائدہ پر رہتی ہے، اور وہ سب کے سود و بہبود کو دیکھتی ہے (اس لئے وحی الٰہی کے ذریعہ جو قانون اور نظام حکومت بنے گا اس مین ساری دنیا کی بھلائی کا لحاظ ہوگا،) وہ صلح ہو یا جنگ، ہر حالت مین عدل و انصاف پر قائم رہتی ہے، اس کے میل جول اور جدائی مین کسی کا خوف اور کسی کی رعایت نہین ہوتی،

ان اشعار خصوصاً پانچوین شعر سے ظاہر ہے کہ اقبال کی حکومتِ الٰہیہ کا مقصد قرآنی احکام کے مطابق

حکومت ہے،

مذہبی حکومت کے متعلق غلط فہمی کا سبب

مذہبی حکومت کے متعلق ایک عام غلط فہمی ہے اور اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جس مین دوسرے مذہب والون کے کوئی حقوق اور اُن کے لئے عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کی کوئی گنجایش نہ ہو، کم از کم اسلام کی مذہبی حکومت کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے، اس کی تفصیل آیندہ بیان کیجائے گی،

درحقیقت یہ غلط فہمی یورپ کی پھیلائی ہوئی ہے، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ عیسائی مذہب کی بنیاد ترک دنیا پر ہے جس مین حکومت کی کوئی گنجایش نہین ہے، اس لئے اس مین حکومت کا کوئی آئین بھی نہین ہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی غلط تفسیر نے کہ "جو قیصر کا حصہ ہے سو قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے، سو خدا کو دو" عیسائی مذہب مین اور بھی دین و دنیا مین علحدگی پیدا کر دی، لیکن سیاست سے مذہب کی بے دخلی کا اصل سبب یہ ہے کہ گو عیسائی مذہب مین حکومت کی گنجایش نہین ہے لیکن قرون وسطیٰ مین کلیسا کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ حکومت پر بھی غالب آگیا تھا، اور اس کی حیثیت کنگ میکر کی ہو گئی تھی اور پاپ کلیسا جس کو چاہتے تھے، تخت پر بٹھاتے تھے، اور جس کو چاہتے تھے، اتار دیتے تھے، اور چونکہ اُن کے پاس حکومت کا کوئی مذہبی قانون نہین تھا، اور وہ خالص دنیا دار اور مذہبی روح سے بالکل خالی تھے اسلئے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے، جو دنیاوی بادشاہ اپنی حکومت کی بقا کے لئے کر سکتے ہین، بلکہ ان کی سفاکیان اور عیش پرستیان اُن سے بھی بڑھ گئی تھین، جس پر یورپ کے قرون وسطیٰ کی تاریخ شاہد ہے، اس سے ہر تاریخ دان واقف ہے، اس کا نتیجہ کلیسا کے خلاف بغاوت کی شکل مین ظاہر ہوا اور بڑی خونریز معرکہ آرائیون کے بعد کلیسا کی قوت اور اس کا اقتدار ختم ہو گیا، یہ وہ زمانہ تھا، جب یورپ مین علم و عقل کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی، اس لئے کلیسا کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ارباب کلیسا کی غلطیون اور اُن کی زیادتیون کی سزا مین نہ صرف مذہب کو سیاست سے خارج کر دیا گیا، بلکہ سرے سے

مذہب ہی کی وقعت جاتی رہی، لیکن اسلام مین جیسا کہ اوپر بھی لکھا گیا ہے، دین و دنیا الگ الگ نہین، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہین، اور اس کے نزدیک جسم و روح سے مل کر کامل انسان بنتا ہے اس لئے اس کی تعلیمات بھی ان دونون کی ضروریات پر حاوی ہین، اور اس مین دینی و اخلاقی تعلیمات کے ساتھ حکومت کا بھی پورا آئین موجود ہے، اقبال نے ان واقعات کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے،

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہان اس فقیری مین میری

خصومت تھی سلطانی و راہبی مین — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

ہوئی دولت و دین مین جب جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی فقیری

دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرانشین کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی مین حفاظت ہے انسانیت کی

کہ ہون ایک جنیدی و اردشیری

سیاست سے مذہب کی علٰحدگی کے بعد اگرچہ حکومتین کلیسا کے اقتدار سے آزاد ہوگئین، لیکن ان مین شخصی حکومتون کی تمام خرابیان موجود تھین، اور ارباب کلیسا مذہب کے نام پر جو مظالم کرتے تھے، وہ اب سیاست کے نام سے ہونے لگین، جب یہ شخصی استبداد حد سے بڑھ گیا، تو اس کے خلاف بھی عوامی اور جمہوری تحریکین شروع ہوئین جس کا نتیجہ انقلاب فرانس کی شکل مین ظاہر ہوا، اس وقت سے یورپ مین شخصی حکومتون کے بجائے جمہوری نظام کا آغاز ہوا، گو جمہوری اور عوامی حکومت کی اصطلاح بظاہر بڑی دلفریب ہے، اور اس مین شبہہ نہین کہ جمہوریت نے شخصی استبداد کا خاتمہ کردیا، لیکن جمہوریت کے قیام کے بعد شخصی استبداد کے بجائے جماعتی اور قومی و وطنی استبداد شروع ہوگیا، اور شخصی حکمران

اپنے ذاتی مفاد کے لئے جو بے عنوانیاں کرتے تھے، وہی بر سر حکومت طبقہ اپنے اقتدار اور اپنے قومی و وطنی مفاد کیلئے دوسری قومون کیساتھ کرنے لگا، اور اس کے جواز کے لئے وطنیت و قومیت کے بُت تراشے گئے، چنانچہ اسی زمانہ مین ایشیا پر یورپ کی یلغار شروع ہوئی، اور انہی جمہوری حکومتون نے اس کے بڑے حصّہ کو اپنا غلام بنا لیا، اُنہوں نے اپنے سیاسی و اقتصادی مفاد کے لئے انھون نے جس طرح مشرقی ملکون کو لوٹا، اور اہلِ مشرق کو ذلیل و خوار کیا اس سے ہر تاریخ دان واقف ہے؛

لیکن اہلِ مغرب اپنے جلو مین ایک دلفریب تمدن اور نئے علوم کی فوج بھی [illegible] لائے تھے، اس سے مشرقی ممالک اس قدر مرعوب و مسحور ہوئے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی مین فخریہ اُن کی تقلید کرنے لگے، چنانچہ جمہوریت کی برکتون کا غلغلہ بھی سارے مشرق مین پھیل گیا، اور اس کے بعد یہاں بھی جو نئے نظامِ حکومت قائم ہوئے اُن کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی، لیکن درحقیقت موجودہ جمہوری حکومتین جمہوریت کی روح سے بالکل خالی ہین، ان مین اور شخصی حکومتون مین صرف یہ فرق ہے کہ شخصی حکمران اپنے ذاتی فائدہ اور اقتدار کے لئے اپنی رعایا پر جو زیادتیاں کرتے تھے، جمہوری حکومتین وہی زیادتیان اپنے قومی مفاد کے لئے دوسری قومون پر کرنے لگین، جس پر مشرق کی تاریخ شاہد ہے، اقبال نے مختلف پیرایون مین اس نام نہاد جمہوریت کی پردہ دری کی ہے؛

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردون مین نہین غیراز نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا مین پائے کوب	تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق	طبِ مغرب مین مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں	یہ بھی اک سرمایہ دارون کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیان سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم مین جمہوریت کے چہرہ سے اس طرح نقاب اٹھائی ہے،

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ / مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
حقہ بازان چون سپہرِ گردگرد / از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد
شاطران این گنج ور آن رنج بر / ہر زمان اندر کمین یک دگر

فاش باید گفت سرّ دلبران
ما متاع و این ہمہ سوداگران

ان اشعار کی صداقت پر ایشیا و افریقہ کی گذشتہ دو تین صدیون کی تاریخ شاہد ہے، ایشیائی ملکون اور قومون کی غلامی اور ان کی تباہی اسی دورِ جمہوریت کا زرین کارنامہ ہے، جمہوریت کے بانی اول فرانس کے ہاتھون شمالی افریقہ کے مسلمانون پر اور جمہوریت کے نام بر طانیہ کے ہاتھون تمام ایشیائی ملکون پر جو کچھ گذری اور اب تک گذر رہی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے،

اس کا ایک سبب تو وہی نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، دوسرا سبب لادینی سیاست ہے، درحقیقت جو سیاست مذہب یعنی اخلاق روحانیت اور خوفِ خدا سے خالی ہوگی وہ کبھی دوسرون کے ساتھ انصاف نہین برت سکتی،

غیر حق چون ناہی و آمر شود / زور ور بر ناتوان قاہر شود
زیر گردون آمری از قاہریست / آمری از ما سوی اللہ کافری است
قاہر آمر کہ باشد پختہ کار / از قوانین گردِ خود بندد حصار
جرۂ شاہین تیز چنگ و زود گیر / صعوہ را در کارہا گیرد مشیر
قاہری را شرع و دستورے دہد / بے بصیرت سرمہ با کورے دہد
حاصل آئین و دستور ملوک / دہ خدایان فربہ و دہقان چو دوک

اس کا علاج صرف قوانین خداوندی کے مطابق حکومت ہے، جو قانون محض انسانی عقل و تجربہ

پر مبنی ہوگا، وہ ذاتی مفاد اور قومی غرض سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے اس سے تمام انسانون کے ساتھ عدل و انصاف کی توقع نہیں کیجا سکتی ہے جس کا تجربہ صدیون سے ہو رہا ہے، اور حکومت الٰہیہ کا نظام اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب نے نہین پیش کیا ہے جس کی بنیاد تمامتر عدل و انصاف پر ہے، اور جس مین نہ صرف محکوم قومون بلکہ عالم انسانیت کے حقوق متعین اور محفوظ ہین،

لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، کلیسا کی استبدادی اور تنگ نظر حکومت نے سارے یورپ کو مذہبی حکومت کا مخالف بنادیا، اور پھر اس کے ذریعہ یہ مخالفت ساری دنیا مین پھیل گئی، اور مغربی قومون خصوصاً انگریزون نے اسلام کی مذہبی حکومت کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ بدنام کیا، اور بعض مسلمان بادشاہون بالخصوص عجمی فرمانرواؤن کے غیر اسلامی اعمال نے ان کو بدنام کرنے کا اور زیادہ موقع دے دیا، لیکن جو لوگ اُن کے اعمال افعال سے اسلام پر اعتراضات کرتے ہین وہ اس فرق کو بھول جاتے ہین، کہ اسلامی حکومت اور مسلمان حکومت اور مسلمان فرمانروا دو الگ چیزین ہین[1] مسلمان فرمانرواؤن کے ذاتی اعمال سے اسلامی قوانین کا قیاس کرنا صحیح نہین اور اُن کے بُرے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہین ہے، ایسے سلاطین و حکمران، نہ اسلام کے صحیح نمایندے تھے اور نہ اس کا نظام حکومت اسلامی تھا، اُن کا مذہب ضرور اسلام تھا لیکن انکی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکومت مین اُن کی ملکی اور قومی روایات اور آئین و قوانین کا زیادہ اثر تھا، اور مسلمانون کے پرسنل لا اور بعض دوسرے ظاہری اسلامی اثرات کو چھوڑ کر ان کا نظام حکومت خالص دنیاوی تھا، ایسی حالت مین ان کو اسلامی حکومت کہنا اور اُن کے اعمال کی ذمہ داری اسلامی قوانین پر ڈالنا کسی طرح صحیح نہین ہے، بلکہ جن ملکون مین عجمی قومون کے ذریعہ اسلام پہنچا، وہ بھی اصلی شکل مین نہین تھا، اور اس مین بہت سے

---

[1] مسلمان حکومتون کو مجازاً تو اس معنی سے اسلامی کہہ سکتے ہین، کہ اُن کے فرمانروا مسلمان ہین، لیکن اُن پر حقیقی اسلامی حکومت کا اطلاق صحیح نہین ہوگا،

عجمی خیالات و عقائد شامل ہو گئے تھے، ایسی حالت میں اُن سے خالص اسلامی قوانین پر عمل کی توقع ہی نہیں کیجا سکتی تھی، یہ بھی اسلام کا بڑا احسان ہے کہ اس نے بہت سی پرانی خونخوار قوموں کو مہذب بنا دیا، اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ایسے بادشاہوں کا طرزِ عمل خود مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، جہاں اُن کے اقتدار اور حکومت کے مفاد کا سوال آجاتا تھا، وہ اُن کے لئے بھی ایک جابر و ظالم فرمانروا بن جاتے تھے، ایسے حکمرانوں کی تاریخ خود مسلمانوں کے ساتھ جنگ و خونریزی اور وحشت و بربریت سے بھری ہوئی ہے، چنانچہ اسلامی ملکوں اور اُن کی حکومتوں کے زوال کا ایک بڑا سبب اُن کی خانہ جنگی بھی ہے، تاریخی بحث میں پڑنے کا یہ موقع نہیں، اس سے ہر لکھا پڑھا شخص واقف ہے، کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ مسلمان مسلمان کا گلا کاٹتے، اور اُن کو محکوم بناتے رہیں، درحقیقت یہ سب کے سب دنیاوی بادشاہ تھے، اور اُن کی حکومتیں بھی خالص دنیاوی تھیں اور اُن کے پیشِ نظر ذاتی مفاد تھا، اور وہ اسلام کے نام کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے تھے، اگر ان میں اسلامی تعلیم کا کچھ بھی اثر ہوتا، تو وہ آپس میں لڑ لڑا کر اس طرح مسلمانوں کو تباہ نہ کرتے، لیکن ہر حکومت میں بعض فرمانروا ذاتی حیثیت سے صالح اور دیندار بھی تھے، اور انھوں نے بڑے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی، اور علم و فن تہذیب و تمدن اور انسانیت اور بعض حیثیتوں سے مذہب کی بھی خدمت انجام دی، خود ہندوستان کے بہت سے صالح مسلمان سلاطین کے زرین کارنامے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن ان کی حکومت بھی خالص اسلامی نہیں تھی بلکہ عجمی فرمانرواؤں کے مقابلہ میں عرب حکمران نسبتہً بہتر تھے، گو خلافتِ راشدہ کے بعد ان کی حکومت بھی خالص اسلامی نہیں رہ گئی تھی، پھر بھی اُن میں اسلامی تعلیمات کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا، اس لئے جب تک خلافت کی باگ عرب خلفاء کے ہاتھوں میں رہی اور وہ عجمی قوموں کے اثرات سے بالکل مغلوب نہیں ہو گئے، اُن کی دنیاوی حکومت بھی اسلامی اثر سے یکسر خالی نہیں ہوئی بنی امیہ دمشق خلافتِ عباسیہ کا ابتدائی دور اور اسپین کی اموی حکومت اس کی شاہد ہیں، جنھوں نے انسانیت کی بڑی خدمت انجام دی،

جن کے ذریعہ یورپ مین علم و فن اور تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی،

اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اسلامی تعلیمات کے اصل حامل و مبلغ عرب تھے اس لئے عجم کی نو مسلم اقوام کے مقابلہ مین ان مین اسلامی تعلیم کا زیادہ اثر تھا، یہی وجہ ہے کہ جن ملکون مین ان کی حکومت رہی، یا جہان اُن کے ذریعہ اسلام پہنچا، ان ملکون کی کایا پلٹ گئی اور وہ ان کے حُسن عمل اور اُن کے عدل و مساوات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے، چنانچہ جن ملکون مین اسلام کی حکومت کبھی قائم نہین ہوئی اور صرف عرب مبلغین کے قدم پہنچ گئے، وہان بھی اسلام کی روشنی پھیل گئی، جزائر شرق الہند یعنی انڈو نیشیا اور چین مین کبھی اسلام کی تلوار نہین پہنچی، لیکن آج پورا انڈونیشیا مسلمان ہے اور چین مین چھ کروڑ مسلمان ہین، خود ہندوستان مین مالابار کے سارے ساحلی علاقہ مین عرب مبلغین کے ذریعہ اسلام پھیلا،

یہ ایک ضمنی بات تھی جو درمیان مین آگئی، اصل مقصود یہ کہنا تھا کہ جن حکومتون کو اسلامی کہا جاتا ہے اور جن حکمرانون کے ذاتی اعمال کو اسلامی سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ حکومتین اور وہ حکمران دراصل اسلامی نہین بلکہ خالص دنیاوی ہین، اُن کو اسلامی نظام حکومت اور اس کے قوانین پر عمل سے کوئی تعلق نہین تھا، اس لئے اُن کے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہین ہے، اسلامی حکومت وہ ہے جس کا نظام قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق ہو جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، جس مین بلا امتیاز مذہب و ملت رعایا کے ہر طبقہ اور ہر فرد کے ساتھ انصاف برتا جائے، اُن کے تمام حقوق محفوظ ہون، اور وہ اپنے کو اپنی ملکی و قومی حکومت سے زیادہ محفوظ سمجھین، اور نہ صرف حکومت بلکہ ہر مسلمان اُن کے حقوق کا محافظ و نگہبان ہو، یہ کوئی خیالی آئیڈیل نہین، بلکہ تاریخی واقعہ ہے خلفائے راشدین کے زمانہ مین شام کے یہودیون اور عیسائیون مصر کے قبطیون، شمالی افریقہ کے بربر اور ایران کے مجوسیون کو اسلامی حکومت پر اپنی ملکی حکومت سے زیادہ اعتماد تھا، جس کے واقعات تاریخون مین موجود ہین،

اسلامی حکومت نے غیر مسلمون کو جو حقوق دئیے ہین، اس سے زیادہ اس دور ترقی مین بھی تصور مین

نہین آسکتے، ان کی تفصیل کی اس مختصر مضمون مین گنجائش نہین ہے، مختصر یہ ہے کہ اسلام مین غیرمسلم رعایا کو وہ تمام حقوق حاصل ہین جن کو آج کل شہری حقوق کہا جاتا ہے، چند بنیادی حقوق یہ ہین،

اُن کی جان و مال خواہ وہ کسی شکل مین ہو، عزت و آبرو، مذہب، عبادتگاہین، محفوظ رہین گی، اُن کو اپنے مذہبی مراسم کے ادا کرنے اور اپنے معاشرتی قوانین پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل رہے گی، اُن کے مذہبی نظام مین کوئی مداخلت نہ کیجائے گی، اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو کو مسلمانون کی جان و مال اور عزت و آبرو کے برابر سمجھا جائے گا، اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے گا، یا اس کے مال اور آبرو کو کوئی نقصان پہنچائے گا، تو قصاص مین قتل کیا جائے اور مالی نقصان اور بے عزتی کرنے کی سزا پائیگا،

حکومت کے عہدون مین تو اُن کے حقوق کی تصریح نہین ہے لیکن دولت بنی امیہ بنی عباس، دولت فاطمیہ مصر اور اسپین کی اموی حکومتون مین چند بڑے ذمہ دار عہدون مثلاً صوبہ داری، فوج کی سپہ سالاری اور قضا ت کو چھوڑ کر جن مین علم دین سے واقفیت ضروری ہے، باقی دوسرے عاملانہ عہدون خصوصاً مالیات کے شعبہ مین ذمی بڑے بڑے عہدون پر مامور تھے اور انکو ہر قسم کی ترقی کے مواقع حاصل تھے،

فقہ کی تمام کتابون مین اسلام کے دوسرے قوانین کی طرح حقوق الذمیین کا بھی باب ہوتا ہے، خصوصاً قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج مین اُن کے حقوق کی پوری تفصیل درج ہے[1]، علامہ شبلی نے بھی اردو مین اس موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس مین ذمیون کے حقوق کی پوری تفصیل ہے، اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیا گیا ہے، جو اس سلسلہ مین کئے جاتے ہین،

ممکن ہے نئے مسائل و حالات کی روشنی مین ان قوانین مین ترمیم اور بعض نئے قوانین کی ضرورت ہو، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اس کا دروازہ بند نہین ہے، اور علمائے مجتہدین اس کام کو کر سکتے ہین،

---

[1] یہ کتاب ہارون رشید نے اسلامی قانون خراج پر لکھوائی تھی، لیکن اس مین ذمیون کے حقوق کی بھی پوری تفصیل درج ہے، جس پر عباسی دور مین عمل درآمد ہوتا تھا،

اس بحث میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، اُن کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی انسانی حقوق کے احترام، عدل و انصاف، امن و صلح کی تعلیم، اور ظلم و جور فتنہ و شر اور دوسروں کی حق تلفی وغیرہ کی ممانعت اور اس قبیل کی دوسری اخلاقی تعلیمات سے خالی نہیں ہے اور اُن کے ذریعہ بھی عدل کے ساتھ حکومت کی جاسکتی ہے، اس سے انکار نہیں، اسی لئے کسی حکمراں قوم کی تاریخ بھی صالح اور عادل حکمرانوں سے خالی نہیں ہے،

لیکن اصل بحث محض اخلاقی تعلیمات کی نہیں، بلکہ اُن کی قانونی حیثیت کی ہے، قانونی حیثیت اور قوتِ نافذہ کے بغیر محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہے، اس لئے کہ اخلاقی تعلیم پر عمل اشخاص کی ذاتی صلاحیت اور سلامتِ طبع پر موقوف ہے، مثلاً ایک صالح حکمراں تو اخلاقی تعلیمات پر عمل کرتا ہی لیکن جو حکمراں ایسا نہیں ہے، اس کو مجبور کرنے والی کوئی قوت ہونی چاہئے، یہ قوت آئین و قوانین کی اسلامی نظام کی یہی خصوصیت ہے کہ اس کا پورا آئین اور اس کے قوانین موجود ہیں جن کی پابندی اخلاقی تعلیمات کی طرح ذاتی صلاحیت پر موقوف نہیں، بلکہ اس کا نفاذ اور اُن پر عمل قانونی فرض ہے، اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو اسلامی حکمراں اُن پر عمل نہیں کرتا، اس کو مجبور کرنے والی کونسی قوت ہے جس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں اس کا جواب اوپر گذر چکا ہے کہ وہ صحیح اسلامی حکمراں ہی نہیں جو اسلامی قوانین کا پابند نہ ہو، اور وہ اسلامی حکومت نہیں جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہو، اور اس بحث کا مقصد صحیح اسلامی حکومت ہے، درحقیقت خالص دنیاوی اور مادی فوائد کے لحاظ سے بھی اسلامی تعلیمات ایسی صداقتوں پر مبنی ہیں جن پر عمل کے بغیر انسانوں کو مادی فلاح اور دنیاوی امن و سکون بھی حاصل نہیں ہوسکتا چنانچہ آج انسانی حقوق کے احترام، عالمگیر انسانی اخوت و محبت، معاشی مساوات اور امن و صلح کی آوازیں ہر ملک سے بلند ہو رہی ہیں، اور جن باتوں کو دنیا آج نہیں مانتی، ان کے کل ماننے پر مجبور ہوگی، اسلام کے نام سے نہ سہی دوسرے ناموں سے سہی، اصل مقصد نام نہیں، بلکہ کام اور نتیجہ ہے، اگر دنیاوی معاملات

ہی کی حد تک صحیح اسلامی اصولوں پر دنیا کا عمل ہو جائے تو کم از کم مخلوقِ خدا کو دنیا میں تو امن وسکون حاصل ہو جائے گا،

اس لئے اقبال کی دعوت درحقیقت انسانی فلاح وسعادت کی دعوت ہے جس میں تمام برحق اور الہامی مذاہب کی اصولی تعلیمات شامل ہیں، انھوں نے شاعری کے علاوہ اپنی کتابوں اور تحریروں میں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، خیال آتا ہے کہ اسرارِ خودی کے انگریزی مترجم ڈاکٹر نکلسن یا کسی دوسرے ریویو نگار کے اعتراض پر انھوں نے یہی جواب دیا تھا کہ اُن کے نزدیک انسانوں کی نجات اور اُن کے تمام مشکلات کا حل اسلام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اس وقت ان کا اصل جواب سامنے نہیں ہے، اس لئے اُن کے صحیح الفاظ نقل نہیں کئے جا سکتے، مگر اس کا مفہوم قریب قریب یہی تھا،

پروفیسر آل احمد سرور نے اُن کی بعض تعلیمات اور اشعار کے متعلق اپنے کچھ شکوک اور اعتراضات لکھ بھیجے تھے، اُن کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا،

آپ کے دل میں جو باتیں پیدا ہوئیں، اُن کا جواب بہت طویل ہے، اور میں بحالت موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں، اگر میں کبھی علی گڈھ حاضر ہوا، یا آپ کبھی لاہور تشریف لائے، تو انشاء اللہ زبانی گفتگو ہو گی، سرِ دست میں دو چار باتیں عرض کرتا ہوں،

۱- میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے، میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے، میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے، اگر آپ پورے غور و توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے آپ انہی نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں، یہ ممکن ہے آپ کا ریویو مجھ سے مختلف ہو، یا آپ خود دینِ اسلام کے حقائق ہی کو ناقص تصور کریں، اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہے،

۲۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے میرے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہین کیا ہے، اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو مین آپ کو دوستانہ مشورہ دیتا ہون کہ آپ اس طرف بھی توجہ کرین، کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتین خود بخود اس کی سمجھ مین آجائین گی، (رسالہ ماہ نو اگست ۱۹۷۷ء)

ان سطور مین انھون نے اپنے کلام کے متعلق اس قسم کے تمام اعتراضات کا جواب دیدیا، تاہم اس سے انکار نہین کہ اقبال انسان تھے، اُن سے غلطی بھی ہو سکتی ہے، اور ان کی بعض تعلیمات مین اختلاف کی گنجایش نکل سکتی ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ بلا اختلاف مذہب و ملت تمام قومون کے لئے درس حیات ہین،

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ تو اقبال کے معترضین کا جواب تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اپنے نفس اور اپنی ذات پر خدا کے قوانین کی حکومت قائم کئے بغیر سیاسی حکومت الٰہیہ وجود مین نہین آسکتی، یعنی جب تک مسلمان اپنے اعمال اور اپنی انفرادی زندگی مین خدا کے احکام کے پابند نہ ہون گے، اور ان کی زندگی اسلامی سانچہ مین نہ ڈھل جائے گی، اس وقت تک حکومت الٰہیہ کا قیام ممکن ہی نہین ہے، اور جب وہ خود نمونہ عمل بن جاین گے، تو دنیا خود بخود اسلامی نظام کی طرف کھچے گی اور بغیر کسی دعوت و تبلیغ کے حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے گی،

مذہبی عقیدہ و تعلیم اصول فطرت اور تاریخی واقعہ ہر لحاظ سے حکومت الٰہیہ کے قیام کی یہی تنہا یہی ایک شکل ہے اس بارہ مین قرآن مجید کا وعدہ یہ ہے،

"اللہ تعالیٰ نے اُن لوگون سے جو ایمان لائے، اور عمل صالح کئے، یہ وعدہ کیا ہے کہ روئے زمین پر اُن کو اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے والون کو خلیفہ بنایا تھا"

یعنی استخلاف فی الارض ایمان وعمل صالح کے ساتھ مشروط ہے،

اصول فطرت یہ ہے کہ عملی نمونہ کے بغیر کوئی تعلیم اور کوئی دعوت خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی کامیاب نہین ہو سکتی، اور ہر دعوت کے لئے ضروری ہے کہ داعی کی پوری زندگی خود دعوت کا عملی نمونہ ہو، اس لئے

مسلمان جب تک اپنی انفرادی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا مثالی نمونہ نہ پیش کر سکیں گے اس وقت تک محض زبان سے اُن کی دعوت بے نتیجہ اور بے اثر رہے گی لیکن اگر وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ اسلام ہی ہر حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہے، تو دنیا خود بخود اس سے متاثر ہو گی اور بغیر دعوت کے اس کی طرف کھنچ آئے گی ع

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اور یہ اصول نہ صرف اسلام اور حکومت الٰہیہ بلکہ دنیا کی ہر تعلیم اور ہر نظام کے لئے یکساں ہے، چنانچہ اگر آج نسلی و جغرافی قومیت و وطنیت کے جذبات سے بلند ہو کر صحیح جمہوری اصولوں پر عمل کیا جائے تو دنیا صحیح جمہوری نظام کو قبول کرے گی اور اس لئے کہ وہ تو اپنے مشکلات کا حل اور اپنے مصائب کا علاج چاہتی ہے، یہ علاج جس نظام میں بھی ملیگا اس کو بلا تامل قبول کرے گی، اس لئے اگر مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانیت کے امراض کا علاج اسلامی نظام میں ہے اور یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے تو انھیں عمل سے اس کا ثبوت دینا چاہئے۔

تاریخی حیثیت سے بھی اسلامی نظام کی تبلیغ اور اس کی کامیابی کی یہی ترتیب ہے، اسلام کے ظہور کے ساتھ حکومت الٰہیہ نہیں قائم ہو گئی تھی، بلکہ پہلے برسوں کی اور پھر ابتدائی مدنی زندگی میں اس میں عمل کی روح پیدا کی گئی، اور جب وہ نمونۂ عمل بن گئے، اس وقت حکومت الٰہیہ کی بنیاد پڑی اور جب خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس کا مکمل مثالی نمونہ قائم ہوا، اس وقت خود بخود دوسری قومیں اس نظام کو قبول کرنے لگیں، اس لئے اسلامی نظام کے دعوت کی کامیابی اور ناکامی مسلمانوں کے عمل پر منحصر ہے۔

لغات جدید ۂ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت مع ضمیمہ جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ۔

قیمت عہ

منیجر

ہندوستان مین توپ کی تاریخ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۳)

عہد جہانگیری
اکبر کی پچاس سالہ حکومت کے باعث ملک مین امن و امان اور خوشحالی کا دورہ تھا، سلطنت کے کسی حصہ مین کوئی جنگ درپیش نہ تھی، اس لئے جہانگیر جب تخت نشین ہوا، تو اس کو سوائے عیش و عشرت کے دوسرا کام نہ تھا، اس لئے اس کے عہد مین فوجی تنظیم وہی رہی، جو اکبر کی قائم کردہ تھی جس مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی، مگر توپ خانہ مین جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض معمولی بغاوتون کے فرو کرنے کے لئے جو فوجین گئین اُن مین توپون کی تعداد اس عہد کے لحاظ سے کہین زیادہ تھی، تزک جہانگیری مین بنگالہ کے زمیندار عثمان کی بغاوت کے متعلق ہے،

درین حالت عبد السلام پسر معظم خان با جمعے	اس حالت مین عبد السلام پسر معظم خان
از بندہاے درگاہ کہ مجموعہ سی صد سوار و	شاہی ملازمون کی ایک جماعت لے کر
چہار صد توپچی باشند میرسند[1]،	جس مین تین سو سوار توپچی تھے، پہنچی،

اسی طرح قلعہ کانگڑا کے فتح کے لئے جب راجہ بکرماجیت کو بھیجا گیا، تو ایک بڑا توپ خانہ بھی اسکے ساتھ تھا، اقبال نامہ مین ہے،

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۱، جشن ہفتم علی گڈھ،

دو دویست سوار برقنداز و پانصد نفر توپچی	دو سو سوار برق انداز اور پانصد توپچی پیادے
پیادہ سوائے جمعیتے کہ بیشتر تعین شدہ بودند	اُن لوگون کے علاوہ جو پہلے سے مقرر ہوئے
بخدمت تسخیر قلعہ کانگڑا دستوری یافتہ تبنا ت	تھے، قلعہ کانگڑہ فتح کرنے کے لئے مامور ہوئے
خلعت و شمشیر سرفراز گردیدہ[۱]	خلعت اور تلوار عطا کرکے سرفراز کئے گئے،

آگرہ مین ایک توپ تھی جس کا نام ظفر بخش تھا اس کے بنانے والے کا نام استاد سلطان محمد ہے اس کا وزن ۴۶۴۴ من چھ سیر تین پاؤ تھا، اس توپ پر کندہ تھا" الفقیر سلطان محمد بن عبد الغفور دہلوی سنہ ۱۰۳۱
فتح دکن کرد لطف اللہ شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ[۲]"

شاہجہان جب ۱۰۳۷ھ مین سریر آرائے سلطنت ہوا، تو مغلیہ سلطنت عروج پر تھی، اس عہد مین جنگ قندھار اور حملۂ دکن کے سوا کوئی جنگ قابلِ ذکر نہین ہے، قندھار مین جو توپین استعمال ہوئین کچھ زیادہ بڑی نہ تھین، چنانچہ اورنگ زیب کے خطوط مین جو شاہجہان کے نام ہین، اس کا بار بار تذکرہ آتا ہے دارا شکوہ جب قندھار جانے لگا ہے، تو دو توپین، غالباً چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاہور مین چھوڑ گیا تھا، اُن مین سے ایک کا نام فتح مبارک اور دوسری کا کشور تھا، دہلی سے دو توپین اور روانہ کی گئی تھین قلعہ کشا، اس کا طول ۲۵ فیٹ تھا، اس مین اسی فی صدی تانبا، اور باقی ٹین تھا،

ایک توپ "جہان کشا" تھی، اس کا طول ۱۰ فیٹ دور ۱۵ فیٹ اور دہانہ ایک فیٹ کا تھا، یہ ڈھاکہ مین ڈھالی گئی، ۳ رجمادی الآخر جلوس (یعنی ۱۰۴۷ھ) اس پر کندہ ہے،

ارغن اکبر کے عہد مین جو مشین گن تیار ہوئی تھی، اس مین اس زمانہ مین بڑی بڑی ترقی ہوئی ہے ایک فرانسیسی نے جو ۱۰۶۹ھ مین ہندوستان آیا ہے اپنے ایک خط مین لکھا ہے، کہ ارغن نامی ایک ایسی

[۱] اقبال نامہ ص ۱۱ کلکتہ [۲] تعمیر تاج محل قلمی کتب خانہ سیلیم پور (لکھنؤ) لیکن شبلی منزل مین جو قلمی نسخہ ہے اس مین ۱۰۳۰ھ ہے، [۳] لیکن ڈاکٹر برنیر لکھا ہے کہ اس جنگ مین اورنگزیب نے انگریزی فرانسیسی جرمنی پرتگیزی توپین استعمال کی تھین لیکن اُس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہین ہوتی،

تیار ہوئی ہے، جس مین ۲۰ نال بندوق بیک وقت ایک فلیتہ سے سر ہوتی ہے[۱]،

دھول دہان نظام شاہی توپون مین سے ایک توپ "دھول دہان" تھی، اس کو دیکھکر شاہجہان نے سلطان محمد کو حکم دیا کہ اسی طرح کی دوسری توپ ڈھالی جائے، چنانچہ سلطان محمد بن عبدالغفور دہلوی نے اس کو ڈھالا، اس کی خصوصیت یہ تھی، کہ اس مین دوسری دھاتون کے علاوہ دو من چھ سیر چاندی اور ۲۵ سیر سونا بھی لگایا گیا تھا، اس کی مزدوری پر ۲۳۵ روپیے خرچ ہوئے،

عہد عالمگیری عالمگیر کی ساری عمر چونکہ جنگون مین گذری، اس لئے فوجی ضروریات کے لحاظ سے توپخانے کی جس قدر اُس کو ضرورت تھی، اس کے پیش رو بادشاہون مین سے اکبر کے بعد کسی کو نہین پیش آئی اس نے توپخانہ کو اعلیٰ پیمانہ پر پہنچانے کے لئے باہر سے بہت سے ماہرین فن کی خدمات حاصل کی گئی ہین،

مینڈھا توپ ان مین سے ایک محمد حسین عرب تھا، جو اعلیٰ درجہ کی توپین تیار کرتا تھا، اس کی بنائی ہوئی بعض توپین آج بھی موجود ہین، اُن مین سے ایک توپ دولت آباد مین چینی محل کے پاس قلعہ کے دروازہ کے نزدیک ایک برج پر رکھی ہوئی ہے، اس کا اصلی نام "قلعہ شکن" ہے۔ مگر آج کل اسکو "مینڈھا توپ" اس لئے کہتے ہین کہ اس کا سر مینڈھے کی طرح ہے، اس توپ کے سیدھے جانب گولہ کے صدمہ سے گڈھا پڑ گیا ہے، اس کا طول ۱۰ فیٹ ۱۰½ انچ، کان کے پاس کا دور سات فیٹ دو انچ، دہانے کا دور پورے پانچ فیٹ ہے، اور دہانہ ایک فٹ دو انچ کا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس کا گولہ ایک منی ہوگا، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

نَصرٌ مِّنَ اللّٰہ فتح قریب وبشّر المؤمنین فاللہ خیر حافظا ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، توپ قلعہ شکن، عمل محمد حسین عرب"

اس زمانہ مین گولہ اندازون مین ہندوستانی اور عرب کے علاوہ بعض ڈچ بھی ملازم تھے، چنانچہ

[۱] نظام فوج مصنفہ ارون صاحب لندن ص ۱۳۰،

ایک ڈچ انجینیر جس کا تعلق توپخانہ سے تھا پندرہ سولہ سال تک ملازم رہا، سیواجی سے جنگ کے بعد جب راجہ جے سنگھ واپس آیا، تو اس کی سفارش سے رخصت لیکر ۱۶۶۷ء میں اپنے وطن واپس چلا گیا،[۱]

دھول دہان | اس وقت تک کوئی شہادت ایسی نہیں ملی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ خود ہندوستانیوں نے اس فن کی جانب کتنی توجہ کی، دولت آباد کے ایک برج پر ایک توپ لکڑی کی گاڑی پر رکھی ہوئی ہے، اس کا نام "دھول دھان" ہے، یہ بیجاپوری توپ ملک میدان کے قریب قریب ہے، اس کا طول ۱۹ فیٹ دس انچ، کان کے پاس کا دور ۷ فیٹ، دہانہ کا دور چار فیٹ آٹھ انچ ہے،

یہ ایک ہندو منگل سنگھ کی بنائی ہوئی ہے، اندازاً اس توپ کا وزن دو سو پچانوے من ہے،

اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

"عمل منگل سنگھ ولد رگھناتھ کشن داس ولد تسنگ جی، توپ دھول دہان بابت

جوڑا کٹرہ، طوب، تب در، سری درگ،

سایغ ۲۰ ۲۹۵

یہ تحریر مرہٹی زبان میں ہے اور مرہٹی زبان کا عروج عہد عالمگیر سے شروع ہوا، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ یہ توپ اسی عہد کی ہے، یا ممکن ہے نظام شاہ کے عہد کی ہو، اس لئے کہ نظام شاہیوں کے عہد میں بھی مرہٹے بہت کچھ سلطنت میں دخیل ہو چکے تھے، چنانچہ ملک عنبر نے ان کا ایک دستہ تیار کیا تھا، جس کو بڑے بڑے دھاوے کرکے غنیم کو لوٹ لینا سکھایا تھا، یہ طرز مرہٹوں کو اس قدر پسند آیا، جس کو وہ اپنے زوال کے آخری زمانہ تک کام میں لاتے رہے، محاصرہ گولکنڈہ میں دو توپیں "اژدہا پیکر" اور "دشمن کوب" اتنی بڑی تھیں کہ ان کی آواز کی دھمک سے دیواریں ہلنے لگتی تھیں، افسوس کہ موقع پاکر اس کو غنیم نے بے کار کر دیا،

اسی قسم کی ایک دوسری توپ تھی، جس کا نام توپ کلان تھا، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ تھی،

---

[۱] سفرنامہ تیورنیر بیان دولت آباد،

"ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۱ھ گولہ ۲۵ سیر

می مقرر داس ابن رام جی (اسیر قلعہ!) توپ ریز"[۱]

اس عہد کا مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ ایک جنگ میں عالمگیر کی فوج میں ستر بڑی توپیں تھیں، اُن میں سے بعض کو ۱۲ جوڑی بیل کھینچتے تھے اور سڑک خراب ہونے کی صورت میں ہاتھی استعمال کرتے تھے،

خاص قسم کی چھوٹی چھوٹی پیتل کی خوبصورت توپیں گاڑیوں میں بادشاہ کے ساتھ جلوس میں چلتی تھیں، اُن کو دو گھوڑے کھینچتے تھے، یہ توپیں دراصل زنال قسم کی ہوتی تھیں، مگر بادشاہ کے ساتھ رہنے کے سبب اُن کا نام آخر میں حاضر رکاب رکھا گیا،[۲]

ہوائی توپ | اسی زمانہ میں ایک اور دلچسپ توپ ایجاد ہوئی تھی، اس کا نام ہوائی توپ تھا قلعۂ ڈنڈا ن کی فتح کے موقع پر یہ توپ یاقوت شیدی نے سیواجی کی جنگ میں استعمال کی تھی، اس توپ کو درخت یا مچان پر رکھ کر فیر کرتے تھے، خافی خان لکھتا ہے،:

"توپہائے ہوائی بہم رسانده بر درختہا بستہ وقتِ شب طرف ڈنڈان آتش می داد"

آگے چل کر پھر ایک جگہ لکھتا ہے،

"از ڈون توپہائے ہوائی و دیگر فراہم آورد،"[۳]

اس وقت تک گولے اور گولیاں پتھر اور لوہے کی مستعمل تھیں، مگر اس عہد میں شیشے کا بھی استعمال شروع ہو گیا تھا، حافظ محمد امین خان گورنر گجرات متوفی ۱۰۹۳ھ کے مال و اسباب کا جب جائزہ لیا گیا ہو تو اس میں ایک من سیسہ بھی تھا، مآثر عالمگیری میں ہے:۔

"خسرو بیگ چیلہ، حافظ محمد امین خان مرحوم کا مال و اسباب احمد آباد سے لے کر حضور میں

---

[۱] تعمیرات محل علی کتب خانہ سلیم پور لکھنؤ [۲] سفرنامہ برنیر، [۳] منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۲۶،

حاضر ہوا اور سترہ لاکھ روپیہ ایک لاکھ ۳۵ ہزار اشرفیاں، چارسو بیس گھوڑے ایک سو ستر اونٹ، ایک من سیسہ، چار من باروت خان مرحوم کا اثاثہ جہان پناہ کے ملاحظہ میں گذرانا گیا[۱]

عالمگیری عہد میں توپ خانہ کے متعلق حسب ذیل عہدہ دار تھے، (۱) داروغہ (افسر) توپ خانہ (۲) میر آتش، (۳) گولہ انداز (۴) انجینیر (۵) سپاہی، توپ خانہ کا داروغہ پہلے مومن خان پھر حاجی مقیم خان بنائے گئے، کچھ دنوں امان اللہ بیگ بھی رہا[۲]، میر آتش کے عہدے پر صف شکن خان، صلابت خان، سید عزت خان اور مخلص خان وغیرہ مقرر ہوتے رہے[۳]، یہ سب افسر ذی عزت اور صاحب منصب ہوتے تھے، چنانچہ مخلص خان ایک ہزار اور سی صد سوار کے منصب پر فائز تھے[۴]

عالمگیری عہد میں بے شمار توپیں موجود تھیں جن کا شمار مشکل ہے، ان میں سے اکثر ہندوستان میں تیار کی گئی تھیں، مگر دوسرے ملکوں کی توپیں بھی مختلف طریقوں سے جمع ہوگئی تھیں، ان میں سے ایک ہزار چھبیس ۱۰۲۶ عدد برنجی اور آہنی وہ توپیں تھیں جو جنگ چاٹگام میں پرتگیزوں اور اراکانیوں سے فتح کے بعد بطور مال غنیمت حاصل ہوئی تھیں[۵]

زمزمہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے افسر توپ خانہ ابراہیم خان کے ماتحت قلعہ شکن توپوں کے علاوہ دوسو میدانی توپیں تھیں، اور احمد شاہ ابدالی کے پاس صرف تیس توپیں، ان توپوں میں سے ایک کا نام "زمزمہ" تھا، یہ توپ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے اس کے وزیر ولی خان نے لاہور کے ایک مشہور توپ ساز شاہ نظیر سے ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۷ء میں تیار کرائی تھی، اسی جوڑ کی ایک دوسری توپ بھی اس نے تیار کی تھی، جو جنگ پانی پت کے بعد کابل لیجاتے ہوئے دریائے چناب میں غرق ہوگئی تھی، یہ دونوں توپیں تیل اور تانبہ ڈھال کر بنائی گئی تھیں، اس کی لمبائی ۱۴ فیٹ ۴½ انچ اور اس کا دہانہ ۹½ انچ ہے،

---

[۱] ماثر عالمگیری جلوس ۲۱، [۲] رقعات عالمگیر بنام فرزند عالی جاہ، [۳] ماثر عالمگیری جلوس ۳، [۴] ماثر جلوس ۳، [۵] عالمگیر نامہ،

پانی پت کی فتح کے بعد ابدالی اس توپ کو خواجہ عبید گورنر لاہور کے پاس چھوڑ گیا، جس سے ۱۷۶۲ء
ں ایک سردار ہری سنگھ بھنگی نے چھین لی، جو ۱۷۶۴ء تک لاہور کے شاہ برج مین پڑی رہی، اسی سنہ
ں گوجر سنگھ نے سردار چڑت سنگھ کو جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دادا تھا، دے دی، وہ گوجرانوالہ لے گیا، پھر راجپوت
ردار احمد خان وہان سے احمد نگر (پنجاب) اٹھا لے گیا، کچھ دنون کے بعد گوجر سنگھ نے اُن سے لے لی،
برس کے بعد چڑت سنگھ کے ہات آئی، ۱۷۷۲ء مین یہ توپ پھر احمد خان کے ہاتھ لگی، جس کو اُس نے رسول نگر
پہنچا دیا، ۱۷۷۳ء مین سردار جھنڈا سنگھ بھنگی اُن سے چھین کر امرت سر لے گیا، اور ۱۸۰۲ء مین امرت سر
تح ہونے پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ مین آئی، اس سے مہاراجہ نے بڑا کام لیا، ڈسکہ، قصور، سجانپور،
زیرآباد اور ملتان کی لڑائیون مین اس کو استعمال کیا، ۱۸۱۸ء مین اس توپ کو محاصرۂ ملتان مین بڑا
نقصان پہنچا، اور لاہور کے دہلی دروازہ پر عرصہ تک پڑی رہی، ۱۸۶۰ء مین انگریزون نے یونیورسٹی
ل اور عجائب خانہ کے درمیان ایک چبوترہ پر نصب کردی، جو اب تک موجود ہے، اس کے دہانہ پر مندرجہ
یل شعر کندہ ہے،

بامرہ در دوران شاہ ولی خان وزیر	ساخت توپ زمزمہ نام قلعہ گیر (عمل شاہ نظیر)

توپ کے پشت پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہین، جس کے آخری مصرعہ سے تاریخ بھی نکلتی ہے،

در زمان شہ فریدون فر	داور داد بخش عدل شعار
در دوران عصر احمد شاہ	خسرو تخت گیر و جم مقدار
شد بدستور اشرف الوزراء	امر از سدہ سپہر مدار
کہ بر زد باہتمام تمام	توپ ثعبان شکوہ کوہ وقار
خانہ زاد شہ سپہر سریر	شہ ولی خان وزیر اکثر کار
بہر تقدیم آن مہم سترگ	کرد استاد چند را احضار

تا بسعی تمام ریختہ شد — زمزمہ نام توپ نادرکار

قلعہ کوب حصار چرخ دوم — شد باقبال شاہ روبکار

سال تاریخش از خرد جستم — کرد با وحشت آن چنان اظہار

کہ اگر نفت جان کنی تسلیم — راز پنہان تو کنم تکرار

بعد تسلیم او بگفتا توپ — پیکر اژدہائے آتشبار ۱۱۵۵ھ

چونکہ یہ توپ کچھ عرصہ تک سکھوں کے "بھنگی" سرداروں کے پاس رہی، اس لئے اس کا نام "بھنگی توپ" بھی ہے۔[۱]

۱۱۸۲ھ میں ملتان کے امیر نواب محمد شجاع خان بہادر نے کوہ شکن نامی ایک توپ تیار کرائی تھی، جس پر مندرجہ ذیل کتبہ تھا، غالباً دہانہ پر یہ شعر ہے۔ اس کا وزن ایک سو دس من ہے:

" چو اژدر ہا بجان ودل بسے داغ کین دارم — حذر کن اے رقیب از من کہ آتش در دہان دارم

اور پشت پر مندرجہ ذیل اشعار اور عبارت ہے،

اے راست روی توپ ز نواب نامدار — در راستی و پردلی خود یگانہ

اژدر وے و شیر نر ادے و جنگجو — ماری دھرہ دار وے و صاحب خزانہ

ساکنہ نواب محمد شجاع خان بہادر صفدر جنگ ۱۱۸۲ھ ہجری النبوی اسمش کوہ شکن بوزن

یک صد و دہ من گولہ بمقدار دہ من و باروت نصف از گولہ در وزن۔[۲]

فتح ملتان کے بعد یہ توپ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ آئی، اور فتح لاہور کے بعد ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے اس کو کلکتہ پہنچا دیا،

ملک میدان بہادری | اس نام کی یہ تیسری توپ ہے اسی لئے اس کے نام کے ساتھ شناخت کے لئے لفظ

۱؎ رسالہ ادب لطیف لاہور مارچ ۱۹۴۵ء بہ تصرف و اختصار، ۲؎ تاریخ پنجاب ص ۱۸۱،

بھاری کا اضافہ کر دیا ہے، اس کا گولہ ایک من کا ہوتا تھا، اور ایک سو پچاس بیل اور دو ہاتھی اس کو کھینچتے تھے،

۱۱۲۴ھ میں جب فرخ سیر بادشاہ اکبرنگر (راج محل) سے عظیم آباد پٹنہ گیا، تو اس وقت یہ توپ کیچڑ میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی، کہ ہر چند بیل اور ہاتھی زور لگا کر کھینچتے تھے، مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتی تھی،

فرخ سیر خود توپ کے پاس آیا، اور توپ خانہ کے فرنگی ملازموں کی تدبیروں سے نکالنا چاہا، مگر کسی طرح کامیابی نہیں ہوئی، اس وقت میرزا اجمیری آداب بجالا کر عرض پرداز ہوا، کہ اگر اجازت ہو تو بندہ بھی ایک دفعہ زور آزمائی کرے، فرخ سیر نے اجازت دی، میرزا موصوف نے گاڑی کے پہیوں (چکوں) میں ہاتھ ڈال کر سینہ تک اس توپ کو اٹھالیا، اور عرض کی جہاں ارشاد ہو رکھدوں،

فرخ سیر نے بلند زمین کی طرف اشارہ کیا، میرزا نے نیچی زمین سے لیجاکر بلند زمین پر رکھدیا، اس زور آزمائی سے قریب تھا کہ میرزا موصوف کے آنکھوں سے خون ٹپک پڑے، یہ قوت دیکھ کر فرخ سیر نے بیحد تعریف کی، تماشائی بھیلے تو دم بخود رہ گئے، پھر تحسین و آفرین کی صدا اس قدر زور سے بلند کی، کہ تمام میدان گونج اٹھا، اُس کے صلہ میں مرزا کو سہ ہزاری کا منصب عطا ہوا، اور "افراسیاب خان" کے خطاب سے سرفراز ہوا[1]، غالباً فرخ سیر اس توپ کو دہلی ساتھ لے گیا ہوگا، کیونکہ بنگالہ کی تاریخ میں پھر اس کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے،

محمد شاہ بادشاہ دہلی نے کرنال کی جنگ میں ایسی توپیں استعمال کیں جن کو پانچ سے دس ہاتھی یا ۵۰۰ سے ایک ہزار بیل تک کھینچتے تھے[2]، غرض مغلیہ سلطنت کے زوال پر ہر قسم کی توپیں ایجاد ہو چکی تھیں جن میں سے ہلکی بھی تھیں، اور وزنی بھی، بعض توپیں ہاتھی پر لاد دیجاتی تھیں، اور دو سپاہی بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے، ان کا نام "گجنال" تھا،

کچھ توپیں اونٹوں پر لاد کر لیجاتے اور اُن کی پشت سے دشمنوں پر فیر کرتے، اس کے لئے اونٹوں کو

---

[1] ریاض السلاطین ص ۲۶۹ مطبوعہ کلکتہ [2] نظام فوج اردن صاحب،

خاص طور پر سدھایا جاتا تھا، ایسی توپوں کا نام "شتر نال" تھا، "ہتھ نال" غالباً ان توپوں کو کہتے ہوں گے جن کو آدمی ہاتھ سے اٹھا لیتے ہوں گے، یہ "تر نال" سے چھوٹی ہوتی ہے، اسی طرح "زنبورک" شاہین "دھماکہ" "رام جنگی" "رہکالہ" "بدالیجہ" "سنگ زاد" "سرکوب" "جادر" وغیرہ مختلف قسموں اور ناموں کی توپیں اور آتشیں اسلحے موجود تھے، جن کا ذکر اس عہد کی تاریخوں میں کثرت ملتا ہے،

سکھوں کا توپخانہ مغلیہ سلطنت کے زوال پر دو طاقتور سلطنتیں پیدا ہوئیں، پنجاب میں سکھوں کی اور دکن میں مرہٹوں کی، سکھوں نے اپنے ابتدائی دور میں توپوں کا زیادہ استعمال نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فرقہ ایک مذہبی حیثیت رکھتا تھا، لیکن جب اُن میں جنگی جوئی پیدا ہو گئی، تو اس طرف بھی اُن کا رجحان ہوا،

لکڑی کی توپ چنانچہ ۱۷۱۰ء اور ۱۷۱۵ء کی جنگ لوہ گڑھ اور گرداس پور میں جب اُن کو توپیں نہ ملیں تو انھوں نے عجب طریقہ سے توپ تیار کی، یعنی بڑے بڑے املی کے درختوں کو کاٹ کر اس کے تنوں میں سوراخ کر کے توپ کی جگہ استعمال کیا، گو یہ طریقہ کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہوا، لیکن غنیم کو توپ کا خوف دلانے کے لئے کافی تھا[1]،

سکھوں کے عروج کا زمانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا عہد ہے، اس زمانہ میں توپخانہ کو ترقی دینے کی کافی کوشش کی گئی، اس کے متعدد کارخانے لاہور میں قائم ہوئے، ملکی اور غیر ملکی، اور مسلم اور غیر مسلم ہر قسم کے ماہرین فن کی قدردانی کر کے اُن سے فائدہ اٹھایا گیا،

لاہور میں صوبہ سنگھ کا کارخانہ اس کے لئے زیادہ مشہور تھا، بعض توپوں پر صرف "کارخانہ دارالسلطنت" کندہ پایا گیا ہے، جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ سرکاری کارخانہ ہو،

توپ بنانے والوں میں بھی سکھ اور مسلمان دونوں نظر آتے ہیں، ان میں سے بسران سدھا سنگھ اور رائے سنگھ زیادہ مشہور تھے، مسلمانوں میں محمد حیات فضل علی اور باقی خان زیادہ نامآور ہوئے،

[1] نظام فوج مصنفہ ارون صاحب (لندن)

توپ

کارخانہ کے افسر اعلیٰ جواہرل (رسدو) سردار تیج سنگھ، لنکا سنگھ، قادر میان بخش، امام الدین بہادر، اور
شیوالیر صاحب جنرل کورٹ فرانسیسی تھے، جنرل موصوف نے توپخانہ کو یورپین طرز پر کارآمد بنایا
ی فیاضی سے متعدد شاگرد بھی پیدا کئے،

ان توپون پر مہاراجہ کے بعد اُن افسرون کے بھی نام ہوتے تھے جن کے ماتحت یہ کارخانے ہوتے
اور توپ ساز کا نام اور تاریخ بھی ہوتی، مگر عموماً سنہ بکرمی استعمال کرتے تھے، اور مغلیہ سلطنت کی تقلید
س پر اشعار بھی کندہ کراتے، عام طور پر زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، مگر آخر مین ہندی (غالباً
ی) استعمال کرنے لگے تھے، کسی پر انگریزی مین بھی کچھ الفاظ تحریر کئے گئے ہین،

۱۸۴۶ء مین جب سکھون نے انگریزون سے شکست کھائی، تو دوسو بیس ضرب توپ انگریزون
مین لین، اور ۳۶ توپین صلح کے بعد لاہور سے حاصل کین، غرض کل ۲۵۶ توپین، صرف لاہور سے
اُرکے کلکتہ کے بندرگاہ سے لندن فتح لاہور کی یادگار مین روانہ کی گئین[۱]،

ان توپون مین سے بعض پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

ک (۱) کال سہائے نظم

توی طالع شاہ رنجیت سنگھ	ہمہ ملک را زیر کردہ چو خنگ
کھڑک سنگھ شہزادہ عالی مکان	کہ دانائے کوران بود مادران
فتح جنگ شد در زمانے تیار	کہ ہجدہ صد و بود ہشتاد و چار
جمعدار این توپ شد ورائے سنگھ	کہ در جان فشانیست ادبے درنگ
بموجب صلاح لالہ جے سنگھ یار	غلام نبی گفت تاریخ وار

دستخط گر و تاراگیر بتاریخ پنجم ماہ ماگہ سنبت ۱۸۸۴ (بکرمی)

[۱] تاریخ پنجاب ص ۳۹ مولفہ منشی عبدالکریم صاحب،

اس کے علاوہ کچھ ہندی (یا گورکھی) مین بھی کندہ تھا،

(۲) توپ سی بان بر دن بابت شتا ہولی، طول یپ وال للہ در عہ ۱۲۶ ادیؔ

اس کے بعد کچھ گورکھی مین تحریر ہے،

فتح و نصرت | (۳) سری اکال سہائے نظم

ہست این توپ مصر بجلی رام ... ہاتفش گفت فتح و نصرت نام

ضرب آتش فشان و برق شرار ... صبح اعدا، از دود او چون شام

جنگ بجلی | بفضل اکال سہائے از حکم پادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ جنگ بجلی باہتمام جواہرمل بکارخانہ صوبہ سنگھ ساخت دار السلطنت لاہور سمبت ۱۸۹۴ (بکرمی) در تحت سردار فتح سنگھ،

ترنگ گھی | بفضل سری اکال پور کہ جی از حکم رنجیت سنگھ بادشاہ بہادر بلند اقبال ترنگ گھی کارخانہ دار السلطنت لاہور باہتمام جواہرمل سنبت ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

فتح بان | بفضل سری اکال پور کہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ وسلطنۃ سری مہاراجہ صاحب او جیراج ہذا ضرب موسوم بہ فتح بان حسب الامرا قدس در ۱۸۹۴ء از سال راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب ارسطو فطرت افلاطون فطنت موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

شش بان | بفضل اکال ہاز حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ شش بان باہتمام جواہرمل کارخانہ صوبہ سنگھ دار السلطنت لاہور سنبت ۱۸۸۱ در تحت سردار تیج سنگھ،

بام بان | بفضل اکال کے بعد بجز توپ کے نام کے باقی عبارت مندرجہ بالا ہی درج ہے، جو شش بان مین ہے،

نصرت بان | بفضل سری اکال پور کہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ وسلطنۃ سری مہاراجہ صاحب او جیراج ہذا ضرب موسوم بہ نصرت بان حسب الامرا قدس در ۱۸۸۱ از راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب ارسطو

نظرت فلاطون فطنت موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

توپ فتح جنگ | بموجب حکم حضور فیض گنجور سنگھ صاحب سرتاج خالصہ پادشاہ رنجیت سنگھ جیو دام اقبالہ باہتمام میان قادر بخش در قلعہ مبارک لاہور، توپ دیوان لالہ موتی رام ودام دیال تیار شد، سنہ ۱۸۸۶ رسم توپ فتح جنگ عمل محمد حیات،

توپ لیلی | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ، بہادر دام ملکہ وسلطنتہ سری مہاراجہ صاحب دھیراج درسنہ ۱۸۸۵ ازراجہ سری بکرماجیت ہذا الضرب موسومہ لیلان (لیلی) حسب الامر اشرف اقدس علی حضور انور درسنہ ۱۸۹۱ باہتمام صاحب ارسطو فطرت فلاطون زمان موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر عیدگاہ بن خدمت فضل علی کیدان شاگرد صاحب ممدوح بہادر ریختہ شد،

توپ مجنون | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ وسلطنتہ سری مہاراجہ صاحب دھیراج درسنہ ۱۸۸۵ ازراجہ بکرماجیت ہذا الضرب موسومہ مجنون حسب الامر اشرف اقدس اعلیٰ حضور نور ۱۸۹۱ء باہتمام صاحب ارسطو فطرت فلاطون زمان موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بن خدمت فضل علی کیدان شاگرد صاحب ممدوح ریختہ شد،

ایک توپ پر کندہ ہے،

ادب سہاے روپ سنگھ وانوپ سنگھ کل تیار شد سنبت ۱۸۵۱

نصرت جنگ | نظم

نیست این توپ اژدہاے دہان	ازدم خود شرار برق افشان
بہ یک آواز خود کند ناگاہ	بخت دشمن چو دود خویش سیاہ
پے تفتیح قلعہ سخت چو جنگ	زین سبب نام گشت نصرت جنگ

درعہد بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر، توپ سردار جیالا سنگھ ٹھرانیہ باہتمام ولیا نمبرا سنبت ۱۸۸۸ عمل رائے سنگھ

توپ ساز، در سال یک ہزار و ہشتصد و ہشتاد و ہفت اتمام یافت،

شیو کھی بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم رنجیت سنگھ بادشاہ بہادر قلعہ اقبال توپ شیو کھی کارخانہ دار السلطنۃ لاہور باہتمام جواہر مل ۱۸۹۳ عمل پسران سدھا سنگھ،

رام بان ضرب رام بان بفضل سری اکال جی بعہد بادشاہ جہاہ جدھشٹر زمان کرن دوران مہاراج ادھیراج رنجیت سنگھ بہادر خلد اللہ ملکہ مقرب بارگاہ سلطانی مصاحب درگاہ خاص الخاص خاقانی سردار خوشحال سنگھ در سنبت یکہزار و ہشت صد و نود و پنج بکرماجیت مطابق ایک ہزار دو صد و پنجاہ و چہار ہجری باہتمام باکی خان (باقی خان) توپ ریز تیار کنانید،

سورج کھی از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ وازحکم شاہزادہ کنور نونہال سنگھ

شد توپ نو طیار ظفر جنگ و شہ پسند منصوب توپخانہ جرنیل تیج سنگھ

(ضرب سورج کھی ساخت لاہور سنہ ۱۸۹۷)

عدو کوب بفضل اکال نظم

از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ ورحکم بادشاہ بہادر رنجیت سنگھ

شد توپ نو تیار عدو کوب و وزبان منصوب توپ خانہ جرنیل تیج سنگھ

(ساخت دار السلطنت لاہور کارخانہ صوبہ سنگھ سنہ ۱۸۹۰)

اندربان بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ وسلطنۃ سری مہاراج ادھیراج ہذا الضرب موسوم اندربان حسب الامر اشرف اقدس در سنہ ۱۸۹۴ از راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب والا فطرت فلاطون فطنت موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

توپ اژدہا سنہ ۱۹۰۲ فتح حضرت مرتبت ساخت توپ اژدہا، مشتاق برق، رعد سائی، آئین الملک امام الدین بہادر خطابی شاہانہ شاہی (شہنشاہی) سنہ ۱۲۶۱

ایک توپ پر صرف مندرجہ ذیل عبارت ہے، دوسری رام جی سہائے سری راجہ سوچیت سنگھ سنت ۱۸۸۱

کچھ گورمکھی مین بھی لکھا ہے،

توپ راہ بان　　فضل اکال از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ راہ بان باہتمام جواہر مل

کارخانہ صوبہ سنگھ ساخت لاہور ۱۸۸۸

جنگ جیت　　ابتدا رمین کچھ گورمکھی مین لکھا ہے، اس کے بعد ہے،

"اسم این توپ از سرکار عالی جنگ جیت تحریر بتاریخ سنبت ۱۸۷۷،

جوالامکھی،　　بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ جوالامکھی کارخانہ

دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

خالصہ پسند　　بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ خالصہ پسند کارخانہ

دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

ہنونت بان　　فضل اکال از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ ہنونت بان درکارخانہ صوبہ سنگھ

دارالسلطنت لاہور سنبت ۱۸۸۶ درتحت تیج سنگھ

شیو درشن بان　　فضل اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ شیو درشن بان

کارخانہ دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۸۸ عمل پسران سدھا سنگھ درتحت تیج سنگھ،

بھرت بان　　از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ　　از حکم بادشاہ بہادر رنجیت سنگھ

شد توپ نو تیار عدو خوار بھرت بان　　منصوب توپخانہ سردار تیج سنگھ

رام بان　　بفضل سری اکال پورکہ جی ضرب رام بان بعہد بادشاہ جہاہ جنبد ہشتر زمان کرن دوران

مہاراجہ ادھیراج رنجیت سنگھ بہادر دام اقبالہ حسب الحکم مقرب بارگاہ سلطانی مصاحب درگاہ خاص الخاص

خاقانی سردار خوشحال سنگھ در سنبت یکہزار و ہشت صد و نود و پنج بکرماجیت مطابق یک ہزار و دو صد

پنجاہ وچہار ہجریہ باہتمام باکی (باقی) خان توپ ریزہ تیار کنانید[۱]

سلطان شہید ٹیپو کا توپخانہ بارہویں صدی ہجری کے وسط مین ایک جدید طاقت حیدر علی اور فتح علی (ٹیپو سلطان) کے قالب مین نمودار ہوئی ان مین سے حیدر علی کو فتوحات سے بہت کم فرصت ملی مگر اس کے جانشین لائق فرزند فتح علی کو اس کی طرف توجہ کرنے کی کافی مہلت حاصل ہوئی، اس نے فرانسیسی گولہ انداز اور افسر توپ خانہ خاص طور سے مقرر کئے، اس نے مختلف قسم کی توپین بنوائین، اور اس کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر کارخانہ قائم کیا تھا، اس کے پاس ۹۲۹ ضرب توپین مختلف قسم کی موجود تھین[۲]، کہتے ہین کہ مہاراجہ بڑودہ نے سونے اور چاندی کی ایک ایک توپ بنوائی تھی، جس کو دیکھنے کیلئے دور دور سے سیاح آتے تھے،

---

[۱] تاریخ پنجاب ص ۵۴ لاہور افسوس ہے کہ ان توپون کی نسبت یہ نہ معلوم ہوسکا، کہ یہ کس قدر وقت کی تھین اور انکا دہانہ کتنا تھا، کس قدر بارود اور گولہ اس مین ڈالا جاتا تھا، اس لئے صحیح طور پر یہ اندازہ نہین کیا جاسکتا، کہ میدان جنگ کے لئے یہ کتنی کارآمد تھین، [۲] تاریخ ٹیپو سلطان بنگلور،

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہی،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے، قیمت:- للعہ

"منیجر"

عربی نظم ونثر کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۳)

عباسی دور کی شاعری

عربی شاعری خلافت عباسیہ کے پہلے دور مین

عربی شاعری اگرچہ زمانۂ جاہلیت کے اخیر، زمانۂ اسلام کے آغاز اور حکومت امویہ کے زمانۂ عروج مین نتھاے کمال تک پہنچ گئی تھی، لیکن وہ صرف اہل عرب تک محدود تھی، اور عربی شعر کہنے والے اور اس کے سننے والے دونون صرف اہل عرب تھے، کیونکہ اہل عجم اب تک فصاحت و بلاغت کے اس درجہ تک نہین پہنچے تھے، کہ بادیہ نشین عربی شعراء کا مقابلہ کرسکتے، البتہ بنو امیہ کی حکومت کے دور تنزل مین اُن کو اس کا موقع ملا، اور جب خلفاے عباسیہ نے عجمیون بالخصوص ایرانیون پر جو اُن کی خلافت کے داعی تھے، نگاہ لطف وکرم ڈالی تو ان کو اپنی عربی شاعری کی داد طلبی کا موقع ملا، اور انھون نے بڑے بڑے صلے پائے، کیونکہ ان کی شاعری مین ایک طرف تو بدویانہ فصاحت پائی جاتی تھی، دوسری طرف تمدنی اختراعات کی جھلک بھی نمایان ہوتی تھی، کوفہ، بصرہ، اور مشرقی شام کے متمدن عربون نے بھی چونکہ عربیت کو تعلیم کے ذریعہ حاصل کیا تھا، اس لئے ان مین بھی یہی دونون خصوصیتین پائی جاتی تھین، اسی لئے وہ بھی محدثین اور مولدین کے لقب سے مشہور ہوے، اس وقت متمدن شعراء نے بادیہ نشین شعراء کا مقابلہ کیا، اور اعیان سلطنت نے اُن کو اپنا مصاحب اور ہمنشین بنا لیا، اور متعدد

شعراء مثلاً محمد بن عبدالملک زیات، مسلم بن ولید اور ابو تمام نے اس قدر ترقی کی، کہ وزارت اور صوبیداری کے درجہ تک پہنچ گئے، رفتہ رفتہ اس دور کے وسط میں صحرانشین بدوؤن کی شاعرانہ آواز بالکل پست ہوگئی،
دور اول کے تمام خلفاے عباسیہ نے شعر و شاعری کی قدردانی کی، اور اس کے لئے سالانہ مجلسین منعقد کرتے، اور شعراء کے قصائد پر انعام اور صلے دینے لگے جس کا مقصد یہ تھا، کہ عربیت کے تمام عمدہ اوصاف قائم رہیں،
ان کے ایرانی وزراء و عمال نے بھی اس کی تقلید کی، یہان تک کہ ان مین بہت سے ادیب اور شاعر پیدا ہوگئے، اگرچہ اس دور مین شعراے مولدین نے شاعری کے اغراض، مضامین اور اسلوب بیان مین بہت سی جدتین اور لطافتین پیدا کین لیکن قصیدہ کی بنیاد جن چیزون پر زمانۂ جاہلیت مین قائم تھی، اس کو بعینہ قائم رکھا، قصیدہ کو ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ کی پابندی کے ساتھ کہتے تھے، اگرچہ ان مین کسی شاعر نے صحرانوردی اور اونٹ کی سواری نہین کی تھی تاہم قصائد کی تشبیہون مین معشوق کے اجڑے ہوئے کھنڈر، اونٹنی کے اوصاف، صحرانوردی، اور سیر و شکار وغیرہ کے واقعات بیان کرتے تھے، اور اس کا مقصد صرف وطن کی یاد کا تازہ کرنا اور شعر مین بدویانہ خصوصیات کا قائم رکھنا تھا، با این ہمہ بعض نئے شعراء مثلاً ابونواس نے اس کی پابندی نہین کی، اور جو شعراء اس کے پابند تھے، ان پر نکتہ چینی کی، اور اس کے بدلے قصائد کی ابتداء شراب و کباب یا محلون اور باغون کے اوصاف سے کی، اور اونٹنی کی جگہ کشتیون کی سواری کا ذکر کیا، اور اس معاملہ مین بہت سے شعراء نے اس کی تقلید کی،

بہر حال خلافت عباسیہ کے دو پہلے دورون مین شاعری کے اغراض اسلوب بیان اور وزن و قافیہ مین جو تغیرات پیدا ہوئے اُن کی تفصیل یہ ہے:-

اگرچہ زمانۂ جاہلیت مین جن اغراض کے ماتحت شعر کہے جاتے تھے، وہ اس دور مین بھی باقی رہے، لیکن اس دور مین اُن کی ایک خاص شکل قائم ہوگئی، یا کثرت سے ان اغراض کے ماتحت شعر کہے گئے، چنانچہ جن اغراض نے ایک خاص شکل اختیار کرلی، یا اُن کے ماتحت بہ کثرت شعر کہے گئے وہ حسب ذیل ہین:

۱۔ **عصبیت**: زمانۂ جاہلیت مین عصبیت صرف بعض قبائل تک محدود تھی، اور یہی قبائل باہمی مفاخرت کے ذریعہ اس کا اظہار کرتے تھے لیکن اس زمانہ مین اہلِ عرب اور اہلِ عجم کے درمیان بھی عصبیت پیدا ہوئی، اور فرقہ شعوبیہ نے شاعری کے ذریعہ اس کا اظہار کرنا شروع کیا، حالانکہ بنو امیہ کے دور مین وہ اس قسم کی عصبیت کا اظہار نہین کر سکتے تھے، اہلِ علم شلاً بصرہ اور کوفہ کے نحویون اور اہلِ مذہب یعنی فقہا و متکلمین کے درمیان بھی عصبیت پیدا ہوئی،

۲۔ **سیاست**: اس دور مین شاعری کا استعمال سیاسی اغراض سے بھی کیا گیا، اس دور سے پہلے علویون اور عباسیون مین کوئی سیاسی اختلاف نہ تھا، بلکہ دونون بنو امیہ کے مخالف تھے، اور دونون ہاشمی گروہ کہا جاتا تھا لیکن اس دور مین دونون مدمقابل پارٹیان ہوگئین، اور دونون کی تائید و مخالفت مین شعر کہے گئے، کسی عباسی خلیفہ یا کسی ولی عہد کی تائید بھی اس کے حریف کے مقابلہ مین شاعر کے ذریعہ سے کی گئی، خلافتِ عباسیہ مین اہلِ عجم کو اہلِ عرب پر جو ترجیح دی گئی تھی، اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے جوان کو دیئے گئے تھے، اس پر بھی شاعری کے ذریعہ سے تنقید کی گئی،

۳۔ **وصف نگاری** اس مین بہت زیادہ تنوع پیدا ہوا، اور اس کی مختلف شکلین قائم ہوئین مثلاً محلون، باغون، رنگین مجلسون، کارخانون، مچھلی اور چڑیون کی شکارگاہون، مختلف قسم کی کشتیون قدرتی مناظر، آثارِ قدیمہ اور نفسانی حالات پر نظمین لکھی گئین،

۴۔ **رندی و ہوسناکی**، اگرچہ بنو امیہ کے دور مین بھی کسی قدر ان خیالات کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جس بے باکی کے ساتھ عباسی دور مین ابو نواس وغیرہ نے اس قسم کے خیالات شاعری مین ظاہر کئے اس کی نظیر اموی دور مین نہین مل سکتی،

۵۔ **حکیمانہ خیالات**، اگرچہ زمانۂ جاہلیت، آغاز اسلام، اور بنو امیہ کے دور مین بھی اس قسم کے حکیمانہ خیالات بعض قصائد مین پائے جاتے ہین لیکن عباسی دور مین جب یونان، ایران اور ہندوستان

کے فلسفہ کا ترجمہ عربی زبان مین ہوا، تو شعرا نے اُن کے بہت سے مسائل کو شاعری مین داخل کیا، اور خود بھی بہت سے فلسفیانہ خیالات پیدا کئے، اس قسم کے شعرا مین صالح بن عبد القدوس اور ابو تمام زیادہ مشہور ہین،

ان کے علاوہ شاعری کے جو نئے نئے اغراض پیدا کئے گئے، اُن کی تفصیل یہ ہے،

۱- امرد پرستی اہلِ عرب اس ذوق سے بالکل ناآشنا تھے، اس کی ابتدا عجمی نژاد بدکارون نے کی، اور جو اہلِ عرب اُن سے میل جول رکھتے تھے، وہ بھی ان کے متعدی اثر سے اس مرض مین مبتلا ہو گئے، رفتہ رفتہ یہ فتنہ بہت زیادہ پھیل گیا، اور سب سے زیادہ ابو نواس اور حسین بن ضحاک وغیرہ نے اس کے پھیلانے مین حصہ لیا،

۲- خمریات بعض شعرائے جاہلیت کے کلام مین شراب کباب کے مضامین پائے جاتے ہین، لیکن جب اسلام نے شراب نوشی کی ممانعت کی، تو صرف بعض عیسائی شعرا، مثلاً اخطل نے اس قسم کے مضامین باندھے، اس کے بعد حکومت بنو امیہ کے آخری دور مین بعض رند مزاج امرا نے شراب و کباب کے متعلق چند قطعات لکھے، اور غلط یا صحیح طور پر ان مین بعض قطعے ولید بن یزید کی طرف منسوب کئے گئے، ا رخود اس کے خاندان کے بعض حریفون نے خصوصاً اور بنو امیہ کے دشمنون نے عموماً اس کے بدنام کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا، لیکن خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور مین جب اہلِ عجم کو پوری آزادی حاصل ہوئی، تو بہت سے عجمی شعرا نے اس لے کو بہت بڑھا دیا، اور شراب و کباب کے ذکر مین اس قدر غلو کیا، جس کی نظیر دورِ جاہلیت اور دورِ اسلام مین نہین پائی جاتی، خلفا، اور امرا نے اگرچہ اس کو اس کو روکنا چاہا، اور ان شعرا کو قید و بند کی سزائین بھی دین، لیکن اس کا کچھ اثر نہین ہوا، یہانتک کہ جو لوگ خود شراب نہین پیتے تھے، وہ بھی رنگینی کلام کے لئے اس قسم کے اشعار کہنے لگے، سب سے زیادہ ابو نواس نے اس صنعت کو ترقی دی، اور اس کے بعد اور لوگون نے بھی اس کی تقلید کی،

۳- زہدیات، اس قسم کی شاعری میں دنیا اور دنیوی عیش پرستیوں کی بے ثباتی، موت کا ذکر اور شہوت پرستی اور لذت پرستی کی ممانعت کی جاتی تھی، اور وہ فقہار علما متکلمین، محدثین، اور زہد پیشہ لوگوں کے خیالات کی اشاعت کا ایک ضروری آلہ تھی، اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے بدکار شاعروں اور انشاپردازوں کی مخالفت کرتے تھے، اس میدان کا سب سے بڑا شہسوار ابوالعتاہیہ تھا، اگرچہ ابونواس وغیرہ نے بھی اس قسم کے بہت سے قصائد لکھے لیکن اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ لوگ بھی ہر صنف میں شعر کہہ سکتے ہیں، ورنہ ان کی شاعری میں خلوص نہیں پایا جاتا تھا،

۴- تہذیب اخلاق، اس دور میں نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح کے لئے جانوروں اور انسانوں کی زبان میں بہت سے قصے اور حکایتیں نظم کی گئیں، اور سب سے پہلے ابان اللاحقی نے برامکہ کے لئے کلیلہ دمنہ کو نظم کیا، اور اس پر برامکہ نے اس کو بڑا صلہ دیا، اور اسکے بعد اور لوگوں نے اس کی تقلید کی،

۵- مذہبی اور علمی شاعری، اس کے ذریعہ سے فقہ اور دوسرے علوم کے مسائل نظم کئے گئے، اور اس سے علوم کے حفظ کرنے میں آسانی پیدا ہوئی، اور اب تک اہل مشرق اور اہل مغرب اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں،

ان اغراض سے زیادہ تمدن اور خوش مذاقی کا اثر الفاظ کے انتخاب، اسلوب بیان اور مطالب و معانی کے طریقۂ ادا پر پڑا، کیونکہ بدیہہ گوئی کا رواج کم ہوگیا تھا، لوگ غور و فکر اور کانٹ چھانٹ سے زیادہ کام لینے لگے تھے، اور خلفار، وزرار اور ولاۃ کی مدح، اُن کے مرثیوں اور فخریہ شاعری میں نرم اور آسان زبان استعمال کرتے تھے، اور ہزل و ظرافت کے علاوہ الفاظ کی جزالت اور متانت کو بھی قائم رکھتے تھے، البتہ عجمی شعرار نے کھانے پینے، وضع و لباس، ظروف اور سامان آرایش وغیرہ کے متعلق شاعری میں بہت سے فارسی اور دیہاتی الفاظ شامل کر دیئے، جو خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں معرب تسلیم کئے گئے، اور فصحار اُن کو استعمال کرنے لگے، لیکن جب شہروں کی زبان خراب

ہوگئی، تو ان کو غیر فصیح قرار دیا گیا، ابو نواس نے جو شعوبی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس قسم کے الفاظ زیادہ استعمال کئے۔

اسی طرح ان شعراء نے علم کلام کے بعض الفاظ اور اسالیب بیان اور قرآن و حدیث اور اشعارِ عرب کی عمدہ تشبیہات کا استعمال کیا، اور اس کا نام بدیع رکھا، سب سے پہلے بشار نے اس کی ابتدا کی، اس کے بعد مسلم بن ولید نے اس کا بہت زیادہ استعمال کیا اور ان تکلفات کی بنا پر اہلِ ادب کے نزدیک سب سے پہلے اس نے شاعری کو خراب کیا، ابو تمام نے اس میں اور بھی زیادہ غلو کیا، پھر بعد کے شعراء نے اس کی تقلید کی، اور اس کی اور بھی بہت سی قسمیں پیدا کیں، جن سے اہلِ عرب ناواقف تھے،

اشعار کے معانی و مطالب مین بہت زیادہ نزاکت خیال، رنگینیان اور تشبیہات و استعارات مین ترکیب پیدا ہوگئی، اور ابو تمام اور ابن رومی وغیرہ کا کلام جو مامون اور اس کے بعد کے زمانے مین پیدا ہوے، فلسفیانہ اور منطقیانہ روح کا مظہر بن گیا، اور چونکہ شعراء مذہبی روح کے اثر سے خالی تھے، اس لئے انھون نے ممدوحین کے اوصاف مین اس قدر مبالغہ سے کام لیا، کہ ان مین خدا اور پیغمبرون کے اوصاف ثابت کئے، اس کے بعد شاعری کی ہر صنف مین اس قسم کا غلو پیدا ہوگیا،

وزن اور قافیہ کے لحاظ سے اس زمانہ مین ایسی چھوٹی چھوٹی بحرون کا رواج ہوا جن کو اہلِ عرب نے بہت کم استعمال کیا تھا، اس کے علاوہ بعض نئی نئی بحرین ایجاد کین، جو اہلِ عرب کے کلام مین موجود نہین تھین، مثلاً "شعر مزدوج" جس کے دو ٹکڑے ایک قافیہ پر پھر دوسرے دو ٹکڑے ایک قافیہ پر نظم کئے جاتے تھے، اور اس کا زیادہ تر استعمال امثال، قصہ حکایت، اور علوم اور فقہ کے اصول و قواعد کے نظم کرنے مین کیا جاتا تھا مواليا کے نام سے شاعری کی ایک عامیانہ صنف بھی ایجاد ہوئی، اور سب سے پہلے برامکہ کی ایک لونڈی نے ان کو مرثیہ مین اس کا استعمال کیا،

نثر انشا پردازی

اس سے عام بول چال کی زبان مقصود نہین، بلکہ وہ تحریری زبان مقصود ہے جس سے اصل مقصد کو ایسی انشا پردازانہ عبارت مین ظاہر کیا جاتا ہو، جو ایک دلفریب صورت مین دل پر خوشی یا اعجوبگی کا اثر ڈالتی ہے، اور اس مین حسب ذیل تحریرین داخل ہین،

۱- شاہی خطوط جو حکومت کے دفتر خط و کتابت کے سلسلہ مین روانہ کئے جاتے تھے،

۲- دوستانہ خطوط جو بعض دوست دوسرے دوست کو تہنیت، تعزیت یا سفارش کے لئے لکھتے تھے،

۳- طویل ادبی رسالے جن کو بعض انشا پرداز حکومت یا رعایا کے بعض معاملات یا کسی مذہب کی تائید یا کسی فریق کو دوسرے فریق پر فضیلت دینے یا محض دلچسپی کے لئے لکھتے تھے،

مثلاً تحفے، مقامات، سیر و اخبار اور کہانیان وغیرہ علمی تحریرین، جو علمی طرز پر علمی اصطلاحات کے ساتھ لکھی جاتی ہین، اور اس مین ترتیب عقلی اور قیاس منطقی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور عبارت مین حشو و زوائد نہین ہوتا، وہ اس سے الگ ہین، اور ان کو تصنیفی طرز تحریر کہا جاتا ہے لیکن مورخین ادب صرف انشا پردازانہ طرز تحریر کی خصوصیات سے بحث کرتے ہین، اور علمی طرز تحریر کو نظر انداز کر دیتے ہین، کیونکہ انشا پردازانہ طرز تحریر مین حسن و جمال پایا جاتا ہے، اور اس سے دل کو انبساط حاصل ہوتا ہے، اسلئے عباسی دور مین انشا پردازانہ تحریرون مین جو خصوصیات پیدا ہوئین، ہم اجمالی طور پر انہی کے بیان کرنے پر قناعت کرتے ہین،

بنو امیہ کی خلافت کے آخری دور مین سالم اور عبدالحمید کے انشا پردازانہ طرز تحریر نے انشا پردازی کو ایک محبوب ترین فن بنا دیا تھا، اس لئے ان کی جماعت کے جن لوگون نے عباسی خلافت کا زمانہ پایا، انھون نے اس کو اور بھی زیادہ ترقی دی، اور وہ فنون ادبیہ مین ایک شریف ترین فن بن گیا، اور ایسے ایسے نامور انشا پرداز پیدا ہو گئے، جن کا پایہ نامور شعراء سے بھی بھاری ہو گیا، کیونکہ نثر کی ان انشا پردازانہ

عبارتون مین دو خوبیان پائی جاتی تھین، ایک تو یہ کہ وہ تمدنی اور دفتری دونون ضرورتون کو پورا کرتی تھین، دوسرے یہ کہ عربی زبان کے جمال و کمال کا مظہر ہوتی تھین، اور شاعری صرف اس دوسری صورت تک محدود تھی، اس زمانہ مین انشا پردازی اس درجہ تک مختلف اسباب سے پہنچی،

(۱) ایک یہ کہ بہت سے اہل عرب اور وہ لوگ جو عرب تو نہ تھے لیکن عرب بن گئے تھے، قرآن مجید کو حفظ کرنے لگے، اور اپنے کلام مین اُس کی آیتون کے ٹکڑے شامل کرنے لگے، اور معانی اسلوب بیان اور امثال و تشبیہات مین اسکی پیروی کرنے لگے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان لوگون نے حدیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین، اُن کے گورنرون، سپہ سالارون کے خطوط، خلفائے بنوامیہ، اور خوارج وغیرہ کے خطبات کا اکثر حصہ یاد کر لیا، چنانچہ جب عبدالحمید کاتب سے پوچھا گیا، کہ تم نے یہ بلاغت کیونکر حاصل کی، تو اُس نے کہا اس لئے کہ مین نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کلام کو ازبر کر لیا تھا،

(۳) تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے بنوامیہ اور اُن کے گورنرون نے معاہدات صلح وغیرہ کے متعلق جو تحریرین لکھی تھین، اُن کو اُن لوگون نے حفظ کر لیا تھا، اور ان تحریرون مین بہت سی بلیغ نصیحتین اور سیاسی شرعی احکام موجود تھے،

(۴) چوتھے یہ کہ ان لوگون نے اُن اسلامی اداب کا جو قرآن، حدیث اور ان خطبات اور تحریرون مین جن کا ذکر اوپر کیا گیا، موجود تھے، اور تمدن، قومون مثلاً ایرانی، ہندو رومی، یونانی کلدانی، وغیرہ کی علمی و ادبی ترقیون کا مطالعہ کر لیا تھا اس طرح ان مین ایک مخلوط تہذیب پیدا ہو گئی، جو اسلامی روح کا مظہر بن گئی، اور خلفاء، وزراء، اور اس زمانہ کے مورخین اور ادباء کی انشا پردازانہ تحریرین ان سب کا مرقع بن گئین،

اس زمانہ کی انشا پردازی جس درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے اس کا اندازہ ان مختلف موضوعات سے بھی

دسکتا ہے جن کے متعلق یہ تحریرین لکھی جاتی تھین مثلاً

(۱) سرکاری تحریرین یعنی خلفاء اور ولی عہدون کے بیعت نامے اور سیاسی اور دفتری فرمان وغیرہ

(۲) بعض سیاسی اور دینی یا حکومت کے سیاسی مسلک کی تائید،

(۳) پاکیزہ اخلاق کی ترغیب،

(۴) ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح دینا،

(۵) قصے، کہانیان، اور جانورون وغیرہ کی زبان سے حکایتین بیان کرنا،

(۶) کسی ماہر فن، یا کسی مذہب کے مبلغ یا کسی باپ کا اپنے بیٹے یا شاگردون یا اوس مذہب کے معتقدین کو ہدایتین دینا یا نصیحتین کرنا،

الفاظ، معانی اور اسالیب بیان مین اس طرز تحریر کی امتیازی خصوصیات یہ ہین،

(۱) لمبے لمبے خطوط، معاہدات اور فرمانون کی ابتدا مین مقدمات قائم کرنا جس کا اثر اب بھی باقی ہے،

(۲) خطوط کی ابتدا، مین مختلف النوع عبارتون سے کام لینا مثلاً لمبے لمبے شاہی خطوط مین مختلف الفاظ مین خدا کی حمد کرنا اور چھوٹے چھوٹے خطوط مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کی نقل کرنا مثلاً من عبد اللہ فلان امیر المومنین الی فلان ومن قبلہ من المسلمین سلام علیک، اما بعد فانی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو،)

ہارون رشید نے حمد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا طریقہ بھی اختیار کیا، اور امین نے خلیفہ کی کنیت کا بھی اضافہ کیا، کبھی صرف "اما بعد" سے خطوط کی ابتدا کرتے تھے، کبھی مکتوب الیہ کو دعا بھی دیتے تھے، اور بعض اوقات صرف اس قدر لکھتے تھے کہ "کتابی الیک"

(۳) آسان اور فصیح الفاظ کا انتخاب کرنا اور اُن کو عمدہ طریقہ سے ترکیب دینا،

(۴) حسب موقع ایجاز واطناب سے کام لینا،

(۵) نزاکت خیال، استدلال، نتائج واحکام کے دلنشین کرنے کے لئے علم فلسفہ ومنطق سے کام لینا۔

اس دور کے مشہور انشا پردازون کے نام یہ ہین، ابن المقفع، احمد بن یوسف، عمرو بن مسعدہ،

عربی شاعری اندلس مین

اہل عرب نے اندلس کو ۹۲ھ مین فتح کیا، اور فتح کے بعد اُن کے جو قبیلے اور خاندان، مصر، شام، اور آفریقہ کے شہرون مین رہتے تھے، وہ ہجرت کرکے اندلس مین آباد ہو گئے، بنو امیہ کے گورنرون نے تقریبًا چھیالیس سال یعنی ۹۲ھ سے ۱۳۸ھ تک اندلس پر حکومت کی، اور یہ زمانہ فتوحات، بغاوت اور شورش مین بسر ہوا، اس لئے عقلی زندگی، اور عربی زبان کو اس زمانہ مین ترقی کرنے کا موقع نہین ملا، اس زمانہ مین صرف چند تقریرون مین ادبی روح پائی جاتی ہے جن کو وہان کے گورنر فوج مین شجاعت کے پیدا کرنے اور انتظامی امور مین اُن کو ثابت قدم رہنے کے لئے کرتے تھے، ان کے علاوہ بعض خطوط بھی تھے جن کو امراء سپہ سالارون وغیرہ کے نام لکھتے تھے، مجلسون اور محفلون کی عام گفتگو بھی زیادہ تر فصیح عربی زبان مین کی جاتی تھین، اور اندلس کے جو باشندے تعلیم کے ذریعہ سے عربی زبان سیکھتے تھے، وہ بھی اس معاملہ مین اہل عرب کی تقلید کرتے تھے،

اندلس کے آخری باغی امیر یوسف بن عبد الرحمٰن فہری سے جب عبد الرحمان بن معاویہ بن ہشام بن عبد الملک "الملقب بالداخل" نے (۱۳۸ھ) سلطنت چھین لی، تو وہان بنو امیہ کی دوسری سلطنت قائم کی، اور عربی زبان عربی لغت اور شریعت کی اشاعت کا کام شروع کر دیا، اور اس کے بعد اس کی آل و اولاد نے بھی اس کی تقلید کی، اب اندلس مین علمی ترقی کا دور شروع ہوا، جو عبد الرحمان ناصر کے زمانہ (سنہ ۳۰۰ھ سنہ ۳۵۰ھ) مین اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا، اس وقت اندلس مین بہ کثرت شاعر، ادیب، انشا پرداز اور مصنف پیدا ہو گئے، خلفائے بنو امیہ مشرق کے شہرون یعنی بغداد وغیرہ مین اہل علم اور اہلِ ادب کو اس لئے بھیجتے تھے، کہ وہ اہلِ مشرق کے علوم کو سیکھ کر آ ہین، اور اندلس مین اُن کی اشاعت کرین، اس لئے لوگ لغت ادب اور دینی علوم کی طرف نہایت کثرت کے ساتھ متوجہ ہوئے، عبد الرحمان ناصر اور اس کے فرزند حکم مستنصر نے اس طرف اس قدر توجہ کی کہ ہارون رشید اور

اس کے فرزند مامون رشید کا ہمسر ہوگیا، اور کتابون کے جمع کرنے اور کتب خانون کے قائم کرنے مین قرطبہ بغداد کا مقابلہ کرنے لگا

پھر جب اموی سلطنت زوال پذیر ہوئی، تو اندلس کی حکومت کو امراء کی ایک جماعت نے جس کو "ملوک الطوائف" کہتے ہین، باہم تقسیم کرلیا، اور ۴۲۲ھ سے ۴۸۴ھ تک اندلس مین فرمانروائی کی، ان مین شعراء و ادبا بھی تھے جنھون نے ادبی ترقی مین اعانت کی، اس سے پہلے عقلی علوم لغت اور ادب کافی ترقی ہو چکی تھی، اب ان بادشاہون نے شعراء و ادبا کی اور بھی حوصلہ افزائی کی، اور اُن کو وزیر اور امیر بنالیا، اس لئے ادب کی شاخین خوب سرسبز و شاداب ہوئین، اور بہت سے شعراء و ادب کے امام پیدا ہوگئے، شاعری تو یون بھی عرب کی گھٹی مین پڑی ہوئی تھی، لیکن جب انھون نے اندلس مین فطری حسن و جمال کو دیکھا تو اس ذوق نے اور بھی ترقی کی، اور اب وہ بدویانہ اور تمدنی دونون قسم کی زندگیون کا مظہر بن گئی، اور اس مین فطری حسن و جمال کے ساتھ تمدنی جلوے بھی نظر آنے لگے، اندلس کے تمدن اور فطری حسن و جمال کا اثر شعراء پر بہت زیادہ پڑا، اور انھون نے وصف نگاری مین اسقدر ترقی کی کہ یہ اندلس کی شاعری کی نمایان خصوصیت قرار پائی،

وصف نگاری کے علاوہ اندلس کے شعراء نے اور تمام اصناف شعر مین بھی اہل مشرق کا مقابلہ کیا، اور شاعری کی ایک خاص صنف ایجاد کی جس کو "موشح" کہتے ہین جس مین ایک قافیہ اور ایک وزن کی پابندی نہین کی جاتی، البتہ اجتماعی اور فلسفیانہ مضامین کے پیدا کرنے مین وہ اہل مشرق کا مقابلہ کرسکے" اور ان مین کوئی متنبی، اور معری پیدا نہین ہوا،

نثر اندلس مین قدیم امراء کے زمانے مین انشا پردازانہ نثر کی ترقی کے لئے کوئی میدان نہ تھا، کیونکہ اب تک سیاسی اور اجتماعی حالات کو رسوخ و ثبات حاصل نہین ہوا تھا، اس لئے کوئی چیز ایسی نہین پیدا ہوئی تھی، جو اجتماعی یا فنی موضوعات مین انشا پردازی کے ملکہ کو ترقی دیتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

فرمانروایانِ اندلس کے پہلے دور مین نثر صرف ان خطبات اور خطوط مین محدود رہ گئی، جو فوجیون مین شجاعت پیدا کرنے اور امور سلطنت کے انجام دینے کے لئے امرا و عمال فوج کے سامنے دیتے اور لکھتے تھے اور ان سب مین اس خالص عربی روح کی جھلک پائی جاتی تھی، جو دمشق مین خلفاے بنو امیہ کے زمانہ مین موجود تھی، اس لئے ان مین خالص عربی موضوعات اور لفظ و عبارت مین خالص عربی اسلوب کا لحاظ رکھا جاتا تھا، اور وہ صنائع و بدائع اور تکلف و تصنع سے خالی ہوتی تھین، لیکن جب سیاسی اور اجتماعی حالات نے وسعت اور ترقی حاصل کی ملک مین خوشحالی پھیلی، اور علم و ادب کی اشاعت ہوئی تو انشا پردازانہ نثر کا میدان بھی وسیع ہوا، اور مشرق مین جن موضوعات پر نثر لکھی جاتی تھی، اندلسیون نے بھی ان پر لکھنا شروع کیا، اور اُس کے ساتھ اندلسیون نے نثر کے لئے بعض ایسے موضوع ایجاد کئے جو مشرق مین موجود نہ تھے، مثلاً نثر مین خلفاء کی مدح کرتے تھے، اور تہنیت، تعزیت، اور شوق و ناراضی کا اظہار کرتے تھے، جس سے وصف نگاری کے تمام اقسام نثر مین آگئے تھے، مثلاً مجالس محافل، بالخصوص رقص و سرود کی مجلسون باغون چشمون، ستارون اور آسمانون کے اوصاف نثر مین بیان کرتے تھے، زہد و تقوی اور تصوف کے مضامین بھی نہایت انشاپردازانہ عبارت مین لکھے گئے اس لئے اُن کی تحریرون کے ہر جملہ مین استعارہ اور تشبیہ پائی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ مقفی عبارتون کا رواج تھا،

بے خوف زندگی

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

جائے روح پاک علیین بود کرم باشد کش وطن سرگین بود! (رومی)

آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گر بتلائیں جنھیں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق و وجدان سے دریافت کیا ہے، اگر آپ انھیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کرکے بے خوف و مطمئن زندگی بسر کرسکتے ہیں

زین شہد یک انگشت رسانم بلبت از لذت اگر محو نگردی تف کن

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیہ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے جیتے ہیں، اور انہی کے لئے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:-

بہر یزدان می زید نے بہر گنج، بہر یزدان می مرد نز خوف و رنج

آنکہا خندد کہ او بیند رضا ہمچو حلوائے شکر او را قضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق تعالیٰ ہی کی مراد اور ان ہی کے منشا کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ منشا یا مراد خیر بر ترین ہے،

عمر خوش در قرب جان پروردن است عمر زاغ از بہر سرگین خوردن است (رومی)

اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کریں گے،

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ "میرا رب مجھ سے قریب ہے، میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے" اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ "بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنتا ہے" جب کسی اعرابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے، جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی،

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ	جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال
قَرِیْبٌ،	کریں تو اُن سے کہہ دیں قریب ہی تو ہوں،

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا:

یا ایھا الناس اربعوا علی انفسکم	یعنی اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو،
انکم لا تدعون اصما ولا غائبا	(یعنی آہستہ کہو) تم کسی بہرے اور غائب کو
انکم تدعون سمیعا بصیرا	نہیں پکار رہے ہو تم پکار رہے ہو سننے اور
وھو معکم، والذی تدعونہ	دیکھنے والے کو جو تمہارے ساتھ ہے، اور تم
اقرب الی احدکم من عنق	جس کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے اونٹ کی گردن
راحلہ،	سے بھی زیادہ قریب ہے،

یہ حدیث وما کنا غائبین، کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح ہے،

خواب جہل از حرم قرب مرا دور فگند ورنہ نزدیک ترا ز دوست کسے ہیچ ندید

اس معرفت کے حصول کے بعد جو وراء طور عقل و نظر ہے، جس کی سند نص قطعی و کشف صحیح ہے [۱]

---

[۱] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵،

یہ علوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بغیر اختلاط وحلول واتحاد کے ہمیں حاصل ہے، صوفیہ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے، اور خوف وحزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت وحکمت کے ہیں،

(۱) قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے۔ حق تعالیٰ تو حلیم ورحیم ہیں، غفور وکریم ہیں اِنَّ اللّٰہ بِکُمْ لَرَؤُفٌ رَّحِیْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن ورحمت ہی کی طرف بلاتے ہیں، اللّٰہ یدعوا الیٰ دار السلام ان کا فضل وکرم عظیم ہے، وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ وہ ہمارے سچے دوست ہیں، اللّٰہ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، اُن کے سایۂ رحمت میں زندگی بسر کریں اور اُن کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمتِ حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کونسی قوت آسکتی ہے،

لیکن ہماری زندگی ذہول وغفلت میں گذرتی ہے، معصیت ونافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ یار مہربان کی طرح ہمارے جویا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور ادبار اور آفتوں کا شکار ہوتے ہیں،

تو مرا جویا چو یارِ مہربان ... من گریزان از تو مانندِ خران (رومی)

جب خوف وحزن آفات وبلیات کا سامنا ہو اور ہم قرب حق کا ارادہ قائم کر سکیں تب کو اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمتِ کاملہ کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں، مونس ورفیق ہیں، یار مہربان ہیں، ہماری قوتِ بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں

ولی اللہ مہائمی در تفسیر القرآن المسمی بہ تبصیر الرحمٰن ص ۳۱۹

وہی حق تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور ورحمت کے جاندار اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن و مکرم و منعم ہیں جو حرز ضعفاً ذکر فرما ہیں؛ تو بھلا بتلاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، حاشا وکلّا! قرآن کریم نے بانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی و یقینی ہے،

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ	جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان
بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ	کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ
الْقُلُوْبُ۔	اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان
	ہوتا ہے

"ذکر" توجہ قلبی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی، اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے، کہ خوف دور ہوا اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہمیں یقین ہو گیا، اور ہم نے محسوس کر لیا کہ رحمتِ حق ہمارے سامنے ہے، وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا!

لیکن خوف و خطرے کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو، تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا، پس ازبس یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو، یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، اُن کی یاد میں زندگی بسر کریں، اُن کی معیت کا ادراک کرتے رہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اس بنا پر نصیحت فرمائی تھی، کہ

اُذْکُرِاللّٰہَ فِی الرَّخَاءِ یَذْکُرْکَ فِی الشِّدَّۃِ، - اللہ کی یاد چین کی حالت مین کرو وہ تجھ کو سختی کی حالت مین یاد کریگا یعنی تیری مصیبت دور کرے گا،

جب انسان آسایش اور چین کی حالت مین حق تعالیٰ کی یاد نہین بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت مین نہین بھولتے، اس لئے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے،

فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ، چین اور آسایش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو

جانتے ہو کہ چین کی حالت مین دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے، وَمَا بِکُمْ مِنْ نِعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ حقیقت مین منعم، قاسم، فاعل مسبّب موجد حق تعالیٰ ہی ہین، ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتون کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ مین شکر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور مومن کی شان مین فرمایا گیا ہے،

اَلْمُؤْمِنُ شَکُوْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ مومن چین کی حالت مین حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے،

اگر ہم آسایش و نعمت کی حالت مین حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھین، نعمتون کو ان ہی کی جانب سے نہ سمجھین، اور اس طرح اپنا رُخ اُن ہی کی جانب نہ رکھین، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہین قائم کرسکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چین و آسایش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ذہن اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم اُن کی معیت کا ادراک کرسکین، اُن کی رحمت کا لمہ کو اپنا مونس و رفیق پاسکین، اس نے حضور انورؐ نے ابن عباسؓ سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

اِحْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ اللّٰہُ، خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمھاری نگہداشت

احفظ اللہ تجدہ امامك — کرے گا، خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤگے،

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں یعنی اُن کی معیت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں، (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انھیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں:۔

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں" میں آپ کی نظروں میں ہوں" پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے، کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور اُن کی رحمت کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط ہے،

خوف اور بلا کے ورود کے وقت قرآن شاہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا، — اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو،

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، حضور و معیتِ حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں جھومتے رقص کرتے، خود حضور انور[1] پر اس آیت سے وجد طاری ہوا تھا، اور اُم المؤمنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، جامیؔ نے شاید اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

با درد بساز چون دوائے تو منم — در کس منگر کہ آشنائے تو منم

---

[1] معارف:۔ لائق مضمون نگار نے اس کی کوئی سند نہیں لکھی ہے،

گر بہ سر کوے عشق ما کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(۲) ثانیاً قربِ حق یا حضورِ حق حکمت و نظم کا نام ہے، حضورِ حق عالمِ لاہوت ہی، عالمِ لاہوت میں کامل الٰہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہیں، عالمِ لاہوت میں شر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم و ترتیب ہی،

نظمِ کائنات پر غور کرو، یہاں پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے، مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں قصور نہیں کرتا، دوسرے برقیہ سے نہیں ٹکراتا اُن کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صُنعِ الٰہی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا، بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ درماندہ ہوکر لوٹتی ہی، اور کوئی عیب یا خلل نظر نہیں پڑتا،

ما تریٰ فی خلق الرحمٰن مِنْ	تو خدا کی صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا
تفٰوتٍ فارجع البصرَ هل	تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھے کہیں تجھ کو
تریٰ مِنْ فُطورٍ ثم ارجع البصر	کوئی خلل نظر آتا ہے، پھر بار بار نگاہ ڈال کر
کرّتین ینقلب الیک البصرُ خاسئًا	دیکھ، نگاہ ذلیل اور درماندہ ہوکر تیری
وھو حسیر (پ ۲۹ ع ۱)	طرف لوٹ آئے گی،

عالمِ لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم و توافق کی حکمرانی ہے، یا یوں کہو کہ نظمِ الٰہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے، نغمہ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ان میں سے ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے مرتعش ہوتا ہے، اس رفتار میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظمِ الٰہی کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مفوضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی ہے، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے،

حضورِ حق یا قربِ حق کے مفہوم میں نظمِ الٰہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں

اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظم الٰہی، حکمتِ حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہے گا،

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں، کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے، کہ معیت حق نہ صرف رحمت ہی، بلکہ حکمت بھی ہے نظم بھی ہی، لہٰذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس یقین صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا،

عارف رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے،

رو دیدہ بپوش تا دلت دیدہ شود زان دیدہ جہانِ دگرت دیدہ شود

گر تو ز پسند خویش بیرون آئی کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر دیدۂ دل سے حکمتِ الٰہی نظر آنے لگے، اگر دل نظم الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت وشہود میں وہ جا بھی رہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا، اور ہر وقت وہی کہے گا، کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آنچنان می باید وآن چیز کہ آنچنان نمی باید نیست!

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللّٰہ معنا، بلکہ ہر زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل ہمارے اعضاء اور ہم خود سراپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشائے الٰہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سراپا حکمت ہی، رحمت ہی، یہ ہمیں خیر بہتر ہی کی طرف لیجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللّٰہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضی مولیٰ بھی کہا گیا ہی، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق اُن کی رضا سے راضی ہونا، رضا اُدو، رضا بدو، رضا درو، اعراض عن الاعتراض "حفظ حال"، "قیام فی ما اقسام اللّٰہ" اس کی تعلیم تو ہمارے پیغمبر اعظم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے

ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی، سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس زیادہ حسین وجمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہوسکتی، نیک انجام و شاد کام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کرلیا اور بآواز بلند کہا

اُرِیْدُ ان لا ارید،	میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا

اور حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو،

اللّٰھمّ انی قلوبنا ونواصینا	حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سراپا
وجوارحنا بیدك لم تملکنا	اور ہمارے اعضا آپ ہی کے قبضہ
منھا شیئًا فاذا فعلت	میں ہیں، اور آپ نے ہمیں اُن میں سے
ذالك، فکن انت ولیّنا	کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں
واھدِ نا الی سواء السّبیل[1]	دیا ہے، پس جب آپ نے یہ کیا ہے،
	تو آپ ہی ہمارے مددگار رہئے، اور
	ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہئے،

جس کی شب و روز یہ دعا ہو کہ

اللّٰھُمّ انّی ضعیف	حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی
فقوّنی فی رضاك	مرضیات میں میرا ضعف اپنی قوت
ضعفی وخُذ الی	سے بدل دیجئے، اور کشاں کشاں
الخیر بناصیتی و	مجھے خیر کی طرف لے جائیے، اور اسلام
وَاجْعل الاسلام	کو (یعنی سرا مریں آپ کے سامنے

---

[1] ترمذی عن ابی ھریرۃ وکنز العمّال عن جابر،

منتہائے رضائی،[1] سر تسلیم خم کرنے کی خو کو) میری پسند

کا منتہا بنا دیجئے،

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہوجاتے ہیں، اُن کے ارادے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے ہیں، تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس کی توثیق کی ہے، ان اللہ رجالا یرضی برضائهم و یغضب بغضبهم کما یرضوا برضاءِ لا و یغضبوا لغضبه،

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہی آن کنی

آنچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر یہ پروا نہیں رہتی، کہ زندگی میں ہم پر کیا گذرا ہے، یا گذرنے والی ہے، کیونکہ ہم جاننے لگتے ہیں، کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لئے بھی اسی لئے شیخ جیلی نے جان کر کہا تھا، کہ

الرضا بالقضا هو الراحة الكبرى	قضائے الٰہی سے راضی رہنا دنیا میں
والجنة العالية المنفردة فی	بڑی راحت کا سبب ہے، گویا
الدنیا وعلة محبة الله لعبده	جنت عالیہ ہے، اور عبد مومن کے
المومن فمن احبه الله لم یعذبه	ساتھ حق تعالیٰ کی محبت کا باعث
فی الدنیا والآخرة[1]	ہے، اور جس سے حق تعالیٰ محبت
	کرتے ہیں، اس کو نہ دنیا میں تکلیف

---

[1] فتوح الغیب،

قربِ حق مین زندگی بسر کرنے اور اس پر یقین صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی مین مرادِ الٰہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف پریشانی فکر اور بے شمار خرابیون کا کامل دفعیہ ہو، ہم کو اسی سے اس عارف کامل کا نقطۂ نظر حاصل ہو جاتا ہے جو زندگی اور اس کے ہموم و غموم، افکار و پریشانیون پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پس پردہ حکمتِ مطلقہ و رحمتِ مطلقہ کام کر رہی ہے، اور اپنے شاندار منشأ و مراد کی تکمیل کر رہی ہے، اور ہمین خیر برترین کی طرف لے جا رہی ہے، سارے جہان کو بھی اگر وہ برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے، تو گھبراتا نہین، کیونکہ وہ جانتا ہے، کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ ساری برف پگھل جائے گی،

گر جہان پُر برف گردد سر بسر

تابِ خور بگدازدش از یک نظر (رومی)

اس لئے وہ اپنے ساتھیون سے عجیب امید افزا لہجہ مین کہتا ہے،

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست

سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہی ہے کہ

(۱) قربِ حق مین زندگی بسر کرو کیونکہ

عمرِ خوش در قربِ جان پروردن ست

عمرِ زاغ از بہرِ سرگین خوردن ست

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھون مین نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے، رضائے حق تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ"! حق تعالیٰ نے جہان تمھین کھڑا کیا ہے، وہین کھڑے رہو، رضا بالعطا، حفظا حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت مین خوش رہو، تصادم بالقضا سے بچو،

جن تجربات سے گذر رہے ہو، ان پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمھین موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دنیا کو "روح ساز" وادی کہا گیا ہے، یہان کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تارون سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہین، ان پر ہر حال مین شکر واجب ہے، کرب و بلا دونون کی ایک سی قیمت ہی،

بالفاظ دیگر جن چیزون سے تمھین خوف ہو، اُن ہی سے پیار کرو، اور خوف سے تمھین ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی،

بس زبون وسوسہ باشی دلا
گر طرب را باز دانی از بلا

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ہندی قرون وسطیٰ

جلد دوم

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (علیگ)

مذکورہ بالا کتاب ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ہے جس میں ۱۱۹۰ء سے ۱۳۲۰ء یعنی سلطان محمد غوری سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی تک کے حالات ہیں، فاضل مؤلف قاری محمد بشیر الدین بدایونی ایم اے (علیگ) و ایس پرنسپل اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہجہانپور مبارکباد کے مستحق ہیں، کہ انھون نے بڑی محنت کاوش اور ایک نئے نقطۂ نظر سے اس کتاب کو لکھنے کی کوشش کی ہے، اور اب تک ہندوستان کے مسلمان بادشاہون کی جتنی تاریخین لکھی گئی ہین، ان مین یہ کتاب جداگانہ حیثیت رکھتی ہے،

کتاب کے شروع مین پروفیسر محمد حبیب بی، اے (آکسن) بارایٹ لا، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا مقدمہ، شیخ عبدالرشید ایم اے ال ال بی صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی تقریب اور پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ایم اے شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کا تعارف ہے، مسلم یونیورسٹی کے ان تینون فاضل اساتذہ مین سے اس اردو کتاب مین صرف پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ہی نے اردو زبان مین تعارف لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے، پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر شیخ عبدالرشید نے انگریزی ہی مین اپنی زبان کی

وادوی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دونون فضلا اپنے بلند درجہ سے اردو کی نیچی سطح پر اترنا پسند کرتے ہون، یا شاید تمام زندگی اردو بولتے اور اُس کے ایک بڑے مرکز مین رہنے کے باوجود وہ انگریزی زبان ہی مین سوچتے ہون، تاہم جو کچھ انھون نے انگریزی مین لکھا ہے اگر اس کو اپنی ٹوٹی پھوٹی مادری زبان مین لکھ دیتے تو اُن کی خوش مذاقی کی دلیل ہوتی، ورنہ اردو کی تصنیف مین مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی تحریر کے پیوند سے خود اپنے لسانی افلاس کا مظاہرہ ہوتا ہے، کتاب کے فاضل مؤلف کو شاید اس کا احساس تھا، اس نے اُن انگریزی تحریرون کا ترجمہ اردو مین بھی دیا ہے، اور غالباً پروفیسر حبیب کی بعض باتین بھی اُن کی نگاہ مین قابلِ اعتراض تھین، اس نے مقدمہ کے اردو ترجمہ مین اُن کو حذف کر دیا ہے،

پروفیسر حبیب کا مقدمہ بیس صفحون پر مشتمل ہے، جو نہ صرف ایک کتاب کا دیباچہ بلکہ ایک پرمغز علمی مقالہ بھی ہے، یہ اگر علٰحدہ کسی انگریزی رسالہ مین شائع ہوتا تو زیادہ موزون ہوتا، کچھ دنون سے پروفیسر حبیب نے مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوؤن کے تمدنی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کو اپنا موضوع بنالیا ہے، اور وقتاً فوقتاً وہ اس موضوع پر لکھ کر اپنی وسعتِ نظر اور فراخدلی کے جوہر دکھاتے رہتے ہین، چنانچہ اس مقدمہ مین بھی انھون نے ہندوؤن کے قدیم تمدنی اور ثقافتی پہلوؤن پر بھی بحث کی ہے،

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پروفیسر حبیب جب کبھی مسلمانون کے دورِ حکومت کی جانب توجہ کرتے ہین تو کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور لکھ جاتے ہین، جس سے مسلمانون کے مذہبی اور ملی جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے، یہ مقدمہ بھی اس سے خالی نہین ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہین :-

"مسلمانون کی شریعت مین کوئی پبلک لا نہین ہے، یہ (یعنی اسلامی شریعت) سیاسی حقوق سے کچھ بھی واقف نہین، اس کا تعلق صرف نجی اور شہری حقوق سے ہے،"

(انٹروڈکشن صفحہ ۱۱)

حیرت ہو کہ ایک مسلمان کے قلم سے ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کیونکر نکلی ایک غیر مسلم بھی جو اسلامی شریعت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، ایسی بات نہین لکھ سکتا، اسلام کی تو سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح اس کا دائرہ محض خدا اور بندے کے تعلق یعنی عقائد و عبادات اور اخلاق تک محدود نہین ہے، بلکہ وہ پورا نظام زندگی ہے جس مین عقائد و عبادات اور اخلاق کے ساتھ معاملات یعنی انسانون کے باہمی حقوق و فرائض اقتصادیات، معاشیات اور زندگی کے تمام پہلوؤن کا پورا دستور العمل ہے، موجودہ لادینی سیاست کے نقطۂ نظر سے اسلام اور اس کی شریعت پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اسلام مین مذہب اور سیاست الگ نہین ہین، حکومت اور سیاست کو بھی مذہب مین داخل کر لیا گیا ہے اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو غالباً فاضل پروفیسر نے اسی اعتراض سے بچنے کے لئے سیاست کو اسلامی شریعت سے خارج کر دیا ہے، اس لئے کہ ایک پڑھے لکھے مسلمان سے ہرگز اس کی توقع نہین کی جا سکتی کہ وہ اپنے مذہب سے اتنا ناواقف ہو سکتا ہے، پروفیسر موصوف فقہ کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھ لین، اس مین عبادات کے ساتھ معاملات یعنی انسانون کے باہمی حقوق و فرائض جنگ و صلح، حقوق اعدا، حقوق ذمیین، حقوق متامن، حقوق عوام وغیرہ کے مکمل قوانین ملین گے، بلکہ حکومت کے سیاسی و مالی قوانین پر مستقل کتابین موجود ہین، ماوردی اور ابن عماد حنبلی کی احکام السلطانیۃ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور ابن عبید کی کتاب الاموال حکومت اسلامیہ کے دستوری اور مالی قوانین پر مشہور کتابین ہین، اس کے علاوہ فقہ کی کوئی کتاب بھی ان ابواب سے خالی نہین ہے، ایسی حالت مین اسلامی شریعت کو محض کبھی اور شخصی حقوق تک محدود کر دینا یا تو مصلحت آمیز دروغ یا اسلام سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہے؛

آج کل کے غیر مسلم اہل قلم جب کبھی مسلمانون کے مذہب اور تاریخ پر لکھنے بیٹھتے ہین، تو وہ ان کی مذہبی اور تاریخی کتابون کا گہرا مطالعہ کرنے کے بجائے کسی مسلمان اہل قلم کی ایسی رائے اور تحریر کی جستجو و تلاش مین رہتے ہین جن سے وہ کسی خاص غرض کے لئے فائدہ اٹھا سکین، اس لئے اگر کوئی غیر مسلم

اہل قلم مسلم یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر کی مذکورہ بالا تحریر سے فائدہ اٹھالے تو اُن کے یہ چند فقرے کس قدر مضر ثابت ہو سکتے ہین،

پروفیسر موصوف نے خلاف توقع ایک نئی بات یہ پیش کی ہو کہ ہندوستان مین مسلمانون کی آمد سے پہلے اور اُن کی حکومت کے زمانہ مین مزدورون کا سوال بہت اہم تھا، اور بے روزگاری کی وجہ سے اُن مین مستقل بے چینی رہتی تھی، آج کل ہر ملک مین یہی سوال پیدا ہے، اور سیاست کا کھیل مزدورون ہی کے ذریعہ سے کھیلا جارہا ہے، اور آیندہ تاریخ ان ہی مزدورون کے ذریعہ سے بنائی جانے والی ہو، اس لئے آج کا مورخ گذشتہ عہد کی تاریخ کا مطالعہ بھی اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہتا ہے، جو صحیح نہین ہے، ہماری گذشتہ تاریخ عام طور سے جو مسخ ہو گئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ اس کو موجودہ دور کی عینک سے دیکھا جاتا ہے، معلوم نہین آگے چل کر اور کن کن عینکون سے گذشتہ دور کے واقعات دیکھے جائین گے، اور اُن کی کیا کیا تعبیرین کی جائین گی، لیکن یہ تعبیرین مورخون کی محض اُپج ہی ہون گی، جن کا تعلق حقیقت سے نہ ہوگا،

پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ اگر مزدورون، گاؤن والون اور شہر کے کام کرنے والون مین بددلی اور بے چینی نہ ہوتی، تو شہاب الدین غوری ہندوستان کو اتنی آسانی سے فتح نہ کر سکتا تھا، اُن کے خیال مین غوریون کی فتح اُن کی سپہ گری اور جانبازی کا نتیجہ نہین، اس لئے اس کو اُن کا سپاہیانہ کارنامہ قرار نہین دیا جاسکتا، بلکہ ان کی فتح کو سقوطِ ہند (Indian Coollapse) کہنا چاہئے، ممکن ہے، یہ راے صحیح ہو، لیکن اس کو قبول کرنے مین اس لئے تامل ہوتا ہے کہ ۱۱۹۱ء مین جنگ ترائین مین غوریون کو شکست فاش ہوئی، تو پروفیسر صاحب کے خیال کے مطابق اس کا سبب یہ ہوگا، کہ ۱۱۹۱ء مین مزدورون، کسانون، اور کام کرنے والے طبقون مین بددلی اور بے چینی نہین تھی لیکن اس کے کل سوا سال کے بعد پھر غوریون نے راجپوتون کے مقابلہ مین فتح حاصل کی، اور بہت جلد

سارا ہندوستان مسلمانون کے زیر نگین ہوگیا، اب اگر پروفیسر صاحب کی رائے تسلیم کرلی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک بہت ہی قلیل مدت مین مزدورون اور کام کرنے والے طبقون مین بددلی اسی سرعت اور عجلت کے ساتھ پھیلی جیسی کہ موجودہ دور مین ڈاک، تار، ریل، ہوائی جہاز، اخبار اور ریڈیو کے ذریعہ سے پھیلائی جاتی ہے،

علائی منار (جس سے مراد غالباً قطب منار ہے) اور اس کے پاس قطب مسجد (یعنی مسجد قوۃ الاسلام) مسلمانون کی شاندار تعمیری یادگارین ہین لیکن پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ اس قسم کی بے مصرف تعمیرات عامہ (Useless public structures) محض بے روزگارون کی بے روزگاری مزدورون کی بے چینی دور کرنے کے لئے کرائی جاتی تھین، اگر کسی چیز کو محض جنبش قلم سے بے کار اور بے مصرف قرار دیا جاسکتا ہے، تو دنیا کے ہر ملک کی شاندار یادگارون کی اہمیت بالکل ہی ختم ہوجائے گی، لیکن اس قسم کی رائے وہی مورخ ظاہر کرسکتا ہے جو کسی خاص عینک سے تاریخ کا مطالعہ کرنا یا کسی مقصد کے لئے ماضی سے نفرت پیدا کرانا چاہتا ہو، اگر قطب منار، اور مسجد قوۃ الاسلام کی محرابون کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ محض مزدورون کی بے چینی دور کرنے کی خاطر تعمیر کی گئین، تو پھر اسپین کے الحمرا و الزہرا، دمشق کی جامع اموی، اور مصر کی جامع عمرو بن العاص کی محرابون اور منارون، ہندوستان مین فتح پور سیکری کی عمارتون، جہانگیر کے مقبرے اور تاج محل وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے، اس طرح آرٹ کے نقطۂ نظر سے ان عمارتون کے مطالعہ اور اُن کی اہمیت کا سوال ہی باقی نہین رہ جاتا،

فاضل پروفیسر نے اپنے انگریزی مقدمہ مین کتاب کے مؤلف قاری محمد بشیر الدین پنڈت کے نام کے ساتھ کہین پنڈت اور کہین شمری لکھا ہے، اسی کے ساتھ اگر وہ کسی جگہ قاری بھی لکھدیتے، تو ان کی روشن خیالی اور فراخ دلی پر حرف نہ آتا،

فاضل مصنف کی اصل کتاب کا آغاز "لمحۂ فکریہ" سے ہوتا ہے جس مین بعض خاص خاص مسائل مثلاً اسلامی جہاد کی حقیقت، حرمت نفس، قصاص، مقصد جنگ، مجاہدین کا درجہ، مدافعانہ جنگ، جزیہ اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول، مسلمانون کا خلیفہ، طریق انتخاب و طریق کار، یہ مفید مباحث ہین جن سے مؤلف کی وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، لیکن اگر یہ مباحث ایک مستقل باب مین لکھے جانے کے بجائے کتاب کے خاص خاص مسائل کے ساتھ ہوتے، تو زیادہ بہتر ہوتا، مثلاً اسلامی جہاد کی حقیقت کے سلسلہ مین یہ بتایا جاتا کہ اس بارہ مین اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے، اور عملی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانون نے کیا کیا، اسی طرح یہ بھی ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ اسلام مین جنگ کا مقصد کیا ہے، اور مسلمان فاتحون کے کیا مقاصد تھے، یا اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول پر بحث کر کے یہ دکھایا جا سکتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانون نے ان اصولون کی پابندی کہان تک کی تمہید مین جزیہ پر تو بحث ہے، لیکن جن مسلمان فرمانروا‌ؤن کا حال لکھا گیا ہے، اُن کے دور حکومت مین کہین جزیہ کی بحث نہین آئی ہے، اسی طرح باب اول مین ہندوستان مین آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ اور اسی کی فصل دوم مین "ہندوستان مین آنے سے پہلے مسلمانون کی علمی ترقیان" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مصنف کے معلومات کا اظہار تو ضرور ہوتا ہے، لیکن اگر ان کو حذف کر دیا جائے تو اصل کتاب کے علمی وزن مین کوئی کمی نہین ہوتی ہے، البتہ اگر یہ دکھایا جاتا کہ ہندوستان مین مسلمانون کی آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا، اور خود ہندوستان کے مسلمانون کی سوسائٹی کا کیا رنگ رہا۔ اسی طرح ہندوستان مین آنے سے پہلے مسلمانون کی علمی ترقیان دکھا کر ہندوستان کے مسلمانون کی علمی ترقیان پیش کیجاتین تو لائق مصنف کا یہ بڑا علمی کارنامہ ہوتا،

باب دوم کی مختلف فصلون مین عہد یمینی سے پہلے کے ہندوستان کے مذہبی اور معاشرتی حالات دکھائے گئے ہین، جو اپنے معلومات کی وجہ سے لائق مطالعہ ہین، فاضل مؤلف نے زیر نظر تاریخ کی

پہلی جلد بھی لکھی ہی، جس مین ظاہر ہے کہ عربون اور غزنویون کی حکومتون کے حالات ہون گے، اس لئے جلد دوم کے باب دوم مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر وہ ان کی پہلی جلد مین ہوتا، تو زیادہ مناسب تھا، لیکن شاید پہلی جلد مین یہی باتین کسی اور نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہون،

باب سوم مین ۱۲۰۰ء سے پہلے کی ہندؤن کی مختلف ریاستون اور حکومتون کا ذکر ہے، باب چہارم اور باب پنجم مین غوریون، غلامون اور خلجیون کی تاریخ ہے، جس کے پڑھنے کے بعد مؤلف کی تلاش وتحقیق کے شوق اور تاریخ نویسی کے ذوق کا پورا اندازہ ہوتا ہی، طرز بیان سنجیدہ اور متین ہے اور زبان صاف وسلیس ہے،

حاشیے مین جن ماخذون کے حوالے دئے گئے ہین، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ وسیع ہی، لیکن ان مین بکثرت ایسی کتابین بھی نظر آتی ہین، جو تعلیمی ادارون مین مقبول ہین، لیکن نصابی کتابون کو خواہ وہ کیسی ہی مفید اور مستند ہون، کسی محققانہ کتاب کا ماخذ بنانا احتیاط کے خلاف ہے، معلوم نہین فاضل مصنف نے کہین ضیاء برنی، اور زیادہ تر ضیائے بَرنی لکھنا کیون پسند کیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید پُر از معلومات اور لائق مطالعہ ہے،

تاریخِ سندھ

مولانا مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ، اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی وتمدنی حالات اور رفاہِ عام کے جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہی،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے، قیمت: للعہ ر

"منیجر"

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی ڈپٹی کلکٹر آرہ

بزمِ طرب سے کام کیا لذتِ غم چشیدہ کو
صحنِ چمن سے کیا غرض برگِ خزاں رسیدہ کو

نرگسِ مستِ ناز کی اُڑ رہی فسوں طرازیاں
دیتی ہے ذوقِ مے کشی زاہدِ برگزیدہ کو

دن کو سکون محال ہے رات کی نیند حرام ہے
روگ ہے انتظار کا دیدۂ خوں چکیدہ کو

عقل کی ہرزہ کاریاں اہلِ خرد کو ہوں پسند
دے نہ سکے گی یہ فریب ذوقِ جنوں چشیدہ کو

بڑھ گئی دل کی بے کلی دیکھ کے زلفِ خم بہ خم
کیسے سکون ہو سکے طائرِ دام دیدہ کو

اپنے مریضِ غم کا حال پوچھ بھی لو دمِ اخیر
دیدو نویدِ زندگی جانِ بلب رسیدہ کو

سامنے آکے دل کو پھر محشرِ غم بنا دیا
آگ لگا دی چھیڑ کر شعلۂ آرمیدہ کو

بزمِ جہاں میں ابتری پھیل رہی ہے ہر طرف
اُٹھ کے ذرا سنوار لو کاکلِ سرکشیدہ کو

گلشنِ دہر میں ولی لالہ و گل تھے بے شمار
کوئی سکون نہ دے سکا میرے دلِ رمیدہ کو
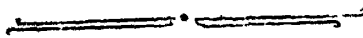
مطبوعات جدیدہ

مضامین سید سلیمان ندوی | مرتبہ جناب مولوی ابو سلمہ محمد شفیع صاحب بہاری تقطیع
حصہ اوّل | چھوٹی ضخامت: ۳۹۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت للعہ، پتہ مکتبہ علم و حکمت محلہ سکونت کلان بہار شریف ضلع پٹنہ،

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے سیکڑوں علمی ادبی و مذہبی مضامین نکل چکے ہیں جن کا بڑا حصہ الندوہ اور معارف کے اوراق میں بکھرا ہوا ہے، یہ تمام مضامین علمی و افادی حیثیت سے اس لائق ہیں کہ ان کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع کیا جاتا، لیکن موصوف نے کبھی اسکی جانب توجہ نہیں فرمائی، اسلیے لائق مرتب تشکر کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے ذوق سے چند مذہبی و علمی مضامین منتخب کرکے اُن کا ایک حصہ شائع کر دیا، اس حصہ میں حسب ذیل مضامین ہیں، اسلام دونوں جہان کی بادشاہی، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، اسوۂ نبی، حقیقت صوم، کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے، وحی از روے قرآن، اور مدعی کا تضاد بیان، وحی کے اقسام، علوم القرآن، ہمدردانہ خلیل اللہ کی بشریت، ذبح عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک، اسلام اور سوشلزم، رومن کیتھلک کی چند من گھڑت کہانیاں، نئی صورت حال کی پرانی دستاویز، اندراج نکاح و طلاق اور تقرر قضاۃ، تاج محل، اور لال قلعہ کے معماروں کی بحری تصنیفات، عرب اور امریکہ، یہ تمام مضامین اپنے مفید اور بیش قیمت معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں، لیکن جہاں فاضل مرتب تشکر یہ کے لائق ہیں کہ انھوں نے ان بکھرے ہوے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا، وہیں وہ قابل شکایت بھی ہیں کہ مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں پوری توجہ

سے کام نہیں لیا، اگر مختلف حصّوں میں مضامین کو شائع کرنا تھا تو ہر جلد ایک موضوع کے مضامین کے لئے مخصوص ہونی چاہئے تھی اور اس جلد میں جیسا کہ مضامین کی فہرست سے ظاہر ہے علمی مذہبی و تاریخی کئی قسم کے مضامین ہیں، اور ان کا انتخاب و ترتیب بھی قابلِ اصلاح ہے، گو اس مجموعہ میں حضرت الاستاذ کے مختصر پیش لفظ کی بھی سند موجود ہے لیکن موصوف کو خود ایسے کاموں کی جانب توجہ کرنے کی مہلت نہیں ملتی اور جو شخص بھی ان سے اس قسم کی تحریریں لکھانا چاہتا ہے، اس سے پاس مروت سے انکار نہیں کر سکتے، یہ پیش لفظ بھی اسی قسم کا ہے، اگر مرتب دار المصنفین کے کسی شخص سے مشورہ کر لئے ہوتے، تو یہ مجموعہ اس سے بہتر شکل میں ہوتا، ہم کو امید ہے کہ اگر اس کی بقیہ حصّوں کی اشاعت کی نوبت آئے، تو وہ ضرور رفقائے دار المصنفین سے مشورہ کر لیں گے، اور ان کی طباعت و کتابت میں بھی اس سے زیادہ اہتمام فرمائیں گے تاکہ یہ مجموعہ ہر حیثیت سے مضامین کا شایان شان ہو، تاہم ان فروگذاشتوں کی وجہ سے ان مضامین کی اہمیت و افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، اور وہ اصحابِ علم کے مطالعہ کے لائق ہیں،

بوستانِ حسرت از جناب مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ عمدہ طباعت نفیس و پاکیزہ قیمت سے ر پتہ:- کانفرنس بک ڈپو، سلطان جہان منزل علی گڈھ،

ہمارے مخدوم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی ہماری بزم دوشین کی وہ آخری شمع ہیں، جن سے ہماری پرانی باوضع و باوقار تہذیب و شرافت کی محفل روشن ہے، ممدوح کے گوناگوں کمالات کے ساتھ ان کا ذوق ادب اور ذوق سخن بھی نہایت پاکیزہ ستھرا اور نکھرا ہوا ہے، ان کی نثر کی طرح ان کی نظم بھی رنگینی و لطافت اور حسن و دلآویزی کا مرقع ہوتی ہے، اگرچہ انھوں نے تالیف و تصنیف کی طرح شعر و سخن کو مستقل مشغلہ نہیں بنایا، لیکن ان کا ذوق ادب کبھی کبھی اس رنگ میں بھی اپنی بہار دکھاتا تھا، بوستان حسرت اسی بہار کا خوشرنگ گلدستہ ہے، ممدوح، مولانا شبلی مرحوم

مرحوم لکھنوی اور حضرت گرامی جیسے اساتذۂ سخن کی بزم ادب کے ایک رکن تھے، اور ان اساتذہ نے اُن کے فارسی کلام کی داد دی ہے، بوستانِ حسرت کی غزلیں نعتیں، قطعات تاریخ اور دوسری متفرق منظومات اس کا ثبوت ہیں، ان میں قند پارسی کی شیرینی اور چمنستان شیراز کی بہار کا لطف ہے، بیشتر غزلیں عالمِ شباب کی یادگار ہیں، اس لئے ان میں شراب کی مستی، پھولوں کی نکہت و رنگینی اور موسیقی کا ترنم ہے، اور بقول مولانا حالی "یہ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہیں، جن میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے" خیالات کی رنگینی و لطافت اور زبان کے لطف کا اندازہ اُن کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں سید الطاف حسین صاحب بریلوی کی تقریب اور مصنف کے قلم سے فارسی غزل کی مختصر تاریخ ہے، جو بجائے خود مستقل حیثیت رکھتی ہے، اب بادۂ شیراز کا ذوق ختم ہوتا جاتا ہے، اس کے لذت آشنا بہت کم باقی رہ گئے ہیں، اس لئے اس کا جو جام بھی نظر آجائے، تبرک سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہئے، اس لئے توقع ہے کہ فارسی شاعری کے ذوق آشنا بوستانِ حسرت کی نکہت بیزیوں سے لطف اندوز ہوں گے،

مولود شمسی، مرتبہ محترمہ شمسی عباد الرحمٰن صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ نولکشور پریس لکھنؤ،

میلادِ نبوی کی محفلوں میں جو کتابیں عام طور سے پڑھی جاتی ہیں، اُن کی بیشتر روایات غیر معتبر اور اسلامی عقیدہ کے خلاف ہوتی ہیں، جن سے محفلِ میلاد کا اصلی مقصد یعنی اسوۂ رسول پر عمل کی ترغیب کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، لیکن مولود شمسی سیرت نبوی کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہے، اس لئے اس عیب سے پاک ہے، اور مصنفہ نے واقعات کے انتخاب اور اُن کی ترتیب و تحریر میں بڑے سلیقہ سے کام لیا ہے، اور سوانح نبوی آپ کے خلق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو بڑے موثر اور دلنشین انداز میں تحریر کیا ہے، یہ کتاب نہ صرف میلاد کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے مناسب بلکہ مذہبی معلومات کی حیثیت سے عورتوں کے مطالعہ کے لائق ہے، اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہے، اگر اس قسم کی کتابیں میلاد کی مجلسوں میں پڑھی جائیں

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے ان کی جامع شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پر اور پھر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملت، نظام سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- [illegible]

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت:- ۵۷۰ صفحے،

قیمت:- [illegible]

منیجر

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین ان زمین کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں بادشاہت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- ؏

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) **منیجر**

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اے

مارچ ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت:- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی، بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاحات و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

"تاریخ اسلام حصۂ اول"

(عہدِ رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۹۵ صفحے قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- عہ

"منیجر"

"تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت عہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۴۳۲ صفحے

قیمت :- عہ

"منیجر"

جلد ۶۵ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان کی غلامی کے زمانہ مین فرقہ پرستی کا سارا الزام انگریزون کے سر منڈھ دیا جاتا تھا، اور یہ کہکر دل کو تسلی دیجاتی تھی کہ یہ آگ انگریزون کی لگائی ہوئی ہے، ان کے بعد خود ٹھنڈی ہو جائیگی، لیکن آزادی ملنے کے بعد اس کے شعلے اور بھڑک اٹھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیون کا بھرا ہوا بخار دفعتہً پھوٹ پڑا ہے جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی جماعت بھی محفوظ نہین، جو لوگ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علمبردار سمجھے جاتے تھے، وہ بھی اس کی لپیٹ مین آگئے تاہم اب بھی دونون ملکون مین کچھ ایسے حق پرست انصاف پسند اور محب انسانیت موجود ہین، جو ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہشمند اور ہندوستان اور پاکستان پر یہان کی اقلیتون کا بھی وطنی حق سمجھتے ہین، اور چاہتے ہین کہ ان پر زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ ان ملکون کی اکثریت کی طرح امن و سکون و خوشحالی کی زندگی بسر کرین لیکن اُن کی تعداد بہت کم اور اُن کی آواز بے اثر ہے، عام ذہنیت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ حکومت کو بھی فرقہ پرستون پر قابو نہین رہ گیا ہے، اور وہ آزادی کے ساتھ اقلیتون کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتے رہتے ہین اور حکومت اُن کے خلاف کوئی اقدام نہین کر سکتی،

ہندوستان اور پاکستان کے آئے دن کے اختلافات اور ان کی اقلیتون کی بے اطمینانی اس آگ کو اور مواد دیتی رہتی ہے، اس سے فرقہ پرستون کو زہر پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، اور اس کا خمیازہ دونون ملکون کی اقلیتون کو بھگتنا پڑتا ہے، جن کی حیثیت یرغمال کی سی ہوگئی ہے، جہان ہندوستان اور پاکستان مین کوئی نئی پیچیدگی پیدا ہوئی، یا ایک ملک کی اقلیت پر ظلم و زیادتی کی جھوٹی یا سچی خبر آئی کہ دوسرے ملک کی اقلیت کی جان پر بن گئی، اور اس کے امن و سکون کا خاتمہ ہوگیا، انکی زندگی جس بے اطمینانی اور موت و حیات کی کشمکش مین گذر رہی ہے، اس کا اندازہ صرف ہندوستان کے مسلمان اور پاکستان کے ہندو ہی کر سکتے ہین، اگر یہ صورت قائم رہی تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان دونون کا حشر کیا ہوگا، ان کے بچنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہین ہے کہ پاکستان ہندوون کی اور ہندوستان مسلمانون کی پوری حفاظت اور اپنے عمل سے اُن کو مطمئن کرے

ورنہ موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت اور انتقام در انتقام کا سلسلہ اگر قائم رہا تو کچھ کرور انسانون کی تباہی اور ہلاکت یقینی ہے جس کا وبال دونون حکومتون کے سر ہوگا،

ہندوستان کی حکومت تو لادینی ہے، جو صرف دنیاوی قانون کی حیثیت سے مسلمانون کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اس کو اور کسی مواخذہ کا خوف نہین لیکن پاکستان تو اسلامی حکومت ہونے کا مدعی ہے اس لئے پاکستان کے غیر مسلمون کے ساتھ عدل و انصاف اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کا مذہبی فریضہ ہے اور وہ خدا کے سامنے اس کا جوابدہ ہوگا، اس لئے اس پر غیر مسلم محکومون کی حفاظت کی دُہری ذمہ داری ہے اس کے علاوہ غلط یا صحیح ہندوستان کے مسلمانون کا امن و سکون پاکستان کے ہندوؤن سے وابستہ کر دیا گیا ہے، جو حال ان کا پاکستان مین ہوگا وہی مسلمانون کا ہندوستان مین ہوگا، اس حیثیت سے پاکستان پر ہندوؤن کی حفاظت کی اور زیادہ ذمہ داری ہے، کیا غازیان پاکستان پر شہدائے پاکستان کا اتنا حق بھی نہین ہے کہ وہ ان کے تحفظ و اطمینان کے لئے پاکستان کے ہندوؤن کو محفوظ و مطمئن رکھین، ان کو کیا خبر کہ ان کی ایک غلطی سے ہندوستان کے مسلمانون پر کیا گذر جاتی ہے،

تو اے کبوتر بامِ حرم چہ میدانی تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

ان کے ساتھ پاکستان کا سب سے بڑا سلوک و احسان یہی ہے کہ وہان کے ہندوؤن پر زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ محفوظ و مطمئن رہین، ہندوستان کے مسلمانون کی حیثیت پاکستان کے یرغمال کی ہے، وہان کی جو فضا ہوگی اس کا اثر ہندوستان کے مسلمانون پر ضرور ظاہر ہوگا، اسلئے ان کا امن و سکون انھین کے ہاتھ مین ہے خواہ وہ ان کو زندہ رہنے دین یا تباہ کرا دین،

اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانون کو یہ کہنا ہے کہ غیر اللہ کا خوف و ہراس نہ صرف اسلام کی تعلیم اور ایمان کی شان کے خلاف ہے بلکہ دنیاوی حیثیت سے بھی زندہ رہنے کا یہ اصول نہین، وہ اپنے دل کو مضبوط رکھین اور ایمان و عمل کی قوت پیدا کرین، اسی سے زندگی کی طاقت آتی ہے، اگر وہ حوصلہ و ہمت اور ہوشمندی سے کام لین تو فرقہ پرست ان کو ختم کر سکتے ہین اور نہ حکومت نظر انداز کر سکتی ہے، چار کرور کی طاقت معمولی نہین ہے، بشرطیکہ وہ خوف و ہراس اور سوء تدبیر سے خود اپنے کو موت کے حوالہ نہ کرین، موت سے ڈر نا زندہ رہنے والی قومون کا شیوہ نہین مسلمانون کا تو

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں

فنون جنگ

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین

میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب

غزنویوں کی فوج کی صف آرائی | غزنویوں کے عہد میں لڑائی کے موقع پر فوجوں کی ترتیب میں حسب ذیل صفیں ہوتی تھیں،

(۱) مقدمہ (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب،

تاریخ یمینی کے مصنف عتبی کا بیان ہے کہ نارین کی معرکہ آرائی کے موقع پر سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کی ترتیب اس طرح دی،

"سلطان جب اپنی منزل مقصود کے قریب پہونچا تو اس نے اپنے سواروں کو صفوں میں مرتب کیا، اور مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ میمنہ میں اپنے بھائی امیر نصر بن ناصر الدین کو جانباز بہادروں کے ساتھ مقرر کیا، میسرہ میں ارسلان الجاذب کو طاقتور نوجوانوں کے ساتھ نامزد کیا، اور مقدمہ میں عبد اللہ محمد بن ابراہیم طے تھا جس کے ساتھ غیظ و غضب سے

بھرے ہوئے عرب سوار تھے، قلب مین التونتاش شاہی حاجب تھا، اس کے ہمراہ شاہی غلامون کی ایک بڑی تعداد پہاڑ بن کر کھڑی تھی؎[1]،

مقدمہ فوج کی اگلی صف میمنہ دائین صف، میسرہ بائین صف، اور قلب مرکز کو کہتے تھے، کچھ فوجین عقب مین بھی رہتی ہون گی، مگر غزنوی دور مین ان .... کے لئے کون سی اصطلاح استعمال کیجاتی تھی معلوم نہین ہو سکی،

غوریون کے لشکر کی صف آرائی | یہی ترتیب غوریون کے زمانہ مین بھی رہی، ترائین کی جنگ مین معزالدین محمد بن سام المعروف بہ شہاب الدین غوری نے جو صفون کی ترتیب دی تھی، ان کے لئے منہاج سراج نے حسب ذیل اصطلاحات استعمال کی ہین،

(۱) قدام لشکر (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب (۵) خلف،

اس جنگ مین فوجون کی صف آرائی کا ذکر منہاج سراج نے ان الفاظ مین کیا ہے:

"در حدود ترائین لشکرگاہ کردہ سلطان تعبیہ لشکر بساخت و قلب و بنہ و رایات و علامات و چتر و پیلان در عقب بقدر چند کروہ بگذاشت صف راست کردہ آہستہ می آمد و سوار برہنہ و جریدہ را چہار فوج فرمودہ بود از طرف کفار نامزد کرد، و فرمان داد، می باید کہ از چہار طرف میمنہ و میسرہ و خلف و قدام لشکر بہر طرف دہ ہزار سوار تیرانداز دست بر لشکر کفار می دارند و چون پیلان و سوار و پیادہ ملاعین حملہ می کنند شما پشت می دہید و بتگ اسپ از پیش ایشان دور می شوید لشکر اسلامیان بہمیران منوال کفار را عاجز کردند حق تعالیٰ اسلام را نصرت بخشید"[2]

---

[1] ایلیٹ جلد دوم ص ۴۰۳ تاریخ یمینی کا فارسی نسخہ پیش نظر نہین ہے، اس لئے ایلیٹ کی انگریزی عبارت سے میمنہ میسرہ اور قلب کی اصطلاح قیاساً لی گئی ہے [2] طبقات ناصری ص ۱۲۰ نیز دیکھو مبارک شاہی ص ۱۰،

سلاطینِ دہلی کی فوجون کی صف بندی

غلامون، خلجیون اور تغلقون کے زمانہ مین لڑائی کے موقع پر فوجون کی صفون کے لئے حسب ذیل اصطلاحات استعمال ہوئین،

(۱) طلایہ[۱]، مقدمہ پیش[۲]، یزک[۳]، یہ تینون اصطلاحات فوج کے اس دستہ کے لئے استعمال ہوتی تھین جو لشکر سے بہت آگے دشمنون کی مختلف خبرین پہنچانے پر گویا مامور ہوتا تھا، یہ کبھی کبھی غنیم سے ہلکی جھڑپ بھی کر لیتا تھا،

(۲) مقدمہ یعنی اگلی صف اس کے کبھی کبھی دو بازو کر دیئے جاتے تھے، جو جناح[۴] کہلاتا تھا،

(۳) میسرہ، اس کے دونون جانب کے حصہ کو دست راست میسرہ، دست چپ میسرہ کہتے تھے،

(۴) میمنہ، اس کے دونون بازو دست راست میمنہ و دست چپ میمنہ کہلاتے تھے،

(۵) قلب، اس کے دائین بائین حصہ کو دست راست قلب اور دست چپ قلب کہتے تھے،

(۶) سقہ یا خلف،

ہر حصہ کی نگرانی [illegible] سپہ سالارون کے سپرد ہوتی تھی، اگلی صف کا نگران مقدم یا [illegible] مقدمہ کہلاتا تھا[۵]، میمنہ اور میسرہ کے نگران علی الترتیب سرفوج میمنہ یا سرفوج میسرہ کے لقب سے ملقب ہوتے تھے[۶]، قلب مین بادشاہ یا اس کا قائم مقام عہدیدار ہوتا تھا، بادشاہ کے اردگرد علما، ائمہ، اطبا

---

[۱] و [۲] طبقات ناصری ص ۲۷۷، ۱۲۲ [۳] ایضاً ص ۲۲۳ [۴] برنی ص ۲۲۹ فتوح السلاطین ص ۲۲، و ص ۵۴، وغیرہ [۵] جناح کی اصطلاح بالکل واضح نہین ہوتی میرا ذاتی خیال ہے کہ اگلی صف کے بازوؤن ہی کے لئے یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جناح کے لفظی معنی بازو کے ہین لیکن اس سے میمنہ یا میسرہ ہرگز مراد نہین، فتوح السلاطین مین ہے،

چو قلب و جناح و یسار و یمین ۔۔۔ ہمہ سو شدہ مرتب وران و فت کین

[۶] فتوح السلاطین ص ۲۵۰ و برنی ص ۹۵ [۷] برنی ص ۲۶۰،

منجنیق اور اُن کے بعد تیر انداز پرے جمائے کھڑے رہتے تھے[۵۱] شاہی علم، طبل، بوق، دمامے، نفیری، ارغون سرنا وغیرہ بادشاہ کے سامنے ہوتے[۵۲] بادشاہ جنگ مین شریک نہ ہوتا، تو ساری فوج سرلشکر[۵۳] کے ماتحت ہوتی، جو یا تو وزیر اعظم یا کوئی بہت ہی اعلیٰ رکن سلطنت ہوتا،

مقدم، سرفوج میسرہ اور سرفوج میمنہ کوئی معزز خان ہوتا تھا، اس کے ماتحت ملک، ملک کے ماتحت امیر، امیر کے ماتحت سپہ سالار، اور سپہ سالار کے ماتحت سرخیل ہوتے تھے، ایک ملک زیادہ سے زیادہ دس ہزار سوار، ایک امیر، ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار، ایک سو سوار، اور ایک سرخیل یا ایک عارف دس سوارون کی نگرانی کرتا تھا[۵۴] قلب مین خاصہ خیل یعنی بادشاہ کے خاص سوارون کی نگرانی سرجاندار کرتے تھے، اور وہ قلب کے دونون بازوؤن پر ہوتے تھے، اس لئے سرجاندار میمنہ اور سرجاندار میسرہ کہلاتے تھے[۵۵] لشکر مین شاہی غلان ہوتے تو وہ امیر غلمان میمنہ و میسرہ کے ماتحت ہوتے تھے[۵۶]

اس عہد کے پیادون کے نگران کیلئے اصطلاحات معلوم نہ ہو سکین، ہسم الحشم و نائب ہسم الحشم و شحنہ حشم فوج کے بعض عہدے تھے[۵۷] حشم سے مراد اگر پیادے ہون تو شاید یہ عہدے پیادہ فوج ہی سے متعلق ہونگے ہر حصہ مین گھوڑون کی نگہبانی کے لئے ایک اخور بک، ہاتھیون کے لئے ایک شحنہ پیل، اونٹون کے لئے ایک شحنہ نفر، ہتھیارون کے لئے ایک سر سلاحدار ہوتا تھا، ایک چاؤش بھی متعین رہتا تھا، جو اس کی نگرانی کرتا کہ ہر لشکری اپنی اپنی جگہ پر موجود ہے، ایک نقیب احکام سنانے کے لئے مامور ہوتا تھا[۵۸] ضوابط اور احکام کی خلاف ورزی یا صفون مین بے ترتیبی پیدا کرنے کے سلسلہ مین سخت سے سخت سزا مقرر تھی، علاؤالدین خلجی کی فوج کیلی مین مغلون کے مقابلہ مین صف آرا ہوئی، تو اُس نے اپنی فوج

---

[۵۱] صبح الاعشی بحوالہ معارف نمبر ۹ جلد ۲۶، [۵۲] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۳۷ء [۵۳] برنی ص ۳۶۵، ۳۲۱، ۳۵۱، ۷، ۷، ۷، علاؤالدین کے عہد مین سرلشکر ملک نائب کافور تھا، [۵۴] برنی ص ۱۴۵، [۵۵] مبارک شاہی ص ۶۲ [۵۶] برنی ص ۳۳ [۵۷] مبارک شاہی ص ۱۱۳ و برنی ص ۳۳ [۵۸] برنی ص ۱۰۰،

کو یہ حکم سُنایا،

کس از سر فرازان نجنبد ز جائے مگر ہم بہ فرمان فرمان روا اے
دگر خود کسے بگذرد زین سخن سر خود نہ بیند بہ پہلوے تن[1]

صفوں کی ترتیب میں پیادوں، سواروں اور ہاتھیوں کے تقدم و تاخر میں کسی یکسان ضابطہ کی پابندی نہیں ہوتی تھی، مصالح اور مواقع کی بنا پر کبھی پیادے کبھی سوار اور کبھی ہاتھی آگے رکھے جاتے، پیادے اگر آگے ہوتے تو پہلی قطار میں برگستوان، جوشن اور سپر والے تیر انداز رکھے جاتے، دوسری قطار میں زرہ پوش، نیزہ باز اور تیغ انداز سپر کے ساتھ ہوتے، تیسری قطار میں تیر اور گرز بردارون کی جماعت ہوتی، چوتھی قطار، سیف شمشیر اور گرز والوں پر مشتمل ہوتی، تمام قطاروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی جاتی کہ عقب کے سوار اور دوسرے لشکری سامنے لڑائی کے نشیب و فراز کو دیکھ سکتے تھے، یا ضرورت کے وقت ان جگہوں سے ہوکر آگے مدد کے لئے بڑھ سکتے تھے، یا آگے بڑھ کر اپنی مقررہ جگہ پر واپس آسکتے تھے[2]

سوار اگر آگے ہوتے، تو زرہ، خود، جوشن، دستوانہ، اور برگستوان میں ملبوس، تیر کمان، تیغ، نیزہ اور تبر سے لڑتے،

ہاتھی کبھی آگے ہوتے، تو اُن کے پیچھے سوار ہوتے، غیاث الدین تغلق اور خسرو خان کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو اول الذکر کی فوج کی صف آرائی کا حال لکھتے ہیں،

صف پیلان چو صف ابر آزار ہرا برسے، برق حملہ، باد رفتار
نہ موذہ ہر پیل چون کوہ باشکوہ بہ دو برگستوان چون ابر بر کوہ
بہ پشت پیل ترکان تیر در شست چو کوہے کو بہ پشت کوہ بنشست
پس پیلان سواران صف کشیدہ بجوش از پشت ماہی تف کشیدہ[3]

---

[1] فتوح السلاطین ص ۲۵۰ [2] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء [3] تغلق نامہ ص ۹۳-۹۲،

کبھی ہاتھی ہر صف کے آگے ہوتے، علاؤ الدین خلجی مغلوں کے خلاف کیلی میں جنگ کر رہا تھا، تو
فتوح السلاطین کے مؤلف کا بیان ہے کہ

بہر فوج دو بستگاں پیل مست — یقین کردہ آن خسرو چیرہ دست
ازان زندہ پیلان شرزہ شکار — کہ کس بزکو بد دریں کارزار
بفرمود پس شاہ والا تبار — شدہ پیش ہر صف یکے کوہسار
کس از سرفرازان نجنبد زجائے — مگر ہم بہ فرمان فرماں روائے[51]

مگر ہاتھی عموماً بادشاہ کیسے قلب میں ہوتا، صبح الاعشیٰ کا مصنف محمد تغلق کی لشکری ترتیب کے سلسلہ
میں رقمطراز ہے،

"سلطان خود قلب میں ہوتا ...... اس کے سامنے ہاتھیوں کا جھنڈ ہوتا ہے
ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے ہیں، جن پر تیرانداز سوار
رہتے ہیں، اور پھر ان ہی برجوں کی ہر سمت میں سوراخ بنے ہوتے ہیں جن سے تاک تاک کر
نشانے لگائے جاتے ہیں، اور ان ہی ہودجوں میں روغن نفط ہوتا ہے، جو شیشہ کی نلکیوں
سے دشمنوں پر اچھالا جاتا ہے جس سے شعلے پیدا ہوتے ہیں[52]"

محمود تغلق امیر تیمور کے خلاف معرکہ آرا ہوا تو اس کی فوج کے قلب ہی میں ہاتھی تھے[53] ابراہیم لودی
پانی پت کی جنگ میں صف آرا ہوا تو قلب ہی میں اس نے ہاتھی رکھے تھے،

قلب کے پیچھے آخری صف یعنی ساقہ یا خلف ہوتی، اس کی بھی کئی قطاریں ہوتی تھیں، پہلی قطار میں

---

۵۱ فتوح السلاطین ص ۲۵۰ نیز دیکھو برنی ص ۲۵۱ سیری کی جنگ میں بھی علاء الدین کی فوج کے ہر حصہ میں ہاتھی بھی رکھے گئے، برنی کا بیان ہے
"در ہر فوجی وانگی نجگان پیل برگستوانہا کردہ ایستادانیدند"

۵۲ صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف جلد ۲۶ نمبر ۹ ۔ ۵۳ ظفر نامہ جلد دوم ص ۱۰۲،

شاہی حرم کی بیگمات ہوتین، اُن ہی کے ساتھ شاہی خزانے، اسلحہ خانے، آبدارچی خانے وغیرہ ہوتے، دوسری قطار مین فاضل گھوڑے، اونٹ اور مویشی، قیدی اور زخمی سپاہی رکھے جاتے، پھر تیسری قطار مین فوج کا ایک دستہ ہوتا تھا، جو عقب سے دشمنون کے حملہ کی مدافعت کے لئے تیار رہتا تھا[۱] خلف قلب سے چند گروہ پر واقع ہوتا[۲]،

ان مختلف صفون کے علاوہ کمین گاہون[۳] مین بھی فوجین پوشیدہ رکھی جاتی تھین، یہ دشمنون پر اچانک حملہ کرتی تھین، اگر کوئی صف کمزور دکھائی دیتی تھی، تو اسکی مدد کو بھی پہنچتی تھین،

تیمور کی فوجون کی صف آرائی | امیر تیمور نے اپنے لشکر کی صف آرائی کے لئے خاص خاص قوانین وضوابط مرتب کئے تھے، اگر اس کی فوج بارہ ہزار سوار پر مشتمل ہوتی، تو اس کی صف آرائی حسب ذیل طریقہ پر ہوتی،

(۱) قراول

(۲) ہراول

(۳) جرانغار، اس کے تین حصے ہوتے، ہراول جرانغار، چپاول جرانغار، سقاول جرانغار،

(۴) برانغار، اس کے بھی تین حصہ ہوتے، ہراول برانغار، چپاول برانغار، سقاول برانغار،

(۵) قول

اور اگر فوج کی تعداد بارہ ہزار سے چالیس ہزار یا اس سے زیادہ ہوتی، تو اس کی صف آرائی کا نقشہ یہ ہوتا،

(۱) قراول، قراولِ دست راست، قراولِ دست چپ،

---

[۱] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۳ء [۲] طبقات ناصری ص ۱۲۲ [۳] فتوح السلاطین ص ۲۵ علاؤ الدین خلجی کیلی مین مغلون کے خلاف صف آرا ہوا تو اس کی ہر صف کے پیچھے کمین گاہ تھی،

بہ پشتی ہر صف گرانے دلیر : کمین کردہ چون درہ صید شیر

(۲) ہراول بزرگ، ہراولِ ہراول

(۳) جرانغار، ہراولِ جرانغار، شقاول، ہراولِ شقاول،

(۴) برانغار، ہراولِ برانغار، چپاول، ہراولِ چپاول،

(۵) قول، دستِ راست قول، دستِ چپ قول،

(۶) عقب

قراول یعنی فوج کے آگے آگے رہنے والا دستہ، ہراول کے راست و چپ غنیم کے لشکر کی نگرانی کے لئے ہوتا، ہراول بزرگ کے آگے بھی ایک ہراول ہوتا جس مین فوج کا صرف ایک دستہ ہوتا، ہراول ہراول کے پیچھے ہراول بزرگ کی فوج چھ دستون مین منقسم ہوتی، اسی طرح جرانغار مین چھ دستے ہوتے، ہراول جرانغار مین صرف ایک دستہ، شقاول مین چھ اور ہراولِ شقاول مین صرف ایک دستہ ہوتا، برانغار، ہراولِ برانغار، چپاول اور ہراول چپاول کی یہی ترتیب ہوتی، قول کی پہلی صف چھ دستون مین تقسیم ہوتی، اس کے عقب مین اٹھائیس دستے کھڑے رہتے، قول کے دست راست پر امیر تیمور کے "فرزندان و نبیرگان" اور دست چپ پر "خویشاوندان اور قرابتان" کی جماعت ہوتی، ان کی فوج طرح یعنی فوج محفوظ کہلاتی، جو بوقت ضرورت مختلف حصّون مین مدد کے لئے پہونچتی، [۱]

بابر کی فوجون کی ترتیب | صف آرائی کی یہ اصطلاحین بدلتی رہین، پانی پت کی جنگ مین خود بابر کے بیان کے مطابق حسب ذیل صفین تھین،

(۱) قراول

(۲) ہراول، اس کے ساتھ فوج محفوظ کی صف طرحِ ہراول کہلاتی تھی،

(۳) برانغار، برانغار کے اوج یعنی اس کی داہنی طرف بالکل کنارے پر فوج کا ایک ایسا

---

[۱] تزوک تیموری صفحہ ۲۱۰، ۱۹۰،

دستہ تھا، جو پلٹ کر غنیم کے عقب پر تیز دوڑ سے حملہ کرتا تھا، اس کو تولقمہ اوج جرانغار کہا جاتا تھا،

جرانغار کے ساتھ ایک فوج محفوظ بھی تھی، جو طرح جرانغار کہلاتی تھی،

(۴) جرانغار جرانغار کے ساتھ بھی تولقمہ، اوج برانغار اور طرح برانغار تھی،

(۵) قول یا غول یعنی مرکز، اس کے دو حصے تھے، دستِ راست قول، دستِ چپ قول،

(۶) طرح قول یعنی فوج محفوظ قول کے پیچھے صف آرا تھی،

سیکری کی جنگ میں بابر کی فوج کے جرانغار اور برانغار میں دایئں اور بائیں بازو بھی تھے جن کے لئے یمین جرانغار، یسار جرانغار، یمین برانغار اور یسار جرانغار کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں،[۵۱]

بابر کے جانشینوں کی فوجوں کی صف آرائی

تیموریوں کی سلطنت ہندوستان میں باضابطہ قائم ہوئی، تو مختلف لڑائیوں کے موقع پر صفوں اور ان کی اصطلاحات میں تھوڑی تھوڑی ترمیم ہوتی رہی،

(۱) قراول جو کبھی مقدمۃ الجیش[۵۲]، کبھی منقلا[۵۳] اور کبھی طلیعہ[۵۴] یا طلایہ کہلاتا تھا،

(۲) ہراول، اس کے کبھی کبھی دو بازو، راست ہراول اور چپ ہراول ہوجاتے، بدایونی نے جوزۂ ہراول[۵۵] کی ایک اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کی تشریح خود اس طرح کی ہے،

"وچند نفر چیدہ و برگزیدہ ہمراہی سید ہاشم بارہہ پیشتر از ہراول نامزد شدند کہ آنرا جوزۂ ہراول می نامیدند"

مگر یہ اصطلاح کسی اور مورخ نے استعمال نہیں کی ہے، ہراول کی فوج محفوظ کو التمش[۵۶] کہتے تھے

---

۵۱ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۱۳، ۳۱۴، و بابر نامہ انگریزی جلد دوم ص ۶۶۷، ۶۶۸ ۵۲ بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۶۸ اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۳، ۲۶۳، بدایونی جلد دوم ص ۱۵ تزک جہانگیری ص ۳۹۴، ۳۳۶، بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری ۲۱۳-۲۱۴ وغیرہ وغیرہ ۵۳ اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۶، جلد سوم ص ۵۰۶، عمل صالح جلد اول ص ۴۰۰، منتخب اللباب ص ۵۸۹ ۵۵ بدایونی جلد دوم ص ۲۳۱ ۵۶ اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۴۴، ۳۳۲، ۴۲۵،

(۳) جرانغار اسکو کبھی دست چپ کبھی میسرہ کبھی صرف یسار کہا جاتا تھا، اس کے دائین بائین بازو بھی ہوتے تھے، جو دست راست جرانغار اور دست چپ جرانغار کہلاتے تھے، جرانغار کے ساتھ تولقمہ یا تلقمہ[۱] اور طرح[۲] بھی ہوتا تھا،

(۴) برانغار جس کے لئے کبھی دست راست کبھی میمنہ اور کبھی صرف یمین کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی، اس کے بھی دست راست برانغار اور دست چپ برانغار ہوتے تھے، اس کے ساتھ بھی تولقمہ یا تلقمہ اور طرح ہوتا تھا،

(۵) قول یا غول یا قلب، اس کا بایان بازو دست چپ قول اور دایان بازو دست راست قول (یا میسرہ قول یا میمنہ قول[۳]) کہلاتا تھا، ان دونون بازوؤن کے پیچھے کچھ فوجین محفوظ رکھی جاتی تھین، جو طرح دست راست اور طرح دست چپ کہلاتی تھین[۴]،

(۶) چنداول جس کو کبھی چنداول یا ساقہ بھی کہتے تھے، یہ فوج کی پچھلی صف ہوتی تھی، جو فوجی سامان شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی محافظت کے لئے متعین ہوتی تھی،

صفون کو ترتیب دینے کا ذمہ دار بخشی الممالک ہوتا تھا، جنگ سے ایک روز پہلے وہ بادشاہ یا شہزادہ یا جنگ کے حاکم اعلیٰ کے سامنے فوجون کی تعداد اور مختلف فوجی سردارون کی متعینہ جگہون کا نقشہ پیش کرتا تھا[۵] اسی نقشہ کے بموجب وہ میدان جنگ مین مختلف عمدہ دارون کو مختلف صفون مین متعین کرتا تھا، لڑائی مین کوئی سردار جنگی خطا کرتا تو اس کی جگہ پر دوسرے کو متعین کرتا بخشی الممالک کے ماتحت نائب بخشی بھی ان کامون مین ان کی مدد کرتے تھے، کبھی صف آرائی کی خدمت امیر دیگر

---

[۱] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۴۲، ۱۵۱۰، لب التواریخ از خافی خان حصہ دوم ص ۶۰۸ [۲] عمل صالح جلد دوم ص ۷۷، ۲ [۳] عالمگیر نامہ ص ۶۵، و ص ۶۹ [۴] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول حصہ دوم ۱۲۰۷ ۲۹۳ ۱۲۱۴ اکبر نامہ جلد سوم ص ۹۴۹ و ص ۳۴۴ [۵] تزک تیموری ص ۱۹۲-۱۹۱ و بابر نامہ اردو ترجمہ پانی پت مین جنگ کے موقع پر نظام الدین علی خلیفہ میر بخشی کی صف آرائی، بابر نامہ انگریزی جلد دوم ص ۴۷۲، ۵۶۴، ۵

کے بھی ذمہ کی جاتی تھی[1]، کبھی بادشاہ دارالسلطنت سے فوجوں کی صفوں کو ترتیب دیکر ان کو روانہ کرتا، فوجیں اسی ترتیب کے ساتھ میدانِ جنگ میں کھڑی ہوتیں[2]، اہم لڑائیوں میں بادشاہ یا سپہ سالار فوجوں کی صف آرائی بنفس نفیس خود کرتے[3]، جانشینی کی جنگ کے موقع پر شہزادے خود ہی صفوں کو ترتیب دیتے[4]، ہر صف کا نگراں ایک سردار یا سالار ہوتا تھا[5]، پھر ہر صف کے لشکر کی مختلف حصوں میں منقسم کئے جاتے تھے، یہ حصے قشون[6] (قوشون) یا تومان[7] (تومن) یا کبھی چوکی اور کبھی توپ کہلاتے تھے[8]، ہر قشون کا محافظ ایک علحدہ عہدیدار ہوتا تھا، بابر کی فوج میں ان عہدوں کی نگرانی کسی سلطان، یا بیگ یا امیر کے ذمہ ہوتی تھی[9]، اکبری دور میں جب منصبداری نظام قائم ہوا، تو پھر فوجوں کے قشون اور تومان کی نگرانی کوئی معزز منصبدار کرتا تھا، دہ ہزاری منصبدار کی رہنمائی میں نو ہزاری سے یکہزاری

---

[1] عالمگیر نامہ جلد اول ص ۲۴۵ [2] عمل صالح جلد اول ص ۴۰، جلد دوم ص ۲۹۴ بادشاہ نامہ جلد اول ص ۵۰۴ جلد دوم ص ۲۰۴ [3] مثال کے لئے دیکھو دارا و اورنگ زیب کی جنگ عالمگیر نامہ ص ۹۵ و ۹۰، منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۶، ۲۰، و منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۰۰ [4] اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ میدانِ جنگ میں شہزادوں اور سپہ سالاروں کے ساتھ غیر ضروری لوگ نہ ہوں، کیونکہ با ہجوم توابع و پیش آمدن آنہا از فوج انتظام و نسق فوج را مجال نمی گذارد، (رقعات عالمگیر ص ۲۷۳) (معارف پریس) [5] تزوک تیموری ص ۲۰۳، جنگ کے موقع پر مختلف سرداروں اور سالاروں کے نام کے لئے دیکھو اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۲۴، عمل صالح جلد اول ص ۳۶۹ جلد دوم ص ۴۹ و ص ۲۹۴، بادشاہ نامہ جلد اول ص ۴۰۵، جلد دوم ص ۴۰۲، منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۰۰ وغیرہ وغیرہ [6] تزوک تیموری ص ۲۰۳، الیٹ جلد سوم ص ۴۳۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۲، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۳۴ و ص ۴۷، ۹، سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۰۳ [7] تزوک تیموری ص ۲۰۳، الیٹ جلد سوم ص ۴۳۰، اکبر نامہ جلد دوم ص ۹۲ [8] اکبر نامہ جلد سوم میں ہے تخشیان را فرمان شد کہ فرد ہر سپاہ را چوکی بہ چوکی بشائستگی بگذرانند، اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۲۵، خانخاناں لشکر منصور را چہار توپ گردانید [9] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۵، ۶۲ و ۱۳۰، ۲۱۲، تیمور کی فوج کی سرداری ایک امیر کرتا تھا، اس کی دو قسمیں تھیں، امیر با تمغا، اور امیر بے تمغا (تزوک تیموری ص ۲۲)

منصبدار تک ہوتے تھے، اسی طرح ہشت ہزاری کے ماتحت ہشت صدی تک، ہفت ہزاری کے ماتحت ہفت صدی تک، پنج ہزاری کے ماتحت پنج صدی تک اور پنج صدی کے ماتحت یک صدی تک مقرر کئے جاتے تھے[۱]، جنگ مین بادشاہ یا شہزادہ شرکت کرتا، تو سارے منصبدار اس کے ماتحت ہوتے، بادشاہ یا شہزادہ نہ ہوتا، تو سارے سردار یا سالار سپہ سالار[۲] کی نگرانی مین ہوتے تھے، مختلف لشکرون کا سردار عموماً ان ہی کی قوم کا کوئی منصبدار ہوتا تھا، مثلاً راجپوتون کی چوکی ایک راجپوت منصبدار، افغانون کا تومان ایک افغانی منصبدار، مغلون کا قشون ایک مغل منصبدار کے ماتحت ہوتا، توپچی، برق انداز، تفنگچی، اور دیگ انداز وغیرہ ایک ایسے منصبدار کی نگرانی مین رہتے جو میر آتش کہلاتا تھا،

صف آرائی مین پیدل، برق انداز، سوار، ہاتھی، اور پیادے کے تقدم و تاخر مین کسی یکسان ضابطہ کا تحریر کرنا مشکل ہے، مگر بڑی بڑی لڑائیون کے موقع پر عام طور پر ہراول کی پہلی قطار مین توپچی، برق انداز، گولہ انداز اور دیگ انداز ہوتے تھے، توپین کبھی بڑے بڑے چھکڑون (ارابہ) پر رکھی جاتین، ان مین سے دو دو چھکڑے زنجیر اور چمڑے سے متصل کر دیئے جاتے، اور دونون کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی جاتی کہ سکے چھ سات مٹی سے بھرے ہوئے توڑے رکھے جا سکتے تھے، تفنگچی ان چھکڑون اور توڑون کے عقب مین پناہ لے کر تفنگ اندازی کرتے تھے[۳]، کبھی توپون کو آہنی زنجیرون سے سطح

---

[۱] آئین اکبری ص ۱۲۰، آئین درسپاہ آبادی [۲] تیمور کی فوج کا اعلیٰ ترین عہدیدار امیرالامرا کہلاتا تھا (تزک تیموری ص ۱۹۰۰۹) [۳] تیمور کی فوج کے ہراول مین اوقچیان، شمشیرداران و نیزہ داران و بہادران آزمودہ کار ہوتے، (تزک ص ۱۹۹) [۵] دیکھو بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۲۹۴، طبقات اکبری جلد دوم ص ۱۳، منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۴۴، لفظ توبرہ اس کے معنی مین اختلاف ہے، اکبرنامہ جلد اول ص ۹۵ مین توبرہ کے بجائے تورہ ہے، بابرنامہ کے اردو ترجمہ مین اس کے معنی "جالی" لکھے گئے ہین، سلسلہ مین طبقات اکبری کی عبارت یہ ہے:

"درمیان ہر دو ارابہ شش ہفت توبرہ تعبیہ نمایند تا تفنگ اندازان بر در معرکہ

منسلک کر دیا جاتا تھا کہ دشمن یلغار اور یورش کر کے گھسنے نہ پاتے تھے[۵۰]، کبھی غنیم کی یورش کو روکنے کے لئے توپچیوں کی صف کے آگے عمیق خندقیں بھی کھودی جاتی تھیں[۵۱]، ارابہ کے بعد اونٹوں اور اونٹوں کے بعد ہاتھیوں کی قطار رہتی[۵۲]، اونٹوں پر سے شتر نال اور زنبورک اور ہاتھیوں پر ہتھنال اور گجنال چھوڑی جاتی، ہاتھیوں کے بعد برق انداز سوار ہوتے[۵۳]،

دیگ انداز، توپچی، برق انداز، تفنگچی، رعد انداز، اور برق انداز کی کثرت زیادہ تر ہراول، اور اس کے دونوں بازوؤں پر ہوتی، مگر جرانغار، برانغار، اور قول کی اگلی قطاریں بھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھیں[۵۴]، اسی طرح کبھی کبھی ہر صف میں ہاتھی بھی ہوتے تھے[۵۵]، ہتھنال اور گجنال کی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۶) در پناہ ارابہ و تو بر ۂ بفراغت تفنگ توانند انداخت"

منتخب التواریخ میں یہ عبارت اور بھی واضح طریقہ پر لکھی گئی ہے :-

"درمیان ہر دو عرابہ شش ہفت تو برۂ پر خاک تعبیہ نمودہ تا در معرکہ تفنگ اندازان در پناہ عرابہ و تو برۂ پر خاک بفراغت توانند انداخت"

تو برہ کی وضاحت منتخب التواریخ کی توضیح سے ہو جاتی ہے، اس لئے ہم بدایونی ہی کو قابلِ قبول سمجھ کر "تو برۂ پر خاک" کو استعمال کرتے ہیں ۔ [۵۰] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۳، انگریزی ترجمہ ص ۵۶۴، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۰، نیز دیکھو اورنگ زیب اور دارا کی جنگ سموگڈھ کی تفصیل خافی خان جلد دوم ص ۲۱۔ ۲۰، کرنال کی جنگ میں توپوں کی زنجیر بندی کیلئے دیکھو سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۲ [۵۱] ملاحظہ ہو، سلطان بہادر شاہ اور ہمایوں کی جنگ طبقات اکبری جلد دوم ص ۳۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۳۶ [۵۲] دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی [۵۳] عمل صالح جلد دوم ص ۳۰۵، [۵۴] دیکھو بابر اور رانا سانگا کی جنگ کی تفصیل بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۱۔۳۱۷، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۹، عمل صالح جلد دوم ص ۳۶۵، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۸۴۔۴۸۵ نیز دیکھو منتخب اللباب حصہ دوم میں جاجو کی جنگ کی تفصیل ص ۵۰۰۔۵۰۰۹ [۵۵] سلطان مظفر گجراتی سے اکبر کی فوجیں معرکہ آرا ہوئیں، تو ابو الفضل کا بیان ہے، فیلان کوہ پیکر یادر قتادہ در ہر فوج شکوہ دیگر بخشید ند (اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۴ نیز دیکھو اوڑیسہ کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۳ ص ۱۳، ۱۲، کابل کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۶۵)

کمی ہوتی، تو ہاتھیوں پر تیر انداز بٹھائے جاتے، تیر انداز بہادروں کے ہمراہ ایک ہاتھی ایک ہزار سوار کا کام کرتا تھا[۵۱]، ہر صف میں ہاتھی کے پیچھے سوار ہوتے تھے، راجپوت سوار عموماً برچھے[۵۲] سے لڑتے تھے، مغل سواروں کا ہتھیار تیر و کمان تھا، ہر سوار کی کمر میں شمشیر یا تیغ یا تلوار آویزاں ہوتی، کمر کی دوسری طرف کبھی کٹار یا خنجر ہوتا، بائیں کاندھے پر سپر یعنی ڈھال ہوتی، جو لڑتے وقت بائیں ہاتھ میں پکڑی جاتی، سواروں کے عقب میں پیادے ہوتے، تیموریوں کے زمانہ میں بڑی لڑائیوں میں پیادوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی،

قول میں بادشاہ یا شہزادہ یا سپہ سالار عموماً ہاتھی پر حوضۂ زرین اور چتر مدور[۵۳] کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا تھا، وہ ایسی جگہ ہوتا کہ لشکر کے ہر حصہ سے دکھائی دیتا تھا، شاہی جنگی علم کبھی اس کے ہاتھی یا کبھی اس کے بالکل قریب دوسرے ہاتھی پر لہراتا رہتا تھا[۵۴]، آس پاس دوسرے ہاتھیوں پر فوجی باجوں کی مختلف قسمیں بھی ہوتیں[۵۵]، بادشاہ یا شہزادہ کی عماری میں اس کی کوئی چہیتی اولاد بھی ہوتی[۵۶]، اس کے ہاتھی کے دونوں جانب اعیان سلطنت اور اولیاء دولت گھوڑوں پر سوار رہتے تھے، کبھی کبھی علماء و فضلاء کی بھی جماعت ساتھ ہوتی تھی[۵۷]، بادشاہ یا سپہ سالار قول سے کوئی حکم صادر کرتا تو اس کو

---

[۵۱] آئین اکبری باب آئین فیل خانہ [۵۲] مثال کے لئے دیکھو راجہ بھگونت داس کے اسلحہ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۱۵ [۵۳] عمل صالح جلد دوم ص ۵ [۵۴] تیمور جب جنگ میں شریک ہوتا، تو قلب میں علم کے نیچے ہی جلوہ افروز رہتا، ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۳۹ [۵۵] مثال کے طور پر دیکھو، سموگڈھ میں دارا کی فوج کی ترتیب [۵۶] نورجہان مہابت خان سے جنگ کر رہی تھی تو اس کی عماری میں شہریار کی لڑکی، اسکی انّا اور صبیہ شاہنواز خان ساتھ تھی، (اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۹۳ - ۲۹۴) اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جنگ جانشینی ہوئی، تو شہزادہ اعظم کے لڑکے بیدار بخت کے ہاتھی پر اس کا کمسن بچہ بیدار دل تھا، خود شہزادہ اعظم کے ساتھ اس کا لڑکا شہزادہ علی تبر تھا، اسی جنگ میں اعظم شاہ کے لڑکے شہزادہ والاجاہ کی بیوی ہاتھی کے ہودج ہی میں ایک تفنگ کی زد میں آکر جان بحق ہوئی، (منتخب اللباب ص ۵۹۳) [۵۷] ظفر نامہ ج ۲ ص ۱۰۱

مختلف صفوں میں تواچی، یساول، یا منزاول پہنچاتے، یہی یساول اور منزاول اس کی نگرانی بھی کرتے کہ ہر لشکری اپنی جگہ پر ہو، احکام کی پابندی سختی سے عمل میں آتی، عدول حکمی کی سزا موت تھی[۱]،

چنداول قلب کے پیچھے ہوتا، اس کی فوجیں عقب سے غنیم کی یورش روکنے کے لئے مستعد رہتیں، شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی نگہبانی بھی کرتیں کچھ فوجیں کمین گاہوں میں بھی پوشیدہ ہوتیں،

صفوں کو ترتیب دیتے وقت مختلف صفوں کے درمیان اور پھر ہر صف میں جا بجا اتنا خلا اور گذرگاہ چھوڑی جاتی تھی کہ عقب کے لشکر کے سامنے کی چیزیں دیکھی جا سکیں، اور ضرورت کے وقت مختلف گذرگاہوں سے سواروں کے گھوڑے آسانی سے گذر سکیں[۲]، ایک صف سے دوسری صف کا فاصلہ کبھی نصف کوس اور کبھی تیر پرتاب کا ہوتا[۳]،

ہر صف کے گھوڑوں کی نگہبانی کے لئے ایک اخور بیگ، ہاتھی کے لئے ایک شحنہ پیل، آتشیں اسلحہ کے لئے ایک میر آتش، اور عام اسلحہ کے لئے داروغہ توزخانہ یا توربیگی ہوتا، توربیگی کے ہاتھ میں شاہی علم بھی ہوتا،

(باقی)

---

[۱] ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۳۴، بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵، اکبرنامہ جلد اول ص ۱۰، جلد سوم ص ۲۳ [۲] بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵، عالمگیرنامہ جلد اول ص ۲۴۵ [۳] منتخب اللباب ص ۵۹، اکبرنامہ جلد سوم ص ۸۳، و ص ۱۲۲، تزک جہانگیری ص ۲۵۳ [۵] تزک تیموری میں ہے:-

"وامر نمودم کہ با میر ہر فوج کہ فرمان یریغ فرستم مطابق حکم یریغ نمایند، و ازان تخلف نہ ورزند، و ہر کس از بیکلر بیکیان و امراء از حکم تخلف و تجاوز نماید وی را بہ شمشیر بگذرانند و کوتل وی را کہ منتظر الامارت باشد بجائے وے نصب کنند" (ص ۲۰۲)

بابرنامہ میں ہے:-

"چون ارکان لشکر قائم گشتہ ہر کس بجائے خود شتافت، فرمان واجب الاذعان لازم الامتثان شرف اصدار یافت کہ ہیچکس بے حکم از محال خود حرکت ننماید و بے رخصت دست بکار بہ نکشاید" (بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵) [۵] بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۲۹۴ [۵] ایضاً

ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر

از

جناب ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی استاذ مدرسۂ عالیہ کلکتہ

اہلِ عجم کی ترقی و عروج کیساتھ ساتھ فارسی زبان بھی پروان چڑھی، اور یہی اُن کے درباروں کی زبان بنی لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کو زبان عربی کے ساتھ اعتنا نہ تھا، کیونکہ ہمیں ان ہی زبانوں میں زمخشری، رشید الدین وطواط، حسن صغانی، عبد القاہر جرجانی، بدیع الزمان ہمدانی، خطیب تبریزی، ابوبکر خوارزمی جیسے سیکڑوں ائمۂ لغت و اعیان شعر و ادب کے نام ملیں گے، جو آسمان عجم ہی کے مہر و ماہ تھے، اہلِ عجم نے عربی کی خدمت اپنی مادری زبان سے کم نہیں کی، وہ اُن کی مذہبی زبان تھی، اس لئے اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور آج تک اسی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے،

عربی شاعری جب صحرا سے نکل کر اہلِ بادیہ کی عنجہیت اور مخضرمین کی عبقریت کھو بیٹھی، اور ادبا مولدین، عربوں کی فطری سادگی، اور اُن کی خالص عربی تعبیر و اسلوب کو زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھ سکے، تو رفتہ رفتہ اس صحرائی ادب کی معصوم سادگی عجم کے صنائع و بدائع کی زنگارنگی میں گم ہوگئی،

اہلِ عجم نے اپنے خیالات کو عربی قالب میں ڈھالا، قوانین و ضوابط قیاسیہ کو برتنے میں وہ بہت کامیاب رہے، لیکن اس تعبیر و اسلوب کو نہ پاسکے، جو خالص عربی اسلوب کہا جاتا ہے، قواعد علمیہ کے ذریعہ کسی زبان کے تمام اسالیب و طرق کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا جاننے والا اپنے مافی الضمیر کو اس زبان کے مخصوص طریقے میں بالکل اسی طرح تعبیر کرسکے جس طرح ایک اہلِ زبان ادا کرتا ہے،

اس کے لئے اس زبان کے اسالیب کی دائمی مزاولت و تتبع شرط ہے،

عجمی ادباء کے کلام میں سب سے بڑی خامی اسی "اسلوب" کی ہے، ان کا کلام رفعت خیال، جدت طرازی، امیال و عواطف اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کتنا ہی بلند ہو، لیکن اس میں عربوں کے مخصوص انداز بیان کا فقدان نظر آتا ہے، اس لئے وہ نقادانِ سخن کی نگاہوں میں نہیں جچتا، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے،

وبهذا الاعتبار كان الكثير	اسی اعتبار سے فن ادب کے اکثر شیوخ جن
ممن لقينا من شيوخنا في هذه	سے میری ملاقات ہوئی، یہ رائے رکھتے تھے
الصناعة الادبية يرون ان نظم	کہ متنبی و معری کی نظمیں کسی حیثیت سے بھی
المتنبي والمعري ليس هو من الشعر	شعر نہیں، اس لئے کہ یہ دونوں اسالیب
في شيء لانهما لم يجريا على اساليب العرب	عرب پر نہیں چلے؛

(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۰۵)

ہندوستان کی تاریخ سے اگر سندھ کی عربی حکومت کو الگ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں عربی ان مسلم فاتحین ہی کے ذریعہ آئی جن کے درباروں میں حسن بن اسحاق فردوسی، ملک الشعراء احمد عنصری، ابوالحسن رودکی، فرخی، علی خرنی وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا، انہی درباروں میں قفال مروزی، ابونصر عراق، ابوریحان البیرونی، ابوالحسن الخمار جیسے حکما بھی ملیں گے، جنھوں نے اپنی قیمتی تحقیقات و معلومات سے عربی زبان کو مالا مال کیا،

ہندوستان کی شاہی زبان غزنوی و غوری دور سے لیکر تیموریوں کے خاتمہ تک فارسی رہی لیکن ہر دور میں یہاں علماء کی ایسی جماعتیں بھی رہیں، جو عربی ادب و لغت کو بھی فروغ دیتی رہیں آج جن کی صرف مختصر سی فہرست ہمارے سامنے ہے، لیکن معلوم نہیں ماضی کے دھندلکے میں ایسے کتنے درخشندہ تارے ہم سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے، اس مختصر فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو حدیث نبوی

کے خدام بھی ملین گے، فقہ و فرائض کے عالم بھی، لغت کے امام بھی ملین گے، شعر و ادب کے مفتون بھی، صغانی[1] کا تذکرہ پڑھئے تو ایک طرف لغت و انساب کا دریا امنڈتا نظر آئیگا تو دوسری طرف مشارق الانوار کی شعاعین دلون کو روشن کرتی دکھائی دین گی، یہی منظر سید[2] مرتضیٰ زبیدی کے یہان بھی مشاہدہ مین آئے گا، تاتارخان[3] اور اورنگزیب عالمگیر رحمہما اللہ کے دربارون مین علماء کبار نے تدوین و تصنیف کے عظیم الشان کارنامے انجام دئیے، غرض ایسی بہت سی شخصیتین ہین، جن مین سے صرف دو چار کے نام لئے گئے،

آیندہ سطرون مین دور گذشتہ کے چند ایسے ادبا پیش کئے جائین گے، جنھون نے اپنے تاثرات کو عربی نظم مین ظاہر کیا، اس لئے عربی شاعری مین ان کے ذوق کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ عربون

---

[1] رضی الدین ابو الفضائل حسن بن محمد بن حسن بن حیدر عمری صغانی ۵۷۷ھ مین بمقام لاہور پیدا ہوئے، آبا و اجداد صغان یا صغانیان (چغانیان) ماوراء النہر کے رہنے والے تھے، اسی انتساب سے صغانی یا صاغانی کہلائے، ۶۵۰ھ مین بغداد مین انتقال کیا، اور مکہ مین مدفون ہوئے، حدیث و لغت کے مشہور امام تھے، مشارق الانوار حدیث مین، شوارد، تکملۃ الصحاح، مجمع البحرین، العباب الزاخر واللباب الفاخر لغت مین آپ کی مشہور تصنیفات ہین، کتاب العباب مکمل نہ ہو سکی تھی، مادہ "بکم" تک پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا، (الجاسوس احمد شدیاق) بعد مین کسی نے اس کی تکمیل کی، علامہ زبیدی نے مادۂ "خصی" مین اخصی الرجل کے معنی بیان کرنے کے بعد نقل کیا ہے، "فنقلہ الصاغانی وہو مجاز" اس قول کی نسبت صغانی کی طرف صحیح نہین (مقالہ عبد اللہ البستانی مناظرۃ لغویہ ادبیہ ص ۹۰) [2] سید ابو الفیض محمد مرتضیٰ ابن محمد بن محمد بن عبد الرزاق الواسطی البلگرامی، زبید مین مدتون مقیم رہے، اس لئے زبیدی کہلائے، ۱۱۴۵ھ مین بلگرام مین پیدا ہوئے، ۱۲۰۵ھ مین مصر مین انتقال کیا، (تاریخ جبرتی) قاموس کی مشہور شرح تاج العروس آپ کی تصنیف ہے، جو ۱۱۸۱ھ مین اختتام کو پہنچی۔ [3] فیروز شاہ تغلق متوفی ۷۹۰ھ کے دربار کا مشہور امیر، جو خود بڑا فاضل اور علماء و فضلاء کا قدردان تھا، تفسیر تاتارخانی و فتاوی تاتارخانی اسی کی طرف منسوب ہین، مزید تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۲،

سے اتنے دور رہکر بھی انھون نے کس حد تک ادب عربی کی خدمت کی، عرصہ ہوا، ایک صاحب عبدالرشید بریلوی نے الشعر العربی فی الہند پر تلاش و تحقیق ... کا کام شروع کیا تھا، معلوم نہین انجام کو پہنچا یا نہین،

مسعود بن سعد بن سلمان | سعد بن سلمان ہمدان سے لاہور آیا، اور یہین توطن اختیار کر لیا، کئی اولادین ہوئین، ان مین سے مسعود نے بڑی شہرت و ناموری حاصل کی،

مسعود کے مولد و منشا مین تذکرہ نویسون کا اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ مسعود لاہور ہی مین پیدا ہوا، اور وہین تعلیم و تربیت حاصل کی، ولادت کے سال متعین نہین ہے، البتہ اتنا متیقن ہے کہ ۴۳۸ھ اور ۴۴۰ھ کے مابین اس کی پیدایش ہوئی ہے،

۴۶۹ھ مین سلطان ابراہیم بن مسعود بن سبکتگین کی طرف سے شاہزادہ ابو القاسم سیف الدولہ محمود حکومت ہندوستان پر متعین ہوا اس وقت مسعود سعد سلمان ابو القاسم سیف الدولہ کے ملازمین خاص مین شامل ہو گیا، قیاس ہے کہ ۴۶۴ھ کے حدود مین مسعود کی رسائی غزنوی دربار تک ہوئی،

حدود ۴۸۰ھ مین سلطان ابراہیم کو سیف الدولہ محمود کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوئی اس کا سبب یہ ہوا کہ سلطان کو یہ خبر ملی کہ سیف الدولہ محمود، ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ - ۴۸۵ھ) سے ربط پیدا کر رہا ہے اور عراق جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس خبر سے مشوش ہو کر سلطان نے سیف الدولہ محمود اور اس کے ندماء و حوارین کو گرفتار کر کے مختلف قلعون مین قید کر دیا، اسی سلسلہ مین مسعود بھی قید کیا گیا،

---

[۱] ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان ص ۲۰، چہار مقالہ بہ تصحیح و تحشیہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی ص ۲۰، ۴۵، ۴۶، ۱۴۰ - ۱۵۰ - ۱۵۲ - ۱۶۸، ۱۶۲، ۲۰۷، مطبوعہ بریل لیڈن [۲] چہار مقالہ ص ۱۶۱ [۳] ایضاً ص ۴۵، [۴] نظامی عروضی نے اس کو ۴۷۲ھ ہجری کا واقعہ بتایا ہے (چہار مقالہ، مقالہ دوم ص ۴۴) لیکن یہ صریحاً غلط ہے تفصیل کے لئے دیکھو (ص ۱۷۸، ۱۷۹)

دس[۱] سال تک قید کی شقیتن مختلف قلعون مین جھیلتا رہا۔ سات سال تو قلعۂ "سو" اور قلعہ دھک" مین گذارے، بقیہ تین سال قلعۂ "نائے"[۲] مین چنانچہ خود کہتا ہے،

ہفت سالم بکوفت "سو" و دھک پس ازآنم سہ سال قلعۂ "نائے"

پھر سلطنت کے ایک رکن ابوالقاسم کی سفارش سے سلطان ابراہیم نے عفو تقصیر کیا، اور مسعود کو رہائی نصیب ہوئی،

سلطان ابراہیم خود شاعر اور شاعرون کا قدردان تھا، علامہ آزاد بلگرامی کا بیان ہے:-

"وکان شاعرا یحب الشعراء	(مآثر الکرام ص ۲۱۹)	شاعر اور شعراء کا محب تھا، بڑے بڑے
یعطیھم صلات وجوائز فخیمۃ		انعامات وعطایا معمولی قطعہ و رباعی کے
علیٰ ادنیٰ شعر من القطعۃ والدوبیت		صلہ مین دیا کرتا تھا،

سلطان ابراہیم نے ۴۵۱ھ سے ۴۹۲ھ تک سلطنت کی، باتفاق مورخین اس کا انتقال ۴۹۲ھ مین ہوا، البتہ ابن الاثیر سے سہو ہو گیا ہے، اس کے بیان کے مطابق سنہ وفات ۴۸۱ھ ہے، جو تمام تذکرہ نگارون کے خلاف ہے،

سلطان ابراہیم کے بعد اس کا لڑکا علاؤ الدولہ مسعود سریر آرائے سلطنت ہوا، علاؤ الدولہ ۵۰۸ھ تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے دور مین ہندوستان کی حکومت اپنے ولی عہد عضد الدولہ شیرزاد کے

---

[۱] نظامی عروضی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) کل مدت حبس بارہ برس کی تھی (۲) اور سلطان ابراہیم نے اپنی حیات مین مسعود کو رہائی نہین دی (چہار مقالہ ص ۴۵) لیکن دونون باتین خلاف واقعہ ہین (دیکھو ص ۶۴ - ۲۶۷ التحشیہ محمد قزوینی [۲] مسعود دو مرتبہ قید کیا گیا، پہلی دفعہ تین قلعون مین دس سال تک قید رہا (۱) قلعہ نائے جس کے متعلق صرف حمد اللہ مستوفی نے نزہتہ القلوب مین اتنا لکھا ہے کہ "قلعہ نائے محبس مسعود سعد سلمان است" تمام تذکرہ نویسون کا بیان ہے کہ قید کی پوری مدت قلعہ نائے مین گذری

سپرد کی، اور ابو نصر ہبۃ اللہ فارسی کو اس کا مشیر و وزیر بنایا، ابو نصر فارسی اور مسعود کے تعلقات دوستانہ تھے، اس کے بعد پھر مسعود کا ستارۂ اقبال چمکا، ابو نصر نے جالندر کی حکومت پر مسعود کو سرفراز کیا، لیکن بہت جلد ابو نصر معتوب ہو گیا، اس لئے مسعود بھی معزول کیا گیا، اور دوبارہ جیلخانہ بھیج دیا گیا، اس مرتبہ آٹھ نو سال تک حصار مرنج مین قید رہا۔ چنانچہ کہتا ہے،

در مرنجم کنون سہ سال وبود   کہ ببندم درآین چو دوزخ جائے

آخرعہد دسنہ ۵۰۰ھ مین ثقۃ الملک طاہر بن علی بن مشکان کی سفارش پر رہائی نصیب ہوئی، مسعود یمین الدولہ بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم (۵۱۱ھ - ۵۵۲ھ) کے ابتدائی عہد تک بقید حیات رہا۔ اسی سال کی عمر مین ۵۱۵ھ مین انتقال کیا،

مسعود ہندی اور فارسی کیساتھ عربی کا بھی قادر الکلام شاعر تھا، تینون زبان مین اس کے دیوان تھے، لیکن عربی اور ہندی دیوان بقول آزاد بلگرامی "طارت بہا العنقاء" بالکل ہی ناپید ہو گئے، البتہ فارسی دیوان ہندوستان و ایران مین متداول و متعارف رہا۔ فارسی دیوان اس کی حیات ہی مین سنائی غزنوی نے مرتب کیا تھا، سنائی نے دوسرون کے اشعار کو غلطی سے مسعود کا سمجھ کر اس مین شامل کر لیا تھا، بعد مین جب طاہر بن علی مشکان نے اس غلطی سے آگاہ کیا تو سنائی نے ایک قطعہ مسعود کے پاس معذرت مین بھیجا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) لیکن یہ صحیح نہین، نظامی عروضی کہتا ہے کہ قلعہ نائے وجیرستان مین واقع ہے، لیکن نہ تو وجیرستان کے متعلق صحیح علم حاصل ہو سکا، اور نہ قلعہ نائے کی جائے وقوع معلوم ہو سکی (۲) دوسرا قلعہ دھک ہے، جو زرنج پایۂ تخت سیستان اور "بست" کے درمیان واقع تھا (۳) تیسرا قلعہ "سو" ہے جس کا مقام معلوم نہین (دوسری دفعہ مسعود قلعۂ مرنج مین قید کیا گیا، مرنج کے متعلق برہان قاطع مین ہے کہ قلعہ ایست در ہندوستان (چہار مقالہ ص ۱۶۹) (ص ۲۳۱) [۱] طاہر سلطان مسعود بن ابراہیم کا وزیر تھا، لب الالباب جلد ۲ ص ۲۴۶ چہار مقالہ ص ۱۸۲ [۲] چہار مقالہ ص ۱۴۹،

مسعود کی عربی شاعری کے لئے یہ سند کافی ہے کہ رشید الدین وطواط جیسا ادیب اس کے حسن تخیل، انسجام بیان و جودت کلام کی شہادت دیتا ہے، حدائق السحر[لہ] میں وطواط نے مسعود کے کچھ عربی اشعار بطور استشہاد نقل کئے ہیں آج اسی کے ذریعہ مسعود کے عربی کلام کا نمونہ ہم کو ملتا ہے "براعۃ المطلع" کی مثالوں میں وطواط نے ایک مطلع مسعود کا بھی پیش کیا ہے، جو مندرج ذیل ہے،

تق بالحسام فعهده میمونٌ   وارکب وقل للنصر کن فیکون

توریہ کی مثالوں میں مسعود کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں،

ولیل کأنّ الشمس ضلت ممرها   ولیس لها نحو المشارق مرجع
نظرت الیه والظلام کأنّه   علی العین غربان من الجو وقّع
فقلت لقلبی طال لیلی ولیس لی   من الهم منجاة وفی الصبر مفزع
أری ذنب السرحان فی الجو طالعا   فهل ممکن انّ الغزالة تطلع

وطواط ہی کی زبانی چند اشعار ذو قافیتین بھی سن لیجئے،

یا لیلة اظلمت علینا   لیلاء قاریة الدجنه
قد أرکضت فی الدجی علینا   دهما خداریة الأعنه
فبت اقتا مها فکانت   حُبلی نهاریة الأجنه

مذکورۂ بالا اشعار میں قاریہ، خداریہ نہاریہ، قافیۂ اولی اور دجنہ، اعنہ، اجنہ قافیۂ ثانیہ ہیں،

مسعود کے بعد ایک طویل خاموشی چھا جاتی ہے، تا آنکہ ۷۰۳ھ میں قاضی عبدالمقتدر بن قاضی رکن الدین شریحی کندی پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی نواسنجی سے اصحاب ذوق کی روح کو بالیدگی بخشی، قاضی صاحب حضرت شیخ نصیر محمود چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ) کے خلیفہ اور مشہور فاضل قاضی

لہ سبحۃ المرجان

شہاب الدین دولت آبادی کے استاد تھے، قاضی صاحب کا قصیدہ لامیہ جو لامیۃ العجم طغرائی کے معارضہ میں ہے، اُن کے مذاقِ سلیم کا بین ثبوت ہے، آپ کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی، حوض شمسی کے قریب خانقاہ شیخ عبد الصمد میں مدفون ہوئے [۵۱]

قاضی عبد المقتدر کے معاصر و برادر طریقت مولانا احمد تھانیسری کا قصیدہ دالیہ بھی ہندوستان کے قدیم عربی ذوق کا اعلیٰ نمونہ ہے، ان بزرگون کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین وہ ہندیت نہین، جو پچھلے دور کے اعیان شعر و ادب کے کلام مین عموماً پائی جاتی ہے، محمد مومن شیرازی [۵۲] (م ۱۱۱۸ھ) سید عبد الجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ھ - ۱۱۳۸ھ) سید محمد بلگرامی (۱۱۰۱ھ - ۱۱۸۵ھ) طفیل محمد اترولوی (۱۰۷۳ھ - ۱۱۵۱ھ) علامہ آزاد بلگرامی وغیرہ بلند پایہ ادبار تھے، عربی لغات اور محاورات اُن کی نوک زبان تھے، پھر بھی اُن کے کلام مین عجمیت کا اثر ہے، جس سے اُن کی فنی قابلیت واغلاط نظر آتی ہے، علامہ عبد الجلیل بلگرامی کے دو شعر ہین،

حبیبی قوس حاجبہ کنون وصاد یل ابن مقلۃ شکل عینہ

لعمری انہ نص جلی علی ان الرمایۃ حق عینہ

اس کو سنتے ہی نقاد فن یا تو یہ خیال کرے گا کہ کسی ماہر فن خطاط کا شعر ہے یا یہ کہ کسی اصولی و فقیہ کے پرواز خیال کا نتیجہ ہے، سید محمد بلگرامی کے بھی دو شعر سن لیجئے،

بروحی سلمی قد اتتنی کرامۃ وساعد نی فیھا زمان مُبشرُ

لقد ذقت من فیھا مزید حلاوۃ نعم شفتاھا سکرٌ و مکررُ

محمد مومن شیرازی جس نے اپنا دیوان "ثمر الفواد" سرزمین سندھ مین مرتب کیا تھا، اس کے چند اشعار یہ ہین :-

[۵۱] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر، سبحۃ المرجان و اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۱ [۵۲] سبحۃ المرجان ص ۱۰۸

یشق علی الموت فی ارض غربۃ	یقل صراخ النائحات علی قبری
تقضت لیال کنت اجہل قدرہا	سفاہا و ما ادریت ما لیلۃ القدر
وجاءت لیال ما أشد سہادہا	بہا عذبت روحی الی مطلع الفجر
وقائلۃ صبراً علی ما تذوقہ	فقلت وہل شیٔ أمرّ من الصبر
بلی انہ ادوی داء صبری بمثلہ	کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

البتہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ – ۱۱۷۶ھ) اور شاہ عبد العزیز (۱۱۵۹ھ – ۱۲۳۹ھ) کے قصائد و مقطوعات میں ایک خاص جاذبیت و سادگی پائی جاتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کے کلام کا مجموعہ "طیب النغم فی مدح سید العرب و العجم" شائع ہو چکا ہے، حضرت شاہ عبد العزیز کے اشعار و قطعات جو مختلف رسائل و کتب میں نظر آتے ہیں، آپ کی فصاحت و بلاغت کا آئینہ ہیں، آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

یا من یسئل عن دہلی و رفعتہا	علی البلاد و ما حازتہ من شرف
إن البلاد إماء وہی سیدۃ	وانہا درۃ والکل کالصدف
فاقت بلاد الوری عزاً و منقبۃ	غیر الحجاز و غیر القدس و النجف

کیا ان اشعار کے مطبوع و حسین ہونے میں کچھ کلام ہو سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں علامہ آزاد بلگرامی کے کلام پر تبصرہ کرنا ضروری ہے، اگرچہ آزاد پر ایک طویل مقالہ معارف کے قدیم پرچوں میں قسط وار شائع ہو چکا ہے، اور مقالات شبلی[2] میں بھی ان پر ایک قیمتی مضمون موجود ہے، تاہم اُن کی بعض خصائص و مزایا پر روشنی ڈالے بغیر یہ مضمون ناقص رہے گا، اس لئے اُن کے مختصر حالات اور شاعری کے بعض خصوصیات پر تبصرہ ضروری ہے،

---

[1] حالات خاندان عزیزی ص ۳۸، ص ۳۹ [2] ایضاً ج ۵ ص ۱۱۹

آزاد بلگرامی | سید غلام علی آزاد بن سید نوح حسینی واسطی بلگرامی، یوم یکشنبہ ۲۵ رصفر ۱۱۱۶ھ ہجری میں بہ مقام بلگرام پیدا ہوئے،

تمام کتب درسیہ سید طفیل محمد اترولوی کی خدمت میں پڑھیں، اپنے نانا سید عبد الجلیل بن سید احمد بلگرامی نور اللہ ضریحہ سے لغت اور سیرت کی تحصیل کی، انہی سے حدیث مسلسل بالاولیہ، حدیث الاسودین اور اکثر کتب احادیث وسنن نبویہ کی سند و اجازت حاصل کی، عربی و فارسی دواوین کی اجازت بھی انہی سے ملی، عروض و قوافی اپنے ماموں سید محمد بن سید عبد الجلیل بلگرامی سے حاصل کئے اور حضرت سید لطف اللہ بلگرامی المتوفی ۱۱۴۳ھ سے بیعت کی،

۱۱۴۳ھ میں سیوستان پہنچے[۱] اور سید محمد کی جگہ ۱۱۴۵ھ تک بخشیگری اور وقائع نگاری کے عہدہ پر مامور رہے، سفر سیوستان کا حال اپنی ایک مثنوی میں لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں؛

بیا اے خامہ راہ نامہ سر کن	با قلیم سخن عزم سفر کن
نخستین گیر نام فیض بسرمد	فروغ مکرمت سید محمد
بکار نیک توفیقش رفیق ست	مرا خال حقیقی و شفیق است
بسیوستان عظیم الاقتدار است	کہ آنجا بخشی و واقع نگار است
چو آنجا مدت دہ سال ماندہ	مرا بہر نیابت باز خواندہ
کہ خود سوے وطن تشریف آرد	مرا بر عہدہ خدمت گذارد

سید محمد آزاد کو اپنی جگہ چھوڑ کر بلگرام روانہ ہوئے، اسی اثنا میں ایک شخص عبد العزیز تتوی (ٹھٹھوی) نے بخشی گری و وقائع نگاری کی خدمت پر اپنا تقرر کرا لیا، لیکن سید محمد نے دوبارہ اس کو حاصل کر لیا، اور ۱۱۴۵ھ میں پھر اپنے عہدہ پر آ گئے، چنانچہ سنہ مذکور کے واقعات قلمبند کرتے ہوئے

[۱] سبحۃ المرجان ص ۱۰۸ و تبصرۃ الناظرین (ذکر سنہ ثلاث واربعین و مایۃ والف) مصنفہ سید محمد (قلمی)

رقمطراز ہیں :-

"درین سال راقم الحروف بعد ازانکہ خدمت بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان تابع صوبہ ملتان بنام خود از حضور انور بحال و مقرر نمود و مطالب ما فی الضمیر تیسیر پذیر گشت اہلِ خانہ خود را از وطن طلب داشتہ بتاریخ ہفدہم شہر جمادی الاولیٰ از دار الخلافہ شاہجہان آباد بعزم ولایت سندھ برآمدہ بعد طے مراحل و قطع منازل مع مردم وطن و قبائل بخیر و عافیت باحسن احوال با جان و مال بتاریخ بست و پنجم رمضان المبارک روز پنجشنبہ ببلدہ سیوستان رسیدہ سرگرم کار پادشاہی گردید و مخالف کہ سند خدمت بنام خود حاصل کردہ بود حیران و سراسیمہ و پریشان شدہ دخل نیافت"[1]

اس کے بعد علامہ آزاد سیوستان سے واپس آگئے ۱۱۵۱ھ میں تن تنہا ارضِ حجاز کا سفر کیا، اس سفر کا حال اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے شوق کا نقشہ سبحۃ المرجان میں اپنی کلک گہربار سے کھینچا ہے، اور ایک مثنوی "طلسم اعظم" میں بھی حالاتِ سفر کو بیان کیا ہے، روانگی کی تاریخ "سفر خیر" سے اور واپسی کی تاریخ "سفر بخیر" سے نکلتی ہے ۱۱۵۱ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اس کا مادہ تاریخ "عمل اعظم" ہے،

مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ میں محدث جلیل حضرت شیخ محمد حیات سندی[2] کے خرمنِ علم سے

---

[1] تبصرۃ الناظرین پیشِ نظر نسخہ صدیق محترم مولوی ابوسلمہ شفیع احمد استاذ مدرسہ عالیہ کا نقل کردہ ہے، جو ٹبہ لائبریری کے مخطوطے سے منقول ہے [2] آپ نے عنفوان شباب میں حرمین شریفین کا سفر کیا، مدینۃ النبی میں اقامت پذیر ہوگئے شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ سے شرف تلمذ تھا، شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے حدیث کی اجازت لی، یوم چہار شنبہ ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ میں وفات پائی، بقیع غرقد میں مدفون ہیں، اپنا نسب خود لکھا ہے: "والد الفقیر محمد حیات السندی اسمہ ملا فلاریہ من قبیلۃ جاجا الساکن فی اطراف عادل پور دار السید موسیٰ القادری، الساکن فی کوتہ" یعرف بہ انتہی سبحۃ المرجان ص ۹۵،

خوشہ چینی کرتے رہے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،[1]

"و قرأت أیاما قامتها صحیح البخاری	میں نے قیام مدینہ کے دوران میں اپنے
علی شیخی و مولائی صاحب الجلالۃ	بلند مرتبہ شیخ حضرت محمد حیات سندی
السندی الشیخ محمد حیاۃ المدنی	قدس سرہٗ سے صحیح بخاری پڑھی صحاح
المدنی قدس سرہ و اخذت	ستہ اور ان کے تمام مقروءات کی اجازت
عنہ اجازۃ الصحاح الستۃ	لی، اور ان کی ذات بابرکت سے مستفید ہوا،
و سائر مقروءاتہ و اقتطفت	
ثمارا ایانع من غصون برکاتہ	

(سبحۃ المرجان صفحہ ۱۲۰)

مکہ معظمہ میں شیخ عبد الوہاب طنطائی مصری (م ۱۱۵۷ھ) کی صحبت سے فیضیاب ہوئے، احادیث و آثار نبویہ کے متعلق فوائد و معلومات حاصل کئے، ایک دن شیخ سے اپنے تخلص "آزاد" کا ذکر کیا، اور اس کے معنی بتائے تو اُن کی زبانِ مبارک سے یہ کلمۂ بشارت نکلا "یا سیدی انت من عتقاء اللہ"

حجاز مقدس کی زیارت سے واپس آکر اورنگ آباد میں قیام کیا، اور حضرت شاہ مسافر غجدوانی المتوفی ۱۱۳۶ھ کی خانقاہ میں ۱۱۵۹ھ تک یعنی تقریباً سات برس رہے، اواخر ۱۱۵۹ھ میں نواب نظام الدولہ ناصر جنگ بن نواب نظام الملک آصفجاہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی، اور سفر و حضر میں برابر اپنے ساتھ رکھنے لگے ۱۱۶۱ھ میں جب خود ناصر جنگ سریر آرائے سلطنت ہوئے احباب کا اصرار ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی بڑا منصب عز و جاہ حاصل کر لیں، لیکن علامہ کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی، جواب دیا،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۱۲۰،

مثل ھذہ الدنیا مثل نھر | اس دنیا کی مثال نہر طالوت کی ہے کہ
طالوت غرفۃ منہ حلال | اس کا ایک گھونٹ (بقدر ضرورت)
والزیادۃ علیھا حرام | حلال اور اس سے زیادہ حرام ہے،

یہ شرف صرف ناصر جنگ کو حاصل ہے کہ علامہ آزاد نے اُن کی شان میں دو شعر کہے، ورنہ انھوں نے کبھی کسی امیر کبیر کی تعریف نہیں کی، وہ اشعار یہ ہیں:-

ھو ناصر الاسلام سلطان الوری | ابقاہ فی العیش المخلد ربہ
حاز المناقب والمآثر کلھا | جبل الوقار یحبنا ونحبہ

علامہ آزاد نے اورنگ آباد ہی میں اپنی مشہور کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان تصنیف کی اور یہیں ۱۱۹۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا[۱] تاریخ وفات "غلام علی آزاد" سے نکلتی ہے، لیکن نواب صدیق حسن خان نے ایک جگہ یہ تصریح کی ہے، کہ ۱۲۰۰ھ[۲] میں اُن کی وفات ہوئی،

آزاد کی وطنیت | آزاد کو اپنے وطن کے ذرہ ذرہ سے بڑی محبت تھی، اسی جذبۂ وطن پرستی میں ؔ سرزمین ہند ہی کو نور محمدی کی پہلی جلوہ گاہ کہتے ہیں، سبحۃ المرجان کے ابتدائی صفحات میں اپنی پوری قوت بیان ہندوستان کی برتری و تفوق کے اثبات میں صرف کرنے کے بعد فرماتے ہیں[۳] :-

قد اودع الخلاق آدم نورہ | متلالئاً کالکوکب الوقاد
والھند مھبط جدنا ومقامہ | قول صحیح جید الاسناد
فسواد ارض الھند ضائت اولا | من نور احمد خیرۃ الامجاد

وطن کی فضیلت ایک اور شعر میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۱۲۲ [۲] ابجد العلوم ص ۹۲۲ [۳] ابجد العلوم ص ۲۱۳،
[۴] سبحۃ المرجان ص ۲۴،

إن تبتغوا ماء الحیوٰۃ فذلکم   فی الھند لا فی موضع الظلمات[۵۱]

آزاد کی شاعری | عربی و فارسی ادب میں علامہ آزاد کا درجہ محتاج تشریح نہیں۔ ان دونوں زبانوں کے علاوہ ہندی پر بھی ان کو پورا عبور حاصل تھا، اور اس میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے، مسعود لاہوری کا بھی یہی کمال تھا کہ اسے بھی تینوں زبانوں پر قدرت تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ آزاد فرماتے ہیں:[۵۲]

"وھو مثلی عارف بالالسنۃ	وہ میری طرح تینوں زبانوں کا جاننے
الثلاثۃ وصاحب الثلاثۃ	والا، اور تین دواوین عربی، فارسی
دواوین العربی والفارسی و	ہندی رکھتا ہے، میرے دو دیوان عربی
الھندی وانا صاحب الدیوانین	و فارسی کے ہیں، ہندی کا کوئی
العربی والفارسی ومالی فی الھندی	دیوان نہیں، لیکن میں ہندی
دیوان لکنی ماھر بالشعر الھندی	شاعری اور اس کے گُر سے واقف
ودقائقہ"	ہوں،

آزاد کی عربی شاعری تقلید محض نہیں ہے، بلکہ اس میں انھوں نے ایک نئی راہ نکالی ہے، اُن کا تغزل ہندی تغزل سے مشتق ہے، اور یہی وہ خاص نہج ہے، جس کی جانب نواب صدیق حسن خان نے اشارہ کیا ہے:[۵۳]

ولہٗ فی التغزل طور خاص قلما	تغزل میں اُن کا خاص طریقہ ہے جو
یوجد فی کلام غیرہ یعرفہ	جو دوسروں کے کلام میں بہت کم پایا
اصحاب الفن،	جاتا ہے، اسے فن والے واقف ہیں،

---

۵۱ سبحۃ المرجان ص ۴۰، ۵۲ ایضاً ص ۲۷ ۵۳ ابجد العلوم ص ۹۱۳،

آزاد جیسا کثیر الکلام عربی شاعر ہندوستان کے کسی دور میں نہیں پیدا ہوا، اپنی اس خصوصیت کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے[۱]؎

وما ظهر فی الهند قبلی من یکون	مجھ سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسا
له دیوان عربی ومن یکون لهٗ	شخص نہیں ہوا، جو عربی دیوان رکھتا
شعر عربی علی هذه الحالة	ہو اور اس کے عربی اشعار ایسے ہوں

لیکن ان کا ان سے پہلے کوئی صاحب دیوان عربی ہندوستان میں نہیں گذرا، صحیح نہیں کیونکہ مسعود لاہوری کا صاحب دیوان عربی ہونا مسلم ہے، اگرچہ اس کا دیوان زمانہ کی ناقدردانی کے باعث ناپید ہو گیا اور چند اشعار کے سوا اس کے عربی کلام کا نمونہ بھی آج نہیں ملتا، محمد مومن شیرازی بھی صاحب دیوان تھے، آزاد نے خود اس کو ہندوستان کے عربی شعراء کے زمرہ میں لکھا ہے، اور اس کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے[۲]؎

آزاد کے کلام کا بیشتر حصہ مدائح نبویہ پر مشتمل ہے، اسی لئے ان کے استاذ نے ان کو حسان الہند کا خطاب مرحمت فرمایا تھا[۳]؎

آزاد کی جدت طرازی | آزاد کو عربی ادب کی طرح اپنے وطنی لٹریچر بھاشا میں بھی پوری مہارت تھی، ان کے ذوق و وجدان نے ان دونوں کے حسین امتزاج کا نہایت لطیف نمونہ پیش کیا ہے،

تعالوا واسمعوا منی الاغانی عن الورقاء تذکر الکلاء

انھوں نے عربی میں بھاشا کے خیالات اور شاعرانہ صنائع نقل کئے، ان صنعتوں کی تعداد تینتیس ہے[۴]؎ ہندی کے بحور و قوافی کا بھی عربی سے مقابلہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ ہندی کی اکثر بحریں عربی

---

[۱] سبحۃ المرجان و ابجد العلوم ص ۹۲۲ [۲] سبحۃ المرجان ص ۲۰۸ [۳] ابجد العلوم ص ۹۲۲ [۴] مقالات شبلی ص ... جلد ... تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان ص ۱۶۳ تا ۲۵۵،

و فارسی سے مختلف ہیں لیکن بحر تقارب کفن خلیل اور بحر سریع ہندی میں بھی ہیں، ایک بڑا فرق یہ بتایا ہے کہ ہندی میں بعض بحریں ایسی ہیں جن کا قافیہ مصرع کے آخر کے بجائے وسط میں آتا ہے، اور باوجود اس کے یہ بحر مطبوع اور دلپسند ہے[1]،

آزاد اپنی جدت پر ناز کرتے ہیں، اور اپنے کو مجدد و بدیع کہتے ہیں، فرماتے ہیں[2]،

الفت سفرا فی البدیع وغیرہ	ونظمت سمطا من ثمین جمان
قد کان عبد اللہ واضع فنہ	ولہ الینا غایۃ الاحسان
وانا المجدد للبدیع فیا لہا	قد صغتہ من حلیۃ الاذان

آزاد کے دواوین میں سیکڑوں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں خالص ہندوستانی خیالات اور جاشانی تشبیہات و استعارات ہیں، اُن کی مشہور کتاب سبحۃ المرجان سے صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں[3]،

نیلو فو طرفک السکران من سنۃ	بشانہ قلبی المشتاق یصعق
نعم امسی حذاء البدر منفتحا	وعم اضحی حذاء الشمس منفحم

مذکورۃ الصدر شعر میں ایک حسینہ اپنے شوہر سے جس نے رات کہیں اور بسر کی ہے، یوں شکایت کر رہی ہے کہ تمہاری نیلوفر جیسی سرخی مائل آنکھیں نیند کے غلبہ سے مندی جا رہی ہیں، تو ضرور اس میں کوئی بات ہوگی، پھر کہتی ہے کہ یہ آنکھیں چاندنی میں تو کھلی رہیں، لیکن آفتاب حسن کے مقابل میں کیوں بند ہوئی جا رہی ہیں،

اس شعر کے معنوی محاسن کی تشریح آزاد نے خود کی ہے کہ نیلوفر کی دو قسمیں ہیں، شمسی و قمری، نیلوفر شمسی، آفتاب کی روشنی میں کھلتا، اور چاندنی میں مرجھا جاتا ہے اور

---

[1] مقالات ۲/۱۲۶، [2] سبحۃ المرجان ص ۳، [3] سبحۃ المرجان ص ۲۴۳،

قمری چاند کی روشنی میں شگفتہ رہتا ہے، اور طلوع آفتاب تک پژمردہ ہو جاتا ہے، آنکھوں کو نیلوفر سے تشبیہ دینے میں یہ لطافت ہے کہ نیلوفر ایسا سُرخی مائل ہوتا ہے جس طرح آنکھوں میں شب بیداری کی وجہ سے سُرخ ڈورے پڑ جاتے ہیں، دوسرے شعر میں بدر و شمس میں صنعت توریہ ہے، یعنی شمس سے وہ اپنے حسن کی تعبیر کر رہی ہے، اور بدر سے اپنی سوکن کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں سوکن کی تنقیص اور اپنی فضیلت اور بڑائی کے ساتھ ہی باتوں باتوں میں شوہر کو اختیار ناقص پر غیرت بھی دلا رہی ہے۔

اسی طرح یہ دونوں اشعار[1]

لقد نحلت فی یوم راح حبیبها — الی أن هوی من ساعدیها انضارها

ولما اتاها مخبر عن قدومه — علی الساعد الملآن ضاق سوارها

بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے خالص ہندی ہیں،

ایک اور شعر ہے[2]

بدنا معاً فاذا بدی فلق الدجیٰ — غطت بفضل الکم سلک جمانِ

ہندی ادب میں موتیوں کا ٹھنڈا ہو جانا طلوع سحر کی علامت ہے، لہذا معشوقہ (ملکہ عاشقہ) زیورات اور گلے کے ہار کو چھپا رہی ہے کہ ان کی ٹھنڈک سے محبوب بیدار نہ ہو جائے، عربوں کے یہاں بھی "بَرد السوار" یعنی کنگن کی ٹھنڈک طلوع صبح کی دلیل ہے، چنانچہ ابو فراس بن حمدان کہتا ہے،

وکم من لیلۃٍ لم ارو منها — حییت لها توٴرقنی نوادرُ

فبتّ اعلّ خمراً من رضاب — لها سکر ولیس لها خمارُ

الی أن رق ثوب اللیل عنا — فقالت قم فقد برد السوارُ

شعرائے عرب کو غُراب، جبین خون کے آنسو رلاتا ہے، لیکن اہل فارس و ہند اسی کو غُراب الوصل

---

[1] سبحہ ص ۲۵۴ [2] سبحہ: القصیدۃ الغزلانیہ، ص ۲۶۰، ۲۶۳۔

سمجھے ہیں، اسی مفہوم کو حسان الہند کی زبانی سنئے،[ه]

سمعت غراب الهند یضحی مبشرا بعود حبیب یا له من مبشر

ألا یا غراب البحد انت شقیقه فما لك تؤذی هائما بالتطیر

عرب شعرا میں صرف ابو الشیص ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنے اسلاف سے الگ راستہ اختیار کیا ہے:[ه]

ما فرق الاحباب بعد الله الا الابل

والناس یلحون غراب البین لما جهلوا

وما علی ظهر غراب البین تطوی الرحل

ولا اذا صاح غراب فی الدیار احتملوا

وما غراب البین الا ناقة او جمل

هندیت | ہندوستانی نقطۂ نظر سے جو چیز آزاد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہے، وہی عربی شاعری کے نقطۂ نظر سے اُن کے کلام کا نمایاں عیب ہے،

معشوق من است آن کہ بنزدیک تو زشت است

ان کے اشعار میں ہندیت اس قدر غالب ہو کہ وہ اسالیب عرب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے اور یہ نقص صرف ان ہی اشعار میں نہیں ہے جن کے متعلق یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ علی الارتجال کہے گئے ہیں اور ان کے حک و اصلاح کی نوبت نہیں آسکی، بلکہ وہ طویل قصائد بھی جو یقیناً غور و تامل کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس سے پاک نہیں ہیں، مثلاً ان کا قصیدہ لامیۃ الہند پڑھ جائیے، اس اکاون شعر کے قصیدہ میں ایک شعر بھی تو ایسا نہیں ملیگا جس کو خالص عربی مذاق کا نمونہ کہا جائے۔ اس کے مقابل

ه سبحۃ المرجان ص ۲۵۳ ه الشعر والشعرا ابن قتیبہ ص ۳۴۷

مین قاضی عبدالمقتدر کا لامیہ اپنی عجمیت کے باوجود حسنِ انسجام، برجستگی، عربیت اور مطبوعیت مین بڑھا ہی، علامہ شبلیؒ لکھتے ہین[1]،

"آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے چہرۂ کمال کا داغ ہے، اس سے انکار نہین ہوسکتا، کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہین، نہایت نادر کتب ادبیہ پر اُن کی نظر ہی، لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہین لیکن کلام مین اس قدر عجمیت ہے، کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے، اُن کو اس پر ناز ہے کہ انھون نے عجم کے خیالات عربی زبان مین منتقل کئے ہین لیکن نکتہ سنج جانتے ہین کہ یہ ہنر نہین بلکہ عیب ہے"

اس سخت عیب کے باوجود آزاد کی شاعری خاص مرتبہ رکھتی ہے جس سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا، اب ان کے کچھ سنجیدہ اور سادہ اشعار پیش کئے جاتے ہین، جن سے اندازہ ہوگا کہ اگر اُن کے کلام کا بیشتر حصہ اسی رنگ کا ہوتا تو ان کا مرتبہ ہر حیثیت سے بلند ہوتا[2]،

یا ظبیۃ فتنتنی این مرعاک	حیث اصبحت عین اللہ ترعاک
انی لھمت وما امری بمبتدع	الاس والبان والغزلان تھواک
اری غصون النقا یرقصن قاطبۃ	لقد تمایلن نشوی من حمیاک
والشمس ترفل فی ابراجہا مرحا	لعلھا مارأت یوما محیاک
لقد طال اشجانی بطول مطالک	فعطفا علی المملوک یا ابنۃ ملاک
وما ابتغی واللہ مالا ودولۃ	ملاک رجائی نظرۃ من نوالک
علی م أبث المشتکی ان نسیتنی	ومن أناحتی اخطرن ببالک

[1] مقالات ۲/ ۱۲۹، [2] سبحۃ صفحہ ۲۳۶، [3] ایضاً، ۲۳،

علامہ آزاد کو آج تک ہندوستان کا سب سے بڑا عربی شاعر اور مستند مورخ سمجھا جاتا ہے،

علامہ شبلی گو وہ اختصار پسند واقع ہوئے ہیں لیکن جو کچھ لکھتے ہیں مستند و مفید ہوتا ہے، انکی

کی فہرست حسب ذیل ہے،

) ضوء الدراری، یہ صحیح بخاری کی شرح ہے جو شروع سے کتاب الزکوٰۃ کے ختم تک ہے، الحطہ

ح الستہ میں نواب صاحب نے اس کی ابتدائی عبارت نقل کی ہے،

) تسلیۃ الفواد،

) سبحۃ المرجان، ان کی تصانیف میں بے نظیر کتاب ہے جس کی تصنیف سے ۱۱۷۷ھ میں فارغ

ور جس کی توصیف میں خود رطب اللسان ہیں،

هذا الکتاب له محل شامخ	یدل ریه من هو صاحب العرفان
ررت تالیفی وقلت مورخا	تجلو البصیرة سبحة المرجان

۴) شفاء العلیل، اس کتاب میں عربی کے مشہور شاعر ابو الطیب احمد بن الحسین المتنبی (م ۳۵۴ھ)

ن پر تنقید و مواخذات ہیں،

۵) غزلان الہند،

۶) سند السعادۃ،

۷) عربی دواوین، جن میں کل اشعار بہ قول علامہ صدیق حسن خان قنوجی گیارہ ہزار ہیں

ین کی تفصیل یہ ہے :-

الف) سبع سیارہ، یعنی سات دیوان کا مجموعہ، مثلاً دیوان مردف، دیوان مستزاد

رجیع وغیرہ، یہ تمام اجزاء، غزلیات و مدائح نبویہ پر مشتمل تھے، سبع سیارہ نواب صاحب

فات کی فہرست ابجد العلوم ص ۹۲۳، ۹۲۳ سے ماخوذ ہے۔

کے پاس موجود تھا،[۱]

(ب) مرآۃ الجمال، ایک قصیدہ ہے جس میں معشوق کے ہر عضو کے حسن و جمال کو قلمبند کیا ہے، اور خود ہی اس کی ایک لطیف شرح بھی لکھی ہے،

(ج) دو دیوان جو مدینہ طیبہ بھیجے گئے، اور روضۂ اقدس میں پیش ہوئے تھے، ان دونوں میں کل تین ہزار اشعار ہیں،

(د) مظہر البرکات، مثنوی کے وزن پر سات دفاتر کا مجموعہ جس کے متعلق نواب صدیق حسن خاںؒ رقمطراز ہیں :-

مزدوجۃ فی البحر الخفیف فی	مزدوجہ ہے بحر خفیف میں، جس
غایۃ السلاسۃ والعذوبۃ	کی زبان نہایت ہی سلیس اور شیریں
ولم ینظم احد قبلہ مزدوجۃ	ہے، ان سے پیشتر کسی نے اس بحر میں
عربیۃ فی ھذا البحر (ابجد العلوم ص ۲۱۳)	عربی مزدوجہ نظم نہیں کی،

نواب صاحب کا بیان ہے کہ اس کا ساتواں دفتر ۱۱۹۲ھ میں نظم کیا گیا، اگر یہ صحیح ہے تو یہ کہنا کہ آزاد کی وفات ۱۱۹۲ھ میں ہوئی صحیح نہیں ہو سکتا،

(ہ) نواب صاحب نے مذکورۂ بالا دواوین کے علاوہ اور تین دیوانوں کا ذکر کیا ہے جن میں زیادہ تر نعت و مدائح نبویہ ہیں، ان میں سے کسی کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، (ابجد ص ۹۲۲)

علامہ آزاد کی فارسی تصانیف میں ید بیضا، سرو آزاد، مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیاء ہندوستان، ایران و توران کے شعراء کے تذکرے، سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات، فارسی دیوان وغیرہ ہیں،

---

[۱] معارف بیع سیارہ آسی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے،

ہندوستان کے عربی شعراء کی بزم میں مذکورۂ بالا اکابر کے علاوہ شیخ فضیل بن شیخ جلال کالپی[۵۱]، شاہ رفیع الدین[۵۲] (م ۱۲۳۸ھ یا ۱۲۳۳ھ) فضل حق خیرآبادی صاحب قصائد فتنۃ الہند (۱۲۱۲ھ - ۱۲۷۸ھ) وزیر علی بن مولانا انور علی[۵۳] بن مولانا اکبر علی بن مولانا احمد اللہ سندیلی، نفیس[۵۴] احمد بن حافظ غلام احمد ابن شمس الدین بن مولانا محمد علی بدایونی، علی عباس چریا کوٹی، سید احمد حسن قنوجی المتخلص بہ عرشی، شیخ اوحد[۵۵] الدین ابن قاضی علی احمد بلگرامی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، شیخ حنیف علی رعب شاہ آبادی، عبد العلی آسی مدراسی، حافظ عبد الاول بن علی جونپوری، علامہ حمید الدین فراہی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندی، حضرت شاہ انور کشمیری، مولانا احمد حسین اعظمی مولانا ابو الطیب یعقوب بخش راغب بدایونی وغیرہ کے اسمائے گرامی روشن رہیں گے خصوصاً فیض سہارنپوری، علامہ فراہی اور راغب بدایونی کا درجہ تو بہت ہی بلند ہے، مولانا فضل حق خیرآبادی کی ذات تبصرہ و تذکرہ کی محتاج نہیں، انھوں نے حریری و بدیع الزمان کے معارضہ میں اشعار خوب کہے، البتہ صنائع کے التزام سے کلام میں ثقل پیدا ہوگیا ہے، اس موقع پر نواب صدیق حسن خان کا قول نقل کردینا کافی ہوگا،

---

[۵۱] تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء از مولوی عبد الشکور عرف رحمن علی ص ۱۹۵ [۵۲] حالات خاندان عزیزی از محمد احمد آزاد مرحوم ص ۹۵، دار الحکومت دہلی ص ۵۰۸، حدائق الحنفیہ، ابجد العلوم ص ۲۱۳،

[۵۳] تحفۃ الفضلاء کی عبارت ہو:- بمقام کلکتہ تحصیل علوم خصوصاً ادب عربی را کما حقہ تکمیل رسانیدہ شہرتے پیدا کرد، وچند دیوان اشعار عربی وارد بمدرسۂ کلکتہ دوصد و پنجاہ روپیہ مشاہرہ می یافت و مدرس بود نزد نصیر الدین حیدر فرمانروائے لکھنؤ بود بکلکتہ رحلت نمود" ص ۲۵۰ [۵۴] آپکے قصائد زیادہ تر حضرت غوث اعظم کی منقبت میں تھے، عربی و فارسی میں تین دیوان تھے، اپنے ماموں شاہ فضل رسول بدایونی سے تحصیل علوم کی (تحفۃ الفضلاء ص ۱۹۵) ان کا کلام غدر ۱۸۵۷ھ کے ہنگامہ میں برباد ہوا [۵۵] ابجد العلوم صفحہ ۲۱۳،

؎ واتی فیہا بکل لفظ لطیف	یعنی ان کے اشعار کے الفاظ لطیف اور
ومعنی بدیع لولا انہ اکثر	معانی بدیع ہیں، کاش تجنیس،
فیھا من التجنیس والاشتقاق	اشتقاق اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت
والالفاظ الحوشیۃ بلا اخلاق	نہ ہوتی،

اسی طرح مولانا راغب بدایونی (۱۳۰۸ھ ۔ ۱۳۶۷ھ) کے کلام میں بھی بعض جگہ التزام صنائع کی وجہ سے تکلف پیدا ہوگیا ہے،

ناظرین سے احمد حسین اعظمی کا تعارف کرا دینا ضروری ہے، کیونکہ اُن کے نام و کلام سے اکثر و بیشتر قارئین ناواقف ہوں گے،

احمد حسین اعظمی رسول پور، اعظم گڈھ کے رہنے والے، لانبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ، ناک کھڑی طبیعت میں شاعرانہ ظرافت، بیحد چست و چاق، بے لوث و بے غرض انسان تھے،

موصوف نے رام پور، اور خیرآباد میں تحصیل علم کی، علامہ طیب مکّی سے شرف تلمذ تھا، مشرقی پاکستان کے دارالسلطنت ڈھاکہ میں ایک مدت تک رہے، مدرسہ حمادیہ کے صدر المدرسین تھے، ۱۹۱۹ء میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہوکر وطن لوٹ گئے، اخیر زمانہ میں دوستوں کے اصرار پر دوبارہ ڈھاکہ تشریف لائے، پھر مکہ جاکر اپنے طبی تجربات سے خدمت خلق کرتے رہے، کم و بیش پچھتر برس کی عمر میں اپنے وطن میں بہ عارضۂ اسہال وفات پائی، سن وفات ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء ہے،

عربی ادب میں خاص دستگاہ رکھتے تھے، اُن کے کلام کی خصوصیت ذیل کے اشعار سے واضح ہوجائیگی، ایک خط میں فرماتے ہیں،

واخبرنی ریح الصباعن جنابکم	بما زال احزانی وزاد سروری

فاصبح صدری فاسحا بعد ضیقة واصبح قلبی فارحا بو فو ہرا

ونبأ الاحباب بعد طول لقائهم کروح سری فی المیت بعد ھوا

نسیم الصبا ان زرتهم بلغی لهم تحیة من قد قام بعد نشورا

آپ کے دو قصیدے دست خاص کے لکھے ہوئے برادر محترم مولانا صغیر حسن صاحب معصومی لکچرر فلسفۂ اسلام، ڈھاکہ یونیورسٹی کے پاس تھے، لیکن افسوس کہ دونوں ناگہانی طور پر ضائع ہوگئے، اب صرف ایک ٹکڑا باقی رہ گیا ہے جس کے دونوں طرف چھ چھ اشعار ہیں، ان میں سے ایک قصیدہ لامیہ تھا، اور دوسرا نونیہ، اس ٹکڑے میں جتنے اشعار ہیں، قصیدہ نونیہ کے ہیں، ایک جانب ذیل کے اشعار ہیں،

لولا الھوی خفرت عهود بنی الحمی اید الکروب علی ذوی الازمان

ولما تعارفت النفوس محلها والسرب جوء ذرها مدنی الاوان

ترمی فوارسها السهام فاسهت وتعود طاغتة من السمران

فتصاب من ذالك الحمام ولم تمت وتفش هذا اشرف البنیان

لولا الھوی لم یذکر اللسن الذین خلوا ولم یفصح لهم بلسان

وهی الکریمة عنصر الحیاتنا وحیاة من قد دب فی الحیوان

دوسری طرف یہ اشعار ہیں:-

هیهات اعفی الدهر اُبلی رسمها وحفت علیها نائبات زمان

وغدا حذوق الناس جل سفیههم وحکی القرود مناطق الانسان

وردوا فلول العود سیفا باترا ودعوا جبانا مقتدی الشجعان

ضرب الجلاجل ایقنوه عبادة والکفر قد سموه بالایمان

ویبایعون لنا مھم علما بأنھم ارسطالیس واللقمان[1]

اذا نھم صمۃ واعینھم عمی وقلوبھم عمہ من الطغیان

مذکورہ بالا اشعار سے اہل نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا کہنے والا عربی شاعری کا کتنا ستھرا مذاق رکھتا تھا،

تلک آثارنا تدل علینا

فانظروا بعدنا الی الآثار

---

[1] کذا فی الاصل و فی البیت اقوا (۱۲)،

انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت

از

مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ

کوئی تراشا ہوا خیالی افسانہ نہیں بلکہ معتبر راویوں کی مسلسل سند کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کا جو مجموعہ ابن سعد کے طبقات میں پایا جاتا ہے، اسی کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، ہر ہر واقعہ کے لئے حوالہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ یہاں جو کچھ بھی درج کیا جا رہا ہے صرف ایک ہی کتاب سے ماخوذ ہے،

دنیا کے تین[1] مشہور دل کشا اور دل آویز سیرگاہوں میں وہ خود شہر اور اس کا مینو سواد علاقہ سمجھا جاتا ہے، جہاں کے حکمران کی یہ تاریخی داستان آپ کے سامنے ہم دہرانا چاہتے ہیں،

جانشین کے انتخاب کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں جس حکمران کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا گیا ہے وہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے، انتخاب کے وثائق ملک کے جس باوقار صاحب علم بزرگ کے سپرد کئے گئے ہیں، ان کو حکم ہے کہ جب تک موت اپنے فیصلہ کو قطعی شکل میں صادر نہ کرے، اس وقت تک انتخاب کس کا ہوا، اس کو صیغہ راز میں رکھا جائے جس کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کو خود اس کی خبر نہیں ہے، مسئلہ معمولی نہیں ہے، ایک بڑی حکومت کی حکمرانی اور فرمانروائی کا مسئلہ جس کی قلمرو کے حدود میں ایشیا اور افریقہ ان دونوں براعظموں کے تقریباً اکثر اور بڑے آباد علاقے شریک ہو چکے ہیں، اور جو شریک

---

[1] اسلامی تاریخوں میں غوطہ دمشق، وادی سمرقند، نہر ابلہ زیر دریائے دجلہ کے متعلق یہی باور کرایا گیا ہے،

نہیں ہوئے، حالات ایسے سازگار ہیں کہ اُن کی شرکت کی توقع بھی بعید از قیاس نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں کرۂ زمین کی سب سے بڑی قاہرہ اور ہر لحاظ سے ممتاز ترین حکومت یہی تھی، تو یہ مبالغہ نہیں، بلکہ واقعہ کا اعتراف و اظہار ہوگا،

بہر حال راز کے وثائق کے امین ت وہی جن کا اس حکومت کی فرمانروائی کے لئے انتخاب ہو چکا ہے، دیکھا گیا کہ وہی اُن سے کہہ رہے ہیں،

"اگر کچھ بھی میری محبت اور قدر و قیمت آپ کے دل میں ہے، تو خدارا مجھے آگاہ کیجئے کہ کہیں قرعہ فال میرے نام تو نہیں ڈالا گیا ہے، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہی نہ ہوا ہو"

ابھی اس کا وقت باقی ہے، کہ اس فیصلہ کو میں بدلوا سکتا ہوں، بات اگر ہاتھ سے نکل گئی، تو نہ کچھ میں اس وقت کر سکتا ہوں آئندہ وہ میرے بس کی بات نہ رہے گی"

جو اس حکومت کی صدارت نہیں، بلکہ بادشاہی کے لئے چنا جا چکا ہے، مگر اپنے انتخاب کے اس واقعہ سے بے خبر ہے، گڑگڑانے لگا، خود ان ہی کا بیان ہے، جن سے وہ کہہ رہا تھا کہ

"دیکھئے اس بڑے کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل اپنے آپ کو نہیں پاتا"،

بار بار اسی فقرے کو وہ دہراتے جاتے تھے، "امانت میں خیانت ہوگی، اگر وقت سے پہلے تم کو میں آگاہ کردوں" یہی جواب ان کو ملتا رہا۔ جب تقاضا حد سے زیادہ گذر گیا، تب امین نے یہ بات کہہ کر کہا کہ یہی ایک ذریعہ اُن کے خاموش کرنے کا ہو سکتا تھا بولے:-

"خوب میں سمجھتا ہوں اپنے دل کی آرزو کو اس طریقہ سے تم میرے آگے پیش کر رہے ہو"،

چاہتے ہو، کہ تمہارے لئے مین کوشش کرون، تم پر حکمرانی کے شوق کی حرص سوار ہے"
یہ ایسا سخت اور کارگر حملہ تھا کہ منہ لٹکا کر بیچارے چلے گئے، قدرت نے فیصلہ کر دیا، ارباب بست وکشاد
جمع ہوئے، لفافہ کھولا گیا، اور بادشاہی کے لئے جو چنا گیا تھا، اس کے نام کا اعلان کر دیا گیا، جن کے سپرد
یہ امانت ہوئی تھی، ان ہی کا بیان ہے،

"مین نے اپنے دونون ہاتھون سے اس شخص کے بازو کو پکڑا، اور اٹھا کر بزور اس منبر
پر لیجا کر بٹھا دیا، جس پر انتخاب کے بعد حکمران کو کھڑے ہو کر خطبہ دینا پڑتا ہے"،

وہی کہتے ہین مین اُن کو منبر کی طرف لئے چلا جا رہا تھا، اور ان کی زبان پر بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ
وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ جاری تھا، اور یہ کہہ رہے تھے کہ مین جس چیز کو نہین چاہتا تھا، وہی زبردستی میرے
سامنے آئی، بادشاہی کا اعلان ہو گیا، تخت نشینی کہیے یا منبر نشینی کی تقریب ختم ہو گئی[1]،

گھوڑے ہین، خچر ہین، طرح طرح کی سواریان قطار در قطار سامنے ہین، ہر گھوڑے اور خچر کی لگام
ایک سائیس کے ہاتھ مین ہے،

ان ہی سوارون مین مرحوم سابق حکمران کا شاہی گھوڑا بھی اپنی کامل زیب و آرایش کے ساتھ

---

[1] **معارف** حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف انتخاب سے پہلے اپنی نامزدگی کی مخالفت پر بس نہین کیا
بلکہ چونکہ آپ کا انتخاب شوریٰ سے نہین ہوا تھا، اس لئے انتخاب و بیعت کے بعد مجمع عام مین دست برداری
ظاہر کی، اور مسلمانون کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی، لوگو میری خواہش اور عام مسلمانون کے مشورہ کے بغیر
مجھکو خلافت کی ذمہ داری مین مبتلا کیا گیا ہے، اس لئے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن مین ہے، مین خود اسے
اتار دیتا ہون، تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرو" یہ تقریر سن کر مجمع نے شور بلند کیا کہ ہم سب نے آپ کو خلیفہ
بنایا ہے، اور آپ کی خلافت سے راضی ہین، جب آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف
نہین ہے، اس وقت اس منصب کو قبول فرمایا (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۱۰۸)

سامنے لاکر کھڑا کیا گیا اور کہا گیا سوار ہو جایئے انھوں نے گردن جھکائی، اور منجملہ شہپار، اشہب رنگ کا خچر جس پر ہمیشہ سوار ہوتے تھے، حکم دیا کہ سب کو لیجاؤ، اور اسی خچر کو میرے آگے لاؤ چنانچہ وہ لایا گیا، آپ سوار ہو کر چل پڑے، جلوس کی شاہانہ سواریاں واپس ہو گئیں، جا رہے تھے، سامنے دار الخلافت کا قصر رفیع تھا، مگر اپنے خچر کا سوار آگے بڑھا جا رہا تھا، عرض کیا گیا کہ بادشاہ کا محل یہ ہے فرمایا اس میں مرحوم کے بچے اور اہل وعیال ابھی ہیں، میرے لئے تو میرا فسطاط (خیمہ) ہی کافی ہے، یہ فرماتے ہوئے حکم دیا گیا، کہ مرحوم کے لوگون کے لئے پہلے مکان کا نظم کر لیا جائے، تب حکومت کے کامون کی نگرانی کے لئے مین حکومت کے اس مکان مین آؤن گا، یہ بھی کیا گیا،

شاہی توشک خانہ سے غالیچون، قالینون، گدون، شطرنجیون، مسندون کا ایک انبار اسی پرانے گھر یا خیمہ مین بھیج دیا گیا، یہ کیا ہے شاہی فراش خانہ کا سامان ہے، جواب دیا گیا، سب کو واپس لیجاؤ، صرف آرمینیہ کا بنا ہوا ایک نمدہ اس سے نکال لیا گیا، زمین پر خود ہی اسے بچھا کر بیٹھ گئے، حکومت کے کام کو اسی پر بیٹھ کر اگر انجام نہ دیتا، تو مین تجھ پہ ہرگز نہ بیٹھتا" یہ فقرہ آرمینیہ کے اسی نمدے کو خطاب کرکے کہا گیا،

فرمان پر فرمان حکم پر حکم جاری ہونے لگا "غیر قانونی ذریعہ سے جس کے پاس جو چیزین بھی پہنچی ہین، ایک ایک کرکے واپس کر دی جائین، خواہ وہ کوئی ہو اور خود فیصلہ کیا کہ

"سب سے پہلے اس کام کو چاہئے کہ مین خود اپنی ذات سے شروع کردن"

کوڑی کوڑی کا حساب کیا گیا، قانون نے جنکی واپسی کا حکم دیا، وہ واپس کر دی گئین، جن مین بعض غیر معمولی پتھر کے نگینے بھی تھے،

ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر ضلع مین انتظام کیا گیا یعنی غیر قانونی ذرائع سے جن کے پاس جو کچھ ہو اس کو حقدارون تک پہونچایا جائے، اس کا خاص دفتر کھولا گیا، صوبہ کے مقامی خزانے کی رقم اگر کافی نہین

ہوتی تھی، تو مرکزی خزانہ سے روپیہ بھیجا جاتا تھا، اور یوں حقداروں تک اُن کے حقوق پہنچا دیئے گئے

طے کیا گیا کہ حکومت کی چیزوں کے استعمال کا حق صرف اسی وقت تک ہے جب تک کہ حکومت کا کام انجام دیا جائے، اس قسم کے عملی نمونوں کو پیش کرکے حکام اور عہدہ داروں پر اپنا منشا واضح کیا جاتا تھا، مثلاً حکومت کا کام رات کو جب کرتے تو حکومت کی شمع استعمال ہوتی، مگر اسی وقت کسی ذاتی ضرورت کے لئے کچھ لکھتے، تو وہ ہٹا دی جاتی، اور ذاتی ملوکہ شمعدان کی روشنی سامنے لاکر رکھدی جاتی

شاہی خزانے سے مشک کا ذخیرہ برآمد ہوا، دیکھا گیا کہ ناک کو انگلیوں سے بند کئے ہوئے ہیں، کہنے والے نے کہا اگر خوشبو ناک میں آگئی، تو یہ مشک میں تو تصرف نہ ہوا، فرمایا بجز خوشبو کے مشک میں اور ہوتا ہی کیا ہے،

عوام کے لئے حکومت کی طرف سے سردیوں کے موسم میں گرم پانی کا انتظام غسل اور وضو کے لئے کیا جاتا تھا، ابتدا میں دو ایک مہینے تک وہی پانی آپکے لئے استعمال میں بھی آیا، بعد کو معلوم ہوا، کہ حکومت کے خرچ سے پانی گرم کیا جاتا ہے تو حساب کرکے اتنی لکڑیاں حکومت کے ذخیرے میں جمع کرا دی گئیں،

معذوروں، مسکینوں، مسافروں کے لئے شاہی مہمان خانے سے کھانا کھلانے کا نظم کیا گیا تھا، اسی باورچی خانہ سے دہی کا ایک پیالہ آپ کی بیوی صاحبہ کے لئے لونڈی مانگ کرلئے جا رہی تھی، پوچھا کیا ہے؟ لونڈی نے عرض کیا آپ جانتے ہیں، کہ بیوی صاحبہ حاملہ ہیں، دہی کی خواہش ان کو ہوئی وقت پر کہیں نہیں ملا، لونڈی نے یہ بھی کہا، مشہور ہے کہ حاملہ عورت کی خواہش اگر نہ پوری کیجائے تو کہا جاتا ہے کہ بچہ ساقط ہو جاتا ہے، اسی لئے مہمان خانے سے دہی مانگ کرلے جا رہی ہوں، لونڈی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا، اور گھر پہنچ کر کہتے ہوئے کہہ رہے تھے "اگر غربا اور فقرا ہی کے کھانے سے بچہ پیٹ میں ٹھہر سکتا ہے، تو خدا تیرے پیٹ کے بچہ کو گرا دے"

ادھر ہی کا پیالہ واپس کر دیا گیا،

اس معاملہ میں حکام کا شعور اس حد تک بیدار ہو چکا تھا کہ ایک بڑے محکمہ کے ذمہ دار افسر کا بیان ہے کہ حسب دستور میں کاغذات پیش کر رہا تھا، اب ایک بالشت تھا، یا چار انگل کے برابر سادہ کاغذ تھا، میں نے دیکھا کہ اس سادہ کاغذ کو اپنی ذاتی ضرورت میں انھوں نے استعمال کیا، چونکہ یہ پہلا واقعہ تھا، جو اس افسر کے سامنے گذرا تھا، دل میں خیال آیا آج غفلت کا شکار یہ شخص بھی ہوا، مگر دوسرے دن وہی کہتے ہیں کہ خلاف دستور کاغذات جو دیکھے ہوئے تھے، ان کے بستے کو واپس منگایا میں نے بھیج دیا، واپسی کے بعد جب اپنے بستے کو کھولا تو دیکھا کہ سادہ کاغذ کا ایک ٹکڑا جو اسی کاغذ کے برابر تھا، بستے میں دوسرے کاغذوں کے ساتھ لپٹا ہوا رکھا ہے "غفلت کا شکار ہوا" اپنے اس خیال میں ان کو ترمیم بھی کرنی پڑی، اور حکمران کی نظر ان معاملات میں کتنی کڑی اور سخت ہے، اس کا بھی تجربہ ہوا،

خیر یہ تو ان کے ذاتی قصے ہیں، دیکھنے کی بات حکمرانی کے وہ خاص طریقے ہیں، جو انھوں نے اختیار کئے تھے، سب سے پہلی چیز تو وہی ہے کہ خود اپنے آپ کو انتخاب کے لئے پیش نہیں کیا، بلکہ آپ سُن چکے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوشش کی نوعیت اس طریقہ کار کے بالکل برعکس تھی، جسے آج انتخابی قصوں میں لوگ اختیار کر رہے ہیں" در مدح خود قصیدہ گفتن" جس کا دوسرا ترجمہ مینی فسٹو کیا جا سکتا ہے، اور نوبت کا دن نہ سہی لیکن چاندی اور سونے کے دباؤ سے رائے عامہ کو دبانے اور ضمیر واحساس کے خلاف اپنے مطابق بنانے میں کرنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، سب کے سامنے ہے آخر کیا فرق ہے چنگیز و تیمور کی آہنی تلوار اور انتخابی ارکان کے نقرئی و طلائی گرزوں میں یقیناً روح کے لحاظ سے دونوں کے جرم کی نوعیت ایک ہی ہے، صرف بیرونی قالب بدلا ہوا ہے؛

دوسری بات اس سلسلہ کی وہ ہے کہ عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کی چند ایسی ممتاز و نمایاں ہستیوں کا انتخاب کیا، جن کی سیرت و کردار کی استواری، علم و فہم کی گہرائی پر اس عہد کی عام مخلوق کامل اعتماد رکھتی تھی، یہ دس آدمیوں کی مجلس شوریٰ تھی، ارکان

کو سامنے بٹھا کر حکمران کی طرف سے یہ عہدنامہ پیش ہوا کہ

"مین آپ لوگون مین سے ہر ایک کی یا جو مجلس شوری مین حاضر رہین گے، ان کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہین کرون گا"

اور حکومت کے پورے دور مین اس عہدنامہ کی پابندی کی گئی،

ملک کافی وسیع تھا، انتظام کے لئے جتنے آدمیون کی بھی ضرورت ہوتی ہوگی، اس کا خود اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی مجلس شوری کے ایک رکن نے بڑی اچھی بات اس وقت کہی، جب بھروسے کے قابل کارآمد آدمیون کے مہیا کرنے کا سوال انھون نے پیش کیا، مجلس شوری کے رکن نے کہا،

"آپ اس کی زیادہ پروا نہ کرین، آپ کی حیثیت تو گویا بازار کی ہے، ہر بازار مین جس چیز کی طلب ہوتی ہے، رسد بھی اسی طلب کے مطابق ہوتی ہے، آپکے بازار مین جس چیز کی مانگ ہے، قدرۃً وہی آپ کے ہان آئے گی"

. . . .

مگر اس بازار کے لوگون کو جب مفصلات مین بھیجتے، تو وہان کی عام پبلک کے نام حکمران اپنا ایک خریطہ بھی بھیجتا تھا، جس مین لکھا ہوتا کہ

"مین جنھین بھیج رہا ہون یہ تو نہین کہتا کہ وہ تم مین سب سے بہتر ہین، مگر اتنی بات کہہ سکتا ہون، کہ تم مین جو بڑے لوگ ہین، اُن سے شاید یہ اچھے ہون"

سب سے زیادہ توجہ اپنے وُلاۃ اور حکام کو اس مسئلہ کی طرف دلاتے تھے کہ رعایا پر محصولون کا جو بار ہے، حتی الوسع اس بار کو ممکنہ حد تک کم کرنے کی کوشش کیجائے، عموماً محصولون کی وہ قسم جسے اس زمانہ مین مکس اور آج کل ٹیکس کہتے ہین، ان کا اور ان کی مختلف قسمون کا فرامین مین ذکر کرکے لکھا کرتے، ۔۔

"یہ ٹکس نہین بلکہ نجس ہے" اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مین ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین (اور نہ کم کرو لوگون کی چیزون مین، اور بگاڑ پیدا کرنے والے ان مفسدین مین نہ ہو جنھون نے زمین مین سر اٹھا رکھا ہے)

ایک دفعہ شکایت پیش ہوئی کہ محصولون کی تخفیف کی وجہ سے آمدنی فلان علاقہ کی بہت کم ہو گئی ہے، فرمان والی کے نام گیا "مین نے ان محصولون کو نہین ساقط کیا، بلکہ خدا نے ساقط کیا ہے" دار السلطنت مین خبر پہنچی کہ ایک علاقہ مین حکام کا دستور ہے کہ پیدا وار کی قیمت بازار کے مطابق نہین، بلکہ منمانے طریقہ سے لگا کر رعایا سے خراج وصول کرتے ہین، اسی وقت حکومت نے اپنے دو معتبر نمایندے بھیجے، حکم دیا گیا کہ جس کسی سے جتنی مقدار بھی زائد وصول کی گئی ہو، فوراً واپس کر دی جائے"

اور گورنر کے لئے حکم تھا "ان دونون کے کام مین تمھاری طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ اگر ڈالی گئی تو یاد رکھو کہ تمھین جو بات ناگوار ہو گی، اسے اپنے سامنے پاؤ گے،

گھوڑون پر ڈاک آتی تھی، راستہ مین کسی مقام کی ڈاک کے گھوڑے بے کار ہو گئے، مقامی کسانون کو بطور بے گار کے حکام نے پکڑا، اور ان ہی پر ڈاک لاد کر دار السلطنت روانہ کر دی گئی اطلاع ہوئی، لکھا ہے کہ بے گار لینے والے پر پہلے تو چالیس کوڑے لگائے گئے، اور کہا کہ میری حکومت مین اور بے گار؟"

شاہی خزانے کے تین شعبے کر دیئے گئے، ایک شعبہ مین خراج اور مالگذاری کی عام آمدنی جمع ہوتی تھی، دوسرے مین فوجی فتوحات کی آمدنی کا پانچوان حصہ جسے خمس کہتے تھے، جمع ہوتا تھا، اور تیسرا مستقل شعبہ ملک کے حاجت مندون، غریبون، یتیمون، تاوان زدہ افراد، مسافرون وغیرہ کے لئے مختص تھا، صدقات و زکاۃ کی آمدنی اسی شعبہ مین جمع ہوتی تھی، دیکھا گیا تھا، دیکھنے والون کا چشم دیدبیان ہے یا ایسا نظم قائم کر دیا گیا کہ گذشتہ سال جو خود خیرات کا مستحق تھا، اس کے پاس اتنا سرمایہ اکٹھا

ہوگیا ہے کہ خود صدقہ ادا کر رہا ہے "

تجارت مین زراعت مین یا کسی اور کاروبار مین جو نقصان اٹھاتے تھے، یا مقروض ہو جاتے تھے، بیان کیا گیا ہے کہ ملک کے دور دراز گوشون سے اس قسم کے تاوان زدہ افراد آتے، اُن کے واقعہ کی تحقیق کی جاتی، جب ثابت ہو جاتا کہ واقعی تاوان کے وہ شکار ہوئے ہین، توصدقات کے شعبہ سے ان کی تلافی کر دی جاتی تھی، لکھا ہے کہ چار چار سو طلائی اشرفیان بسا اوقات کسی ایک ایک آدمی کو اس سلسلہ مین ملتی تھین، نہ صرف مرکزی خزانہ سے یہ امداد لوگون کو ملتی تھی بلکہ ہر ہر علاقہ کے مقامی خزانون مین یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، عام فرمان تمام ملک مین گشت کرا دیا گیا تھا کہ جس شخص پر کوئی ایسا بار ہو جس کے ادا کرنے کی قدرت نہین رکھتا، تو خزانے سے رقم اس کی طرف سے ادا کر دی جائے "

یہی نہین بلکہ اسی فرمان مین یہان تک لکھا پایا جاتا ہے کہ جو شادی کرے، اور مہر ادا کرنے کی صلاحیت نہین رکھتا، اس کو بھی مہر ادا کرنے کے لئے خزانے سے رقم عطا کیجائے،

سرکاری خزانے کی ان مدون سے استفادے کے لئے صرف یہ شرط تھی کہ وہ ملک کا باشندہ اور قانونی رعیت ہو، کسی نسل سے ہو، کسی فرقہ کا ہو کسی قسم کا مذہب رکھتا ہو، ہر ایک کیلئے دروازہ کھلا ہوا تھا، لکھا ہے کہ

"ایک ایک بطریق (عیسائی پادری) کو ہزار ہزار طلائی اشرفیان دی گیئن "

کم سے کم رعایا سے لیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ مقدار مین ان ہی سے لئے ہوئے مال کو انھی تک ایک خاص نظم کے تحت واپس کر دیا جائے، یہی ایک معاشی اصول جس پر یہ مثالی حکومت کار فرما نظر آتی ہے، اس سلسلے کے تفصیلات اگر تلاش کئے جائین، تو ان سے کافی مجلد ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے،

- مگر امکان اس کا سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی قاعدے سے پیدا ہوا تھا جس کا ذکر مین نے شروع ہی مین کیا تھا، یعنی حکومت کی آمدنی حکومت کی یا جن لوگون کی حکومت تھی ان کی آمدنی سمجھی جاتی تھی، نہ کہ ان لوگون کی جن کے سپرد حکومت کی باگ کردی جاتی ہے،

اسی مثالی حکمران کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خاندان مین پیدا ہوئے تھے، والد اُن کے ملک مصر کے گورنر تھے، انتخاب سے پہلے ان کی زندگی امیرانہ تھی، ایک ایک قمیص کا کپڑا چار چار درم کا استعمال کرتے تھے، کھانے پینے، رہنے سہنے، الغرض زندگی کے تمام شعبے مین ان ہی امیرانہ عادتون کے عادی تھے، لیکن حکومت کی ذمہ داری جب سر پڑ گئی، تو اسی شخص کے اس لباس کا جسے جمعہ کے دن پہن کر منبر پر آئے تھے، جب حساب کیا گیا تو بارہ درم (ڈھائی روپے) سے زیادہ پورے لباس کی قیمت نہ ٹھہری، لکھا ہے اس لباس مین عمامہ بھی تھا، اور قمیص بھی، قبا بھی، اور قرطق (کرتا) بھی، موزے بھی اور چادر بھی،

عمدہ کھانے کے عادی تھے، مگر حکومت کے بعد اس کا میسر ہونا دشوار ہوگیا، چنے اور مسور کی دال ہی پر کبھی قناعت کرنی پڑتی، پیٹ پھول جاتا، نفخ کی شکایت پیدا ہو جاتی، مگر صرف یہ فرما کر کہ

"اے پیٹ یہ تیرے گناہون کا جنازہ ہے،"

خاموش ہو جاتے،

ان کا غلام جنگلوں مین لکڑیان اور منگنیان تلاش کرتا پھرتا، کیونکہ بازار سے ایندھن خریدنے کی قیمت کبھی نہین ہوتی، ایک دن اسی غلام نے جو اپنے وقت کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کا غلام تھا، اسی نے ایک دن عرض کیا،

"آج ساری دنیا اچھے حال مین ہے بجز آپ کے اور میرے"

اور یہی روح ہے مثالی حکومت کی جس میں حکومت کی آخری اقتداری طاقت حکومتی آمدنی سے استفادے میں سب سے آخری ہستی سمجھی جاتی ہو،

یہ سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کی حکمرانی کا زمانہ خواہ جتنا بھی مختصر ہو، لیکن صدیوں قائم رہنے والی حکومتوں کے لئے ان کی "مثالی حکومت" پہلے بھی قابلِ رشک تھی، اور جب تک الدین یا انسان کی قانونی زندگی پر پولیس و فوج کی نگرانی کے ساتھ اللہ کی نگرانی کا یقین مسلط نہ ہوگا، ان کی یہ مثالی حکومت آیندہ بھی قابلِ رشک رہے گی، کیونکہ جب تک الدین للہ کے اصول کو مان کر خواص و عوام کو اس راہ پر نہیں لائیں گے، فتنہ کا ازالہ نہیں ہو سکتا،

گاندھی جی نے بھی حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حکومتوں کو مثالی حکومت قرار دیکر مطالبہ کیا تھا کہ اسی کو چاہیے کہ نمونہ بنایا جائے میرے خیال میں اسی کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام کا بھی اضافہ ہونا چاہیے،

تاریخِ یمن کی ایک سطر

عمرو بن عامر عرف مزیقیا کے عہد کا سیلِ عرم

از

مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

دسمبر ۴۹ء کے معارف مین کتبات حصن غراب کی فارسٹری قرأت پر مختصر تبصرہ کیا جا چکا ہے، آج ان مین سے ایک کی صحیح قرأت پیش کی جاتی ہے، اس کا چربہ یہ ہے،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ تین سطرین ہین، دوسری سطر پہلی سطر کے پانچوین حرف کی سیدھ سے شروع ہوتی ہے، تیسری سطر پہلی سطر کے پانچ نقوش کا اعادہ ہے، پادری صاحب نے اس سطر کو قرأت مین حذف کر دیا ہے، اور بار بار اسے دو سطری قرار دیا ہے، نقوش کو مصنوعی آوازین دیکر اسے پڑھا ہے۔

سرھ	تقسیم کیا حصون مین،
وشنر ر	اور داہین سے باین لکھا،
وزمنہ رنیہ سرش	اور نقطے لگائے اس ترانہ فتح مین

ذذذرعا	سرش اور ذذرعا نے
خزوقفص وسخمر	بید حا اور شکار کیا، اور سیاہ رو کیا،
عوص ابنوہ علک	عوص نے فرزندان عک کو

اس ترجمہ پر بحث کی ضرورت نہیں ہو، کیونکہ قرأت کے مصنف کو حق تھا کہ جو مطالب اس نے اپنی مصنوعی عبارت کو دیدیا، دوسرے قاریان مسند نے نقوش کی جو آوازین بتائی ہین، ان پر بحث کو ہم اس وقت ملتوی رکھین گے، ج ۲ ص ۴۰۲ و ص ۴۰۳ مین خود پادری صاحب نے نقوش کی آوازین دی ہین اُن کے مطابق انھین پڑھنا چاہئے تھا،

سادھر وشلدیر وذنوہر ابنوہر سرش ذذذریا

قذ وقفش وسخمر یو ذا ابنوہر اخ

ایک توراتی مورث (تکوین ۱۰: ۲۳، ۳۶، ۲۸) کی جستجو اور عک کو سیاہ رو کرنے کے شوق نے نو ... کو "عوص" اور "اخ" کو "عک" بنا دیا،

اس کتبہ مین کل ۳۰ نقوش ہین، مکررات کو حذف کرنے کے بعد جملہ تعداد ۲۰ رہ جاتی ہے، ان مین سے ۱۵ اور ۹ کو سین اور غین سمجھنے سے عبارت بامعنی ہو جاتی ہے، یہ دو نقوش مجھے قدما کے یہان نہین ملے، پادری صاحب نے ... حرف قرار دیکر آخر مین ان نقوش کو ع غ خیال کیا، اسی طرح ... بھی قدما کے یہان نہین ملا، اس نقش کو روسیڈجر نے شین اور سین اور الف نما نقش کو "الف" اور "واو" پڑھا ہے، اکثر قاریان مسند اس کو اختتام لفظ کی علامت قرار دیتے ہین، اس نقش کی آواز بحث طلب ہے لیکن یہ محل بحث کا نہین ہے، کیونکہ اس کی قرأت مین میں روسیڈجر اور دادرسٹر کا ہم نوا ہون، باقی نقوش کو قدما کی بتائی ہوئی آوازین دے کر پڑھیں تو تین مصرعے بن جائین گے،

صَیدٌ مَا شَذَ رَدُ ذُنُوبِل عَنا مَصَدٌ شُوذُ ذُ دغا قذ اقنشا

سَتِطَرَاذ رَھنُوم یَتْ صَیَن مَا

صید کو تتر بتر کر دیا، نو ل کے کیڑے نے جسے خارج کیا، بری بارش نے جو کہ بدخو کو بہالے گئی،

سزا کے طور پر صید کے ساتھ رہنوم بھی جلا وطن ہو گئے"،

صید ما کے آخر میں جو ما ہے، اس کی حقیقت ہمدانی کے اس بیان سے معلوم ہو گی، ریا ما اور ماذ نا

کو حمیری میں ریام اور ماذ نم بولتے ہیں، اسی طرح تلفم دراصل تلف تھا، اس کے آخر میں صا کا اضافہ ہوا پھر الف

حذف ہو گیا، اور تلفم بن گیا، اس بیان کے مطابق ما عربی مبین کی تنوین کا بدل ہے، اور صید ایک ہمدانی

قبیلہ کا نام ہو، دوذ شو اور ستطراذ کو دود، سوء اور استطرد کا قدیم تلفظ سمجھنا چاہئے نول سے

مراد یا تو نمل (چیونٹی) ہے یا نملہ ہے، حوض کے اندر بچے ہوئے پانی کو نملہ کہتے ہیں، اس لئے دوذ نول کے معنی یا

سے کیڑے کے بھی ہو سکتے ہیں، رھنوم کو عربی مبین میں راھنون سے بدل سکتے ہیں، یہ وہی لفظ ہے جس کے نقوش کو

جلی آذزین دے کر یادری صاحب نے ازبرم پڑھا ہے، اس لفظ نے اس کتبہ کو حل کرنے میں ہم کو بڑی مدد دی ہے

رھنوم سے مراد بنو ازد ہیں جن کا رئیس سیل عرم کے زمانہ میں عمرو بن عامر عرف مزیقیا تھا، اس کے مزیقیا کہلانے

کی اور بنو ازد کے رھنوم کہلانے کی وجہ آگے معلوم ہو گی، یت کو عبرانی ات (ہمراہ) سمجھنا چاہئے اور تفش کو عربی

لفظ تفس خیال کرنا چاہئے جس کا ایک مطلب ابراہیم الملاح نے جتا بتایا ہے،

یہ کتبہ ہم کو خبر دیتا ہے

۱- ایک زمانہ میں ایک نہایت بڑی بارش ہوئی،

۲- یہ بارش ذودغا (بدخو) کو بہالے گئی،

۳- یہ خدا کی طرف سے بدخوئی کی سزا تھی،

۴- قبل اس کے کہ وہ بارش آئے ایک "دوذ نول" کے خروج سے اس کا اندازہ ہو گیا،

۵- بنو صید اور اس کے ساتھ رھنوم نے جلا وطنی اختیار کی،

۲- اور یہ لوگ مختلف دیار مین تتر بتر ہو گئے،

یہ قصہ سیل عرم کے اس قصہ سے ملتا جلتا ہے جو سورۂ سبا مین مذکور ہے، قرآن کا بیان یہ ہے کہ قوم سبا کے ایک شہر پر وہان والون کی ناشکری کے سبب بطور سزا کے خدا نے سیل عرم بھیجا، یہان والے اپنے شہر سے نکلے، اُن کے درمیان اور برکت والی سرزمین کے درمیان چند زبردست آبادیان حائل تھین، ان آبادیون مین چند دن اور چند راتین اُن کے لئے سیر کرنا مقدر تھا، حکم تھا کہ ان بستیون مین چند روز بے خوفی کے ساتھ بسر کر لو، پھر اپنے شہر کو چلے جانا، مگر ان لوگون نے اپنی صرابدید کو خدا کی مصلحت سے زیادہ قیمتی سمجھا، اُنہون نے دعا کی کہ اے خدا ہماری سفرون مین درازی پیدا کر دے، ان کی یہ دعا قبول ہوئی، اور ان کو اس طرح پرزے پرزے کر کے بکھیر دیا گیا کہ اب وہ لوگ محض باتین ہی باتین ہو کے رہ گئے ہین، یہ مضمون سورۂ سبا کی آیتون کا ہے، اس وقت ہم کو ان آیتون کی تفسیر کرنی منظور نہین ہے، صرف کتبہ کی تشریح مقصود ہے، قرآنی قصہ کا تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا تاکہ اس کتبہ کی اہمیت کا اندازہ ہو،

اس کتبہ مین جس واقعہ کا تذکرہ ہے اس کی بابت عرب مین یہ کہانی مشہور تھی کہ جبل مارب اور جبل ابلق کے درمیان زمانہ قدیم مین سبا نے ایک باندھ بنایا تھا جس مین کئی برساتی نہرون کا پانی آکر جمع ہوتا تھا، وادی حضرموت کا سیلاب بھی اس مین آکر گرتا تھا،

مارب مین ایک بادشاہ تھا، عمران بن عامر، وہ وعاۃ سلیمانؑ مین سے تھا، اُس نے مرتے وقت اپنے بھائی عمرو بن عامر عرف مزیقیا کو بلا کر کہا کہ عنقریب یہ باندھ ٹوٹ جانیوالا ہے اور اہل مارب تتر بتر ہو جانے والے ہین اور وصیت کی کہ اس آفت سے بچنے کے لئے ظریفہ کاہنہ سے رائے لیکر اس پر عمل کرنا، عمران کے مرنے کے بعد مزیقیا نے ظریفہ سے شادی کر لی،

ایک روز ظریفہ نے دیکھا کہ ایک کچھوا پانی مین سے کودا، پیٹھ کے بل زمین پر گرا، بڑی کوشش کے بعد کافی دیر کے بعد سیدھا ہو گیا اور دوبارہ پانی مین کود گیا، یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور آنے والی آفت کی خبر مزیقیا کو دی، اس کے

بعد خود مزیقیانے

ورای جرذا یحث برجلیه وبقلب	ایک چوہا دیکھا جو اپنے دونوں پاؤں سے زمین
الصخر بیدیه التی لا یقلبها	کریدتا تھا، اور اپنے ہاتھوں سے وہ ان بند کو حرکت
اربعون رجلا (تیجان ص ۲۶۷)	دے رہا تھا جس کو ۴۰ مرد مل کر حرکت دے سکتے تھے

عمرو بن عامر نے اس کی خبر ظریفہ کو دی تو اُس نے کہا،

اذا اظهر الجرذ الحفار فاستبدل	جب زمین کریدنے والا جانور نمودار ہو گیا تو
دارا من دار وجارا من جار فعندها	اب اپنا وطن اور پڑوس بدل دو کیونکہ مصیبت
تنزل الاقدار	آنے والی ہے۔ (تیجان ص ۲۶۷)

ظریفہ کی اس رائے کو مان کے کر مزیقیا اور اس کے لوگوں نے مارب کو چھوڑ کر دوسرے دیار میں چلے جانے کا فیصلہ کیا، اور اپنی تمام املاک دوسروں کے ہاتھ فروخت کرکے اور تمام بنو ازد کو ساتھ لے کر مارب سے چل پڑا، اور دیار عک میں پہنچا، تو اس نے وفات پائی، اس جگہ مختلف اشخاص کی قیادت میں اس کے ہمراہی متفرق دیار میں منتشر ہو گئے،

زیر بحث کتبہ میں رہنوم یعنی جائداد رہن کرنے والے ان ہی ازد کو کہا گیا ہے، عربی روایات کے مطابق انھوں نے اپنی املاک کو فروخت کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہو کہ رہن کیا تھا، اس لئے رہنوم کہلائے۔

زیر بحث کتبہ کے مطابق سیلاب کا تیل از وقت علم "دُوذ نوحل" کی وجہ سے ہو گیا تھا، جسے "سد شر" یعنی بڑی بارش نے خارج کیا تھا نوحل کو اگر ہم نمل سمجھیں تو حقیقت یہ تھی کہ بارش کا اندازہ پا کر چیونٹیاں بکثرت اپنی بلوں سے نکل کر بلند مقامات پر چڑھنے لگیں، اور لوگوں نے فیصلہ کیا کہ زور کا سیلاب آنے والا ہے لیکن نملہ حوض کے اندر بچے ہوئے پانی کو بھی کہتے ہیں، اس لئے "دُوذ نوحل" کے معنی ہوئے "آبی کیڑا" یہی مفہوم عربی کہانی کے لحفاة اور جرذ حفار کی اصل ہو۔

کتبہ کے مطابق سیدھا سادہ واقعہ یہ تھا کہ ایک آبی کیڑا یا چیونٹیون کا گروہ نہایت بری بارش کا اندازہ پاکر پانی سے یا بلون سے باہر نکل پڑا، اور اس کا خروج سابق تجربہ یا پیشین گوئی کے مطابق آنے والی آفت کا قدرتی اعلان تھا مگر زبانی روایت کے اعجاز نے اسے ایسا جرذ چوہا (بنا دیا)، جو اپنے دونون ہاتھون سے پتھر کے اس دربند کو حرکت دے رہا تھا، جسے ۵۰ مرد مل کر ہلا نہین سکتے تھے۔

اس کتبہ کے دائین حاشیہ پر [illegible] مکتوب ہے، جسے شط پڑھا جا سکتا ہے، اس کا مطلب ہے ۳۰۹ حمیری مطابق ۱۹۴ء یہ ہے صید ما اور رہنوم کے استطراد و تمزق کا پہلا سال، عمرو بن عامر عرف مزیقیا اس سال مارب سے روانہ ہوا، اس کی نسل کی ایک شاخ شمال کی طرف روانہ ہوئی، کچھ لوگ مکہ مین رہ گئے، اور بنو خزاعہ کہلائے، کچھ لوگ مدینہ مین مقیم ہوئے، اور ان کا اسلامی نام انصار ہے، ممکن ہے یہ انہی Amoarite کی نسل سے ہون جن کا ذکر رومی مورخون نے آلوس جالوس کے حملہ یمن کے تذکرہ مین کیا ہے، کچھ لوگ ملک شام مین جا بسے، اور غسان کہلائے، یہان پہنچ کر انھون نے اپنی ایک حکومت قائم کی، عربی روایت کے مطابق غسان کا اولین فرمانروا عمرو بن جفنہ بن عمرو بن عامر تھا، صاحب تیجان کے بیان کے مطابق عمرو بن جفنہ نے دقیوس (Decius قیصر ۲۴۹ء تا ۲۵۱ء) کے زمانہ مین وہان حکومت قائم کی جسے دقیوس نے کسی قدر جنگ و مقابلہ کے بعد تسلیم کر لیا، عمرو بن عامر کے خروج سے لیکر عمرو بن جفنہ کے والی بننے تک جملہ ۵۰ برس گذرے، اور یہ خلاف قیاس نہین ہے،

عمرو بن عامر کی قوم مارب مین رہتی تھی، صید ما کا وطن اس کتبہ کے شہر حضر موت کو ہونا چاہئے، مارب کے بند کو جس سیلاب نے توڑا تھا اس کا سبب یہی معدشو تھا جس کا سیلاب حضر موت کی وادیون سے سد عرم مین پہنچا تھا،

پادری فارسٹر نقوش کی صحیح آوازون سے نا واقف تھے لیکن چونکہ اس کتبہ سے ایک عربی داستان کی اصلیت معلوم ہوتی ہے جس کا تعلق ایک قرآنی قصہ سے ہے، اس لئے انھون نے اس کی تحریف کو ضروری سمجھا، اور اسی کی تحریف کے لئے تمام کتبات کی تحریف کی، ہژدہ سطری کتبہ مین ایک لفظ سنکر دیکھ کر جیسا کہ خود معترف ہین، ان کو انتہائی رنج ہوا تھا کہ اس سے تو قرآن کی تصدیق ہوتی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیل عرم کے قصہ کی تصدیق

سے ان کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا،

سیل عرم کے وقت مارب کے فرمانروا کو مزیقیا کیا جاتا تھا، عربی کہانی نے اس کی وجہ تسمیہ یہ تجویز کی ہے کہ وہ اپنے کپڑے جب بھی اتارتا تھا تو پھاڑ ہی دیا کرتا تھا لیکن اس لفظ کو مزلق (پاش پاش کیا ہو) یا (خداوند کا) پڑھو پھر قرآن میں غور کرو سبا کی بابت کہا گیا ہے، مزقناہم کل ممزق، اس کتبہ میں تمزق کی حقیقت شندا ور استطراد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں، قرآن کے اندر مذکور سیل عرم کا زمانہ یقینی طور پر عمرو بن حفنہ کے زمانہ سنہ ۲۵۰ء سے نصف صدی قبل گذرا لیکن الکلیل کے مصحح الاب انستاس ماری لکرملی البغدادی فرماتے ہیں،

"آج علماء پر واضح ہو گیا ہے کہ سیل عرم کا انشقاق و انہدام سنہ ۵۴۲ء اور سنہ ۵۷۰ء کے درمیان ہوا اس سے قبل نہیں جیسا کہ بعض علماء عرب اور بصرائے غرب کا وہم ہے جسے مزید تشفی کی ضرورت ہو وہ مجلہ الاسلام میں مارب کو پڑھے، (حاشیہ الکلیل ص ۲۶۳/۸)

عربیا بیفور محمد کے مولف ڈے لیسی اولیری (De Lacy oleary) نے اس کا زمانہ سنہ ۵۴۲ء اور سنہ ۵۷۰ء تام فرض کیا ہے سیلاب یمن میں بارہا آیا، متعدد قدیم تحریروں کے تذکرہ میں سیلاب کا ذکر ملتا ہے، سنہ ۴۴۷ء اور ۴۵۰ء کے درمیان بھی سیلاب آیا، اور سد عرم ٹوٹتا رہا، اس کی مرمت ہوئی، مگر قرآن مجید میں جس سیلاب کا ذکر ہے وہ اس سے قدیم زمانہ کا واقعہ ہے کہ خدا نے فرمایا،

وجعلناھم احادیث ہم نے ان کو باتیں ہی باتیں بنا دیا،

جس قوم پر یہ حادثہ گذرا جو قوم تتر بتر ہو کر اپنی قومی ہستی کھو بیٹھی اور سبا کی بجائے مزیقیا ہو گئی، اسی قوم کے اس بیان پر کہ سیل عرم عمرو بن حفنہ (سنہ ۲۵۰ء) کے دادا عمرو بن عامر کے زمانہ میں آیا تھا، اس قوم کی متواتر روایت کو محض اتنی سی بات پر جھٹلا دینا کہ عرب کے سیلاب کا ذکر سنہ ۵۴۲ء اور سنہ ۵۷۰ء کے درمیان بھی ملتا ہے، تکذیب روایت کے شوق اور نئی بات کہنے کے اشتیاق سے بہتر کسی اور بات کا ثبوت نہیں ہے قرآن میں یقینی طور پر عمرو بن حفنہ کے دادا مزیقیا کے زمانہ والے سیلاب کا ذکر ہے،

موسیٰ جاراللہؒ کی بعض تصانیف

از

جناب مولانا عبدالمجید صاحب حریری قنصل جمہوریہ ہند برائے اسنودی عرب

"ہمارے فاضل اور محترم دوست مولانا عبدالمجید صاحب حریری ان علم دوست اصحاب مین ہین جن کے تعلقات ہندوستان و بیرون ہند کے بہت سے علماء و مشاہیر سے ہین، اور بنارس مین ان کا دولت کدہ اصحابِ علم و کمال کا مستقل مہمان خانہ رہتا ہے، مشہور روسی عالم موسیٰ جاراللہ سے بھی اُن کے خاص روابط تھے، اور وہ بنارس مین کئی سال تک اُن کے مہمان رہے، جنوری کے معارف مین مرحوم موسیٰ جاراللہ کی وفات پر جو شذرہ لکھا گیا تھا، اس مین ان کے شغل تصنیف کا بھی اجمالی ذکر تھا، اس سلسلہ مین مولانا حریری نے بعض مفید معلومات لکھ بھیجے ہین، ان کو گذشتہ شذرات کے تتمہ کے طور پر شائع کیا جاتا ہے"

"م"

حضرت الاستاذ الامام نے میرے یہان بیٹھکر جو رسالے ترتیب دیئے وہ بھوپال سے شائع ہونے لگی سب سے بڑی دو کتابین ہین جن کے مسودے وہ صاف کرا چکے تھے، اور اُنہی کی اشاعت کی آرزو اُن کو تڑپا رہی گئی، مگر جب جمہوریہ ترکیہ نے ان مولفات کی اشاعت کی اجازت بہ خط عربی ان کو نہین دی تب وہ شکستہ خاطر ہو کر واپس آئے، صحت تباہ ہو چکی تھی، اختلال حواس کے آثار بھی نمایان ہو چکے تھے، وہان بھی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور انھون نے جوارِ رحمتِ الٰہی مین پناہ لی، یہ دو کتابین یہ تھین،

۱- تاریخ مصاحف الامصار: اس میں انھوں نے رسم مصاحف اور اسکی تاریخ پر ایک بڑی سیر حاصل بحث کی تھی، اور جامعۂ فواد اول مصر کے ایک مسیحی پروفیسر ولیم آرتھر جیفرے کی اُس خطرناک تالیف کی دسیسہ کاریوں سے پردہ اٹھایا تھا، جس میں اُس نے تاریخ تدوین و کتابتِ مصحف سے متعلق تمام شواذ قرأت و روایات کو جمع کرکے یہ ثابت کرنے کی نامراد کوشش کی تھی، کہ معاذ اللہ متن قرآن بھی دوسری کتبِ سماویہ کے متون کی طرح محفوظ نہیں رہا۔

۲- دوسری کتاب جس کی اہمیت پر وہ بہت زور دیا کرتے تھے، اور جس کی تالیف پر انھوں نے اپنی عمرِ گران مایہ کے پورے بیس سال صرف کئے تھے، وہ القانون المدنی للاسلام ہے، اس کا مسودہ روس کی اکادمیہ میں اب بھی محفوظ ہے، اُن کی بڑی خواہش تھی کہ ترکیہ یا کوئی اور اسلامی حکومت اس مسودہ کو اکادمیہ سے حاصل کرکے چھپوا دے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میرے مکرم دوست ڈاکٹر عبد الوہاب بے عزام سفیر مصر جو پچھلے ہفتہ قاہرہ واپس تشریف لے گئے ہیں، وہ کوشش کریں گے کہ شیخ کی بقیہ تالیفات کے مسودے شیخ کے مصری دوستوں سے حاصل کریں، اور اُن کی اشاعت کی کوئی سبیل نکالیں، دیکھئے کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں،

حضرۃ الاستاذ الامام رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کی تعداد ستّو سے زائد ہے، کچھ عربی میں ہیں، شرح بلوغ المرام، شرح طیب النشر فی القرأت العشر، شرح شاطبیہ، بقیہ ترکی زبان میں، ان میں پندرہ بیس کتابیں میرے پاس موجود ہیں،

باب التقریظ والانتقاد

جہانِ نو[1]

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

مغربی قوموں کی ترقی کی نقل و تقلید میں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لئے مذہب کے نام سے قرآن و حدیث کی خالص مادی تفسیر و تاویل اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی بدعت سب سے پہلے صاحب تذکرہ نے جاری کی اور اب اس کی تقلید شروع ہو گئی ہے، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی قبیل کی ہے، گو مصنف کے نقطۂ نظر کے مطابق اسکا مقصد مسلمانوں کی مذہبی و اخلاقی اصلاح اور دنیاوی ترقی کی ترغیب دونوں ہے، لیکن اس کا طریقہ وہی ہے جو عنایت اللہ مشرقی نے تذکرہ میں اختیار کیا ہے، اور یہ کتاب اپنے خیالات کے اعتبار سے اس کا چھوٹا اڈیشن معلوم ہوتی ہے، یعنی نام تو مذہب کا لیا گیا ہے، اور اپنے خیالات کی تائید میں قرآن و حدیث، اسوۂ صحابہ اور تاریخ اسلام کے واقعات سے استدلال کیا گیا ہے، لیکن یا مصنف کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہے، یا انھوں نے عمداً تلبیس، مغالطہ اور غلط استنباط نتائج سے کام لیا ہے، مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی ضرورت سے انکار نہیں، ان کی دینی اصلاح کیساتھ ان کی دنیا سنوارنے کی کوشش بھی مستحسن و محمود ہے، اور اس کی تعلیم خود اسلام میں موجود ہے، اس کے لئے قرآن و حدیث کی غلط تاویل اور تاریخ اسلام کو بگاڑنے، علماء و مجتہدین بلکہ کارنامون

[1] مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۱ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عا پتہ کتاب منزل لاہور

* پر خط نسخ پھیرنے اور ان کے استخفاف کی ضرورت نہیں ، جس سے اس کتاب کا صفحہ صفحہ لبریز ہے، افسوس ہے کہ اس مختصر ریویو میں اس پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجایش نہیں ہے، اس کے لئے اتنے ہی حجم کے کتاب کی ضرورت ہوگی، اس لئے صرف اس کی کچھ مثالین نمونۃً پیش کی جاتی ہین، ان سے کتاب کی نوعیت اور مصنف کے کمالات کا اجمالی اندازہ ہو جائے گا،

یہ ہر مسلمان بلکہ تعلیم یافتہ غیر مسلمون کو بھی معلوم ہے کہ قرآن مجید ہدایت و رہنمائی کا صحیفہ ہے، رسمی علم و فن کی کتاب نہین، اس کے باوجود مصنف کو اس کی ان آیتون مین جن مین کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے محض سائنس کی تحصیل کی ترغیب اور سائنٹفک تحقیقات کی تعلیم نظر آتی ہے، چنانچہ فرماتے ہین "جسے قرآن مجید نے ۲۰۰ مرتبہ بیان فرمایا، (یعنی کائنات پر غور و فکر کی آیات) اور جس سے ہمارے مقتدا و مولانا قطعاً نا آشنا ہین یہی وجہ ہے کہ وہ وعظ مین داڑھی کی لمبائی چوڑائی اور اس قسم کے باقی مسائل پر پورا زور صرف کرتے ہین، لیکن کوئلہ فولاد اور پٹرول کا نام تک نہین لیتے، (ص ۲۵) گویا کلام اللہ کا مقصد کوئلہ فولاد اور پٹرول نکالنے کی تعلیم دینا تھا، ہمارے فاضل محقق قرآنی آیات سے استدلال اور علماء پر طعن و طنز کے بغیر بھی مسلمانون کو اس کی ضرورت کی جانب توجہ دلا سکتے تھے، کیا وہ بتا سکتے ہین کہ انھون نے خود اپنی سائنٹفک تحقیقات سے مسلمانون کو کیا فائدہ پہنچایا، یا وہ محض داڑھی کی صفائی ہی مین لگے رہے، انھون نے جن آیات سے کوئلہ فولاد اور پٹرول نکالنے کے احکام کا استدلال کیا ہے وہ ملاحظہ ہون، اس سے ان کی قرآن فہمی کا اندازہ ہوگا وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس مین چونکہ لوہا پیدا کرنے کا ذکر ہے اس سے لوہا نکالنا مسلمانون کا فرض ہوگیا کوئلہ کی کان کنی کی فرضیت اس آیت سے ثابت کی ہے

الذی جعل لکم من الشجر الاخضر	اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لئے سبز درختون سے
ناراً فاذا انتم منہ توقدون ،	آگ کا سامان کیا جس سے تم آگ جلاتے ہو

اس کی شرح مین فرماتے ہین "پٹرول کوئلہ کا پسینہ ہے، کوئلہ سبز درختون سے تیار ہوتا ہے جو آج سے کئی لاکھ برس پہلے زلزلہ کی وجہ سے زمین مین دب گئے تھے، (ص ۲۰) اس لئے کوئلہ اور پٹرول نکالنے کا حکم بھی قرآن

ثابت ہو گیا، اس میں شبہ نہیں، کہ قرآن مجید سے کائنات کے بہت سے عجائبات کا پتہ چلتا ہے اور
ابھی سائنس کا تخیل نہیں پہنچا ہے، اس کے اشارات بھی موجود ہیں لیکن ان کا ذکر قدرتِ خداوندی
بوت کے سلسلہ میں ہے، اور ان کا اولین مقصد خالق کائنات کی عظمت اور عبرت پذیری ہے ثانوی
سے اُن سے مادی فوائد بھی مراد لئے جا سکتے ہیں لیکن ان کے اصل مقصد کو چھوڑ کر محض مادی فوائد مراد
قرآن پاک سے بے بصری کا ثبوت ہے، اور ان فوائد کے بارہ میں بھی مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا ذاتی استنباط
ت نہیں بلکہ ایک مولوی ہی طنطاوی جوہری مصری کی تفسیر قرآن سے ماخوذ ہے جس میں اس قسم کے مباحث بھی ہیں ھدًی للمتقین
سیر میں ارشاد ہوتا ہے تقویٰ کے معنی بچاؤ دفاع اور سلف ڈیفنس کے ہیں، یعنی قرآن ان قوموں کا
راہنما ہے جن کا ڈیفنس مضبوط ہو، (ص ۱۸۳) یہ تفسیر تو لاتقربوا الصلوٰۃ کے مشہور لطیفہ سے
بڑھ گئی، مصنف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے کلام مجید کے ترجمہ میں اس قسم کی تحریفیں جا بجا کی ہیں،
فضلتکم علی العالمین کا ترجمہ کیا ہے "تمہیں یاد ہو گا کہ تمہارے نادر کارناموں کی وجہ سے
ے تمہیں خیرالامم قرار دیا (ص ۱۲) اس ترجمہ میں "نادر کارنامے" مصنف کا اضافہ ہے، جس سے اُن کا
دنیاوی ترقی کا ثبوت ہے، حالانکہ گر وہ اس پر غور کرتے کہ یہ خطاب یہود سے ہے تو ان کو معلوم
اکہ اُن کے نادر کیا ہے نادر کارنامے بھی نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ضرور ان کو اپنے فضل و کرم سے
کو ایک زمانہ میں حکومت و سلطنت بھی دی لیکن انھوں نے ہمیشہ احکام الٰہی سے سرتابی کی،
بد اعمالیوں سے اس کو بھی کھو بیٹھے، قوم یہود کا اس کی قدیم تاریخ میں بھی کوئی کارنامہ نہیں
مصنف نے ان کی جانب نادر کارنامے منسوب کر کے نہ صرف اپنی قرآن فہمی بلکہ تاریخ سے بھی
یت کا ثبوت دیا ہے،

اسی طریقہ سے ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین کا ترجمہ مسلم ہو، یا کوئی اور گروہ منشائے الٰہی
کے خلاف چل پڑے تو اللہ تعالیٰ سزا دینے میں کبھی دریغ نہیں کرتے، وہ عالم سے بے نیاز ہیں (ص ۲۴۳) جلی

سراسر غلط ہے،

سُور کے بالون کے استعمال کے جواز مین تحریر فرماتے ہین، کہ "اللہ کو علم تھا کہ سور کے بال تیرہ سو برس کے بعد انسانی تمدن کا حصہ بن جائین گے، اس لئے سور کو حرام کرتے وقت لحم الخنزیر کے الفاظ استعمال فرمائے، یعنی سور کا گوشت حرام قرار دیا، اور بالون کے متعلق خاموشی اختیار فرمائی، ص ۲۰۲ "اگر اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو پھر مصنف کے لئے ان تمام چیزون کا استعمال جائز ہو جائے گا جن کی نجاست کے بارہ مین قرآن خاموش ہو انکو غور کرنا چاہئے کہ اس کا سلسلہ کہان تک پہنچتا ہے، اس کی تصریح کی ضرورت نہین آیات ذیل

انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت	ہم نے آسمانون زمین اور پہاڑ کے سامنے امانت
والارض والجبال فابین ان یحملنھا	پیش کی پس انھون نے اس کے اٹھانے سے انکار
واشفقن منھا وحملھا الانسان	کیا، اور ان سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو
انہ کان ظلوما جھولا،	اٹھا لیا، یہ بڑے بے ترس اور نادان ہین

کی تفسیر مین مجتہدانہ شان سے فرماتے ہین "کہ تمام علماے اسلام نے حمل کے معنی کی تشریح مین غلطی کی ہے، اس کے معنی اٹھانے کے بھی ہین، اور خیانت کرنے کے بھی اور اس موقع پر خیانت کرنا مراد ہے اس کی تائید مین انھون نے قاموس کا حوالہ دیا ہے، (ص ۱۴۶)

قاموس کے حوالہ کے ساتھ یہ کہنا کہ تمام علماے اسلام نے حمل کے معنی کی تشریح مین غلطی کی ہے تضاد بیان کا عجیب نمونہ ہے، جب صاحب قاموس نے خیانت سے تشریح کی ہے، تو پھر سارے علماء کو خطا کار بنانا کہان تک صحیح ہے، یہ بھی مصنف کا نیا اجتہاد نہین ہے، بلکہ بعض مفسرین خصوصاً علمائے لغت نے خاص اس آیۃ مین حمل کی تفسیر خیانت سے کی ہے لیکن حمل کے معنی کسی لغت مین بھی خیانت کے نہین ہین، بلکہ حملھا الانسان سے وہ کافر و مشرک مراد لیتے ہین، جنھون نے بار امانت کا حق ادا نہین کیا، اور خدا کی نافرمانی کر کے

ں مین خیانت سے کام لیا، اس لئے حمل کے لغوی معنی خیانت کے نہین ہوئے، بلکہ بطور نتیجہ کے اس کی تشریح
بات ہو جوتی، جو بہت سی لغت کی کتابون مین اس آیت کے ضمن مین ملتی ہے لیکن یہ قول شواذ مین ہے جمہور علما
کے نزدیک اس کے معنی اٹھانے ہی کے ہین، یہ مصنف کی فہم قرآن اور اُن کے تفسیری اجتہاد کے چند نمونے ہین
ں کی مثالین اور بھی ہین لیکن سب کی تفصیل مقصود نہین،

حدیث کی صحت اور اس کی حجیت کے وہ منکر ہین، اور اس کی بے اعتباری کے ثبوت مین انھون نے
ہی پُرانے دلائل دہرائے ہین، جو منکرین حدیث عموماً دیا کرتے ہین، اور جن کے جوابات بار ہا دیئے جا چکے
ہن لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وہ حدیث کی صحت کے منکر ہین، دوسری طرف انھون نے
پنی تائید مین بکثرت حدیثون سے استدلال کیا ہے، اور عباسی عہد کی علمی ترقیون کے سلسلہ مین جن علمائے
کر کے نام لکھے ہین، ان مین بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی بھی ہین (ص ۲۹)

ان ائمہ کی عظمت اور ان کا علمی کمال محض ان کی محدثیت و خدمتِ حدیث کی بنا پر ہے جب حدیث ہی
صنف کے نزدیک دفترِ بے معنی ہو، تو پھر ان بزرگون کو اصحابِ کمال کے زمرہ مین شامل کرنے کے کیا معنی ہین

فقہ و اجتہاد کے بارہ مین مصنف کے بیان مین عجیب تضاد نظر آتا ہے، ایک طرف تو انھون نے اس
از مین اجتہاد کی ضرورت پر بڑا زور دیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ص ۶۰، ۶۱، اور قدیم مجتہدین کے کارنامون
ان الفاظ مین سراہا ہے، تمام ائمہ مین اجتہادی مسائل مین شدید اختلاف تھا، ابن ابی لیلیٰ شہر کے سرکاری قاضی
ے، اور جب کوئی فیصلہ کرتے تھے تو امام ابو حنیفہ اُن کے خلاف فتویٰ صادر کرتے تھے، ص ۶۶ بشر بن غیاث مریسی
امام شافعی سے باقاعدہ مناظرے کیا کرتے تھے، اور یہی وہ فقیہ ہے جس نے گدھا حلال کیا (ص ۶۰) (زبان
تہذیب و شائستگی داد طلب ہو) امام ابو یوسف نے اپنی تحریرات مین امام مالک کی سخت تردید کی ہے،
بعض مسائل تو ایسے ہین کہ ساری خدائی ایک طرف اور امام مالک دوسری طرف ص ۶۰)

ناظرین کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اس تحریر سے مصنف کا مقصد اختلافِ ائمہ کی مذمت ہے ایسا نہین ہے بلکہ

اجتہاد کی مدح و توصیف مقصود ہو، یہ ان کی بلاغت ادا کی خوبی ہے کہ مدح و ذم میں امتیاز کرنا مشکل ہو، یہ واقعات انھوں نے خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کے اردو ترجمہ سے بلا حوالہ نقل کئے ہیں جو انھوں نے اختلافِ ائمہ کے سلسلہ میں تحریر کئے ہیں، اور جن کو مصنف نے اپنے حُسن تحریر اور تدلیس سے اس شکل میں کر دیا ہے، اگر وہ اس کی پوری بحث یا ماقبل اور مابعد کی عبارتیں بھی نقل کر دیتے تو ان واقعات میں بدنمائی نظر نہ آتی، لیکن انھوں نے تو اپنی خوبیٔ تحریر سے اردو ترجمہ کو بھی مسخ کر دیا ہے،

اجتہاد و اختلافِ ائمہ کی تحسین کے ساتھ اسلامی فرقوں کے اختلاف کا رونا بھی روئے ہیں، اور ان الفاظ میں اس کا ماتم کیا ہے، "ہر مسجد اور ہر مکتب میں علٰحدہ مذہب رائج تھا، اور ہر عالم دوسرے عالم کا کفر ابن جوزی کے متعلق مشہور ہے کہ آپ غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی کے سلام کا جواب تک نہیں دیتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ غوثِ اعظم بدعتی ہیں، اس قسم کی بعض اور مثالیں بھی انھوں نے دی ہیں (ص ۳۹)

یہ واقعہ معلوم نہیں مصنف نے کہاں سے نقل کیا ہے، اس کی حیثیت خرافات سے زیادہ نہیں ہے، ایک طرف تو مصنف کا تشدد اور بلندی یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے علاوہ حدیث کو بھی نہیں مانتے، دوسری طرف وہ اس درجہ تک اتر آتے ہیں کہ غوث و ابدال کی متصوفانہ اصطلاح کو بھی قبول کرنے میں ان کو تامل نہیں، شاید اپنی نسبت کی لاج میں یہ تنزل گوارا کیا گیا ہو کہ ان کے نام کے ساتھ جیلانی کی نسبت ہے،

یہ ایک درمیانی بات آگئی تھی، اصل مقصد یہ کہنا تھا کہ ایک طرف انھوں نے اجتہاد پر بھی زور دیا ہے، دوسری طرف اسلامی فرقوں کے اختلافات کا بھی ماتم ہے جو اجتہاد کی صورت میں ناگزیر ہے اسلئے کہ وحدت خیال تو تقلید کا نتیجہ ہوتی ہے،

مصنف کے نزدیک اجتہاد کا مفہوم بھی شرعی اجتہاد سے مختلف ہے، شرعی اجتہاد کی تفصیل بعد میں آئے گی، مصنف کے نزدیک کسی اصول اور شرط کے بغیر کسی مسئلہ میں اپنی پسند کی رائے قائم کرنے کا نام اجتہاد ہے، چنانچہ لکھتے ہیں "مختلف مسائل میں بڑے بڑے ماہرین قانون مثلاً امام ابو حنیفہ امام شافعی اور

امام مالک کے اجتہاد کو سامنے رکھے جہاں کہیں ان کے وضع کردہ قوانین پسند آئیں انہیں اپنائے ورنہ اپنی راہ خود نکالے (ص ۲۶)" اس اصول کے مطابق مصنف کے اجتہاد کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں "زکوٰۃ کی کوئی شرح قرآن نے نہیں مقرر کی ہے، اس لئے پاکستان کی طرف سے مختلف قسم کے ٹیکس بھی مد زکوٰۃ میں شامل کئے جاسکتے ہیں" "داڑھی منڈانے کا اجتہاد یہ ہے کہ قرآن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل کے متعلق احکام و ہدایات ہیں (ان سب کے نام لکھے ہیں) اس میں داڑھی کا ذکر نہ کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز مذہب نہیں ہے یا تو پھر قرآن نامکمل ہے جس میں داڑھی جیسی ضروری چیز کے متعلق کوئی ہدایت موجود نہیں ہے داڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی رجحان ہے جس کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے اس لئے مسلمان کو اختیار ہے چاہے رکھے چاہے نہ رکھے (ص ۱۰۰)

کس قدر عالمانہ استدلال ہے قرآن میں تو نمازوں کے اوقات ان کی تعداد اور موجودہ شکل کا بھی کوئی تصریح نہیں ہے اسلئے زکوٰۃ کی طرح نوافل و مستحبات کو بھی فرائض میں شامل کرلیا جائے یا داڑھی نہ منڈانے کی طرح سرے سے نمازوں ہی کو نہ مانا جائے، اس علم و استدلال پر اجتہاد کا کھلی ہوئی ہے داڑھی کو روزے نماز اور حج و زکوٰۃ کی طرح کوئی بھی ارکان اسلام میں نہیں مانتا لیکن حضور کے بعض افعال و احکام کا درجہ بھی واجبات سے کم نہیں ہے، اس مسئلہ پر اس سے زیادہ تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے،

اسی طریقہ سے مصنف بعض منصوص احکام یعنی چور اور زانی کی سزا میں بھی اپنے اجتہاد سے ترمیم چاہتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۹۷ و ۹۸) ان مثالوں سے ان کے تخیلہ اجتہاد کے مفہوم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اجتہاد کی آزادی کے ثبوت میں انہوں نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے "اجتہادی مسائل میں حضرت عمرؓ کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اخیافی بھائی، ماں اور باپ کی موجودگی میں حقیقی بھائیوں کو وراثت سے محروم کردیا ہے، اگلے سال سب کو شریک وراثت بنا لیا کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا وہ اس فیصلہ کے مطابق تھا، جو پچھلے سال کیا تھا، اور یہ اس فیصلہ کے مطابق ہے جو اس سال کیا ہے"،

اس واقعہ کو انہوں نے اجتہاد کی آزادی کے ثبوت میں نقل کیا ہے یعنی جب اور جیسی چاہے رائے قائم کرے

یہ واقعہ بھی انھوں نے اول آخر کو حذف کرکے لکھا ہو، خضری نے اس کو اس سلسلہ میں نقل کیا ہو کہ ائمہ اور صحابۂ کرام
کے اجتہاد کی بنیاد غور و فکر اور دلیل و برہان پر ہوتی تھی اسلئے اگر کسی اجتہادی مسئلہ میں ایک فیصلہ کرنے کے بعد
ان کو اس کے خلاف کوئی دلیل مل جاتی تھی، اور وہ دوسرے نتیجہ پر پہنچتے، تو وہ بلا تامل پہلی رائے کو بدل دیتے
تھے غلطی پر جمے نہ رہتے تھے، ملاحظہ ہو تاریخ التشریع الاسلامی، (ص ۲، ۳ مطبوعہ مصر)

اس روشنی میں یہ واقعہ مصنف کے ذاتی پسند یا پسند کے اجتہاد کے خلاف پڑتا ہی یعنی اجتہاد کی بنیاد، ذاتی پسند
رای پر نہیں بلکہ دلائل پر ہو، اس کے یہ معنی نہیں کہ آج ایک بات پسند آئی، اسکے مطابق رائے قائم کرلی اور کل جب کوئی
دوسری بات پسند آگئی تو پہلی رائے کو بدل دیا، ذاتی پسند سے رای قائم کرنے اور بدلنے اور دلائل سے کسی دوسرے
نتیجہ پر پہنچنے میں زمین و آسمان کا فرق ہی، لیکن بالفرض اگر ان معنوں میں بھی حضرت عمرؓ کی اجتہادی آزادی
کو مان لیا جائے تو کیا ہمارے مصنف مجتہد کا بھی وہی درجہ ہو اور وہ بھی حضرت عمرؓ کی اجتہادی آزادی کے اہل ہیں

اب شرعی اجتہاد کے اصول و شرائط ملاحظہ ہوں شریعت میں کسی مسئلہ میں ذاتی پسند سے رائے قائم کرنے
کا نام اجتہاد نہیں ہی، بلکہ اس کے حسب ذیل شرائط ہیں،

اجتہاد انہی مسائل میں ہو سکتا ہو جن کے بارہ میں قرآن مجید اور احادیث نبوی میں کوئی حکم نہیں ہے
اور نہ اجماع سے اس کا ثبوت ملتا ہو جن مسائل میں قرآن مجید اور احادیث نبوی میں احکام موجود
ہیں، یا جن پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے ان میں اجتہاد نہیں ہو سکتا اجتہاد کے معنی ہیں کہ نئے اور نامعلوم
مسائل کے متعلق قرآن و حدیث کی اساس پر احکام کا استنباط کرنا، اس کی دو صورتیں ہیں،

(۱) ایک یہ کہ قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے احکام کا استنباط کیا جائے، یہ اسی صورت میں مسئلہ
میں ملے گا جب قرآن کے الفاظ اس حکم پر حاوی ہوں (۲) دوسری یہ کہ قرآن و حدیث کے الفاظ میں تو اس
کی صراحت نہ ہو لیکن اس میں ایسی علت اور سبب بیان کیا گیا ہو یا اس سے مستنبط ہوتا ہو جو زیر بحث مسئلہ
میں بھی پایا جاتا ہو تو اس صورت میں قرآن و حدیث کے عقلی مفہوم سے حکم اخذ کیا جائے گا (۳) ایک یہ کہ

اور سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ مجتہد کے لئے عربی زبان و ادب، قرآن و حدیث اور اصول فقہ میں مہارت اور دیانت و تقوی بھی ضروری ہے،

ان شرائط سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی بنیاد قرآن و حدیث ہی پر ہے، خواہ اس کے الفاظ پر ہو یا اس سے مستنبط کسی اصول پر، ذاتی پسند اور رائے پر نہیں ہے، ان شرائط کے ساتھ آج بھی اجتہاد کی اجازت ہے لیکن اجتہاد میں خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، اس لئے صحابہ کرام اس میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، اور ناگزیر حالات کے علاوہ اجتہاد سے پرہیز کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کا یہ اصول تھا، کہ جب آپ کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا، تو پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے، اگر اس میں کوئی حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، ورنہ حدیث کی جانب رجوع کرتے، اگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوتا، تو پھر صحابہ کرام کے مشورہ سے فیصلہ فرماتے (مسند دارمی)

کسی مسئلہ میں محض قیاس سے رائے زنی نہیں کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اگر میں کتاب اللہ یا نامعلوم مسائل میں رائے زنی سے کام لوں تو کون زمین میرا بار اٹھائیگی، اور کون آسمان مجھے سایہ دیگا (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۶) اور جب کبھی ناگزیر حالات میں اجتہاد کرنا پڑتا، تو یہ تصریح فرما دیتے کہ یہ میری رائے ہے اگر صحیح ہے تو منجانب اللہ ہے، اور غلط ہے تو میری طرف سے ہے، اور میں خدا سے طالبِ مغفرت ہوں،

یہی طریقہ حضرت عمرؓ کا تھا، آپ بھی نئے اور نامعلوم مسائل میں علی الترتیب قرآن و حدیث کی جانب رجوع کرتے تھے، اس کے بعد اس بارہ میں حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ یا فتوی کو تلاش کرتے، اگر ان کا فیصلہ بھی موجود نہ ہوتا، تو صحابہ کرام کے سامنے پیش کرتے، اور اس وقت تک بحث و مناظرہ کرتے رہتے، جب تک مسئلہ کے متعلق تمام شکوک و شبہات دور ہو کر پورا یقین نہ ہو جاتا، (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۵)

یعنی دونوں بزرگ پہلے قرآن و حدیث کی جانب رجوع کرتے تھے، اس کے بعد صحابہ سے رائے لیا کرتے تھے اور سب سے آخر میں اجتہاد کرتے، لیکن اُن کے اجتہاد کی نوعیت کا اندازہ حضرت عمرؓ کی ان ہدایات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور کوفہ کے قاضی شریح کو لکھ کر بھیجی تھیں، قاضی شریح کو فیصلہ کے بارہ میں یہ ہدایت دی تھی کہ

جس مسئلہ مین کتاب اللہ کا حکم موجود ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو، اس مین نہ ہو تو حدیث نبوی مین تلاش کرو اور اس مین بھی نہ ملے، تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو

اس اجتہاد کی تشریح خود آپ ہی کی ایک تحریر سے جو آپ نے قاضی شریح کو لکھی تھی، ہوتی ہے جو چیز تم کو قرآن و حدیث مین نہ ملے، اور اس کے متعلق تم کو شبہ ہو تو اس کا غور کرو اور خوب غور کرو، ان کے ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر اس پر اس کو قیاس کرو (ازالۃ الخفا ص ۸۶) اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی شریعت مین اجتہاد کسے کہتے ہین، اس کے کیا شرائط ہین اور صحابۂ کرام کے اجتہاد کی نوعیت کیا تھی اجتہاد کی بنیاد بہرحال قرآن و حدیث ہی پر ہونی چاہئے،

مصنف نے اجتہاد و تقلید کی تاریخ کے سلسلہ مین یہ عجیب و غریب انکشاف کیا ہے کہ "ہمارے علماء سلطنت عباسیہ کے زوال تک اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ تقلید کا مرض اس وقت سے شروع ہوا جب مختلف خطون کے امراء نے صرف ان علماء کے وظیفے باندھے (باندھنے کا لفظ کس قدر برمحل استعمال کیا گیا ہے) جو کسی بڑے مجتہد کی تقلید مین فتوی دیا کرتے تھے، اب کسی عالم کو کیا پڑی تھی کہ وہ اجتہاد کی مصیبت مین پھنسکر اپنی تنخواہ گنواتا (ص ۱۷")

کاش مصنف نے اس واقعہ کے ثبوت مین حوالہ بھی دیدیا ہوتا، لیکن اس کو واقعہ سے کوئی تعلق نہ ہو تو حوالہ کہان سے دیتے، یہ تو ان کا تاریخی اجتہاد ہے، اجتہاد کا دروازہ کبھی بھی وظیفہ خواری نے بند نہین کیا، اور ضرورت کے وقت شرعی اجتہاد کی آج بھی اجازت ہے، البتہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا، خود اجتہاد کی ضرورت کم ہوتی گئی، اسلئے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے مقابلہ مین بعد کے زمانہ مین اجتہاد گھٹتا گیا، مصنف کو یہ سادہ بات اس لئے پیش آرہی ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس سے رائے قائم کرنے کو اجتہاد سمجھے ہین، بہرحال اوپر کے اقتباس مین ان کے قلم سے یہ نادانستہ اعتراف نکل گیا ہے کہ "ہمارے علماء سلطنت عباسیہ کے زوال تک اجتہاد سے کام لیتے رہے، گو انھون نے اس زوال کا زمانہ متعین نہین کیا ہے، اس لئے کہ عباسیون کا زوال

سے لیکر ساتویں صدی کے وسط یعنی اُن کے خاتمہ تک قائم رہا اگر مصنف زمانہ متعین کر دیتے تو
زیادہ آسانی سے صاف ہو جاتا تاہم دونوں میں سے جو زمانہ بھی مراد لیا جائے، مصنف کو اتنا
یال ماننا پڑے گا کہ یہ مسلمانوں کے اوج شباب کا زمانہ تھا، ساری دنیا میں اُن کی عظیم الشان حکومتیں
قائم ہو گئی تھیں اور وہ تہذیب و تمدن کی ہر شاخ میں اوج کمال تک پہنچ گئے تھے، اس لئے تقریباً
نئے مسائل پیدا ہو کر طے ہو چکے تھے، اور طے شدہ مسائل کو بار بار بدلنے کا نام اجتہاد نہیں، بلکہ
نئے مسائل میں جن کے متعلق قرآن و حدیث میں احکام اور گذشتہ ائمہ کے اجماعی فیصلے موجود نہیں میں اجتہاد
سے فیصلہ کرنے کا نام اجتہاد ہے، مثلاً آج کل بیمہ کمپنیوں، جنگ کے منافع، صنعت و حرفت و تجارت
کی نئی شکلوں میں اجتہاد کے شرائط کے مطابق ان کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، لیکن
اجماعی اور متفق علیہ مسائل میں اجتہاد کی اجازت نہیں ہے، اگر اس کی اجازت دیدی جائے تو
شریعت کا کوئی قانون اور کوئی مسئلہ بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا، جیسا کہ مصنف کی اجتہادی
مثالوں سے جو اوپر گذر چکی ہیں، ظاہر ہے،

اس اصول کے مطابق اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں تقریباً تمام نئے مسائل پیدا ہو کر
طے ہو چکے تھے اور اجتہاد کا موقع بہت کم باقی رہ گیا تھا، اس لئے قدرتاً اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی
مگر اس کا دروازہ مطلق بند نہیں ہوا، اور ہر دور میں علمائے مجتہدین پیدا ہوتے رہے، ان میں سے
بعض کے نام خود مصنف نے بھی لکھے ہیں، امام ابن تیمیہ آٹھویں صدی ہجری میں تھے، خود ہندوستان
میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، ان کے علاوہ اور بہت سے
نام لئے جا سکتے ہیں، اس لئے اجتہاد کا سلسلہ تو قائم رہا، البتہ چونکہ اس کی ضرورت کم باقی رہ گئی تھی
اس لئے اس کی نوبت کم آئی،

ممکن ہے کسی حکومت یا کسی دور کے علماء نے اصحاب ہوا کی آزادی کو روکنے کے لئے عارضی طور سے اجتہاد بند

بھی کر دیا ہو تو مصالح شرعی کی بنا پر اس قسم کی بندش قابل اعتراض نہیں بلکہ عین تحفظ دین ہو، خاص حالات میں بعض تو انین کا نفاذ عارضی طور سے ملتوی کیا جا سکتا ہے، جس سال عرب میں عام قحط پڑا تھا تو حضرت عمرؓ نے چند دنوں کے لئے چوری کی سزا قطع ید ملتوی کر دی تھی، اسلئے کسی مصلحت کی بنا پر اجتہاد کی عارضی بندش سے اسکی مطلق بندش کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، ایک عامی کے لئے اجتہاد مطلق تقلید سے کہیں سے زیادہ خطرناک اور مضر ہے، مقلد تو بہر حال ایک امام کا پیرو ہوتا ہے اسلئے اس کی جانب سے کسی غلطی کا امکان نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ اس کو روشن خیالی مقلد جامد کا لقب دیگی لیکن اس کے کسی فعل کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا، اس کے مقابلہ میں اجتہادی غلطیوں سے ایک دنیا گمراہ ہوتی ہے، اس لئے ایسی اجتہادی بندش عین خدمت دین ہے، لیکن اس سے مراد مصنف کا متخیلہ غیر شرعی اجتہاد ہے،

مصنف کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقلید کو اجتہاد کا ضد سمجھتے ہیں، اس اصول سے تاریخ اسلام میں ایک حقیقی مجتہد بھی نہیں نکل سکتا، مجتہد کے صرف یہ معنی ہیں کہ اس میں اجتہاد کے تمام شرائط پائے جاتے ہوں، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عملاً بھی اجتہاد کرتا ہو، اور ان علماء مجتہدین میں بھی جو عملاً اجتہاد کرتے تھے، بہت سے مسائل میں اتحاد رائے ہے، اختلافی مسائل تو صرف چند ہوتے ہیں خود ائمہ اربعہ کے متفق علیہ مسائل کی تعداد اختلافی مسائل سے زیادہ ہے، اس لئے کہ جب اجتہاد کی بنیاد اور اس کا طریقہ ایک ہوگا، تو لازمی طور سے اختلافات کم اور زیادہ تر فروعی ہونگے، یہ بحث ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی پھر بھی اجتہاد پر تفصیلی بحث نہ ہو سکی آجکل اجتہاد پر بڑا زور دیا جاتا ہے اس لئے اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، انشاء اللہ آیندہ کسی موقع پر اس موضوع پر مفصل گفتگو کی جائیگی،

آخر میں اکابر اسلام سے مصنف کی ناواقفیت اور انکی ادب ناشناسی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے متعلق لکھتے ہیں "جب ابوموسیٰ مجمع عام اپنا فیصلہ سنا چکا (جنگ صفین کی تحکیم میں) تو اس کے فیصلے سے اس نے اپنی انتخاب کی توہین بھی (ص ۲۶، ۳۶) "فرقہ کیسانیہ کے عقائد کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کے فرزند دلبند اور جلیل القدر تابعی حضرت محمد بن حنفیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "محمد بن حنفیہ فوت نہیں ہوا بلکہ بدستور زندہ ہے" ص ۲۹

اگر مصنف ان بزرگون کی شخصیت سے ناواقف ہین تو تاریخ اسلام پر اُن کی نظر نہین اور اگر جان بوجھکر ان کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے تو اور بھی قابلِ الزام ہین، اس سے بھی بڑھکر کمال یہ کیا ہے کہ غزوۂ خندق مین ام المومنین حضرت صفیہؓ کی بہادری کے سلسلہ مین لکھتے ہین "حضور کی ایک بیگم صفیہ لٹھ لیکر نکلین اور ایک یہودی کو قتل کر ڈالا" ام المومنین کے لئے بیگم ہی کے لقب کا استعمال کیا کم تھا اس کے ساتھ لٹھ مصنف کے حسن مذاق کا ثبوت ہے اس بارہ مین وہ غریب مجبور بھی ہین آخر کچھ وطنی خصوصیات کو بھی تو ملحوظ رکھنا ہے،

غرض اس کتاب مین مصنف کے علم واجتہاد وسعت معلومات حُسنِ تحریر اور حسن ادب وغیرہ ہر کمال کے نمونے ہین ان سب کی تفصیل کی گنجایش نہین ہے، مذکورۂ بالا نمونون سے اس کا اندازہ ہوگیا ہوگا ہم کو اس کے ماننے مین تامل نہین کہ مصنف کی نیت نیک اور اس کتاب کی تالیف سے ان کا مقصد مسلمانون کی اصلاح اور دنیاوی ترقی ہے جو ایک محمود اور اچھا مقصد ہے لیکن اس کا طریقہ وہ نہین ہے جو انھون نے اختیار کیا ہے، اس کی تعلیم خود اسلام مین موجود ہے، اور جس طرح ایک مسلمان پر عبادت فرض ہے، اسی طرح اسلام اور مسلمانون کی قوت وشوکت اور اُن کی دنیاوی سربلندی کے لئے اس کے مادی ذرائع پر عمل کرنا بھی فرض ہے، اس لحاظ سے مصنف کے بعض خیالات اور مشورے صحیح بھی ہین، لیکن ان مین حق و باطل دونون کی آمیزش ہے جس سے فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے، اس قسم کی کوششون کی مثال ایسی ہی ہے جیسے جسم کے ماؤف حصہ سے مادہ فاسد ... کو خارج کرنے کے لئے ماؤف حصہ پر نشتر لگانے کے ساتھ شہ رگ کو بھی کاٹ دیا، اس لئے ایسے اہم اور نازک مسائل مین بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جس کا سنبھالنا ہر شخص کا کام نہین۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مطبوعات جدیدہ

خطباتِ بدر از جناب مولوی بدر الدین صاحب بدر جالندھری تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۔/۱۰ پتہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور،

خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد خدا کی حمد و ثنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل واصحاب پر درود و سلام، ترتیلِ قرآن، وعظ و تذکیر اور دعا ہے، لیکن اس میں دوسری مذہبی تعلیمات بھی دیجا سکتی ہیں، اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے اہم مسائل بھی بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ حصہ ایسی زبان میں ہونا چاہیے جس کو سامعین سمجھ سکیں، اس کی صورت یہ ہے کہ خطبۂ مسنونہ تو عربی زبان میں پڑھا جائے اور دوسرے معاملات و مسائل ملکی زبان میں بیان کئے جائیں، مصنف نے اسی نقطۂ نظر سے یہ خطبات لکھے ہیں، اس میں عربی کے دونوں مختصر خطبے بھی دیدیئے ہیں، اس کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اجتماعی، اصلاحی اور اسی قسم کے دوسرے ضروری مسائل پر اردو میں پچاس خطبے ہیں، ان تمام خطبات کی روح خالص اسلامی ہے، اور دورِ جدید کی ضروریات کے مسائل میں بھی مصنف کا قدم دین کے دائرہ سے باہر نہیں نکلا ہے، اس لئے یہ خطبات نہ صرف جمعہ میں پڑھنے کے لئے کارآمد بلکہ اپنی مفید مذہبی معلومات کے لحاظ سے مسلمانوں کے عام مطالعہ کے لائق بھی ہیں، اُن سے کم استعداد مبلغین اور واعظ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

قومی ملکیت اسلامی نقطۂ نظر سے | از جناب نعیم صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۵۵ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ مکتبہ چراغِ راہ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱،

اسلام اور کمیونزم کے معاشی نظام پر جن لوگون کی پوری نظر نہین ہے، وہ اُن کے بعض پہلوؤن مین مشابہت دیکھ کر دونون کو یکسان سمجھنے لگتے ہین، اور قرآن وحدیث سے اس کی تائید وتلاش کرتے ہین، چنانچہ اشتراکیت کی طرح اسلام مین بھی وسائل معیشت کو قومی ملکیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین، جو قطعاً غلط ہے، درحقیقت اسلام کا معاشی نظام مستقل حیثیت رکھتا ہے، اور کمیونزم اور سرمایہ دارانہ دونون نظامون سے مختلف ہے لائق مصنف نے اس کتاب مین قومی ملکیت کے بارہ مین اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور اس بارہ مین اشتراکی اصول کے نتائج پر بحث کرکے دکھایا ہے کہ اس سے اصل مقصد یعنی طبقاتی اور معاشی مساوات بھی حاصل نہین ہوتا، اور سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں پیدا ہوتی ہین، اس کے مقابلہ مین اسلام کا اصول اس قدر متوازن ہے کہ انفرادی ملکیت کو قائم رکھتے ہوئے بھی اس سے قومی ملکیت کی اصل غرض وغایت کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہین اور اس کی خرابیان بھی پیدا نہین ہوتین، درحقیقت ہر نظام اپنے تمام اجزا سے مل کر کامل ہوتا ہے اور اس کی ایک بنیادی روح ہوتی ہو جو سارے نظام مین ساری ہوتی ہے، جس سے اس کو الگ نہین کیا جا سکتا ورنہ سارا نظام بے کار ہو جاتا ہو، اس لئے مختلف نظامون کے اجزا ایک دوسرے مین فٹ نہین کئے جا سکتے، اور جب اس کی کوشش کیجائیگی تو دونون کا مقصد فوت اور اس کی روح ختم ہو جائے گی، اس لئے اسلام اور کمیونزم کے معاشی نظام کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرنا دونون کو بگاڑنا ہو، یہ رسالہ کمیونزم سے متاثر مسلمانون نوجوانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

دلائل توحید باری از مولانا عبدالرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت، وطباعت، بہتر قیمت ایک روپیہ، مصنف نائب ناظم مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر ڈاکخانہ رام دت گنج ضلع بستی،

خدا کی توحید کا عقیدہ تقریباً تمام الہامی مذاہب مین موجود ہو، زیادہ التباس توحید فی الصفات

مین ہوا ہے، جس نے بگڑ کر شرک کی صورت اختیار کر لی، پرانی مناظرانہ کتابون مین اس پر بڑی بحثین اور توحید کے اثبات اور شرک کی تردید کے پرانے طرز کے دلائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مصنف نے انہی مین سے اپنے پسندیدہ دلائل منتخب کر کے اس کتاب مین جمع کر دیئے ہین، اس کے پہلے حصہ مین توحید باری کے ثبوت اور تعدد الٰہ کی تردید کے دلائل ہین، دوسرے مین ان عقائد و اعمال کی تردید ہے، جو توحید خالص کے خلاف اور مسلمانون مین بھی رائج ہین مثلاً غیر اللہ سے استمداد اور علم غیب وغیرہ، مصنف کو موجودہ زمانہ کے کلامی مسائل اور ان کے طرز استدلال کا اندازہ نہین ہے، اس لئے انھون نے انہی پرانے مسائل اور دلائل کو دہرا دیا ہے جن کی آج کل چندان ضرورت نہین، اور نہ ان کو موجودہ مذاق قبول کر سکتا ہے تاہم مصنف کی نیت اور ان کا مقصد نیک ہے، اس لئے انشاء اللہ اس کا اجر ان کو ملے گا،

مادر ہمدرد از جناب خواجہ حسن نظامی دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ امیر خسرو ہرنڈیو لائبریری دہلی،

ایک عرصہ کے بعد خواجہ صاحب کی نئی تصنیف کی زیارت ہوئی ہے، ان کی تحریر کے مطابق "اس تصنیف کا مقصد باشندگان ہندوستان و پاکستان کے کلچر اور قدامت کی مادری تربیت کے عمدہ نتائج کا بیان ہے" اس مقصد کے مطابق مصنف نے ہندوستان کے بہت سے قدیم صلحاء و اخیار اور موجودہ دور کے اکابر و ممتاز آدمیون کے مختصر حالات مادری تربیت کے اچھے نمونے کی حیثیت سے لکھے ہین لیکن ان مین کم ایسے ہین جن کے متعلق یہ ثبوت دیا گیا ہو کہ ان کے محاسن مادری تربیت کا نتیجہ تھے، ہر شخص کے اوصاف مادری تربیت کا لازمی نتیجہ نہین کہا جا سکتا، جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو، ورنہ اگر اس کو بطور کلیہ کے مان لیا جائے، تو پھر ہر انسان کو مادری تربیت ہی کا نمونہ ماننا پڑے گا، جو ایک غیر منطقی بات ہے، تاہم اس کتاب سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس مین ہر طبقہ کے بہت سے اکابر اور ممتاز اشخاص کا تذکرہ قلمبند ہو گیا اور اس سلسلہ مین مصنف نے اپنے جذبہ ہندو مسلمین کا حق بھی ادا کر دیا،

"م"

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت چھ روپیے سالانہ

دفتر — دار المصنفین — اعظم گڑھ

جلد ۶۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

ہم کو اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ کا تراشہ موصول ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ پنجاب کا کوئی خود غرض ناشر دار المصنفین کی کتابوں کو چھپوا رہا ہے، اور چند سکّوں کے لئے ہندوستان کے اس اسلامی ادارہ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اڈیٹر صاحب نوائے وقت نے اپنی انسانی شرافت اور دینی حمیت سے اس کے خلاف حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

"آج یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ پنجاب کے کوئی ناشر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ کی ساری کتابیں بلا اجازت چھپوا رہے ہیں، اور اپنے نام سے بیچیں گے، اس سے پہلے حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری پر یہی ظلم ہو چکا ہے، اور اب ایک ادارہ اس ظلم کا شکار ہو رہا ہے، یہ حرکت مذہب، اخلاق، قانون، شرافت، ہر معیار سے گری ہوئی ہے، اور اب جو ناشر اس کے ارتکاب کا ارادہ رکھتا ہے، وہ انسانیت کے ابتدائی معیار سے بھی گرا ہوا ہے، مزید براں اس ظالم کو اس امر کا بھی احساس نہیں کہ دار المصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جو سالہا سال سے مولانا سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں مسلمانوں اور اردو زبان و ادب کی بڑی خاموشی سے خدمت انجام دے رہا ہے، ہندوستان میں جو حالات رونما ہیں، ان کی وجہ سے دار المصنفین اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان کے مسلمان اس مفید ادارہ کی مدد کرتے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کا ایک ناشر ذاتی نفع کی لالچ میں ادارہ کی آمدنی کا واحد ذریعہ یعنی اس کی کتابیں چھاپ کر اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے، یہ ناشر اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اسے اس بات کا بھی خیال نہیں کہ اس کے اس فعل سے ساری پاکستان کی بدنامی ہو گی، ہم سردار عبد الرب نشتر سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ خود توجہ فرمائیں، اور اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں، اور اس ناشر کی مطبوعہ کتابیں

باہر آتے ہی چھپا کر لیجائیں، اور بہتر یہ ہو کہ انھیں دارالمصنفین بھیج دیا جائے ہمیں بتایا گیا ہو کہ پہلی کتاب جو باہر آئے گی وہ مولانا شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی ہی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، (نوائے وقت ۱۵ مارچ ۱۹۵۰ء)

یہ نوٹ لکھ کر معاصر موصوف نے جس انسانی شرافت، اسلامی اخوت اور دینی حمیت کا ثبوت دیا ہی ہم اس کے شکرگذار ہیں جزاہ اللہ عنا وعن المسلمین، اس سے زیادہ ہم بھی اور کیا کہہ سکتے ہیں لیکن اہل پاکستان کی خدمت میں اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دینا ہے،

(ن)

ہندوستان کی تقسیم سے بھارت کے اسلامی اداروں کو جو نقصان پہنچا ہی اس سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں، وہ چونکہ اسلامی علوم و فنون اور اردو زبان و ادب کا ادارہ ہی، اور اس کی کتابیں انہی موضوعوں پر ہیں اسلئے ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی ان کے خریدار قریب قریب کل مسلمان اور پاکستانی علاقہ تھا، ہندوستان میں انکی مانگ زیادہ تر دلی اور حیدرآباد میں تھی، اس لئے موجودہ انقلاب کا اثر دارالمصنفین کی تجارت پر بہت پڑا حیدرآباد اور بھوپال سے تھوڑی بہت جو امداد ملتی ہی وہ چند دنوں کی مہمان ہے اور اب اس کا مدار بڑی حد تک پاکستان کی تجارت پر رہ گیا ہی، دونوں ملکوں کے درمیان سکہ کے اختلاف نے اور بھی مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن وہ عارضی ہیں اور یقین ہو کہ دیر سویر اس کا کوئی حل نکل آئے گا، اور اس وقت بھی پاکستان کتابیں جا رہی ہیں،

(ن)

ان اسباب کی بنا پر دارالمصنفین بڑے نازک دور سے گذر رہا ہی جس کا تذکرہ ان صفحات میں کیا جا چکا ہی، ان حالات میں اگر پنجاب کے کسی ناشر نے اس کی کتابیں چھپوا کر بیچنا شروع کر دیں، تو اس کی تجارت بالکل ختم ہو جائیگی اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا، دوسری مملکت کی وجہ سے سر دست اس کا قانونی تدارک مشکل ہے گو انشاء اللہ اس کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جائیگی لیکن یہ ہم سے زیادہ اہل پاکستان کا فرض ہو کہ اگر وہ ہندوستان میں اسلامی آثار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو پاکستان اور پنجاب دونوں حکومتوں کو اس ننگ اسلام و ننگ انسانیت تاجر کو ایسی عبرت انگیز سزا دینی چاہئے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، ہم کو یقین ہو کہ معاصر نوائے وقت کی طرح پاکستان خصوصاً لاہور کے دوسرے اخبارات بھی اس ناشر کے خلاف لکھیں گے، اور حکومت بھی ہمارے معروضات پر توجہ کرے گی، ورنہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت کچھ شمار ہو چکا ہی ایک دارالمصنفین اور سہی، معاصر نوائے وقت سے اس ناشر کا نام معلوم ہو سکتا ہی،

پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن مرحوم ریڈر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی کی وفات علمی حلقہ کا بڑا المناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور مصنف و مترجم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم صاحب اندلسیات کے خلف الصدق اور خود ممتاز صاحب علم، اور علم و فن کے خدمت گذار تھے، عربی فارسی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور عبرانی سے بھی واقف تھے، عربی زبان سے ان کا تعلق محض درس و تعلیم تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کو اس کا ذوق اور ملک میں اس کی خدمت کا جذبہ تھا، انجمن عربی عوبنی ہ کے منصرم اور اس کے سرگرم کارکن تھے، انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کی اہمیت اور مسلمان طالب علموں میں اس کا ذوق قائم رکھا، بہت سے علمی اور تعلیمی اداروں کے رکن اور رکن تھے، تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب تھے، عربی و فارسی کی بہت سی درسی کتابیں لکھیں، ان کی علمی یادگاروں میں مورخ عبد الواحد مراکشی تیمی کی المعجب فی تلخیص اخبار المغرب کا اردو ترجمہ خلافت موحدین خصوصیت کیساتھ لائق ذکر ہے، مرحوم کی عمر چھپن سال سے زیادہ نہ تھی، اور صحت ایسی تھی کہ مشکل سے سنتالیس سال کے معلوم ہوتے تھے، چند مہینے بیمار رہ کر ۲۴ر فروری کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو نعیم جنت سے سرفراز فرمائے،

حافظ ابن قیم نے قرآن مجید کی بعض چھوٹی سورتوں کی تفسیر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں لیکن قرآن کی کوئی مستقل تفسیر ان کی یادگار نہیں ہے، مگر ان کی کتابوں میں مختلف مباحث کے سلسلہ میں اُن کے قلم سے متفرق سورتوں کی آیات کی تفسیریں ملتی ہیں، ہمارے پرانے رفیق مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی نے دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مد ظلہ کے ایما سے ان تفسیروں کو تلاش کرکے جمع و مرتب کیا تھا، اب یہ تفسیر التفسیر القیم کے نام سے محمد حامد الفقی رئیس جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیہ کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں مکہ مکرمہ سے چھپ کر شائع ہوگئی ہے، اس کی ضخامت ۶۳۰ صفحے ہے، اس کے لائق مرتب اور اس کے ناشر عبد اللہ و عبید اللہ صاحب دہلوی تاجران مکہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اہل علم کو اس تفسیر سے استفادہ کا موقع دیا، اگر اللہ تعالیٰ کسی صاحب علم کو اسی طریقہ سے امام ابن تیمیہ کی تفسیر کی جمع و ترتیب کی توفیق دیدیتا تو ایک بڑا کام ہو جاتا،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے پاکستان وی پی نہیں جا سکتے، لیکن پاکستان کے معارف کے اُن خریداروں کے نام بھی جن کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے پرچہ برابر جاری ہے، اُن سے التماس ہے کہ وہ اس کا چندہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور کے نام بھیج دیں، ہم کو توقع ہے کہ جس طرح اُن کے اعتماد پر معارف جاری رکھا گیا، اسی طرح وہ بھی چندہ بھیجنے میں تاخیر نہ کریں گے،

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں

فنونِ جنگ

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۲)

میدان کی جنگ کے طریقے

میدانِ جنگ کا انتخاب عام طور سے معرکۂ کارزار کے لئے ایک بہت ہی وسیع اور کشادہ میدان منتخب کیا جاتا تھا، جس کے لئے حسب ذیل چیزوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا،

(۱) میدان آبادی سے زیادہ دور اور نہ نزدیک ہو،

(۲) اس کی زمین سخت ہو لیکن پتھریلی نہ ہو تاکہ گھوڑوں کے کھر زخمی نہ ہونے پائیں،

(۳) زمین گیلی اور ریتیلی نہ ہو، تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو،

(۴) زمین پر زیادہ گرد و غبار نہ ہو تاکہ جنگ کی شدت کے وقت گرد کے بادل اس میں حائل نہ ہوں

(۵) اس کے آس پاس پانی آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہو۔[۱]

میدانِ جنگ میں فطری سہولت اور مدافعت بھی مدِ نظر رکھی جاتی تھی، مثلاً خسرو خان غیاث الدین

---

[۱] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۳۷ء۔

تغلق سے جنگ کرنے کے لئے سیری سے باہر آیا، تو اُس نے حوض علائی کے پاس جنگ کے لئے اس طرح میدان منتخب کیا کہ حوض علائی کے سامنے باغات تھے، اور پشت پر دہلی کا حصار تھا، محمد تغلق اودھ کے حاکم عین الملک کی بغاوت فرو کرنے کے لئے قنوج پہنچا، تو لڑائی کے وقت اس کے لشکر کی پشت پر شہر قنوج اس کی محافظت کر رہا تھا[۱]

کبھی غنیم کے راستے کو مسدود کرنے کے لئے لشکر گاہ اور میدانِ جنگ کے چاروں طرف خندق کھُدی جاتی تھی، اور خندق کے گرد لکڑی کا حصار بنالیا جاتا تھا، علاء الدین مغلوں سے سیری کے پاس جنگ کرنے آیا، تو مولانا برنی رقمطراز ہیں،

"سلطان علاؤ الدین باندک سوارے کہ در شہر داشت از شہر بیرون آمدہ در سیری لشکر گاہ کرد و از غلبۂ مغل و ہجوم مغل سلطان را ضرورت شد کہ گرد بر گرد لشکر خود خندق کاوانید و بر گرد خندق از تختہا ے درہا ے خانہا ے مردمان حصار چوبی بیدا نید و راہ در آمد مغلان را در لشکر گاہ خود مسدود کرد[۲]"

شیر شاہ ہر جنگ میں اپنی لشکر گاہ کے ارد گرد خندق کھدواتا، اور مٹی کا حصار بنواتا تھا، اس کا حریف ملو خان (والی منڈو، اجین، سارنگ پور وغیرہ) سپر ڈال کر اس سے ملنے آیا تو عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ

"شیر شاہ نے ملو خان کو اپنے تمام لشکر کی ترتیب دکھائی جس کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا، کبھی اس نے ایسی فوج نہیں دیکھی تھی، جس وقت بادشاہ کا چتر سواروں کو دکھائی دیا، تو وہ اپنی تلواریں میان سے نکال کر چتر کی طرف دوڑے آئے، اور گھوڑوں سے اُترے، سواروں کے کل دستوں نے اس طرح سلام کیا کہ وہ لڑائی کے دن کیا کرتے تھے"

---

[۱] برنی ص ۴۸۰، ابن بطوطہ ص ۱۸۰ [۲] برنی ص ۲۵۱

جب اس کو معلوم ہوا کہ ہر منزل مین سپاہی ایسی محنت و مشقت کرتے ہین، کہ لشکر کے گرد خندق کھودتے ہین، اور قلعہ بناتے ہین، تو اس کے ہوش اڑ گئے، اُس نے افغانون سے کہا اللہ اکبر! کیسی محنت کرتے ہو، لمحہ بھر آرام لینا حرام جانتے ہو، افغانون نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا بھی اسی طرح محنت کرنے کا دستور ہے، اس لئے ہم کو بھی محنت و مشقت کی ایسی عادت ہوگئی کہ اس سے کلفت مطلق نہین معلوم ہوتی ہے، سپاہی کو چاہئے کہ اس کا بادشاہ جیسی بھی محنت و مشقت و خدمت لینی چاہئے، اس کو کرنے سے وہ تنگ نہ آئے، آرام کرنا عورتون کا کام ہے، نیک مردون کے واسطے آرام کرنا شرم کا مقام ہے،"[1]

آگے چل کر عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہی لشکر کے گرد خندق کھودنے مین بڑے بڑے امرا بیلدارون کی طرح پھاوڑے چلاتے تھے، ملو خان کو خوف ہوا کہ کہین اس کو بھی بیلداری نہ کرنی پڑے، اس لئے شیر شاہ کو چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ فرار ہوگیا[2]، ۹۵۰ھ مین شیر شاہی لشکر ناگور، اجمیر اور جودھپور کی طرف روانہ ہوا، تو ریگستانی علاقون مین ریت کی وجہ سے قلعہ اور خندق تیار نہ ہو سکی، شیر شاہ کے پوتے محمد خان بن عادل خان نے پھر یہ ترکیب کی کہ تھیلون مین ریت بھر کر قلعہ بنایا[3]،

مندرجۂ بالا باتون کا خیال تیموریون کے زمانہ مین بھی کیا جاتا تھا، تیمور تزوک جنگ و جدل کے سلسلہ مین لکھتا ہے :-

"وامر نمودم کہ امیر الامراء در زمین جنگ گاہ چہار چیز ملاحظہ نماید، **اوّل** آب آن سرزمین، **دوم** زمینے کہ سپاہ را گنجائش داشتہ باشد، **سیوم** کہ بر غنیم مشرف باشد و آفتاب

---

[1] تاریخ شیر شاہی مصنفہ عباس خان سروانی بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۴۰۹ - ۳۹۳، نیز دیکھو تاریخ ہند جلد سوم مصنفہ شمس العلماء محمد ذکاء اللہ ص ۲۱۰ [3] الیٹ جلد چہارم ص ۴۰۵، ذکاء اللہ ص ۳۱۹۔

"روبرو نباشد تا شعاع آفتاب چشم سپاہ را خیرہ نگرداند چہارم پیش روے جنگ گاہ کشادہ ووا باشد"[1]

میدان جنگ میں مذکورۂ بالا سہولتیں میسر ہو جاتیں تو تیموری لشکر کے سپاہی ایک بے پناہ قوت بن کر دشمنوں سے لڑتے، اور فتح و کامرانی حاصل کرتے، چنانچہ اُن کی میدان جنگ کی نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی کا خوف اور رعب ان کے مخالفوں پر ہر زمانہ میں رہا، ہندوستان کی سب سے بہادر قوم یعنی راجپوت بار بار میدان کھو کر اپنی قسمت آزمائی کرنے کے بعد اپنا تحفظ اسی میں سمجھتے تھے کہ تیموریوں کے خلاف حصار اور قلعہ میں محصور ہو کر اپنی مدافعت کریں،

اگر مذکورۂ بالا سہولتیں میسر نہ ہوتیں تو شاہی لشکر کو بڑی دقتیں اور مشکلیں پیش آتیں جو سا کی جنگ میں ہمایون کو شیر خان کے مقابلہ میں جو شکست ہوئی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایون کی فوج کو خاطر خواہ میدان جنگ نہیں ملا، دونوں مخالف فوجیں گنگا کے ساحل پر مقیم ہوئیں، دونوں کے درمیان گنگا کی ایک شاخ جیسی گز چوڑی بہتی تھی، شیر خان نے سبقت کر کے ایک ایسے مقام پر اپنی فوج کو لا کر کھڑا کیا، جو اس کے لئے ہر طرح مفید ثابت ہوا، ہمایون کی فوج کو مجبوراً ایسی جگہ قیام کرنا پڑا، جہان کی زمین بہت ہی ڈھلوان تھی، اس کی گہرائی میں کیچڑ اور دلدل ایسی تھی کہ سوار اور گھوڑے اس میں پھنس کر رہ جاتے تھے[2]،

اکبری عہد میں گڈہ کی رانی درگاوتی کے خلاف خواجہ آصف خان نے لشکر کشی کی تو رانی درگاوتی نے گھٹے ہوئے میدان میں آنے کے بجائے نرہی کے پاس اپنی فوج کا پڑاؤ اس طرح ڈالا کہ اس کے چاروں طرف سر بفلک پہاڑ تھے، اردگرد درختوں کے گھنے جنگل تھے، سامنے دریاے گور تھا، اور اس کے دوسری

---

[1] تزوک تیموری ص ۱۹۱ و ۱۹۲[2] تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی بحوالہ ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۷۰ و ذکاء اللہ جلد دوم ص ۲۹۳،

طرف دریائے نربدا بہتا تھا، اس دریا کے پاس ایک پہاڑی پشتہ (گریوہ) تھا، جس سے ہو کر نربدی کا راستہ جاتا تھا، لیکن یہ راستہ بہت ہی تنگ اور ہولناک تھا چنانچہ رانی درگاوتی کے لشکر کے نا کے بہت ہی دشوار گذار تھے، تیموری فوج کو رانی کے لشکر تک پہونچنے کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ میسر نہ تھا، مگر شاہی فوج کے امراء بہادر سپاہی جانبازی سے کام لے کر پہاڑی پشتہ پر پہنچ گئے اور یہاں اپنی توپوں کا ایک مورچہ بنا کر اتنی زبردست آتشباری کی کہ رانی درگاوتی کے لشکریوں کو کٹ مرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

ابراہیم حسین مرزا کے خلاف اکبر گجرات میں معرکہ آرا ہوا تو اس کی سب سے بڑی دقت میدان جنگ کی سرزمین تھی، جو بہت ہی خراب اور کانٹوں سے بھری تھی، دو سوار پہلو بہ پہلو ساتھ گذر نہیں سکتے تھے، ان خار دار جھاڑیوں سے فائدہ اٹھا کر غنیم کے دو سواروں نے اکبر پر حملے کئے، اکبر کے فوجی سردار پاس ہی کھڑے تھے، مگر جھاڑیاں بیچ میں حائل تھیں، اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، اکبر نے غیر معمولی سرعت سے جھاڑیوں کے اوپر سے اپنے گھوڑے کو جست کرایا اور دشمنوں کا مقابلہ کیا،

خان اعظم مرزا کوکہ نے سلطان مظفر گجراتی کے خلاف لشکر کشی کی، تو دونوں فوجیں ساہرمتی کے پاس مد مقابل ہوئیں لیکن شاہی لشکر کو زمین کے نشیب کے باعث پیچھے ہٹنا پڑا،[۵۳]

اوڑیسہ میں افغانوں نے اکبر شاہی فوج کا مقابلہ کیا تو ملک پور میں انھوں نے اپنی فوج کو اس طرح کھڑا کیا کہ بیچ میں جنگل تھا اور اس کے چاروں طرف ایک دریا بہتا تھا، شاہی فوج کی باگ راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، اس نے پیش قدمی کر کے غنیم کی فوج کے نزدیک ایک سرکوب پر قبضہ کر لیا اور وہاں فوراً ایک قلعہ تعمیر کر لیا، جہاں سے توپوں کی آتشباری کر کے دشمنوں کو پسپا کیا،[۵۴]

شاہجہانی عہد میں اوزبکوں نے شاہی فوج کا تسلط اور اقتدار اپنے ملکوں میں اس لئے قائم نہیں ہونے دیا کہ وہ دروں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کی غارتگری کرتے تھے، عالمگیری عہد میں آسام کے علاقوں میں گڈہ اور اہوم کی مخالفت محض اس لئے جاری رہی کہ وہ جنگلوں اور بحری دروں

---

۵۱ اکبرنامہ جلد دوم ص ۲۱۲-۱۳ ؛ ۵۲ ایضاً جلد سوم ص ۱۵ ۵۳ اکبرنامہ جلد سوم ص ۵۹۳ ۵۴ ایضاً ص ۶۱۱-۱۲،

ین لڑنے کے عادی تھے، مرہٹے پہاڑیوں مین چھپ چھپ کر تیموری فوج کا مقابلہ کرتے رہے، اس لئے تیموری ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکے،

میدانِ جنگ مین فوجین صف آرا ہوتین تو تیموری بھی لشکر گاہ کی مدافعت کے لئے مختلف تدبیرین اختیار کرتے تھے، امیر تیمور جب محمود تغلق کے خلاف جنگ کے ارادہ سے آیا تو اس کے لشکر گاہ کے چارون طرف خندق کھودی گئی، وہ خود لکھتا ہے،

"وازین جہت در دور لشکر خندق کندم، و میانِ خندق خود را استوار ساختم"[1]

ہاتھیون کو پسپا کرنے کے لئے تیمور نے صف لشکر کے آگے چپرون سے حصار بنایا، اور اس کے گرد خندق کھودی، خندق کے سامنے بھینسون کی گردنون اور ٹانگون کو چمڑے سے باندھ کر ان کو کھڑا کیا، اور آہنی کانٹے بنا کر پیادون کو دئیے کہ ہاتھی حملہ آور ہون تو یہ کانٹے راستہ مین بکھیر دئیے جائین[2]

بابر نے پانی پت کے میدان مین اپنے لشکر گاہ کا تحفظ اس طرح کیا کہ دائین طرف پانی پت شہر کے محلے اور مکانات کی آڑ لی، سامنے توپون کے ارابے اور مٹی کے توبرے رکھے، بائین طرف خندق کھود کر درختون کی شاخون کی باڑ لگائی[3]، کنواہا کی جنگ کے موقع پر بھی بابر نے اپنے لشکر گاہ کو ارابون اور خندقون سے مستحکم کیا تھا[4]، ہمایون کے خلاف سلطان بہادر مانڈسور مین صف آرا ہوا، تو اس نے لشکر کے گرد خندق ہی کھود کر ہمایون کا مقابلہ کیا، طبقات اکبری مین ہے،

"رومی خان نے جس کے اختیار مین سلطان بہادر کا توپ خانہ تھا، کہا کہ صفون کی جنگ مین توپ وتفنگ کام نہین آتا ہے، توپ خانہ تو کافی فراہم کر لیا گیا ہے چنانچہ قیصر روم کے سوا اس قسم کا توپ خانہ کسی اور کے پاس نہین، لیکن مناسب یہ ہو کہ لشکر کے گرد خندق کھودی جائے، اور ہر روز جنگ ہو، اور جب مغلون کے لشکر مقابلہ مین آئین گے

---

[1] تزک تیموری ص ۳، [2] ظفر نامہ جلد دوم ص ۱۰۲، [3] بابر نامہ ص ۲۶۶، [4] ایضاً ص ۳۱۰

تو توپ و تفنگ کی ضرب سے ان میں سے اکثر ہلاک ہو جائیں گے، سلطان بہادر نے یہ رائے پسند کی، اور اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، دو ماہ کی مدت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل میں پڑے رہے،[۱]

ابوالفضل کا بیان ہے کہ خندق کے چاروں طرف ارابہ کا حصار بھی بنایا گیا، ہر حصار پر توپیں نصب کر دی گئیں، مگر توپوں کی یہ قلعہ بندی کام نہیں آئی، ہمایوں نے حصار کے باہر توپوں کی زد سے دور تیر اندازوں کی ایک بڑی جماعت دشمنوں کی رسد کو تاراج کرنے کے لئے مقرر کر دی، چنانچہ ہر طرف سے سلطان بہادر کی فوج کی رسد بند ہو گئی جس سے لشکر میں بڑی سراسیمگی پھیل گئی، اور یہ توپخانہ کا قلعہ قید خانہ بن گیا، بالآخر سلطان بہادر ہلکی سی جھڑپ کرنے کے بعد توپخانہ میں آگ لگا کر فرار ہو گیا،[۲]

۹۹۲ھ میں اکبر نے سلطان مظفر گجراتی سے احمد آباد کے پاس سرکیچ میں جنگ کی، تو شاہی فوج کے ایک طرف شہر اور دوسری طرف دریا تھا، میدان جنگ کو خار دار شاخوں سے استوار کیا، اور پھر ان خار دار شاخوں کو مٹی کی دیوار بنا کر مستحکم کیا،[۳]

اکبر کے اکتالیسویں سال جلوس میں صادق خان نے نظام الملک کے خلاف دکن میں فوج کشی کی تو جنگ و جدل کا مقام لنکر واقع دریائے بان گنگا (شاخ گوداوری) تھا، شاہی فوج نے لشکر گاہ کو اس طرح ترتیب دیا کہ سامنے دریا، اور پشت پر ایک رود بار تھا،[۴]

جہانگیر کے اٹھارویں سال جلوس میں شاہی فوج گجرات میں عبد اللہ خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی، تو تزک جہانگیری میں ہے (ص ۳۰۳)

"از اتفاقات حسنہ جائے کہ لعنت اللہ (یعنی عبد اللہ) فرود آمدہ بود، زمین پست و بلند بود، از قوم زارا نبوہ و کوچہائے تنگ داشت بنا برین سلسلۂ افواج او انتظام شایستہ نیافت

---

۱ طبقات اکبری جلد دوم ص ۳۵ ۲ اکبر نامہ جلد اول ص ۱۳۳ ۳ ایضاً جلد سوم ص ۴۲۵ ۴ ایضاً ص ۶۱۵،

شاہجہانی عہد میں داراا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کی پہلی لڑائی میں دارا کی طرف سے مہاراجہ جسونت سنگھ نے نربدا کے ساحل پر دھرما وت میں میدان جنگ منتخب کیا لیکن اس کی زمین بہت ہی تنگ پست نا ہموار اور نشیب و فراز سے پر تھی، مہاراجہ جسونت سنگھ نے حسب معمول لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق بھی کھدوائی اور میدان کی زمین کو پانی ڈال کر کیچڑ سے آلودہ کر دیا، جو سواروں کے گھوڑوں کے لئے مضر ثابت ہوا[1]

خندق کھود کر لشکر گاہ کو محفوظ کرنے کی تدبیر آخر آخر وقت تک قائم رہی، بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ شروع ہوئی، تو شہزادہ عظیم الشان نے لاہور پاس راوی کے ساحل پر اپنے لشکر کی قیامگاہ کو جس طرح ترتیب دیا، وہ خافی خان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو،

"پشت بدریائے راوی دادہ فرود آمدہ دو طرف لشکر حکم کندن خندق فرمود و طرف دیگر لشکر عظیم الشان دریا داشت"[2]

فرخ سیر اور جہاندار شاہ ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے تو جہاندار شاہ نے پہلے اپنے لڑکے عزالدین کو پچاس ہزار سوار دے کر فرخ سیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا، عزالدین کھجوہ میں اپنے لشکر کے ساتھ قیام پذیر ہوا، لشکر کے گرد اس نے خندق کھدوائی، جو پندرہ فٹ چوڑی اور دس فٹ گہری تھی، خندق کی مٹی لشکر کے طرف ڈال دی گئی جس کی اونچائی قد آدم کے برابر تھی، اسی اونچائی پر مورچال بنایا گیا، (تفصیل کے لئے دیکھو خافی خان جلد دوم ص ۶۹۹)

خندق کھود کر توپوں کے لئے جو مورچے تیار کئے جاتے وہ ملچار یا مورچل یا مورچال کہلاتے تھے، گویہ اصطلاحات قلعہ اور حصار کی جنگ کے سلسلہ میں زیادہ استعمال کی گئی ہیں، جیسا کہ آئندہ

---

[1] واقعات عالمگیری عاقل خان ص ۲۳، لاہور اڈیشن [2] منتخب اللباب جلد سوم ص ۶۸۶،

ذکر آئے گا، مگر میدان جنگ میں بھی زمین کھود کر توپوں کی مورچہ بندی کے لئے ملچار اور مورچل بنائے جاتے، مثلاً شاہجہانی عہد میں شہزادہ اورنگ زیب بلخ کی مہم میں اوزبکوں سے لڑ رہا تھا، تو تیمورآباد کے پاس اس نے اپنے لشکرگاہ کے گرد ملچارہا تعمیر کئے، بادشاہ نامہ میں ہے،

"وباشارۂ آن والاگوہر بہ داران ظفر آئین کوہ تمکین بر دور اردو ملچارہا مقرر نمودہ و در ہر جانب با سپاہیان بزرگزین مراسم حفظ وحراست بتقدیم رسانیدہ شب گذرانیدند"[1]

دارا شکوہ اپنی جنگ جانشینی کی دوسری لڑائی کے سلسلہ میں اورنگ زیب سے لڑنے کے لئے دھولپور پہنچا تو عاقل خان کا بیان ہے،

"در ساحل آب چنبل خیمہ و خرگاہ تا گنبد نیلگون برافراشت و بر مسالک و معابر مورچال مقرر کردہ جابجا افواج توپخانہ تعبیہ نمود از چہار جانب و اطراف راہ عبور بر موکب منصور مسدود ساخت"[2]

دارا شکوہ جب دھول پور سے بڑھکر سموگڈھ میں معرکہ آرا ہوا، تو میدان جنگ میں اس کی فوج کو پانی کی کمی کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا، اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لئے قتال و جدال کا میدان گرم ہوا تو جاجو کی جنگ میں شہزادہ اعظم شاہ کے لشکریوں کو بھی پانی کی قلت کے سبب بڑی صعوبت اور مصیبت اٹھانی پڑی، جاجو کا میدان اعظم شاہ کی فوج کے لئے اس کی گرد آلود زمین کے باعث بھی نہایت مضر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا[3] جنگ جب انتہائی شدت کو پہنچ گئی، تو یکایک اعظم شاہ کی مخالف سمت سے بہت تیز اور تند ہوا چلی، گرد و غبار کی کثرت سے لڑائی کا میدان لشکریوں کی آنکھوں میں ایسا سیاہ اور تاریک ہوگیا کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم ص۴۹۲ [2] واقعات عالمگیری ص۳۲، ۵۳ منتخب اللباب جلد دوم ص۵۹۲ [3] عہد اکبری میں شاہی فوج جانی بیگ کے خلاف سیوان کے (ٹھٹھہ) قریب جنگ کر رہی تھی، تو شاہی فوج کو گرد آلود زمین کی وجہ سے میدان میں بہت دقتیں اٹھانی پڑیں جنگ کے درمیان تیز ہوا چلنے لگی تو از شورش باد و خاک از یک دیگر آگہی نبود (اکبر نامہ جلد سوم ص۶۱۹)

رہی لیکن یہی ہوا، اعظم شاہ کے حریف معظم شاہ کے لئے فتح و کامرانی کی وجہ بن گئی، موخر الذکر کے لشکر سے جو تیر پھینکا جاتا وہ ہوا کی مدد سے اوّل الذکر کے فوجیوں کے زرہ و بکتر میں تیزی سے پیوست ہو جاتا تھا، اور جو سنگ ریزے باد صرصر سے اڑ کر اس کے لشکر میں پہونچتے وہ گولیوں کی طرح لشکریوں کے چہرے پر لگتے تھے، برخلاف اس کے اعظم شاہ کی طرف سے جو بان تیر اور گولہ پھینکا جاتا وہ مخالف ہوا کی وجہ سے یا تو چند قدم پر جا کر گر جاتا، یا پلٹ کر خود اسی کی صف میں چلا آتا تھا، (خافی خان جلد دوم ص ۵۹)

بہادر شاہ کی وفات کے بعد شہزادہ عظیم الشان لاہور کے پاس راوی کے کنارے جہاندار شاہ سے جنگ کر رہا تھا کہ یکایک ایک آندھی آئی اور راوی کی ریت ہوا میں بادل کی طرح چھا گئی، لشکریوں کو غبار کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، وہ مشکل سے اپنی آنکھیں کھول سکتے تھے، وہ صرف توپوں کی صدائیں سن رہے تھے، اور بے حس و حرکت کھڑے تھے، اس تاریکی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ لشکریوں نے عظیم الشان کے خزانہ کو لوٹنا شروع کر دیا، [۱]

مجلسِ مشاورت | لڑائی شروع ہونے سے پہلے اعلیٰ فوجی عہدیداروں کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، سلاطین دہلی کے زمانہ میں اس قسم کی مجلس کے لئے امیر خسرو نے کبھی صرف "مجلس" [۲] اور کبھی "مجلس ملکی" [۳] اور عصامی نے "انجمن" [۴] کی اصطلاح استعمال کی ہے، امیر خسرو نے اس مجلس میں شریک ہونے والوں کو "رائے زنانِ لشکر" کہا ہے [۵]، یہ مجلس سر لشکر کی صدارت میں منعقد ہوئی، اور فوج کے اکثر "ملوک کبار" "مردان رزم و کار" اور "دیلمان سال خوردہ" اس میں شریک ہوتے، کیونکہ مہم کی کامیابی کی ذمہ داری ان پر بھی ہوتی تھی [۶]، عارض اور ان کی عدم موجودگی میں نائب عارض اس مجلس میں ضرور شریک ہوتا،

---

[۱] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۰۳ [۲] تغلق نامہ ص ۴۸، [۳] خزائن الفتوح ص ۴۴، [۴] فتوح السلاطین ص ۲۵۴ [۵] خزائن الفتوح ص ۱۴۲ [۶] ایضاً ص ۱۳۹، تغلق نامہ ص ۴۸، مجلس مشاورت کی مثالوں کے لئے دیکھو تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی الیٹ جلد چہارم ص ۳۴۰، ۳۶۳، ۳۸۱ وغیرہ،

اہم فیصلے غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد کئے جاتے، کیونکہ اگر لشکریون کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا کہ سرلشکر کے کسی حکم سے ان کی جانین محض تلف ہو جائین گی، تو وہ اس کے حکم کو بجالانے سے انکار کر دیتے، اس لئے آداب الحرب والشجاعہ کے مولف فخر مدبر نے لشکر کے نگہبانون کے لئے یہ ہدایت لکھی ہو کہ فوج کی کثرت اس وقت تک مفید اور موثر نہین ہو سکتی، ہے جب تک کہ باقاعدہ مشورون سے مہم مین کافی احتیاط اختیار نہ کی جائے[1]،

تیموریون کے زمانہ مین بھی لڑائی کے موقع پر جنگی مشاورت کی خاص اہمیت تھی، امیر تیمور نے تزک تیموری مین اُن کے متعلق جو اپنے خیالات جابجا ظاہر کئے ہین، وہ ملاحظہ ہون :-

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ مخالفون پر غالب آنا نہ لشکر کی کثرت سے اور نہ ان سے مغلوب ہونا، فوج کی کمی سے ہوتا ہے، بلکہ غلبہ صرف تائید اور تدبیر سے حاصل ہوتا ہے،

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ رائے تدبیر، اور مشورہ عقلمند اور ہوشیار آدمی سے کرنا چاہئے اگرچہ کامیابی کا راز پردۂ تقدیر مین چھپا ہوا ہے" لیکن رسول اللہ صلعم کی سنت کے موافق مین نے جو کام کیا، مشورہ سے کیا، جب ارباب رائے واصحاب مشورہ اکٹھا ہوئے تو بُرے بھلے، نفع ونقصان اور پیش آنے والے کامون کے کرنے یا نہ کرنیکے متعلق مین نے ان سے گفتگو کی، اور جب ان کی باتین سنین، تو دونون پہلوؤن پر غور کیا، اور نفع ونقصان کو سوچا، اور اس کام کے خطرات کو غور سے دیکھا، جس کام مین مجھکو دو خطرے نظر آئے، اس کو نظر انداز کر دیا، اور جس کام مین صرف ایک خطرہ تھا، اس کو اختیار کر لیا،.........

مین نے تمام کامون مین مشورہ سے کام لیا، اور اس کام کے انجام دینے مین صحیح تدبیر کی، اور اس کام کے پورے ہونے کی راہ پر غور کرنے کے بعد اس کام کو شروع کیا، اور تدبیر،

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر حیدر آباد دکن، اکتوبر ۱۹۳۷ء

عزم صحیح، احتیاط، انجام بینی، اور دور اندیشی سے اس کام کو پورا کیا، مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ صاحبِ مشورہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں، جو باتفاق اپنے قول و فعل پر مستحکم عزم کرلیں، اور اس کام کو کسی وجہ سے نہ چھوڑیں، اور اگر کہیں کہ ہم اس کام کو نہ کریں گے، تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں"

مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ مشورہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک زبان سے، دوسرا تہ دل سے، میں نے جو زبانی مشورہ سنا، اس کو صرف کان سے سُن لیا، اور جو مشورہ تہ دل سے سنا، اُس کو کان اور دل دونوں میں جگہ دی،

فوج کشی کے وقت میں نے صلح و جنگ دونوں کے متعلق گفتگو کی، اور اپنے امراء کے دل کی بات کا سُراغ لگایا کہ وہ جنگ چاہتے ہیں، یا صلح، اور اگر انھوں نے صلح کا مشورہ دیا، تو صلح کے فوائد کا مقابلہ جنگ کے نقصان سے کیا، اور انھوں نے اگر جنگ کی بات چیت کی، تو اس کے فائدے پر صلح کے نقصان کے متعلق غور کیا، جس میں فائدہ زیادہ نظر آیا، اسی کو اختیار کرلیا، اور وہ مشورہ جو فوج میں نااتفاقی پیدا کرتا تھا، اس کے سننے سے میں نے احتراز کیا، اور جس صاحبِ مشورہ نے بے اختیارانہ مشورہ دیا، اس کو سُن لیا، اور جس شخص نے عاقلانہ اور مردانہ بات کی، اس کو بھی سنا،

میں نے مشورہ ہر شخص سے طلب کیا، لیکن ہر بات کی بھلائی اور بُرائی پر غور کیا، اور اس کے صلح و صواب کے پہلو کو اختیار کیا،[1]

تیمور کے جانشین مذکورۂ بالا زرین مشوروں سے برابر مستفید ہوتے رہے، ان کے عہد میں لڑائی کے موقع پر "مجالس کنکاش" اور انجمنوں کی مثالیں بکثرت ہیں،[2] میدانِ جنگ میں بادشاہ کی موجودگی

[1] تزوک تیموری ص ۹، ۱۰، ۷، ۶، ۵ [2] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۰۹، ۲۹۲، ۲۹۴، اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۳۴، ۴۲۵، ۴۰۰

مین ایسی انجمن اور مجلس کنکاش کا انعقاد اسی کی صدارت مین ہوتا، وہ نہ ہوتا تو صدارت کے فرائض سپہ سالار انجام دیتا، اور اس مین امرائے "ذوی الاقتدار"[۱] "اہل اعتبار"، "خبرت گزینان رکاب دولت"[۲] "کار آگاہان"[۳] "سران لشکر یعنی قشون اور تومان کے سردار وغیرہ شریک ہوتے، اس انجمن مشاورت مین خوب مباحثے ہوتے، اور ہر ایک فرد آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا، ضرورت کے وقت یہ انجمن مین لڑائی کے دوران مین بھی منعقد کی جاتی، اس وقت اجتماع شاہی تور کے نیچے ہوتا، مباحثے مین زیادہ تر نبرد آزمائی حملہ آوری اور صف شکنی کے قواعد وضوابط اور "دغا و بجا" کے رسوم و آداب پر گفتگو ہوتی۔[۴]

مجلس مشورت مین پر جوش تقریرین اس مجلس اور انجمن مین بعض اوقات ولولہ انگیز تقریرون سے لشکر کے سردارون اور عہدیدارون مین غیر معمولی جوش وخروش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، بعض مثالین ملاحظہ ہون،

علاؤالدین خلجی کی فوج کیلی مین مغلون کے مدمقابل ہوئی، تو ظفر خان نے فوجی سردارون کی ایک انجمن منعقد کی، اور ان کو مخاطب کرکے کہا، اے سران سپاہ! میدان جنگ مین کون سی تدبیر اختیار کرنی چاہیے، اگر ہم ان کفار سے جان بچا کر فرار ہو جائین، تو ہم اپنے سلطان کو کیا منہ دکھائین گے، اور اگر ہم لڑنے کو آمادہ ہو جائین، تو دس ہزار فوج کے مقابلہ مین ہمارے پاس ایک ہزار فوج ہے، ہم عجب کشمکش مین ہین، دو بھیڑیون کے درمیان ایک بھیڑ آگئی ہے، نہ پیچھے ہٹنے اور نہ لڑائی لڑنے مین بہتری ہے، لیکن مین وہی کرون گا جو اس مجلس مین آزمودہ کار اصحاب مجھکو کرنے کو کہین گے۔

فتوح السلاطین مین اس تقریر کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے۔

---

[۱] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۵ [۲] تا [۵] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۰۲ [۶] ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۴۲ - ۴۲۹ ذکا اللہ جلد سوم ص ۴۷، ۲۶۵،

بدیشان بگفت اے سران سپاہ چہ تدبیر باید درین حرب گاہ
ازین فوج کافر اگر بگذریم چہ رو پیش منعدار عالم بریم
درآید و تک پیچم در کارزار کجا یک ہزار و کجا دہ ہزار
عجب کار ما را بہ پیش آمدہ است دو گرگ از پس و پیش شیر آمدہ است
درعلف خرے نہ در کار زار کنیم انچہ گویند مردان کار

اس تقریر کو سُن کر اصحاب انجمن نے کہا اے خان ! مغلون کو پسپا کرنے مین تمھاری شہرت بہت ہی دور تک پھیل چکی ہے، اس لئے اگر تم لڑائی کئے بغیر سلطان کے پاس گئے، تو تمھاری شان مین کمی نہ ہوگی، اور سلطان تم سے ناخوش نہ ہوگا،

گروہے ز اصحاب آن انجمن بگفتند کاے خان فرخندہ فن
شکستی سراسر مغل را سپاہ ز ماہی رسید این خبر تا بہ ماہ
کنون عطف شایان تراز کارزار کہ شہ را براہت دو چشم است چار

ظفرخان شجاعت، بہادری اور معرکہ آرائی کے لئے اپنے زمانہ مین بہت مشہور ہو چکا تھا، اُس نے بزدلی اور کم ہمتی سے میدان جنگ چھوڑ کر واپس جانے مین ذلت اور خواری محسوس کی، اس کو اپنے فوجی سرداروں کا جواب پسند نہین آیا،

چو زان قوم بشنید خان این سخن خروشید و جوشید چون اہرمن

ظفرخان نے اُن کو مخاطب کرکے پھر کہا جب ایک دن مرنا ہے تو دشمنون پر حملہ کرکے مرنا بہتر ہے، مین تو اس ہندوستان مین ناموروں کی موت مرون گا، اور آج ہی کی لڑائی مین جان دون گا، تاکہ میرا نام تاریخون مین زندہ رہے، جو شخص اس نازک موقع پر میدان جنگ مین وفادار رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ تو فوجیوں کے ساتھ آگے بڑھے، تاکہ مہر و وفا کی کتاب مین اس کا نام باقی رہے، اور

جو مراجعت چاہتے ہیں، وہ واپس ہو جائیں اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں ہیں، وہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچ جائیں، فتوح السلاطین کے مصنف کی زبانی بھی اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں[1]،

بگفتا کہ اے قوم آشفتہ رائے ندانید فرقے ز سر تا بپائے

ہمہ حال چون جان بباید سپرد بباید نمودن یکے دست برد

من امروز آید چو نام آوران کنم ختم در ملک ہندوستان

دہم جنگئے ایدر کہ در روزگار بماند بشہنا ہما یادگار

گرازے کہ با ما درین وقت جنگ وفائے نماید بہنگام جنگ

ہمو ہست ہمراہِ اہلِ غزا بود نقش نامش بہ مہر و وفا

گروہے کہ دارند بر عطف رائے نہ بستہ است شان را کسے دست و پائے

سپہ تا نکو داشت بر جنگ ساز سلامت ہمین دم بگردند باز

ظفر خان کی تقریر سن کر تمام فوجی سردار بے حد متاثر ہوئے، یکزبان ہو کر بولے کہ ہم جان دینے اور آگ میں کود پڑنے کے لئے بھی تیار ہیں،

کہ تا جان بود جان سپاری کنیم بہ پشت سر خود بخاک افگنیم

بفرمان خان جملہ راضی شویم اگر خان فرستد در آتش رویم

غازی ملک (یعنی غیاث الدین تغلق) جب خسرو خان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دہلی کی طرف بڑھا، تو خسرو خان نے پیشقدمی کر کے سرستی کے پاس اس کو روکنا چاہا، خسرو خان کے پاس کثیر فوج تھی، لیکن غازی ملک نے اپنی پریشانی اور سراسیمگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اپنے لشکر کے سرداروں کو بلا کر ایک پرجوش تقریر کی، جس کو امیر خسرو نے تغلق نامہ میں اس طرح منظوم کیا ہے،

---

[1] فتوح السلاطین ص ۲۵۵،

ملک در پیش یک یک را طلب کرد — پس از دل قصه را همان لب کرد

که ما را چرخ پیشین آورد کارے — که گردش هست در وی چرخ وارے

گرانیروے پیل است و دل شیر — که هم بازو شود با ما به شمشیر

نخست از خون خود خیزد چو لاله — پس از خون عدو شوید پیاله

به خنجر نهد ا دل سر خویش — کشد پس بر دگر سر خنجر خویش

بلے مردان به هر سازے و سوزے — کسان را بر درند از بهر روزے

بود هر روز عشرت را شمارے — فتد او بعد عمرے کار زارے

بکارے ناید ار یارے دران روز — بسوزش دل که نبود یار دلسوز

بود تیر از برائے رزم نخچیر — تو بے آن چوبه دان چوبه تیر

گمان گر بشکند هنگام پیکار — زہے کے یابد از لب‌های سوفار

اگر شاهین زبون گردد ز شارک — کله گُل مرغ را زیبد تبارک

بیاید آن که دارد کار با ما — شوید از عهد و پیمان یار با ما

شود گر عهد با محکم به سوگند — بکار جان شویم از جان کمربند

دگر یارے ندارد میل یاری — که دشوار است کار جان سپاری

درین یاری که دارد کار با من — دل من هست آخر یار با من

بدین دل کاهنین سدیست پایے — کنم گر سد آهن باشد از جایے

مرا یاور بس است دو هم ترازو — دو بازوے من و تعوید بازو

شنیدم بود رستم چیره دستے — که گاه حمله تنها صف شکستے

نه آن رستم ز من در کار پیش است — که هر کس رستمے در عهد خویش است

چو من بر نام یزدان تکیہ کردم	یقین است آن کہ تنہا چیرہ کردم
مرا دمن چو جز دین را فرج نیست	من و این کار بر غیرے حرج نیست

اس تقریر سے جو اثر پیدا ہوا، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

چو بشنیدند مردانِ سرافراز	ز مخدوم خود این حرف سرانداز
سراسر جون یک ہمہ سرباز بودند	بروے خاک سرہا باز بردند
پس آنگاہ از سراسربازی خویش	سر خود خدمتے بردند در پیش
فرو گفتند کاے سرورسران را	بزیر پاے تو سر سروران را
ہمیشہ باد سر بار کلاہت	کلہ گوشہ کشیدہ سر ہماہت
سرے کز دولت عمری کلہ داشت	ز کارت چون توان اکنون گلہ داشت
بسر بازی چو مارا مژدہ دادی	سر ما در کلہ ناید زشادی
نہ ما آن سرسری آریم پیشت	کہ ندہیم ارفتد سرہاے خویشت
چہ باشد یک سر ما زیر خنجر	ہزاران پارہ گردد جملہ یک سر
زہر پارہ جدا برخیزد آواز	کہ باز از بہر تو کردیم سرباز
کمر بستیم و پیمان نیز بستیم	بر آن پیمان رگ جان نیز بستیم
کہ تا جان در تن است و سر بگردن	نخواہیم از درت سر دور کردن
چو ما را سر جدا گشت اندرین کار	تو دانی خواہ صلح و خواہ پیکار[1]

بابر راناسانگا سے جنگ کرنے کو کنواہا کے میدان کی طرف بڑھا، تو اُس نے اپنے فوجی امراء اور

[1] تغلق نامہ ص ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - اسی جنگ مین ایک اور موقع پر غیاث الدین تغلق نے ایک تقریر کی تھی وتغلق نامہ ص ۲۰ پر درج ہے ؛

سرداروں میں سراسیمگی، بددلی اور کم ہمتی کے آثار دیکھے لیکن اس نازک موقع پر اس نے غیر معمولی ہوشمندی سے کام لیا، اپنے ہمراہیوں میں شجاعت و بہادری اور جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک مجلس کنکاش منعقد کی، اور فوجی عہدہ داروں کے سامنے حسب ذیل تقریر کی،

"اے امرا اور سرداران فوج!

ہر کہ آمد بجہاں اہل فنا خواہد بود آنکہ پایندہ و باقی است خدا خواہد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا میں آیا ہے وہ یہاں سے جائیگا بھی، بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہو کر مرنا بہتر ہے،

بنام نکو گر بمیرم رواست مرا نام باید کہ تن مرگ راست

جانتے ہو کہ یہاں سے ہم لوگوں کا وطن اور شہر کتنی دور ہے؟ کئی مہینوں کا راستہ ہے، خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ ہم کو شکست ہو جائے، اور اگر ہم کو شکست ہو گئی (نعوذ باللہ) تو پھر ہم کہاں کے رہیں گے؟ کہاں ہمارا وطن؟ کہاں ہمارا شہر؟ ہم اجنبیوں اور بیگانوں کے ساتھ پڑے ہوں گے، جانتے ہو اگر ہم کو شکست ہو گئی، تو مسلمان بادشاہ جو دنیا کے ہر گوشہ میں موجود ہیں کیا کہیں گے، اور ہم کو کس زبان سے یاد کریں گے، اہل دنیا کی گفتگو اور طعن و ملامت کو چھوڑ دو، قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں کیا عذر پیش کر سکوں گا کہ ایک سلطنت مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئی، میں اس سلطنت کا بادشاہ اپنے بہت سے ہم مذہبوں اور ہم قوم کو قتل کر کے بن بیٹھا تھا اور آج غیر مسلموں سے جنگ کئے بغیر، کم از کم بغیر عذر شرعی کے واپسی کا راستہ تلاش کروں؟ آخر ان کے ہاتھوں اس ملک کے باشندوں پر کیا کیا مصیبتیں نہ آئیں گی، افسوس اب وہ وقت ہے کہ دل میں شہادت کی ٹھان کر جہاد کے لئے بڑھیں،

چون جان آخر از تن ضرورت رود　　ہمان بہ کہ باری بعزت رود

سر انجام گیتی ہمین است و بس　　کہ نامی بہ نیکی بماند ز پس

اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے، اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے، تو غازی کہلائے، اور اگر مرے تو شہید ہوئے، دونون حال مین ہم کو بڑا اجر اور بلند مرتبہ ملتا ہے، آؤ ہم سب مل کر حلف اٹھائین کہ ہم موت سے نہ بھاگین گے، اور جب تک دم مین دم ہے اس لڑائی سے منہ نہ پھیرین گے،[۵]

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سردارون، نوکرون، چھوٹون اور بڑون نے کلام پاک کو ہاتھون ...ن سے کر قسمین کھائین کہ وہ میدانِ جنگ سے کسی حال مین بھی منہ نہ موڑین گے، چنانچہ لڑائی ...ئی تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوئی،

شیر شاہ ہمایون کے خلاف قنوج مین معرکہ آرا ہوا، تو جنگ سے پہلے اُس نے اپنے لشکریون ...اس طرح مخاطب کیا :

"مین نے بہت سعی کرکے تم کو جمع کیا ہے، اور تمھاری تربیت مین حتی المقدور کوتاہی نہین کی، آج ہی کے دن کے لئے تمھاری نگاہداشت کی ہے، آج ہی امتحان کا روز ہے، آج ہی کے دن جو میدانِ حرب مین غالب ہوگا، اپنا رتبہ بڑھائے گا، ایسی کوشش کرو کہ وقت کارزار مین سب افغان یک دل و یک زبان ہون، افغانون کی فوج مین اتفاق ہو تو شمشیر زنی مین کوئی ان کے برابر نہین، مین اپنے عزیزون سے یہ التماس کرتا ہون کہ حسد، خصومت اور اختلاف کو جانے دو، سلطان ابراہیم کے عہد مین یہ حسد، مخاصمت اور

---

[۵] یہ تقریر بابر نامہ اردو ترجمہ (ص ۳۰۹-۳۱۰) ہمایون نامہ از گلبدن بیگم (ص ۱۶) اور طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۶ کے مختلف ٹکڑون کو ملا کر تیار کی گئی ہے۔

اختلاف ہی کی وجہ سے افغان مغلوب ہوئے جس کا مزہ انھون نے خوب چکھا لشکر کو فیروزمندی اور بلندی اس کی یکدلی سے حاصل ہوتی ہے، اے عزیزو! تم کو یہ معلوم رہے کہ مین نے عزم جزم کرلیا ہو کہ اس رزمگاہ سے اس وقت زندہ نکلون گا کہ فتح و نصرت ہو، ورنہ میرا سر دشمنون کے گھوڑون کے سُم سے کچلتا نظر آئے گا، مرنا مسلّم ہے، بہتر ہے کہ ایسے کام مین مرین کہ نیک نام ہون، اے عزیز و تم ڈرو نہین، رزمگاہ مین اس طرح جاؤ کہ سر کے ساتھ پاسبانی کلاہ رکھو، سپاہ کے لئے اس سے زیادہ کوئی بدنامی، اور شرمندگی نہین ہو کہ اس کا آقا مارا جائے، اور سپاہی اور خدمت گار زندہ رہین، اس جنگ مین ثبات قدم کے لئے تحریص کرتا ہون، کیونکہ ملک ہند کا ہاتھ آنا، اور مغلون کے ہاتھ سے اہل و عیال کا رہائی پانا اسی پر موقوف ہے، مین بڈھا ہوگیا ہون، ہزارون دقتون سے افغانون کو جمع کیا ہے، اگر خدانخواستہ اس معرکہ مین یہ لشکر شکست کھاکر پراگندہ ہوگیا، تو پھر اس کا دوبارہ جمع ہونا محال ہے، ہوا سے جو کلیان درخت سے جھڑجاتی ہین، پھر وہ شاخسار پہ جمع نہین ہوتین"

اس تقریر کو سُن کر افغانون نے پامردی اور جان نثاری دکھانے کا وعدہ کیا،[۵]

۹۸۰ھ جلوس شاہی مین اکبر نے دوسری بار احمد آباد مین محمد حسین مرزا کے خلاف اپنی فوج صف آرا کی، تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس نے اپنی فوج کی ہمت ان الفاظ سے بڑھائی،

" غنیم کی تعداد بہ ظاہر بہت ہے لیکن درگاہ الٰہی کے اس نیازمند کی طرف خداوند کا سایہ

---

[۵] تاریخ شیر شاہی مؤلفہ عباس خان سروانی بحوالہ ذکاء اللہ، جلد سوم ص ۳۰۳-۳۰۲ و الیٹ جلد چہارم ص ۳۸۰، مجلس مشاورت مین شیر شاہ کی اور تقریرون کے لئے دیکھو الیٹ جلد چہارم ص ۴ ، ۳۰۷ ، ۳۰۲ و ذکاء اللہ جلد سوم ص ۲۹۲،

کی عنایت اس سے بھی زیادہ ہے جتنی کہ انسانی عقل کے احاطہ میں آسکتی ہے، تمھارا طریقہ یہ ہو کہ تم اپنے کو عاطفت ربانی کی مضبوط رسی میں جکڑ لو، تذبذب اور تزلزل کے شائبہ کو دل میں مطلق نہ لاؤ یک دل، یک رو، اور ایک راہ ہو کر اپنی پراگندگی کو اپنے سے دور رکھو، غنیم کی فوج کا جھنڈا سُرخ ہے، اُن کے سر پر خون سوار ہے تم نصرت کے ہمرکاب ہو کر اُن کے پاس پہنچ جاؤ، میدان جنگ میں بہادروں کو جوش میں لڑائی اور تجربے کے مسلک سے باہر نہیں ہونا چاہئے، اور جب ہم اس سرکش کا کام تمام کرلیں گے، تو دوسرے بدبختوں سے چھٹکارا پالیں گے؛[۵]

۱۰۳۵ھ میں جہانگیر کشمیر سے کابل جارہا تھا، تو دریائے جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے سازش کرکے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، نورجہان بھی ساتھ تھی، جہانگیر کا قید ہونا تھا کہ شاہی فوج میں انتشار پھیل گیا، لیکن نورجہان اپنی فراست اور تدبیر سے کام لے کر مہابت خان کے پنجہ سے بچ نکلی، اور دریا کی طرف اپنے بھائی آصف خان سے جاملی، وہاں پہنچ کر ارکان دولت کو طلب کیا، اور نہایت ہی خشمگین ہو کر اُن کے سامنے ایک ملامت آمیز تقریر کی کہ

"تمھاری غفلت اور ناتجربہ کاری سے ایسی بات پیش آئی، جو کسی کے تخیل میں بھی نہیں آسکتی تھی، تم اب خدا اور خدا کی مخلوق کے سامنے شرمندہ ہو، لیکن یہ شرمندگی اس وقت دور ہوسکتی ہے، کہ جو کچھ ہوچکا ہے اس کا تدارک ہونا چاہئے، بتاؤ اب کیا کرنا ہے"

اس ملامت بھری تقریر کو سن کر نورجہان کے ہمراہیوں نے بالاتفاق مہابت خان کی فوجوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا؛[۶]

سموگڈھ میں داراا ور اورنگ زیب کی فوجوں کا اجتماع ہوا، تو لڑائی سے ایک رات پہلے

---

[۵] اکبرنامہ جلد سوم ص ۹۰۵ [۶] اقبالنامہ جہانگیری صفحہ ۲۶۰،

اورنگ زیب اپنے لشکر کے "مبارزان نصرت کیش" اور "دیران صف شکن" میں یہ کہکر جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا،

"کل بہادری اور مردانگی دکھانے کا دن ہے، اس جگہ سے ہمارا پایۂ تخت بہت دور ہے، یک دل اور یک رو ہو کر دشمنوں پر حملہ کرو، اور اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کی ضرب سے حکومت حاصل کرو، فتح پاکر، اور دشمنوں کو پسپا کرکے دنیا میں نام پیدا کرو،

بکوشید کوشیدن مرد وار | رگ جان بکوشش کنید استوار
اگر دست بردیم مارا ست ملک | وگر کشته گشتیم آن دارا ست ملک[1]

کھجوہ کی جنگ میں جسونت سنگھ کی سرداری میں راجپوت سپاہی آئین وفا کے خلاف اورنگزیب کو چھوڑ کر شجاع سے جا ملے، جسونت سنگھ کے ہاتھ میں اورنگ زیب کی فوج کی میمن یعنی دائیں بازو کی کمان تھی، اس نے رہائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کرلی کہ رات کو میں عقب سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ آور ہوں گا، اور تم سامنے سے حملہ کر دینا، اس طرح ہم دونوں مل کر اورنگزیب کو پیس ڈالیں گے، چنانچہ جس وقت اورنگ زیب کو جسونت کی بے وفائی کی خبر ملی تو اس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا، اس کی فوج میں انتشار پھیلا لیکن اس کی پیشانی پر بل نہ آیا، اس نے اطمینان کے ساتھ تہجد کی نماز ختم کی، پھر ضبط و ہمت اور وقار و تحمل کا پیکر بن کر تخت رواں پر سوار ہوا، اور اپنے امرا اور سرکاروں کو جمع کرکے اُن سے اس طرح مخاطب ہوا،

"الحمد للہ، اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی، اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں، اور اب یہی چیز میرے لئے فتح و کامرانی کی باعث ہوگی، بعض کوتہ اندیش، اور بد باطن منافقوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ اب غنیم کا غلبہ ضروری ہے، اور اسی لئے وہ

---

[1] واقعات عالمگیری ص ۲۴،

دشمنوں سے جا ملے ہیں، لیکن وہ اپنے اعمال اور خیالِ خام کی سزا پائینگے"[۱]

اس تقریر سے اورنگ زیب کے لشکر میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، اور اپنے آقا کا سکون اور اطمینان کلی دیکھکر اسکو ڈھارس ہوئی، تقریر کے بعد اورنگ زیب نے نقارہ بجانے کا حکم دیا، اور اپنی سواری کا ہاتھی منگوایا، تمام رات اسی ہاتھی پر سوار ہوکر اپنی فوجوں کی نگرانی کرتا رہا، آفتاب طلوع ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھی شجاع کے ہاتھی کی طرف بڑھایا جائے، مرشد قلی خان نے روکا کہ اتنی جرأت بادشاہوں کے دستور کے خلاف ہے، لیکن اورنگ زیب نے کہا کہ

"کوئی شخص یونہی بادشاہ نہیں ہو جاتا، اسی قسم کی جرأت سے بادشاہت ملتی ہے، اگر بادشاہت ملنے کے بعد جرأت میں کوئی فرق آجائے تو سلطنت باقی نہیں رہ سکتی،

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد تنگ

کہ بوسہ بر لبِ شمشیرِ آب دار دہد"[۲]

(باقی)

---

[۱] عالمگیر نامہ ص ۵۶-۲۵۵، خافی خان جلد دوم ص ۵۳ [۲] احکام عالمگیری بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر معارف پریس ص ۷۰،

مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہی مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء، اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و اقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، قیمت: صہ

"منیجر"

"اخلاقِ ہندی"

کا

ایک نادر اڈیشن اور پامر کا اردو قصیدہ

از

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت لکچرار عثمانیہ کالج ، ورنگ آباد

میر بہادر علی حسینی مصنف اخلاق ہندی نثر بے نظیر تاریخ آسام اور رسالہ گل کرائسٹ کے حالات میں صرف اتنا معلوم ہے، کہ میر بہادر علی حسینی کا شمار مرحوم فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز ارباب قلم میں ہوتا تھا، اور ڈاکٹر گل کرائسٹ جان شکسپیر اور ڈاکٹر فوربس جیسے محبانِ اردو کی سرپرستی میں کالج کے منشیوں نے سادہ اور بے تصنع اردو نثر لکھنے کی جو مہم شروع کی تھی، ان میں میر بہادر علی بھی ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے متعلق جو کچھ بھی منتشر مواد مل سکا، اسے صاحب ارباب نثر اردو نے ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ یکجا کر دیا ہے[1]؛

میر بہادر علی کی کتابوں کو وہ شہرت اور وہ حسن قبول حاصل نہ ہو سکا جو اُن کے ہمعصر اور ہم پیشہ میر امن کی لکھی ہوئی کتابوں کو حاصل ہوا، ان کی تصانیف میں تاریخ آسام اور رسالہ گل کرائسٹ؛ تو اب تک شائع بھی نہیں ہوئیں، اور ہنوز مخطوطوں کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں، تاہم ان کی کتابوں میں "اخلاق ہندی" کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ باغ و بہار "طوطا کہانی" اور بیتال پچیسی جیسی کتابوں کو

---

[1] ارباب نثر اردو، از سید محمد طبع دوم ۱۳۷ ؁ء ص ۱۱۰-۱۱۲؛

چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں کی کم کتابوں کو نصیب ہوا، اخلاق ہندی بہادر علی حسینی کا مشہور کارنامہ ہے، اور بقول صاحب ارباب نثر اردو حقیقت یہ ان کا نام بھی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہی سے زندہ ہے۔[1]

جیسا کہ خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں بتایا ہے کہ یہ کتاب اس نے ڈاکٹر گل گرانسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں لکھی، اپنی مرتبہ اس کا ایک طویل اقتباس گل گرانسٹ کی بیاض ہندی میں شائع ہوا، اور اسی سال یعنی ۱۸۰۳ء میں خود گل گرانسٹ نے اپنی نگرانی میں پوری کتاب کلکتہ سے شائع کی،

اس کے بعد یہ کتاب متعدد بار چھپی، چنانچہ سر جارج گریرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف اڈیشنوں کی جو فہرست دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال کے عرصہ میں یہ کتاب بمبئی، بنگلور، کلکتہ اور لندن میں چھپتی رہی، اور اس عرصہ میں اس کے دس بارہ اڈیشن نکل گئے، اس کے بعد اس کے اور بھی اڈیشن نکلے، لیکن اس کے باوجود اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں، اول تو ان دنوں ایسی قدیم اور پارینہ کی حیثیت رکھنے والی کتابوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایسی دائمی مقبولیت نہیں حاصل کر سکی جیسی کہ باغ و بہار کو نصیب ہوئی،[2]

صاحب ارباب نثر اردو کے پیش نظر اخلاق ہندی کا جو نسخہ تھا، وہ مطبع فتح الکریم بمبئی کا چھپا ہوا تھا، انھوں نے لندن کا چھپا ہوا نسخہ نہیں دیکھا، لکھتے ہیں ۱۸۶۸ء میں ایک صاحب سید عبد اللہ نامی نے اس کا نفیس اڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا، اس میں تمہید اور حاشیہ بھی تھا[3]" یوں بھی اس کتاب کے نسخے کمیاب ہیں، یہ اڈیشن تو نایاب کا حکم رکھتا ہے، راقم کی نظر سے یہ نسخہ گذرا ہے، اور بعض ایسی خصوصیتوں کا حامل ہے جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے، کتاب متن اور مرتب کے لکھے ہوئے خاتمہ کو ملا کر رائل سائز کے (۱۹۲) صفحوں پر ٹائپ میں چھپی ہے۔

---

[1] ارباب نثر اردو، مولفہ سید محمد طبع دوم ۱۹۳۷ء ص ۱۷۶، [2] ایضاً ص ۱۸۶، [3] ایضاً ص ۱۸۸،

آخر میں آٹھ صفحون میں مرتب کا انگریزی مقدمہ اور (۳۲) صفحون میں حواشی آئے ہیں، سرورق کی عبارت ہے،

"اخلاق ہندی جس کی اصل مفتی تاج الدین کی مفرح القلوب فارسی ہے، اور میر بہادر علی حسینی نے زبان ہندستانی میں اس کا ترجمہ کیا اور وہ ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ کے شہر کلکتہ میں چھاپا ہوا تھا، اب بعہد مہد ملکۂ معظمۂ انگلستان و ہندوستان کوئین وکٹوریہ دامت سلطنتہا بوزارت آنریبل سر اسٹافورڈ نارتھکوٹ بیرونٹ ممبر آف پارلیمنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا بہ تصحیح خاکسار بے مقدار سید عبد اللہ بن سید محمد خان بہادر غفران پناہ مطبع صاحبان ذی شان ڈبلیو اچ، ایلن اور کمپنی واقع نمبر ۱۳ واٹرلو پلیس ولیٹ منسٹر لندن میں پھر مطبوع ہوا، ۱۸۶۸ء عیسوی، مطابق ۱۲۸۵ھ ہجری،

کتاب کے آخر میں تقریباً اسی مفہوم کا سرورق انگریزی میں ہے"

اس کتاب کے مرتب سید عبد اللہ کے تفصیلی حالات کی راقم نے بڑی تلاش وجستجو کی لیکن افسوس ہے کہ کامیابی نہیں ہوئی، کتاب کے مقدمہ یا خاتمے سے بھی ان کی زندگی کے حالات پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی، بہرحال جو کچھ بھی معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ ان کا تعلق اودھ کے ایک اونچے گھرانے سے تھا، وہ نقوی سید تھے لیکن زمانہ کے انقلاب کا شکار ہو کر یہ خاندان پراگندہ ہو گیا، ان کے والد سید محمد خان جائس کے باشندے اور مشہور آدمی تھے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سال یعنی ۱۸۶۸ء میں وفات پائی تھی، سید عبد اللہ نے کتاب کے آخر میں جو قصیدہ اس وقت کے وزیر ہند سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ کی مدح میں لکھا ہے اس میں اپنے بارے میں کہتے ہیں،

انکشاف نام کی خواہش اگر بندے کو ہو — انکسار عجز سے دیتا ہوں میں اپنا نشان
سید عبد اللہ نقوی نام اس عاجز کا ہے — نام نامی باپ کا پیر و سے مشہور جہان
حضرت سید محمد خان بہادر جائسی — صاحب اعزاز و مکنت افتخار خاندان

ہین امام عاشران کے جدا مجد فخر خلق کون بہتر اُن سے ہوگا اور والا دودمان

رحمت اللہ ان پر ہوے تا بعد قیام جو ہوئے اس سال ہی داخل باغ جنان

صاحب تذکرہ ہندی و یورپی شعرا ے اردو و فارسی رام بابو سکسینہ کے بیان کے مطابق سید عبداللہ
...کے نواب سید رجب علی خان ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے، اور ان سے لاہور، دہلی اور جگراؤن
...تعلیم حاصل کی تھی، اور ارسطو جاہ ہی نے سید عبداللہ کو بمبئی کے گورنر سر جارج کلارک کی خدمت مین
...کیا تھا، اونھون نے کوشش کرکے سید عبداللہ کو جامعۂ کیمبرج مین مشرقی زبانون کا استاد مقرر
...دیا تھا، وہ اردو، عربی، اور فارسی کے سوا ہندستان کی اور کئی زبانین جانتے تھے، چنانچہ جامعہ کیمبرج
...اردو عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی، بنگالی اور گجراتی بھی پڑھایا کرتے تھے،

معلوم ہوتا ہے اس زمانہ مین جامعہ کیمبرج مین اور بھی کئی ہندوستانی عالم جمع ہوگئے تھے، ان مین
...کے نواب اقبال الدولہ خاص طور سے مشرقی علوم کی ترویج مین پیش پیش تھے، ایک اور صاحب کا
...سید عبداللہ نے اس کتاب مین نمونۃً لیا ہے، یہ مدرسہ عالیہ ٹرنٹی کالج ڈبلن کے مدرس اولاد علی ہین
...یہ وہی صاحب ہین، جو پامر کے پاس مصرع طرح بھیجا کرتے تھے، ان کا نام سکسینہ صاحب کی کتاب
...آیا ہے، ان کا حسب ذیل شعر بھی سید عبداللہ نے نقل کیا ہے،

سواد موے سیہ یون ہے رُخ کے پرتو پر دھوئین کی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

سید عبداللہ نے اخلاق ہندی کی طرح سنگھاسن بتیسی کو بھی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کرکے
...ستان سے شائع کیا تھا، یہ کتاب اخلاق ہندی سے پہلے شائع ہوئی تھی، اخلاق ہندی کے اس نسخے
...طرح سنگھاسن بتیسی کا یہ نسخہ بھی نایاب ہے، راقم کی نظر سے یہ کتاب نہین گذری، البتہ اس کا اشتہار
...ٹر فوربس کی مرتبہ کتاب منتخبات عربی (Arabic Reading. London. 1864)
پشت پر دیکھا ہے،

سید عبد اللہ اس وقت کے ذیرہ ہندسر اسٹا فورڈ نارتھ کوٹ سے شخصی طور پر متعارف تھے، اور ان کی اجازت سے اپنی کتاب انھون نے ان کے نام معنون کی ہے اور قصیدے مین، اور کتاب کے مقدمہ اور خاتمہ مین بالکل مشرقی انداز مین اُن کی بڑی تعریف کی ہے، اور ان کا شکریہ ادا کیا ہے،

سرورق کے بعد قواعد ضروری کے عنوان کے تحت کتاب مین جو اعراب دیئے گئے ہین، ان کی تشریح درج ہے، ملاحظہ ہو،

"قواعد ضروری جو اس کتاب مین ملحوظ ہین،

واو معروف، جیسا تو (دوسرا)، مارون گا، بے نشان ہے،

ی معروف، جیسے پانی، موتی، گھی، بھی، بے علامت،

واو مجہول مثل توم کوہ سوچ، جزم مدور، کا نشان رکھتا ہے تاکہ فرق رہے، اور کوئی تُو بروزن رُو یعنی چہرہ کو، تو، جزم دن پر روکے ہے، نہ پڑھے،

ی مجہول متوسط ہو تو یہی نشان رکھتی ہے، مگر آخر لفظ مین بدون کسی نشان کے بڑی ے لکھی گئی، جیسے بیٹے، میرے،

واو ما قبل مفتوح پر نشان ۂ کا دیا کہ واو مجہول سے مشابہ نہ ہو، اور معروف سے تمیز یا تر رہے، جیسا نوٗ۔ دوٗلت،

ی ما قبل مفتوح پر متوسط ہو، یا آخر یہی نشان ۂ ہے، مگر فرق کے لئے ی کے تلے زیر دے دیا ہے،

نون غنہ یا نون خفی، آخر مین بے نقطہ چھوڑا، مثلاً مین ہنین کو مین نہین لکھا، درمیان مین جا بجا اس پر جزم ۂ دے دیا ہے، جیسے ہنسی، مُنہ نون اظہار کو حالت اصلی پر رکھا ہے، جیسے بن، انجن، تین،

میرے عزیز دلی مولوی معنوی میر اولاد علی صاحب دام لطفہ مدرس مدرسہ عالیہ ٹرنٹی کالج

ڈبلن کا ایک قطع ہے، اور اس میں حسن اتفاق سے مثالیں قواعد مذکورہ کی اکٹھی ہو گئی ہیں، اس واسطے

یہاں حسب موقع لکھا جاتا ہے، دیکھو ہذا،

شعر

سواد موسے سیہ یون ہو رُخ کے پر تو پر ڈھونڈنگی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

اسی صفحے کے مقابل (یعنی سرورق کی پشت پر) یہی "قواعد ضروری" انگریزی میں ادا کئے گئے ہیں

اس کے بعد پانچ صفحوں پر کتاب کے مطالب کی فہرست اردو میں "فہرست اخلاق ہندی کی"

اور انگریزی میں انڈکس کے عنوان کے تحت کالموں میں دی ہے،

فہرست کے اختتام پر اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے، اب کتاب کو بند کر کے دائیں طرف سے

شروع کیجئے تو پہلے انگریزی میں سرورق ہے جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس کے بعد انگریزی میں

رایٹ آنریبل سر اسٹفرڈ ہی نارتھ کوٹ سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا کے نام تمہید ہے، اور

اسی کے ساتھ ایک خط ہے جس میں موصوف کی ہندوستان کی زبان سے دلچسپی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے،

اس کے بعد انگریزی میں آٹھ صفحون پر پھیلا ہوا مرتب کا مقدمہ ہے، ابتدا میں اخلاق ہندی

سے متعلق وہی باتیں بیان کی ہیں، جن کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں، اس کے بعد اردو یا ہندستانی کے

متعلق یہی دعویٰ کیا ہے جس کی صداقت کو آج ایک صدی کے بعد بھی ہر محب وطن پوری طرح محسوس

کر رہا ہے لکھتے ہیں :-

"اخلاق ہندی کی زبان خالص ہندوستانی ہے، جو پورے جزیرہ نما کی قومی زبان ہے

اور جس کو راس کماری سے کابل تک تقریباً ہر شخص بولتا ہے "

اس کے بعد افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت ہند وستانیوں کو انگریزی سکھانے کے لئے تو روپے

صرف کرکے لائق اور فاضل استادون کو بھیجنے کا انتظام کرتی ہے لیکن انگریزون کو ہندوستانی سکھانے کے لئے ایسا ہی طریقہ اختیار نہین کیا جاتا، انگریزون کو اردو پڑھانے والے جو اشخاص مل جاتے ہیں وہ نہ تو باقاعدہ ترتیب یافتہ ہوتے ہین، اور نہ ان کی علمی استعداد ہی کچھ اچھی ہوتی ہے، اس کے بعد ایسے انگریزون کو جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہین، صحیح ہندوستانی سیکھنے کے بارے مین کئی مشورے دیئے ہین، اسی کے ذیل مین رومن رسم خط اختیار کرنے کے بارے مین لکھتے ہین،

"جو لوگ ہندوستان مین قیام کرنا چاہتے ہین، ان کے لئے ہندوستانی زبان کی اہمیت ظاہر ہے، اس اہمیت کو نظر انداز نہین کیا جا سکتا، اس لئے بیجا نہ ہوگا، اگر کچھ ایسے مشورے پیش کئے جائین، جو اس زبان کے سیکھنے مین بہتر ثابت ہون، ایک بتدی کو اس کے حروف تہجی خود سیکھنے کی کوشش نہین کرنا چاہئے، کیونکہ اگر زبان پر خراب قسم کا تلفظ چڑھ گیا، تو پھر اس کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے ایک تجربہ کار استاد کی نگرانی مین یہ زبان سیکھنی چاہیئے اسی کے ساتھ نستعلیق کی مشق شروع کر دینی چاہئے، جیسا کہ فاربس کی ہندوستانی گرامر مین دی ہوئی ہے، بعض کوتہ اندیش رومن رسم الخط اختیار کرنے کی رائے دیتے ہین، اور اسی رسم الخط مین ابتدائی کتابین پڑھنے کو کہتے ہین، لیکن یہ محض کاہلی کا ایک مہمل بہانہ ہے، کیونکہ کوئی شخص کسی کی زبان کو اس وقت تک نہیں سیکھ سکتا ہے، جب تک کہ رسم الخط سے بھی واقف نہ ہو جس مین یہ زبان لکھی جاتی ہے"

مقدمہ کا خاتمہ مسٹر بارکی ایک عربی نظم اور اس کے انگریزی ترجمہ پر کیا ہے جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے کرین گے، مقدمہ کے بعد انگریزی مین حواشی درج ہین، جو (۲۴) صفحات پر محتوی ہین، حواشی مین سب سے پہلے کتاب کے ابتدائی حصہ یعنی حمد و نعت و سبب تالیف کا انگریزی ترجمہ درج ہے، اس کے بعد کتاب مین جہان جہان عربی الفاظ، مشکل روزمرہ، محاورے، اور اشعار آئے ہین، ان پر مفصل حواشی لکھے ہین،

صفحہ ۲۰۸ پر اخلاق ہندی کا متن ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مرتب نے ایک خاتمہ لکھا ہے جس میں ان کا اور ان کے شاگرد ہنری پامر کا اردو قصیدہ بھی شامل ہے، اور پھر اس خاتمہ کا پورا انگریزی ترجمہ حواشی کے خاتمہ پر دیا ہے، اس ترجمہ کی ابتدا میں یہ معذرت ہے کہ ترجمہ میں اصل زبان کی لذت و چاشنی نہیں یہ خاتمہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے اس لئے اسے شروع سے آخر تک نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے،

خاتمہ | ہو الاول، ہو الآخر، الحمد للہ کہ اس کتاب کا اختتام ہوا، اور عہد وزارت امیر کبیر سرا سٹا فورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر بالقابہ میں یہ نسخہ تمام ہوا، اور ان کی توجہ بے غایت اور الطاف و عنایت سے نہ فقط اس کتاب کا بلکہ خود اس فدویت انتساب کا رتبہ بڑھا بقول سعدی،

سزد گر بدورش بنازم چنان کہ سید بدوران نوشیروان

اوصاف اس مجمع علم و کمال اور مرکز جاہ و جلال کے میری کیا جان اور قلم کی کیا زبان ہے، جو بیان کروں، اس کی ذات خجستہ صفات بفضل حی و قیوم سے موجود ہے، میرا تعریف کرنا فضول اور بے سود ہے، مشک آنست کہ از خود بوید نہ آنکہ عطار گوید، عیاں راچہ بیان، مگر جو امر حق ہو اس کو چھپانا گویا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے، اور اپنے ولی نعمت کا شکر نہ کرنا کفر ہے، من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ اس واسطے بالکل ساکت بھی نہیں رہ سکتا،

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

گر بگویم مشکل و گر نہ گویم مشکل، بہر حال الفاظ چند بطور اظہار حق، نہ خوشامد سے عرض کرتا ہوں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حقیقت حال یہ ہے کہ جس تاریخ سے یہ امیر ابن امیر مدبر امور ہند مقرر ہوا، ہر طرح سے خیال بہبود ہند اور ہندیوں کا مد نظر رہا، افضال الٰہی اور اقبال شاہی اور اس وزیر خوش تدبیر کی نیک نگاہی سے سارا ہندوستان آباد ہے، اور ہر دل انصاف پسند شاد ہے،

یہ سچ ہے کہ اقلیم ہندوستان ہوئی اس کی اقبال سے بوستان

شگفتہ ہین گل بلبلین نغمہ سنج شکستہ ہین سب خارِ اندوہ و رنج

ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان مین کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بے خطر نہ جا سکتا تھا راہین ٹھگون اور ڈکیتیون سے، بازار دغا بازون اور جیب کترون سے، دوکانین اور گھر نقب زنون اور چورون سے حفاظت مین نہ تھین، اور ایک وقت یہ ہے کہ حکومت سرکار مین راہین خشکی اور تری کی ریل گاڑی اور دودکش کی آمد و رفت سے پرشور و غوغا ہین، مال تجارت کروڑون کا آتا جاتا ہے کوئی نہین پوچھتا کہ موتی لئے جاتے ہو یا پوت، سونا لادا ہے، یا پتھر، بازارون مین جتنی مال و اسباب کی کثرت ہے اتنی ہی کیسہ برون کی قلت، دوکانون اور گھرون مین کچھ چوکی پہرے کی حاجت نہین عدالت گستری ان کا پاسبان ہے، جہان لڑائی اور خونریزی ہر روز سننے مین آتی تھی، وہان اب سلطنت ہر روز علم کی ترقی اور جہل کی کمی ہے، انصاف سے ظلم کی خرابی اور بدی ہے، جہان گائے بیل کی قربانی منع اور آدمی کی اذیت جائز تھی، بچہ کشی اور ستی ہونا گویا منہ کی بات تھی، وہان مار پیٹ کا تو کیا ذکر ہے کوئی کسی کو گالی بھی اگر دے یا آدمی کے بدلے جانور کی جان ناحق کوے تو ایسی سزا پائے کہ چھٹی کا دودھ یاد آئے، بردہ فروشی اور کسب حرام گمنام، حفاظتِ رعایا کو تھانے اور پولیس، حفاظت ملک کو فوج جرار پیادہ اور سوار بری اور بحری ہمیشہ تیار، مخالف سرکاری زبون اور نشان جہازات عالم کے سامنے رایت دولت انگلیزیہ کے سرنگون ہوتے ہین، یہ عزت کیا کم ہے، کہ حکومت ملکہ معظمہ کی سرکوب عالم ہے، پھر وزیرا یسے بادشاہ ظفر پایگاہ کا کیونکر ویسا نہ ہو، شعر

وزیرے چنین شہریارے چنان

جہان چون نگیرد قرار اے جوان

ہندیہ شکر اس کا فرض ہے کہ زیر حکومت ایسے بادشاہ معدلت پناہ کے ہین جس کا [illegible]

آصف جاہ سلیمان سے عقل اور تدبیر مین بڑھ کر ہے، بیرے اوصاف اس حکومت کے اگر کوئی شخص خوشامد پر محمول کرے تو اس کو لازم ہے کہ احوال ہند کو ایک نظر بچشم انصاف دیکھے، مدرسے، تھانے، نمایش گاہین، دواخانے، تار برقی، ڈاک، مراکب دودی، (یہ ترجمہ ہے Steamers کا) ترقی تجارت، وادرسی مظلومان، سرکوبی ظالمان، رئیس بے انتظام کو معزول کرنا، اور حاکم منتظم کو اختیار دینا، یہ سب باتین رفاہ کی میرے دعویٰ پر دلیل ہون گی، اور مخالف کی دلیلین سب ذلیل ہون گی، انصاف شرط ہے، جو حصہ ہندوستان کا ابھی سرکار نے نہین لیا، دیکھو تو وہان کیسی خرابی اور ویرانی ہے، حاکم وہان کے تھپنے کے تھپنا، گوبر گنیش، ماٹی کے طبیب (ان محاورون کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، Blockheads. pampered. slaveholders-) جو الف کا نام لٹھا بھی نہین جانتے، رات دن رنڈیون مین بسر کرتے ہین،

صبح تو جام سے گذرتی ہے شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گذرتی ہے

ان کا وجود کالعدم ہے، چہ خفتہ چہ بیدار،

مگر سب حکام اور راجا ایسے نہین، جناب معزز خطاب، مہاراجہ سرگباتتی والی پٹیالہ کو دیکھئے کہ اپنے حسن انتظام اور عقل وفہم سے کتنے نیک نام رہے، اور پیش گاہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام ملکہا سے تمغائے عزت اور خطاب فرزند خاص منصور زمان، امیر الامراء، مہاراجہ دھیراجہ راجیشر، مہاراجہ راجگان، نرندر سنگھ بہادر کا ملا، اور اب فی زماننا سری مہاراجہ ادھیراج والی کپورتھلہ دام دولتہ جو سرکار انگریزی کے خیرخواہ جانی رہے، اور جانفشانی مین جان ومال سے دریغ نہین کیا، اور مہمات کابل اور پنجاب مین کیسے کارہائے نمایان کئے، خصوصاً بلوائے ۱۸۵۷ء مین جو جو شجاعتین اور بہادریان کین ان کا کیا کہنا، یہی کافی ہے کہ بہ جلدوی حسن خدمات پیش گاہ حضرت ملکہ معظمہ سے خطاب فرزند دلبند، راسخ الاعتقاد، راجہ رندھیر سنگھ بہادر اور ستارۂ ہند کا تمغا عطا ہوا، جاگیر بھی ملی، اور امید

قومی ہے کہ اور ترقی مناصب بھی ہو، یہ سب خوبیان ان کے حسن انتظام اور کارکنان کی قدرشناسی کا ثمرہ ہو، تعریف دولت انگریزی کی کرنا گویا توصیف ارکان دولت کی ہے، اگر فندار حکومت کے ایسے نہ ہوتے، تو یہ رونق سلطنت کہان ہوتی؟ اگر رایٹ آنریبل سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی نیک نیتی، خوش نصیبی اور تدبیر رسا شریک نہ ہوتی، تو یہ نیک نامی جو فتح حبش پر ان کی وزارت کے ایام مین حاصل ہوئی، کب ہوتی؟ کیا اعانت ربانی ہے کہ جتنا کام ان کے تحت میں ہے، سب زین پہ چمن انتظام و کامرانی ہے، جس قدر اس امیر کبیر کے اوصاف بیان کرون، تھوڑے ہین، اس نیازمند کو خود ان کی خدمت مین نیاز ہے، اس لئے جو کہتا ہون آنکھون دیکھی ہے، فقط کانون سنی نہین، جو خوبیان اس مختصر مین اس عالی ہمت والا دودمان مجمع علم منبع فیض، معدن جود و احسان کی لکھون وہ اس سے بہت کم ہون گی، جو تاریخ عالم مین ابد الآباد کو نام پہ میرے ممدوح کے لکھی جائین گی مین فقط دعا پر اپنا کلام تمام کرون گا، کیونکہ اس کے اوصاف کرنا اور دریا کو کوزے مین بھرنا میرا کام نہین جو کچھ مین نے کیا ہے، اندکے از بسیارے و مشتے نمونہ از خروارے ہے،

تا زیب زبان بود بتقریر | تا زینت کاغذ است تحریر
نامت برود بہ نیک نامی | بر خامہ کند تر اعلامی
سرچشمۂ فیض تو روان باد | اقبال چو دولت جوان باد"

اس کے بعد انگریزی مین تمہید ہے، اس مین یہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ قصیدہ مین جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، ان مین بظاہر غلو معلوم ہوگا، لیکن مین نے ان کو تشکر اور صداقت کے جذبے مین قلمبند کیا ہے،

قصیدہ

گر نہین حاصل بخوبی قوت نطق و بیان | پر مناسب ہے کہ ہون حمد خدا سے تر زبان

وہ خداے پاک و برتر جس نے احمد کو کیا — رہ نماے جن و انسان پیشواے مرسلان

وہ نبی جس نے علی کو جانشین اپنا کیا — جانتے ہین سب غدیر خم کے جو ہین راز دان

دونون کو پہنچے درود اور دونون کو ہو سلام — اُن کے لائق اور کیا ہے پاس میرے ارمغان

شکرِ خالق مین رہے مصروف خلقت چاہیے — یعنی بندون پر ہو وہ اپنے نہایت مہربان

سلطنت وکٹوریہ کو کی عطا اللہ نے — ہندیون پر ہے یہ احسانِ خداوندِ جہان

کوئین ایسی کوئی گذری ہے نہ آگے ہوئیگی — فیض بخش و دادگسترِ اہلِ جود و امتنان

ختم اس پر ہے رعیت پروری و منصفی — ہے عجب عاجز نوازِ اہلِ عطا و مہربان

خلق و اکرام و مروّت مین نہین اس کا نظیر — قدر اس کی جانتے ہین خوب جو ہین قدردان

پیرِ گردون خم پئے تسلیم ہے اس کے حضور — عقل و بخت اس کو دیئے ہین حق تعالیٰ نے جوان

بے سخن وہ باعثِ افزونیِ اخلاق ہے — کیون فدا اس پر نہ کیجئے اے دل اپنا مال و جان

حکم اس کا ماہ سے ماہی تلک جاری ہوا — کیون نہ ہو توصیف مین اسکے مرا خامہ روان

اس کے حق مین کر رہے ہین اوج و حشمت کی دعا — ساکنِ انگلینڈ و ہر باشندۂ ہندوستان

ہون عدو پامالِ غم آفاق مین اس کے مدام — دوست جو دل سے ہون اسکے وہ رہین شاد و شادمان

کیسے کیسے اہلِ دانش ہین امیر اسکے رفیق — ہو بجا اک اک کو گر کہئے فلاطونِ زمان

انتظامِ مملکت کرتے ہین بآئین بہین — بندوبست ان کا ہے بیشک باعثِ امن و امان

منتخب ان مین سے ہے ممدوح میرا نارتھ کوٹ — رائٹ انریبل سر اسٹافورڈ مشہورِ جہان

وہ مدارِ کارِ عالم مستقل ذی اختیار — راتق و فاتق وہی ہے از پئے ہندوستان

اسکے اوصافِ حمیدہ سے ہو خوش وکٹوریا — والیِ روے زمین شاہنشہِ ہندوستان

بادشاہ کوئی نہ ویسا ہے نہ ایسا ہے وزیر — دونون کو رکھے سلامت خالقِ کون و مکان

کس قدر اخلاق نے پایا ہی عالم مین رواج
کبر و نخوت کا نہین باقی رہا نام و نشان

علم اخلاق و ادب مین بے نظیر و بے مثال
مفتی تاج الدین کا اک نسخہ ہی مشہور جہان

بارہ سو اٹھارہ ہجری مین ہوا تصنیف جو
تھے اٹھارہ سو اور تین از سن عیسائیان

ترجمہ اردو زبان مین کیا اک شخص نے
رکھ دیا اخلاق ہندی نام ہو کر شادمان

اسم سامی مترجم ہے بہادر سے شروع
خاتمہ ہے نام کا اس کے علی پر بے گمان

تھی کتاب خوب و زیبا بس کہ علم خلق مین
اور سکھلاتی تھی ہر اک کو زبان ہندیان

صاحبان عقل و دانش کو خوش آئی اس قدر
کر دیا مشروطاً اس کو ازبراے امتحان

مین نے دیکھا اس پہ نظر کی خوب غور و فکر سے
بیشتر اغلاط پائین دیکھین کم تر خوبیان

جس قدر ممکن ہوا مین نے کمال جہد سے
صرف ہمت کو کیا بہر سرور دوستان

بعد تصحیح مزید آخر اسے چھپوا دیا
دیکھ کر تا اہل دانش اسکو ہون سب شادمان

ختم طبع اس کا ہوا مطبع مین بالطف تمام
ڈبلیو۔ ایچ۔ ایلن اینڈ کو جو فرمانی ہین یہان

سیزدہ نمبر کے ساکن ہین بہ واٹرلو پلیس
خاص لندن مین جو زینت بخش ہی بحر روان

ہوا اگر اور اک سال طبع مطبوع مزاج
ہوئے گا اس بیت کے پڑھنے سے ہر اک کو عیان

یک ہزار و ہشت صد و شصت و ہشت عیسوی ۱۸۶۸
یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلمان ۱۲۸۵

با وجود اہتمام صحت و غور بلیغ
کچھ بھی گر سہو و خطا کا ناظرین پاوین نشان

لطف و الطاف بزرگانہ سے یہ امید ہی
دامن عفو و عطا مین اس کو فرمائین نہان

انکشاف نام کی خواہش اگر بندہ کے ہو
انکسار و عجز سے دیتا ہون مین اپنا نشان

سید عبد اللہ ہندی نام اس عاجز کا ہی
نام نامی باپ کا میرے ہی مشہور جہان

حضرت سید محمد خان بہادر جائسی
صاحب اعزاز و مکنت افتخار خاندان

ہین امام عاشران کے جد امجد فخر خلق کون بہتر ان سے ہوگا اور والا دودمان
رحمت اللہ ان پر ہوئے تا روز قیام جو ہوے اس سال ہی داخل باغ جنان

یہان مرتب کتاب سید عبداللہ کا قصیدہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد ایک انگریزی عبارت درج ہے، جس مین مرتب کے دوست اور شاگرد مسٹر ای ۔ اچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج کے ایک قصیدہ کی تعریف کی گئی ہے، اس مین مسٹر پامر کے قصیدہ کے صحیح مطلب بیان اور انکار تخیل کی بڑی داد ہے،

اڈورڈ ہنری پامر، جن کا قصیدہ ہم آگے نقل کرین گے، وہی مشہور انگریزی مستشرق ہین، جنھون نے قرآن کا انگریزی مین ترجمہ کیا تھا، ان کا ذکر مقدمہ مین بھی آچکا ہے، ایسے انگریز جنھون نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے صحیح اردو کی تحصیل کی ہے، ان کی مثال دیتے ہوئے، لکھتے ہین،

"ہندوستان تقریباً دو صدیون سے انگلستان کے قبضہ مین ہے، لیکن ایسی کوئی مثال نہین کہ ہندوستان کی کسی زبان مین کسی انگریز نے انگریزی کی کوئی کتاب ترجمہ کی ہو، بعض ہندوستانی کتابون کا ترجمہ یا بعض کو ایڈٹ کرکے انگلستان مین چھاپا گیا ہے، جو بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے لیکن اگر ہندوستان کے نوجوانون کے لئے سائنس اور تعلیم کی بعض کتابین ترجمہ کی جاتین، تو یہ اور بھی بہتر ہوتا، اہل یورپ جن مین محنت و استقلال زیادہ ہوتا ہی، اچھے اساتذہ کی نگرانی مین اپنے کو اس کام کے لائق بنا سکتے ہین، مثلاً مین ایک ایسا نام پیش کرتا ہون جس نے مشرقی زبانون مین پوری مہارت حاصل کر لی ہے، یہ میرے دوست اور شاگرد مسٹر ای ۔ اچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج ہین جنھون نے عربی، فارسی اور اردو کے اخبارون مین اپنی نثر و نظم کو شائع کرکے ان زبانون کے ماہرین کو حیرت مین ڈال دیا ہے، ان کی تحریرین صحیح

اسلوب بیان نہایت آسان اور بامحاورہ اشائل کے حیرت انگیز نمونے ہیں، اور یہ اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کہ انھون نے کبھی ہندوستان کا سفر بھی نہیں کیا ہے"

پھر اسی مقدمہ کے آخر مین مسٹر پامر کا ایک انگریزی قصیدہ نقل کیا ہے، جو انھون نے رائٹ آنربل سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ کی شان مین کہا تھا، اسٹیفورڈ کے نام سے اخلاق ہندی معنون کی گئی ہے، اس لئے اس قصیدہ کے آخری شعر مین اخلاق ہندی کی اشاعت کی تاریخ بھی درج ہے،

فی ظل استیفورد مجد ذی العُلی .	وزیرنا الاعظم باھی الغوت
وصاحب الفقہ الذی لم یزل	موئیدا من ربہ الصباوت
الغالب الاد یا بسا داتھا	رأیا وتدبیراً وعزماً ثبوت
محیی دروس العلم فی عصرہ	فی کل قوم قد عراھم خفوت
طباعتہ الکتب با سعا نہ	من بعض آثارلہ لا تموت
اخلاق ھند طبعہ للملا	بھیج استفورد نورتہ کوت
	۲۰ ۵۶۱ ۶۶۱ ۴۲۴

سنہ ۱۸۶۶ء

اس کے بعد اس عربی نظم کا انگریزی نثر اور نظم دونون مین ترجمہ دیا ہے،

(باقی)

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی تاریخ کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی،

ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عہ

"منیجر"

جلوۂ صد رنگ

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب ایڈوکیٹ اعظم گڈھ

اس نام سے جناب حبیب احمد صدیقی ام اے ال ال بی کلکٹر بلیا نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے، شروع مین مصنف کے ایک مختصر دیباچہ کے بعد جناب مجنون گورکھپوری کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے، جس سے مصنف کے ذاتی اخلاق، علمی و ادبی قابلیت اور خصوصیاتِ شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے، کلام کا بیشتر حصہ غزلون پر مشتمل ہے، آخر مین چند مختصر نظمین بھی ہین، جن سے صدیقی صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے،

صدیقی صاحب کی خوش مذاقی اور لطافتِ طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ انھون نے غزل کو جو سب سے زیادہ لطیف اور نازک صنفِ شاعری ہے، اپنا موضوعِ سخن قرار دیا ہے، اور اس مین شبہہ نہین کہ وہ اس میدان مین عام غزل گو شعراء کے مقابلہ مین مختلف حیثیتون سے کامیاب اور ممتاز نظر آتے ہین،

غزل کا اصلی موضوع عشق و محبت ہی، جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ لطیف، نازک، بلند اور شریفانہ جذبہ ہے، یہ وہی درد ہے جس کو نکتہ دانِ روم نے طبیبِ روحانی کہکر پکارا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

یہ وہی بادۂ تند و تلخ ہے، جس کے فیضانِ سرمد سے متاثر ہوکر ہاتفِ شیراز نے حیاتِ ابدی کا غلغلہ بلند کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ وہی اکسیر ہے جس کے فیض تاثیر نے نظیری کے ظلمت کدۂ کفر کو ایمان کا جلوہ گاہ بنا

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نرسد کفر آوردم و در عشق تو ایمان کردم

اس بنا پر ہم اس عام خیال سے متفق نہیں، کہ غزل گوئی نہایت آسان چیز ہے، اگر لگا

انداز سخن کو تغزل کا معیار قرار دیا جائے، تو بے شبہہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا دعویٰ کر سکتا ہے

غزل دراصل عشق و محبت کے حقائق و اسرار کی مصوری کا نام ہے، تو ہمارے نزدیک اس سے

اور دقت طلب اور کوئی صنف شاعری نہیں ہے؛ اس کے لئے نہ صرف نکتہ سنج دماغ بلکہ ایک

بھی درکار ہے لیکن یہ متاع گران ارز ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب نااہل

میدان میں قدم رکھتے ہیں، تو چونکہ نظر میں وسعت نہیں ہوتی، اور دل درد سے خالی ہوتا ہے

ان کی جولانگاہ شوق صرف شاہدان بازاری کے لب بام تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جس

نتیجہ جذبات کی پستی اور خیالات کا ابتذال ہے،

غرض غزل ایک ایسی لطیف اور نازک صنف شاعری ہے جس میں کسی قسم کا لفظی یا

برداشت نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ سب سے پہلے ہم نے اسی نقطہ نظر سے صدیقی صاحب کے اس مجموعہ کا

کہیں بھی خیالات یا انداز بیان میں وہ نفرت انگیز ابتذال کہیں نظر نہیں آیا، جس کا دوسرا نام لکھنؤ

نزدیک صدیقی صاحب کے کلام کی سب سے زیادہ نمایاں اور قابل قدر خصوصیت یہی ہے کہ وہ

دونوں کے عظمت شناس ہیں، اس لئے اُن کے جذبات میں عام طور پر شستگی، لطافت اور پاکیزگی

اس کا اندازہ مثالوں سے ہو سکتا ہے؛

محبت ہی حقیقی منزل ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، سب گمراہی ہے،

محبت کے سوا جادہ نہ منزل محبت کے سوا سب گمرہی ہے

محبت سراپا نیاز و بندگی کا نام ہے، اس مین شکایت کی گنجایش نہین،

محبت مین شکایت کیا گلہ کیا   محبت بندگی ہی بندگی ہے

ارباب خرد کے نزدیک طریق عشق گمراہی سہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزلِ حیات کی حقیقی راہ نما یہی گمراہی ہے،

طریق عشق پہ ہنستی تو ہو خرد لیکن   یہ گمرہی کہین منزل سے ہمکنار نہ ہو

عقل و ہوش کے آداب و قیود سے نہین، بلکہ دل ہی کی کجروی و ناعاقبت اندیشی سے زندگی وابستہ ہے،

قیود ہی قیود ہین حواس و عقل و ہوش کے   یہ کجروی دل نہ ہو تو زندگی محال ہو

بغیر عشق کی نادانیون کے زندگی ایک عذاب ہی،

اک مستقل عذاب ہو پھر تو یہ زندگی   الفت مین دل اگر دلِ نادان نہ ہو سکا

یہ محض شاعرانہ تخیل نہین ہے، بلکہ ایک لطیف حقیقت ہو، یعنی زندگی کی چہل پہل، رنگینی اور دل آویزی دلِ نادان ہی کی بدولت ہو کیونکہ وہ محبت کے نورِ یقین سے معمور ہے، اور صرف نورِ یقین ہی مین قلب و روح کو حقیقی سکون و مسرت کا جلوہ نظر آ سکتا ہو، عقل کو اپنی جدت طرازیون اور موشگافیون پر کسی قدر ناز ہو، لیکن حیاتِ انسانی کو رنگین و پرکیف بنانے کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہین، صدیقی صاحب نے نہایت سچ کہا ہو،

جہانِ آب و گل کو جس نے ذوقِ زندگی بخشا   اسے اے حضرتِ ناصح دلِ نادان بھی کہتے ہین

لیکن افسوس ہے کہ عام غزل گو شعرا، "دلِ نادان" کی حقیقی قدر و عظمت کا احساس نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سرچشمۂ کیف و نشاط ایک مستقل مریض بن کر رہ گیا، اور عشق کے درد و غم کا باقاعدہ نوحہ گرون کی طرح ماتم کیا جانے لگا، حالانکہ یہی وہ نشتر ہے جس کے زخمہائے خونچکان مین تسکین [illegible] و دانی

کا راز پنہان ہو، اور تشنگان ذوق کو ہمیشہ اسی جرعۂ تلخ کی آرزو رہتی ہو کہ بغیر اس کے زندگی کی روح بیدار نہیں ہو سکتی، اگر عشق کے درد و غم میں کوئی مخصوص لذت نہیں ہو تو پھر خواجہ فرید الدین عطار کی یہ بے تابانہ آرزو

کفر کافر را و دین دیندار را　　ذرۂ درد ے دل عطار را

بالکل فضول اور بے سود تھی، اگر عشق کے درد و غم کا اثر بجاے سرور و انبساط کے حزن و افسردگی، رنج و ملال، گریہ وزاری، اعضا شکنی وغیرہ ہے، تو پھر مولانا جامی کی یہ صداے دعوت،

اسیر عشق شو تا آزاد باشی　　غمش بر سینہ نہ تا شاد باشی

ایک بے معنی اور بے حقیقت آواز تھی،

ہم کو نہایت مسرت ہو کہ صدیقی صاحب کا مذاق سلیم درد و غم کی لذت سے ناآشنا نہیں ہے، انھوں نے درد و غم کو نوحہ گروں کی آنکھوں سے نہیں، بلکہ ایک بلند حوصلہ عاشق کی نگاہ سے دیکھا ہے، اس لئے اُن کے ترانہ ہاے محبت نوحہ گری کی آلایش سے پاک ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے اور سچ کہا ہے،

مجھکو دماغ شیون و آہ و فغاں نہیں　　اک آتش خموش ہوں جس میں دھواں نہیں

غم سے عام طور پر نجات حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی ہے لیکن صدیقی صاحب اس راز سے واقف ہیں کہ یہی در اصل زندگی کا سہارا ہے، اس لئے وہ اس کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں،

دامن غم بھی کہیں چھوٹ نہ جائے ہمدم　　زندگی کے لئے پھر کوئی سہارا ہی نہیں

صرف یہی نہیں بلکہ صدیقی صاحب کے نزدیک درد محبت ہی کائنات عالم کی روح ہے،

روح جہان کرشمۂ قدرت کہیں جسے　　شاید وہی ہے درد محبت کہیں جسے

ناکامیوں پر آنسو بہانا غم کی بہت بڑی توہین ہے،

پلکوں پہ اشک آئے تو توقیر غم کہاں　　ناکامیوں کو پردۂ اخفا بھی چاہئے

یہ اسی جذبۂ احترام کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ عام غزل گو شعرا نے تغزل کی بزم سرور کو نقش

مجلس عزا بنا دیا ہے،

صدیقی صاحب کے دل کو غم سے جو شغف اور وابستگی ہے، اُس نے اُن کو فکر مآل سے بے نیاز کر دیا ہے؛

مآل دیکھئے ہو گیا کسی کا غم ہو جزو جان
کسی کا غم ہو جزو جان تو پھر غم مآل کیا

یہ صدائے مستانہ صرف ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر عاشق ہی کے درد آشنا دل سے اٹھ سکتی ہے،

عام غزل گو شعرا نے عشق و محبت کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں بجز ایک رسوائے سر بازار عامیانہ اور مبتذل ادا کے، ان کے روحانی لطافت و بلندی کا کوئی جلوہ نظر نہیں آتا، لیکن صدیقی صاحب کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں عشق کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کافی احساس موجود ہے، ان کے نزدیک عقل نہیں، بلکہ عشق ہی رزمگاہ حیات کا اصلی حریف ہے، وہ عقل کی طرح زندگی کی سخت گیریوں سے لرزہ براندام نہیں ہوتا، اس کے اندر عزم و استقلال کی وہ روح پنہاں ہے، جس کی قوت عمل راہ طلب کے سخت سے سخت مقام پر بھی عجز و درماندگی کی کیفیت محسوس نہیں کرتی، اس کی فطرت بیم و خوف سے قطعًا ناآشنا ہے، اس کی زبان سے بزدلی کا کوئی کلمہ بلند نہیں ہو سکتا،

خرد تو زندگی کی سخت گیری سے ہراساں ہے
زبان عشق پر آیا نہ لفظ الامان اب تک

اہل ہوس کو تو عشق کی زندگی ایک مصیبت نظر آتی ہے، لیکن صدیقی صاحب کی نکتہ سنج نگاہ میں وہ سراپا عبادت ہے، جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی، اس کے لئے جوہر قابل درکار ہے،

ہر کس نہیں ہے اہل کہ سب کو عطا کریں
یہ زندگی عشق عبادت کہیں جسے

صدیقی صاحب نے اس شعر میں ایک لطیف اور ناقابل انکار حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، عبادت کا اصل مقصد محض ظاہری تقدس نہیں، بلکہ قلب و روح کو تمام رذائل اخلاق مثلاً بغض، حسد، کینہ، خود پرستی غرور وغیرہ کی آلائشوں سے پاک کرنا ہے، چنانچہ حضرات صوفیہ تزکیۂ نفس کے لئے سب سے پہلے عشق و محبت ہی کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صیقل ہر قسم کے زنگ کو مٹا کر طبیعت میں خشوع و خضوع، سوز و گداز اور ذوق و شوق

کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس کے بغیر عبادت کا حقیقی لطف حاصل نہین ہو سکتا، اس بنا پر اگر صدیقی صاحب
کی چشم بصیرت کو عشق و محبت کی زندگی عین عبادت نظر آتی ہے، تو کچھ محل تعجب نہین، ورنہ اس حقیقت کے
اعتراف سے کسی صاحب نظر کو گریز ہو سکتا ہے،

موجودہ دور مین مادہ پرستون کے نزدیک تو عشق و محبت کے لطیف احساسات کی کوئی وقعت نہین،
عقل و ہنر نے مادی اختراعات و ایجادات کا جو حیرت انگیز منظر پیش کیا ہے، [illegible] زندگی کے بام ترقی
کا آخری زینہ سمجھتے ہین لیکن ہم کو مسرت ہے کہ صدیقی صاحب اس فریب مین مبتلا نہین ہین، ان کے نزدیک
محبت تکمیل زندگی کے لئے لازمی ہے، اس لئے کہ وہ حسن اخلاق کا سرچشمہ ہے، اور حسن اخلاق ہی انسان
کا حقیقی طغرائے امتیاز ہے، اسی کی بدولت اس کو کائنات ارضی کی فرمانروائی کا منصب عظیم عطا ہوا ہے، محبت
کی اس شان عظمت کا اعتراف ان سادہ الفاظ مین کیا ہے،

وہ سادہ دل ہون کہ تکمیل زندگی کیلئے سمجھ رہا ہون محبت کو لازمی اب تک

افسوس ہے کہ دنیا مین محبت کے ایسے سادہ دل قدرشناسون کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے ورنہ انسانی زندگی
اس قدر بے کیف افسردہ اور غمناک نظر نہ آتی،

صدیقی صاحب کے نزدیک محبت ہی وہ نسخہ ہے جس کے استعمال سے زندگی کی کلفتون مین ایک
خاص راحت محسوس ہونے لگتی ہے،

اب کلفت حیات بھی راحت سی ہوگئی شاید مجھے کسی سے محبت سی ہوگئی

آگے چل کر ان کے درد آشنا دل سے یہ صدائے شکر اٹھتی ہے،

تیرا کرم وہ درد محبت عطا کیا، آلام زندگی سے فراغت سی ہوگئی

غور کرو لفظ "سی" نے پیرایۂ بیان مین کس قدر دلکشی اور لطافت پیدا کر دی ہے؟ صحیح الفاظ کا انتخاب
بھی شاعر کا ایک بڑا کمال ہے،

جس کے دل کو درد مین آرام محسوس نہ ہو، صدیقی صاحب اس کو محبت کی حقیقت سے بے خبر سمجھتے ہین،

جو درد مین راحت پا نہ سکے الفت کی حقیقت کیا جانے ‏ ‏ ‏ پروانہ صفت جو جل نہ سکے سرشاری الفت کیا جانے

مین نے طوالت کے لحاظ سے صرف چند مثالون پر اکتفا کیا ہے لیکن ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہین کہ صدیقی صاحب کے دل مین محبت کے درد و غم کا جو احساس ہے وہ کس حد تک لطیف، پرکیف اور پاکیزہ ہے،

اب دیکھنا یہ ہو کہ صدیقی صاحب کی چشم و نگاہ کے محبوب کی ادائون کا کیا عالم ہے، یعنی وہ محض ایک شاہد لب بام کی ہوس پرور عشوہ طرازیان ہین، یا اُن مین قلب و روح کے اندر دنی احساسات کو شگفتہ اور مشتعل کرنے کی کوئی صلاحیت بھی ہو؟ ہم کو مسرت ہو کہ اس موقع پر بھی ہم کو مایوسی نہین ہوئی، یعنی صدیقی صاحب نے حسن کی ادائون کو ایک کم حوصلہ اور ہوس پرست عاشق کی نگاہ سے نہین دیکھا ہے، بلکہ جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان سے ان کے عاشقانہ خلوص و ایثار، نیاز و عقیدت، بلند حوصلگی اور نکتہ سنجی کا کافی اندازہ ہوتا ہی، چند مثالین ملاحظہ ہون:

حسن کی ہر ادا زندگی کے نشو و نما کا سرمایہ ہے،

زندگی مین قوت بالیدگی آتی گئی ‏ ‏ ‏ ہر ادائے حسن مین اک راز پنہان دیکھکر

حسن کی رنگینیان، در اصل جزو ایمان ہین، اس لئے سر نیاز جھکنے پر مجبور ہے،

بارگاہ ناز مین سر کو جھکانا ہی پڑا ‏ ‏ ‏ حسن کی رنگینیون کو جزو ایمان دیکھکر

ذوق نظر کی اس قابلیت کی داد دینا آسان نہین ہی،

نگاہ ناز کا تبسم عام طبائع کو برق بلا نظر آتا ہی لیکن یہ وہ لمعۂ نور ہے جس کے فیضان سے صدیقی صاحب کا تمام عرصہ گاہ حیات دفعتہً جگمگا اٹھتا ہے،

مسکرائی نگاہ سحر طراز ‏ ‏ ‏ زندگی جگمگائی جاتی ہی

اسی کیفیت کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے،

کہیں ضیائے تبسم نہ ہو کرم فرما — جمود قلب میں ہیجان زندگی کیوں ہے

محبوب کے فیض نظر کی معجز طرازیوں کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

کبھی گلشن بداماں آئی تھی دل تک نظر اُن کی — مری نظروں میں ہو صد گلستاں بے خزاں اب تک

اس اعجاز نظر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن صدیقی صاحب کے دل کی قابلیت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے، ابر کرم ہر جگہ برستا ہے لیکن ہر خاک لالہ رنگ کی تجلی گاہ نہیں بن سکتی،

بہار حسن محض عارضی نظر فروزی کا سامان نہیں ہے، بلکہ وہ ذوق ابدی کا سرمایہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے صدیقی صاحب اپنی تمام دولت ہستی نثار کرنے پر آمادہ ہیں،

تمام دولت ہستی لٹا کے مانگوں گا — بہار حسن تری، ذوق جاوداں اپنا

محبوب کی نگاہ ستم میں بھی صدیقی صاحب کو ایک التفات خاص کی جھلک نظر آتی ہے، اس لئے باوجود تباہی و بربادی کے ان کی زبان آلودۂ شکایت نہیں ہوتی،

کچھ ایسی التفات نما تھی نگاہ دوست — ہوتے رہے تباہ شکایت نہ کر سکے

محبوب کے خشم و عتاب میں جس دل کو تسکین و راحت محسوس نہیں ہوتی، وہ صدیقی صاحب کے نزدیک اسرار محبت سے ناآشنا ہے

رموز عشق سے ناآشنا ہے دل شاید — ہنوز وجہ تجلی ترا عتاب نہیں

عتاب کا وجہ تجلی ہونا بظاہر تعجب انگیز بات ہے، لیکن عشق کی طلب صادق نے ہمیشہ اسی برق عتاب ہی کے جلووں سے اکتساب فیض کیا ہے، زخم محبت کو ہمیشہ ناوک بیداد ہی کے ذوق خلش سے تسکین و راحت نصیب ہوتی ہے، چنانچہ اسی احساس کی بنا پر صدیقی صاحب نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ہے،

مجھے آ جائیگا وہ ناوک بیداد رہنے دے — جو اس کا نام بربادی ہے تو برباد رہنے دو

اہل ہوس ہمیشہ محبوب کے ظاہری لطف و کرم کے متمنی رہتے ہیں لیکن صدیقی صاحب اس حقیقت

سے باخبر ہین کہ محبوب کی حقیقی نوازش اس کے جور وستم ہی مین پنہان ہی، لیکن ہر دل مین اس کے تحمل کی صلاحیت نہین ہوتی، اس لئے وہ یہ نہین چاہتے کہ یہ بجلی ہر جگہ گرتی رہے،

غم نہین سب پہ اگر چشم کرم ہو تیری　　　غم تو یہ ہو کہ ستم بھی ہو ترا عام ابھی

یہ اسی لطافتِ احساس کا نتیجہ ہے کہ صدیقی صاحب کبھی محبوب سے گلہ مند جفا نظر نہین آتے، بلکہ وہ اس کے خشم وعتاب ہی کے آرزومند رہتے ہین کہ ربط وتعلق کی حقیقی دلیل یہی ہی،

یہ التفاتِ مسلسل دلیلِ ربط نہین　　　تبسمون مین ترا رِعتاب بھی دیکھین

نگاہِ ناز سے عام طبیعتون کو ستم طرازیون کی شکایت رہتی ہے لیکن صدیقی صاحب کی آشفتہ مزاجی کو عدمِ عتاب کا شکوہ ہے کہ بغیر اس کے ان کے دل کو پرکیف اضطراب کی کیفیت محسوس نہین ہوتی،

نگاہِ ناز مگر مائلِ عتاب نہین　　　سکونِ قلب مین پرکیف اضطراب نہین

باوجود جفا شعار ہونے کے حسن پھر بھی صدیقی صاحب کے قلب وروح کا سرمایۂ قرار ہے،

لاکھ سہی جفا شعار پھر بھی قرارِ جان ہو تو　　　حسن سہی ستیزہ کیش حسن ہی غمگسار بھی

آستانہ محبوب پر صدیقی صاحب سر جھکانے پر اس لئے مجبور ہین کہ وہ عالم کائنات کا سرمایۂ ناز ہے،

تو ہی وہ نازشِ فطرت کہ تمنا مین تری　　　آستانہ پہ بجز سر کو جھکائے نہ بنے

وصل کی خواہش محض تقاضائے ہوس ہی، طالبِ صادق کے لئے محبوب کا تصور ہی کافی ذوق آفرین اور لذت بخش ہی،

ایک فردوس تمنا ہے تصور تیرا　　　میرے بازو پہ تری زلف پریشان نہسہی

یہ اسی تصور کا فیض ہی کہ صدیقی صاحب کی شبِ فرقت بجائے گریہ وزاری کے مستی وسرشاری کے عالم مین کٹ جاتی ہی،

یہ کس کا تصور ہے انیس شب ہجران　　　اک عالم سرشاری پیہم ہے سحر تک

آداب محبت کا تقاضا ہے کہ بارگاہ حسن سے جو کچھ بھی عاشق کو مل جائے، اسی پر اس کو قانع و شاکر رہنا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مزید خواہش کا اظہار نہ کرنا چاہئے اس جذبہ شکر و قناعت کو صدیقی صاحب نے ان سادہ لیکن موثر الفاظ مین ادا کیا ہے،

دل امیدوار کو نہ پوچھئے کہ کیا ملا　　　بہت ہے جو بھی دیدیا نگاہ بے نیاز نے

صدیقی صاحب کو محبوب سے جو نیاز و عقیدت ہے، اس کا یہ عالم ہے کہ باوجود نامرادیون اور محرومیون کے وہ ترک جبین سائی پر آمادہ نہین ہین،

باوجود محرومی، باوجود ناکامی　　　پھر وہی کسی کا در پھر وہی جبین سائی

جوش محبت کا یہ حال ہے کہ اُن کے خون دل کی اک اک بوند دل بن گئی ہے تاکہ محبوب کی ہر نگاہ ناز پر اک تازہ دل نثار کیا جا سکے،

دل بنی جاتی ہے اک اک بوند دل کے خون کی　　　ہر نگاہ ناز پر اک دل لٹانے کے لئے

لیکن ہم کو مسرت ہے کہ باوجود اس والہانہ نیاز و عقیدت کے صدیقی صاحب کے جذبہ عشق مین ایسے رسوا سر بازار کی مبتذل ادائین نظر نہین آتین، اُن کے دل مین عشق کے وقار و عظمت کا بھی احساس ہے جس کا اندازہ ناظرین اشعار ذیل سے کر سکتے ہین،

یہ کیسے حجابات، یہ کیا دوری و قربت　　　مشتاق نگاہون کے لئے حد نظر کیا

نگاہ ملتجی ٹھہر، کسی کو منفعل نہ کر　　　ہے عشق کیا گداگری سوال بار بار کیون

چھپتے نہین بنتی ہے انھیں ارض و سما مین　　　سمجھے تھے نظر دیکھتی ہے حد نظر تک

یہ پردۂ افلاک نہین مانع پرواز　　　ہے یون کہ ابھی مائل پرواز نہین تین

آپ کے اختیار مین گرچہ نظام عشق ہے　　　عشق کی مستیان نہین آپ کے اختیار مین

ممکن ہو کہ صدیقی صاحب کے خیالات میں ناظرین کو غیر معمولی فلسفیانہ تعمق یا وقت آفرینی نظر نہ آئے تاہم اُن کے قلم سے اکثر ایسے اشعار بھی نکل گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر حقائق سے بالکل بے خبر نہیں ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

آرزو دے سکون ہے بے معنی ۔۔۔ زندگی اضطراب پیہم ہے

پھر کیا ہجوم برق سر آشیاں ہو آج ۔۔۔ کیوں موج زندگی یہ ہے پامال دیر سے

پرستار تو ہم ہے الٰہی یہ جہاں اب تک ۔۔۔ ہے سر بستہ زندگی راز بقیہ آستاں اب تک

معنی و مقصد ہستی کا سمجھنا معلوم ۔۔۔ عقل ہو صرف پرستاری اوہام ابھی

شوق نے پردے اٹھائے بارہا ۔۔۔ عقل صرف اختراع راز ہے

بہار نام نہیں رنگ و بو کے طوفاں کا ۔۔۔ وہ ایک کیفیت دل ہو جو خزاں میں نہیں

وہ بھی کچھ ایام نادانی کے گذرے ہیں کہ جب ۔۔۔ موسم بے برگ سے گل کو خزاں سمجھا تھا میں

ہر چند زندگی ہے کسی اور شے کا نام ۔۔۔ جینے کے واسطے غم دنیا بھی چاہئے

مجھکو احساس رنگ و بو نہ ہوا ۔۔۔ یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

سعی پیہم کی جو لذت سے ہوئے ہیں آگاہ ۔۔۔ اپنی منزل کو وہ خود دور بنا لیتے ہیں

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں، جو اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ صدیقی صاحب کی شاعری میں نہ صرف دل کی حرارت بلکہ دماغ کی نکتہ سنجی کا عنصر بھی شامل ہے،

علاوہ حسن خیال کے شاعری کی ایک ضروری شرط انداز بیان کی ندرت و طرفگی بھی ہے، اس لحاظ سے بھی صدیقی صاحب مستحق ستایش ہیں کہ ان کا پیرایۂ بیان ہمیشہ شاعرانہ رہتا ہے، اور وہ زیادہ تر کنایوں اور اشاروں سے کام لیتے ہیں جن سے طرز ادا میں ایک خاص دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ زیادہ کھلتے نہیں، لیکن اسی کے ساتھ اتنا چھپتے بھی نہیں کہ شعر معمہ بن کر رہ جائے، اور اصل مفہوم

کی طرف سامع کا ذہن منتقل نہ ہونے پائے، صدیقی صاحب کو اگرچہ فارسیت سے خاص ذوق ہے، اور زیادہ تر وہ فارسی ترکیبوں سے کام لیتے ہیں، لیکن ان کو اس کا احساس ہے کہ غزل کی زبان صاف سادہ شیرین اور نرم و نازک ہونی چاہئے، اس لئے وہ حتی الوسع ثقیل اور نامانوس الفاظ و تراکیب کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں جس کی وجہ سے بندش کی چستی، روانی اور برجستگی میں فرق آنے نہیں پاتا غرض مجموعی حیثیت سے صدیقی صاحب کا ایک خاص انداز بیان ہے، جس کا اندازہ ناظرین اشعار مذکورہ بالا سے بخوبی کر سکتے ہیں،

ناظرین کو غالباً تنقید کے دوسرے رخ کا انتظار ہوگا، کسی شاعر کے کلام کا ہر قسم کی لغزشوں اور کمزوریوں سے قطعاً پاک ہونا یقیناً نہایت مشکل ہے، صدیقی صاحب کو غالباً اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا، ممکن ہے کہ ان کے کلام میں نکتہ چین نگاہوں کو تلاش سے کچھ فروگذاشتیں نظر آجائیں لیکن محض جزئی فروگذاشتوں کی بنا پر صدیقی صاحب کے شاعرانہ مذاق کی لطافت اور پختگی سے انکار کرنا سخت ناانصافی ہوگی، ان کے کلام کے متعلق ارباب فن کی جو رائے بھی ہو، لیکن بحیثیت ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے ہم ان کا خیر مقدم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، ہم کو تو صرف یہ دیکھ کر خوشی ہے، کہ وہ ایک نوحہ گر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دل و دماغ میں ایک مطرب رنگین نوا کا کیف و سرور لے کر بارگاہ حسن میں حاضر ہوئے ہیں، ان کا یہ ادعا:-

اک نوحہ گر عشق کی آواز نہیں ہیں ۔۔۔ گاتا ہوں محبت کے دل آویز ترانے

ہمارے نزدیک بالکل صحیح اور حق بجانب ہے،

کلیات فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ جواب تک متفرق طور سے دیوان شبلی دستۂ گل، بوئے گل، برگ گل کے ناموں سے چھپے تھے، انہیں سب یکجا کر دیئے گئے ہیں قیمت ۱۲؍

"منیجر"

وفیات

مولانا شبیر احمد عثمانی رح

دسمبر ۱۹۴۹ء کے وسط مین جدہ مین تھا، ۱۳ر دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد حکومت سعودیہ کی وزارتِ خارجیہ جدہ مین ایک ہندوستانی مسافر کی دعوت تھی، شہر کے کچھ معززین، اسلامی حکومتون کے سفیر اس مین شریک تھے، ہندوستان، پاکستان، مصر و عراق وغیرہ کے سفیر اور وزارتِ خارجیہ سعودیہ کے بعض ارکان موجود تھے، مین ہندوستانی کونسل کے نمایندون پروفیسر عبدالحمید خان انڈین کونسل اور مولانا عبدالمجید الحریری کمشنر حج متعین جدہ کے ساتھ وہان پہنچا، احباب کچھ آچکے تھے، کچھ آرہے تھے، مختلف موضوعون پر گفتگو تھی، خصوصیت سے کراچی مین اسلامی ملکون کی جو اقتصادی کانفرنس ہورہی تھی اس مین حجاز کی طرف سے حجاز کی اقتصادی حالت کی جو مطبوعہ رپورٹ اس وقت سامنے رکھی تھی اس پر گفتگو ہورہی تھی کہ اتنے مین جدہ مین پاکستانی کونسل مسعود صاحب جو مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب دانا پوری کے صاحبزادہ ہین، تشریف لائے، اور نہایت افسوس کیساتھ یہ ذکر کیا کہ آج مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال ہوگیا، اس خبر کے سننے کے ساتھ مجلس پر اداسی چھاگئی، میری سامنے سے پوری نصف صدی کی معاصرانہ صحبتون کی ایک دنیا گذر گئی،

سنہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے وہ دارالعلوم دیوبند مین اور راقم دارالعلوم ندوہ مین تعلیم پارہے تھے، یہ زمانہ دونون درسگاہون کا زرین زمانہ تھا، دارالعلوم ندوہ مین میرے ساتھ میرے ایک عزیز قریب و ہموطن (مولوی سید محمد قاسم صاحب خلف الرشید مولانا شاہ تجمل حسین صاحب خلیفہ شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، و حضرت مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہم اللہ تعالیٰ) رفیق درس تھے، وہ اپنے والد کے حکم سے

وہ چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تھے، اُن کو طالب علموں کی انجمن سازی اور فرد وادی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، چنانچہ
ربند پہنچ کر انھوں نے اس سلیقہ کا ثبوت دیا، اور دیوبند میں طالب علموں کی تقریر و تحریر کی ایک انجمن کی
یا ڈالی، مولانا شبیر احمد صاحب جوان دنوں اُسی کی عمر کے طالب علم تھے، اور تقریر و تحریر کا فطری ذوق
لھتے تھے، ان جلسوں میں دلچسپی لیتے تھے، اور اسی مناسبت سے مولوی ناظم سے بھی ان کو محبت تھی، مولوی
سم نے ندوہ و دیوبند کو ملانا چاہا۔ وہ میرے خطوں میں مجھ سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تذکرہ کرتے تھے اور
ام پہنچاتے تھے، اور میرا تذکرہ ان سے کرتے تھے، اور میری طرف سے ان کو سلام پہنچاتے تھے، اس تعلق کا یہ اثر
ا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا اور ایک دوسرے کو واقف ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند سے القاسم
ندوہ سے الندوہ نکل رہا تھا، اور ہم دونوں کے مضامین اپنے اپنے پرچہ میں نکلتے تھے، اور چھپتے تھے، اسی زما
ن مرحوم کسی تعلق سے لکھنؤ آئے، تو مدرسہ میں مجھ سے ملنے آئے، یہ میری اُن کی طالب علمانہ ملاقات کا پہلا موقع تھا،
غالباً ۱۹۰۴ء کی بات ہو،

۱۹۰۶ء میں میری دستار بندی ہوئی، اور دستار بندی کے جلسہ میں برجستہ عربی تقریر کی وجہ سے
بی مدرسوں میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی زمانہ میں مولانا کو بھی فراغت حاصل ہوئی، وہ
ر العلوم دیوبند میں، اور میں دار العلوم ندوہ میں مدرس ہوگئے، اسی کے سال دو سال کے بعد کسی انجمن کی
وت پر پنجاب جانے کا اتفاق ہوا، تو راہ میں سہارنپور اُتر کر دیوبند چلا گیا، یہ میری حاضری کا پہلا اتفاق
ما، ان دنوں دار العلوم دیوبند میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (خلف مولانا سید حکیم
بد الحی صاحب ناظم ندوہ) ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر دیوبند میں حدیث کے دورہ میں شریک تھے، میں
س کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی پہچانے نہیں، منہ چادر میں لپیٹے تھا، مدرسہ پہنچ کر سید عبد العلی صاحب کو پوچھکر ان کے
رہ میں گیا، وہ مجھے یک بیک دیکھ کر زبان سے کچھ کہا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اشارہ سے ان کو منع کیا،
ور وہ رک گئے، اور ساتھ لے کر مدرسہ اور درس کے کمرے دکھانے لگے، اسی آخر میں اوپر چھت پر دار الشوریٰ

اندر دار الاہتمام دکھانے لے گئے، اتفاق دیکھئے کہ ایک طالب علم جو پہلے ندوہ میں پڑھتے تھے، اور اب دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ دار الاہتمام سے نکل رہے تھے، وہ مجھے دیکھنے کے ساتھ دوڑ کر مولانا حبیب الرحمان صاحب نائب مہتمم کی خدمت میں چلے گئے، اور میرا نام بتادیا، موصوف جو ہمہ تن متواضع اور خاکسار رہتے، ایک معمولی طالب علم کے لئے یہ زحمت فرمائی کہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ اندر کمرہ کے لے گئے، اور چائے کی دعوت فرمائی جس میں اکثر حضرات مدرسین شریک تھے، دوسرے وقت حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنے فضیلت کدہ پر کھانے کی دعوت فرمائی،

ایک طالب علم کے لئے سب سے بڑی دعوت طالب علموں کے جلسہ کی ہو سکتی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے جلسہ کا اہتمام فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس تھے مگر اس خدمت سے علٰحدگی کا خیال کر رہے تھے، اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولینا حسین احمد صاحب تازہ تازہ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، جلسہ آراستہ ہوا، طالب علموں نے تقریریں کیں، آخر میں مولینا انور شاہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب نے عربی میں تقریریں کیں، اور پھر اس کم سواد کو عربی میں تقریر کا حکم ہوا، اور اُس نے تعمیل کی،

اس زمانہ میں آریوں کی تحریک سے شدھی کا زور تھا، اور عربی مدرسوں میں آریوں سے مناظرہ کی مہم دیجاتی تھی، چنانچہ جلسہ کے بعد طالب علموں نے آریہ اور مسلمانوں کے مناظرہ کا مظاہرہ کیا، طالب علموں کے دو گروہ بنے، ایک ایک مسئلہ کا حامی تھا، دوسرا اس پر معترض، باہم سوال وجواب اور رد و قدح کا سلسلہ قائم تھا کہ ایک فریق کمزور سا پڑ گیا، مولانا شبیر احمد صاحب جو مدرسین کے ساتھ میرے قریب بیٹھے تھے، مولانا حبیب الرحمن صاحب سے اجازت لے کر مدرسین کی صف سے نکل کر طالب علموں میں مل گئے، اور اس کمزور فریق کی حمایت میں فرمانے لگے، اور آخر اپنی تقریر کی قوت اور استدلال کے زور سے ہارا ہوا میدان جیت لیا، اور سب نے ان کی ذہانت اور طباعی کی داد دی، میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام

عمر میں ایک دفعہ زیارت کی، اور وہ اسی موقع پر نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ایک کمرہ میں جس میں کھری چارپائی اور ایک چٹائی اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، تشریف فرما تھے،

اس واقعہ پر لمبا لمبا سال گذر گئے، مولانا شبیر احمد صاحب دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور سال بہ سال ادنی سے اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے ہوئے کتب حدیث کا درس دینے لگے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس ہو گئے، اسی زمانہ میں میرا بھی دلی جانا ہوا، تو مدرسہ میں اُن سے ملاقات ہوئی، مگر پھر دارالعلوم دیوبند لوٹ آئے، اسی زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھی حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی طلب پر دیوبند آکر مقیم ہوئے تھے، ان کا مشن یہ تھا کہ دیوبند جو تعلیمی فضا محیط ہو گئی تھی، اور سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ روح جو اس حلقہ سے دیتی چلی جا رہی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اور اس سلسلہ میں موتمر الانصار کی بنیا دڑالی، اور اس کا ۱۹۱۱ء یا اوس کے پس و پیش زمانہ میں مرادآباد میں بہت بڑا جلسہ ہوا، جس میں علی گڈہ اور ندوہ اور دیوبند کے اکثر رجالِ علم و عمل جمع ہوئے، اور تمام ہندوستان سے مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع اس میں شریک تھا، ندوہ سے حضرت الاستاذ مولانا شبلی مرحوم شریک ہوئے تھے، اس جلسہ میں مولانا شبیر احمد صاحب نے العقل والنقل کے نام سے اپنا ایک کلامی مضمون پڑھکر سنایا، حاضرین نے بڑی داد دی، اس مضمون میں گو جدید معلومات حضرۃ الاستاذ کی تصنیف سے لئے گئے تھے، مگر اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکالا گیا تھا، یہ گویا حامیانِ عقل کے اس علم کلام کا رد تھا، جس میں خرق عادت کے وجود اور معجزات کے صدور پر ناک بھوں چڑھائی جاتی تھی، حضرت الاستاذ نے واپس آکر مجھ سے فرمایا تھا، کہ انھوں نے معلومات میری کتاب سے لئے اور پھر میرا ہی رد کیا، دیوبند کے حلقہ میں اُس زمانہ میں یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو حضرت مولانا قاسم صاحب کے علوم و معارف پر پورا احتوا ہے، وہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین و معانی کو اپنی زبان اور اپنی طرز ادا میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ وہ دلنشین ہو جاتے تھے، یہ خیال رہے کہ مولانا قاسم صاحب

رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین نہایت غامض، دقیق اور مشکل ہوتے تھے، جن تک عوام کی پہنچ نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اُن کے مضامین اور حقائق کو سمجھنا، پھر زمانہ کی زبان میں اس کی تعبیر و تفہیم کوئی آسان بات نہ تھی، اور اسی لئے مولانا شبیر احمد کی تقریر و تحریر کی تعریف کی جاتی تھی،

۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانوں کی سیاست کروٹ لے رہی تھی، یکے بعد دیگرے طرابلس، پھر کانپور کی مسجد، پھر بلقان کی جنگ، پھر یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے واقعات پیش آئے، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی،

یہاں پر ایک بات مجھے بے محابا کہنا ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب مولانا ابو الکلام کا الہلال نکل رہا تھا، ان کی آتش بیانی سے مسلمانوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی، اور وہ جہاد جس کے نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے مولانا ابو الکلام نے اس کا صور اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ یہ بھولا ہوا سبق لوگوں کی زبانوں پر آگیا، الہلال دیوبند کے حلقہ میں بھی آتا تھا، اور حضرت مولانا محمود حسن کی مجلس میں پڑھا جاتا تھا، میں نے اسی زمانہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا، اور ابو الکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا،

اس زمانہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان تھے، مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اس حلقہ کی ایک جماعت پر مدرسہ کے مصالح مقدم تھے، اور دوسرے پر اسلام کے مصالح، مولانا محمود حسن صاحب دل سے دوسری جماعت میں شریک تھے، میں نے سُنا کہ انھوں نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے تو مدرسہ اپنے اصلی مقصد (جہاد) پر پردہ ڈالنے کے لئے بنایا تھا، بہرحال مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے ہٹنا پڑا، اور دہلی میں مسجد فتحپوری کے ایک گوشہ میں دائرۃ المعارف کی بنیاد ڈالی، اور اس میں انگریزی خوان تعلیم یافتوں اور عربی کے فارغ التحصیل عالموں کو قرآن پاک کا درس اس جہادی اسپرٹ میں دینے لگے، جو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی زندگی کی روح تھی، اور مجاہدین

سرحد (یاغستان وغیرہ) سے حلقۂ اتصال قائم کیا گیا، اس وقت یورپ کی جنگ کے شعلے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں بغاوت کا خیال روز افزون تھا، انگریزی حکومت کی جاسوسی اپنا کام کر رہی تھی، مولانا ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ احرار سب نظر بند تھے، یا جیل میں تھے، حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے ہجرت کی، اور وہ حجاز میں قید ہو کر مالٹا میں نظر بند ہوئے، اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبد اللہ انصاری جیسے رفقا افغانستان پہنچ گئے، جو لوگ اب باقی رہ گئے تھے، ان میں بڑے لوگ حکیم اجمل خاں مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی تھے، ان لوگوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اور پہلے مجلس خلافت اور پھر جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اس وقت تک مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا میں تھے، ۱۹۲۰ء میں جو وفد خلافت لندن گیا تھا جس کا ایک ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، غالباً مارچ یا اپریل میں جب مسٹر فشر وزیر تعلیم قائم مقام وزیر ہند سے ملاقات ہوئی، تو میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیری و نظر بندی کے معاملہ کو ان کے سامنے پیش کیا، یاد آتا ہے کہ موصوف اسی سال کے آخر یا ۱۹۲۱ء کے شروع میں مالٹے سے چھوٹ کر مع خدام کے جن میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے، واپس آئے مگر شاید چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہے، اور وفات پائی، اس درمیان میں عقیدتمندوں نے ہر سمت سے ان کو بلایا، مگر خود تشریف نہ لیجا سکے، اپنے قائم مقام یا ترجمان کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد صاحب ہی کو بھیجا، ان مقامات میں سے خاص طور سے دہلی کے جلسہ میں ان کی نیابت نہایت یادگار اور مشہور ہے، گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خاں مرحوم نے اٹھایا تھا، حضرت مولانا شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت دلنشین تقریر فرمائی تھی، یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے نہ صرف فخر و شرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت اور ارجمندی کی بڑی دلیل ہے،

۱۹۲۲ء کے آخر میں گیا میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے شاندار اجلاس ہوئے، جمعیۃ کے اس اجلاس

کے صدر مولانا حبیب الرحمان صاحب تھے، ان کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے اکثر اساتذہ آئے ہوئے تھے، ان

مین مولانا شبیر احمد صاحب بھی تھے کانگریس اور جمعیۃ کے یہ اجلاس ایک خاص حیثیت سے اہمیت رکھتے ہین

یعنی اس اجلاس مین کانگریس کی سیاست مین ایک اہم تبدیلی ہوئی اور پنڈت موتی لال، سی آر داس

حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی رہنمائی مین ترک موالات کی جگہ جس مین کونسلون اور اسمبلیون

کا بائیکاٹ بھی تھا، یہ تجویز سامنے رکھی گئی، کہ ان کونسلون اور اسمبلیون پر قبضہ کرکے حکومت کو بے دست و پا

کر دیا جائے، گویا مقصد یہ تھا کہ مقصود کے حصول کے لئے طریق جنگ اور لڑائی کے ڈھنگ کو بدلا جائے، اس

تحریک کے حامیون نے سوراج پارٹی اپنا نام رکھا، اس وقت گاندھی جی، ابوالکلام، محمد علی وغیرہ جیل مین تھے

ان کے خالص پیرو دن نے اس کی سخت مخالفت کی، اور نو چنجر (نہ بدلنے والے) کا لقب پایا، کانگریس کی

طرح جمعیۃ مین بھی حکیم صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا، اور اس کے فیصلہ کے لئے ارکان جمعیۃ کا خاص جلسہ ہوا

تجویز کے حامیون کی طرف سے خاکسار نے اور مخالفون کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریرین کین، مولانا

شبیر احمد صاحب کی اس تقریر کا صرف ایک حصہ مجھے یاد ہے جس مین انھون نے فرمایا تھا کہ حضور انور علیہ الصلوٰۃ

والسلام خانہ کعبہ کی فتح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ قریش نو مسلم تھے

ان کو یہ بات کعبہ کی حرمت اور ادب کے خلاف نظر آئی، اس لئے حضور نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

ارشاد فرمایا کہ اگر تمھاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی، تو مین کعبہ کو ڈھاکر پھر اس کی بنیاد ابراہیمی اساس پر رکھتا'

یہ واقعہ بیان کرکے مولانا نے فرمایا کہ ترک موالات کے بدولت ابھی ہماری قوم انگریزون کی غلامی سے نئی نئی

نکلی ہے، یہ کونسل اور اسمبلی کے چکر مین پڑکر پھر نہ غلام بن جائے، بہرحال ووٹ لئے گئے، اور مولانا کی مخالفت

کامیاب ہوئی،

مولانا حسین احمد صاحب کا نام اس وقت تک خواص سے نکل کر عوام تک نہین پہنچا تھا، وہ اس تمام

ہنگامہ کے وقت حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹا مین تھے، ساتھ ہی ۱۹۲۱ء مین ہندوستان واپس آئے

اور سب سے پہلے وغیرہ وہ ہندوستان کی سیاست میں کراچی خلافت کانفرنس میں مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے
اور اس مشہور انقلابی تجویز کے مؤیدین میں تھے جس میں مسلمان نوجوانوں سے فوج کی ملازمت ترک کرنے
کی تحریک تھی، اس کے محرک محمد علی اور مؤید مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد اور سیف الدین کچلو وغیرہ تھے،
آخر سب پر مقدمے چلائے گئے، اور سب کو چند سال کی قید کی سزا ہوئی، ع

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اس قید سے آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب پیش از بیش تحریکات میں حصہ لینے لگے اور
آخر خلق کی زبان نے ان کو شیخ الہند کا جانشین مان لیا، اور اب حضرت شیخ الہند کے مسلک کی ترجمانی
اور اُن کی جماعت کی نمایندگی مولانا موصوف فرمانے لگے، تاہم خلافت اور جمعیۃ کے جلسوں میں مولانا شبیر
صاحب بھی آتے جاتے رہتے تھے، لیکن یہ آمد و رفت بھی کم ہوتی رہی،

۱۹۲۶ء میں جب سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ میں عالمگیر اسلامی کانفرنس بلائی، اور ہندوستان
کی مختلف مجلسوں کی طرف سے وفد بھیجے گئے، تو خلافت کے وفد کی صدارت حکیم صاحب اور احرار پنجاب کے
اصرار سے اس خاکسار کے حصہ میں آئی، اور اس کے ممبر محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی ہوئے، اور جمعیۃ العلماء
کے وفد کے صدر مولانا کفایت اللہ صاحب، اور ممبر حافظ احمد سعید صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا
عبدالحلیم صدیقی صاحب اور مولانا عرفان صاحب مرحوم تھے، یہ کل وفد ایک ہی جہاز پر حجاز کو روانہ ہوا، اور
اس طرح اس سفر میں مرحوم کو بہت پاس سے دیکھنے کا موقع ملا، طبیعت میں بڑی نزاکت تھی، اور بات بات
میں وہ چیز ظاہر ہوتی تھی، اس لئے رفقائے سفر ان کی بڑی رعایت کرتے تھے، ایک مینی طالب علم جو دیوبند میں
ان کے شاگرد رہے تھے، ان کی خدمت کرتے تھے، اور یہ خدمت پورے سفر حجاز میں انھوں نے کی، جدہ سے مکہ معظمہ
تک ہم سب ایک لاری میں آئے، جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مرحوم پر عجب کیفیت تھی، انھوں نے قرآن کا احرام
باندھا تھا، اور ہم سب تمتع کے احرام میں تھے، جیسے جیسے مکہ معظمہ قریب آتا جاتا تھا، ان پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا

اور بہوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، یہ ان کا دوسرا حج تھا، مکہ مین موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے، ان مین ہم لوگ شریک ہوتے رہے، اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی شریک ہوتے تھے، اسی سفر مین مجھے علم ہوا کہ موصوف عربی تحریر و تقریر پر اچھی طرح قادر تھے، سلطان نے خلافت اور جمعیۃ کے دونون وفدون کو ایک ساتھ ملنے کو بلایا، اور مختلف موضوعون پر گفتگو کی، مولانا شبیر احمد صاحب نے اس موقع پر خلاف توقع اپنے اکابر دیوبند کے عقائد اور فقہی مسلک پر اچھی اور شستہ گفتگو کی، اور سلطان اس کو دیر تک سنتے رہے،

موتمر کی کارروائیون مین تو مولانا نے کوئی خاص حصہ نہین لیا، مگر موتمر کے آخری اجلاس مین ایک مضمون انھون نے پڑھ کر سنایا، جس کو پہلے سے وہ لکھ لائے تھے، مگر اپنے رفقاء کو وہ پہلے سے نہین دکھایا تھا، مین اس اخیر جلسہ مین شریک نہ تھا، مگر وفد جمعیۃ کے ارکان کو مولانا کے اس تنہا بیان سے بڑی حیرانی تھی، بہ حال بات چپ چپ ختم ہوگئی،

حج کے مناسک مین بھی ان کی رفاقت رہی، یہ زمانہ گرمی کا تھا، باد سموم کے جھونکے چل رہے تھے، ظہر کے وقت ذوق و شوق مین مسجد نمرہ مین نماز پڑھنے کی آرزو تھی، مگر آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت دیکھ کر ہمت نہین پڑتی تھی، مگر مولانا کفایت اللہ صاحب اور حافظ احمد سعید نے اونٹون کا سامان کر لیا تھا، آخر مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ اونٹ پر ان کا ردیف بن کر چلا، مجھے ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا، اور تب گرا، اسی خوف سے واپسی مین پیدل آیا، اسی موسم کی شدت مین مولانا شبیر احمد صاحب پیدل ہی روانہ ہوئے، مسجد کے قریب ہی پہنچے تھے کہ باد سموم کے ایک جھونکے نے ان کو آلیا، مگر بال بال بچ گئے، اس نماز مین آنے کا شوق اس خیال سے بھی تھا کہ سلطان امامت کرین گے، اور ایک سلطان وقت کے پیچھے ہم ہندوستان کے غلام نماز پڑھین گے، مگر مسجد مین جماعت تیار تھی، سلطان کا انتظار رہا۔ وہ نہین آئے، تو ایک مصری شیخ نے نماز پڑھائی، نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ سلطان اپنے نجدی ہمراہیون کے ساتھ ننگے سر اور ننگے پاؤن لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آرہے ہین، بعد کو جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو مین نے حاجیون

کی طرف سے شکایت پیش کی، کہ نماز میں آپ کا بڑا انتظار رہا، سلطان نے کہا ہمارے نجدی بھائی آپ جانتے ہیں کہ جھٹ ہی نہیں لگاتے، اس لئے میں نے چاہا کہ ذرا آفتاب ڈھل جائے، تو چلوں، مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی نماز ہوگئی، پھر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے بے گھر ہوگیا، تعلیم جیسی چاہئے نہیں ہوئی، بدو ہوں، قرأت نہیں جانتا، بدآواز بھی ہوں، اس لئے نماز پڑھانے سے گریز کرتا ہوں، میں نے مذاقاً کہا کہ سال میں ایک دفعہ لوگ آسانی سے اس آواز کو گوارا کرسکتے ہیں، مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو مشتاق رہتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا امیر کے پیچھے نماز پڑھیں، امیر افغانستان جب ہندوستان آئے تھے، تو مسلمان سیکڑوں کوس سے اُن کے پیچھے نماز پڑھنے آئے تھے،

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک سفر میں بھی رفاقت رہی، میں گو محمد علی و شوکت صاحب وغیرہ کے ساتھ تھا، مگر ہم جنسی اور ہم مذاقی کے سبب سے اکثر جمعیۃ والوں کے یہاں آکر بیٹھا کرتا تھا، اونٹوں کا سفر تھا، بارہ روز میں منزلیں تمام ہوئیں، ہر روز ایک نئی منزل میں قیام تھا،

ہر روز مرا نیا مقام	صبح کہیں، کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام	راہ دور و دراز میں

میں مرحوم کی خدمت میں بیٹھتا، اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں، ایک منزل میں مرحوم نے غدر دہلی کے زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رفقائے جہاد، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، اور حافظ ضامن علی صاحب شہید کے واقعات اور تھانہ بھون اور شاملی پر تاخت اور مجاہدین کا حملہ اور حافظ صاحب کی شہادت کے واقعات کو اس پر اثر طریقہ کر بیان فرمایا کہ روح نے لذت پائی،

واپسی میں مولانا جہاز پر بہت علیل ہوگئے تھے، حالت بہت نازک معلوم ہوتی تھی، دوسرے درجہ میں ان کا سفر تھا، جو جہاز کے پچھلے حصہ میں تھا، وہاں بڑی تکلیف جہاز کے بعض آلات کا دھڑ دھڑا کر کے نیچے

گزرنا تھا، اسی حالت مین ہندوستان پہنچے، بالآخر اُن کو صحت ہو گئی،

اُن کی آنکھین کمزور تھین، ایک دفعہ تو تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، موگا (پنجاب) کے ڈاکٹر آنکھون کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان سے علاج کرایا تو درست ہو گئی تھین،

مرحوم اب تک دار العلوم دیوبند مین مدرس تھے، دار العلوم دیوبند کے اکابر مین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے کچھ انتشار سا تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، ایک طرف مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا حافظ احمد صاحب اور کچھ مدرسین تھے، دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحب مفتی عزیز الرحمن مولانا سراج احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، اور بعض نوجوان مولوی عتیق الرحمن صاحب وغیرہ تھے، آخر دوسرا گروہ دیوبند کو چھوڑ کر گجرات مین ڈابھیل ضلع سورت مین منتقل ہو گیا، جہان پہلے سے ایک معمولی سا مدرسہ قائم تھا، مگر عمارت اچھی خاصی تھی، مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد اور مولانا سراج احمد صاحب وغیرہ نے یہان دوسرا دیوبند قائم کیا، بہت سے سرحدی اور ولایتی اور بنگالی، اور ہندوستانی طالب علم بھی اُن کے ساتھ آئے، اور چند سال تک زور وشور سے ان صاحبون کا درس وہان جاری رہا،

اسی زمانہ مین خاکسار کو کسی جلسہ کے سلسلہ مین راندھیر ضلع سورت جانے کا اتفاق ہوا، ڈابھیل قریب ہے، مولانا شبیر احمد صاحب کو معلوم ہوا تو ایک حیدر آبادی طالب علم کو خط دیکر بھیجا، مین نے آنے کا وعدہ کیا، اور دوسرے روز ڈابھیل گیا، مدرسہ کو دیکھا، حضرات مدرسین سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، طلبہ نے میرے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا، جس مین تقریرین ہوئین، رات کو قصبہ مین جلسہ کا انتظام ہوا، جس مین مختصر تقریر کی، اس کے بعد خود مولانا نے تقریر فرمائی، جس مین میری حقیر ذات کی نسبت ایک فقرہ استعمال کیا تھا، جو درحقیقت میری حقیقت ہے، میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ مجھے اُن سے بہت اُنس ہے، اس لئے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتون کے درمیان ایک سفیر و متوسط کی حیثیت رکھتے ہین، پھر میری کتاب ارض القرآن کی تعریف فرمائی،

اُن کے گجرات کے قیام کے زمانہ مین اُن کی آمد و رفت حیدرآباد دکن کی طرف بہت بڑھ گئی تھی، شرح صحیح مسلم کی امدادی تحریک جاری تھی، اور کبھی کبھی میرا بھی جانا ہوجاتا تھا، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک میلاد کی مجلس مین میرا ان کا ساتھ ہوگیا، اسی جلسہ مین خود حضور نظام بھی آنے والے تھے، میری تقریر ہورہی تھی کہ وہ آگئے، میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، حضور نظام نے بڑی داد دی، اور اہلِ محفل محظوظ ہوئے، لوگون مین باہمی ترجیح کی اچھی خاصی ردّ و کد شروع ہوگئی، مگر بحمداللہ دونون مقررون کے دل باہم صاف رہے اور زبانین محفوظ،

مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب مقرر تھے، عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے جس سے اہلِ محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہین ہنستے تھے، مگر دوسرون کو ہنسا دیتے تھے، ان کی تقریرون مین کافی دلائل بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور علمی اور تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی، ذہانت وطباعی، اور بدیہہ گوئی ان کی تقریرون سے نمایان ہوتی تھی، اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے، وہ اُنکو اپنی تقریرون مین عمدگی سے کھپاتے تھے،

ان کی تحریر بھی صاف شستہ تھی، اور اس عصر کے اچھے لکھنے والون کے لٹریچر کو غور سے پڑھا تھا اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا، جمعیۃ و خلافت کے جلسون مین علمار کی بعض تجویزون کی انگریزی بنانے مین بڑی دقت ہوتی تھی، اس موقع پر محمد علی مرحوم نے کہا تھا کہ مولوی شبیر احمد صاحب کی عبارت کی انگریزی بنانے مین بڑی آسانی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی ساخت انگریزی طرز پر ہوتی ہے،

موصوف کے مضامین اور چھوٹے رسائل تو متعدد ہین، مگر حقیقت یہ ہو کہ ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو مین ان کے قرآنی حواشی ہیں، جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ترجمۂ قرآن کے ساتھ چھپے ہین، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی، اور تفسیرون پر عبور اور عوام کے دلنشین کرنے کے لئے انکی

قوتِ تفہیم حدِ بیان سے بالا ہے، مجھے امید ہے کہ ان کے ان حواشی سے مسلمانون کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، ان حاشیون مین انھون نے جا بجا اپنے ایک معاصر کی تصنیف کا حوالہ صاحب ارض القرآن کے نام سے دیکر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہو کہ وہ معاصرانہ رقابت سے کس قدر بلند تھے، مین نے اپنے حلقۂ درس مین ان کے حواشی کی افادیت کی ہمیشہ تعریف کی ہے، اور ان کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، افسوس یہ ہو کہ یہ حاشیے بہت باریک چھاپے گئے ہین، اس لئے اُن سے استفادہ مین مشکل پڑتی ہے، ان حواشی کی افادیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانون کے فائدہ کے لئے فارسی مین ترجمہ کر کے چھاپا ہو،

صحیح مسلم کی شرح لکھنے کا خیال ان کو اپنی نوجوانی کے عہد سے تھا، صحیح بخاری کی شرح تو احناف مین سے حافظ بدرالدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کر دیا تھا، مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہین لکھی گئی تھی، اس کے لئے مرحوم نے اپنے دست و بازو کو آزمایا،

انگریزون کے عہد مین دیوبند مین جو بعض سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، اور کانگریسی اور لیگی خیالات مین جو آویزش تھی، اس کی اطلاع حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد کے کانون تک پہنچی تھی، اس سلسلہ مین انھون نے مناسب سمجھا کہ مولانا شبیر احمد کو مہتمم بنا کر دیوبند بھیجین، چنانچہ وہ اس صورت سے ڈابھیل سے واپس آکر دیوبند مین مقیم ہوئے، اور اہتمام کا کام شروع کیا، مگر ظاہر ہو کہ صرف تقرر اور منصب سے خیالات اور نظریون کا اختلاف دور نہین ہوسکتا تھا، چنانچہ طلبہ مین اسٹرائک ہوئی اور بعض نامناسب واقعات پیش آئے جن کا نتیجہ ان کا استعفاء تھا،

اس موقع پر مجھے ایک بات یاد آئی، ۱۹۱۳ء کی بات ہو کہ ندوہ مین مولانا شبلی کے استعفے پر ایک عظیم الشان اسٹرائک ہوئی تھی جس مین علی گڈھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے، اور ملک اور قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی مین طلبہ کی تائید مین تھے، اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب

ندوی کا ایک مضمون "الاحتساب فی الاسلام" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا، جس میں اسٹرائک کو خلاف اصول بتایا تھا، اس مضمون میں ایک مصرع یہ بھی تھا ع

لو آپ اپنے جال میں صیاد آگیا

پھر جب دیوبند کے احاطہ تک اسٹرائکوں کا سیلاب پہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے بہت یاد آیا،

موصوف کے حیدرآباد دکن اور نظام حیدرآباد سے گوناگوں تعلقات پیدا ہوگئے تھے، مرحوم نے اس ہنگامہ میں جو آریہ تحریک کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں میں پیدا ہوگیا تھا، اپنی تقریر سے بہت کچھ مسلمانوں میں سکون پیدا کیا، یہاں تک کہ حیدری صاحب اپنی ممنونیت ان کی ذات کی نسبت ظاہر کی، اور منصب میں ترقی کی، مگر ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام پر تفضیلیت کا غلبہ تھا، اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، تو مرحوم نے تقریر فرمائی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقہ سے بیان کئے تھے، اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی، اور ان کے بے باکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی،

مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڈھ کی دعوت پر اعظم گڈھ آئے اور شبلی منزل میں میرے ہی پاس ٹھہرے، اس وقت انکی شرح مسلم کے کچھ اجزار ساتھ تھے جن میں قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے، جن کو جابجا سے مجھے سنایا، ایک اور دفعہ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڈھ آئے، ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے، مجھ سے ملنے آئے میں نے چائے پیش کی، تو پینے سے انکار کیا، انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی، مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں ان پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، اس لئے ان میں پینے سے انکار کیا، بہرحال اس سے اُن کے تقویٰ اور بزرگان کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے،

مرحوم کی شرح مسلم جس کا نام فتح الملہم ہے لکھنے کا کام تمام عمر جاری رہا، اتنے بڑے کام کے لئے ان
کسی ریاست سے امداد کی فکر تھی، چنانچہ اس کے لئے حیدرآباد دکن کا خیال تھا، اس کے لئے معروضہ پیش کیا
اور آخر بڑے رد و کد کے بعد ریاست نے اس کی سرپرستی منظور کی، اور ہر جلد کے لئے کچھ امداد اور مصنف کیلئے
ماہانہ وظیفہ منظور ہوا، اور مولانا نے جمعیت خاطر کے ساتھ اس کی چند جلدیں لکھ کر شائع کیں، اس سلسلہ میں یہ امر
ذکر کے قابل ہے کہ جب ریاست نے ان کی امداد منظور کی تو مرحوم نے مجھے دوستانہ خط لکھا کہ اہل علم کی طرف سے
ریاست کی اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل معارف کے شذرات میں کی، افسوس
ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی،

مرحوم سے میری آخری ملاقات اس سال ہوئی جب جمعیۃ علمائے اسلام کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا،
اور اس میں ان کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا، جس کی اس زمانہ میں بڑی دھوم تھی، اور جس کے بعد مرحوم
مسلم لیگ کی دعوت کی صف میں اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔ اور روز بروز ان کا تعلق لیگ سے بڑھتا
ہی چلا گیا، مرحوم اس زمانہ میں بیمار تھے، نشست و برخاست سے معذور سے رہتے تھے، گٹھیے کا گمان تھا،
اور میرٹھ کے کسی ہومیوپیتھ کے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں میرا دیوبند جانا ہوا تو ملاقات
کو حاضر ہوا، بشاشت سے ملے، اور مجھ سے اپنے پیغام کے متعلق رائے پوچھی، تو میں نے اس کے نرم و ملائم
لہجہ اور مصالحانہ انداز کی تعریف کی، اسی زمانہ میں ان کو حیدرآباد دکن کی ریاست اپنی عربی درسگاہ مدرسہ
نظامیہ کی صدر مدرسی کے لئے پانچ سو ماہوار پر بلا رہی تھی، مرحوم اس کے قبول و عدم قبول میں متردد تھے،
مجھ سے بھی اس میں مشورہ پوچھا، مجھے اس مدرسہ کا اندرونی حال جو معلوم تھا وہ بیان کیا،
اور عدم قبول کا مشورہ دیا، بہرحال مرحوم نے بھی وہاں جانا قبول نہیں کیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لیگ کی
خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے، کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہیں ملا، اور آخر ۱۹۴۷ء
میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے، اور وہیں کے ہوگئے،

مرحوم نے کراچی پہنچ کر گو کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہین کیا، مگر مذہبی معاملات مین ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی، اس لئے زبانِ خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہکر پکارا، جو اسلامی سلطنتون مین عموماً قاضی القضاۃ کا لقب رہا ہے، اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ مین رہی، اسی حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے، اور اس جماعت کے روح رُوان تھے، جو اس آئین کو اسلامی قالب مین ڈھالنا چاہتی ہے، اور اس راہ مین مرحوم ہی کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا نتیجہ تھا، جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح مین "قرارداد مقاصد" کہتے ہین،

مرحوم گو مستقل طور سے پاکستان چلے گئے تھے، مگر تعجب ہوگا کہ انھون نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ بعض عقیدتمند اہل ثروت کے مکان مین رہے، اور اسی مسافرت مین اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کردی،

مرحوم مروّت کے آدمی تھے اور اہل حاجت کی سعی و سفارش بدل وجان کرتے تھے، چنانچہ پاکستان کے اہلِ حاجت اور اہلِ غرض دونون ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اور وہ اپنی جاہ و منزلت کا ذرا خیال کئے بغیر ہر ایک کے کام آتے رہے، اور حکام کے پاس جا جا کر بے تکلف ان کی سفارشین کرتے رہے،

مرحوم کا آخری کام ایک عظیم الشان عربی درس گاہ کے قیام کا خیال تھا، چنانچہ اس کے لئے انھون نے مخلصین کی ایک جماعت بنائی تھی، میرے قیام حجاز کے آخری زمانہ مین مرحوم کی طرف سے اس جماعت کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا، اور انھون نے مجھے بھی اس مجلس کا ایک رکن بنایا تھا،

مرحوم کی صحت اخیر دنون مین اچھی نہ تھی، امسال پاکستان سے خیرسگالی کا ایک وفد حجاز جا رہا تھا، اس کے ممبرون مین خواجہ شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ مرحوم کا نام بھی تھا، مگر وہ اسی علالت کے سبب سے نہ جا سکے اور ان کی جگہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی گئے، مرحوم پر فالج کا اثر تھا، جس سے ان کے دل و دماغ اور جسمانی قویٰ پر بڑا اثر تھا، اتفاق وقت یا تقدیر کا تماشہ دیکھئے کہ دسمبر مین جب سردی انتہائی نقطہ پر تھی وہ

عباسیہ کی تعلیمی ضرورت سے بہاولپور گئے، جہاں سنا ہے کہ اس وقت بڑی سردی تھی، اس کے بعد کا حال کراچی کے ایک رسالہ ندائے حرم مورخہ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء سے نقل کرتا ہوں:

"۲۰ صفر سنہ ۶۹ مطابق ۱۰ دسمبر سنہ ۴۹ء کو حضرت علامہ مرحوم و مغفور جامعہ عباسیہ کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے کراچی سے بہاولپور تشریف لے گئے، ۲۲ صفر سنہ ۶۹ مطابق ۱۳ دسمبر کی صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی، خلاف معمول اس روز ایک پیالی کے بجائے دو پیالیاں چائے پی، اور فرمایا رات کو کچھ حرارت رہی، چنانچہ اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرکے طلب کیا گیا، ڈاکٹر نے بہت خفیف حرارت بتائی، اور دوا دیدی، دس بجے کے قریب سینہ میں غیر معمولی گھبراہٹ محسوس ہوئی، دوبارہ ڈاکٹر کو بلایا گیا، نبض کی رفتار اس وقت اپنی طبعی رفتار سے کچھ کم تھی، ایک طبیب اور دوسرے ڈاکٹر کو بھی طلب کر لیا گیا، بہاولپور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعظم اور وزیر مال بھی پہنچ گئے، چار پانچ انجکشن دیئے گئے، مگر نبض کی رفتار کم ہوتی گئی، آخر گیارہ بجکر ۵ منٹ پر یہ آفتاب علم غروب ہو گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میت اسی روز شام کو بذریعہ پاکستان میل ۸ بجے کے قریب بہاولپور سے کراچی روانہ کی گئی، اسی روز شام کو پاکستان کے اس مایہ ناز عالم باعمل کو لاکھوں اشکبار آنکھوں اور سوگواروں نے سپرد خاک کیا، ڈیرہ نواب کے اسٹیشن پر نواب صاحب بہاولپور نے میت کی زیارت کی، اور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا"

کراچی کے اسٹیشن پر مسلمانوں کے بہت بڑے مجمع نے میت کو اتارا، اور پہلے مرحوم کے قیامگاہ پر لائے، اور پھر وہاں سے ان کے قیامگاہ کے سامنے ایک زمین میں جس کو عامل کالونی کہتے ہیں دفن کیا گیا، سندھ کے اقطاع میں سے بہاولپور ہی وہ مقام ہے، جس سے دیوبند کے اکابر اور امداد اللّٰہی

سلسلہ کے مشائخ کو تعلق خاطر رہا ہے، اس لئے اگر مرحوم کی موت اسی سرزمین پر واقع ہوئی، تو عالم مثال کے حوادث مین کوئی عجیب چیز نہین ہوئی،

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی لیکن بحمد اللہ کہ انھون نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے، یہ تلامذہ ہین، جو زیادہ تر دیوبند اور بعض ڈابھیل مین اُن کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہین، ان مین بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہین وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہون، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو الماٰثر محمد حبیب الرحمان صاحب اعظمی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مولانا سعید احمد اکبرآبادی کہ ان مین سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے،

مرحوم کی پیدایش ۱۳۰۵ھ معلوم ہوئی ہے، اس لحاظ سے اُن کی عمر قمری صاحب سے چونسٹھ سال کی ہوئی، اس وقت جب مرحوم کے نصف صدی کے واقعات کو سپرد قلم کر رہا ہون، میرا دل کانپ رہا ہے اور لب معاصر مسافر عدم کے لئے مغفرت کی دعا مین مصروف ہین، ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیون مین پیدا ہوتے ہین، اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو پر نور فرمائے، اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے، وہ اب اس دنیا مین نہین، مگر ان کے کارنامے دنیا مین انشاء اللہ تعالیٰ حیاتِ جاوید پائین گے،

سالہا زمزمہ پرداز جہان خواہد بود
زین نواہا کہ درین گنبد گردان زدہ است (س)

تاریخ سندھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ، ان تمام دورون کے علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہی، مرتبہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین، اعظم گڈھ،

قیمت :- ۳ر "منیجر"

ادبیات

نغمۂ حیات

از سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی

شاعرِ آتشیں نوا دیدے پیامِ زندگی
بیٹھے ہیں لوگ بزم میں تشنۂ جامِ زندگی

ہاتفِ خوش کلام نے آکے کہا یہ سامنے
شاعرِ حق پرست ہے سُن لو پیامِ زندگی

اس کو سکون حرام ہے گرمِ سفر مدام ہے
صرصرِ تیز گام ہے موجِ خرامِ زندگی

منظرِ صبح و شام میں محفلِ دورِ جام میں
کوششِ ناتمام میں جلوۂ عامِ زندگی

گلشنِ لاجواب ہے کانِ دُرِ خوش آب ہے
معدنِ لعلِ ناب ہے سنگِ رخامِ زندگی

فتح و شکستِ رزم میں لالہ و گل کی بزم میں
ذوقِ سفر کے عزم میں مستیٔ جامِ زندگی

لب پہ صدائے ہاؤ ہو دل میں ہجومِ آرزو
سر میں ہوائے جستجو حاصلِ کامِ زندگی

طلعتِ مہرِ نیم روز جلوۂ ماہِ شب فروز
صاعقۂ نگاہ سوز حسنِ نظامِ زندگی

جلوہ گہِ حیات میں کارگہِ ممات میں
عرصۂ کائنات میں رقصِ دوامِ زندگی

جذبۂ خودسری میں ہے حملۂ قیصری میں ہے
غمزۂ دلبری میں ہے حسنِ خرامِ زندگی

معرکۂ ستیز میں عرصۂ رستخیز میں
سایۂ تیغِ تیز میں فیضِ حسامِ زندگی

حسن کی شرمِ ناز میں عشق کے سوز و ساز میں
سجدۂ پاکباز میں شورشِ عامِ زندگی

سوزِ دلِ پیمبری حملۂ تیغِ حیدری
روحِ نیاز بوذری نقشِ دوامِ زندگی

جوشِ غبارِ کاروان جنبشِ موجِ روان ہمتِ مورِ ناتوان کوششِ گامِ زندگی

مجلسِ وجد و حال مین محفلِ قیل و قال مین شوکت و جاہ و مال مین نشۂ جامِ زندگی

سبزۂ نو دمیدہ مین لالۂ نو رسیدہ مین غنچۂ چیدہ چیدہ مین شرحِ پیامِ زندگی

نغمۂ عیشِ کامران نالۂ دردِ بیکسان زمزمہ ہائے طائران حسنِ کلامِ زندگی

طینتِ خود پسند مین طالعِ ارجمند مین ہمتِ سربلند مین رفعتِ بامِ زندگی

توُنے لکھی غزل ولیؔ خوب ہی وجد آفرین

اس کا ہر ایک شعر ہے شرحِ پیامِ زندگی

غزل

از جناب شفیقؔ صدیقی جونپوری

ہے کیا ذو ہوش دیوانہ تری جلوون کا گردیدہ قدم دیکھو تو شوریدہ نظر دیکھو تو سنجیدہ

چمن مین تازگی پاتے ہین گلہائے خزان دیدہ خوشا تیری ہوائے نازِ دامانِ جنبیدہ

نسیمِ جامۂ یوسف ترے دامن مین رقصیدہ شمیمِ چادرِ مریم تری زلفون مین خوابیدہ

زبان پران کا نام آیا کہ آہین بند خشک آنسو تمنا اتنی شایستہ جنون اور اتنا سنجیدہ

تمھاری خوش کلامی سے معطر ہے مسیحائی تمھارا ہر نفس جیسے کہ بوئے گل خرامیدہ

سنایا وصل مین فرقت کا افسانہ تو کہہ اٹھے بھلا دو اس کہانی کو کہ دل ہوتا ہے رنجیدہ

وہ محوِ خواب، گیسو کا بکھرنا روئے تابان پر کہ جیسے چاندنی ہو رات کے دامن مین خوابیدہ

چمن مین باغبان اتنا مخالف ہے نشیمن کا نظر آتی نہین اب کوئی شاخِ ناتراشیدہ

شکایت آسمان سے کیجئے کیا برق باران کی ہزارون بجلیان جب آشیانون مین ہون خوابیدہ

ارے او موت کی دشواریون کو سوچنے والے خبر بھی ہے تجھے خود زندگی ہے کتنی پیچیدہ

در عالی پہ پردہ ہے نگہبان آستانے پر نگاہِ شوق شرمیلی، جمالِ یار پوشیدہ

کسی نے کہدیا تھا مسکرا کر اپنا دیوانہ اسی دن سے مری شوریدگی ہے اور بالیدہ

شفیق اللہ رے کیفِ شوق نزدیکِ جانان

کہ جیسے قافلے کا قافلہ لغزیدہ لغزیدہ

نیرنگِ حقیقت

از

جناب عتیق انجمی مالیگانوی

مجھے سلام کرا سے میری منزلِ مقصود بغیر اٹھائے ہوئے اٹھ گئے حجابِ قیود

نہ دے فریب مجھے اے مقامِ غیب و شہود کہیں نہیں ہے مگر ہر جگہ ہے وہ موجود

عطا کیا ہے مجھے جس نے دردِ لامحدود وہی ہے میری تمنا، وہی مرا مقصود

حضورِ غم کے تھپیڑے سے نہیں جاتے یہ جانتا ہوں کہ ان میں ہے زندگی کی نمود

گذر کے دیکھ تو ذوقِ طلب سے اک ہر شے تجھے پکارنے آئے گی منزلِ مقصود

حضورِ دوست بہت سعی ضبط کی میں نے ٹپک پڑے مگر آنکھوں سے اشکِ خون آلود

خطا معاف کہ اندازِ بندگی میں نے بدل دئے ہیں کچھ از راہِ احتیاطِ سجود

یہ فیصلہ تری محفل سے ہو تو اچھا ہے مجھے خبر نہیں موجود ہوں کہ لاموجود

بدل چکی ہے محبت ہزار رنگ مگر

عتیق! ہیں مری آنکھیں ہنوز اشک آلود

مطبوعات جدیدہ

تجدید تصوف و سلوک از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۹۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت صہ ملنے کے پتے (۱) مولوی سعید الباری صاحب شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ (۲) مکتبہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ، (۳) مکتبہ اشرفیہ اشرف المدارس، ہردوئی،

تصوف نام ہے ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے تحسین اعمال و کمال دین کا لیکن مروجہ خانقاہی تصوف مین اس کی حقیقت بالکل چھپ گئی ہے، اور وہ محض چند غیر اسلامی رسوم و بدعات کا مجموعہ بن گیا ہے، اس سے تصوف کے متعلق بڑی غلط فہمی اور شکوک و شبہات پیدا ہوگئے ہین، اور کچھ لوگ سرے سے تصوف ہی کے منکر ہو گئے، ہندوستان مین سب سے اوّل حضرت مجدد سرہندیؒ نے تصوف کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کیا، اور اس دور مین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اسکی تجدید و اصلاح فرمائی، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی مین تصوف کے مسائل کی تدوین، اس کی پرانی غلطیون کی اصلاح اور اس کے متعلق غلط فہمیون کے ازالہ کا عظیم الشان کام انجام دیا، اور بقول فاضل مرتب تصوف کو تمام نئی پرانی علمی و عملی غلطیون سے پاک و صاف کرکے اس حقیقت کو آئینہ کر دیا کہ تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا، حضرت مولاناؒ کی یہ تجدیدات و اصلاحات اور تصوف و سلوک کے مسائل ان کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات کے ہزارون صفحات مین بکھرے ہوئے ہین جن سے ہر شخص

آسانی کے ساتھ استفادہ نہین کرسکتا، اس لئے ضرورت تھی کہ اُن کو چن کر ترتیب کے ساتھ کتابی شکل مین مرتب کر دیا جاتا، تاکہ اردو مین تصوف پر ایک جامع کتاب ہو جاتی اور لوگون کو اس سے استفادہ آسان ہو جاتا، اس فرض کفایہ کو حضرت مولانا کے خلیفہ راشد جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی نے، جو ہر حیثیت سے اس کام کے اہل ہین، انجام دیا، وہ حضرت مولانا کے فیض صحبت کا عملی نمونہ، اُن کی تعلیمات اور ارشادات و ہدایت کے عالم و عارف بھی ہین، اور ایک کہنہ مشق ادیب و صاحب قلم بھی، انھون نے مولانا کی تصانیف اور تحریرون سے تصوف و سلوک کی روح اس کتاب مین کھینچ دی ہے، اور اپنی تشریحات سے ان کو نہایت واضح، روشن، مدلل اور دلنشین بنا دیا ہے، اس طرح یہ کتاب صحیح معنون مین تحقیقی تصوف کا آئینہ ہو گئی ہے، جس مین اس کی تمام غلطیون کی اصلاح، غلط فہمیون کا ازالہ، اور سلوک و تصوف کی اصلی صورت نظر آتی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کے دل مین تصوف کے متعلق کوئی شک و شبہہ باقی نہین رہ سکتا، اور وہ اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہو گا کہ "تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا" کتاب کے شروع مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے حضرت مولانا کی تجدیدات و اصلاحات پر جامع تبصرہ ہے، مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑا مذہبی و علمی فرض انجام دیا جس کے لئے وہ مسلمانون کے شکریہ کے مستحق ہین، یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

کلمۂ طیبہ از مولانا غوث علی شاہ المعروف بہ غوثی شاہ صاحب قادری چشتی حیدرآبادی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۳۲ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درجہ اول عمر درجہ دوم مہ مجلد کی قیمت ایک روپیہ زیادہ ہوگی، پتے:۔ (۱) بیت النور خلی گوڑہ حیدرآباد (۲) عبد القادر صاحب تاجر کتب، چار کمان حیدرآباد، (۳) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اسلام کا کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک تخم ہے، جس مین شجر اسلام

کے سارے برگ و بار پنہان ہین، اور اس مختصر کلمہ مین اسلام کے تمام بنیادی ارکان اور اسلامی تعلیم کا خلاصہ آگیا ہے، اور شرک یا غیر اللہ کی نفی، توحید کے اقرار اور رسالتِ محمدیؐ کی تصدیق سے ان تینون ارکان کی جامع و مانع اور کمالی تشکیلین مراد ہین یعنی لا الہ کے معنی شرک کی ان تمام علمی و عملی اور خفی و جلی شکلون کی نفی ہے جن مین اس کا خفیف شائبہ بھی نکلتا ہو، اور الا اللہ سے مراد صرف ایک ذات کی الوہیت پر ایمان کے تمام الوہیت و معبودیت کے سارے اوصاف و خصائص کا عملی اقرار ہے، اور رسالتِ محمدی کی تصدیق کا مقصد صرف دین اسلام کی صداقت پر ایمان اور دوسرے بگڑے ہوئے دینون سے برأت ہے، اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح اور اس کے مضمرات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ تشریحات نہایت جامع ہین، اور ان مین اسلام کے تمام بنیادی عقائد و اعمال کا خلاصہ آگیا ہے، البتہ کتاب کے بعض مباحث دقیق اور ان کا طریقۂ تعبیر صوفیانہ اور کہین کہین پرانے طرز کا فلسفیانہ ہے جس سے عبارت مین پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، لیکن مصنف کے صوفیانہ ذوق و شوق کے باوجود ان کا قلم توحید کے جادۂ مستقیم اور شریعت کے دائرہ سے باہر نہین نکلا ہے، اور جابجا غلط متصوفانہ عقائد و اعمال کی تردید کی گئی ہے، مگر یہ کتاب خواص کے مطالعہ کے لائق ہے، عوام اس سے فائدہ نہین اٹھا سکتے،

مشاہیر مہدویہ (جلد اول) مؤلفہ جناب سید عزیز مہدی صاحب بخاری، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتے:- دارالاشاعت مہدویہ چن پٹن (۲) سید اسد اللہ خوندمیری کتب فروش چن پٹن،

فرقہ مہدویہ سید محمد جونپوری المتوفی سنہ ۹۱۰ھ کی جانب منسوب ہے، وہ اپنے زمانہ کے ممتاز عالم زاہد تھے، نوین صدی ہجری مین انھون نے مہدویت کا دعویٰ کیا، اس زمانہ کے علمانے اس کی بڑی مخالفت کی، لیکن دکن اور گجرات مین اُن کی دعوت مقبول ہوئی، احمد نگر کے بعض نظام شاہی سلاطین اُن کے عقیدت مند ہوگئے، اس سے دکن مین اُن کی دعوت کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اور وہاں ان کے

ماننے والوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، اور مہدیوں کو دکن میں بڑا عروج حاصل ہوا، اور وہ دکنی حکومتوں میں بڑے بڑے مناصب پر ممتاز ہوئے، حیدرآباد اور مدراس وغیرہ میں آج بھی مہدوی موجود ہیں، لائق مصنف نے جو خود مہدوی ہیں، اس کتاب میں ان ممتاز مہدویوں کے حالات لکھے ہیں جن کا تعلق دکن کی حکومتوں سے رہا ہے، کتاب کے شروع میں دیباچہ نگار اور بہمنی حکومتوں کے زمانہ میں سے لے کر ارکاٹ اور میسور کی نوابی کے عہد تک دکن کی ہندو مسلمان حکومتوں کا مختصر ذکر ہے، اس کے بعد ان حکومتوں سے متوسل مہدوی عہدہ داروں کے حالات ہیں، شمالی ہند میں مہدویوں کا وجود نہیں ہے، اور یہاں ان لوگوں کے علاوہ جن کی نظر تاریخ پر ہے، عام طور سے مہدوی فرقہ کے نام تک سے لوگ ناواقف ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ کتاب کے شروع میں فرقہ مہدویہ کی مختصر تاریخ لکھ دی جاتی، تاکہ اس کے پڑھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو جاتا، کہ فرقہ مہدویہ سے مراد کون لوگ ہیں، کتاب مہدویوں اور دکن کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

تحقیقی نوادر، از محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج میسور تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد، قیمت مرقوم نہیں، مصنفہ سے ملے گی،

یہ کتاب لائق مصنفہ کے دس علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، انشاء کے شورش پسند حریف، انشاء کے مربی الماس علی خاں اور نواب سعادت علی خاں، قواعد اردو و رسم الخط، خلاصہ تعدیہ فعل از دریائے لطافت، املائے نون، تنقید دستور الفصاحت، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، حضرت کیفی اور دریائے لطافت کا اردو ترجمہ، ہندوستان میں فارسی کا نشو و نما، اکبر الہ آبادی اور پردہ، اصلاح زبان اور خواتین، ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کا علمی و ادبی ذوق سنجیدہ اور اردو زبان و ادب پر ان کی نگاہ گہری، اور وسیع ہے، تنقیدی مضامین خصوصیت کیساتھ مصنفہ کی وسعت و دقت نظر اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہیں، نئی پود میں عورتوں کا کیا ذکر، مردوں میں بھی صحیح علمی مذاق کا فقدان ہے، ایسی حالت

مین ایک خاتون کے قلم سے ایسے مفید علمی مضامین اور بھی زیادہ لائق تحسین و آفرین ہین، مضامین سے اندازہ ہوتا ہی کہ آیندہ اردو زبان کے ادیبون کی صف مین مصنفہ کی ممتاز جگہ ہوگی،

نماز اور ترقی کی تین راہین از جناب مولانا محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت تحریر نہین، پتہ :- منیجر دارالکتب اسلامیہ نمبر ۱۰۰ اعظم پورہ ملک پیٹھ حیدرآباد دکن،

اسلام مین نماز راس العبادات ہی، اور قرآن مجید و احادیث نبوی مین اس کے بڑے فضائل اور دینی و دنیوی برکات بیان کئے گئے ہین، بہت سے علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تشریح و تفصیل بیان کی ہے، مولانا محمد علی لاہوری نے بھی نماز کی حقیقت اور اس کے فوائد و ثمرات پر ایک تقریر کی تھی، اس کو کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین مقرر نے نماز کے ارکان اور اس کی دعاؤن کے اسرار و حکم یا موجودہ اصطلاح مین اس کے فلسفہ کی روشنی مین دکھایا ہے کہ نماز ہی مسلمانون کی ہر قسم کی روحانی اور مادی فلاح کا ذریعہ ہے، اس سے انفرادی تطہیر و تزکیہ بھی حاصل ہوتا ہے، اجتماعی و قومی فلاح و سعادت بھی اور حق و صداقت کا اعلاء بھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے، مصنف کا نقطۂ نظر اور تشریحات خالص دینی ہین لیکن اتنی نفسیاتی اور دلنشین ہین کہ اس سے عقل پرست بھی انکار نہین کر سکتے، اس حیثیت سے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، البتہ ایک دو مقامون پر کھٹک پیدا ہوئی، مثلاً فصل لربک وانحر مین "نحر" یعنی جانورون کی قربانی کے معنی ایثار و قربانی یعنی Sacrifice کے لئے گئے ہین، جو محل نظر ہے، دوسرے "رفع" کی تشریح مین مصنف نے حضرت عیسیٰؑ کے رفع کے متعلق اپنے عقیدہ کی تبلیغ کر دی ہے، جس کا یہ محل نہین تھا، اس لئے کہ یہ رسالہ عام مسلمانون کے فائدہ کا ہے، لیکن اس سے اس رسالہ کی خوبی مین کوئی فرق نہین آتا،

"م"

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت
مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے
ن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ
و سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس
ین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ
ر شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی
اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر
ارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ
فصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی
بیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم
ضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم
علم سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ
ر نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

ضخامت:- [illegible] صفحے

قیمت:- [illegible]

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و
شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی
کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی سرپرستی سے جگمگا اٹھا،
جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء
اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے مذہبی معارف
اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموریوں
کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی
روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر
نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں
اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں،
دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں
گرانقدر کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس
کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔

ضخامت:- [illegible] صفحے

قیمت:- [illegible]

سنہ ۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے۔

(طابع و ناشر صدیق احمد) **منیجر**

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ مئی سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت ۔ چھ روپے سالانہ

[illegible]

جلد ۶۵ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب المراسلة والمکاتبة

وفیات

ساڑھے تین برس کے بعد مین بھوپال سے رخصت ہوکر واپس آیا، ابھی تو تین ماہ کی رخصت مین نے لی ہو، مگر امید یہی ہو کہ اب پھر واپسی نہ ہوگی، لیکن ابھی یہ طے نہین کیا ہے کہ زندگی کے باقی دن کہان اور کس طرح گذارے جائین، احباب مجھے بھوپال کے پتہ سے خط نہ لکھین،

ان ساڑھے تین برسون مین دنیا بدل گئی، بیسیون خیالات بدل گئے، بہت سے نظریون مین انقلاب ہوگیا، بعض ممکن اب ناممکن، اور ناممکن اب ممکن ہوگئے، ایک ملک دو ملک ہوگئے، ایک ملک کے رہنے والے خود اپنے ملک مین بیگانہ ہوگئے، غالباً تاریخ مین اس واقعہ کی مثال نہ ملے گی،

ان دونون ملکون کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کا طوفان امنڈا آرہا تھا، اور ڈر تھا کہ اس سیلاب کی زد مین خدا جانے کیا کیا آئے کہ خلیج بنگال کے دہانہ پر آکر وہ تھم گیا، یعنی بنگال کے پچھلے واقعات نے دونون ملکون کے وزراے اعظم کو پچھلے دورِ زندگی پر غور کرنے اور ایک مصالحتی معاہدہ پر متفق کردیا، بنگال ہی سے (کلکتہ اور نواکھالی) یہ سیلاب اٹھا تھا، اور شاید بنگال (مشرقی و مغربی بنگال) ہی پر آکر وہ ختم ہوگیا، خدا کرے کہ انسان کے حیوان بننے کا سلسلہ اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے،

ہندوستان اور پاکستان کا یہ معاہدہ دونون ملکون کی اقلیتون کے لئے پناہ کا سایہ ہو اور جیسا کہ لیاقت علی خان نے اپنے امریکہ کے ایک بیان مین کہا ہو کہ یہ قدم تقسیم کے بعد سب سے پہلے اٹھنا چاہئے تھا، مگر سوء اتفاق نے ایسا نہ

ہونے دیا، بہرحال اب جو قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ چکا ہے اب اس سے ہٹنا نہ چاہئے کہ اس ہٹنے میں دونوں کی تباہی ہے،

اس معاہدہ نے دونوں ملکوں کی قدر دنیا کی نظروں میں بڑھادی، اور دونوں ملکوں کے وزیر اعظموں کے اخلاص، تدبر اور دانشمندی کی تحسین دنیا بھر کے اخباروں نے کی خصوصیت کیساتھ پاکستان اور ہندوستان کے لیڈروں کی باہمی ملاقات اور مبادلۂ خیال، اور میل جول کے تعلقات نے ملک میں جو خوشگوار فضا پیدا کی ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہماری مصیبتوں کے بادل ان دونوں ملکوں کے افق سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئے،

ہندوستان کے باشندوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ساری دنیا سمٹ کر ایک گھر میں جمع ہوگئی ہے اور ساری قومیں مل جل کر آیندہ دنیا کا نقشہ بنارہی ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں اور ہزار ہا سال پیچھے ہٹ کر پھر ملک کو ویسا ہی بنادیں، جیسا پہلے تھا، اس کے معنی یہیں کہ ہم ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں پھر سے بہلی اور رتھ پر سوار ہوکر اپنا سفر شروع کریں اور آپ دیکھیں گے کہ یہ تخیل ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کردیگا اور اس باقی ملک کو بھی بیسیوں ملکوں میں تقسیم کردیگا،

اپنے صوبہ کے ٹنڈن جی کی آواز تھم تھم کر پھر سنائی دیتی ہے اخباروں میں آیا ہے کہ راج رشی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ہندو کلچر کو اختیار کریں ورنہ پاکستان کی راہ لیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ٹنڈن جی سے اول تو میرا یہ کہنا ہے کہ کیا وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہیں یا بادشاہ، جو پوری قوم کی طرف سے اپنے خیال کا اظہار حکم کے لہجہ میں کرتے ہیں، وہ اس صوبہ کی اسمبلی کے ایک اسپیکر اور اس صوبہ کی کانگریس کے صدر ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں، اور اس لئے وہ اس تحکمانہ لہجہ میں باتیں کرکے اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں،

وہ ہندو کلچر جس کے وہ منادی ہیں، کہاں پایا جاتا ہے، کیا ان کی داڑھی ہندو کلچر ہے کیا ان کا ننگا سر ہندو کلچر ہے، کیا بھارت کی یونیورسٹیوں میں ہندو کلچر ہے، کیا ہمارے بڑے بڑے عہدہ داروں، نئی تعلیم یافتوں اور طالب علموں کی طرز و طریق اور لباس و صورت اور زبان و بیان اور طریق زندگی میں ہندو کلچر ہی آج ہر جگہ پورپ

کا تمدن پھیل رہا ہے، اُسی کی پیروی ترقی کا نام پا رہی ہے، ہمارے نوجوان برملا کہتے ہین کہ یورپ کے اس غلبہ
اور استیلاء کو جو ہر میدان مین نظر آرہا ہے، آج ہندو کلچر سے نہین بلکہ اُسی کے طور و طریق سے روک سکتے ہین
اور اب یہ پرانی باتین کسی پرانے ڈھنگ کے ملک مین بھی نہین چل سکتی ہین، اس لئے اگر کوئی نئے زمانہ کا دل چلا
نوجوان کسی دن خود راج رشی سے یہ کہدے کہ رشی جی آپ یوروپین کلچر اختیار کیجئے، ورنہ ہندوستان چھوڑ کر
نیپال کی ترائی مین چلے جائیے، اور وہان تپسیا کیجئے، تو کیا ہوگا،

ہندوستان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ملک آنکھین بند کرکے جواہر لال
جی کے پیچھے چلے، ان کے خیالات کو دل مین جگہ دے، اور اُن کے احکام کی تعمیل اور اُن کی نصیحتون پر عمل کرے، ورنہ
تنگ خیال تحریکین ملک کو دیوانہ کر دین گی، صدیون کی زبان اردو کی تقسیم، ہزار سال کی مردہ ریاستون کو دوبارہ
زندہ کرنے کا خیال، سنسکرت کو ملک کی زبان بنانے کی تحریک، یہ سب اسی تنگ خیالی کی پیداوار ہین،

بھارت نے جو اپنا آئین تیار کیا ہے، اس مین اقلیتون کے جان و مال، عزت و آبرو، اور مذ
ہب و تمدن کی حفاظت اور حقوق کی مساوات کی جو دفعہ رکھی ہے، اس کا بار بار ذکر آتا ہے، اور اس
اقلیتون کی حفاظت کا شگی دفعہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، مگر یہ نکتہ ذہن سے نکل جاتا ہے کہ کاغذ پر لکھی
ہوئی آئین کسی اقلیت کی حفاظت کا سامان نہین بلکہ اس پر عمل حفاظت کا سامان ہے، اگر اکثریت کا
طرز عمل اس آئین کے مطابق نہ ہو تو آئین بھی ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہین، ضرورت ہے کہ
بھارت کے باشندے اس آئین کی قدر کرنا سیکھین، اور اپنی غلط کاری سے انصاف اور برابری کی
ان سطرون کو نہ کاٹ دین، جو اُن کے نمایندون نے ان کی رہنمائی کے لئے اس آئین نامہ مین
لکھی ہین،

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے زمانہ مین

فنون جنگ

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم، اے

(۳)

آغاز جنگ جنگ عموماً صبح کو شروع ہوتی، اور شام تک ختم کر دی جاتی، مگر فریقین دن کا کچھ حصہ گذار کر لڑائی شروع کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ ہزیمت اور شکست کی حالت مین رات کی تاریکی فرار ہونے مین معاون ہو،

لڑائی شروع ہونے سے پہلے سر لشکر کے حکم سے نقارہ بجتا، کرنا پھونکا جاتا اور تکبیر کہی جاتی، تو سارے لشکری تیاری مین مشغول ہو جاتے، نقارہ کی دوسری آواز مین وہ اپنے گھوڑون کے ساتھ مسلح ہو کر اپنی اپنی صفون مین کھڑے ہو جاتے، تیسری آواز مین وہ گھوڑون پر سوار ہو کر مزید حکم کے منتظر رہتے،[1] چاوش نفیری بجاتے تو لڑائی شروع ہو جاتی،[2] مسلمان سپاہی اللہ اکبر اور ہندو نارائین یا مہادیو کے نعرون کے ساتھ آگے بڑھتے

تیموریون کے دور مین بھی کم و بیش یہی طریقہ مروج تھا، نقارہ اور کرنا ہی سے جنگ کا آغاز کیا جاتا

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۳۷ء ص ۵۲۲ تغلق نامہ ص ۲۰،

[2] ایضاً ص ۲۳، ۱۳۹،

تھا،[51] جنگی نعرے کے لئے اس دور میں جا بجا سورن کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے مسلمان سپاہیوں کے نعرۂ اللہ اکبر کے علاوہ مختلف قسم کے سورن تھے، کبھی وہ "بستان" اور کبھی "دو" کے غلغلے بلند کرتے،

اکبری عہد میں تیموریوں کی فوج احمد آباد میں محمد حسین مرزا کے خلاف جنگ کر رہی تھی، تو اس موقع پر ملا بدایونی رقمطراز ہیں،

ز دوش سپاہی و پشت سپاہ	بن نیزہ و قبضۂ بارگاہ
ہوا نیلگون شد زمین آبنوس	بجوشید دریا ز آوازِ کوس
بانگشتِ لشکر بہامون نمود	سپاہی کہ آن زاکرانہ نبود
کمال کیانی در آمد بہ زہ	یکے گفت بستان یکے گفت دہ[52]

کبھی "بزن بزن" اور "بکش بکش" کی بھی صدائیں بلند ہوتیں،[53] اکبر کا سورن "یا معین" تھا،[54] احمد آباد کی ایک جنگ میں سیف خان کوکلتاش "یا اجمیری یا اجمیری" کہتا ہوا جان بحق ہوا،[55] کبھی لشکری بادشاہ کے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے یورش کرتے،[56] کبھی منادی "الجرأة خیر من الجبن" (جرأت بزدلی سے بہتر ہے) کر کے دیگر لشکریوں کی ہمت بڑھاتے، (سیر المتاخرین جلد دوم ص ۲۲۰)

ہندو نارائن کے علاوہ "رام رام" کہتے ہوئے آگے بڑھتے،[57] مرہٹے "گوپال گوپال" اور "ہر ہر مہا دیو" بلند کیا کرتے تھے،

جنگ کی شدت میں تیغ اور نیزہ سے لڑنے والے سوار مخالف فوجوں کے ساتھ گڈ مڈ ہو جاتے

---

[51] مثال کے لئے دیکھو ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۰۸، اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۰۶، ۵۱، تزک جہانگیری ص ۱۹، عالمگیر نامہ جلد اول ص ۱۰۰ وغیرہ۔ [52] بدایونی جلد دوم ص ۱۶۷ [53] ایضاً جلد اول ص ۳۴۵، خافی خان جلد دوم ص ۸۵ [54] اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۵، تزک جہانگیری ص ۲ [55] اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۸، بدایونی جلد دوم ص ۱۶۰ [56] تزک جہانگیری ص ۱۰۳ [57] واقعات عالمگیری ص ۲۹،

ایسی حالت مین دوست اور دشمن کا امتیاز یا تو خاص خاص لباس سے کیا جاتا، یا نہین، تو مقررہ الفاظ ہوتے، محمد تغلق جب عین الملک کے خلاف جنگ کر رہا تھا، تو اس سلسلہ مین ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"بادشاہ نے اس رات اپنی علامت "دہلی" اور غزنی مقرر کی تھی، جب ہمارے لشکر کا کوئی سوار دوسرے کو ملتا تھا، تو دہلی کا لفظ کہتا تھا، اگر دوسرے نے غزنی کا جواب دیا، تو معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ہمارے لشکر کا ہے، ورنہ حکم تھا، کہ اس کو قتل کر دو"[51]

غیاث الدین تغلق خسرو خان سے معرکہ آرا تھا، تو اس کی فوج کی علامت کا لفظ "قلا" تھا[52] تیموری دور کی کسی فوج کا امتیازی لفظ معلوم نہین ہو سکا،

یورش | یورش مین عموماً پہلے مقدمہ کی فوج آگے بڑھتی، پھر میمنہ کی فوج پیش قدمی کرتی[53] پھر قلب معرکہ آرا ہوتا، میسرہ آخر مین بڑھتا[54] مسلمان حکمرانون کے ابتدائی دور مین جب آتشین اسلحہ کی فراوانی نہ تھی، تو غنیم کی فوجون مین پہلے تیرون کی بارش سے انتشار پھیلانے کی کوشش کی جاتی، راجہ پتھورا کے خلاف دوسری جنگ کرنے کیلئے شہاب الدین غوری میدان مین اترا تو طبقات ناصری کے مصنف کا بیان ہے،

فرمان داد کہ می باید کہ از چہار طرف میمنہ و میسرہ و خلف و قدام لشکر بہر طرف دہ ہزار سوار تیر انداز دست بر لشکر کفار می دارند[55]

مسلمانون کی حکومت جب ہندوستان مین باضابطہ قائم ہوئی، اور لشکر مین ہاتھیون کی تعداد زیادہ رہنے لگی، تو ہاتھیون پر برجون سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودے مین تیر انداز سوار ہوتے تھے[56] تغلق نامہ مین ہے[57]

صف پیلان چون صف ابر از اد	ہر ابرے ، برق حملہ ، باد رفتار
نہ ہو ذ ہر پیل چون کوہے با شکوہ	بر و بر گستوان چون ابر بر کوہ

---

[51] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۸۱، [52] تغلق نامہ ص ۱۲۲ [53] مثال کے لئے دیکھو کلی مین علاء الدین اور قتلغ خواجہ مغل کی جنگ برنی ص ۲۶۰ [54] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۳۷ [55] طبقات ناصری ص ۱۲۰

[56] صبح الاعشی، بحوالہ معارف جلد ۴۳ نمبر ۲ [57] تغلق نامہ ص ۹۲۔

بہ پشت پیل ترکان تیر درشست   چو کوہے کہ بر پشت کوہ نشست[۱]

ہودج کی برجون کی ہر سمت مین سوراخ بنے ہوتے تھے جن سے تاک تاک کر تیرون کے تنتے لگائے جاتے تھے، یہ تیر کبھی آتشین اور کبھی زہر مین بجھے ہوتے تھے، ہاتھی کی عماریون پر سے شیشہ کی نلیون کے ذریعہ سے روغن نفط بھی دشمنون پر اچھالا جاتا تھا، جس سے شعلے پیدا ہوتے تھے، کبھی منجنیق کے ذریعہ سے پتھر اور آتش گیر مادے پھینکے جاتے تھے، محمود تغلق تیمور کے خلاف جنگ کر رہا تھا، تو اس کے ہاتھیون پر "رعد انداز" "آتش باز" اور تخش انداز تھے[۲]، تیموریون کی آمد سے پہلے دکنی ریاستون مین توپون کا بھی رواج ہو گیا تھا، چنانچہ توپون اور بارود سے بھی دشمن مین اختلال پیدا کیا جاتا، کبھی ان کی صف شکنی ہاتھیون کے یلغار سے بھی کی جاتی،

ان ذرائع سے غنیم کے لشکر مین سراسیمگی پھیل جاتی تو شمشیر تیغ، تیر، اور نیزے سے لڑنے والے سوار اور پیدل سپاہی اپنے افسرون کے حکم اور اشارے پر تیزی سے آگے بڑھتے پھر گھمسان کی لڑائی شروع ہو جاتی لڑائی کا سارا دباؤ غنیم کے قلب یعنی مرکزی صف پر ہوتا، جہان عموماً سر لشکر کی جگہ ہوتی، اس لئے علم انداز یعنی، ہر تیر انداز خاص خاص جگہون پر مامور کئے جاتے کہ وہ سے اپنے تیرون کے نشانہ سے غنیم کے سر لشکر کو ہلاک کر دین، یا اس کے ہاتھی کو مجروح کر دین، پھر فتح و نصرت مین آسانی ہو جاتی،

فوج کا کوئی بازو کمزور ہوتا ہوا نظر آتا، تو فوج محفوظہ یا دوسرا بازو مدد کو پہنچتا، اس قسم کی مدد پہونچانے مین غیر معمولی جنگی احتیاط کی جاتی تھی، ہمایون اور شیر خان کے درمیان قنوج مین جنگ ہوئی تھی، تو عباس خان سروانی کا بیان ہے،

شہنشاہ (یعنی ہمایون) کے مقدمۃ الجیش کو خواص خان کے لشکر نے شکست دی لیکن شیر شاہ کے میمنہ نے جو جلال خان کی نگرانی مین تھا شکست پائی، اس بازو کے چار سردارون جلال خان، میان ایوب سروانی، غازی بگلی محمد گکھکپور نے میدان نہین چھوڑا، جب شیر شاہ

---

[۱] صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف نمبر ۲ جلد ۱۹، [۲] ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم،

نے دیکھا کہ اس کے میمنہ کو شکست ہوگئی ہے، تو خود قلب سے اپنے لشکر کو لے کر مدد کرنے کا
ارادہ کیا، لیکن قطب خان لودی نے عرض کیا کہ حضور اپنی جگہ کو نہ چھوڑیں کہیں لوگوں کا خیال
ایسا نہ ہو کہ قلب سپاہ کو بھی شکست ہوگئی، اس وقت مناسب یہ ہو کہ دشمنوں کے درمیان
گھس جائیں، جب شیر شاہ کی سپاہ سیدھی ہمایوں بادشاہ کے لشکر کی طرف چلی تو اس نے
اس سپاہ کو شکست دی جس نے اس کے میمنہ کو شکست دی تھی اور وہ بھاگ کر ہمایوں کے قلب سپاہ میں چلی گئی، شیر شاہ
میمنہ کے سامنے مغلوں کو پیچھے ڈھکیل چکا تو اس کے میسرہ کی فوج اپنے مدمقابل فوج
کو ہٹا کر ہمایوں بادشاہ کے قلب کی طرف بڑھی، شکست یافتہ میمنہ نے بھی پھر کر ہمایوں
بادشاہ کو گھیر لیا[۱]

امیر تیمور نے غنیم سے لڑنے کے لئے، جو خاص خاص ضوابط و قوانین مرتب کئے تھے، وہ بہت ہی
واضح اور روشن ہیں، وہ خود تزوک تیموری میں لکھتا ہے[۲]

"فوج غنیم سے ایک منزل کی مسافت پر دیکھ کر کھڑی ہو........ اور میں نے حکم دیا کہ
جنگ کے ایک روز پہلے صف آرائی ہو جائے، اور فوج کو آراستہ کرکے قدم آگے بڑھایا جائے،
اور جس ایک سمت سے جائیں، پھر اسی سمت اپنے گھوڑوں کے سروں کو نہ پھیریں، اور دائیں
بائیں اپنے کو متوجہ نہ کریں، اور میں نے حکم دیا، کہ لشکریوں کی نظر غنیم کی فوجوں پر پڑے تو بلند
آواز سے تکبیر لشکر سورن یعنی جنگی نعرے لگائیں،........

"اور اگر لشکر کا عارض دیکھتا ہو کہ کوئی سردار غلطی کر رہا ہے تو وہ اس کی جگہ پر دوسرے
کو مامور کرے،........

اور میں نے حکم دیا کہ لشکر کے سردار عارض مدد سے غنیم کی فوج کی کمی اور زیادتی کو ملاحظہ

---

[۱] ذکاء اللہ جلد سوم ص ۳۰۳ - ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۰۲ [۲] تزوک تیموری ص ۲۰۳ (۱۹۱۱)

کرین، اور اپنے اور غنیم کے سرداروں کا مقابلہ کرین، اور کمی اور زیادتی کی تلافی اور تدارک کرین، اپنی اور دشمن کی سپاہ کے اسلحہ کا جائزہ لین، اور غنیم کی رفتار کو دیکھتے رہین کہ آہستہ اور مسلسل وہ جنگ کرتے ہین یا اضطراب کے ساتھ،

"اور دشمن سے لڑنے کا طریقہ ذہن نشین کرین، کہ ایک ساتھ حملہ کرین، یا ایک فوج کے بعد دوسری فوج کو بھیج کر حملہ کرین اور یہ دیکھین کہ حملہ کے وقت دشمن پیچھے کو واپس جاتا ہے، اور پھر دوبارہ حملہ کرتا ہے، یا پہلے ہی حملہ پر اکتفا کرتا ہے، اگر ایسا ہو تو وہ اپنے جانب کی فوج جو اُن کے حملہ کا صدمہ برداشت کرتی ہے، صبر کرے، کیونکہ ایک ساعت کا صبر ہی اصلی بہادری ہے،

"اور مین نے حکم دیا کہ جب تک دشمن خود جنگ مین پیشقدمی نہ کرے، اس پر سبقت نہ کرین، اور مین نے حکم دیا کہ جب دشمن میدان مین آئے، سردار کو افواج تھگانہ پر نظر رکھنا اور ان کو کام کرنے کی ہدایت کرنا چاہئے، کیونکہ سردار کا کام یہی ہو کہ فوج کو کام مین لگائے اور سردار کو چاہیے کہ کام کے وقت اپنے دل کو کمزور نہ کرے، اور ہوش و حواس مین خلل نہ آنے دے، اور ہر فوج کو بمنزلہ ایک ہتھیار کے ہاتھ مین رکھے، کوئی تیر ہو، کوئی تبر کوئی تلوار، کوئی گرز، کوئی چھری اور کوئی خنجر، اور ہر فوج سے خاص خاص اوقات مین کام لے اور سردار کو چاہئے کہ نہ تو فوج کو اور نہ خود اپنے کو ایک کشتی لڑنے والے شخص کی طرح سمجھے جو اپنے ہر عضو یعنی ہاتھ پاؤن، سر اور سینہ وغیرہ سے لڑائی کرتا ہو، اور امید ہے کہ جب تلوار کی ضرب باری باری دشمن کو لگے گی، تو وہ نوین ضرب مین ضرور شکست پا جائے گا، اور سردار کو چاہئے کہ پہلے ہراول فوج کو دشمن کے مقابلے مین بھیجے، اور ہراول برانغار کو اس کے پیچھے مدد کو بھیجے، اور ہراول برانغار کے پیچھے، ہراول جرانغار کو بھیجے، تاکہ دشمن کی

فوج پر تین ضرب لگے، اور اگر اس وقت ہراول شکست کھا جائے، تو برانغار کی فوج اول کو روانہ کرے، اور اس کے پیچھے جرانغار کی فوج دوم کو بھیجے، اگر فتح حاصل نہ ہو تو برانغار کی فوج دوم کو آگے بڑھائے، اور اس کے پیچھے جرانغار کی فوج اول کو روانہ کرے، اور مجھکو اطلاع دے، اور میرے رایات کا منتظر رہے، اور خدا پر بھروسہ کرکے سردار خود شریک جنگ ہو، اور مجھکو معرکہ میں حاضر سمجھے، کہ بہ توفیق الہی جب دشمن پر آٹھ ضرب لگے گی تو نوین ضرب مین شکست کھا جائے گا، اور فتح حاصل ہو جائے گی،

اور سردار کو جلدی بھی نہین کرنی چاہئے، اور لشکر کو کام پر لگائے، اور جب خود اس کی باری آئے تو جہان تک ممکن ہو، اپنے کو قتل نہ ہونے دے کہ سردار کے قتل ہو جانے سے بدنامی ہوتی ہے، اور دشمن اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتا ہے پس سردار کو چاہئے کہ راے اور تدبیر سے کام کرے، اور عجلت نہ کرے کہ عجلت شیطان کا کام ہے، اور ایسی جگہ نہ جائے، جہان سے نکل نہ سکے، ....

میں نے حکم دیا کہ اگر غنیم کا لشکر بارہ ہزار سے زیادہ ہو، لیکن چالیس ہزار تک نہ پہنچا ہو، تو اس کے مقابلہ مین میرے کامگار فرزندون مین سے کوئی ایک سردار ہو، اور اس کے رکاب مین دو بیلگر بیگی، امراء اور اتنے قشون، تومان اور الوس ہون، جن مین چالیس ہزار سوار سے کم نہ ہون، اور غالب ہونے والی فوج کو چاہئے کہ مجھکو حاضر سمجھ کر تدبیر جوانمردی اور بہادری کے سررشتہ کو ہاتھ سے جانے نہ دین، ....

اور سردار وہی ہے کہ غنیم کی سپاہ کے سلسلہ کو شمار کرکے ان کے مقابلہ مین سردارون کو متعین کرے، اور دشمن کی سپاہ مین، برچھیون، شمشیر اندازون اور تیر و بازون کو نگاہ مین رکھے، اور غنیم کی سپاہ کی رفتار کو دیکھے کہ وہ پیوستہ یا آہستہ فوج پر فوج میدان جنگ مین لاتا ہے

یا تیزی سے آتا ہے؟ اور اپنے درآمد اور برآمد کی راہ کو میدان جنگ مین ملاحظہ کرے، اور غنیم کی
جنگ کے شیوہ اور روش کو دریافت کرے، کیونکہ کبھی وہ اپنے کو کم نمودار کرتے ہین اور اپنے کو
بھاگتے ہوئے ظاہر کرتے ہین، ان کے مکر اور گریز پائی سے محفوظ رہنا چاہئے :

اور جنگ کا تجربہ کار اور آزمودہ سردار وہی ہے کہ جنگ کے معاملات کو سمجھا ہو کہ کون سی
فوج کو آگے بڑھانا چاہئے، اور کون سے رخنہ کو تدبیر سے بند کرنا چاہئے، اور کس طرح لڑائی
لڑانی چاہئے، سردار وہ ہے جو غنیم کے ارادہ کو سمجھتا ہو کہ کس روش پر وہ جنگ کرے گا اور
اس کے تمام شیوہ کو اس پر مسدود کر دیتا ہو............

اور سردار وہ ہے کہ غنیم کی رفتار پر نظر رکھتا ہو: اور ہر ایسے امیر کو جو بغیر حکم کے حرکت اور
تیزی کرتا ہو، تنبیہ کرتا ہو........

اور سردار وہ ہے کہ غنیم کے درآمد اور برآمد پر نظر رکھتا ہو، اور جنگ کرنے مین اضطراب
کا اظہار نہ کرتا ہو، یہان غنیم خود جنگ مین پیشقدمی کو رواد دیتا ہو، اور جب غنیم لڑائی شروع
کردے، تو سردار کو چاہئے کہ ان کی لڑائی کے طریقے کو دیکھے کہ کس طرح وہ میدان
جنگ مین داخل ہوتا ہے اور باہر جاتا ہے، اور کس طرح اس پر حملہ کیا جائے؛

"کبھی غنیم اپنی تعداد کو کم دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور بظاہر بھاگتا نظر آتا ہے
لیکن اس کے اس قسم کے مکر و فریب مین نہین آنا چاہئے،

اعلیٰ اور تجربہ کار سردار وہ ہے جو جنگ کے طریقون سے واقف ہو کہ کونسی فوج
کو آگے بڑھانا چاہیے اور اگر فوج مین رخنہ پیدا ہو رہا ہو، تو کون سی تدبیر کارگر ہوسکتی ہے؛
سردار کو چاہیے کہ غنیم کے ارادے سے واقف رہے کہ کس طرح وہ جنگ کریگا، اور کس طرح
اسکی چالون کا انسداد کیا جائے گا، ....

"اور سردار کو چاہئے کہ یہ دیکھے کہ غنیم میدان میں پیش قدمی کر کے حملہ کرتا ہے یا اپنے چپ راست کی فوجوں کو بڑھاتے ہوئے ہے، ایسی حالت میں سردار کو چاہئے کہ پہلے ہراول کو ان کے روبرو کرے اور جنگ کرے، اور پھر ہراول چپاول اور ہراول تشقاول کو ہراول کلان کی مدد کو بھیجے، اور ان کے پیچھے چپاول کی فوج اول، اور تشقاول کی فوج دوم کو بڑھا کر جنگ کرے، اور پھر ان کے پیچھے چپاول کی فوج دوم اور تشقاول کی فوج اوّل کو روانہ کرے"

اگر ان سات ضربوں سے غنیم پر فتح حاصل نہ ہو، تو اس وقت ہراول برانغار اور ہراول جرانغار دوڑایا جائے، یہاں تک کہ غنیم پر نو ضربیں وارد ہو جائیں، اور اگر ان نو ضربوں سے بھی فتح میسر نہ ہو تو برانغار کی فوج اوّل اور جرانغار کی فوج دوم آگے بڑھائی جائے

اگر ان گیارہ ضربوں پر بھی فتح حاصل نہ ہو تو برانغار کی فوج دوم اور جرانغار کی فوج اوّل جنگ کے لئے بھیجی جائے، پھر امید ہے کہ ان تیرہ ضربوں کے بعد غنیم کی فوج کو شکست ہو جائے گی، اور فتح حاصل ہو گی،

اور اگر حیاناً ان تیرہ ضربوں سے بھی فتح حاصل نہ ہو تو اس وقت سردار کو چاہئے کہ قول کی فوج کو آراستہ کر کے اس طرح روانہ کرے کہ غنیم کی نظر میں وہ پہاڑ نظر آئے، وہ آہستہ اور پیوستہ ہو کر روانہ ہو۔ اور فوجی بہادروں کو حکم دے کہ شمشیر لے کر ہجوم کریں اور تیچیان تیر چلائیں، اور اگر فتح نہ ہو تو خود سردار جنگ کے لئے قدم بڑھائے، اور میری رایات کا منتظر ہو ....

"اور میں نے حکم دیا کہ افواج چنگتائیہ کے امراء کو جب تک میرا فرمان نہ پہونچے جنگ شروع نہ کریں اور جب تک جنگ کی نوبت ان لوگوں تک نہ پہونچے، دست بردنہ دکھائیں، لیکن جنگ کے لئے مستعد و آمادہ رہیں،

"اور جب جنگ کا حکم اُن کے پاس پہنچ جائے، تو غنیم کی روش کو دیکھ کر جنگ کریں، یہ دیکھیں کہ غنیم کس راستہ سے آتا ہے، اس راستہ کو اس کے لئے بند کردیں، اور جو راستہ غنیم کے لئے بند ہوگیا ہو، اس کو پھر تدبیر سے کھولیں،

اور میں نے حکم دیا کہ جب ہراول ہراول جنگ میں پیش قدمی کرے، امیر ہراول ہراول جنگ میں پیش قدمی کرے، امیر ہراول اپنی فوج کے چھ حصوں کو یکے بعد دیگرے اور ایک دوسرے کے پیچھے جنگ کے لئے بڑھائے، اگر اس طرح چھ متواتر ضربیں لگائی جائیں تو غنیم کو شکست ضرور ہو جائے گی، اس وقت امیر چنداول کو بھی چاہئے کہ اپنی چھ فوجوں کو باری باری کمک کو بھیجے، اور خود حملہ آور ہو اور اسی طرح افواج شقا ول کے امیر کو اپنی چھ فوجوں کو آگے والی فوج کی مدد کو روانہ کرے، اور اپنے کو بھی وہاں تک پہنچائے، اور جب اٹھارہ ضربیں غنیم پر لگائی جائیں گی تو اس کو شکست ہو گی،

"اور اگر اس کے باوجود غنیم خیرگی دکھائے، تو امیر برانغار کو چاہئے کہ اپنے ہراول کو بڑھائے اور امیر جرانغار بھی اپنے ہراول کو روانہ کرے،

"جب چپ وراست سے یہ دونوں ہراول بڑھیں گے، تو البتہ غنیم کا لشکر بے تاب اور ناتوان ہوگا،

"اور اگر اس پر بھی غنیم خیرہ رہے تو امیر برانغار و امیر جرانغار اپنی اپنی فوج کو باری باری غنیم کی طرف بڑھائیں، اور اگر وہ دیکھیں کہ غنیم کی فوج کو افواج قاہرہ سے شکست نہیں ہورہی ہو تو برانغار اور جرانغار کے امیر خود ..... دشمن کے دفع دفع کرنے میں متوجہ ہوں،

"اور اگر اس وقت برانغار اور جرانغار کے امیروں کا حال خراب ہو، تو امیر زادگان

جو طرح برانغار مین ہون، اور خویشاوندان جو طرح جرانغار مین ہون غنیم پر حملہ آور ہو جائین، اس وقت ان کی نظرین سردار اور سردار کے علم پر ہون اور شجاعت اور جوانمردی سے غنیم کی صف شکنی کرین، اور غنیم کے سردار کو گرفتار کرنے کا قصد رکھین، اور کوشش کرین کہ مخالفون کا علم نگونسار ہو،

" اور اگر ان تمام ضربون کے باوجود بھی غنیم اپنی جگہ پر قائم ہو تو اس وقت چاہئے کہ متفرق فوجین، قول کے بہادر، اوساقت (قبیلے) کی فوجین جو قول کے عقب مین آراستہ ہون، یک بارگی ہجوم کرکے حملہ آور ہو جائین،

اور اگر اس وقت بھی فتح نہ ہو تو سلطان کو چاہئے کہ خود قوی دل اور بلند ہمت کے ساتھ حرکت کرے"

اور اگر غنیم قزاقی کرکے چپاول، شقاول، برانغار اور جرانغار کو برہم کرکے قول تک پہنچ گیا ہو، تو سلطان کو واجب ہے کہ اپنے پائے شجاعت کو صبر کے رکاب مین مستحکم کرے اور غنیم کے دفع کرنے کی طرف متوجہ ہو،

گولہ باری: مندرجۂ بالا طویل اقتباسات سے لڑائی کے موقع پر تیموری فوجون کی مختلف صفون کی یورش، یلغار اور طرز جنگ کا اندازہ ہوا ہوگا، تیمور کے جانشین مصالح اور مواقع کی بنا پر ان مین وقتاً فوقتاً فروعی ترمیم کرتے رہے، لیکن اصول تمام تر یکسان رہے، آتشین اسلحہ کی غیر معمولی ترقی سے بھی یورش و یلغار کی نوعیت بدلتی رہی، جب فوج مین آتشین اسلحہ کی کثرت ہوتی، تو غنیم کے لشکر مین انتشار پھیلانے اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچانے کی غرض سے جنگ کی ابتدا، توپ و تفنگ یعنی رعد، دیگ، بان، زنبورک، ضرب زن، ہتنال، گجنال، شترنال، شاہین، دھماکے، اور رہکلے کے وار سے کی جاتی،

رانا سانگا کے خلاف بابر کی فوج صف آرا ہوئی تو اس نے تفنگچیوں اور رعد اندازوں کو اپنی فوج کے آگے رکھا، ارابوں پر تفنگ اور رعد تھے، اور یہ ارابے زنجیروں سے متصل تھے جن کے پیچھے تفنگچی اور رعد انداز محفوظاً کھڑے تھے، یہ طریقہ رومیوں کا تھا، چنانچہ بابر خود اپنی تزک میں لکھتا ہے :-

"رعایت حزم را مرعی داشتہ بطریق غزات رومیہ بجہت تفنگچیان و رعد اندازان کہ در پیش سپاہ بودند، صفے از ارابہ ترتیب نمودہ بایکدگر بزنجیر اتصال دادہ شد (ص ۲۱۳)"

بابر کے قول میں شاہی تفنگچی تعینات ہوئے، اور قول کے دائیں جانب بھی تفنگچی اور ضرب زن تھے جن کی نگرانی نادر العصر مصطفیٰ رومی کر رہا تھا، قول کے آگے بھاری بھاری توپوں کے ساتھ نادر العصر استاد علی قلی تھا، لڑائی شروع ہوئی تو مصطفیٰ رومی نے ارابے کو آگے بڑھایا، اور تفنگچیوں اور ضرب زنوں کے ذریعہ سے راجپوتوں کی صفوں کو درہم برہم کرنا شروع کیا، اکبرنامہ میں ہے :-

"مصطفیٰ رومی از غول حضرت جہانبانی ارابہا را پیش آورد، و تفنگ و ضرب زن آنجا ان صفوف مخالف را درہم شکست کہ زنگ از آئینہ دلہاے بہادران بزدود، و وجود بسیارے از مخالفان با خاک ہلاک برابر کردہ برباد فنا داد (ج ۱ ص ۱۰۸)"

اور جب لڑائی گھمسان ہونے لگی تو بابر نے حکم دیا کہ ارابے کے پیچھے سے قول کے راست و چپ سے اس کی خاص فوج آگے بڑھے، اور آگے بڑھتے وقت تفنگچیوں کے لئے بیچ میں جگہ چھوڑ دے، اور جب یہ فوج آگے بڑھ رہی تھی، تو استاد علی قلی نے جو قول کے آگے تھا، اپنی توپوں سے آتش باری شروع کی، ان توپوں سے بڑے بڑے گولے پھینکے جانے لگے، ان گولوں کا ذکر بابر نے ان الفاظ میں کیا ہے،

"سنگہائے عظیم القدر کہ چون در پلۂ میزان اعمالش نہند صاحبش فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ نام برآورد، اگر بر کوہ راسخ وجبل شامخش اندازند کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ از پا درآورد" (ص ۳۱۶)

ان گولوں سے راجپوتوں میں بڑی سراسیمگی پھیلی، اسی اثنا میں قول کے شاہی تفنگ انداز نے بھی ارابے کے پیچھے سے آگے بڑھکر یلغار کیا، اور جب یہ غنیم کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، تو بابر قول کے ارابے کو لے کر آگے بڑھ گیا، پھر لڑائی انتہائی شدت کو پہونچ گئی، اور راجپوتوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے،[۱]

پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کو اپنے توپخانے کی کیفیت اور کمیت دونوں پر بڑا ناز تھا، اس لئے پہلے اُس نے اپنی بھاری بھاری توپوں کو آگے بھیج کر لڑائی شروع کی، لیکن اکبر کے لشکریوں نے عجلت، چابکدستی اور غیر معمولی جانبازی سے کام لے کر ان پر قبضہ کر لیا، جس سے ہیمو کی قوت پر بڑی ضرب کاری لگی،[۲]

سنہ ۹۸۳ھ میں اکبر کی فوج بنگال میں بجوسا کے پاس داؤد خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی تو دونوں طرف لشکر کے آگے منگلوسی ہاتھی رکھے گئے، اکبر کی فوج میں ضرب زن اور زنبورک چھکڑوں میں رکھے ہوئے تھے، لڑائی شروع ہوئی تو داؤد خان نے اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا، لیکن شاہی فوج کے ضرب زن اور زنبورک نے ہاتھیوں کو آگے بڑھنے سے روکا، گولہ باری سے ہاتھی مڑ کر بھاگے، ادھر پھر اتنی سخت گولہ باری ہوئی، کہ داؤد کے بہت سے فوجی ہلاک ہو گئے،[۳]

اڑیسہ میں اکبری فوج جانی بیگ سے برسرپیکار ہوئی، تو اس لڑائی میں بھی شاہی فوج

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھو تزک بابری اردو ترجمہ ص ۳۱۵ و ۳۱۶ و اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۶ - ۱۰۷ - [۲] اکبر نامہ جلد دوم ۳۴ - ۳۵ - [۳] بدایونی جلد دوم، ص ۱۹۲،

کی توپوں نے بڑی ہولناکی پیدا کی، لڑائی توپوں کی گولہ باری ہی سے شروع کی گئی، غنیم کو اپنے ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، لیکن توپ کے گولوں نے ہاتھیوں پر ایسی زد لگائی گئی کہ سب ہلاک ہوگئے، اکبرنامہ میں ہے،

"توپہائے کہ تخت برگشودند، میان لہری را کہ سرآمد فیلان غنیم بود، باد یگر فیل نزدیک ہستی بسوخت"[۱]

جہانگیر کی فوج عنبر کے خلاف دکن میں صف آرا ہوئی، تو عنبر نے جہانگیر کا مقابلہ بڑی بڑی توپوں کے ساتھ کیا، دونوں طرف سے لڑائی کی ابتدا بان اور توپ ہی سے کی گئی، غنیم کی فوجوں میں جہانگیر کی توپوں سے ابتری پھیلی، تو شاہی فوج کے بہادر اور دلیر سردار تلواریں سونت سونت کر غنیم کے ہراول پر ٹوٹ پڑے، اور ایسی مردانگی دکھائی کہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ دشمن بنات النعش کی طرح پراگندہ ہوگئے،[۲]

۱۰۵۶ھ میں بلخ میں شاہجہانی فوج کا مقابلہ نذر محمد خان کے لشکر سے ہوا تو اس کی ابتدا جس طرح ہوئی اس کا حال عبدالحمید لاہوری کی زبان سے ملاحظہ ہو،[۳]

"جب دونوں طرف کے فوجی صف آرا ہوگئے، تو شاہی لشکر کے بان اندازوں اور تفنگچیوں نے بان اور تفنگ کا وار شروع کئے، بان کی ضرب سے غنیم کی فوجیں ہلاک ہونے لگیں، بان اور تفنگ کے عجیب وغریب وار سے بڑی ڈراؤنی آواز بلند ہوتی گئی، ایسی کہ شیر کا پتہ بھی پانی ہو جائے، ان آوازوں سے غنیم کے برانغار اور جرانغار فوجوں کے قدم اکھڑ گئے، اور وہ بھاگنے لگیں اس بھگدڑ سے نذر محمد خان نے بھی لڑائی

---

[۱] اکبرنامہ جلد سوم ص ۶۱۲ - [۲] تزک جہانگیری ص ۱۵۲۔
[۳] آزاد ترجمہ کیا گیا ہے،

سے منہ موڑ لیا،[۵۱]

دھرماوت کے میدان میں اورنگزیب اور مہاراجہ جسونت سنگھ سے لڑائی ہوئی تو اس کا آغاز بھی بان اور تفنگ سے ہوا اورنگزیب کے ہراول کی آتش باری اور گولہ باری سے جسونت سنگھ کی صف میں بڑی سراسیمگی پھیلی، راجپوتوں نے اپنے کو ہلاک ہوتے دیکھ کر اورنگ زیب کے توپخانہ پر یورش کی جس سے اورنگ زیب کے توپچیوں میں انتشار پیدا ہو گیا، لیکن اس موقع پر مرشد قلی خان، اور ذوالفقار خان کی غیر معمولی شجاعت اور مردانگی نے اورنگ زیب کی فوج کو سنبھالا، ذوالفقار خان گھوڑے سے اتر کر میدان جنگ میں کود پڑا، اور تلوار سے راجپوتوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا، اسی اثناء میں اورنگ زیب کے توپچیوں نے اپنی توپوں کو اونچی جگہ پر جا کر غنیم کے قلب میں آتشباری شروع کی، جس سے ان کے درمیان بڑی ابتری پیدا ہو گئی،[۵۲]

سموگڈھ کی لڑائی میں دارا کے لشکر کے پورے ہراول میں توپخانہ ہی تھا، بڑی بڑی توپوں کی آڑ میں تفنگچی کھڑے تھے، ان کے پیچھے اونٹوں کی قطار تھی، جن کی پشت پر شترنال تھی ..... ونٹوں کے پیچھے ہاتھی تھے، جن کے اوپر گجنال تھی، اورنگ زیب کے ہراول میں بھی دو توپ خانے علیحدہ علیحدہ نگران کی نگرانی میں تھے، طرفین کی طرف سے بان، توپ اور تفنگ ہی سے لڑائی شروع کی گئی، دارا نے حملہ کرنے میں پیشقدمی کی، اس نے اپنی توپوں سے لڑائی کے شعلے بلند کئے، گولوں کے دھوئیں سے فضا بالکل تاریک ہو گئی، جیسے اندھیری رات کی تاریکی چھائی ہو، اورنگ زیب نے اپنی توپوں کو استعمال کرنے میں احتیاط کی، دور سے گولہ باری کر کے بارود کو ضائع ہونے نہیں دیا، غنیم کے نزدیک آنے کا منتظر رہا، اس کی توپوں کی

---

[۵۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۱۵۵ - نیز دیکھو بلخ کی جنگ شہزادہ اورنگ زیب کی نگرانی میں ص ۶۲۹،

[۵۲] تفصیل کے لئے دیکھو عالمگیر نامہ ص ۶۳ - ۶۶،

خاموشی سے دارا کے لشکریون کو غلط فہمی ہوئی، اس کا لڑکا شہزادہ سپہر شکوہ اپنی فوج کے مشہور اور آزمودہ کار رہبر رستم خان دکنی کو لے کر دس بارہ ہزار سوارون کے ساتھ اورنگ زیب کے توپخانے کی طرف بڑھا، سوارون نے اورنگ زیب کے ہراول مین رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ہراول مین توپین زنجیرون سے بندھی ہوئی تھین، اورنگ زیب کا میر آتش اور اس کے ساتھ کے تفنگچی، اور توپچی اپنی جگہون پر جمے رہے، انھون نے غنیم کے بڑھتے ہوئے لشکر پر ایسی ہولناک آتش باری کی، کہ ان کی یلغار بالکل ناکام رہی، ٹھیک اسی وقت ایک گولہ رستم خان کے ہاتھی پر گرا، جس سے ہاتھی زمین پر ڈھیر ہوگیا، رستم خان نے اپنی شجاعت کا جوہر دکھانا چاہا، وہ اپنے غنیم کے بائین بازو کی طرف لپکا، لیکن اورنگ زیب کے توپچیون نے اس کے ہمراہیون پر اتنی سخت گولہ باری کی کہ کشتون کے پشتے لگ گئے، دارا اپنے لڑکے سپہر شکوہ اور فوجی سردار رستم خان کی پسپائی نہ دیکھ سکا، اپنی جگہ چھوڑ کر اورنگ زیب کے توپخانے کی طرف بڑھا، خود آگے آگے تھا، اور اس کے تفنگچیون کا دستہ پیچھے پیچھے تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے توپچیون کو گولہ باری کرنے مین رکاوٹ پیدا ہوگئی، لیکن اورنگ زیب کے لشکریون نے بان، توپ، اور تفنگ کا حملہ اتنی تیزی اور شدت سے جاری رکھا، کہ دارا کے توپچیون کو جوابی حملہ کرنے کا بالکل موقع نہ ملا، دارا خطرے مین گھرا ہوا تھا، اس نے اپنے کو پیچھے کرکے توپچیون کو آگے بڑھانا چاہا. لیکن اس وقت تک بڑی تاخیر ہوچکی تھی، اورنگ زیب کی توپین برابر کام کر رہی تھین، اور دارا کے لشکری موت کے گھاٹ اتر رہے تھے، دارا دشمنون کی آتش باری سے بچنے کی خاطر دائین جانب اپنے ہراول کی طرف مڑ گیا. لیکن ابھی وہ اپنے ہراول کے پاس پہنچنے بھی نہین پایا تھا کہ اورنگ زیب کی توپون سے اس کے (یعنی دارا کے) سپاہیون کی ایک کثیر تعداد لقمۂ اجل بن گئی، دارا کی فوج مین ابتری پھیلتی جا رہی تھی، اورنگ زیب کے میمن یعنی اس کی فوج کے دست راست نے اس ابتری سے فائدہ اٹھایا،

حملہ کیا اور دارا کی فوج کو گھیر لیا، پھر یمین و یسار کی توپوں نے ایک ساتھ دارا کے لشکریوں پر مسلسل گولہ باری شروع کی، دارا کے توپچیوں کو جواب دینے کا موقع بالکل میسر نہیں ہو رہا تھا، اورنگزیب کی فوج سمندر کی موجوں کی طرح دارا کے لشکر کی طرف بڑھتی گئی، اورنگزیب کے پاس بے شمار توپ و تفنگ تھی جن کی گرج سے میدان جنگ میں ایک زلزلہ سا آگیا، آٹھ آٹھ دس دس سیر کے گولے ہوا میں اڑ رہے تھے، توپچی دارا کے ہاتھی کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے، دارا کے جانثار امراء اور لشکری اس کے ہاتھی کے ارد گرد کٹ کٹ کر گر رہے تھے، دارا اپنے جاں نثاروں کو اس طرح پسپا ہوتے . . . . دیکھ کر سراسیمہ اور پریشان ہو رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے، یکایک ایک گولہ اس کے ہاتھی کے ہودج پر آکر گرا، اس سے خوفزدہ ہو کر وہ ہاتھی کے ہودج سے اتر آیا، اور اتنی عجلت میں کہ وہ اپنی جوتیاں بھی پہن نہ سکا، ہاتھی سے اتر کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن جب اس کے لشکریوں نے ہاتھی کے ہودج کو خالی دیکھا تو وہ سمجھے کہ جس کے لئے جنگ ہو رہی ہے، وہی تمام ہو چکا ہے، ان کا یہ سمجھنا تھا کہ میدان جنگ سے ان کے قدم اکھڑ گئے[1]

بہادر شاہ عالم کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ لاہور کے پاس ہوئی تو توپ و تفنگ کا سخت معرکہ ہوا، شہزادہ عظیم الشان نے اپنے لشکر کا پڑاؤ راوی کے ساحل پر خندقیں کھود کر ڈالا، اس کے ساتھ کچھ بڑی بڑی توپیں تھیں، جن میں سے بعض کو ڈھائی سو ہاتھی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو عالمگیر نامہ ص ۱۰۵ - ۹۶، واقعات عالمگیری ص ۴۸ - ۴۳ خافی خان ص ۳۱ - ۲۸، ہجو سلطح کے بہت بڑے ماہر جدو ناتھ سرکار نے بھی اپنی تصنیف ہسٹری آف اورنگزیب کی جلد دوم باب ۱۶ میں مختلف تاریخوں سے اخذ کر کے اس جنگ کی بہت سی تفصیلات لکھی ہیں۔

پانچ چھ ہاتھی مل کر کھینچتے تھے، عظیم الشان کے مقابلہ میں جہاندار شاہ، رفیع الشان اور جہان شاہ ساتھ تھے، ان تینوں شہزادوں نے اپنے لشکر کا پڑاؤ عظیم الشان کی فوج کے قریب ہی ڈالا، اپنی توپوں کا ایک مستحکم مورچہ تیار کیا، پاس ہی اینٹوں کے بھٹے تھے جن پر توپوں کے لئے سرکوب بنایا، لڑائی شروع ہونے سے پہلے تینوں شہزادوں کی طرف سے عظیم الشان کے بارود خانے کو اڑا دینے کی سازش کی گئی، لیکن یہ ناکام رہی، عظیم الشان کی جانب سے توپوں کی مسلسل گولہ باری سے لڑائی شروع کی گئی، شہزادوں نے ہر گولہ کا جواب گولہ سے دیا، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، دوسرے دن شہزادوں کی فوجوں نے عظیم الشان کے لشکر پر ہولناک آتشباری کی، موخرالذکر کی فوجیں راوی کی ریتلی زمین میں خندق میں محصور ہو کر لڑ رہی تھیں، ریتلی زمینوں میں گولے گرتے تو فوجوں میں بڑی سراسیمگی پھیل جاتی، تین دن اسی طرح لڑائی ہوتی رہی، بالآخر تینوں شہزادوں نے ایک ساتھ عظیم الشان کی فوج پر یلغار کی، لیکن عظیم الشان نے اپنی توپوں کی غیر معمولی گولہ باری سے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا، چھ گھنٹے تک دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی رہی، جہاندار شاہ شدت کی گولہ باری کرتا ہوا عظیم الشان کے لشکر کی خندق کے قریب پہنچ گیا، اب دست بدست جنگ ہونے لگی، یکایک ایک گولہ شہزادہ عظیم الشان کے ہاتھی کی سونڈ پر آکر گرا، جس سے اس کی سونڈ کٹ کر علحدہ ہو گئی، وہ اس طرح زخمی ہو کر راوی میں کود پڑا، جس میں تیموری سلطنت کے ناکام دعویدار کے ساتھ غرقاب ہو گیا[1]،

تیموریوں کی حکومت کے آخری عہد تک توپیں استعمال ہوتی رہیں، حسن پور کی جنگ میں شاہ کی توپوں نے سید عبداللہ کی فوجوں میں بڑی ہولناکی پیدا کی، خافی خان نے اس لڑائی کا ڈرا ور جانگداز نقشہ منتخب اللباب میں کھینچا ہے، جو حسب ذیل ہے[2]،

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۶۸۲، سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۸۲-۸۴ [2] ترجمہ آزاد ہے،

"شاہی فوج نے اپنے آگے توپ خانہ کا مورچال رکھ کر حرکت کی، جنگی کوس اور کرنا
کے زیر و بم سے لڑائی کی سرزمین میں ولولہ پیدا ہوا، چھوٹی بڑی ہوش ربا توپوں کی گرج
سے زمین اور آسمان میں ایک بھونچال آگیا، دوپہر کو دونوں مخالف فوجیں تھوڑے
فاصلہ پر مقابلہ کے لئے کھڑی ہوئیں، گولوں اور آتش فشاں بان کے وار سے غنیم نے اپنی فوج
کی ہمت بڑھائی، شاہی فوج کی طرف سے بھی توپوں نے مسلسل ضربیں لگائیں، جن سے
اس کے دلاوروں کا نشہ تیز ہوا، اور غنیم کے لشکر میں ہیبت طاری ہونے لگی، غنیم کی
فوجوں کی تعداد مور و ملخ کی طرح تھی، ان میں تزلزل پیدا ہونے لگا، ان میں بعض
یا تو سوار بالکل نئے تھے، بعض کو کم تنخواہوں پر ہر گوشہ سے لشکر میں بھرتی کر لیا گیا تھا، ان
کی تعداد کثیر تھی، ان میں کوئی نظم و نسق بھی نہ تھا، وہ مختلف صفوں سے واقف بھی نہ
تھے، اس لئے لازمی طور پر ان کے پاؤں اکھڑ گئے، ہر لمحہ اور ہر قدم پر توپ و تفنگ کے
گولوں کی بارش ہوتی رہی، ہر ساعت ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن رہے تھے، سادات
بارہہ نے کئی بار بڑی جرأت اور جوانمردی سے شاہی فوج پر حملے کئے، بالآخر نجم الدین
علی خان بہادر نے سادات کے توپخانے بڑھائے، اس نے پس کے گاؤں کی ایک
پہاڑی کے درختوں کی آڑ لی، اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ شاہی توپخانہ کی
طرف یورش کی، شاہی فوج میں بڑی سراسیمگی پیدا ہو گئی، ان میں سے بعض کے پاؤں
اکھڑنے لگے، لیکن منصور جنگ اور نامور جنگ مست ہاتھیوں کی طرح بارہہ شیروں کے مقابلہ کیلئے بڑھے
ان کی بڑھتی ہوئی فوج کو روکا، نصرت یار خان، ثابت خان اور دوسرے بہادروں نے
بھی ثابت قدم رہ کر جرأت دکھائی، شاہی فوج نے جوانمردی دکھا کر غنیم کے کچھ دستے پر
قبضہ کر لیا، بارہہ نے درختوں کی آڑ میں جو مورچال بنایا تھا، وہ بھی ان کے تصرف سے

جا تا رہا، آفتاب غروب ہو رہا تھا، بدنصیب سید عبد اللہ خان نے رات گذارنے کے لئے ایک خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا لیکن اس کو پھر خیال ہوا کہ کہین یہ خیمہ تیرون اور توپون کا نشانہ نہ بن جائے، اس نے خیمہ نصب نہین کرایا، چودھوین رات تھی، چاند نی چھٹکی تھی، لیکن جب رات اندھیری ہوئی، تو نا صر جنگ نے ایک عجیب و غریب طریقہ سے توپخانہ آگے بڑھایا، توپون کے بیلون کو توپون کے ساتھ اس طرح باندھا کہ ان کا منہ پیچھے کی طرف رہا۔ اور دم آگے رہی، اس طرح ایک متحرک مورچال بن گیا، پھر توپون سے شدید ضربین لگائی جانے لگین، صف شکن اور فیل افگن توپون نے بارہہ کی فوج مین جو ہولناکی پیدا کی، اس کو بیان کرنا مشکل ہے، ہر گولہ سے ایک ہاتھی اور اس کا سوار مارا جاتا، اس دشت پر وحشت مین ایک قیامت بپا ہو گئی، ....

غازی خان نامی توپ سے جو بھی گولہ آتا بارہہ کی صفون کو درہم برہم کر دیتا، شاہ پسند نامی توپ سے آواز بلند ہوتی، اور شعلے پیدا ہوتے، تو زمین اور آسمان مین سیماب کی طرح ایک بیقراری پیدا ہو جاتی، حیدر قلی خان چاندی اور سونے کے سکے توپخانہ والون کے اردگرد بکھیر رہا تھا، اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کی نظرون مین اپنی کارگذاری سے اور بھی زیادہ محبوب ہو جائین گے، اور طرح طرح کے انعامات کے وعدے بھی کرتا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض بڑی توپین جن سے اور لڑائیون کے موقع پر صرف ایک دو بار صدائین بلند ہوتی تھین، برابر کام کرتی رہین، اور ان سے اتنی صدائین بلند ہوتی رہین، کہ بالآخر غنیم کو پسپا ہونا پڑا، مین نے تاریخ محمد قاسم فرشتہ مین دکن کے فرمانرواؤن کے سلسلہ مین پڑھا تھا کہ توپخانہ کے رواج کی ابتدا ۷۶۶ھ مین محمد شاہ بہمنی کے عہد مین محمد خان رومی کی نگرانی مین ہوئی، اور یہ توپخانہ بیجانگر

کے راجہ کے خلاف استعمال کیا گیا، لیکن اس وقت سے ابو المظفر ناصر الدین محمد شاہ کے دورِ حکومت تک کسی جنگ میں توپوں نے اتنی ہولناکی پیدا نہیں کی جتنی کہ اس جنگ میں کی[۱]"

محمد شاہ نے بھی اس لڑائی میں اپنے آبا و اجداد کی شجاعت و بہادری کی یاد تازہ کی، شب و روز اپنے ہاتھی بادشاہ پسند نامی پر بیٹھکر اپنے لشکریوں کی ہمت بڑھاتا رہا۔ اس کا ہاتھی غنیم کی توپوں کی زد میں کھڑا تھا، لیکن اس کو پیچھے ہٹنے نہیں دیا[۲]۔

نادر شاہ کے خلاف کرنال کی جنگ میں محمد شاہ کے پاس چھوٹی بڑی آٹھ ہزار توپیں تھیں، ان میں سے بعض توپوں کو پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار بیل کھینچتے تھے، لیکن نادر شاہ کے فنِ جنگ کے مقابلہ میں یہ توپیں مفید ثابت نہیں ہوئیں، اس کے علاوہ نادر شاہ کے لشکریوں میں تیزی اور پھرتی ایسی غضب کی تھی کہ محمد شاہ کی بھاری بھاری توپوں کے حرکت کرنے سے پہلے ہی اس کے فوجی اپنی چھوٹی چھوٹی توپیں مثلاً جزائر اور زنبورک کو اونٹوں کی پیٹھ پر لاد کر آگے بڑھے اور اتنی پھرتی سے محمد شاہ کے لشکریوں کو گھیر گھیر کر مارنے لگے کہ سارے لشکریوں خصوصاً ہاتھیوں میں بڑی جلدی پراگندگی پھیل گئی۔ (باقی)

---

[۱] خافی خان ص ۷۲۶، ۹۲۴۔ [۲] ایضاً صفحہ ۹۲۔

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فنِ انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اسکی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و واقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

قیمت :۔ صہ۔ "منیجر"

تواضع

از

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں تواضع اور خاکساری ایک بنیادی تعلیم ہے، جب تک افراد میں یہ صفت نہ پیدا ہو جائے، اس وقت تک کسی صالح معاشرہ کا وجود میں آنا ناممکن ہے، اس مضمون میں اسی کی تشریح کی گئی ہے، لیکن تواضع کی تشریح سے پہلے چند تمہیدی باتیں بیان کر دینی ضروری ہیں۔

اسلام کے نزدیک کبر و غرور ایک مذموم صفت ہے، اس لئے جس مسلم کے اندر یہ عیب پایا جائیگا تو وہ نہ صرف سزاوار ملامت بلکہ مستحق جہنم ٹھہرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

الا اخبرکم باھل النار کل عتل جواظ متکبر	میں تم کو خبردار کرتا ہوں کہ ہر متکبر اور مغرور آدمی دوزخی ہے،

اسی کے مقابلہ میں دنائت و پستی کبر و غرور کی متضاد صفت ہے، اور کبر و غرور کی طرح یہ بھی اسلام میں ایک مذموم چیز ہے، جس طرح کسی مسلم کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ متکبر اور مغرور ہو کر دوسروں کو اپنے سے ذلیل اور پست سمجھے، اسی طرح یہ بات بھی مسلم کے مرتبہ سے گری ہوئی ہے کہ وہ اپنے اغراض، حب جاہ یا کسی اور مقصد کے حصول کے لئے اپنی خوددارانہ روش کو چھوڑ کر خوشامد و چاپلوسی اور دنائت و پستی سے کام لے کر اپنے کو ذلیل و خوار کرے، چنانچہ حدیث میں یہ صفتیں منافق اور فاسق و فاجر کی بیان کی گئی ہیں، اس لئے کہ یہ لوگ حصول اغراض کے ذلیل سے ذلیل اور

پست سے پست طریقے کے اختیار کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور نہ اس میں اُن کو کوئی ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

والفاجر خب لئیم۔ فاجر دغاباز، کمینہ اور دنی ہوتا ہے،

ایک ضعیف حدیث میں ہے۔

لیس من اخلاق المومن التملق چاپلوسی مومن کے اخلاق کے منافی ہے،

دوسری حدیث میں ہے،

المومن کالجمل الذلول و مومن سدھے ہوئے اونٹ کی طرح ہوتا

المنافق والفاسق ذلیل، ہے اور منافق اور فاسق ذلیل ہوتا ہے،

اعتدال کی راہ تواضع ہے | تکبر اور غرور میں افراط ہے، اور دنائت و پستی میں تفریط، اسلام چونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں افراط و تفریط سے بچتا ہے، اس لئے اس نے یہاں بھی ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور متوسط راہ اختیار کی ہے، اور وہ تواضع اور خاکساری کی راہ ہے،

اسلام نے یہ درمیانی راہ اس لئے اختیار کی کہ اگر وہ افراط یعنی کبر و غرور کی راہ اختیار کرتا تو انسان کو ایسے اختیارات اور مواقع دے دیتا جن کے ذریعہ وہ دوسرے انسانوں پر ظلم و تعدی اُن کے حقوق کو پامال اور اپنے تفوق اور ترفع کے لئے دوسروں کو ذلیل و خوار کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عام انسانوں کی صلاحیتیں پروان چڑھنے کے بجائے ٹھٹر کر رہ جاتیں، اور محبت و مساوات کے تمام رشتے یکسر کٹ جاتے،

قوت و اقتدار کے وہ تمام طریقے جن کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بناکر اس پر ظلم و زیادتی کرسکتا ہو، خدا نے ان کو مسدود کردیا ہے، اور اس قسم کے تمام اختیارات اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں، چنانچہ کبریائی اُس نے خاص اپنی صفت قرار دی ہے، جس میں اس کا کوئی

شریک نہین ہے،

اب کسی بندہ کو یہ مجاز نہین ہے کہ وہ کبریائی کرے، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ہمسری اور اس سے بغاوت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے ہمسری اور بغاوت کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے؛

قرآن نے صاف الفاظ مین اعلان کر دیا ہے کہ

وَلَہُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ — اسی کے لئے بڑائی ہو، آسمانون اور زمین مین،

اور، جو لوگ کبر کرتے ہین اُن کے لئے فرمایا کہ

الیس فی جہنم مثوی المتکبرین — تکبر کرنے والون کا ٹھکانا جہنم ہے،

حدیث مین ہے کہ

الکبریاء ردائی فمن نازعنی — کبریائی میری چادر ہے، جو شخص اس کے

نقلہ عذبتہ — لینے کے لئے جھگڑے گا مین اس کو عذاب

(مسلم شریف) — دون گا،

اسی طرح اسلام نے تقریبا یعنی دنائت و پستی سے بھی روکا ہے، اس لئے کہ اس مذموم صفت کے معنی یہ ہین کہ اسلام انسان کو اخلاق و عمل کے جس بلند مرتبہ پر پہنچانا چاہتا ہے، اس سے وہ گر جائے، اور ذلیل اغراض اور پست مقاصد مین پھنس کر اپنے لاہوتی مقصد کو بھول جائے،

ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کی حیثیت چوپایون اور کیڑے مکوڑون سے زیادہ نہین رہ جاتی جو ہر جگہ ذلیل اور روندے جاتے ہین، اور اسلام کسی انسان اور خاص طور سے کسی مسلم کے لئے یہ بات پسند نہین کر سکتا، کہ وہ ذلیل و خوار ہو، اسی لئے جہان خاکسارانہ

روش سے انسان کا ضعف اور پستی ظاہر ہو وہاں اسلام نے عارضی اور نمایشی طور پر خود دارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، ھ؁ میں صحابہ جب ادائے عمرہ کے لئے آئے، تو چونکہ مدینہ کی وبائی بخار نے ان کو کمزور کر دیا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور ان کے ساتھی ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکین پر ان کی طاقت کا اظہار ہو[1] عربی زبان میں اسی کو رمل کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے،

اسی طرح جہاد میں بھی قوت کے اظہار کا موقع ہوتا ہے، اس لئے وہاں بھی اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، حدیث میں ہے کہ جنگ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے[2] لیکن یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہ اجازت صرف عارضی اور محض نمود کے لئے ہے، کوئی مستقل قانون نہیں ہے،

اس تمہید کے بعد اب ہم تواضع کی تشریح کرتے ہیں،

تواضع کی لغوی تشریح تواضع وضع اور ضعة سے مشتق ہے، جس کے معنی گرنے اور پست ہونے یا کسی کو پست کرنے کے ہیں، اسی لئے پست اور ذلیل آدمی کو وضیع کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان تمام معانی سے ایک مذموم صفت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، لیکن تواضع کے لفظ میں یہ مفہوم یا تو بدل جاتا ہے یا پھر ایک محمود صفت بن جاتا ہے،

تواضع کے لفظی معنی ہیں تذلل، یعنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا، اسی لئے عرب زمین کے اس حصہ کے لئے جو اپنے قریب کے حصہ سے نیچا ہو، تواضعت الارض استعمال کرتے ہیں اسی سے تواضع القوم نکلا ہے، جس کے معنی ہیں قوم کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا، دور سے کسی آبادی کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین سے بالکل لگی ہوئی ہے، عرب اس کیفیت کا اظہار

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۲ صفحہ ۵۳۱ [2] ابوداؤد باب الجہاد،

ان یلد کھلمتواضع ..... سے کرتے ہیں اسی سے تواضع ما بینما ہے جس کے معنی ہیں آپس میں جو رنج و خلش کی بات تھی وہ دور ہوگئی، (لسان)

تواضع کا شرعی مفہوم | تواضع کا جو شرعی مفہوم ہے اس میں بھی یہ تمام لغوی معانی موجود ہیں یعنی ایک بندہ (عبد) کی بندگی اور عبدیت کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے آگے اپنے سر پا کو بالکل جھکا دے، دوسرون کے مقابلہ مین اپنے کو پست نہ کرے، جس بات کو حق سمجھے اس کی ہمیشہ موافقت کرے، دوسرون کے ساتھ انکساری سے پیش آئے، ظاہری طور پر اس کی کوئی حیثیت نہ معلوم ہو لیکن جب اس سے معاملہ پڑے، تو وہ معاشرہ ..... کے لئے خوشی و مسرت کا سبب بن جائے، اس کے دل مین کسی سے رنج و حسد اور کینہ نہ ہو، جب یہ صفات اس کے اندر پیدا ہو جائین گے تو خدائے قدوس اس کی اس اختیاری پستی اور گراوٹ کو بلندی اور رفعت سے بدل دے گا، حدیث مین اسی مفہوم کو ادا کیا گیا ہے،

من تواضع للہ رفعہ اللہ، جو اللہ کے لئے انکساری کرے گا اللہ اس کو بلند کر دے گا،

اب ہم قرآن و حدیث، آثار صحابہ و تابعین اور صوفیہ کے اقوال کی روشنی مین اس کی مزید توضیح کرتے ہین،

قرآن | قرآن نے تواضع کا لفظ استعمال نہین کیا ہے، بلکہ اس نے تواضع کی تعلیم اس کے مظاہر و مواقع کے ذریعہ دی ہے، زندگی کے تمام مسائل مین قرآن کا مطمح نظر یہ ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر آن خدا کا بندہ اور اس کا عبد ہے، اس لئے اس کا ہر کام دائرۂ عبدیت کے اندر ہونا چاہئے، اس کو کسی لمحہ یہ مجاز نہین ہے کہ وہ اپنے کو اس دائرہ سے خارج سمجھے، ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کو ان تمام طریقون اور راستون کو چھوڑنا پڑیگا، جو عبدیت کے تقاضون

اس کے مظاہر کے خلاف ہیں،

تواضع کی تعلیم بھی قرآن نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے دی ہے کہ ایک بندہ بندہ ہوتے ہوئے اپنی پوری زندگی اور خاص طور سے معاشرتی زندگی میں کوئی ایسی روش نہ اختیار کرے جو ایک صالح معاشرہ کے مزاج کے خلاف یا اس میں کدورت پیدا کر دینے کا سبب ہو، بلکہ اُسے وہی روش اختیار کرنی چاہئے جس سے معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ خوشگواری اور لطف پیدا ہو سکے، چنانچہ قرآن نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جو زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی یہ روش منشائے عبدیت اور ایک صالح معاشرہ کے مزاج کے سراسر خلاف ہے، بخلاف اس کے جو لوگ فروتنی سے چلتے پھرتے ہیں، اُن کی توصیف کی ہے،

وعباد الرحمٰن الذین یمشون	اللہ کے بندے وہ لوگ ہیں جو زمین پر
علی الارض ھوناً	فروتنی سے چلتے پھرتے ہیں،

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت فرمائی تھی اس میں بھی تواضع کے متعدد مظاہر کا ذکر ہے، آپ نے فرمایا،

ولا تصعر خدک للناس ولا	اور لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر، اور
تمش فی الارض مرحا ان	زمین پر اترا کر مت چل بے شک اللہ تعالیٰ
اللہ لا یحب کل مختال فخور	تکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا،
واقصد فی مشیک واغضض	اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر،
من صوتک، (لقمان)	اور اپنی آواز کو پست کر،

سورۂ بنی اسرائیل میں کبھی مسلمانوں کو اور کبھی خود آنحضرتؐ کو خطاب کرکے جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں، ان میں بھی ــــ ہے کہ "زمین پر اترا کر مت چلو" اس لئے کہ یہ بے سود بات ہے،

ان آیات میں تواضع اور خاکساری کے مختلف مظاہر بتائے گئے ہیں، بات کرنے میں بے رُخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو، اور آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔[1]

قرآن نے ایک دوسری جگہ بڑے لطیف انداز سے تواضع کی تعلیم دی ہے،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (حجر)	اور اپنا بازو مومنوں کے لئے جھکا دے۔

خفض جناح یعنی بازو کا جھکا دینا تواضع اور خاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرند کے بازو کو کہتے ہیں، پرند جب زمین میں اُترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے، تو اپنے بازو کو جھکا دیتا ہے، اس لئے یہ استعارہ کیا گیا ہے، کہ انسان کو بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لینا اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اُترنا چاہئے۔[2]

امام ابن قیمؒ نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ اس آیت میں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ، (سورہ مائدہ)	اے ایمان والو جو بھی تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ تعالیٰ عنقریب ایک ایسی قوم کو لائے گا، جن سے وہ محبت کرتا ہے، اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، وہ نرم دل ہیں، مومنوں پر اور زبردست ہیں کافروں پر،

اللہ تعالیٰ نے "اذلۃ علی المومنین" میں "علیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ مومنین کے مقابلہ میں فروتنی، نرمی اور فرمانبردار رہنا ان کی خاص صفت

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۶ صفحہ ۲۷۲ [2] ایضاً،

ہے، ظاہر ہے کہ تواضع کی تعلیم کا بھی واحد مقصد یہی ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد کے اندر فروتری، نرمی اور انقیاد کی صفت پیدا ہو جائے، تاکہ معاشرتی زندگی زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور پر لطف ہو سکے۔

اگلے انبیاء اور تواضع | امام غزالی نے ایک حدیث نقل کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ "میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں، جو میری عظمت کے سامنے متواضع اور فروتر ہو، اور میری مخلوق پر اپنی عظمت کا اظہار نہ کرتا ہو"

حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ تواضع کرنے والوں کے لئے دنیا میں خوشخبری ہے، کہ وہ قیامت کے دن صاحب منبر ہوں گے[۳] یعنی قیامت میں ان کا مرتبہ بلند ہوگا،

حدیث نبوی میں تواضع کی تعلیم | اوپر ذکر آچکا ہے کہ تواضع، دنائت و پستی سے مختلف چیز ہے، دنائت سے انسان کے اندر گراوٹ پیدا ہوتی ہے، لیکن تواضع سے اس میں بلندی و رفعت پیدا ہوتی ہے، حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتا ہے[۴]

دوسری حدیث میں ہے "تواضع سے بندہ میں رفعت ہی پیدا ہوتی ہے"

ایک حدیث میں ہے کہ

تواضعوا وجالسوا المساکین تکونوا من کبراء اللہ وتخرجوا من الکبر[۱]	تواضع اختیار کرو اور غرباء کے ساتھ اٹھو بیٹھو، تو اللہ تعالیٰ کے کبراء میں ہو جاؤ گے (اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا) کہ کبر کے عیب سے پاک ہو جاؤ گے۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ غرباء و مساکین جنھیں سوسائٹی میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا ہے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی تواضع میں داخل ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ تم کبر و غرور جیسے مہلک عیب

---

[۱] مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۸۳ [۲] احیاء العلوم جلد ۳ ص [۳] ایضاً [۴] حلیۃ الاولیاء بحوالہ احیاء

سے پاک ہو جاؤگے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو لوگ بلند مرتبہ پائیں گے، ان میں تم بھی ہوگے،

یک دوسری حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہ اَوْحیٰ اِلیّ ان تواضعوا	اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے
حتّٰی لایفخر احد علی احد	کہ انکساری اور تواضع اختیار کرو تاکہ
وَلَا یبغی احد علی احد[1]	کوئی کسی پر ظلم یا فخر نہ کر سکے،

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظلم و زیادتی اور فخر و مباہات کا طریقہ تواضع و انکساری کے
ف ہے، اس لئے کہ اس طریقہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان کے حقوق کی پامالی اور اس کو
ر و ذلیل کرنے کا موقع ملتا ہے، اور تواضع کسی حال میں انسان کو اس قسم کا کوئی موقع دینا
ن چاہتی، چنانچہ ایک حدیث سے ان مذکورہ بالا باتوں کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے، وہ
یث یہ ہے،

عَلیکم بالتواضع فانّ التّواضع	تواضع کو اپنے اوپر لازم کرلو، اور تواضع
فی القلب ولا یؤذین مسلم	کی اصلی جگہ قلب میں ہے، اور اس کا
مُسلمًا فلرب متضاعف فی	تقاضا یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے
اطمار لو اقسم علی اللّٰہ	مسلمان کو تکلیف نہ دے، اس لئے کہ بہت سے
لابرّہٗ[2]	پھٹے پرانے کپڑوں میں رہنے والے ایسے
	ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کے اوپر بھروسہ
	کرکے قسم کھالیں، تو اللہ ان کی قسم کو

اس حدیث میں تین باتیں مذکور ہیں، (۱) تواضع کا تعلق قلب سے ہے، اس کا مطلب

---

[1] شریف بحوالہ مدارج السالکین [2] طبرانی بحوالہ جامع صغیر،

یہ ہے کہ صرف ظاہری طور پر انکساری کا اظہار کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ قلب میں بھی یہ کیفیت جاگزیں ہو، اسلئے کہ اگر قلب میں تواضع کی یہ کیفیت پورے طور پر نہ اتری ہوئی ہوگی، تو اس میں اخلاص نہیں ہوگا اور بغیر اخلاص کے کوئی عمل مقبول نہیں ہے (۲) اگر واقعی یہ کیفیت دل میں اتر گئی ہے تو اس کا مظاہرہ یہ ہے کہ اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے (۳) بہت سے پھٹے حال لوگ اللہ کے یہاں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں، اس لئے سوسائٹی کے معمولی سے معمولی آدمی کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے، اور نہ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرنا چاہئے، کیونکہ گو تواضع کا تعلق قلب سے ہے، لیکن دل کا حال اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کی ظاہری بدحالی تواضع اور انکسار کی وجہ سے ہو اور اس کے قلب میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو، اس لئے اس کی تحقیر خدا کی ناراضگی کا سبب ہوگی،

خلاصہ یہ ہے کہ تواضع اور انکسار کا تقاضا ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک روا رکھا جائے، اور دوسروں کی ظاہری پستی اور بدحالی سے کوئی غلط فائدہ اٹھا کے لڑائی کے اسلامی معیار اور معاشرتی تقاضوں کو نہ چھوڑ دیا جائے،

اسوۂ نبوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل آپ کی عملی زندگی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے،

امام ابن قیم نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع ہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑے سیتے اور جوتا گانٹھ لیتے تھے، اپنی بکریاں خود دوہتے تھے، راستے میں بچوں تک کو خود سلام کرتے تھے، گھر والوں کی ضروریات خود پوری کرتے تھے، معمولی سی معمولی بات کے لئے بھی کوئی بلاتا تو بلا تامل اس کی بات سن لیتے، اور اس کا جواب دیتے تھے، اپنے خادموں کے ساتھ کھانا کھاتے، اور غرباء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتے تھے، کبھی

کسی سے انتقام نہیں لیا، ہر شخص سے خندہ پیشانی اور نرم خوئی سے ملتے، آپ کی معاشرتی زندگی سے اور بہت سی مثالیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

کان متواضعا من غیر ذلۃ	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تواضع کسی ذلت، دبیتی یا احساس کمتری کی وجہ سے نہیں تھی،

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی تواضع وانکساری بھی باوقار رہتی، ایسا نہیں تھا، کہ دل میں کسی قسم کی گراوٹ پیدا ہو جائے، بہرحال تواضع وانکساری گراوٹ یا کسی جذبہ کمتری کی وجہ سے نہ ہونی چاہئے،

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے،

طوبیٰ لمن تواضع فی غیر منقصۃ وذل فی نفسہ (طبرانی وغیرہ)	خوشخبری ہو اس کے لئے جس نے بغیر کسی (اخلاقی) نقص اور بغیر کسی احساس کمتری کے تواضع وانکساری اختیار کی،

مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اپنی ذاتی کمزوری اور کمتری کی وجہ سے تواضع اختیار کرتے ہیں اُن کی کوئی تعریف نہیں ہے، بلکہ قابلِ ستایش وہ لوگ ہیں، جو اپنی اخلاقی خوبیوں اور ذاتی محاسن کے باوجود اختیاری طور پر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرتے ہیں،

صحابہ کرام اور تواضع | قرآن و حدیث اور اسوۂ نبوی کے تذکرے کے بعد ضروری ہے کہ صحابۂ کرام کے آثار اور ان کی معاشرتی زندگی سے بھی تواضع کی توضیح وتشریح کی جائے، اس لئے کہ اسلام جس طرح کا مثالی اور صالح معاشرہ بنانا چاہتا ہے اس کی صحیح نمایندگی صحابۂ کرام ہی کرتے ہیں،

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب بندہ تواضع کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی عقل و بصیرت میں

اضافہ کر دیتا ہے" حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا کے لئے انکساری کرتا ہے، قیامت کے دن خدا تعالیٰ اس کا درجہ بلند کر دے گا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں لوگ ایک بہت افضل عبادت سے غفلت برتتے ہیں، وہ عبادت تواضع ہے۔[۵۱]

عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کو ایک بار دیکھا کہ وہ پانی کا مشکیزہ اپنے کندھے پر رکھے ہوئے جا رہے ہیں، میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ امیر المومنین ہیں آپ کے لئے یہ زیبا نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب میرے پاس وفود اطاعت و فرمانبرداری کی خبریں لے کر آتے ہیں تو اس کی وجہ سے میرے نفس میں ایک قسم کی نخوت پیدا ہو جاتی ہے، تو میں نے چاہا کہ اس طرح سے نفس کے کبر کو توڑ دوں"، ظاہر ہے کہ تواضع کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ نفس میں کبر و نخوت نہ رہنے پائے،

ایک بار حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے درمیان کچھ کپڑے تقسیم کئے، ان میں سے ایک قیمتی جوڑا حضرت معاذؓ کے پاس بھی بھجوا دیا، حضرت معاذؓ نے اسے فروخت کر کے کچھ غلام خریدے، اور انھیں آزاد کر دیا حضرت عمرؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک دوسرا جوڑا اُن کے پاس بھجوایا، حضرت معاذؓ کو یہ بات ناپسند ہوئی اور انھوں نے حضرت عمرؓ پر خفگی کا اظہار کیا، حضرت عمرؓ نے اُن سے فرمایا کہ چونکہ آپ نے پہلا جوڑا فروخت کر دیا تھا اسلئے میں نے دوسرا بھجوایا، حضرت معاذؓ نے فرمایا جب آپ میرا حصہ دے چکے تھے، تو آپ پر کیا ذمہ داری تھی، اس کے بعد انھوں نے بڑے سخت لہجے میں فرمایا کہ میں نے قسم کھا لی ہے کہ میں اُس کو آپکے سر پر پٹک دوں، حضرت عمرؓ نے نہایت ہی انکساری سے فرمایا کہ میرا سر حاضر ہے۔[۵۲]

---

۵۱ احیاء العلوم ج ۳ ص ۳۳۲،

۵۲ مدارج السالکین ج ۲ ص ۱۰۵،

ایک بار حضرت زید بن ثابتؓ گھوڑے پر سوار ہوئے، حضرت ابن عباسؓ بڑھے کہ رکاب تھام لین، حضرت زیدؓ نے منع کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہمین اپنے بڑون کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زیدؓ نے اُن سے کہا کہ اپنا ہاتھ لاؤ، انھون نے ہاتھ بڑھایا تو حضرت زیدؓ نے اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور فرمایا کہ ہم کو اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

ایک بار حضرت ابوذرؓ نے حضرت بلالؓ کو سیاہ فام کہدیا، حضرت بلالؓ تو کچھ نہین بولے، لیکن بعد مین حضرت ابوذرؓ کو ندامت ہوئی، اور انھون نے اپنے کو حضرت بلالؓ کے سامنے ڈال دیا، اور قسم کھائی کہ جب تک بلالؓ میرے چہرے پر اپنا پاؤن نہ رکھدین گے، مین اپنا چہرہ نہ اٹھاؤن گا[1]

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ شرافت و بلندی تواضع مین ہے،

یہ تمام واقعات امام ابن قیمؒ اور امام غزالیؒ نے تواضع کی تشریح کرتے ہوئے لکھے ہین،

صوفیائے کرام اور تواضع اوپر لکھا جا چکا ہے کہ تواضع کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کی فرمانبرداری اور اس کی رضا جوئی کی ایسی تڑپ پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کے تمام شعبون مین اور خصوصیت سے اپنی معاشرتی زندگی مین کوئی ایسی روش اختیار نہ کرے جو اس کی عبدیت کے منشا کے منافی ہو، پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تواضع افراط و تفریط کے درمیان کی راہ ہے، اس لئے اس راہ پر چلنے کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اگر وہ افراط کی طرف بڑھا تو گویا اس نے خدا سے بغاوت کی، اور اگر تفریط اختیار کی، تو اُس نے خود اپنے کو ذلیل و خوار کیا،

---

[1] مدارج السالکین جلد ۲ ص ۱۰۵،

صوفیائے کرام نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ تواضع کی یہ وسیع تشریح کی ہے، فضیل ابن عیاضؒ نے تواضع کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: "تواضع یہ ہے کہ حق کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ"۔ ابن عطاؒ نے فرمایا: "تواضع یہ ہے کہ حق جس سے بھی معلوم ہو جائے اُسے قبول کر لیا جائے"۔

یوسف بن اسباطؒ نے فرمایا: "تھوڑی سی تواضع بہت سی کوششوں کے برابر ہے" ایک بار ابن سماکؒ نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المومنین تواضع اس مرتبۂ خلافت سے زیادہ بلند ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں تواضع یہ ہے کہ جب تم اپنے گھر سے نکلو تو جس مسلمان سے بھی ملو اس کو اپنے سے افضل سمجھو۔ زیاد نمیری کا قول ہے کہ غیر متواضع زاہد اس درخت کے مانند ہے جس میں پھل نہیں آتا۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "تواضع یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی قیمت نہ سمجھے" عروہ ابن الوردؒ نے فرمایا کہ تواضع شرف و بزرگی کی شکارگاہ ہے، ہر نعمت پر حسد کیا جاسکتا ہے لیکن تواضع ایسی نعمت ہے کہ اس پر حسد نہیں کیا جا سکتا، عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا ہے کہ اصل تواضع یہ ہے کہ جو لوگ تم سے کم درجہ کے ہیں، اُن کے سامنے اپنے کو اس طرح گراؤ کہ وہ یہ سمجھیں کہ دنیا میں تم کو اُن ... پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اور جو لوگ تم سے اونچے درجے کے ہیں ان کے سامنے اس طرح خوددار رہو کہ وہ یہ سمجھیں کہ دنیا میں ان کو تمھارے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یحییٰ بن خالد برمکی کا قول ہے کہ شریف آدمی جب زہد اختیار کرتا ہے، تو وہ متواضع اور منکسر ہو جاتا ہے، اور جب کمینہ آدمی زاہد ہوتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو حسن و جمال یا مال و دولت کی نعمت دے اور وہ منکسر

۱؎ مدارج السالکین ص۱۸۵،

نہ ہو تو اس کے لئے یہ نعمت وبال ہے"

شیخ اسمٰعیل ہرویؒ نے منازل السائرین میں لکھا ہے کہ

التواضع ان یتواضع العبد لصولتہ الحق،	تواضع یہ ہے کہ بندہ خدا کی صولت و کبریائی کے آگے جھک جائے،

امام ابن قیمؒ نے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ خدا کی مرضی کے آگے اپنے کو اس طرح ڈال دے اور اس کا ایسا ... فرمانبردار اور منقاد ہو جائے جس طرح ایک غلام اپنے آقا کا فرمانبردار اور مطیع ہوتا ہے، جب ایک عبد میں اپنے معبود کے ساتھ یہ تعلق اور اس کی رضا کا یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تب وہ تواضع کی صفت سے متصف ہو سکتا ہے"

شیخ ہرویؒ نے تواضع کے تین درجے قرار دیئے ہیں، پہلا درجہ التواضع للدین، تواضع للدین یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ منقول ہے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنا نصب العین بنا لیا جائے، اور جو چیز بھی اس سے ٹکراتی ہو، اس کو چھوڑ دیا جائے، امام ابن قیمؒ نے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں چار چیزوں کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے تعارض پیدا کیا گیا ہے معقول، قیاس، ذوق، اور سیاست،

معقولات کا طریقہ فلاسفہ و متکلمین نے اختیار کیا کہ جب عقل و نقل کا مقابلہ آ گیا تو یا تو انھوں نے عقل (جو ہر طرح سے ناقص ہے) کو نقل پر ترجیح دی، یا پھر نقل میں غلط قسم کی تاویلات کر کے اس کو عقل پر منطبق کرنے کی کوشش کی،

دوسرا طریقہ یعنی قیاس تھا اس کو بعض فقہائے نے اختیار کیا کہ جب نص اور قیاس کا اجتماع ہوا تو انھوں نے قیاس کو نص کے مقابلہ میں ترجیح دی اور نص میں موشگافی کی،

تیسرا طریقہ ذوق و وجدان کا ہے، اسے اہل تصوف نے اختیار کیا ہے اس کا منشاء

آج بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے شریعت کے صریح احکام رکھدیجئے، لیکن وہ اپنے ذوق و وجدان اور ملفوظات شیخ کے مقابلہ مین اس کو کبھی قبول نہین کرین گے)

چوتھا طریقہ اہلِ سیاست کا ہے کہ جہان شریعت و سیاست کا مقابلہ آجاتا ہے، اہلِ سیاست شریعت کے احکام کو "سیاسی مصلحت مین" غدر بود کرنے کی کوشش کرتے ہین (آج ساری دنیا کے مسلمان اسی مرض مین مبتلا ہین، ان کے دل و دماغ مین موجودہ مادی سیاست نے اس قدر جگہ پکڑ لی ہے کہ ان کو اگر اسلامی زندگی کی طرف بلائیے تو فوراً وہ جواب دین گے کہ یہ زمانہ اسلامی نظام کا نہین ہے، اس وقت تو مادی سیاست کا ہمین مقابلہ کرنا ہے، اس لئے ہمین اپنی زندگی کے بقا کے لئے اس طرز کو اختیار کرنا ہے) اس تفصیل کے بعد امام ابن قیمؒ لکھتے ہین، ان تمام گروہون کا شمار اہل کبر مین ہے اسلئے کہ یہ خدا کے احکام کے مقابلہ مین ان مذکورۂ بالا چیزون کو ترجیح دیتے ہین، تو وہ گویا اس کی کبریائی کا مقابلہ کر رہے ہین، تواضع للدّین ان تمام قیود کے توڑ دینے کا نام ہے

تواضع کا دوسرا درجہ شیخ نے یہ قرار دیا ہے،

ان ترضی بما رضی الحق به لنفسه عبدا من المسلمین اخا وان لا ترد علی عدوك حقا وتقبل من المعتذر معاذیرہ،

امام ابن قیم فرماتے ہین کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانون کو اپنا بندہ بنانا پسند کیا ہے، اس لئے وہ تمام آپس مین بھائی بھائی ہون، اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ خود بھی تمام مسلمانون کو اپنا بھائی سمجھے، یعنی ان سے بھائیون جیسا برتاؤ کرے، اور اپنے دشمنون کے حق کو بھی رد نہ کرے یعنی اگر اس کا کوئی حق ہو

شیخ نے تیسرا درجہ یہ قرار دیا ہے کہ

ان تتضع للحق فتنزل عن	حق کے سامنے اپنے کو بالکل ڈال دے اور
مالك وعوائدك فی الخدمة	پھر اپنی رائے اور طبعی موانع سے دست
	بردار ہو کر اس کی خدمت میں لگ جائے

امام ابن قیمؒ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

التواضع بان تخدم الحق سبحانه	تواضع یہ ہے کہ اللہ کی عبدیت اور
وتعبده بما امرك به علیٰ مقتضیٰ	اس کی بندگی یہ سمجھ کر کرنا کہ اس کا حکم
امره لا علیٰ ما تراه من رایك	اور عبدیت کا تقاضا یہی ہے، نہ یہ کہ
ولا یکون الباعث لك داعی	تمھاری رائے یا تمھاری عادت و
العادة،	طبیعت اس کا سبب ہو،
وحاصله انه لا یکون باعثه	حاصل یہ کہ اس کی عبودیت اور طاعت
علی العبودیة مجرد رای و	کا باعث صرف رائے خواہش نفس یا
موافقة هوی ومحبة ولا	محبت و عادت ہو، بلکہ اس کا سبب
عادة بل الباعث مجرد الامر	محض امر خداوندی ہو،
والرای والمحبة والهوی	رائے محبت، اور خواہش و عادات
والعوائد منفذة تابعة لا	یہ سب اطاعت کے تابع ہیں، نہ یہ
انها طاعة باعثة،	کہ وہ اس کا سبب ہیں،

اتنی تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ اس نکتہ سے اہل بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں،

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی تفصیل سے تواضع کے متعلق لکھا ہے، آخر میں انھوں نے

جو قیمتی باتین لکھی ہین، اس کا خلاصہ یہان پیش کیا جاتا ہے،

"جاننا چاہئے کہ تمام اسلامی اخلاق کی طرح تواضع کے بھی دو طرف (کنارے) اور ایک وسط ہے، اس کا ایک طرف زیادتی (تفریط) کی طرف جھکا ہوا ہے، جس کا نام تکبر ہے، اور دوسرا نقصان (تفریط) کی طرف، اس کا نام ذلت و پستی اور دنیا و چاپلوسی ہے، اور ان دونون کے درمیان جو چیز ہے، اسی کا نام تواضع ہے، چونکہ ہر کام مین اللہ تعالیٰ عدل اور وسط کو پسند کرتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ تواضع پسندیدہ چیز ہے، لیکن محمود تواضع وہی ہے، جس مین گراوٹ، کمینگی، نہ پیدا ہونے پائے،

"اپنے برابری کے لوگون سے تواضع اس طرح کی جائے، کہ ان کے جو حقوق ہین، ان کو ادا کیا جائے، اسی طرح عام لوگون کے ساتھ تواضع یہ ہے کہ ان سے خندہ پیشانی سے ملا جائے، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے، اگر وہ کسی ضرورت کے لئے بلائین، تو ان کی بات سن کر ان کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی جائے، اور ان کے علاوہ اور جو معاشرتی امور ہین، ان مین ان کا لحاظ کیا جائے، پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی وقت ان کو ذلیل، چھوٹا اور اپنے کو ان سے بہتر و برتر نہ سمجھا جائے، پھر تواضع کا یہ بلند مرتبہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب یہ تمام افعال بغیر کسی تکلف اور کوشش کے صادر ہون اور ان کے کرنے مین طبیعت پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہو اور نہ اس مین کسی کی رعایت اور دیا شامل ہو، اس لئے کہ اگر کسی کی قدر و منزلت کی رعایت یا ریا کی وجہ سے تواضع کیجائے گی تو اس مین تملق اور گراوٹ پیدا ہو جائیگی اور یہ چیز تفریط کی طرف لیجائیگی اور ظاہر ہے کہ کسی مومن کے لئے یہ بالکل زیبا نہین ہے کہ وہ اپنے کو ذلیل و خوار کرے، اگر کبھی اس کی ذلت کا موقع آجاتی، تو اسے چاہئے کہ وہ ایسے موقع پر اپنے کو بلند رکھنے کی کوشش کرے،

اخلاق ہندی

کا

ایک نادر اڈیشن اور پامر کا اردو قصیدہ

از جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

(۲)

اڈورڈ ہنری پامر کا نام مشہور مستشرق کی حیثیت سے جانا پہچانا ہوا ہے، انگریز قوم کی جوانی کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا، اٹھارہوین صدی کے انگریز کو دیکھئے، سر سے پیر تک ایک بجلی، پوری قوم مین ایک سیماب وشی تھی کہ طاری تھی زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالئے، لوگ کام کرتے نہین معجزے دکھاتے نظر آتے ہین، کیا سیر و سفر کی دنیا، کیا تلاش و جستجو کا میدان، کیا سیاست اور ملک گیری کی بساط، کیا تحقیق و تدقیق کا عالم، کیا سائنس کی تجربہ گاہ، کیا علوم و فنون کی کارگاہ، اور کیا تاریخ، ادب اور لسانیات کی بارگاہ، جدھر نظر ڈالئے آپ کو معمولی انسان نہین، بڑے بڑے دیو دکھائی دینگے، اُن کے کارنامے پڑھئے اور سر دھنئے، یقین نہین آتا کہ ایک معمولی انسان سے ایسی کرامتون کا ظہور کیسے ہوسکتا ہے، ادب اور لسانیات کی دنیا کا ایک ایسا ہی صاحب کرامت انسان اڈورڈ پامر بھی تھا، انگلستان نے سولہوین صدی سے لیکر اب تک جتنے مستشرق پیدا کئے ہین ان مین غالباً پامر کے حالات زندگی سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ دلکش ہین، تفصیلی حالات تو رام بابو سکسینہ کی کتاب یورپین اور ہندیورپین شعرائے اردو و فارسی، برنارڈ لوئس کی کتاب انگلستان اور عربی علوم و فنون اور تھر چے آربری کی کتاب انگلستان اور فارسی علوم و فنون اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مین

دیکھئے، یہان مختصر طور پر آشنائی لیجئے کہ اڈورڈ ہنری پامر، ۷ اگست ۱۸۴۰ء کو کیمبرج مین پیدا ہوا،
اس کا باپ ولیم ہنری پامر ایک خانگی مدرسہ چلایا کرتا تھا، اور اسی مدرسے کی قلیل آمدنی پر اس کی
زندگی کا مدار تھا، ابھی پامر کمسن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور وہ کچھ دن کیمبرج
مین بسر کرکے لندن چلا آیا، یہان ایک شراب خانے مین ملازم ہو گیا، اس وقت اس کی عمر سولہ
سال سے زیادہ نہ تھی، پامر زبانین سیکھنے کا فطری ذوق لے کر آیا تھا، شراب خانے مین مختلف
زبانین بولنے والی قومون کے جو لوگ آتے، اُن کی باتین سُن سُن کر اُس نے کئی زبانین سیکھ لین، اور
اطالوی اور فرانسیسی بہت اچھی طرح بولنے لگا،

شراب خانے کی ملازمت کے دوران مین پامر شش کے کسی مرض مین مبتلا ہو گیا، اس لئے
علاج کے لئے لندن سے کیمبرج چلا آیا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس مرض سے اس کی جان نہ بچ سکیگی
لیکن کیمبرج آنے کے بعد اسے غیر متوقع طور پر صحت ہو گئی،

کیمبرج کے قیام کے دوران مین پامر کی ملاقات ہمارے سید عبداللہ صاحب سے ہوئی، اور
ملاقات نے دوستی کی شکل اختیار کر لی، اُن کی دوستی سے پامر کو مشرقی زبانین سیکھنے کا شوق ہوا،
اور کچھ ہی دنون مین اس نے عربی، فارسی، اور اردو مین اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی، ۱۸۶۷ء
مین اُس نے بی اے، اور پھر ۱۸۷۰ء مین ایم اے کے امتحان پاس کئے، اس دوران مین اس نے کنگس
ٹرنٹی کالج کیمبرج کے کتب خانے کے عربی، فارسی، اور ترکی مخطوطات کی ایک فہرست مرتب
کی، اس دوران مین اس کے قلم سے اردو مین مضامین بھی نکلتے، اور لکھنؤ کے اودھ
اخبار مین چھپتے رہے، جب مشرقی زبانون مین اس کی مہارت کی شہرت پھیلی، تو ۱۸۶۷ء
مین سینٹ جان کالج کیمبرج نے اسے اپنا فیلو بنا لیا، ۱۸۶۹ء مین اس نے دو مرتبہ مشرق
قریب کا سفر کیا، اور عربی روزمرہ اور عربی تمدن کا گہرا مطالعہ کیا، ان ملکون کے عربون مین

وہ اتنا گھلا ملا کہ ان میں شیخ عبد اللہ کے نام سے شہرت پائی یہاں سے انگلستان واپس آیا تو
جامعہ کیمبرج نے اسے عربی کا پروفیسر مقرر کیا، اس زمانہ مین اُس نے کئی اہم کتابین لکھین ۱۸۸۲ء
مین اُس نے مصر کا سفر کیا، اور حکومت انگلستان کے ایک مشن پر روانہ ہوا، صحرا سے واپس آرہا
تھا کہ چند لیٹرے بدوؤن نے قتل کر ڈالا، قتل کے وقت اس کی عمر (۴۲) سال سے زیادہ نہ تھی
مصر سے اس کی لاش انگلستان لائی گئی، اور پورے اعزاز کے ساتھ سینٹ پال کلیسا مین دفن کیا گیا،
یورپ کے مستشرقون مین شاید پامر ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بیک وقت مشرق
کی تین زبانون پر عبور رکھتا تھا، اور تینون مین نظم و نثر لکھنے پر قادر تھا، اُس نے ہندوستان
کی صورت تک نہین دیکھی، لیکن اس کی اردو غزلین اور اردو مضامین لکھنؤ کے اودھ اخبار اور
دوسرے رسالون مین چھپتے رہے، اور اس زمانہ کے اہل زبان شاعرون کی غزلون اور ان کے
مضامین سے کسی طرح ہیٹے نہین تھے، اُس نے ایران کا کبھی رُخ بھی نہین کیا، لیکن حافظ اور
سعدی کی غزلون پر اس کی غزلین اس کی فارسی دانی کی شاہد ہین، عربی سے اس کے شغف کا
یہ حال تھا کہ دوسرے مستشرقون کی طرح اُس نے عربی زبان کو صرف علمی حیثیت سے حاصل
کرنے پر اکتفا نہین کیا، بلکہ عرب قوم اور عربی زبان کی روح کی گہرائیون تک پہنچنے کی کوشش
کی، اس کا شمار بقول برنارڈ لوئس یورپ کے ان چند گنے چنے اہل علم مین ہے، جو مشرقی زبانون
کو صحت روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے، اس کی اردو تحریرین ہندوستان مین بہت مقبول ہوئین، اُس نے
انگلستان مین شاہ ایران کی سیاحت پر جو مضمون اردو زبان مین لکھا، وہ اردو ادب مین بہت
اہم خیال کیا جاتا ہے، اس سلسلہ مین یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ وہ اکثر عربی علوم
کے ماہرون کو انگریزی مین بھی خطوط لکھتے وقت محسوس کرتا تھا کہ وہ انگریزی مین اپنے خیالات
ادا نہین کر سکتا، اور بے اختیار عربی لکھنے لگتا تھا، اس کے ایک دوست اور رفیق کار جی، ایف

نکل نے جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا، لکھا ہے کہ

"اس کے خطوں سے جو اُس نے مجھے انگریزی میں لکھے اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے انگریزی میں اظہار خیال کرنے میں الجھن سی محسوس ہوتی تھی، کبھی کبھی وہ فوری جذبات سے متاثر ہو کر یا نقد و تبصرے کے وقت یک بیک عربی یا فارسی نظم و نثر لکھنے پر اتر آتا تھا"

پامر نے ارسطو جاہ کے نام اردو میں کئی خط لکھے ہیں، ایک خط میں اُس نے اپنی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، لکھتا ہے:

"میں سول سروس کے ملازم کی حیثیت سے آج سے سات سال پہلے ہی ہندوستان چلا گیا ہوتا، لیکن ہندوستان میں سول سروس کے ملازموں کے ظالمانہ طرزِ عمل کا حال سننے کے بعد میں نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، میں نے لاطینی اور یونانی سیکھی ہے، میں نے فلسفہ منطق اور ریاضی کا مطالعہ کیا ہے، اور ان کی سندیں حاصل کی ہیں، میں نے سید عبداللہ سے تعلیم حاصل کی ہے، اور لندن میں قرآن شریف حفظ کیا ہے، خدارا مجھے ان یورپ والوں میں شمار نہ کیجئے، جو فاقوں کے مارے ہوتے ہیں، اور روٹی کی تلاش میں ہندوستان آتے ہیں"

پامر نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے اُس نے مشہور مصری شاعر بہاء الدین زہیر کا پورا کلام انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، اور اس پر مقدمہ اور حواشی لکھے، اس کے ایک سال بعد اُس نے انگریزی میں عربی صرف و نحو پر ایک کتاب شائع کی، کلام اللہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو مشرق کی مقدس کتابوں کے سلسلہ میں شائع ہوا، بہت مقبول ہوا، انگریزی زبان میں خلیفہ ہارون الرشید کی ایک دلکش سوانح حیات بھی لکھی،

تھامس مور کی مشہور نظم لالہ رُخ کا عربی مین ترجمہ کیا، مشرقی تصوف کے نام سے انگریزی مین عزیز نفیسی کی کتاب مقاصد اقصیٰ کا ترجمہ کیا، عربی اور فارسی شاعری کے انتخابات کا ایک مجموعہ انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، تاریخ بیت المقدس کے نام سے بیت المقدس کی تاریخ لکھی، ان کے سوا انگریزی اور فارسی کا ایک لغت تیار کیا جو بہت مشہور ہوا اور کئی بار چھپا،

پامر عربی فارسی اور اردو مین شعر کہتا تھا، اس کا کوئی دیوان شائع نہین ہوا، اس کی اردو اور فارسی غزلین اور فارسی نثر کے نمونے صاحب تذکرہ انڈو یورپین شعرائے اردو و فارسی نے نقل کئے ہین، لیکن اس کتاب مین یعنی اخلاق ہندی کے اس اڈیشن مین جو طویل اردو قصیدہ اور عربی کلام پامر کا درج ہے، وہ کہین اور میری نظر سے نہین گذرا، اس لحاظ سے اس نسخہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، پورا قصیدہ تو آگے آرہا ہے، یہان پامر کی ایک غزل کے دو چار شعر سُن لیجئے،

جان لب پہ آن پہنچی دلدار گھر نہ آیا	ہم جا چکے جہان سے پر وہ ادھر نہ آیا
دعویٰ مقابلہ کا تھا سب بتون کو لیکن	جب سامنے ہوا وہ کوئی نظر نہ آیا
پامر سا اک نصارا تھا بے گناہ مارا	اے بُت خدا کا تجھکو ذرہ بھی ڈر نہ آیا

فغان اس درپہ ہرگز تو ای دل رنجور مت کیجو	بتون کے شہر مین عاشق مجھ مشہور مت کیجو
قسم ہے تجھ کو اپنے دین اور ایمان کی محرم[1]	ہماری ان کی صحبت کا کہین مذکور مت کیجو
ہزارون آئینے تو توڑتا پتھر سے ای ظالم	ہماری اُن کی صحبت کا کہین[2] مذکور مت کیجو

---

[1] شاعر نے غالباً یہ کہا ہوگا، قسم ہو تجھ کو اپنے دین و ایمان کی تو اے محرم، کاتب سے تو چھوٹ گیا، (مولانا عبدالماجد کا ایک نوٹ) [2] معارف غالباً مضمون نگار نے سہو قلم سے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ اس شعر مین مکرر لکھ دیا ہے،

بقول مولانا عبدالماجد دریابادی متروک لفظون اور ترکیبون سے اور پہلی غزل کے غلط در غلط مقطع سے اگر قطع نظر کرلی جائے، تو یہ نمونہ کلام کا کچھ ایسا برا نہین خصوصاً یہ آخری شعر تو خالص ہندستانی سانچے مین ڈھلا ہوا معلوم ہو رہا ہے، اور پھر شاعر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلون کی پیروی کرتا ہے، اس لئے متروک لفظون اور ترکیبون کا قضیہ اٹھ جاتا ہے۔

اب پامر صاحب کا وہ قصیدہ ملاحظہ ہو جو اخلاق ہندی کے اس اڈیشن مین مرتب کتاب سید عبداللہ نے شامل کیا ہے، اور کسی اور جگہ شائع نہین ہوا ہے،

قصیدہ

چونکہ ہے حمد خدا تاج سر نطق و بیان ۔۔۔ چتر نعت عیسی گردون نشین ہو سایبان

کیا عجب برسائے اختر کے جواہر آسمان ۔۔۔ کہکشان کے جوہری، بازار سے ہو شادمان

مورچھل طاؤس لائے اور کلغی خود ہما ۔۔۔ دیوے زر گل کی بنا پوشاک، پر زر بوستان

بو تلین غنچے بنین، گلہائے گلشن ہون گلاب ۔۔۔ اور گلابی ہوئی بس رنگ بہار بوستان

شاہد ناز چمن رقاص ہو کر آئین پھر ۔۔۔ دے انھین نقد ثریا کا وہ جھومر آسمان

سب جوانان چمن گائین بجائین پیش گل ۔۔۔ نغمۂ بلبل کو سن چکر مین آئے باغبان

یون صدا نکلی بہم مل کر بجائین ساز جب ۔۔۔ دھوم در پہ دھوم در پہ در پہ تیری شادیان

کہکشان تو ہو سڑک ذرات تابان ہون نجوم ۔۔۔ روشنی مین اس پہ سیارون کی دوڑین گھیان

آسمان بنجائے پل خورشید و مہ ہون لال ٹین ۔۔۔ اور بجائے سلسلہ تار شعاعی ہون عیان

چرخ بن جائے عماری برق تابان جھول ہو ۔۔۔ فیل ہو ابر سیہ اور رعد ہو وے فیلبان

دُھن مین مستی کی ہوا پر جب چلے وہ جھوم جھوم ۔۔۔ موج دریا اس کی بیڑی ہو قدم کوہ کلان

ہم رکاب ابلق دوران ہو یہ سارا جلوس ۔۔۔ اور سواری مین مرے ممدوح کی ہووے روان

کون ہے وہ صاحبِ اقبال و عزت نارتھ کورٹ — رائٹ آنربل سر اسٹافورڈ ممدوحِ زمان

خاص خاصِ ملکۂ عالم کوین وکٹوریہ — جس کے ہے زیرِ قلم انگلینڈ اور ہندوستان

گرچہ ہے بلقیس لیکن ہے سلیمانی اُسے — زیرِ سایہ جس کے ہے عنقا ڈھونڈھتا آشیان

وہ سکندر ہے فلاطون وہ سلیمانِ زمین — آصفِ عہد اس کو کہئے بلکہ ہیں بھولا بیان

وہ شنیدہ ہیں یہ دیدہ اس کا ہے یہ اقتدار — سر جھکاتے ہیں والیِ چین و ختن آکر جہان

ہر حباب بحر سے ہے بس عیان انکا شمار — ہفت کشور میں بنی ہیں اس کی اتنی کوٹھیان

شغل ہے اس کے جوانوں کا یہی روزِ مصاف — توپ زنبورک جزائر ہکلہ بندوق بان[1]

بادپا ہیں پر لگائے پھرتے ہیں اس کے سوار — بانک برچھی تیر و شمشیر و سپر ترکش کمان

اس کی وہ سنگین ہے سنگین دل ہوں جس سے موم — کرچ اسکی کرچیں کرتی ہے عدو کے استخوان

ملکۂ کشور ترے سر پر رہے ظلِ اللہ — خیر خواہِ ہند تیرا لطفِ حق ہو پاسبان

ہے لبیبِ خامہ اس گلشن سے کھلا نغمہ سنج — اور شاخِ مدعا پر بیٹھ کر ہے سجع خوان

نسخۂ منشی تاج الدین مفرح القلوب — در ہزار و ہشت صد سن و سالِ عیسیٰ

یک ہزار و دو صد و بیست تھے سالِ ہجری — جس میں ایک عالم ہوا ہندی میں اسکا ترجمان

نام نامی ہے مترجم کا بہادر علی — ترجمے کا نام ہے اخلاقِ ہندی بے گمان

مطبع مطبوع طبع اہلِ علم و فضل میں — جس کے مالک ڈبلیو ایچ ایلن اینڈ کو صاحبان

کارخانہ جن کا ہے واقع یہ واٹر لو پلیس — سیزدہ نمبر بابِ شہر لندن ہے دکان

---

[1] اس مصرع کا انگریزی ترجمہ کیا ہے،

With guns, muskets batteries, mortars can nons. artilary rockets.

اس کی ہر کاپی سی کا پنو ہاتھ بس بہزاد کا — اس کے ہر گل سی ہووے گل نقشۂ ارژنگیان
اس کو چھپوایا بصحت میر عبداللہ نے — میرے مخدوم و مکرم میرے مشفق مہربان
حضرت سید محمد خان بہادر کے پسر — نام نامی جن کا ہے ممدوح و مشہور جہان
محسن اس احقر کے تھے وہ سید عالی مقام — داغ جن کا ہر دو ون پر خود بہ گلزار جنان
چھپ چکی جس دم کتاب انتخاب لاجواب — تازگی بخش عیون اہل فطنت نکتہ دان
اس کا ہر صفحہ خیابان ہر روش بین السطور — ہر ورق گل زار معنی وہ گلستان بوستان
جلد سال طبع لکھ اڈور ڈ ہنری پالمر — تاکہ ہجری عیسوی دونوں کا ثابت ہوں نشان

یک ہزار و ہشت صد او شصت و ہشت عیسوی

یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلمان

سیرۃ النبی جلد دوم

(طبع چہارم)

اس میں اقامت امن، تاسیس خلافت، تکمیل شریعت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات و اخلاق و عادات کا مفصل بیان ہے،

ضخامت :- صفحے،

قیمت :- روپیے

منیجر

کتبات حصن غراب

از

جناب مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے معارف مین حصن غراب کے ایک کتبہ کی قرأت پر فارسٹر سے اختلاف ظاہر کرچکا ہون، ناظرین کو غالبًا یہ جاننے کی خواہش ہوگی کہ پادری صاحب کی قرأت کو غلط باور کرنے کے اسباب کیا ہین؟ جس بات سے پہلے پہلے مجھے اُن کی قرأت ناقابلِ اعتماد معلوم ہوئی، وہ اُن کا تبصرہ ہے جو دی ہسٹاریکل جیاگرفی آف عربیا مین حصن غراب کی دہ سطری کتبہ کی چھٹی سطر پر انھون نے کیا ہے!

"کتبہ کی چھٹی سطر کا خاتمہ دوگونہ اہم ہے، ایک طرف اس سے مقامی طور پر قرآن کے جھوٹے افسانہ کا پردہ فاش ہوتا ہے، دوسری طرف ان بنیادون کا فریب ظاہر ہوتا ہے، جن کی بناپر عیسائی مناظرین نے محمد اور اُن کے تصنع پر بارہا اعتراضات کئے ہین، ہود (یعنی توراتی عابر) کو خود اُن کی غالبًا دسوین پشت کی اولاد کے پاس پیغمبر بناکر بھیجنے کی بجائے جیساکہ قرآن مین جھوٹ مذکور ہے، اس کتبہ مین عاد کا شاعر ہم کو خبر دیتا ہے کہ دین صحیح کی تعلیم ان کو خود عابر نے نہین دی تھی، البتہ طوفان کے بعد ان بزرگوار نے جن امور کی تعلیم اپنے ہم عصرون کو دی تھی، انھین قانون بناکر عاد کے بادشاہون نے نافذ کیا۔

(دی ہسٹاریکل جیاگرفی آف عربیا ج ۲ ص ۹۴ و ۹۳ مین)

حضرت ہودؑ کو عیسائی مناظرین کے اصرار کی بنا پر جناب عابر قرار دیا، پھر خود اس بات پر اصرار کیا ہے کہ عاد کی بابت عربوں کی روایات کو قرآن کا افسانہ قرار دے کر مسترد کر دینا، اور قرآن کے عاد اور بطلیموس کے Oaditae کو عادہ بنت ایلون حتی والدہ الیفز بن عیسو کی نسل قرار دینا چاہیے، (جلد ۲ ص ۳۲) اس پیہم اصرار نے حضرت ہودؑ کو عاد کی دس پشت اوپر کا مورث بنا دیا، حالانکہ قرآن حضرت ہودؑ کو عاد کا بھائی کہتا ہے، اس کے باوجود پادری صاحب کی دیانت اس جھوٹ کا الزام قرآن پر لگاتی ہے، اور اس جھوٹ کا پردہ کتبہ حصن غراب کی مصنوعی قرأت کے زور سے فاش کرتی ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں:

"پھر یہ کہ ہود کی بجائے جو کہ نصرانی مناظرون کے اصرار پیہم کے مطابق قوماتی عابر کے پیٹریارکل نام کی خرابی ہے، اور اس خرابی کی ذمہ داری خود محمد پر عائد ہوتی ہے، اس کتبہ مین اس مورث کا عربی نام ملتا ہے، جو سنشہ طوفان مین رائج تھا، (ص ۳۶۳ مین) اس نام کی املا ہے ا ہ (ل ل) عربی نام اود (Awad) کی ایک شکل منزد کے کے مطابق جو کہ مشرک عربون کا ایک معبود تھا، جس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ود پرستی کا آغاز تعظیم عابر سے ہوا، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر (سیل کے بیان کے مطابق) ماقبل طوفان کے بت تھے، جن کے خلاف نوح نے وعظ و پند فرمایا تھا، بعد مین عربون نے بھی ان کو پوجنا شروع کیا، یہ پرانے زمانہ کے صالحین تھے، جن کے اسٹیچو ان کی مجلسی عزت افزائی کے لئے بنائے گئے تھے، بعد مین یہ عزت افزائی پرستش بن گئی،

(ایضاً ص ۳۰۴ حاشیہ)

پادری صاحب نے (ج ۲ ص ۲۰۲ و ص ۲۰۳) ا ہ کو شخنز کا حرف سوم اور ا ہ اود) کو ہوز کا حرف سوم بتایا ہے، اور حسب موقع اسے ص ص ش بھی پڑھا ہے، ا ہ کو خود اپنی بتائی ہوئی

آوازوں کے مطابق اتنا یا وزن پڑھنا چاہئے تھا، مگر اسے وہ ابرا دو پڑھ کر اس نام کو بگاڑ کے یہ دیتا ہے کہ الزام حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد کیا، یہ تبصرہ دیکھ کر قدرتی طور پر اس کی قرأت کو پرکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

پادری صاحب نے اس کتبہ کی قرأت تصنیف کرنے کے لئے اپنے سامنے ایک کتبہ کے قدیم منظوم ترجمہ کو سامنے رکھا ہے، اس نظم کا ایک مصرع ہے،

ع ونومن بالآیات والبعث والبشر

اس مصرعہ کو انھوں نے کتبہ کی ساتویں سطر کی حسب ذیل عبارت کا ترجمہ قرار دیا ہے،

[illegible]

ودن شرک خب و ودرک خب و شرق خب و منحز خب

عبارت نقل کرتے وقت وہ نقوش جن پر ⊙ بنا ہوا ہے، پادری صاحب نے اپنی طرف سے بڑھائے عربی رسم خط میں قرأت لکھتے وقت شرک خب کا کاف اور درک خب کی خ کا مزید اضافہ کیا، ج ۲ ص ۳۰۴ میں اس کو سین سعفص بتایا، لیکن شین پڑھا،

شرق خب کی ش اور ق کی صورت تحریر ایک ہے، مگر پادری صاحب دو آوازیں دین، ⊙ کو ج ۲ ص ۳۰۴ میں ق اور ک بتایا ہے، مگر اس جگہ اسے خ پڑھا،

اس کمال کے ساتھ عبارت گھڑ کر ج ۲ ص ۲۶۵ میں انھوں نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس کو ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

ونومن	And we proclaimed our beli-ef	اور ہم نے اعلان کیا اپنے ایمان کا
شرک خب	in my stories	رازوں پر
ودرک خب	in the miracle my[illegible]	معجزہ کے رازوں پر

وشرق خب	in The Resurrection mystery	جی اٹھنے کے مانند یہ
ومنخر خب	in The nos Tril mys tery	نتھنے کے مانند یہ

یہ پانچ لفظون کا مجموعہ ہے فرماتے ہین کہ ۹۶ عربی ان (Rana) ہے، یہ دو حرفی لفظ گویا (اننا) کا قائم مقام ہے، یہ لفظ بتاتا ہے کہ یہ قرأت محض ایک ادعا ہے، اور ایک ایسے شخص کا ادعا ہے، جو عربی کی گرامر سے واقف نہین، شرک خب کی بابت فرماتے ہین،

[illegible] عربی لفظ شرک ہے ×××، بالفاظ دیگر مثلث اور ×[illegible] ہے خب،

ترجمہ مین تو شرک کے قائم مقام کو حذف کر دیا گیا، مگر تبصرہ مین اسے تثلیث کا مرادف بنا دیا

خاص طور پر یاد رکھنے کی بات ہے کہ اصل کتبہ کے تین حرف

[illegible]×[illegible]

نقل کرتے وقت چار حرف [illegible]×[illegible]

اور تشریح کرتے وقت پانچ حرف [illegible]××[illegible] ہے،

ج ۲ ص ۴۰۲ مین × کو خ بتایا ہے، اس لئے پڑھنا چاہئے تھا،

شرخ خب

لیکن پڑھا ہے شرک خب

اسی طرح درک خب کی قرأت مین خب کی خ کا قرأت مین اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے،

اس لفظ کی تشریح سنیئے،

"ریومیشن کے اسرار پر ایمان عاد کے ذکر کے بعد ان کا شاعر دوسرے اجزاے ایمان کا ذکر کرتا ہے، ابتدار معجزہ پر ایمان کے ذکر سے کرتا ہے، کیونکہ [illegible] ہے، عربی درک ××× بالفاظ دیگر فوق الفطرۃ قوت لاحق خب کے ساتھ ملا ہوا، اس کے بعد

دوسرے موضوع ایمان کا ذکر تا ہوا اور وہ ہے ریسرکشن [illegible] ہے عربی شرق ××× یعنی شمس طالع یا طلوع شمس، اس سے پہلے سابقہ م لگا ہوا ہے اسم فعل بنانے کو آخر میں لاحقہ خب ملا ہوا ہے عقیدہ کی پر اسرار ی ظاہر کرنے کو عقیدۂ قیامت کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے بہتر تمثیل کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ریسرکشن کا لفظ اسی تمثیل سے ماخوذ ہے، اس صداقت عظمیٰ پر ایمان کا سماتی نقش (Reourgum) کی حالت میں سورج ظاہر کرتا ہے، عادی کا شاعر کے اس مفہوم کو عرب مترجم نے البعث کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۰۰)

لفظ ریسرکشن "کا اردو ترجمہ" قیامت" یا عربی ترجمہ "البعث" وضاحت کے ساتھ پادری صاحب کا مفہوم ادا نہیں کرتا، نصرانی اصطلاح کے مطابق قیامت سے مراد حضرت مسیح کا جی اٹھنا ہے، اور پادری صاحب کا مطلب یہی ہے، چنانچہ اس عبارت پر تبصرہ پادری صاحب نے اس تمہید سے شروع کیا ہے،

" گر چار لفظوں کے اس مجموعہ کے ساتھ جو متوقع گاسپل کی تبلیغ کرتا ہے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر مزید غور کیا جائے،"

لفظ گاسپل پر حاشیہ دیکر اعمال ۱:۸ کا حوالہ دیا ہے،

ناظرین نے دیکھا کہ شرک خب اور شرق خب کو دین ہود کا جزو ثابت کرنے کے لئے پادری صاحب نے کس قسم کی محرفانہ ذہانت سے کام لیا ہے، اب منخب کی قرأت کا راز معلوم کیجئے،

" مسٹر ولسڈ کی تبدیل حرف بحرف میں (Munkar) کا لفظ دیکھ کر میرا پہلا گمان یہ ہوا کہ یہاں قرآن کے منکر کا ذکر ہو رہا ہے، جو ان دو فرشتوں میں سے ایک ہے، جو قبر میں مردہ کا ایمان پرکھتے ہیں، اور مجھے یہ خیال کر کے رنج ہوا کہ محمد کے

پاس اپنے جھوٹے عجائب کے لئے اس قدر قدیم سند موجود تھی"، (ج ۲ ص ۳۶)

اس رنج و غم نے جو اس کتبہ کے علاوہ قرآن میں بھی لفظ منکر کے مل جانے سے اُن کو ہوا، اُن کی نصرانی ذہانت کو مجبور کر دیا کہ کاف کو خ بنا کر منکر کو منخر بنا دیں، پھر ایک مزید لفظ نب کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیں، پھر اپنی زبردست علمی قابلیت کے زور سے اس کا مطلب یہ بتا دیں کہ خدا نے اس کے نتھنے میں زندگی کا دم پھونکا" (تکوین ۲: ۷)

پادری صاحب کے اس تبصرہ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ اُن کی قرأت میں اُن کی حقانیت سے کہیں زیادہ اُن کی نصرانیت کے جوش نے عجائبات کے گل بوٹے کھلائے ہیں،

پادری صاحب نے "کتبات حصن غراب" کے علاوہ عدن اور نقب الحجر کے بھی ایک ایک کتبہ پر اپنی مقدس نصرانیت کا زور صرف کیا ہے، کتبہ عدن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"کپتان ہینس نے اپنی چٹھی میں مرحوم پروفیسر ریجے سے نی اس کا جو ذکر کیا ہے، اسکی بابت میں عرض کروں گا کہ موصوف کی ضعیف دینیات سے میرا تنفس اُن کے متشرقانہ فضل کے ساتھ انصاف پر مجھے اور بھی تکر مندر رکھتا ہے لیکن اس ملک اور دوسرے ملک میں حصن غراب کے طویل کتبہ کے ایک مختصر جز (King of Hamyar Tab ..) کے پڑھنے میں اُن کی مفروضہ کامیابی نے جو غلط فہمی پھیلا دی ہے اس کا ازالہ ضروری ہے، (ج ۲ ص ۳۹)

اس عبارت میں جس انصاف کی توقع دلائی گئی ہے، اس کا پوری کتاب میں کہیں سراغ نہیں ملتا، پروفیسر ریجے سے نی اس کی قرأت کے لفظ تک کو نقل کرنا مناسب نہیں جانا، محض ادعا کے بل بوتے پر یہ ارشاد فرمایا کہ اس قسم کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے، حالانکہ کتبہ کی نویں سطر میں ہے

[illegible]

فارسٹری آواز و م ر س و ۔ م د ی م و ش ق ر ب

جے سے نی اس و م ل ک و ح م ی ر م اش ت ل ہ

میری تحقیق کے مطابق جے سے نی اس نے حروف کی شناخت مین ایمان داری سے کام لیا ہو اور پادری صاحب نے ضرورتِ تحریف سے استفادہ کیا ہے، مین نے ان نقوش کو حسبِ ذیل مصرعہ کی شکل مین پڑھا ہے کہ

وَ مَلِكُ وَحِمْيَرْ مَا شَقَّ لَهٗ اور بادشاہ کو اور حمیری لوگون کو اس کا دکھ ہوا،

جے سے نی اس نے پڑھا ہوگا،

و ملکو حمیر مَا شقّ لہٗ، اور شاہان حمیر کو اس کا دکھ ہوا،

پادری صاحب کو اپنی بتائی ہوئی آوازون کے مطابق پڑھنا چاہئے تھا،

ہو مسو بمو نیو شق

لیکن اس کو پڑھا ہے،

و مرسا ھامَا شق رب

ایک موقع پر پادری صاحب نے بتایا ہے کہ جرمن قاریون کے نصقد مین اس کتبہ کے اندر حمیر وحبش کے تصادم کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آٹھوین سطر کے لفظ ✕ 3ꟷ+ کو جرمن قاریون نے حبشا پڑھا تھا، پادری صاحب نے اسے بزعم خود پڑھا،

ج ۲ ص ۳۳۶ کے حاشیہ پر دوسطری کتبہ حصن غراب کی ابتدائی دو سطرین پروفیسر روڈیگر کی قرأت کے مطابق نقل کی ہین، اور لکھا ہے کہ پہلے لفظ کے علاوہ اس قرات کا لفظ تو کتبہ کے اندر ایک بھی نہین، حروف بشکل ایک دو ہون گے، میری تحقیق مین روڈیگر کی قرأت اغلاط

سے خالی نہین لیکن پادری صاحب کی طرح انھون نے امداد ی غلطی سے کام نہین لیا ہے، رودیئڈ جر
کے خیال کے مطابق کتبہ نویس نے ابتدائی دو سطرون مین لکھا ہے،

۱۔ سمیق اسو ونیبھو سرح ،	سمیق سبائی (؟) اور اس کے فرزندون نے بنایا
(۲) ذ کل مکمل	یہ سب مکمل ہوا،
(۳) ولیذ کو ذ ی	اور اس لئے کہ انھین یاد رکھا جائے ،
(۴) قو ذ نزل ھی	خنک ہے جو اس مین رہے ،
(۵) یرخم الوھت کل	رحم کرے دیوی سب پر
(۶) ن د ذ ی تشینولدنم	ہم پر اور اپنے عابدون پر،
(۷) مشلن و سر تن و خرم ولہن	ہمارے حکام شرفا اور جماعت احباب

ترجمہ پادری صاحب نے جرمن مین نقل کیا ہے، اس لئے مین یقین کے ساتھ نہین کہہ سکتا، کہ رودیئڈ جر نے عبارت کا یہی ترجمہ کیا ہے، مین نے اس عبارت کو ، فقرون مین تقسیم کیا ہے، فقرہ ششم کے لفظ "تشینولدنم" اور فقرہ اول کے لفظ "سرح" کا ترجمہ ان الفاظ کے جرمن مرادفات کو لغت مین دیکھ کر کیا ہے، اس قرأت مین رودیئڈ جر سے حسب ذیل غلطیان سرزد ہوئین،

(۱) اسو کے حرف سوم کو واؤ پڑھا، اس نقش ۳ کو آگے چل کر س یا شین پڑھا ہے، اور یہی ٹھیک ہے،

(۲) H ٦ ٦ ؟ ٠٠ ١ کو منبھو پڑھنے مین نقاط کا محاظ نہین کیا،

(۳) اس کے حرف چہارم کو حرف دوم کی طرح نون قرار دینا چاہئے تھا، ھ پڑھا،

(۴) اس کے حرف اول کو Ⴖ فرض کرکے ب پڑھا،

(۵) ذکل پڑھتے وقت ایک نقش ٢ کو قرأت سے حذف کر دیا،

(۶) ولید کر پڑھتے وقت ل ی کا اپنی طرف سے اضافہ کیا،

(۷) ولید کر کا حرف چہارم ایک کھڑی لکیر ہے اسے (د) فرض کیا)

(۸) قر پڑھتے وقت اس کے بعد کی کھڑی لکیر حذف کر دی،

(۹) حی پڑھتے وقت .× کی قرأت چھوڑ دی،

(۱۰) الوہت پڑھتے وقت دونقوش مین سے کو چھوڑ دیا،

(۱۱) کو فارسٹر نے س فرض کیا ہے، اور یہ درست ہے، رو ئیڈ جر نے اسے الف فرض کیا'

(۱۲) خرم پڑھتے وقت کو فرض کیا،

(۱۳) ۱۰۰۹۹ ۱۰۰۹۹ کو ولی ن پڑھتے وقت اول کو فرض کیا،

دوسطر کی قرأت مین تیرہ غلطیان کین، اس کے باوجود ہم کو روئیڈ جر کا شکر گذار ہونا ضروری ہے، حروف کی آوازین انھون نے بالکل ٹھیک مقرر کین، حمیری تحریر کو حل کرنے کی اولین کوشش کا اغلاط سے بالکل خالی ہونا مشکل تھا، روئیڈ جر کی قرأت پر اعتراض کرنا اب تو بہت آسان ہے لیکن ہر قاری مسند کا ان کی پہلی کوشش سے مستفید ہوا ہے، برخلاف اس کے فارسٹر صاحب کی قرأت سراپا جعل سازی ہے، اس جعل سازی کے لئے انھون نے نقوش کو خود ساختہ آوازین دی ہین، قدما نے حمیری نقوش کی جو آوازین جابجا مختلف کتابون مین نقل کی ہین یورپ مین قاریون نے اُن کو جمع کرنے اور کتبون کے قدرتی فروق اور تغیرات کا لحاظ رکھتے ہوئے حمیری تحریرین حل کرنے کی کوششین کی ہین، پادری صاحب سب کی کوششون کو بس اتنا کہہ کر مسترد کر دیتے ہین کہ اور توا ور مسند کی بابت خود پوکوک کا علم مسلمان مولفون کی مجمل اور پر اغلاط رپورٹون پر مبنی تھا، (ج ا ص) لیکن ہم نہین جانتے کہ نقوش کی ٹھیک اور بے خطا آوازین پادری صاحب کو کن مولفون کی مفصل اور بے خطا رپورٹون

سے معلوم ہوئین،

پادری صاحب کی قرأت کے جعل سازی ثابت کرنے کے لئے میرے پاس متعدد دلائل ہین، مگر سب کا دہرانا ضروری نہین، اُن کی پوری قرأت کو پیش کرکے ایک ایک لفظ پر بحث کرنا کوہ کنی سے کم تکلیف دہ نہین ہے، اس لئے ان کی قرأت پر اس سے مزید تبصرہ کرنا غیر ضروری ہے؛ ناظرین ان کی کتاب مین اُن کی قرأت و ترجمہ کو خود غور کرلین، اصل کتبہ کے نقوش کو پھر قرأت کے حروف کو گن لین، تو معلوم ہوگا نقوش قرأت مین چھوڑ دیئے گئے، مزید غور سے کام لین گے، تو معلوم ہوگا کہ قاری نے نقوش کو اور حذف کر دیا ہے، مگر ان کی جگہ اپنی طرف سے دوسرے حروف کا اضافہ کیا ہے، حروف کی آوازین حسب ضرورت بار بار بدلی ہین، اس قسم کی قرأت کے ذریعہ سے اناجیل اربعہ کو درامائین بنادینا نہایت آسان کام ہوگا،

حروف مسند | دہ سطری کتبہ کی صحیح قرأت پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حمیری نقوش پر مفصل بحث کرلی جائے،

الف | حرف اول کا نام عبری مین الف (بیل) ہے، ایک مصری نقش آ کی آواز دینے والا بیل جیسا ہے، ابن ندیم نے ایک ورقہ ناموس کی نقل دی ہے، اس مین حمیری الف کی شکل (؟) ایک چوپایہ کی سی ہے جس کی ایک ٹانگ نظر نہین آتی، اس پر چارہ لدا ہوا ہے، یہی شکل بدلتے بدلتے (؟) اور (؟) ہوئی، ج ۲ ص ۳۰۸ مین پادری صاحب اسے سین شین اور صاد، اور ضاد بتاتے ہین، کتبات عدن ونقب بحرین ایسے نقوش موجود ہین،

ب | حرف دوم کا عبرانی نام بیت (گھر) ہے، عربی بار کا بھی یہی مطلب ہے، عبرانی حدعربی بسا اور حمیری ٦ گھر ہی کی شکلین تھے، تمام قادیان مسند اس کو ب بتاتے ہین، پادری صاحب کے نزدیک یہ ح ہے، کتبۂ عدن مین وارد ہے، یہ ان خوش قسمت نقوش مین سے ہے جو

پادری صاحب نے وجہ قرأت بھی بتائی ہے، فرماتے ہین کہ یہ یونانی ΤΤ سے ملتا جلتا نقش ہے جو علاوہ برین
⊓ مخفف ہے □ کا جو کہ ⊟ اندرونی خط کے بننے سے بنا اور یہ نقش یونانی Θ کا تغیر ہے، اس دلیل
کی معقولیت پر بحث کرنا بے سود ہے، نشوان حمیری نے جب ⊓ کو ب بتایا ہے، تو اس نقش کا
مفہوم یونان سے مستعار لینے کی ضرورت نہین،

مشرکون کے معبد کے لئے توراتی لفظ بامہ ہے، جس سے فارسی لفظ بام نکلا، بام کے مفہوم
کو ⊟ دو منزلہ گھر کی صورت ادا کرتی ہے، عام قاریان مسند کے نزدیک یہ ب ہے، مگر فاسٹر
ادعا سے س تجویز کرتا ہے،

ث | سماتی ابجد مین سے ایک کا نام تو ہے جس کی شکل صلیب × کی سی ہوتی تھی، یہ کئی سامی
زبانون کی ت ہے، پادری صاحب اسے خ بتاتے ہین، مگر ق اور کاف بھی پڑھتے ہین،

ث | جب کہ ہمدانی نے ∞ کو نشوان نے ث بتایا ہے، پالان شتر باندھنے کی رسی کو جس کے دونون
سرے پر دو حلقے ہوتے ہین، عربی شکال اور ثنایہ کہتے ہین، ∞ کو ثنایہ کی شکل ہونے کی وجہ سے ث
کا قائم مقام بنایا گیا، سماتی نام اس نقش قید الفرس (گھوڑے کی پچھاڑی) ہے، پادری صاحب
کا ادعا ∞ کو الف بتاتا ہے،

ج | ادھر آد کی عربی ہے، جیسا آدمی کو بلاتے ہوئے ہاتھ کی شکل اونٹ کے سر و گردن کی
سی ہو گئی، اس لئے جیم (اونٹ) کہلائی، یہی شکل ⊏ ہو کر ج بنی، 7 کو نشوان وغیرہ
نے حمیری جیم بتایا ہے، کتبہ عدن مین 7 کو پادری صاحب نے "ر" فرض کیا ہے،

ح | Ψ کو تمام قاریان مسند نشوان کے بیان کے مطابق حاے حطی بتاتے ہین، پادری صاحب نے
اسے حمیری ب فرض کیا ہے، اسی نقش کی ایک شکل ⅄ کتبہ نقب الحجر مین ہے، اسے ج ۲ ص ۲۰۲ مین
پادری صاحب نے ہاے ہوز بتایا ہے، مگر "ح" پڑھا ہے،

خ | نشوان نے خ کی شکل ایسی بتائی ہے یہی شکل کشش کے بدلنے سے پھر ہو گئی، تمام قاریان مسند کے برخلاف پادری صاحب نے اسے د قرار دیا ہے،

د | اس حرف کا عبرانی نام دالث ہے جس کا مفہوم دروازہ، پھاٹک، کیواڑ، اور دربند ہے، زیر بحث کتبات میں تو نہیں مگر اکثر تحریروں میں دال کی شکل کواڑ کے پلے جیسی ملی ہے، یہی شکل ... بنی، پادری صاحب کی خود رائی اس کو س بتاتی ہے،

ذ | H، H، H، H، H یہ تمام شکلیں ذال کی ہیں، مگر شمال میں یعنی کنعانی تحریروں میں یہ نقوش حائے حطی کے ہیں،

ر | راس کا مفہوم مصری ہیروغلافی میں جھکتی ہوئی چھت ادا کرتی ہے، راس کی ایک عربی رہمہ ہے، جس کی جمع رہام ہے، اس نقش کو عربی میں رہام پڑھ سکتے ہو، جیسے نقوش زیر بحث کتبات میں وارد ہیں، روئیڈ جرنے اس کو س پڑھا ہے، پادری صاحب اسے ی بتاتے ہیں مگر H کو عوض اور ؟ کو الدالما پڑھا ہے،

(بھی ر ہے کیونکہ یہ کا نصف ہے یہی شکل اور د کی صورت میں بدلی، پادری صاحب اس کو ی بتاتے ہیں،

ز | زکی شکل نشوان و ہمدانی نے جیسی بتائی ہے، اسی پادری صاحب نے ہائے ہوز فرض کیا ہے اور کو حائے حطی بتایا ہے، حالانکہ اور قاریان مسند نے اسے ز پڑھا ہے، ت × کا عبرانی تلفظ تَو ہے، عربی میں تو (طاق) مقابل ہے، زو (جفت) کا دو تو ملکر ایک زو بنتے ہیں یہ ہے اس نقش کی وجہ دلالت کو ز وکس لئے پڑھا گیا، اس کی وجہ نہیں معلوم لیکن قدما کے بیان پہ فارسٹری وہم کو ترجیح نہیں دیجا سکتی،

س | دراصل کا سربریدہ نقش ہے، پہلے نقش کو یمن والوں نے س کے کئے اور دوسرے

کو صاد کے لئے خاص کر لیا، نقش اوّل کی آواز مقرر کرنے مین پادری صاحب نے مسلمان مؤلفون کی بھول اور بیرا غلاط رپورٹون کی مخالفت ضروری نہین سمجھی، لیکن حسب ضرورت اسے اور اس کے تغیرات کو س ش ص ث بھی پڑھتے ہین،

دو سطری کتبہ کے تلے چند نقوش ہین، جن مین سے ایک اور ہے، اوّل الذکر نقش کو پادری صاحب نے پڑھا نہین، ثانی الذکر کو حبشی نقش اور کا مجموعہ بتایا ہے، ان نقوش کی تحلیل کے بعد تحریر کو اس طرح پڑھا ہے، کہ نہین بتایا جا سکتا کہ کی آواز کیا ہے، ہمدانی نے یمن کی ایک شکل کی سی بتائی ہے،

حمیری حروف دراصل سمات ابل مین تقسیم املاک کے وقت خاندانی سمت مین زاید نقوش کا اضافہ کیا جاتا تھا، اس خط زائد کو عازور کہتے تھے، حمیری حروف مین سے بعض قدیم سمانی مین عازوردن کے اضافت سے بنے، صاحب تیجان نے لکھا ہو کہ حمیر نے عالم رویا مین ہدایت پائی کہ اپنے باپ سبا کے سند مین شروع سے آخر تک فلان نقش بڑھا کر لکھا کرو، افسوس دائرۃ المعارف والون نے حمیری نقوش کو علحدہ ورق پر چھاپنے کے وعدہ کی تکمیل نہ کی،

بہرحال اس روایت سے ظاہر ہے کہ حمیری کے اکثر حروف قدیم حرفون مین عازوردن کے اضافہ سے بنے، اور دراصل عازوردن کے اضافہ کے ساتھ ہین، مگر ان نقوش کی آواز س کی ہے،

ش ش، ۳، س، 3، ٤، 3 3، یہ تمام نقوش اصلاً ایک ہین، اور سامی زبانون مین سین اور شین کی آوازین دیتے ہین، پادری صاحب نے کتبہ عدن مین 3 کو ی پڑھا ہے، اور کو زبردستی عین پڑھتے ہین، کو ش پڑھا ہے، مگر اسی کے بغیر کو ت اور ط بھی بتاتے ہین،

ص | یہ تمام نقوش صاد کی آواز دیتے ہیں، پادری صاحب کے نزدیک حسب ضرورت س ش ص ض، قدیم حبشی میں صاد کی ایک شکل کی سی ہے کتبہ نقب الحجر میں چھ نقوش کا ایک مجموعہ ہے جس کو پادری صاحب نے ارضتہ پڑھا ہے، اس مجموعہ کا پہلا نقش یہی ہے،

ض | حمیری ضاد کو پادری صاحب ح بتاتے ہیں،

ط | نشوانی طا ہے زیر بحث کتبات میں یہ نقش موجود نہیں ہے، ہمدانی اور ابن ندیم کے بیان کے مطابق حمیری طا کی شکل کی سی تھی، یہ نقش بھی زیر بحث کتبوں میں نہیں ہے،

ظ | پادری صاحب کے نزدیک م، عام قاریان مسند کے نزدیک ہمدانی کے بیان کے مطابق ظا نشوان کے بیان کے مطابق ظا وجہ اختلاف یہ ہو کہ اس نقش والے الفاظ عربی کتب لغت میں کبھی طا سے ملتے ہیں کبھی ظا سے،

ع | اس حرف کا نام عین (آنکھ) ہے، اس کی قدیم شکل ایسی تھی، پھر بھرت بنی پھر یہی شکل پھر ہو بنی یہ اشکال زیر بحث کتبات میں موجود نہیں ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں برہمی عین کی شکل ایسی اور ایسی منقول ہے، کتبہ صید ا میں اور موجود ہیں پادری صاحب نے اسے ہی بتایا ہے، مگر ایک لفظ کی قرأت میں اُسے حذف کر دیا ہے، اور ایک میں عین پڑھا ہے، ہم نے اسے ایک لفظ میں عین ایک میں غین پڑھا ہے،

غ | غین کی شکل نشوان نے ایسی بتائی ہے، یہ نقش زیر بحث کتبات میں نہیں ہے ایک کتبہ نقب الحجر میں ہے ہم نے اسے غین پڑھا ہے جس میں چھ حرفی مجموعہ کو جو حرفی ارختہ پادری صاحب نے پڑھا ہے، اس کا دوسرا نقش یہی ہے،

ف | ف کی شکل نشوان وغیرہ نے بتائی ہے، نقب الحجر کے کتبہ میں اور جیسے نقوش ہیں پادری صاحب نے ان کو ن پڑھا ہے،

ق | اور کو عام قاریوں کی طرح پادری صاحب نے اُسے قاف بتایا ہے مگر ضرورت تحریف

نے انھیں اس پر بھی مجبور کیا ہے کہ حسب موقع اسے کاف اور خ بھی پڑھیں، لہذا ایک عاذ و رکے اضافہ کے ساتھ ◊ ہی ہی، پادری صاحب اسے ب بتاتے ہیں،

ک | تمام قاریان مسند کے نزدیک کاف ہیں پادری صاحب ان نقوش کو س بتاتے ہیں، بھی کاف کی شکلیں ہیں، پادری صاحب ان کو لام فرض کرتے ہیں، حالانکہ یہی شکلیں ہیں کہ عربی میں ک اور ل کا حرف اول ہیں،

ل | خانۂ خدا کے لئے مصری لفظ ہے جیسے حیت نتر پڑھا جاتا ہے؛ حیت (احاطہ) یا بیت (گھر) ہے، نتر (معبود) ہے جس کی حمیری، عبرانی اور قدیم عربی ال ہے، اس لئے کو پادری صاحب کے علاوہ اور تمام قاریان مسند لام پڑھتے ہیں، پادری صاحب کا بے دلیل ادعا ہے کہ یہ نقش اور فرشت کا حرف دوم ہیں نشوان نے لام کی صورت ایسی بتائی ہے بعض نزالوں نے ۸، ۸، بتائی ہے،

م | یہ پانچوں نقوش ایک ہی نقش کے تغیرات ہیں ان کو تمام قاریان مسند م بتاتے ہیں، پادری صاحب نے نقش ششم کو میم پڑھا ہے، نقش اول اور نقش دوم سے ملتے جلتے نقوش کو اس دلیل سے ب بتایا ہے کہ کریک اور رومن ب ایسی ہی ہوتی ہے، (ج ۲ ص ۳۹۴)

ن | N، ٦، ٦ اور کو ن قرار دینے میں پادری صاحب نے اپنے جابرانہ ادعا کو استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ خلاف عادت عام قاریوں کا اتباع کیا ہے، ہاں کہ فارسٹر سے ب اور رودیڈ جر نے ن پڑھا ہے، رودیڈ جر کی،

و | نشوان وغیرہ نے واؤ کی شکل ⊕ کی سی بتائی ہے، زیر بحث کتبات میں یہ نقش نہیں، فارسٹر و رودیڈ جر سے کھڑی لکیر کو کبھی الف اور کبھی واؤ پڑھا ہے، ہمدانی اور نشوان کے بیان کے مطابق ہر دو لفظ کے درمیان کھڑی لکیر ہوتی تھی، اس لئے اکثر قاریان مسند کھڑی لکیروں کو نہیں

پڑھتے، فارسٹر ور ویڈجر کی قرأت کا اس نقش کی حد تک مؤید ہون، دو لفظون کے درمیانی خط فاصل کو عام حروف سے طویل تر ہونا چاہئیے، زیر بحث کتبات مین کئی قرائن ایسے موجود ہین جو قرأت فارسٹر و ویڈجر کی تائید کرتے ہین،

| ۔ | ۲ کو پادری صاحب ب بتاتے ہین،

| ی | ۹ کو پادری صاحب الف بتاتے ہین،

نقوش کچھ اور بھی ہین، لیکن ہم نے صرف ان نقوش سے بحث کی ہے، جو کثرت مستعمل تھے، یا قلیل الاستعمال ہونے کے باوجود زیر بحث کتبات مین آئے ہین،

فارسٹر صاحب کی قرأت پر اس سے زیادہ تبصرہ کی ضرورت نہین، ہم اب ہم اُن کتبات کو بطور خود پڑھکر سنائین گے، جن کی مٹی پادری صاحب نے خراب کی ہے،

ارض القرآن حصہ اوّل

مؤلفہ

مولانا سید سلیمان ندوی

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے، جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے،

ضخامت: ۳۴۴ صفحے قیمت سے ؎ر

منیجر

قطب تارہ

اور

تاج محل

از جناب خواجہ عبدالرشید صاحب راولپنڈی

تاج محل کو دیکھا تو مین نے کئی رنگ مین تھا، مگر ایک مرتبہ جب آگرہ سے گذرا، تو چاند کی آخری راتین تھین، سوچا کہ اندھیری رات مین بھی دیکھنا چاہئے، چنانچہ دس گیارہ بجے رات کے قریب وہان پہنچ گیا، ابھی بڑے دروازے مین کھڑا اسکی ہیبت ناک شکل دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک چمکتے ہوئے ستارے پر نظر پڑی جو گنبد کے کلس یعنی سلاخ کی نوک کے عین اوپر تھا، ستارہ چونکہ چمکدار تھا، اور اندھیری رات مین اُس کی چمک کچھ اور بھی زیادہ تھی، اسلئے نظر مین کھب گیا، مجھے علم ہیئت سے بھی کچھ دلچسپی ہے، غور سے دیکھا تو وہ قطب تارہ نکلا، جس سے شمال کی سمت دریافت کیجاتی ہے، مین اسی جگہ کھڑا رہ گیا، اور دماغ مین ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی، (Cassiopea) (یہ ستارون کا جھرمٹ ہوتا ہے، انگریزی حرف W کی مانند، آپ عربی نام درج کرلین، مجھے اس وقت یاد نہین)[1] نکل چکا تھا، اور اس کے ساتھ مین نے قطبی تارہ کی پوزیشن کی تصدیق کی، مگر پھر بھی تشفی نہ ہوئی، ابھی (Great Bear) غالباً اسے دُبِ اکبر کہتے ہین، آپ درست کرلین،) نہین نمودار ہوا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کے بعد

---

[1] معارف ذات الکرسی،

یہ جھرمٹ بھی نکلا، اور قطب ستارے کی مزید تصدیق ہوگئی، اور میرے دماغ مین معاً دو سوال پیدا ہوئے، جو ذیل مین درج اور غور و توجہ کے مستحق ہین،

ایک یہ کہ کیا واقعی یہ معمارون کا کمال تھا، جو تاج محل کو قطب ستارے کے سامنے اس طرح کھڑا کر دیا کہ گنبد کی سلاخ پر وہ موتی کی طرح ٹنکا ہوا ہے، یا یہ اتفاقی امر تھا کہ قطب اس طرح سر سامنے آگیا، اگر معمارون نے تاج محل کو اس پوزیشن مین تعمیر کیا، تو یہ ان کا تعمیری کمال ہے،

دوسرا یہ کہ دونون حالتون مین یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علماے ہیئت کے خیال کے مطابق قطب تارہ مکمل طور پر ساکن نہین ہے بلکہ ایک صدی کے بعد اس مین کچھ منٹون کی حرکت ہوتی ہے، (منٹ قطب نما پر ڈگریون کے حصون کو کہتے ہین) تعمیر کے وقت سے لیکر اب تک اس مین کچھ نہ کچھ نقل و حرکت ضرور ہونی چاہئے، اور اب اسے اپنی جگہ سے ہٹ کر کہین اور ہونا چاہئے تھا، اور اگر معمارون کا یہ شعوری فعل نہین، اور اتفاقاً اب اس کی پوزیشن ایسی ہوگئی ہے تو دو تین صدیون کے بعد پھر اسے جگہ بدل دینی چاہئے، اگر ایسا نہ ہوا تو یہ نظریہ غلط ثابت ہوگا، اور اگر قطب ستارے کی یہ موجودہ پوزیشن وقت تعمیر سے ہے، تب بھی یہ نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے،

ان دونون سوالون سے بہت سے اہم مسائل پیدا ہو سکتے ہین، مگر فی الحال انھی دونون سوالون کا جواب مطلوب ہے، امید ہے کہ معارف کے پڑھنے والے اصحاب علم حضرات اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائین گے،

باب التقریظ والانتقاد

پیرس کا ایک مکتوب

"معارف کے ایک پرانے اور فاضل قدردان نے جو عرصہ سے پیرس میں ہیں، اپنے ایک مکتوب میں معارف کے متعلق اپنے جذبات ظاہر کئے ہیں، اس خط میں بعض مفید علمی معلومات بھی ہیں، اس لئے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔" "م"

مخدوم و محترم

سلام مسنون نیازمندانہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ ایک اور مضمون ملفوظ ہے، مناسب ہو تو شائع فرما دیا جائے، گذشتہ مضمون سنا کہ شائع ہوا اگرچہ تا حال پڑھنے یا دیکھنے میں نہیں آیا، خیر اسے کوئی اہمیت نہیں غرض تو اشاعت و اطلاع تھی،

گذشتہ دو سال سے معارف دیکھنے کو ترستا تھا ابھی حال میں ایک دوست کے یہاں ان شماروں کا بڑا حصہ دیکھنے میں آیا، اور دل بھر آیا، مسرت نہ صرف اس عزیز دور افتادہ دوست کے ملنے پر ہوئی بلکہ اس پر بھی کہ معیار اگر بلند تر نہیں ہوا تو ماشاء اللہ پرانا معیار برقرار ضرور ہے،

مولانا عبد السلام صاحب کا دلچسپ مضمون طب پر دیکھکر مستفید ہوا، انھوں نے ابن سمحون کا خاص ذکر کیا ہے، لیکن اس کی کتاب بظاہر اُن کی دانست میں مفقود ہے، الحمد للہ اب اس کے بڑے حصے کا بھی پتہ چل گیا ہے، اس کی تالیف الجامع لاقوال الحکماء .... فی الادویۃ المفردۃ

کی دو جلدین مین نے آکسفورڈ کے کتب خانہ باڈلیان مین دیکھین اور معلوم ہوا تھا کہ کچھ اور جلدین بھی حال مین برٹش میوزیم مین آئی ہین، تا دم تحریر آخرالذکر کے مطالعہ کا موقع نہ ملا، آکسفرڈ کا مخطوطہ نہایت قدیم، نہایت خوشخطا اور خط کوفی (مراکشی، مغربی) مین ہی، اس کا نہج وہی ہے جو بعد مین ابن البیطار کے ہان ملتا ہوا ور سب کو معلوم ہے کہ مختلف بوٹیون کو حروف تہجی پر مرتب کرکے ان کے متعلق مختلف قدیم و معصر مؤلفون کے بیانات یکجا جمع کر دیئے ہین، اس مین بھی دینوری پر سب سے زیادہ اعتماد کیا گیا ہے یہ کتاب بھی اس قابل ہے کہ اسے شائع کیا جائے ہماری علمی میراث مین اسے اہم درجہ حاصل ہے،

ایک اور بھی وجہ مسرت ہی :-

مجھے یاد نہین کبھی اس سے پہلے مولانا ابو الجلال ندوی کی مین نے کوئی چیز پڑھی ہو، گذشتہ دو سال مین اُن کے جو مضمون چھپے ہین، اُن سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمانِ علم پر ایک نیا کوکب دری ایک درخشان تارہ نمودار ہو گیا ہے، خدا اسے بہت دن تابان رکھے، اُن کی تحقیقات قابلِ رشک ہے، اگر وہ کبھی کبھی فرانسیسی جرمن مین نہ سہی انگریزی ہی مین ان کے ترجمے یا خلاصے شائع کرائین تو انھین ہم فن زیادہ تعداد مین مل جائین، انھون نے ایک جرمن کتاب مؤلفہ ڈوزی (Die Israeliten zu mekka .) کا ذکر کیا ہے، اس کا صحیح تلفظ "دی اسرائیلیتن تسو مکہ" ہے، مولانا کی اعلام القرآن کا انتظار رہے گا، خدا کرے جلد تکمیل کو پہنچے، اور یہ خدمت قرآن، صاحبِ قرآن جل شانہٗ کے ہان مقبول ہو،

ابو محفوظ الکریم صاحب تفسیر طبری کے سلسلے مین مفید کام کر رہے ہین، ایک چیز ذہن مین آتی ہی اُن کے غور کے لئے عرض ہے، تفسیر طبری اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، اس سے سات تو کیا، ستر مستقل کتابین اخذ اور الگ کی جا سکتی ہین لیکن وہ اس طرح نئی کتابین شائع کرنے

کی کوشش کرنے کی جگہ محض اشاریے یا انڈکس شائع کردین تو کم خرچ اور زیادہ مفید ہو، تفسیر طبری اس وقت جن لوگون کے پاس ہے اُن کے لئے سات اور کتابین خریدنا ایک طرح سے تحصیل حاصل ہوگا، مولوی ابو محفوظ الکریم صاحب نے جو سات عنوان تجویز کئے ہین، انھین پہ مجوزہ انڈکس مرتب کرین، اور مثلاً معانی القرآن کے سلسلہ مین الفاظ کو حروف تہجی پر مرتب کرکے یہ بھی بتاتے جائین کہ وہ لفظ کس کس سورت اور کس آیت مین ہے، نیز طبری کی کس کس جلد اور کس صفحے مین کن سطرون مین ہے، یہی حال اعراب القرآن، بلاغات القرآن وغیرہ کا ہے، جو انڈکس مین الگ الگ ابواب مین آسکتے ہین، طبری کی عبارتون کو دہرانے کی ضرورت نہ ہوگی، یون بھی طبری کا ایک ہی فقرہ ممکن ہے متعدد ابواب سے متعلق رہے، اور اس طرح بار بار نقل دہرانے سے تیس جلد کی تفسیر طبری کا اقتباس شاید ساٹھ جلدون مین ہوجائے، موصوف کی فہرست مین کم ازکم چار عنوانون کا اضافہ مناسب ہوگا،

(۱) آدمیون کے نام (۲) مقامون کے نام (۳) کتابون کے نام (۴) اشعار شواہد کی یکجائی یا کم ازکم صدر بیت مع قافیہ بتاکر تفصیل، اس طرح کے جامع اشاریے سے اہل علم کو بڑی سہولت ہو گی، اور وہ اس خدمت کو سرآنکھون پر رکھین گے، چند سال قبل سُنا تھا کہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اسی طرح کا کام کرنے والے تھے، انھون نے غالباً اس پہ کوئی مضمون بھی لکھ کر اہل علم کی رائے طلب کی تھی، اگر یہ کام ایک اکیلے آدمی کے لئے بہت وقت لینے والا ہو تو کام کا خاکہ کرکے پانچ دس موزون و مستعد افراد مین بانٹ دیا جا سکتا ہے، اور نتیجہ ہند ہی نہین عربی فارسی ممالک مین بھی خوش آمدید ہوگا، طبری کے دل سے بھی دعا نکلے گی،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

وفیات

سر شیخ عبدالقادر

ہندوستان و پاکستان کی تقسیم نے اب ایسا کر دیا ہے کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ مشکل سے معلوم ہوتا ہے، بہرحال چونکہ پہلے کی شناسائی ہے اس لئے کچھ ابھی تعلق معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دو مصنوعی ملک حقیقت میں دو ملک ہو جائیں جس میں ایک کا حال دوسرے کو شاید ہی معلوم ہو، اور اگر ہو بھی تو دل کا تعلق ظاہر نہ ہو،

سر شیخ عبدالقادر متحدہ ہندوستان کے ایک ممتاز ادیب تھے، اگر ان کا انتقال اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہوا ہوتا، تو سارا ہندوستان ان کا ماتم کرتا، لیکن اُن کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا جب ہندوستان میں اُن کے انتقال کی خبر کسی نے سنی کسی نے نہ سُنی، اور جس نے سُنی اُس نے یہ بھی نہ جانا کہ یہ کون ہستی تھی،

مجھے اُن کے انتقال کی خبر اُن کی وفات کے کئی ہفتے کے بعد ملی، ایک اردو اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس میں یہ خبر نظر سے گذری کہ سر شیخ عبدالقادر نے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو پچھتر برس کی عمر میں لاہور میں وفات پائی، خبر پڑھنے کے ساتھ تعجب کے ساتھ زبان سے نکل گیا کہ ارے! شیخ عبدالقادر نے وفات پائی؟" پاس والوں نے پوچھا کہ کون عبدالقادر! میں نے کہا ایک تھے، اب کیا کوئی سمجھے کر اس "ایک تھے" میں پوچھنے والوں کے لئے کتنے تیر و نشتر چھپے ہیں،

مرحوم سے میری واقفیت کو پوری نصف صدی گذر گئی، سنہ ۱۹۰۰ء مین ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ بڑی ہی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے پٹنہ عظیم آباد مین ہوا تھا، یہ پہلا اجتماع تھا جس مین ہیئت اور علمائے ایک ساتھ جمع ہوئے، جسٹس سید شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر الدین بیرسٹر اور خدا جانے کتنے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور علماء و مشائخ ایک صف مین دین و ملت کی خدمت کے لئے کمربستہ نظر آئے، یہی وہ جلسہ تھا جس مین مین نے مرحوم کو پہلی بار دیکھا، یہ ان کی جوانی کا وقت تھا، انھون نے ایک قومی کتب خانہ کے قیام کی تجویز پر تقریر فرمائی جس کو وہ لکھ کر ساتھ لائے تھے، اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس کی ہو گی، عربی کی ابتدائی کتابین زیر درس تھین، مرحوم اس زمانہ مین آبزرور نام ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اڈیٹر تھے، علماء کے جلسہ مین ایک انگریزی تعلیم یافتہ کی تقریر ایسے انداز مین جس مین پرانے بزرگون کی تحقیقات کا احترام اور ان کی اس متروکہ دولت پر فخر تھا، بڑی توجہ سے سُنی گئی، میری عمر کا یہ پہلا واقعہ تھا جس مین یہ اجتماع اور یہ منظر نظر آیا، محو حیرت تھا، اور مین کیا سارا مجمع مقرر کے جادو سے مسحور تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرحوم نے اپنی تقریر ایک ایسے انوکھے انداز سے شروع کی کہ جس مین اُن کا اور اُن کے اخبار کا اشتہار بھی تھا، اور انداز بیان کی دلچسپی بھی تھی، انھون نے کہا حاضرین! اگر مین یہ کہون کہ آپکے بزرگون نے آپکے لئے ایک بڑا دفینہ چھوڑا ہے، تو آپ کو میری اس بات کا یقین نہین آئے گا، خصوصاً اس لئے کہ مین ایک اخبار نویس ہون، اخبار کی خبرون پر یقین کس کو آتا ہے (اوس وقت ٹرنسوال مین بوئرون اور انگریزون کی جنگ ہو رہی تھی، اس کا حوالہ دیکر کہا) ابھی یہ خبر آئی ہے کہ بوئرون کو شکست ہوئی، اور کل اُس کی تصحیح یون ہوتی ہے کہ انگریزون کی شاندار پسپائی ہوئی،

مرحوم کی یہ پوری تقریر اس سال کی ندوہ کی روداد مین چھپی ہوئی ہے، اسی جلسہ مین مرحوم نے مخزن کا اشتہار تقسیم کیا تھا، اور آخر بیسوین صدی کے پہلے مالی سال اپریل سنہ ۱۹۰۱ء

سے انھون نے مخزن نکالنا شروع کیا، یہ اردو کا وہ پہلا رسالہ ہے جس نے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ اہل قلم کو اردو کی خدمت کی دعوت دی اور جدید و قدیم ادب نوازون کو ایک منبر پر جمع کیا، کتنے اس وقت کے نوآموز اور نوجوان جواب مرحوم ہو چکے ہین، یا بوڑھے ہوگئے ہین، اُن کے قلم کا پہلا ظہور اسی مخزن کے صفحات مین ہوا، ڈاکٹر اقبال اسی کے ذریعہ روشناس ہوئے، سید حسرت موہانی کی صورت سب سے پہلے اسی بزم مین ہم کو نظر آئی، مولانا ابو الکلام کا پہلا مضمون "اخبار" اسی مین نکلا، اور اسی طرح راقم الحروف کے سب سے پہلے مضمون "وقت" اور "معشوقۂ عرب کی یاد مین" اسی مین چھپے، اردو ادب پر مرحوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھون نے نوجوان تعلیم یافتون کو اردو ادب کی خدمت مین لگایا، اور اس سے زبان کو بڑا فائدہ پہنچا،

مرحوم سے میرے تعلق خاطر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی، اور وہ اس کے اکثر ابتدائی جلسون مین شریک ہوتے تھے، اور تقریر کرتے تھے، اور اخیر اخیر تک وہ ندوہ کے رکن رہے، بارہ تیرہ برس کی بات ہو کہ دلی کے ریڈیو اسٹیشن نے ایک سلسلۂ تقریر شروع کیا تھا، "مین کن سے متاثر ہوا" اس سلسلہ کے پہلے نمبر مین مرحوم کی تقریر تھی، انھون نے اپنے تاثر کا آغاز سر سید احمد خان مرحوم سے کیا تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس تقریر کے دوسرے نمبر کے لئے میرا نام رکھا گیا، مین نے اپنی تقریر کا آغاز مرحوم سے کیا، کیونکہ عمر مین پہلی دفعہ ان ہی کی تقریر سنی، اور انھی سے اثر پذیر ہوا،

مرحوم کا آغاز گو انگریزی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے ہوا، مگر اُن کو اپنی روزی کے لئے یہ میدان بہت تنگ نظر آیا، اس لئے اس وقت کے سب سے ممتاز پیشہ قانون دانی کی طرف اُن کی توجہ مبذول ہوئی، اسی لئے ۱۹۰۴ء یا اس کے قریب زمانہ مین وہ بیرسٹری کے لئے لندن سدھارے، اور چند برس کے بعد بیرسٹر ہو کر لوٹے، راہ مین قسطنطنیہ کی بھی سیر کی جس کی

یادگاران کا سفرنامہ مقام خلافت ہے، واپس آکر بیرسٹری شروع کی، مگر اس پیشہ مین جیسا چاہئے ان کو فروغ نہین ہوا، اس لئے گورنمنٹ کی ملازمتون اور عہدون کی طرف اُن کی توجہ ہوئی، ہائی کورٹ کے جج بھی ہوئے، لندن مین انڈیا کونسل کے ممبر بھی ہوئے، اور پنجاب کونسل کے صدر اور وزیر تعلیم بھی رہے، اور لیگ آف نیشنس جنیوا مین ہندوستان کے نمایندہ بنے، اُن کا آخری عہدہ بھاولپور ہائی کورٹ کی ججی تھی، یاد ہے تیرہ برس ہوئے ہون گے کہ انھون نے انجمن حمایت اسلام لاہور مین جس کے وہ اس وقت صدر تھے مجھے یاد فرمایا تھا، مین حاضر ہوکر ان کا مہمان ہوا، اسی اجلاس مین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی ان کے بلاوے پر گئے تھے، اور ان کے مہمان تھے،

اس وقت کا ایک لطیفہ یاد آیا، مرحوم کی صدارت مین اس جلسے مین انجمن کو بہت چندے مل رہے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ روپے برس رہے تھے، اتفاق سے مین ایک صبح کو ان کے مکان سے ٹہلنے نکلا، تو ایک چھوٹی سی مسجد کے دروازہ پر یہ دعا لکھی نظر آئی "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ"، واپس آکر مین نے شیخ صاحب سے عرض کی کہ حضرت انجمن پر جو اس قدر آپ کی صدارت مین روپیہ برسنے کی وجہ ابھی معلوم ہوئی، انجمن نے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا عمل پڑھا ہے،

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک وائس چانسلر کی تلاش تھی، اور مرحوم کے احباب اس جگہ کے لئے ان کو کھڑا کرنا چاہتے تھے، مجھ سے بھی مشورہ چاہا، مین نے اس وقت کی وہان کی صورت حال عرض کردی، بعد کو دوسرے صاحب اس جگہ پر ہوگئے، اور مرحوم بھاولپور جج ہوکر چلے گئے، مرحوم کو علی گڈھ کی تعلیمی تحریک سے بھی دلچسپی تھی، وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس کے صدر رہے، اور مسلم یونیورسٹی کے رکن بھی تھے،

مرحوم کی شخصیت گوناگون اوصاف کی حامل تھی، اور ہر مجلس و محفل مین انکی یکسان

قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، اُن کی مختلف النوع خدمات مین میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے اور وہ بھی خاص نوع کی یعنی لکھنے والے تو بیسیون ہین مگر اُنکا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے بیسیون کو ادیب، انشاپرداز، اہلِ قلم، مصنف اور شاعر بنا دیا، اور حق یہ ہے کہ اُنھین نے ہندوستان کو اقبال بخشا، اور انھین کے فیض نے شاہنامہ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو روشناس کیا،

مضمون لکھنے کے بعد اتفاق سے ماہِ نو کراچی (اپریل ۱۹۵۰ء) مین اُن کی ... سنین نظر سے گذرے جی چاہا کہ اُن کے واقعات کی صحیح تعیین کے لئے بعض سنین یہان نقل کردون،

وہ ۱۸۷۴ء مین لودھیانہ مین پیدا ہوئے ۱۸۹۳ء مین بی اے ہوئے ۱۸۹۵ء مین پنجاب آبزرور مین اسسٹنٹ ایڈیٹر اور تین سال کے بعد چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے ۱۹۰۱ء مین مخزن نکالا ۱۹۰۴ء مین بیرسٹری کے لئے لندن گئے ۱۹۰۷ء مین واپس آکر دلی مین بیرسٹری شروع کی، ۱۹۰۹ء مین لاہور چلے آئے ۱۹۱۱ء مین لائل پور مین سرکاری وکیل ہوئے اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے ۱۹۲۱ء مین لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے ۱۹۲۲ء مین پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر بنے ۱۹۲۵ء مین وہ قائم مقام وزیر تعلیم مقرر ہوئے ۱۹۲۶ء مین لیگ آف نیشنز مین ہندوستان کے نمائندہ ہوکر جنیوا گئے ۱۹۲۶ء مین مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی صدارت کی، ۱۹۲۷ء مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس مین صدارت کی، ۱۹۲۸ء مین پنجاب ایگزیکٹیو کونسل کے قائم مقام ممبر بنے اور سر کا خطاب پایا، ۱۹۲۹ء مین پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے ۱۹۳۰ء مین لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج ہوئے ۱۹۳۴ء مین انڈیا کونسل لندن کے ممبر ہوئے، اور پانچ سال تک لندن رہے جہان سے ۱۹۳۹ء مین ہندوستان واپس آئے اور اسی سال کچھ عرصہ کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے قائم مقام ممبر رہے، ۱۹۴۲ء مین بہاولپور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بنے، جہان سے ۱۹۴۵ء مین واپس آکر لاہور مین مقیم ہوئے، اور آخر مین فروری ۱۹۵۰ء مین سپرد خاک ہوئے۔

اوپر کی سطرون کے پڑھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مرحوم نے وقت کے اہم حکومت کے اعلیٰ سے

اعلیٰ عہدے حاصل کئے، اور بڑے بڑے دنیاوی اعزاز سے سرفراز ہوئے، مگر دیکھنا یہ کہ دنیا اگر انھیں یاد رکھے گی تو مدیر مخزن ہی کی حیثیت سے یاد رکھیگی، ادبی قبر پر احترام کے پھول چڑھاتی رہیگی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی ادبی احترام کے آگے دنیا کے سارے اعزاز ہیچ ہیں، اور آخر یہ اعزاز بھی تاریخ کے صفحوں میں آسودۂ خواب ہو جائے گا، دنیا نے کس کو یاد رکھا ہے، اور کس کو یاد رکھے گی، شہرت بھی ایک فریب سراب ہے، یا نقش بر آب،

مرحوم کو علماء اور اہل دین سے ایک نسبت تھی، وہ مذہبی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر یقین رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اجلاس مدراس کی تقریر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس کے خطبہ صدارت میں انھوں نے کیا تھا، ابھی حال میں مدراس کے ایک بزرگ نے ان کی وفات کے فوراً ہی بعد اس کا اقتباس چھاپا ہے، اور یہ معلوم کر کے کہ ان کا انتقال ہو گیا، تاریخ وفات کہی ہے، بزرگوں کا آخری حال یہ ہے حسن اتفاق کی مغفرت کی بشارت ہو، امر اللہ کا مرحوم کی یادگار میرے پاس اُن کے ہاتھ کے دو خط ہیں، ایک اردو میں ایک انگریزی میں ۱۹۵۰ء میں وزارت تعلیم ریاست بہاولپور نے اپنے جامعہ عباسیہ کے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں مجھے بلایا تھا، ریاست بہاولپور کے فرمانروا کے ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر بڑے احسانات ہیں، اسی کی امداد سے دارالعلوم کی موجودہ ناتمام عمارت اس شان سے تعمیر ہوئی، جی چاہتا تھا کہ بقیہ عمارت بھی انھیں ریاست کی امداد سے تکمیل پائے، میں بہاولپور جاتے ہوئے شیخ صاحب مرحوم سے لاہور میں ملا، اور اُن سے خواہش کی کہ وہ دربار کے چند اعلیٰ عہدہ داروں کے نام مجھے سفارشی خط لکھ دیں، چنانچہ مرحوم نے اس تعلق کی بناء پر جو ان کو قدیم سے دارالعلوم ندوہ سے تھا، فوراً یہ دونوں خط لکھ دئیے، ایک اردو میں کرنل قریشی صاحب کے نام اور دوسرا انگریزی میں خان بہادر محمد حسین صاحب کے نام، مگر وہاں کچھ مقامی حالات ایسے تھے کہ میں نے ان دونوں خطوں سے کام نہیں لیا، خود وزیر صاحب تعلیمات نے نواب صاحب بہاولپور کو ادھر متوجہ کیا، اور انھوں نے وعدہ فرمایا، اور پندرہ ہزار کی رقم منظور ہوئی، جس کی باضابطہ اطلاع وزیر اعظم صاحب بہاولپور نے مجھے دی، مگر افسوس ہے کہ بار بار یاددہانی کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہ ہوا، کاش اگر اب بھی یہ رقم مل جاتی تو اس کو ایک طرح کا تعلق شیخ صاحب کی زندگی سے بھی ہوتا، اور ہندوستان میں پاکستانی فرمانروا کی یادگار رہتی،

"س"

اسلامی نظریہ سیاست از جناب مولوی حمید زمان صاحب صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت

۱۰۴ صفحے، کاغذ، کتابت طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:۔ کتاب منزل لاہور،

ہر زمانہ کے مذاق و رجحان کے مطابق دنیا کے تمام نظاموں کی خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی خوبی و خرابی جانچنے کا ایک معیار ہوتا ہے، یہ زمانہ سیاسیات و معاشیات کا ہے، اس لئے ہر نظام کے عیب و ہنر کو اسی پیمانہ سے جانچا جاتا ہے کہ وہ سیاسی و معاشی حیثیت سے انسانوں کے لئے کہاں تک مفید ہے، اور اس نے اُن کے دنیاوی معاملات و مسائل کا کیا حل پیش کیا ہو، اسی کے فیصلہ کے لئے جمہوریت اور کمیونزم میں رسہ کشی جاری ہے، اس مقابلہ میں اسی نظام کو کامیابی ہوگی، جو عملاً اپنے کو انسانوں کے لئے مفید اور بہتر ثابت کر سکے گا، مصنف نے عرصہ ہوا اسی نقطہ سے معارف میں اسلامی سیاست پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا اس کو اب کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں قدیم مذہبی سیاسی اور جدید جمہوری نظاموں اور اسلامی نظام کا موازنہ کر کے اسکی خوبیاں دکھائی گئی ہیں اور اسکے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کے اس کی برتری ثابت کی گئی ہے، کتاب کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے سیاسیات اسلام کے نظریوں پر اصولی تبصرہ ہے، اس میں اس مسئلہ کی کلامی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور مسلمان حکومتوں کی طرز عمل سے اسلامی سیاست کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہے اس کو دور کر کے اسلامی سیاست کے صحیح نظریے پیش کئے گئے ہیں، اس موضوع پر یہ مقدمہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس زمانہ میں اسلامی سیاسیات کے نظریوں کو پیش کرنے کی بڑی ضرورت ہے، اور ایسی کتابیں نئی تعلیم یافتہ پود کی صحیح رہبری کے لئے ضروری ہیں،

دیوان غالب مع شرح از جناب جوش ملسیانی تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ :- آتما رام اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی،

اردو میں دیوان غالب کی بہت سی شرحیں موجود ہیں جن سے طلبہ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن وہ تعلیمی نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی ہیں، اس لئے پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی نے جو خود بھی شاعر ہیں، اور شعر و ادب کا اچھا مذاق رکھتے ہیں، خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے بی اے کے طلبہ کے لئے یہ شرح لکھی ہے، اور اس میں ان کی استعداد اور ضرورت کا پورا لحاظ رکھا ہے، کتاب کے شروع میں غالب کے کلام پر تبصرہ ہے، اور معاصر شعراء سے ان کا موازنہ کرکے اُن کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں ہم نے جا بجا سے اس شرح کو دیکھا، طلبہ کے لئے اس کو مفید پایا، اس کا مقدمہ خصوصیت کے ساتھ زیادہ کارآمد ہے،

نغمۂ الوہیت مترجمہ جناب حسن الدین احمد صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۲ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ؏ پتہ ادارہ ملیہ نمبر ۲۱ ۳۲ اعظم پورہ، روبرو مدرسہ اعزہ حیدرآباد دکن

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں عارفانہ اور فلسفیانہ حقائق و تعلیمات کے لحاظ سے بھگوت گیتا کا خاص درجہ ہے، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں، اردو میں نظم و نثر میں اس کے کئی ترجمے ہیں، یہ نیا ترجمہ جناب حسن الدین احمد صاحب نے کیا ہے، ایسی دقیق فلسفیانہ کتابوں کا سلیس ترجمہ بہت مشکل ہے، لیکن یہ ترجمہ بہت صاف اور رواں ہے، گیتا میں جن اشخاص کے نام آئے ہیں، کتاب کے آخر میں اس کی مختصر تشریح کر دی گئی ہے، جس سے کتاب کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، جن لوگوں کو اس قسم کے لٹریچر کا ذوق ہو، یہ ترجمہ اُن کے مطالعہ کے لائق ہے،

م

رجسٹرڈ نمبر

جون

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت

جلد ۶۵ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۵۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

مئی کے شذرات مین ٹنڈن جی کے اس مطالبہ پر کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کرلین مین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لہجہ مین گو سختی ہے جس کا مجھے افسوس ہے تاہم جو بات لکھی گئی ہے، اس کی سچائی مین کوئی شبہہ نہین، ٹنڈن جی اس صوبہ کی کانگریس کے اس وقت سب سے بڑے آدمی ہین، کانگریس کے اصولون مین ہندو مسلمانون کا امتیاز نہین، ایسی حالت مین ٹنڈن جی کا بار بار یہ مطالبہ کہ مسلمانون کو چاہئے کہ ہندو کلچر اختیار کرلین کانگریس کی بولی نہین، ہندو مہاسبھا کی بولی ہے،

کانگریس کے بڑے لوگون نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ہندوستان کے کل باشندے خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان یا عیسائی سب ایک قوم ہین، اور اسی لئے اونھون نے ہندو کلچر اور مسلمان کلچر کی تفریق ماننے سے انکار اور صرف ایک ہندوستانی کلچر کا اقرار کیا ہے، ایسی صورت مین صوبہ کانگریس کے موجودہ صدر کی یہ بلند بانگ رجز خوانی کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کرلین، مسلم لیگ کے اس دعوی کی تصدیق ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومین ہین، اور دونون کے دو کلچر ہین لیکن اب ان مین سے ایک کو مٹ جانا اور صرف دوسرے کو زندہ رہنا چاہئے،

پھر ٹنڈن جی کو چاہئے کہ آئین ہند کی اس دفعہ کو مٹا دین جس مین اقلیتون کے مذہب، زبان اور کلچر کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہین کہ آئین بنانے والون اور آئین کے ماننے والون کے ذہنون مین یہ چیز تھی کہ ہندوستان مین مختلف مذہب، مختلف زبانین، مختلف تمدن اور مختلف کلچر ہین اور ان مین سے ہر ایک کو زندہ رہنا چاہئے،

ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نے آج سے بہت پہلے اپنی آپ بیتی مین بڑے شد ومد سے یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوستان مین کوئی ہندو کلچر اور مسلمان کلچر نہین، اور ان مین لوٹا اور لنگی کے سوا کوئی فرق نہین ہے، اگر ان کا یہ بیان صحیح ہے تو پھر صدر صوبہ راج رشی ٹنڈن جی کے اس مطالبہ کے کہ مسلمانون کو چاہئے کہ وہ ہندو کلچر اختیار کرلین، کیا معنی ہو سکتے ہین ؟

اتفاق دیکھئے کہ عین ان سطرون کے لکھتے وقت پائنیر مورخہ ۲۱ر مئی ۱۹۵۰ء مین پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تقریر چھپی ہے، جو انھون نے دہلی کی یونائیٹڈ نیشنس اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن دہلی مین ۲۰ر مئی کو کی ہے، اس مین کہتے ہین کہ

"ملک کے نوجوانون مین ہندو کلچر کے نعرون کی رہبری کی جارہی ہے، جو نہایت گھٹیا، عامیانہ، تنگ دلانہ اور مغرورانہ ہے، ہمارے خیال مین کلچر طریق کردار اور طریق عمل کا نام ہے، اس کے معنی جو تم ہوتے ہو نہ کہ جو تم پکار کر کہتے اور بکتے ہو، اگر ہم چاہتے ہین کہ ہم ترقی یافتہ قوم بنین تو ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی ذہنیت کو بھی ترقی دین، ملک کی تقسیم سے پہلے جب اسلامی کلچر کی بات کہی جارہی تھی، تو آج سے سترہ برس پہلے مین نے اپنی کتاب آپ بیتی مین ہندو کلچر اور اسلامی کلچر پر بحث کی تھی کہ ہندو اور مسلم کلچر سے کیا مراد ہے؟ مین اس کے سمجھنے سے قاصر ہون، البتہ .... ہندوستانی کلچر، عرب کلچر اور ایرانی کلچر تک تو سمجھ مین آسکتا ہے،

پنڈت جی نے جو بات کہی ہے وہ کانگریس کا نقطۂ خیال ہے، اور اسی پر اس کی ساری سیاست کی بنیاد ہے، ایسی صورت مین ٹنڈن جی کا مطالبہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر کانگریس کے اصولون کے خلاف ہے، اور بجائے اس کے کہ مسلمان اس کی مخالفت مین آواز اٹھائین خود کانگریسیون کو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے اگر وہ ایسا نہین کرتے تو وہ اپنے اصولون سے پیچھے ہٹتے ہین،

اسی سلسلہ مین پنڈت جی نے وہ بات کہی ہے جو معارف مین بار بار کہی گئی ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا زمانہ ہمیشہ وہ رہا ہے، جب اس نے دوسری قومون اور ملکون سے تعلقات پیدا کئے، اور بیرونی اثرات کو قبول کیا ہے، اور اس کے زوال کا زمانہ وہ ہے جب وہ دنیا سے اپنے کو الگ تھلگ کر کے اپنے اندر محدود ہو گیا ہے،

۲۳ر مئی ۵۰ء کے پائنیر مین وحید احمد صاحب پارلی منٹری سکریٹری یو پی کی ایک تحریر نظر سے گذری جس سے معلوم ہوا کہ ٹنڈن جی نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے ملحد اپنی

ایک تقریر مین انٹر میرج یعنی ہندوستان کے مختلف فرقون کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز پیش کی ہے، مین نے یہ تقریر نہین پڑھی، اگر اس سے ٹنڈن جی کا مقصد ہندو جاتیون کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز ہے تو مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا نہین ہے، لیکن اگر اس سے مقصود ہندو مسلمانون کے درمیان شادی بیاہ کی تجویز ہے جیسا کہ مضمون نگار کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، تو مین ٹنڈن جی کی اس تحریک کو مسلمانون کی امتیازی حیثیت کو فنا کر دینے کے لئے دوسرا قدم سمجھتا ہون، شاید معلوم ہو تا ہے، کہ مسلمانون کا بحیثیت مسلمان کے جداگانہ وجود باقی نہ رہے،

لیکن مجھے اس تحریر کو پڑھ کر ٹنڈن جی سے زیادہ خود مضمون نگار کے جواب سے جو اسلام کی طرف سے انھون نے دیا ہے سخت تکلیف ہوئی ہے، مضمون نگار نے راج رتنی کو ان کو اس تجویز کی بنا پر مغل اعظم کا خطاب دیا ہے کہ اکبر نے راجپوت شہزادیون سے بیاہ کر کے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، راج رتنی اسی کا رواج اب عہد کے مغل اعظم بن کر دینا چاہتے ہین، اور اس کے بعد مضمون نگار نے ہندوون کی مذہبی کتاب وید کو الہامی کتاب مان کر اور ہندوون کو اہل کتاب مین داخل کر کے مسلمانون اور ہندوون مین نکاح کے جواز کا فتویٰ دیا ہے،

مضمون نگار میرے پرانے دوست ہین، اس لئے اول تو ان سے مخلصانہ عرض ہے،

چیزے کہ نخواندہٗ تو تفسیر مکن صیادنہٗ اگر تو تحریر مکن

"کتاب" قرآن پاک مین ہر اس کتاب کا نام نہین جس کو کوئی قوم اپنی الہامی کتاب مانے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس کے الہامی کتاب ہونے کی قرآن پاک نے خبر دی ہو، اور وہ صرف توراۃ، زبور اور انجیل ہین اور ان کتاب . . . والون کی بھی عورتون کا نکاح مسلمان مردون سے جائز ہے، مردون کا نکاح مسلمان عورتون سے درست نہین، اور ایسی قومین جو اسلام سے پہلے کسی ایسی کتاب کے مدعی ہون جس کی تصدیق قرآن پاک نے نہین کی ہے، فقہا نے شبہ اہل کتاب کا خطاب دیا ہے، ان سے نکاح کسی طرح کا قطعاً ناجائز ہے، افسوس ہے کہ کمزور عقیدہ کا مسلمان آج اپنے کو اکثریت سے مغلوب پا کر اپنے بچاؤ کے لئے اپنے قتل نامہ پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے کو تیار ہے"

ہم ہندو مسلمانون کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہین، لیکن یہ قطعاً ضروری نہین سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہو، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہکر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہین جس کی مثالین انگریزون کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان مین کثرت سے تھین، اور اب بھی ہین،

مقالات

مسلمانون کی حکومت

مین

غیر مسلم اقوام

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ

(۱)

اس مضمون مین بجائے اسلامی حکومت کے "مسلمانون کی حکومت" کا عنوان قصداً قائم کیا گیا ہے کیونکہ عام استعمال کے رو سے تو ہر وہ چیز جو مسلمانون کی طرف کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب ہو آج کل اس کو بھی لوگ اسلامی کہدیتے ہین، حتی کہ اسی بنیاد پر "اسلامی چاء" "اسلامی پانی" کے الفاظ آج تک کانون مین نہ سہی لیکن حافظون مین تو اب بھی گونج رہے ہین، جب چاء کے بیچنے والے اپنی چاء کو بیچنے کے لئے اسلامی کے اس لفظ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے، اور اسٹیشنون کے بھشتی اسی لفظ کی پشت پناہی مین بخشش کا مستحق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے،

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام تو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ایک پیغام ہے، ایسا پیغام جس مین اپنے بندون پر حق تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ ذمہ داریان عائد فرمائی ہین، کائنات کے ماضی و مستقبل وحال کے متعلق فکری نظام عطا کیا گیا ہے، یعنی ہستی کا موجودہ نظام جس کا ایک جز خود ہم انسانون کا

وجود ہے اس کی ابتدا، اور اس کے آخری انجام و انتہا، اور یہ کہ اس وقت یہ نظام جو چل رہا ہے
کیسے چل رہا ہے، کون چلا رہا ہے، انہی اساسی اور بنیادی سوالوں کے جواب کے متعلق ہمیں کیا سوچنا چاہیئے
خود اس عالم کے پیدا کرنے والے نے جو علم اس راہ میں عطا کیا ہے، اس علم کو یقین و قطعیت کی قوت
کے ساتھ ماننا اسی کی مذہبی تعبیر اعتقاد ہے، اور جو معلومات اس سلسلہ میں خالق کائنات کی طرف سے
ہم پر کھولے گئے ہیں، اُن ہی کو عقائد کہتے ہیں، پھر زندگی کو اسی فکری نظام کے تحت رکھتے ہوئے صحیح انجام
تک پہنچنے کے لئے ایک عملی دستور العمل یا ضابطہ پیدا کرنے والے نے عطا کیا یہی اسلام کا عملی نظام ہے آمنوا
وعملوا الصالحات کا تعلق علم و عمل کے ان ہی دو نظاموں کے ساتھ قائم ہے،

ظاہر ہے کہ اسٹیشنوں پر بکنے والی چائے، یا تقسیم ہونے والا پانی، مندرجہ بالا دونوں باتیں یعنی اسلام
کے فکری یا عملی نظام سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا، نہ چائے آسمان سے اُتری، اور نہ پانی، اور نہ چائے بنانے
کا طریقہ اسلام میں بتایا گیا ہے، اور نہ پانی کو کنوئیں یا تالاب سے نکالنے، مشکوں میں بھرنے پشت پر
اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم کے کنارے ٹھلنے بھرنے کا طریقہ، بھشتیوں کو اسلام نے سکھایا ہے،

مگر یہ فرض کرکے کہ مسلمان اس چائے کو استعمال کریں گے، یا اس پانی کو پئیں گے، بکنے والوں نے اس
چائے اور پانی کا نام اسلامی چائے اور اسلامی پانی رکھدیا، اور یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ "اسلامی" کے
اس لفظ کو اتنی وسعت دیکر لوگ اگر استعمال کر رہے ہیں، تو یہ بالکل ایک جداگانہ اپنی من مانی گھڑی
ہوئی خود تراشیدہ اصطلاح یا ایسی اصطلاح ہے، جو خاص خاص اغراض کے زیر اثر کسی طرح چل پڑی ہے
لیکن اسلام کے اس لفظ کو صرف اس پیغام اور فکری و عملی نظام کی حد تک اگر محدود رکھا جائے
جو بندوں کو پیدا کرنے والے خالق کی طرف سے پہنچایا گیا ہے، اور یہی "اسلام" کے لفظ کا صحیح مطلب بھی
پیغام پہنچانے والے پر اعتماد کرکے خدا کے جن بندوں نے اس "پیغام" کو قبول کرلیا، اور اس کے مطابق جینے
اسی پر مرنے کا قطعی فیصلہ جو کرچکے ہیں، ان ہی کا نام "مسلم" ہے، اور اسی کی فارسی جمع لفظ "مسلمان" ہے جو

مسلمانان کی فارسی اور مسلمانوں کی اردو جمیع الجمع کے بعد اب خود مفرد ہو کر رہ گیا ہے،

ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغام یعنی اسلام کا خطاب بندون کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس کے مخاطب جیسے مرد ہین، عورتین بھی ہین، جوان بھی ہین اور بوڑھے بھی، مسافر بھی ہین، اور مقیم بھی، مالدار بھی ہین، اور وہ بھی جو زائداز ضرورت آمدنی نہین رکھتے، جو صحت مند اور چنگے ہین، وہ بھی اور صحت کی نعمت سے جو محروم ہین وہ بھی، باپ بھی ہین، اور بیٹے بھی، مان بھی ہے، اور بیٹی بھی، الغرض انسانیت کے سارے "تکلیفی مظاہر" اس خطاب کے مخاطب ہین جن مین جیسا کہ عرض کیا گیا، ہر طرح کے لوگ مرد و عورت، جوان بوڑھے وغیرہ شریک ہین، اسی طرح حکمرانی کا اقتدار جن افراد کے ہاتھون مین قدرت پہنچا دیتی ہے، جنھین حاکم کہتے ہین، اور وہ بھی جنھین اس اقتدار کا کوئی حصہ نہین بخشا گیا ہے،

بہر حال کہنا یہ ہے کہ اس پیغام کے مخاطب جیسے حاکم ہین، اسی طرح اس کے مخاطب محکوم بھی ہین، وہ بھی ہین جو کسی کو ملازم اور نوکر رکھتے ہین، اور وہ بھی جو ان نوکرون یا ملازمون سے کام لیتے ہین، اسلام کے اس "الٰہی پیغام" کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے مخاطب سارے تکلیفی مظاہر ہین، لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ لوگ جانتے ہین، اسی پیغام کی بعض باتین ایسی بھی ہین جن کی تعمیل کی ذمہ داری خاص خاص طبقون پر عائد ہوتی ہے، مثلاً بہت سے احکام ایسے ہین جن کے مخاطب صرف مرد ہین، اور بعض باتین ایسی بھی ہین، جو صرف عورتون کی حد تک محدود ہین، بہت سے واجبات و فرائض ہین، جن سے بیمارون کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، یا کہنہ سال بوڑھون سے وہ معاف ہین، بہت سے مطالبات کا رُخ صرف مالدارون کی طرف ہے، غریبون کم مایہ لوگون کا ان سے کوئی تعلق نہین، کچھ احکام ہین جن کا پابند اسلام ان لوگون کو بنانا چاہتا ہے، جو دوسرون سے کام لیتے ہین، کچھ ذمہ داریان ان کی بھی ہین، جو دوسرون کا کام کرتے ہین، پدری منصب کے کچھ فرائض ہین، جو ان فرائض سے بالکل مختلف ہین جن کے مکلف بیٹے ہین،

اسی سلسلہ میں احکام و قوانین کا ایک مستقل ضابطہ[1] اسلام نے ان لوگوں کے بھی سپرد کیا ہے جو زمین کے کسی علاقہ میں حاکمانہ اقتدار کے مالک ہیں، اسی کے مقابلہ میں کچھ ذمہ داریاں اُن کی بھی اسلام ہی نے مقرر کی ہیں جن کی جان و مال، عزت و آبرو، فلاح و بہبود وغیرہ جیسے امور کی نگرانی کے لئے حکومت قائم ہوئی ہے؛

ایسی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ مثلاً مسافر بن جانے کے بعد جن اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف مسافروں کو توجہ دلائی گئی ہے، جیسے یہی کہ نماز میں قصر کریں، روزے ماہ رمضان کے چاہیں تو موخر کر سکتے ہیں یا اسی قبیل سفر کے متعلق دوسرے مشورے جو مسافروں کو دین کی طرف سے دیئے گئے ہیں، اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر کو بھی دو قسموں میں تقسیم کر کے سفر کی ایک قسم کا نام اسلامی سفر اور دوسری قسم کا نام "غیر اسلامی سفر" رکھنے پر اصرار اور اس اصرار کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اسلامی سفر کے ہر ہر جز کا جائزہ لیا جائے، اور دیکھا جائے کہ کتاب و سنت میں اس کا ماخذ کیا ہو مسافر نے

---

[1] فبھداھم اقتدہ ولیھدیکم سنن الذین من قبلکم، ان گذشتہ پیغمبروں کی پیروی کرو، تاکہ تمہاری راہ نمائی ان لوگوں کے طریقوں کی طرف خدا کرے جو تم سے پہلے تھے؛

یہ اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں میں پیغمبروں کی امت مسلمہ کو خطاب کر کے جیسا کہ ظاہر ہے یہی بتایا گیا ہے کہ کسی نئی راہ و رسم کی تعلیم نہیں، بلکہ اصولاً انہی باتوں کی تجدید تر و تازگی یا جو بھلا دئیے گئی ہیں ان کی یاد دہانی اسلام کے جدید پیغام سے مقصود ہے جن سے پیدا کرنے والا نسل انسانی کو ہر زمانہ اور ملک میں مطلع کر رہا ہو اور اُن کی پابندی کا مطالبہ کیا ہے، زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ حکمرانی کے اسلامی ضابطہ کا بھی یہی حال ہو اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب کے نام سے نہیں قانون و آئین کے عنوان سے آج دنیا کی اکثر حکومتوں کی بنیادوں میں وہی چیزیں نظر آتی ہیں جن کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے اسلام نے کیا ہے، عمدۃً طور پر قوموں میں یہ باتیں منتقل چلی آرہی ہیں انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام کا کون منکر ہے، ظلم و تعدی استحصال بے جا لوٹ کھسوٹ کو دنیا کی کون سی حکومت جائز رکھتی ہے، گویا غیر شعوری طور پر آج بھی حکومتوں

بستر جو باندھا ہو تو اس کی بندش میں اُس نے قرآن کی کس آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس حدیث کو پیش نظر رکھا ہے، بستر کس چیز سے باندھا، رسی سے باندھا، چمڑے سے باندھا، ہو لڈل میں باندھا، پھر یہ کہ کس سواری پر سوار ہوا، زاد راہ میں اپنے ساتھ کیا کیا رکھا، یہ اسی قسم کے بے شمار سوالوں کو اٹھا اٹھا کر اس پر بحث کرنا کہ مسلمان مسافر کا یہ سفر واقعی اسلامی سفر کیے جانے کا مستحق ہے بھی یا نہیں خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک مناسب ہو ؟ اور ایک سفر ہی کیا ؟ ان کل تصورن میں جن میں بعض کا ذکر ابھی تمثیلاً کیا گیا، کیا ہر ایک میں اسلامی وغیر اسلامی کی اس تقسیم کو جاری کرنا ور اسلامی قرار پانے والی قسم کے متعلق تفتیشی سوالات کے اٹھانے، اور اس کے ہر ہر پہلو کو اسلامی قوانین کے اساسی ماخذوں اور بنیادی سرچشموں پر منطبق کرنے کی ضرورت اسلام کی سیز دہ صد سالہ تاریخ میں کیا کبھی محسوس کی گئی ہے، ہو لباس ہی کو لیجئے، چند ضوابط اسلام میں لباس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں مثلاً مردوں کو چاہئے کہ ریشم کا لباس استعمال نہ کریں، لوگ اسبال ازار کے مرتکب نہ ہوں، ان چند باتوں کو دیکھ کر اسلامی وغیر اسلامی لباس کی تقسیم اور اسلامی کے متعلق یہ سوالات

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) کی اکثریت ان ہی بنیادوں پر قائم ہے، جن پر اسلامی یا الٰہی حکومت کو قائم ہونا چاہئے، بنیادی کلیات کو مان لینے کے بعد ان کے تفریعی جزئیاتی قوالب تک لوگوں کا پہونچنا زیادہ دشوار نہیں ہے، اور میرا تو خیال ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو اسلام کے جزئیاتی قوالب بھی عموماً معلوم ہوگا کہ نئے نہیں ہیں، چوری کی سزا حد یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں بھی جیسا کہ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، یہی تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، بلکہ ویاس جی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ پراچین اتہاس (قدیم تاریخی قصہ) ہے، بیان کیا کہ جو ڈنڈ چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو، اس درخواست پر راجہ نے حکم دیا کہ دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو، دیکھو مہابھارت شانتی پرب مسافروں ادھیاسے، جس سے معلوم ہوا کہ پراچین عہد کا یہ قدیم قانون تھا،

کہ اس کی تراش کیا ہو، سلائی کیسے کی جائے، کیسے پہنا جائے؟ کیا کسی زمانہ میں لوگوں نے ان سوالوں کو اٹھایا؟ عام طریقہ اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی مسلمانوں کو اسلام نے جن حدود میں رہنے کا حکم دیا ہے، بس ان حدود کو دیکھ لیا جاتا ہے، ان حدود کے اندر رہنے والے اپنے دین کے پابند مسلمان سمجھے جاتے ہیں، اور ان حدود سے تجاوز کرنے والوں کو سمجھا جاتا ہے کہ اپنے دین کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں،

پھر فرض و واجب، سنت و مستحب اولیٰ، یا حرمت و کراہت تحریمی و تنزیہی، خلاف اولیٰ وغیرہ ہونے کے حساب سے مطالبہ کی جو نوعیت ہوتی ہے، اسی کے اعتبار سے خلاف ورزی کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے، یعنی کبیرہ گناہ کا مرتکب حدود سے تجاوز کرنے والا ہے، یا صغیرہ کا، یا صرف قابل ملامت

بہرحال اتنا دیکھ لینے کے بعد اس خاص شعبہ کے جن دوسرے پہلوؤں کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے، بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنی اپنی ضرورتوں اپنے اپنے حالات اور دوسرے اقتضاؤں کی بنیاد پر عقل و تجربہ عمل کی جو راہ پیش کرے، اسے مسلمان اختیار کریں اصطلاحاً انہی کو "مباحات" کہتے ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سفر ہی کو لیجئے، جب پیش آتا ہے تو چند خاص باتوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے سفر کے تمام پہلوؤں کے متعلق آزادی عطا کی گئی ہے کہ مصلحت کے مطابق جو کچھ اسکی سمجھ میں آئے اختیار کرے،

ظاہر ہے کہ کسی خاص مقام مثلاً لکھنؤ سے دلی تک ایک ہی سفر کوئی کرے، اور سفر کے سارے اسلامی مطالبات کی تکمیل اس میں کی جائے، پھر بھی اس مسافر کا یہ خاص سفر جن بے شمار امور پر مشتمل ہوگا، ان میں ایسی چیزیں جن کو ہم اسلامی مطالبات کہہ سکتے ہیں، ان امور کے معاملہ میں جن کا "مباحات" سے تعلق ہے، شاید آٹے میں نمک سے زیادہ اُن کی حیثیت نہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ گو سفر میں بھی آدمی کو دین کے بعض مشوروں کو شریک کرنا پڑتا ہے، مگر محض اس کی وجہ سے سفر کی

کی ایک مستقل قسم اسلامی سفر کی اصطلاح نہین بنائی گئی،

ہم یہی پوچھنا چاہتے ہین کہ حاکمانہ اقتدار رکھنے والے مسلمانون کو بھی اس مین شک نہین کہ اسلام نے ایک ضابطہ ضرور دیا ہے، لیکن جیسے قصر صلوٰۃ یا تاخیر صوم وغیرہ دینی مسائل کے جاننے والون کے لئے سفر کے تمام مشکلات حل نہین ہو جاتے، بلکہ ابتدائے سفر سے آخر تک ہر ہر قدم پر عقل و تجربہ، ضرورت وغیرہ کے لحاظ سے ہزارون فیصلے کرنے پڑتے ہین، اور عقل و تجربہ وغیرہ کی روشنی مین کئے ہوئے ان فیصلون کی وجہ سے اس مسافر کا سفر جس نے "اسلامی مطالبات" کی تعمیل مین اپنے پورے سفر مین کوتاہی نہ کی ہو جیسے اس مسافر کے سفر کو نہ غیر اسلامی کہا جا سکتا ہے، اور محض اس لئے کہ دوران سفر مین وہ نماز دین مین قصر کرتا رہا، یا روزے مین تاخیر سے کام لیا، یہ یا اسی قسم کے چند گنی چنی چیزون کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم اسلامی سفر نکالی گئی،

اسی طرح کسی علاقہ مین حکمرانی کا اقتدار جن مسلمانون کے ہاتھون مین آجائے، اور جن مطالبات کی تکمیل کے ذمہ دار مسلمان حکمران ٹھہرائے گئے ہین ظاہر ہے کہ محض ان ذمہ داریون کی تکمیل بھی اگر حکمرانی کے لئے کافی نہ ہو، تو یقیناً یہ اسلامی تعلیم کا نہ تو نقص ہوگا، اور مکان و زمان، حالات و احوال وغیرہ خصوصیات کی وجہ سے حکمرانی کے سلسلہ مین ان مسلمانون کو عقل و تجربہ کی راہون سے جن چیزون کو اختیار کرنا پڑے، ان کی وجہ سے وہ بیچارے اس کے مستحق ہون گے کہ ان کے طریقۂ حکومت کو غیر اسلامی طریقۂ حکومت قرار دیا جائے، اور جیسے یہ فتویٰ لگانا ان پر درست نہ ہوگا، اسی طرح میری سمجھ مین تو یہی آتا ہے کہ ایسی حکومت جس مین زیادہ تر عقل و تجربہ کی روشنی مین نظر آنے والے حقائق ضرورۃً اختیار بھی کئے جاتے ہون، اور چھوڑے بھی جاتے ہون، اور ان ہی عقلی و تجربی عناصر سے حکومت کی مشینری بھری ہوئی ہو، اگر ان ہی کے ساتھ ان معدودے چند اسلامی ضوابط کو بھی اس مین شریک کر لیا جائے، جن کی تعمیل کا مطالبہ مسلمان حکمرانون سے کیا گیا ہے، جیسے مسافر اپنے سفر کے عقلی

دیگر بعض عناصر کے ساتھ ان چند باتوں کا بھی پابند ہو جن کا حکم دین میں مسلمان سا فرون کو دیا گیا ہے، تو مسلمان حکمرانوں کے محض اس طرز عمل سے یعنی حکمرانی کے ان معدودے چند ضوابط کو اپنے طریقۂ حکمرانی میں شریک کر لینے کی وجہ سے ایسی حکومت کو اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت کہنے کی وجہ بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اور آج تک مسلمانوں کی حکومت جہاں کہیں قائم ہوئی، جہاں تک میں جانتا ہوں اس کو "اسلامی حکومت" یا "الٰہی حکومت" وغیرہ ناموں سے شاید کبھی موسوم نہیں کیا گیا، یہ نام نہ عہد خلافت راشدہ میں حکومت کا ہم پاتے ہیں، اور نہ اس کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کو یہ نام کسی زمانہ میں دیا گیا، حکومت بنی امیہ، حکومت عباسیہ، حکومت غزنویہ، غوریہ، مغلیہ، عثمانیہ، اس قسم کے نام تو سننے میں آتے ہیں، لیکن ان مسلمان حکمرانوں نے کسی زمانہ میں اپنی حکومت کا نام حکومت اسلامیہ یا حکومت الٰہیہ رکھا ہو، کم از کم فقیر اس سے قطعاً ناواقف ہے،

بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کلیسا کے نام سے "پوپ" کے ہاتھ میں حکمرانی کا اقتدار آہستہ آہستہ جب منتقل ہوا، اور یورپ کے عام حکمرانوں پر برتری حاصل کرنے کے لئے دین کی پشت پناہی کی ضرورت پوپوں نے محسوس کی، تو شاید دنیا میں یہ پہلی بدعت انھوں نے قائم کی، کہ عام حکمرانوں کی حکومت کے مقابلہ میں "دینی حکومت" یا عیسائی حکومت یا کلیسائی حکومت وغیرہ نام اپنی حکومت کو دیا، پھر جب کلیسا کے خلاف یورپ میں ردّ عمل ہوا، تو کلیسائی حکومت" کے مقابلہ میں ضرورت پڑی کہ تمیز کے لئے سکولر حکومت" یا لادینی حکومت" ان حکومتوں کا نام رکھا جائے، جو "پوپ" کے سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لئے اور ان کو توڑ کر قائم ہوئی تھیں،

بہرحال جیسے سفر یا لباس یا اسی قسم کی ہر وہ چیز جس کے متعلق مسلمانوں کو مذہب کی طرف سے کچھ احکام و ضوابط عطا کئے گئے ہیں اُن کی تعمیل کی وجہ سے الٰہی سفر، غیر الٰہی سفر، یا اسلامی سفر، غیر اسلامی سفر، الٰہی لباس، غیر الٰہی لباس، اسلامی لباس، غیر اسلامی لباس، وغیرہ قسمیں کچھ ان سنی اور انجانی پائی میں مجھ تو خیال ہی گذرتا ہے کہ

الٰہی حکومت غیر الٰہی حکومت یا اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومت، حکومتوں کے نام رکھنے کی یہ رسم شاید نئی رسم ہے، یا کچھ تعجب نہیں کہ کلیسا اور پوپیت کی تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ نکل آئے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پینے والوں کی خصوصیت کی وجہ سے چاء یا پانی کا نام اسلامی چاء، یا "اسلامی پانی" لوگوں نے جیسے رکھدیا تھا، کچھ یہی حال حکومتوں کے ان ناموں کا بھی ہو، اور کیا تعجب ہے کہ آیندہ بجائے اسلامی کے چاء اور پانی کا نام بھی "الٰہی چاء" اور "الٰہی پانی" رکھدیا جائے، اور توجیہ یہ کی جائے کہ اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ چونکہ یہ چاء اور پانی مخصوص ہے، اور اسلام اللہ کا عطا کیا ہوا دین ہے، اس لئے اس چاء اور پانی کا نام "الٰہی چاء" اور "الٰہی پانی" رکھدیا گیا،

بہرحال بات ذرا طویل ہوگئی، ورنہ کہنے کی بات صرف اسی قدر ہے کہ آیندہ جو کچھ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے یہ مشکل تھا کہ "اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت" وغیرہ الفاظ جن کا چرچا سیاست کے اس عہد میں پھیلا ہوا ہے، اور جس قسم کے توقعات ان ناموں کے ساتھ قائم کر لئے گئے ہیں، یا قائم کرا دیئے گئے ہیں، توقعات کے اس معیار پر وہ ساری حکومتیں پوری اتریں گی، جن کے رقبۂ حکومت میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کا اجمالی تذکرہ یہاں مقصود ہے،

اتنی بات میں جانتا ہوں کہ حکمرانوں کا یہ گروہ مسلمان تھا، اور ان میں اگر سب نہیں، تو ذاتی حیثیت سے خواہ وہ کچھ بھی ہوں، لیکن حکمرانی کے سلسلہ میں ایسے کم ہی تھے، جن کے طریقۂ حکومت میں ضوابط کا وہ مجموعہ نہ شریک تھا، جس کی تعمیل و نفاذ کا کام مسلمان حکمرانوں کے ذمہ اسلام کی طرف سے سپرد کیا گیا ہو، فقہائے اسلام نے دین اسلام کے اساسی سرچشموں سے جن اجتہادی نتائج کو پیدا کیا تھا، عموماً ان ہی کے مطابق فصلِ خصومات، دفع نزاع کا کام آخر وقت تک انجام پاتا رہا۔ اور اسی کے ساتھ اپنے اپنے زمانہ اور اپنے اپنے ملک کے خصوصی حالات کی بنیاد پر ہر زمانہ میں عقل و تجربہ سے ہمیشہ کام لیا گیا ہی ان کی حکمرانیوں کا عام طریقہ تھا، اب چاہئے کہ اسلامی یا الٰہی حکومت کے معیا

پر وہ پوری ترقی ہون یا نہ ترقی ہون،

اسی جھگڑے سے بچنے کے لئے مین نے بجائے اسلامی حکومت کے مسلمانون کی حکومت کے عنوان کو قصداً اختیار کیا ہو، جیسے عام مسلمانون مین اچھے بڑے مذہبی مطالبات کی تکمیل مین کامیاب و ناکام سب ہی طرح کے لوگ ہین، وہ بھی تھے، اس وقت میرے سامنے اُن کی حکومت کا صرف ایک پہلو ہو، یعنی غیر مسلم اقوام کا مقام اور اُن کی عام حالت ان مسلمان حکمرانون کی مملکتون مین کیا تھی ؟

(۲)

واقعہ یہ ہو کہ جنگ و جدال لڑائی بھڑائی جس وقت تک ہوتی رہتی تھی، اس کی نوعیت اس زمانہ سے بالکل مختلف تھی، جب کسی علاقہ مین حکومت قائم ہوجاتی تھی،

اگرچہ جنگ و جدال کے وقت کے قصون کے متعلق بھی بہت زیادہ غلط فہمیان پھیلی ہوئی ہین، اور کیسی غلط فہمیان ؟ عہد نبوت کی جنگی مہمون ہی کے متعلق سوچئے عوام کے تاثرات ان کے متعلق کیا ہین ؟ ان عوامی تاثرات کا مقابلہ ذرا اس واقعہ سے کیجئے کہ دس سال کی طویل مدت جس مین یہ معرکے وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے، ان مین قریش، عرب کے عام قبائل، نیز یہودیون اور عیسائیون سب ہی سے مقابلے ہوئے، مگر جانتے ہین، ان مختلف اقوام کی دس سالہ آویزشون کے متعلق کام آنے والون یعنی قتل ہونے والون کی تعداد بہ مشکل پانسو سے ہزار تک پہنچ سکتی ہو، ان مین عرب و یہود، عیسائی اور مسلمان الغرض جنگ کے ہر فریق کے مقتولون کی تعداد شریک ہے[1]،

خیر لڑائی بھڑائی کا قصہ تو الگ ہو، بحث اس وقت قیام امن و امان کے بعد اس زمانہ کے متعلق ہے، جب باضابطہ حکومت کسی علاقہ مین قائم ہوگئی، مین دنیا کے مورخون کو چیلنج کرتا ہون کہ ہزار

---

[1] تفصیل کے لئے منجملہ اور کتابون کے خاکسار کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جا سکتی ہے، جس مین عہد نبوت مین کام آنے والون کی فہرست بھی شریک ہے، ۱۲

سال سے زیادہ طویل مدت جس مین دنیا کے مختلف حصّون مین مسلمانون کی حکومتین قائم ہوتی رہی ہین، کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اس لئے قتل کردیا ہو کہ وہ مسلمان نہین ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کردے،

شاید نصف صدی سے مسلمانون کی تاریخ کا مطالعہ کررہا ہون لیکن میرے حافظہ مین ایسی کوئی شہادت محفوظ نہین ہے، جس کی روشنی مین اس سوال کا جواب اثبات مین دیا جاسکتا ہو ممکن ہے کہ پہلے اس سوال کی طرف توجہ نہ ہو، مگر جب سے اس کا خیال آیا ہے کتابین پڑھتا رہتا ہون لیکن کوئی تائیدی شہادت کم ازکم اس وقت تک تو مجھے نہین ملی ہے، حالانکہ مسلمانون کی یہ حکومتین مشرق مین بھی قائم ہوئی ہین، اور مغرب مین بھی، اقتدار کی باگ کبھی اچھی فطرت کے لوگون کے قبضہ مین رہی اور ان ہی مین بعض غیر معتدل دل و دماغ بھی تھے، اور کیسے غیر معتدل؟

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ مین اگر کبھی کوئی چیز ہزارہا ہزار صفحات کے الٹ پھیر کے بعد ملتی بھی ہے تو وہی ہے کہ فوری محرکات نے غیظ و غضب کے جذبہ مین مغلوب کرکے بعض ناکردنی اقدامات کا ارادہ حکمرانون مین سے کسی کے اندر پیدا کیا، مگر یہ ارادہ کبھی پورا ہوا ؟ میرے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہے کہ کبھی پورا نہین ہوا سب سے بڑی روک اس قسم کے فاسد ارادون کی تکمیل مین بسا اوقات خود اسلام بن گیا، معارف کے ناظرین کو شاید یاد ہوگا کچھ دن پہلے مسلمانون کی طرف سے معذرت کے وجوہ پیش کرتے ہوئے خاکسار نے ایک طویل مضمون اسی مجلہ مین شائع کرایا تھا، اس مین ان نہ پورے ہونے والے فاسد ارادون کی کچھ تاریخی مثالون کا تذکرہ کیا گیا تھا، ترکی کے بعض سلاطین کے ساتھ ہندوستان کے بعض حکمرانون کا بھی نام لیا گیا تھا، عرض کیا گیا تھا کہ اسی ہندوستان مین سکندر لودی نے کورکشیتر کی تیرتھ گاہ کے بعض رسوم مین دخل اندازی کا ارادہ کیا تھا، لیکن دربار کے ایک عالم نے بادشاہ کو اسی وقت ٹوکتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس سلسلہ مین کچھ نہین کرسکتے، لودی نے

غضبناک ہو کر تلوار کھینچ لی، اور غریب مولوی کو دھمکاتے ہوئے کہنے لگا کہ تم کفر کی پشت پناہی کرتا ہو، مولوی نے جواب میں جو کچھ کہا تھا، اس کا حاصل یہی تھا کہ میں پشت پناہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان کا پشت پناہ تو خود اسلام ہے، اسی مقالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کی اس آخری وصیت کا بھی ذکر کیا گیا تھا جس میں ان غیر مسلم باشندوں کی جو مسلمانوں کی حکومت میں آباد ہوں، ذمہ داری لیتے ہوئے تاکید فرمائی گئی تھی کہ اُن کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے ارشاد فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن میں خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں حجیج بن کر کھڑا ہوں گا، یعنی نبوت کی طرف سے ان حکمرانوں پر، بارالٰہی میں دعوی دائر ہوگا جن سے اس وصیت کی تعمیل میں کوتاہی ہوگی،

ان ہی پیغمبرانہ شدید تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ عموماً اپنے زمانہ میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ ہمیں منع کیا گیا ہے کہ

ان اصیب من معاهد ابرة	معاہد یعنی (مسلمانوں کے قلمرو کے غیر مسلم)
(جلد ۴ ص ۲۹۰ اسد الغابہ)	سے ایک سوئی بھی لیں،

مسلمانوں کو صحابہ ہی کی طرف سے یہ بھی سنایا جاتا تھا کہ

اذا اخفرت الذمة ادیل العدو	ذمہ جب توڑا جائے (یعنی غیر مسلم رعایا
(جلد ۴ ص ۲۳۳ اسد الغابہ)	جن کی حکومت نے ذمہ داری لی، اور ان
	کی ذمہ داری کو پورا نہ کرے گی) تو دشمن
	کو پلٹا دیا جائے گا، (یعنی مسلمانوں سے
	حکومت چھن جائے گی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اوردیں وثائق سنان حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ لیا جنھوں نے

کسی مذہبی جذبہ کے تحت قانون کے حدود سے نکلنے کا کبھی ارادہ کیا، اس سلسلہ میں ہندوستان ہی کی تاریخ کی ایک دلچسپ مثال وہ بھی ہے، جس کا تذکرہ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے،

جلال الدین خلجی جو خلجی خاندان کا پہلا حکمران تھا، تقدیر نے اس ترک سپاہی کو موقع دیا، اور دلی کے تخت پر قابض ہو کر سارے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا، غوریوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کی حکومت پر سو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا کہ جلال الدین نے خلجی خاندان میں حکومت منتقل کر دی، اس ایک صدی سے زیادہ مدت میں ہندوستان کے عام غیر مسلم باشندے جس قسم کی زندگی گذار رہے تھے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن اپنے درباریوں سے دیکھا گیا کہ جلال الدین کہہ رہا ہے :-

ہر روز ہندوان، مندل زنان و بوق زنان در زیر کوشک می گذرند، و در جون می آیند و بت پرستی می کنند و در دار الملک با ہزار ناز و کرشمہ و باشوکت نعمت زیند تلذذ ہا و تنعمہا گیرند، و در میان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند، و آشکارا و کشادہ بت پرستیہا می کنند، و طبل زنان احکام کفر و شرک را رواج می دہند،

(جلد اص ۲۱۷)

ہندو روزانہ جھانجھ بجاتے ہوئے اور نرسنگھا پھونکتے ہوئے کوشک (شاہی محل) کے نیچے سے گذرتے ہیں، اور جمنا گھاٹ پر پہونچ کر پوجا پاٹ کرتے ہیں، اور دار السلطنت میں ہزاروں ناز و کرشمہ اور دولت و ثروت کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اور ان سے لذت گیر ہوتے ہوئے عشرت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان عزت و فخر سے مباہی کے ساتھ رہتے ہیں اور کھلے بندوں علانیہ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، اور ڈھول

[illegible]

سو سال سے زیادہ زمانہ کے اس عام دستور کے ذکر سے جلال الدین کی غرض کیا تھی، اگرچہ مؤرخ برنی نے اس کا تذکرہ نہین کیا ہے، مگر قرینۂ حال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا تذکرہ تو ابھی آپ سنین گے، مگر قطع نظر اس سے میرے خیال مین غوریون کے عہد کے متعلق یہ ایک شاہی شہادت ہے جس سے اندازہ کیا سکتا ہے کہ تسلط تام اور کامل قبضہ کے بعد غوری بادشاہون نے یعنی غوری خاندان کے غلام بادشاہون نے اس ملک کے غیر مسلم باشندون کو کس حال مین رکھا،

"درمیان اہلِ اسلام مباہی و مفاخر باشند"

کے فارسی فقرے کا ٹھیک ترجمہ جیسا کہ چاہئے اردو مین ادا نہ ہوسکا، مطلب اس کا یہی ہے کہ مسلمانون کے مقابلہ مین کسی قسم کی کمتری کے احساس کا موقع بھی جیسا کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے اس ملک کے غیر مسلم باشندون کو نہین دیا جاتا تھا، بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ ان کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے،

آج "سیکولر حکومت" کا دنیا مین بہت چرچا ہے لیکن مذکورۂ بالا شاہی شہادت کے رو سے غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک کے جس بلند معیار کو واقعہ کے قالب مین اسی ہندوستان کے آسمان اور اسی کی زمین نے دیکھا تھا، کیا "سیکولر حکومت" اسی معیار کو پھر اس ہندوستان مین قائم کرنے مین کامیاب ہوگی؟ توقع تو اسی کی کرنی چاہئے، خدا کرے کہ طبعی حکومت کا مطلب لوگون کی سمجھ مین آجائے یعنی حکومت کا وہی نظام جس مین ہر بڈھی کا بال بھی محفوظ ہو خواہ اس کا تعلق اکثریت سے ہو، یا اقلیت سے،

مین یہ کہہ رہا تھا کہ اس ترک سپاہی کی جو ادنیٰ درجہ کی ملازمتون سے ترقی کرتے ہوئے ہندوستان کا بادشاہ ہوگیا تھا، اس کی غرض اپنے اس بیان سے کیا تھی؟ برنی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی بادشاہی کے نشۂ اقتدار پر غوری سلاطین کا یہ قدیم

دستور اس ترک جو شیلے سپاہی کے لئے کچھ باعثِ گرانی ہوا اور گو برنی نے تصریح نہیں کی ہے لیکن ممکن ہے کہ کسی غلط اقدام کا کچھ وسوسہ بھی اس کے دل میں ابھرا ہو، لیکن حسرت و یاس کے ان الفاظ یعنی :-

خاک بر سرِ ما، وخاک بر بادشاہی و دین پناہی ما ! (ص ۲۱۷)

کے ساتھ ان وسوسوں پر خاک ڈالنے کے سوا اور بھی اُس نے کچھ کیا یا کر سکتا تھا اس کا جواب آپ کو تاریخ دے گی، کم از کم میں تو نہیں جانتا کہ غوریوں کے زمانہ سے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو دستور چلا آرہا تھا، اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کسی زمانہ میں کیا گیا ہو، کچھ بھی نہ ہوتا، تو صرف ایک یہی شاہی شہادت ان بے بنیاد افواہوں کو باد ہوا بنا دینے کے لئے کافی ہے جو زبانوں سے تو نکلتی ہیں لیکن اُن کی تائید میں کوئی شاہی بیان تو بڑی چیز ہے کسی معتبر مورخ کی ایسی کوئی شہادت بھی پیش نہیں ہو سکتی جس سے معلوم ہو کہ ہندوستان کے دور دراز مضافاتی و مفصلاتی مقامات ہی میں نہیں، بلکہ خاص دارالسلطنت میں شاہی محل سرا کے نیچے سے روزانہ پوجا پاٹ کے لئے نرسنگھا پھونکتے، ڈھول بجاتے، جمنا گھاٹ پر آتے جاتے دیکھنے کا جلال الدین جو عادی تھا، اور اسی دارالسلطنت کے شہر میں مسلمانوں کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی کی تمام نعمتوں سے لذت اندوز ہوتے ہوئے جن لوگوں کو وہ پا رہا تھا، حکومت نے کسی جگہ کسی زمانہ میں کسی قسم کی عملی مداخلت ان کے اس طرزِ عمل میں کبھی کی ہو، خود تراشیدہ افسانوں میں نہیں، بلکہ تاریخی وثائق کی روشنی میں انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے؟ مگر جس دنیا میں "دیوانہ گفت ابلہ باور کرد" کا دور دورہ ہو، وہاں سنجیدگی کے ساتھ حقائق و واقعات کی جستجو کی توفیق لوگوں کو کیوں ہونے لگی ؟

بہر کیف درد کا یہ افسانہ تو بہت طویل ہے، اور اپنے گذشتہ مقالہ میں اس مسئلہ کے متعلق فقیر

کافی چیزوں کا تذکرہ کر چکا ہے،

اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میرا مطلب یہ ہے کہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کروں جن میں مسلمانوں کی حکومت میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کے مختلف طبقات، اور جس طرح اس حکومت کے زیر اثر علاقوں میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے، اس کے متعلق ان تاریخی شہادتوں کو درج کروں جو کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں،

اس سلسلہ میں پہلی قسط ان لوگوں کے حالات پر مشتمل ہوگی جنھوں نے طبابت، علاج و معالجہ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا، ان کے بعد خیال ہے کہ تجارتی کاروبار کرنے والوں کا ذکر کیا جائے، اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے والوں کے حالات اگر وقت میں گنجائش نکلی تو آپ کے سامنے انشاء اللہ آتے رہیں گے،

قطع نظر ایک علمی خدمت کے ایک غرض مضمون نگار کی یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے طرز عمل کے متعلق جو عام غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کا بھی ازالہ انشاء اللہ ان شہادتوں سے ہو سکتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمین کے جن علاقوں میں سیاسی اقتدار سے آج مسلمان محروم ہیں، اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب ان کے جینے کی کیا صورت ہوگی، طرح طرح کے وسوسوں میں یوں بھی مبتلا ہیں، اور شرکا نہ جراثیم کہ جن مسلمانوں یا ان کے رہنماؤں کے دل و دماغ ماؤف ہیں، وہ بھی مستقبل کی ہیبتناک تصویریں ان کے سامنے کھینچ کھینچ کر گویا کچھ ایسا باور کرا رہے ہیں، کہ سیاسی اقتدار کے بغیر نہ کوئی قوم ہی زندہ رہ سکتی ہے، اور نہ کسی قوم کے افراد، غالباً رومی نے شاید اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ

تو مرا چون برہ دیدی بچشبان	ترکمان بدی نادم پاسبان
بے شبان دانستہ اندآن ظبی را	رائگان دانستہ اندآن بیگی را

کے گم از بره و کم از بزغالہ ام | کہ نہ باشد حارس از دنبالہ ام

پھر تیر کا غشاوہ جن کی ایمانی بصیرتوں پر چڑھا ہوا ہے، ان کو جونکاتے ہوئے فرماتے ہیں[۱]

حارسے دارم کہ ملکش می سزد | و اندران یا دے کہ بر من می وزد

سرد بود آن باد یا گرم آن علیم | نیست غافل نیست غائب آن ندیم

اور یہی مسلمانوں کو سمجھایا بھی گیا تھا، زندان مصر میں قیدیوں کو تلقین فرماتے ہوئے سیدنا یوسف علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ

مَا كَانَ لَنَا اَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ | میرے لئے کسی طرح یہ روا نہیں رکھا
شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا | گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو
وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ | بھی ہم شریک اور ساجھی مانیں یہ اللہ

---

[۱] مثنوی شریف کے مندرجہ اشعار اگرچہ صاف اور سیدھے ہیں، مگر فارسی سے ناواقفیت بہ تدریج اس حد تک پہنچ چکی ہے، کہ شاید بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں، اس لئے خلاصہ ان کا درج کر دیا جاتا ہے، دیکھنے والوں کو خطاب کر کے مولانا نے فرمایا ہے کہ،

"یہ دیکھ کر کہ جیسے بکری کے بچے کا چرواہا نظر آرہا ہو تم نے اسی حال میں مجھے پاکر یہ خیال کر لیا ہو کہ میرا کوئی محافظ اور نگہبان نہیں ہے، جن کو تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا چرواہا تو کوئی نہیں ہے، تم نے یہ سمجھ لیا کہ مفت یہ قیدی ہاتھ آجائے گا، مگر یاد رکھو کہ تمہیں نظر آئے یا نہ نظر آئے بہرحال، مینڈھے اور بکری کے بچوں سے ہم کم نہیں ہیں یعنی جیسے ان جانوروں کے پیچھے پیچھے بہرحال چرواہا اور رکھوالا بھی ہوتا ہے، ہم بھی ایک رکھوالا اور اپنا پاسبان رکھتے ہیں، یہ پاسبان ہمارا وہی ہے جسے حقیقی معنوں میں دنیا کی بادشاہت سزاوار ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے یعنی کہ اس ہوا کو بھی جو ہم پر چل رہی ہوتی ہے کہ وہ گرم ہے یا سرد، بس یاد رکھو کہ ہمارا یہ نگہبان نہ غافل ہے اور نہ غائب ہے، ہاں تمہاری کجی کی وجہ سے تمہاری ایمانی بینائی کو وہ نظر نہیں آرہا ہے، تم بیدار ہو،"

لَا یَشْکُرُوْنَ، (یوسف) کا فضل ہے ہم پر بھی، اور سارے انسانوں پر، مگر بہت سے لوگ (اس فضل اور مہربانی کا گن نہیں گاتے،

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ پیدا کر کے ہمارے پیدا کرنے والے خالق قدیر نے دوسروں کے بھروسہ پر سر مارنے کے لئے ہمیں نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کی کفالت ہر بندہ کی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، ضرورتوں کا محتاج بنا کر اس نے ہمیں ضرور پیدا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ کرم اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ ہماری اس محتاجی کا تعلق بجز اپنی ذات کے اور کسی کے ساتھ قطعاً نہیں رکھا ہے، ہم محتاج ضرور ہیں، لیکن اسی ایک پیدا کرنے والے خالق کے جو ہمارا ذو القوۃ المتین، رزاق ہے، اس ایک کے محتاج بن کر ہر ایک کی محتاجی کی ذلت و رسوائی اور دربدر مارے پھرنے کی در دسری سے آزاد ہیں، یہی اللہ کا وہ فضل ہے، جس کا گن ناشکرا انسان بہت کم گاتا ہے، اسی ناشکری کا نتیجہ ہے کہ اس ایک کی محتاجی سے لاپروائی اختیار کرنے والے ہر ایک کی محتاجی کا طوق گلے میں ڈالے مارے مارے پھرتے ہیں، فضل و کرم کی مذکورۂ بالا عجیب و غریب حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ

ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار، کیا بہت سے متفرق طرح طرح کے پروردگاروں کا ہونا بہتر ہے، یا جو ایک سب پر غالب و قاہر اللہ ہے، اسکی پروردگاری کا بہتر ہے،

جس یقین اور یقین کی روشنی کو ایمانی وجدان ان قرآنی آیتوں میں پا رہا ہے، اس کے بعد خود ہی سوچئے کہ کہنے والے نے اگر یہ کہا کہ

از خدا خواہم روز غیر نخواہم بخدا — کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگرست

تو اس کے سوا اپنا احساس آخر اور کیا بتائے،

پس مقصد یہی ہے کہ اپنے اندر کو تو چاہئے کہ قرآن کی اس بخشی ہوئی ٹھنڈی اور خنک روشنی سے مسلمان جگمگاتا رکھیں اضطراب بھی پیدا ہوگا، عقلی اندیشے بھی تاتک شکلوں میں سامنے آ آکر اس روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف بھی ڈھکیلیں گے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم و یقین کا قطعی ذریعہ ایسا قطعی ذریعہ کہ احساس و علم کے دوسرے سارے ذرائع اس کے مقابلہ میں متہم ہو سکتے ہیں، جو قرآن کی اس روشنی میں گھومتا، اور اسی میں تہ و بالا ہوتا رہے گا وہ پائے گا کہ اس سے پیدا ہونے والی ٹھنڈک بھی اس کی روح اور قلب کی رگ رگ ریشہ ریشہ میں پیوست ہے،

"اندر" کو اس حال سے معمور رکھتے ہوئے اپنے باہر کو چاہئے کہ

لیس للانسان الا ما سعیٰ، — نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کوشش کی،

یا

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن — جو کچھ مردوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے، اور جو کچھ عورتوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے،

یہ یا اسی قسم کی دوسری "قرآنی مسلمات" کے مطابق سرگرم عمل ہو جائیں جن واقعات اور سرگذشتوں کا ذکر آئندہ آپ سنیں گے، ان میں آپ کو مسلسل ملتا چلا جائے گا کہ حکمرانی کے اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود اپنی محنت، محنت سے حاصل کئے ہوئے کمالات اور اپنے اخلاص و صداقت وغیرہ صفات کی مدد سے کتنے چھوٹے مسلسل بڑے بنتے چلے گئے، نہ صرف عوام بلکہ حکومت میں بھی تا

وسائل کے حاصل کرنے میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے، یہ قدرت کے مقررہ قوانین ہیں، ان قوانین کی پابندی بھی پابندی کے نتائج کو سامنے لاتی ہے، اوران قوانین سے لاپروائی اختیار کرنے والوں کو بھی اپنی لاپروائیوں کا خمیازہ بہرحال بھگتنا ہی پڑتا ہے، اور قرآنی حقیقت

مَاظَلَمۡنَاهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡا انفسهم يظلمون ، | اور نہیں کیا ہم نے ان پرظلم، بلکہ اپنے آپ پرانھوں نے خود ہی ظلم کیا،

کے اقرار پر ہراس شخص اور قوم کو مجبور ہونا پڑا ہے جس نے اپنے آپ کو "مظلومیت" کا کبھی شکار پایا ہو،

(باقی)

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

کا سہ ماہی رسالہ

اُردو

انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ کا سہ ماہی رسالہ اردو جس کے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں، اپنی روایتی خصوصیات کے ساتھ جناب آل احمد سرور صاحب کی ادارت ونگرانی میں شائع ہورہا ہے، قیمت سالانہ معہ ڈاک وغیرہ ملاکر دس روپیے، اور ایک پرچے کی قیمت دوروپیے رکھی گئی ہے، انجمن کے دوسرے رسالہ سائنس اور "معاشیات" کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جارہا ہے،

انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے، اس وقت ۹ کتابیں زیر طبع ہیں،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں

فنونِ جنگ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۴)

تیراندازی | توپ و تفنگ کے ساتھ تیروں کے ذریعہ سے بھی غنیم کے لشکر میں رخنہ اندازی اور سراسیمگی پیدا کیجاتی، بابر پانی پت کی جنگ کا حال خود لکھتا ہے،

"ہماری فوج میں غنیم کی آمد اور انتظام کی ترکیب دیکھ کر ذرا کھل بلی مچی کہ ٹھہریں یا نہ ٹھہریں، مقابلہ کریں یا نہ کریں، موقع کی بات کرنی چاہئے ایسوں سے مقابلہ ہے جو بے توقف چلے آتے ہیں، میں نے حکم دیا کہ تولقمہ والے غنیم کے دست راست اور دستِ چپ سے پھر کر تیر مارنے شروع کریں، اور لڑائی میں مشغول ہوں، برانغار بھی جا پہنچے، تولقمہ والے غنیم کے پیچھے سے پلٹ کر تیروں کا مینہ برسانے لگے، جرانغار میں سے مہدی خواجہ سب سے آگے پہونچا، مہدی خواجہ کے مقابلہ میں کچھ فوج ایک ہاتھی لئے ہوئے آئی، مہدی خواجہ کی جماعت نے تیروں کی بھرمار سے اس فوج کا منہ پھیر دیا، جرانغار کی کمک کے لئے قول میں سے احمدی پروانچی، تردی بیگ، توچ بیگ اور محمد علی خلیفہ بھیجے گئے، برانغار میں بھی لڑائی شروع ہوگئی، محمدی کوکلتاش، شاہ منصور برلاس،

یونس علی اور صدر اللہ کو حکم دیا کہ تول سے آگے بڑھ کر لڑائی شروع کرو، استاد علی قلی بھی تول

کے آگے بڑھکر فیر کرنے لگا، مصطفیٰ توپچی دست چپ سے خوب گولے مارنے لگا تولقچیوں

نے چاروں طرف سے غنیم کو گھیر لیا اور ہنگامہ پیکار گرم کردیا،"[1]

پانی پت کی دوسری جنگ میں بھی اکبری فوج کے تیراندازوں نے ہیمو کے لشکر میں غیر معمولی

ہولناکی پیدا کر دی تھی، اس سلسلہ میں ابوالفضل کا بیان ہے۔

"گروہ گروہ فدائیان تیرانداز از اطراف وجوانب برآمدہ داد کارزاری دادند"[2]

ان ہی تیراندازوں کا ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں آکر لگا، اور اس کے زخمی ہوتے ہی ہندوستان

کی تاریخ کا رُخ بدل گیا،

بیرم خان خانان جب ہندوستان کے تخت و تاج کا دعویدار ہوکر اکبر کے خلاف

گوناچور (پنجاب) کے میدان میں صف آرا ہوا، تو دونوں لشکروں کے درمیان دھان کا ایک

کھیت تھا، جس میں کیچڑ کی وجہ سے دلدل ہوگیا تھا، لڑائی شروع ہوئی تو بیرم کے ہاتھی دلدل

میں پھنس گئے، بیرم کو اپنے ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، ہاتھیوں کو دلدل میں پھنستے دیکھ کر اکبر کے

تیراندازوں نے فائدہ اٹھایا، اور ہاتھیوں پر شدت کے ساتھ تیروں کی بوچھار شروع کردی'

ایک تیرانداز نے ہاتھیوں کے سرگروہ کے فیلبان پر تاک کر ایک ایسا تیر لگایا کہ وہ لڑھک کر

ہاتھی کی گردن میں آکر اٹک گیا، بیرم خان نے اپنے ہاتھیوں کی اس طرح پسپائی دیکھی تو دلدل

سے بچ کر خشک راستے سے اُن کی مدد کو پہونچنے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوج کے سردار آتکہ خان

نے دوربینی سے کام لے کر بیرم خان کی کوشش کارگر ہونے نہیں دی،[3]

۱۰۳۵ھ میں جہانگیر کشمیر سے کابل جارہا تھا، تو جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے

---

[1] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۶ [2] اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۲ [3] ایضاً،

جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، شاہی جلو کے اکثر امرا اور لشکر کے افراد جہلم کی دوسری طرف جا چکے تھے، جہانگیر نورجہان کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا کہ مہابت خان نے اپنی راجپوت فوجون کی مدد سے اس کو اپنا قیدی بنالیا، نورجہان اپنی دانشمندی اور فراست سے مہابت خان کی نظر بچا کر دریا کے دوسرے جانب شاہی فوج سے آملی، امرار کو غیرت دلائی، فوجون سے برہمی ظاہر کی، اور اپنے محبوب شوہر کو قید سے آزاد کرنے کے لئے خود آگے بڑھی، امرا مین سے فدائی خان مہابت خان کی حرکت نازیبا سے آزردہ خاطر اور شہنشاہ ہند کی بیپائی پر بے حد خفیف اور شرمندہ ہوا، اور وہ چند سوارون کے ساتھ اپنے آقا کی رہائی کے لئے روانہ ہوا، راجپوتون نے دریا کے پل مین آگ لگا دی تھی، فدائی خان نے بڑی دیری سے اپنا گھوڑا دریا مین ڈال دیا، اس کے پیچھے اس کے ہمراہی چلے دریا مین بڑا تلاطم تھا، زیادہ سوار غرقاب ہوگئے، اور صرف سات سوار فدائی خان کے پیچھے ساحل کی طرف بڑھے، راجپوت ساحل پر سے تیرون کی بارش کر رہے تھے، مگر فدائی خان سر بکف ہو کر کنارے پہنچا، اور سات سوارون کے ساتھ راجپوتون پر حملہ آور ہوا، مگر وہ جہانگیر کی قیامگاہ تک نہ پہنچ سکا، مجبوراً پھر دریا عبور کرکے دوسری طرف آیا، شاہی فوج نے پایاب راستہ سے دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی، نورجہان شہریار کی بچی اور اُس کی آتکہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر دریا مین داخل ہوئی، اس کی عماری پر، دو ترکش، دو کمان، اور ایک بندوق تھی، شاہی فوج دریا مین تھوڑی دور آگے بڑھی تھی کہ اس مین کئی غار ملے، جس سے فوج کا تسلسل ٹوٹ گیا، اور وہ علحدہ علحدہ ہوگئی،

مہابت خان کے راجپوت سپاہیون نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ساحل پر ہاتھیون کی قطار کھڑی کر دی، اور تیرون کی بارش شروع کر دی، تفنگ کے گولہ اور بان بھی برسانے لگے لیکن پھر بھی نورجہان کی جان نثار اصحاب نا فوج ساحل پر پہونچ گئی، اور تیر و سنان کی جنگ ہونے لگی، فریقین کے لشکریون کے خون سے دریا لالہ زار ہو رہا تھا، اسی دار و گیر مین راجپوت تیراندازون کا

ایک تیر نور جہان کی عماری میں شہریار کی بچی کے بازو میں جا لگا، عماری رنگین ہو گئی لیکن نور جہان نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں کی، بچی کے بازو سے تیر نکال کر زخم کو باندھ دیا، راجپوتوں نے نور جہان کے ہاتھی اور فیلبان کو تلوار اور برچھے سے زخمی کرنے کی کوشش کی، جس سے ہاتھی سراسیمہ ہو کر دریا کی دوسری طرف بھاگا، مگر کچھ فوجی ایسے تھے، جو ساحل پر پہنچ کر تیروں کی ایسی مسلسل بارش کرتے رہے، کہ راجپوت ان کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکے، اسی یورش میں فدائی خان بندگان شاہی کی ایک مخلص جماعت کو لے کر جہانگیر کی قیام گاہ تک پہنچ گیا، سراپردہ کے اندر سوار اور پیادے بھرے ہوئے تھے، اس نے دروازہ پر کھڑے ہو کر اس نے تیر اندازی شروع کر دی، اس کے اکثر تیر خلوت خانہ کے صحن میں جہانگیر کے پاس گر رہے تھے، مخلص خان جہانگیر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے کو تیر قضا کا سپر بنا لیا، مگر پھر بھی فدائی خان کی شجاعت اور جانبازی جہانگیر کو رہا کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی[1]،

تیموری شاہزادے یا شاہی فوج کے عہدیدار میدان جنگ میں ہاتھی کے ہودج میں ہوتے تو تیر و کمان ہی سے لڑتے، اور تیروں سے زخمی ہو کر میدان جنگ سے منہ موڑنا اپنی حمیت، غیرت اور شجاعت کے خلاف سمجھتے تھے، سموگڈھ کی جنگ میں شاہزادہ مراد نے دارا کے تیر اندازوں کا مقابلہ جس ہمت، دلیری، اور پامردی سے کیا تھا، وہ تاریخ ہندوستان کا ایک عجیب و غریب کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس کی عماری پر چار ہزار ایک تیر چلا رہے تھے، ہاتھی کا ہودج تیروں سے چھلنی ہو کر خارپشت دیکھنے سا ہی بن گیا تھا، مگر اس عالم رستخیز میں بھی مراد ہمت و استقلال کا پہاڑ بنا ہوا دشمنوں کے تیروں کا مسلسل جواب دیتا رہا، اس کا فیلبان زخمی ہو کر نیچے گر پڑا، تو اس نے فوراً ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا دے، راجپوت مراد کی اس ہمت و پامردی کو دیکھ کر آگے بڑھے، راجہ رام سنگھ راٹھور لڑتا ہوا

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۷۰، ۲۶۴ و مآثر الامراء جلد سوم ص ۱۴۰۵، خافی خان جلد اول ص ۳۷۶-۳۹۰

مراد کے ہاتھی تک پہنچا، نفرت اور غرور مین بدمست ہوکر چلایا تو دارا کے مقابلہ مین تخت و تاج کی ہوس رکھتا ہے، یہ کہکر اُس نے مراد پر برچھے سے وار کیا، بہادر شہزادہ نے وار بچا کر راجہ کو ایسا تیر لگایا کہ وہ گھوڑے سے گر کر پھر اُٹھ نہ سکا، راجپوت اپنے سوار کو اس طرح مرتے دیکھ کر دیوانہ وار مراد کے ہاتھی پر حملہ آور ہوئے، اُن کے حملہ سے مراد کے چہرہ پر تین کاری زخم لگے، مگر وہ جانبازی اور سرفروشی کے ساتھ لڑتا گیا، اس کے تیرون سے اتنے راجپوت زخمی ہوئے کہ ہاتھی کے ارد گرد زمین ارغوانی اور زعفرانی ہوگئی، مراد کا یہ ہودج دودمان تیموری کی شجاعت جانبازی اور پامردی کی یادگار مین خزانہ عامرہ مین آخر آخر وقت تک محفوظ رہا، فرخ سیر کے زمانہ مین سادات بارہہ نے تیموری خاندان کے افراد پر استیلا اور غلبہ پانے کی کوشش کی، تو فرخ سیر کی بہن نے غصہ مین اُن سے کہا کہ ہم اُس خاندان کے افراد مین جن کی شجاعت کی یادگار یہ مشبک ہودج اب تک محفوظ ہے[1]،

جاجو کی جنگ مین اعظم شاہ کا سارا جسم تیرون کے زخمون سے خون آلود ہوگیا تھا، لیکن اُس نے اپنے زخمون کی پرواہ مطلق نہ کی، اور بہادری سے لڑتا گیا، یہانتک کہ ایک گولی کے نشانہ سے جان بحق ہوا، اس کے لڑکے بیدار بخت کا بدن بھی تیرون سے چھلنی ہوگیا تھا، مگر اُس نے اپنے ہاتھی کو اس وقت تک نہین چھوڑا جب تک کہ ایک گولی سے اسکا کام بھی تمام نہ ہوگیا، اسی جنگ مین شہزادہ عظیم الشان اپنے باپ بہادر شاہ کی حمایت مین ہاتھی پر بیٹھکر لڑ رہا تھا کہ اعظم شاہ کے دو فوجی سردار خان عالم اور منور خان نے جو صف شکنی کے لئے مشہور تھے، اپنے اپنے ہاتھیون کو عظیم الشان کے ہاتھی کی طرف بڑھایا، خان عالم نے تین بار نیزہ سے شہزادہ عظیم الشان پر حملہ کیا، لیکن شہزادہ وار بچا تارہا۔ اور موقع پاکر اپنے جلد کمان سے خان عالم پر تیر کا ایسا نشانہ لگایا کہ وہ تڑپتا ہوا ہودج مین گر گیا، منور خان اپنے بھائی خان عالم کو ہلاک ہوتے دیکھ کر عظیم الشان پر نیزہ سے حملہ آور ہوا،

---

[1] خافی خان جلد دوم صـ۳۰،

شہزادہ نے اس نیزہ کے وار کو بھی روکا، پھر یکایک توپ کے ایک گولہ سے منوّر خان بھی لقمۂ اجل ہوگیا[۱]

دکن میں بہادر شاہ اور کام بخش میں جنگ جانشینی ہوئی تو کام بخش تیروں سے ایسا زخمی ہوا کہ اس کے ہاتھی کا ہودج اس کے خون سے گلرنگ ہو گیا، مگر اس حالت میں بھی وہ خود غنیم پر تیر چلاتا رہا، اس کے دو ترکش خالی ہوگئے تو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، اس کا لڑکا محی السنۃ بھی تیروں کی مسلسل بارش سے زخمی ہوا، ہاتھی پر فیلبان اور اس کے ہمراہی مارے گئے، وہ زخمی ہو کر خود نڈھال ہوگیا تھا، مگر اس نے میدان جنگ سے منہ موڑنا گوارا نہیں کیا، فیلبان کے مرنے پر ہاتھی خود ہانکنے لگا لیکن گولیوں کے زخموں سے بیہوش ہوگیا، تو ہاتھی ادھر ادھر بہک گیا[۲]۔

۱۱۲۴ھ میں فرخ سیر سادات بارہہ کی مدد سے جہاندار شاہ کے خلاف تخت و تاج کا دعویدار ہوا تو فریقین میں آگرہ کے پاس جنگ ہوئی، اس لڑائی میں فرخ سیر کی حمایت میں سید حسین علی خان اور سید عبد اللہ خان دونوں بھائیوں نے شجاعت اور مردانگی کے اعلیٰ جوہر دکھائے، جب گھمسان کی لڑائی ہونے لگی، تو سید حسین علی خان ہاتھی سے نیچے اُتر آیا، اور ہاتھ میں تلوار لے کر پا پیادہ لڑنے لگا، غنیم کے تورانی تیرانداز چکر کاٹ کر سید حسین علی خان کے پیچھے آگئے، اور اس کو تیروں سے ایسا زخمی کیا کہ وہ زمین پر گر کر بیہوش ہوگیا، اس کا گرنا تھا کہ سادات بارہہ نے اس کو گھیر لیا، اور اس کے جسم کو مزید گزند سے بچانے کی خاطر خود کٹ کٹ کر مرنے لگے، فوج کے دوسرے حصہ میں سید عبد اللہ خان بھی تورانی تیراندازوں کی تاب نہ لاکر دوسری طرف رخ کرنا چاہتا تھا کہ یکایک جہاندار شاہ کی طرف سے عبد الغفار خان سید عبد اللہ خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا، اور چلّۂ کمان سے ایک تیر نکال کر عبد اللہ خان کو نشانہ بنایا، لیکن موحد اللہ کرنے نہایت سرعت سے اپنی کمان سے ایک تیر ایسا چلایا کہ عبد الغفار خان کا تیر اس سے ٹکرا کر بیچ ہی میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، سید عبد اللہ خان نے

---

[۱] خافی خان جلد دوم ص ۵۹۰، ۵۹۱ وغیرہ [۲] ایضاً ص ۶۲۵، ۶۲۳

فوراً ہی ایک دوسرا تیر مارا جس سے عبدالغفار خان زخمی ہو کر دوسری طرف مڑ گیا، اسی اثنار مین سید عبداللہ خان کی مدد کو کمک پہنچ گئی جس کی مدد سے سادات بارہہ نے جہاندار شاہ کے ہاتھی پر تیرون کی اتنی بارش کی کہ ہاتھی خوف زدہ اور سراسیمہ ہو کر اپنے لشکریون ہی کو پامال کرنے لگا، اس کے بعد جہاندار شاہ کی فوج میدان جنگ مین نہ ٹھہر سکی[۵۱]

محمد شاہ نے سادات بارہہ کے خلاف حسن پور کے میدان مین جنگ کی، تو سید عبداللہ خان بڑی دلیری اور شجاعت سے لڑا، اس کے جسم پر آہنی لباس تھا جس کی وجہ سے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا اس کے ہودج پر تیرون کی مسلسل بوچھارین آرہی تھین، محمد شاہ خود اس کو اپنے تیرون کا نشانہ بنائے ہوئے تھا، عبداللہ خان بہادری کے جوش مین شمشیر اور سپر سے پاپیادہ لڑنے کی خاطر ہاتھی سے نیچے اتر آیا، مگر اُس نے ہاتھی کا ہودج چھوڑا تو اُس کے ہمراہی سمجھے کہ وہ مارا گیا، اوران کے پاؤن اکھڑ گئے، مگر عبداللہ خان کے قدم پیچھے نہین ہٹے، وہ جانبازی سے لڑتا رہا کہ یکایک کسی قادر تیر انداز نے تاک کر اس کی پیشانی پر ایک تیر لگایا، اس تیر کی زد سے وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ کسی نے بڑھ کر شمشیر سے اس کے ہاتھ پر ایک ضرب کاری لگائی جس سے بے بس ہو کر وہ شاہی فوج کے ہاتھون گرفتار ہو گیا،[۵۲]

عام طور سے اوزبک[۵۳] اور تورانی تیر اندازی مین بڑے مشاق اور ماہر سمجھے جاتے تھے، تورانیون کے بارے مین مشہور تھا کہ وہ اپنے ہر تیر سے گھوڑے کی پیٹھ اُس کے سوار سے خالی کر دیتے تھے، تیرون کا حملہ روکنے مین افغانی امتیازی حیثیت رکھتے تھے، عظیم الشان اور جہاندار شاہ کے درمیان جنگ جانشینی ہوئی تو اول الذکر کے افغانی لشکریون کے اردگرد تیرون کی جو بارش ہوئی تو مورخون کا بیان ہے

[۵۱] خافی جلد دوم ص ۶۹۰، ۶۹۳، مآثر الامراء جلد اول ص ۳۲۳ و جلد سوم ص ۴۴، ۱۳۳، [۵۲] مآثر الامراء جلد سوم ص ۱۳۵-۶ و سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۴۸، ۴۴۹، [۵۳] ۱۰۵۶ھ مین بلخ کی مہم مین شاہجہانی فوج پر بارہ ہزار اوزبک تیر انداز

افغانی اسپ کو پھولوں کی بارش تصور کر رہے تھے،

تیموری شہزادوں کو تیراندازی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، جہانگیر کی تیراندازی کی مہارت یہ تھی کہ وہ ایک ہی تیر سے بھیڑیئے کو ہلاک کر دیتا تھا، حالانکہ مشہور ہے کہ بھیڑیئے بیس بیس تیس تیس تیر کھا کر بھی نہیں مرتے، وہ خود تزک میں لکھتا ہے:-

"ایک بھیڑیا میرے سامنے آیا، میں نے ایک تیر اس کے کان کے پاس مارا، جو قریب ایک بالشت کے پیوست ہو گیا، وہ بھیڑیا اس تیر سے گر کر ہلاک ہو گیا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ میرے سامنے سخت کمان والے جوانوں نے بھیڑیئے کو بیس تیس تیر مارے ہیں، مگر وہ نہ مرا، اپنے بارے میں کچھ لکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان واقعات کو لکھنے میں زبانِ قلم کو کوتاہ رکھتا ہوں"[1]

اورنگ زیب اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلطان محمد کو برابر تاکید کیا کرتا تھا کہ وہ روزانہ دو گھڑی تیراندازی اور بندوق کی مشق میں صرف کیا کرے[2]

شمشیرزنی | جب غنیم کی صفوں میں تفنگ، تیر یا کبھی ہاتھیوں کی یورش سے انتشار، خلل اور رخنہ پیدا ہو جاتا تو سوار اپنی اپنی تلواروں کو سونت سونت کر مخالف فوجوں کے ساتھ گتھا گتھ ہو جاتے، جس کو معاصر مورخین چپقلش مردانہ یا چپقلش رستانہ کہتے ہیں، اصلی شجاعت تلواروں ہی سے لڑنے میں سمجھی جاتی،

قندھار کی دوسری جنگ میں ایرانی لشکریوں کے پاس آتشیں اسلحہ کی کثرت تھی، تو شاہجہانی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۱) ایک ساتھ تیر چلا رہے تھے، جس سے قریب تھا کہ شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے، مگر پھر توپ اور تیغ تُنستان کی زد ان پیاسی پڑی کہ آخر کیمین کی فتح ہزیمت سے بدل گئی، خافی خان جلد اول ص ۶۶۵ [1] تزک جہانگیری ص ۲۷۰ [2] رقعات عالمگیری معارف پریس، ص ۱۰۲

فوج ان کو طعنہ دیتی تھی کہ وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کے سبب تلواروں سے لڑنے کے بجائے توپوں اور بندوقوں سے جنگ کرنے کے عادی ہیں، اعظم شاہ جاجو کی جنگ میں شریک ہوا تو اپنی بہادری اور شجاعت کے نشہ میں مخمور ہو کر بار بار کہتا کہ توپ و تفنگ تو بازیچۂ اطفال ہیں، بہادروں کا ہتھیار تلوار ہے، جنگ کا فیصلہ تلوار ہی سے ہونا چاہئے،

لڑائی جب زور شور کی ہوتی اور بہادر لشکری دلیری اور سرفروشی کے نشہ سے سرشار ہو جاتے تو وہ اپنے ہاتھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے اتر آتے تاکہ بے قابو ہو کر دھوکہ نہ دے سکیں، پھر زمین میں پاؤں جما کر کھڑے ہو جاتے، اپنی پوشاک کے دامن کو سمیٹ کر کمر سے باندھ لیتے، اور ہاتھ میں تلوار لے کر لڑنا شروع کر دیتے، دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی پھرتی سے اپنی تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے، اور اپنی جان کی فکر مطلق نہ کرتے، یہ شجاعت اور بہادری کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی

دھرماوت کی جنگ میں اورنگزیب کے ہراول کی طرف راجپوت بڑھے، تو ذوالفقار خان نے محسوس کیا کہ بڑا نازک موقع آگیا ہے، اور دشمنوں کے یلغار کو روکنے کی ضرورت ہے، وہ اپنے گھوڑے پر سے اتر گیا، اور ہاتھ میں تلوار لے کر تنہا راجپوتوں میں کود پڑا، اور پھر قدم جما کر شجاعت اور جانبازی کا پیکر بن کر لڑا، اس کا جسم متواتر زخموں سے خون آلود ہو گیا، لیکن اس کی سپاہیانہ غیرت اور حمیت نے دشمنوں سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا،[1]

اس واقعہ کو مورخوں نے بڑے آب و تاب سے لکھا ہے، چنانچہ منشی محمد کاظم بن محمد امین عالمگیر نامہ میں لکھتا ہے :-

"ذوالفقار خان بآئین دلاوران ناموس جوئے ہندوستان کہ چون کار جنگ تنگ شود از اسپان پیادہ شدہ دل بر ہلاک می نہند و اکثر اوقات بہ حسن ثبات قدم در سوخ

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۷۰،

عزیمت غنیم را ہزیمت می دہند، از اسپ فرود آمدہ با معدودی پاے ہمت وجلادت بقصد نیل سرخروئی وشہادت درمیدان وغا افشردہ داد شجاعت ودلیری دادہ دران آزمونگاہ جوہر مردانگی گوے ثبات واستقلال از اقران وامثال بردہ، اگرچہ گلِ زخمی از شاخسار مردی چید، لیکن بہ برکتِ توجہات والاے حضرت شاہنشاہی وبیامن حسن اعتقاد ونیکوخواہی از آسیب ہلاک ایمن ماند[۵۱]"

بہادر شاہ کی وفات کے بعد عظیم الشان اور جہان شاہ مین جنگ ہوئی، تو عظیم الشان کی طرف ممتاز خان نے اسی شجاعت اور مردانگی کی مثال پیش کی، لڑائی تیز ہوئی تو وہ لڑتا ہوا جہان شاہ کے پاس پہنچا اور گھوڑے سے کود کر پیادہ ہوگیا، اور کبھی تیر چلاتا، اور کبھی دشمنون کو اپنی تلوار سے لقمۂ اجل بناتا، اسی بہادری سے وہ لڑتا گیا، یہان تک کہ دشمنون کو پیچھے ہٹنا پڑا،

ساداتِ بارہہ لڑائی کی سرزمین مین قدم جماکر تلوار سے لڑنے مین بہت مشہور تھے ۱۱۲۳ھ مین سید حسین علی خان فرخ سیر کی حمایت مین جہاندار شاہ سے لڑا، تو میدانِ جنگ مین ہاتھی سے اتر کر اپنی شمشیر آبدار کے جوہر خوب دکھائے، مآثر الامراء مین ہے :-

"حسین علی خان در روز جنگ کہ درحوالی مستقر الخلافہ با جہاندار شاہ اتفاق افتاد باتفاق حسن بیگ صف شکن خان کہ نائب صوبہ داری اڈیسہ بود وزین الدین خان پسر بہادر خان روہیلہ مقابل ذوالفقار خان کہ توپ وضرب زن بسیار پیش روچیدہ ایستادہ بود، اسپان تاختہ بہ زنجیرۂ توپخانہ درآمد، چون عرصہ برخود تنگ دید، باین ناموس پرستان ہند پیادہ گشتہ بہ زخمہاے طاقت ربا بزمین افتاد[۵۲]"

---

[۵۰] عالمگیر نامہ ص ۱۰۷۰ [۵۱] ایضاً [۵۲] مآثر الامراء جلد اول ص ۳۲۳ خافی خان مین ہے :-

"وبرحسین علی خان چنان عرصہ کارزار تنگ گردیدہ کہ بدستور بہادران تہور پیشہ ہندوستان

قطب الملک سید عبد اللہ خان نے بھی (سید حسن علی خان کا بھائی) حسن پور کی جنگ میں اسی جوہر شجاعت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، لڑائی شدت پر تھی کہ سید عبد اللہ خان شمشیر اور سپر لے کر ہاتھی سے نیچے اُتر آیا، اور جن دشمنوں نے اس کو گھیر رکھا تھا، ان سے نہایت بڑی دلیری کے ساتھ جنگ کرنے لگا، وہ سر سے پاؤں تک آہنی لباس میں ملبوس تھا، اس لئے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا، وہ دشمنوں کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارتا رہا، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک اس کی پیشانی پر ایک تیر لگا، اور اسی کے ساتھ کسی نے بڑھکر تلوار سے اس کے ہاتھ کو زخمی کیا، جس کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا،[۵۱]

ایک سپاہی تلوار کی ضرب جس قدر زیادہ تیزی، پھرتی اور سختی سے لگاتا، اسی قدر وہ بہادر اور آزمودہ کار سمجھا جاتا، اکبر اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب میں شیر کو ہلاک کر ڈالتا تھا[۵۲] عالمگیر نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں ایک مست ہاتھی کو اپنی تلوار سے زخمی کر کے اس کو پیچھے ہٹا دیا تھا، بہادر سوار گھوم گھوم کر اپنی تلواروں سے ہاتھیوں پر حملہ کرتے، اور ان کو زخمی کر کے پسپا کر دیتے مست ہاتھی کے قریب آکر تلوار کی ضرب سے اس کی سونڈ کو اڑا دینا، اور پاؤں کو بے کار کر دینا کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی تھی،[۵۴]

نیزہ بازی | نیزہ (سنان یا گرز یا برچھا) عموماً راجپوتوں کا ہتھیار ہوتا، مگر مسلمان سپاہی اس ہتھیار سے بھی لڑکر کبھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھلاتے تھے، مخالف سوار یورش کر کے گڈ مڈ ہو جاتے، تو لمبے نیزوں اور برچھوں سے ان کی چپقلش روکی جاتی،[۵۵] مخالف سواروں کے تیز رفتار گھوڑے کبھی گرز اور

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۴) خود را از فیل انداخته با چندے از شجاعت پیشگان بارہہ تردد رستمانہ نمود، بعد بر داشتن زخمہاے کاری بے خبر گشتہ در معرکہ افتاد (جلد دوم ص ۳۰۷)

[۵۱] خافی خان جلد دوم ص ۹۳۲، و سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۱۔۴۴۔ [۵۲] اکبر نامہ جلد دوم ص ۴۴ [۵۳] بادشاہنامہ جلد اول ص ۹۰۔ ۴۹۸ [۵۴] مثال کے لئے دیکھو تزک جہانگیری ص ۲۰۳۔۱۰۴، عمل صالح جلد دوم ص ۳۲۶ [۵۵] اکبر اپنے

سنان ہی سے زخمی کئے جاتے تھے، ہاتھیون کو مجروح کرنے مین بھی یہ ہتھیار موثر ثابت ہوتے تھے،[۵۱]
مخالف سوار ہاتھیون کے قریب آکر ہودج نشینون پر نیزون اور برچھون ہی سے وار کرتے تھے،[۵۲]
کرنال کی جنگ مین نادر شاہ کے ایک نیشاپوری سوار نے اپنے نیزہ کے استعمال کا ایک عجیب و
غریب نمونہ پیش کیا، شدت کی لڑائی جاری تھی کہ یہ نیشاپوری سوار محمد شاہ کے فوجی سردار سعادت
خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا، اور پھرتی سے اپنا نیزہ زمین مین نصب کیا، گھوڑے کی باگ نیزہ سے باندھ
دی، اور سعادت خان کے ہاتھی کے ہودج کی جو ڈور کی نیچے لٹک رہی تھی، اس کو پکڑ کر آناً فاناً ہودج

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵) سترہوین سال جلوس مین ابراہیم حسین مرزا کے خلاف گجرات مین جنگ کر رہا تھا، تو اس
لڑائی کے سلسلہ مین ابوالفضل رقمطراز ہے،

"درین وقت کہ (ہر طرف ہنگامۂ جان فشانی و جان ستانی گرم بود) سہ دلیرے بے اندرم
از گروہ مخالف بصورت شہریار شیر دل تاختند یکے ازان بدنہادان پیش دستی نمودہ متوجہ
راجہ بھگونت داس شدہ نیزہ حوالہ کرد، راجہ پیشتر ازان پا در رکاب محکم کردہ ایستادہ
می باشد کہ برچھہ خود را باو رساند نیزۂ او خالی افتاد و راجہ برچھہ خود را بران مدبر آنچنان زد
کہ حال دگرگون شدہ برگشت" (اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۵)

۵۱ مثال کے دیکھو فرشتہ جلد اول ص ۳۰۴، عبد الحمید لاہوری جلد اول ص ۴۹۵ و ۴۹۰، خافی خان جلد اول ص ۳۶۴
۵۲ مثلاً سموگڈہ کی جنگ مین مراد کے ہاتھی پر راجپوتون کا حملہ ہوا، تو خافی خان رقمطراز ہے۔

"درین حال راجہ رام سنگھ کہ میان راجپوتان بہ تہور می شہرت نام داشت شہرۂ مروارید
بیش قیمت بر سر بستہ رخت زعفرانی با ہمہ ہمراہان بدعوی پر دلی پوشیدہ جلو ریز خود را بفیل
سواری محمد مراد بخش رسانید و بے باکانہ و گستاخانہ گفت تو مقابل دارا شکوہ ہوس بادشاہی
در سرداری و برچھے طرف محمد مراد بخش انداخت و بر جماعت جماعت تمام بانگ زدہ گفت کہ

چڑھ گیا، جس کے بعد محمد شاہ کا فوجی سردار بے بس تھا[1]،

مندرجۂ بالا اسلحہ کے علاوہ دست بدست لڑائی میں جمدھر، خنجر، کھپوا، گرز اور تیر بھی کبھی کبھی استعمال کئے جاتے تھے،

جنگی حیلے [۱] جنگی حیلوں میں یہ حیلہ عام طور سے رائج تھا کہ لشکری میدان جنگ سے بظاہر بھاگتے نظر آتے، اور جب ان کے دشمن اُن کا تعاقب کرتے ہوئے کچھ دور آگے بڑھ جاتے، تو وہ پلٹ کر ان پر حملہ کر دیتے، اس قسم کے جنگی فریب کی مثالیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ہر دور میں ملتی ہیں، شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر جو فتح و کامرانی حاصل کی تھی اس میں اس قسم کا جنگی حیلہ بھی معاون ہوا تھا[2]،

سلطان فیروز شاہ تغلق پہلی بار شمس الدین کے خلاف لکھنوتی جنگ کرنے گیا، تو وہ یعنی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۶) فیل را نشان آن بہادر شیر صولت حملہ آورد و از دو چنان تیر جان ستان بہ پیشانی او رساند کہ از خانۂ زین سرنگون ساخت، (جلد دوم ص ۲۷)

۱۱۱۹ھ میں شاہ عالم اور اعظم شاہ کی جنگ جانشینی کے سلسلہ میں خافی خان لکھتا ہے،

"وہر لحظہ آتش پیکار شعلہ ور میگردید تا آنکہ خان عالم و منور خان کہ از دلاوران صف شکن دکن گفتہ می شدند، در مبارزت بار با علم شہرت برافراشتہ بودند نعرہ زنان فیل جرأت مقابل فیل محمد عظیم جنبش راندند، و منور خان بے باکانہ بحملۂ دستانہ نیزہ طرف شاہزادہ انداخت محمد عظیم نیزۂ او را رد کردہ، آن نیزہ بر جلال خان قراول ردیف محمد عظیم رسید، محمد عظیم تیر بحلۂ کمان در آوردہ چناں بہ سینۂ حریف رساند کہ کار او ساختہ شد (جلد دوم ص ۵۹۱)

[1] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۰۳، ماثر الامراء جلد اول ص ۳۶۵، [2] طبقات ناصری ص ۱۲۰،

سلطان فیروز لکھنوتی چھوڑ کر پیچھے چند میل ہٹ گیا، شمس الدین کی فوجوں نے خیال کیا کہ سلطان فیروز پسپا ہو کر مراجعت کر رہا ہے، اس لئے وہ قلعہ سے نکل کر باہر آگئیں، اور شاہی فوج کا پیچھا کرنے لگیں لیکن اُن کو شکست کھانی پڑی،[1]

شیر شاہ بنگال میں ابراہیم خان کے خلاف سورج گڑھ کے مقام پر صف آرا ہوا، تو اُس نے بھی اپنے غنیم کو جنگی ترتیب ہی سے شکست دی، لڑائی شروع ہونے سے پہلے اُس نے اپنے فوجی سرداروں کو حسب ذیل ہدایتیں دیں،

"غنیم کے لشکر میں بہت سے ہاتھی، بہ کثرت بندوقیں اور کثیر التعداد پیدل سپاہی ہیں، لیکن ہم اُن سے اس طرح لڑیں کہ وہ اپنی اصلی صفوں کو برقرار نہ رکھ سکیں، اُن کے سواروں کو ہم بندوقچیوں سے علحدہ کر دیں، اور اُن کے پیدل سپاہیوں اور سواروں کو ان کے ہاتھیوں کے ساتھ گڈمڈ کر دیں تاکہ ان کی فوج میں ترتیب باقی نہ رہے، میرے ذہن میں ان بنگالیوں کو شکست دینے کی ایک ترکیب ہے، سامنے ایک پہاڑی ہے، اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد کو اس پہاڑی کے پیچھے لے جا کر کھڑی کر دوں گا، لیکن تجربہ کار اور جری شہسواروں کی ایک مختصر جماعت کو جارحانہ حملہ کرنے کے لئے تیار رکھوں گا، غنیم اسی طرح لڑیں گے، جس طرح کہ پہلے لڑ چکے ہیں، ان کو اپنی شکست کا مطلق خیال نہ ہوگا، میں اپنے منتخب دستہ کو آگے بڑھاؤں گا، وہ بنگال کی فوج پر تھوڑی دیر تک تیر چلا کر پیچھے ہٹتے نظر آئے گا، ابراہیم خان کو یقین ہو جائے گا کہ اس کی طاقت ور فوج سے پسپا ہو کر افغان بھاگ رہے ہیں، ابراہیم خان کے حوصلے بڑھ جائیں گے، اور میری فوج پر اور بھی زیادہ دباؤ ڈالنے کے لئے اپنی توپوں اور

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از سراج عفیف ص ۱۱۴،

پیدل سپاہیون کو چھوڑ کر آگے بڑھ آئے گا، اس طرح اس کی صفون مین بے ترتیبی پیدا ہو جائے گی، اس کے بعد مین پہاڑی کے پیچھے سے اپنی فوج کو لے کر غنیم پر حملہ کر دون گا، اس طرح بنگالی سوار توپخانے اور پیدل سپاہیون کی مدد سے بالکل محروم ہو جائینگے اور وہ افغان شہسوارون کا مطلق مقابلہ نہ کر سکین گے،

یہ ترکیب بڑی ہوشیاری اور ہوشمندی سے عمل مین لائی گئی، اور وہی ہوا جس کی امید شیر خان کو تھی، ابراہیم خان کی فوج دام فریب مین پھنس گئی،[1]

اکبر نے اپنے انیسوین سالِ جلوس مین داؤد کے خلاف اپنی فوج بنگال بھیجی، تو لڑائی کے درمیان شاہی فوج کے التمش اور قول کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا، ان فوجون کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر داؤد یہ سمجھا کہ یہ ان کا محض فریب ہے، اس لئے اس نے ان کا تعاقب نہین کیا، اسی اثنا مین شاہی فوج کے داہنے بازو سے اُن کی مدد کے لئے کمک پہنچ گئی، پھر داؤد کی فتح شکست مین تبدیل ہو گئی،[2]

تیموری بادشاہ اس قسم کے جنگی فریب کو پسند نہین کرتے تھے، اس لئے ان کی لڑائیون مین دجل و مکر کی مثالین مطلق نہین ملتی ہین، کرنال کی جنگ مین نادر شاہ کے بعض دستے میدانِ جنگ سے بھاگتے نظر آئے، اس طرح کہ اپنے گھوڑون کی پیٹھ پر الٹے منہ بیٹھ گئے، اور تیر اور بندوق چلاتے ہوئے اپنے گھوڑون کو بھگا لے گئے، محمد شاہ کے سپاہی ان کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے، یہان تک کہ وہ ایک کمین گاہ کے پاس پہنچ گئے، جہان سے نادر شاہ کے سیکڑون بندوقچی نکل کر ان پر بری طرح حملہ آور ہوئے،

اس قسم کا جنگی فریب بڑی احتیاط اور ہوشمندی سے عمل مین لایا جاتا، اور جب بھاگتی ہوئی فوج پلٹ کر لڑتی تو اس کو دوگنی قوت غیر معمولی تیزی اور پامردی سے لڑنا پڑتا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از عباس خان سروانی، الیٹ جلد چہارم ص ۳۰۴ – ۳۰۵ [2] اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۲۶

شبخون | غنیم کے لشکر پر رات کے آخری حصہ میں اچانک حملہ کرنا بھی ایک جنگی فریب تھا، یہ پرانا طریقہ اس وقت سے جاری تھا، جب کہ انسانوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں، لیکن یہ اوچھے قسم کا وار سمجھا جاتا تھا، رات کے اس اچانک حملہ کو شبخون کہا جاتا تھا، اور یہ حملہ اسی وقت کیا جاتا جب کہ غنیم کی لشکرگاہ پوری طرح محفوظ نہیں ہوتی، حملہ آور کسی طرح غنیم کی لشکرگاہ میں چپکے سے گھس جاتے، اور پھر انتشار و اختلال پیدا کر دیتے، شبخون سے محفوظ رہنے کے لئے فوج چار دستوں میں تقسیم کر دیجاتی،

(۱) پیدل سپاہی تیر و کمان، تلوار، نیزے اور سپر سے مسلح ہو کر لشکرگاہ میں داخل ہونے کے راستے پر متعین کر دیے جاتے،

(۲) دائیں بازو یعنی یمین اور قلب کے سپاہی اپنی جگہ پر ہوتے، اور اپنے یہاں کی روشنی گُل کر دیتے تاکہ وہ دشمنوں کو نظر نہ آئیں، یا وہ کسی دوسری جگہ جا کر آگ روشن کر دیتے، غنیم گمراہ ہو کر وہاں پہنچ جاتے، تو پھر وہ نرغے میں پھنس جاتے،

(۳) بائیں بازو یعنی یسار کے سپاہی صف باندھے تیار کھڑے رہتے، تاکہ غنیم کا حملہ ہو تو اس کو وہ روک سکیں،

(۴) فوج کا چوتھا دستہ لشکرگاہ کو چھوڑ کر دور کے راستے پر گشت کرتا رہتا تاکہ غنیم کو کوئی مدد نہ پہنچ سکے، شبخون مارنے والے اپنے غنیم کے تمام راستوں کو مسدود کر دیتے، اور چلاتے، اور شور مچاتے کہ فلاں سردار مارا گیا، اور فلاں آدمی قتل کر دیا گیا، اس طرح غنیم کے لشکر میں سراسیمگی اور بددلی پھیل جاتی،[۵]

جو فوجیں نسبتہً کمزور ہوتیں وہی شبخون مارتیں، سلاطین دہلی کی فوجیں اس قسم کے جنگی فریب

---

۵ آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء

پسند نہین کرتی تھیں، لیکن ان کے دشمنون کے یہان اس فریب کی مثالین ملتی ہین، مثلاً محمد تغلق نے قنوج کے پاس گنگا کے ساحل پر عین الملک کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اپنا پڑاو ڈالا، تو موخر الذکر نے پچھلی رات کو شاہی لشکر کے اگلے حصہ پر چھاپا مارا، لشکریون مین بڑا شور مچ گیا، سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے، اور تلوار دن سے لڑائی کی جائے، تمام لشکریون نے تلوارین کھینچ لین، اور وہ دشمن کی طرف بڑھے، لڑائی کا ہنگامہ خوب گرم ہوا، عین الملک کا ارادہ بادشاہ کے خیمہ پر چھاپا مارنے کا تھا، لیکن اس کے رہبر نے اس کو دھوکا دیا، اور وہ وزیر کی جگہ آپڑا،[1]

پانی پت کی پہلی جنگ مین بابر نے لڑائی کی ابتدا، مین ابراہیم لودی کے لشکر پر شبخون مارنے کی کوشش کی لیکن اس کی تزک کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ شبخون بطیب خاطر نہین مارا، بلکہ بعض ہندوستانی امرار کے اصرار پر اپنی فوج کو شبخون مارنے کی اجازت دی، پانی پت مین اس کی فوج سات آٹھ دن پڑی رہی، اس کے تھوڑے تھوڑے سپاہی ابراہیم لودی کے لشکریون پر حملہ کرتے لیکن یہ اپنی جگہ سے نہ ہلتے، اس لئے بعض ہندوستانی امراو نے شبخون مارنے کی صلاح دی، چنانچہ چار پانچ ہزار سپاہیون کی ایک فوج شبخون مارنے کے لئے آگے بڑھی لیکن وہ غنیم کے پاس اس وقت پہونچ سکی جب صبح ہو رہی تھی، اسی لئے وہ کچھ نہ کر سکی، اور واپس ہو گئی،[2]

شیر خان نے چونسا کی لڑائی مین محض حیلہ و مکر سے فتح پائی، وہ ہمایون کے خلاف تین مہینے تک پڑاو ڈالے رہا، بالآخر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ شاہ آباد ضلع کے ماروں کی سرکشی کو فرو کرنے کے لئے اپنی فوج کے ساتھ وہان جائے گا، دو دن تک وہ اپنی فوج اسی طرف بڑھاتا گیا، اور جب پچیس میل آگے بڑھ چکا تو یکایک ہمایون کے لشکر گاہ کی طرف اپنی فوج کو موڑ دیا، اور

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۸۱ [2] بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۲۲۵،

بڑی خاموشی اور تیزی سے ہمایون کے سر پر آدھمکا، مغل فوج بالکل غافل ہوکر رات کی ٹھنڈی سی ہواؤن مین مزے کی نیند سو رہی تھی، افغان یکایک حملہ آور ہوئے، تو ہمایون کے کسی لشکری کو نہ تو مسلح اور نہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونے کا موقع ملا، ہمایون اپنی فوج کو جمع نہ کر سکا، اور جب اس کے سپاہی سراسیمہ ہوکر منتشر ہو گئے تو اُس نے خود میدان جنگ چھوڑ دیا اور اس کو اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے سکے،[۵۱]

اکبر شبخون مارنے کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، وہ ابراہیم حسین مرزا کے خلاف احمد آباد اور بڑودہ کے درمیان دریاے مندری کے پاس معرکہ آرا ہوا، تو اس کے پاس زیادہ لشکری نہ تھے، اس کے فوجی سردار جلال خان نے اس کو مشورہ دیا کہ جب تک ہمارے پاس کافی فوج نہ پہونچ جائے دن مین لڑائی لڑنا مناسب نہین، بلکہ رات کو شبخون مارنا چاہئے، لیکن اکبر نے شبخون مارنے کی صلاح کو پسند نہین کیا کیونکہ شبخون جیسا کہ ابو الفضل نے لکھا ہے، "صورت تلبیس و تزویر داشت" اکبر نے اپنے لشکریون کی ہمت بڑھائی اور اُن سے کہا، کہ دن کا کام رات پر اٹھا رکھنا بالکل مناسب نہین ہم جیتی اور ہوشمندی سے کام لیکر رزم آرا ہو جائین ہم مین سے ہر ایک شخص قوی دل ہوکر لڑے، اور یہ طے کر لے کہ ہر شخص کم از کم ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اُتارے گا،[۵۲]

احمد آباد کے حوالی مین محمد حسین مرزا کے خلاف اکبر صف آرا ہوا تو اس لڑائی مین بھی اس کو شبخون مارنے کا مشورہ دیا گیا لیکن اس مشورہ کو اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا، اس موقع پر ابو الفضل لکھتا ہے :-

شبخون بود پیشۂ بے دلان ازین ننگ دارند خیل یلان[۵۳]

---

۵۱ تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی ایلیٹ جلد چہارم ص ۵، ۴، ۳،
۵۲ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۳ ۵۳ ایضاً ص ۱۱،

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح شبخون کو کار بیدلان اور شیوۂ فریب کاران کہا کرتا تھا[۱]

مغل فوج شبخون تو نہیں مارتی تھی لیکن شبخوں مارنے والوں کی مدافعت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار

رہتی اس لئے وہ اپنی لشکرگاہ کو محفوظ کرنے کے لئے اس کی چارون طرف یا تو کانٹے بچھا دیتی،

یا مٹی کی دیوار کھڑی کر دیتی، یا خندقین کھود دیتی،[۲]

معارف :- یہ مقالہ انگریزی مین بھی اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) کے ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء

کے مختلف نمبرون مین شائع ہوا ہے،

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۱۹ [۲] اکبرنامہ جلد ۳ ص ۴۲۵، و ۵۳۵، بادشاہ نامہ جلد سوم ص ۲۴۹،

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فنِ انشاء اور شاہانہ

مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، بالخصوص

خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے مآخذ، اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام

واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے، قیمت :- صہ

رقعات عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے

گئے ہین، اس جنگ مین جمع کئے گئے ہین اور ان سے علم و ادب سیاست، اور تاریخ کے بیسیون حقائق

کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت :- للعہ

منیجر

محاکاۃ و تخئیل

از

جناب مولوی کبیر احمد صاحب ایم اے صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج

لغت مین کسی کے قول و فعل کی ہو بہو نقل کرنے کا نام محاکاۃ ہے، اصلیت کا عنصر محاکاۃ مین غالب رہتا ہے، ارسطو کے نزدیک اعلیٰ درجہ کا کلام وہ ہے، جو واقعہ اور نفس الامر کے مطابق نہ ہو، اور جس کو حقیقت و اصلیت سے سروکار نہ ہو، جس کا دارومدار جھوٹی اور گڑھی ہوئی داستانون پر ہو، جس کی غرض و غایت عیش و طرب کا جذبہ پیدا کرنا ہو، دورِ حاضر کے ماہرین کی رائے مین شاعری یا کلام کی بنیاد محض محاکاۃ پر نہین، بلکہ تخئیل و محاکاۃ دونون پر ہے، ارسطو اور اس کے رقیب دونون نے شاعری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، مگر کسی سے بھی تسلی و تشفی نہین ہوتی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محاکاۃ اور تخئیل دونون کا مفہوم سمجھ مین نہین آتا، سمجھ مین نہ آنے کی دو ہی وجہین ہو سکتی ہین، یا تو سمجھانے والون سے فروگذاشت ہوئی یا انھون نے تعقید کا پہلو اختیار کیا، اگر یہ نہین تو اُن کے سمجھانے کا معیار اس قدر بلند و ارفع ہے کہ کم فہمون کی سمجھ مین نہین آتا ہے، ان مین سے جو سبب بھی ہو، مگر یہ امر مسلم ہے کہ متقدمین اور متاخرین کے کسی طبقہ نے محاکاۃ اور تخئیل کی صحیح تعریف نہین بتلائی، کہین یہ کہا گیا کہ تخئیل کی تعریف ویسی ہی مشکل ہے جیسے شعر کی، کہین قوتِ اختراع کے نام سے نامزد کی گئی، کہین یہ کہا گیا کہ محاکاۃ کی ساری گلکاری کا دارومدار اور رونق تخئیل کی بدولت پائی جاتی ہے، محاکاۃ بے تخئیل جسد بے روح کی مانند ہے،

(۲) سب سے بڑی دشواری جو محاکاۃ اور تخئیل کے مسئلہ مین پیش آتی ہے، یہ ہے کہ حواس خمسہ ظاہری و باطنی مین سے ان کا تعلق کس قوت سے ہو؟ یا ان کے مترادف اسمار کون کون ہین، حواس ظاہری قوت باصرہ، قوت سامعہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ، قوت شامہ ہین، حواس باطنی حس مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متصرفہ ہین، متصرفہ کی ذریت متفکرہ اور متخیلہ ہین، محاکاۃ مصدر ہے، یہ ایک فعل ہے، فاعل یا قوت فاعلی نہین، یہ کسی قوت فاعلہ موثرہ کا فعل و اثر ہے، دوسرے الفاظ مین قصہ یا حکایت بیان کرنا ایک فعل ہے، بیان کرنے والا بیان کا غیر ہوتا ہے، دونون ایک چیز نہین، ایک ذات ہو اور ایک اس کی صفت، صفت محتاج ہے ذات کی، ایسے ہی بیان کو بیان کرنے والے کی ضرورت ہے، محاکاۃ اگر بمعنی محاکی یعنی بیان کرنے والا لئے جائین، تو بھی مذکورۂ بالا دسون حواس مین سے اس کا تعلق معلوم کرنا دشوار ہے،

لغت مین کسی کے قول و فعل کی بجنسہ نقش کشی کرنے کا نام محاکاۃ ہے، بیان کرنے والی قوت کا نام محاکاۃ نہین، گمان غالب یہ ہے کہ جس کلام کی بنا گڑھے ہوے قصون اور افسانون پر ہو اس مین متخیلہ کی ریشہ دوانی ضروری ہے، اس لئے محاکاۃ بھی متخیلہ کا ہی کارنامہ ہے،

(۳) تخئیل کے معنی ہین تصویر خیال الشیئ فی النفس یعنی صورت ذہنیہ یا قلبیہ کی نقش کشی کا نام تخئیل ہے، یہ بھی مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی مین لیا جا سکتا ہے، متخیلہ کوئی قوت باطنی نہین مگر متصرفہ کی ایک قسم ضرور ہے، اگر تخئیل سے مراد متخیلہ ہے، تو چندان دشواری نہین، اس لئے کہ متخیلہ وہ قوت دماغی ہے، جو عقل کو پس پشت ڈال دیتی ہے، اور من گھڑت اور فرضی داستانون کی سخن سازی مین مصروف رہتی ہے، تاکہ غیر متین لوگ اس سے لطف اندوز ہون، متخیلہ کا ابلہ فریب زربفت جھوٹ اور باطل کے تار و پود سے طیار ہوتا ہے،

راقم کی رائے ناقص مین یہ ہو کہ محاکاۃ اور تخئیل دونون قوت متخیلہ کے در کے بھکاری ہین، انکے

دامن مین جو کچھ بھی ہے وہ سب تخیلہ کے دست نوال وفضل کا نتیجہ ہے، تخیلہ اور محاکات دونون مفہوم کے اعتبار سے ایک ہین، گو نام جداگانہ ہین، غرض وغایت بھی دونون کی ایک ہے، یعنی عیش و طرب کی جذبہ آفرینی، البتہ چند باتون مین بظاہر مختلف نظر آتے ہین، یون سمجھئے کہ دونون کی منزلِ مقصود ایک ہے، گو راستے جدا جدا ہین،

(۴) سب سے پہلا مصنف جس نے فنِ بلاغت مین کتاب لکھی ارسطو ہے، اس کی راے مین شاعری کی بنیاد محاکاۃ پر ہے لیکن دورِ حاضر کے ماہرین کے نزدیک شاعری مین محاکاۃ اور تخیل دونون کی ضرورت ہے۔ ارسطو نے یہ کتاب شباب کے زمانہ مین لکھی تھی، خود شاعر نہ تھا، یونان کے مشاہیر شعراء سوفاکلیس و ہومروس کی نظمین نشاط انگیزی کے لئے لکھی گئی تھین، جن مین جھوٹ کا عنصر غالب تھا، اس لئے ارسطو نے اپنے دور کی شاعری کا تذکرہ محققانہ طور پر کتاب مذکور مین کیا ہے، سکندرِ اعظم کا زمانہ یونانی تاریخ کا دورِ زرین ہے، یونانیون کا تعیش و تمدن اس زمانہ مین اوجِ شباب پر تھا، ناز و نعمت کی بہتات تھی، بزمِ عیش کا دور دورہ تھا، ایسے زمانہ مین جب کہ زندگی کے ہر شعبہ مین فطرتِ انسانی تکلفات کی ایجادات کی طرف مائل تھی، شاعری کی بنیاد کس طرح سادگی اور سچائی پر رہ سکتی تھی، ایک زمانہ تک بلاشبہہ یونانی اپنی شاعری مین سچے جذبات کی ترجمانی کرتے، اور حقیقی شاعری کی شاہراہ پر گامزن رہے لیکن جب اُن کی زندگی مین تکلفات بڑھے تو سچی اور فطری شاعری اُن کو پھیکی معلوم ہونے لگی، اور اس مین رنگ آمیزی اور حیرت انگیز واقعات کا اضافہ شروع ہو گیا، اور جب طبیعتین جھوٹ کی خوگر ہو گئین، تو ایوانِ شاعری کا سنگِ بنیاد جھوٹ پر رکھا گیا،

(۵) محاکاۃ اور تخیل پر تفصیلی بحث سے پہلے اخلاقی قوتون کا تذکرہ ضروری ہے،

ظاہری صورت کا حسن و جمال اعضاء کے تناسب پر موقوف ہے، اور باطنی صورت کی

خوبی اخلاقی قوتون کے اعتدال پر قائم ہے،

باطنی قوی (۱) قوتِ شہوانی جلب منفعت کی جانب مائل کرتی ہے (۲) قوتِ غضبی دفع ضرر کی طرف رغبت دلاتی ہے (۳) قوتِ نطقی، عقلی، ملکی، یہ صرف انسان کو عطا کی گئی ہیں، اس کے دو مقصد ہین، علمی ترقی، اس اعتبار سے اس کو عقل نظری کہتے ہین، دوسری جسمانی قوتون کو حدِ اعتدال پر قائم رکھکر اُن سے کام لینا، اس حیثیت سے اس کو عقل عملی کہتے ہین

جذبات اور عقل دونون انسان کے لئے ضروری ہین لیکن جذبات یعنی قوت شہری اور غضبی کو عقل کے تابع رہنا چاہئے، خالی عقل کی ترقی جذبات کو فنا کر دیتی ہے، اور مدنیت و انس انسان مین باقی نہین رہتا، اسی طرح اگر جذبات ہی کی پرورش ہوتی رہے تو عقلی ترقیان نیست و نابود ہو جاتی ہین، اور انسان کا شمار احمقون کے زمرہ مین ہونے لگتا ہے، اس لئے عقل و جذبات مین شیر و شکر کا سا امتزاج ضروری ہے، عقل کو حرکت دینا جذبات کا کام ہے، جذبات کو حدِ اعتدال پر قائم رکھنا عقل کا کام ہے، اخلاقی قوتون کے حسن و دلفریبی کا راز اسی مین ہے

محض عقلی ترقی کی بے اعتدالی کے نتائج بڑے عبرتناک ہوتے ہین، اس کا سب سے بڑا ثبوت موجودہ دور کی عقلی ترقیان ہین، جن سے انسانیت پامال ہو رہی ہے، ایثار و قربانی، رحم و کرم، سچائی، وفاداری وغیرہ انسانی ہمدردی کے جذبات فنا ہو چکے، بنی آدم اعضاے یک دیگراند کا نظریہ نسیاً منسیا ہو چکا، قوتِ نطقی، قوتِ شہویہ و غضبیہ کا لقمہ بن چکی ہے، یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ عقل جسمانی قوتون کو حدِ اعتدال پر قائم رکھنے سے قاصر ہے، انسانی ہمدردی کہین باقی نہین رہی ہر قوم، خاندانی، قومی و وطنی عصبیت مین مبتلا ہے، اور عقلی ترقی کے باعث انسانی شرافت کی دھجیان اڑ رہی ہین، جذبات کی افراط و زیادتی کے بُرے نتائج یہ ہین کہ جس زمانہ مین یورپ مین علم کیمیا، طبعیات، ریاضیات، فلکیات، معدنیات وغیرہ علم و فن کے ہر شعبہ مین تلاش و تحقیق کا

سلسلہ جاری تھا، نئی نئی ایجادات ہورہی تھیں علمی ترقی کا آفتاب نصف النہار پر تھا، عین اس زمانہ مین ہندوستان قوت شہوی کی راجدھانی تھی، بٹیر بازی، مرغ بازی، شطرنج بازی، کبوتر بازی وغیرہ کی گرم بازاری تھی، ہر فرد عیش وطرب مین مست تھا، ہندوستان کی ساری آبادی کا میلان فنون لطیفہ رقص وسرود وغیرہ کی جانب تھا، ہزل وسخریہ اس کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا، عیش پرستی اُن کی سرشت مین داخل ہوگئی تھی، اُن کی عمر عزیز مفید کامون کے بجائے لہو ولعب مین برباد ہورہی تھی، اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ سب کو معلوم ہے،

غرض ہندوستانیون کو جذبات کے غلبہ نے تباہ کیا، اور یورپ کی تباہی عقل پرستی کے ہاتھون ہوگی، جس کے آثار نمایان ہین،

روح انسانی یا نفس ناطقہ تمام اعضاے جسمانیہ کی حاکم مدرک و عالم ہے، اس لئے عرض نہین، مدرک کلیات ہے، اس لئے جسم وجسمانی نہین، کیونکہ کل کی کلیت کسی جسم مین قائم رہنے سے باقی نہین رہتی، اس کی تقسیم اس نقشہ سے ظاہر ہوگی،

روح انسانی

قوت عالمہ یا عقل		عاملہ
نظری	عملی	وہ قوت ہے جس کے ذریعہ روح
مثلاً اللہ تعالیٰ کو	مثلاً ظلم قابل ترک	انسانی کا کام قویٰ اور اعضاے جسمانیہ
رحیم وکریم ماننا	عدل قابل اختیار ہے	پر تسلط ہوتا ہے،

تمام امور کلیہ جزئیہ مادیہ مجردہ سب کی مدرک انسان مین روح انسانی ہے، اس بحث کو سمجھنے کے لئے حواس خمسہ باطنی کی تشریح ضروری ہے،
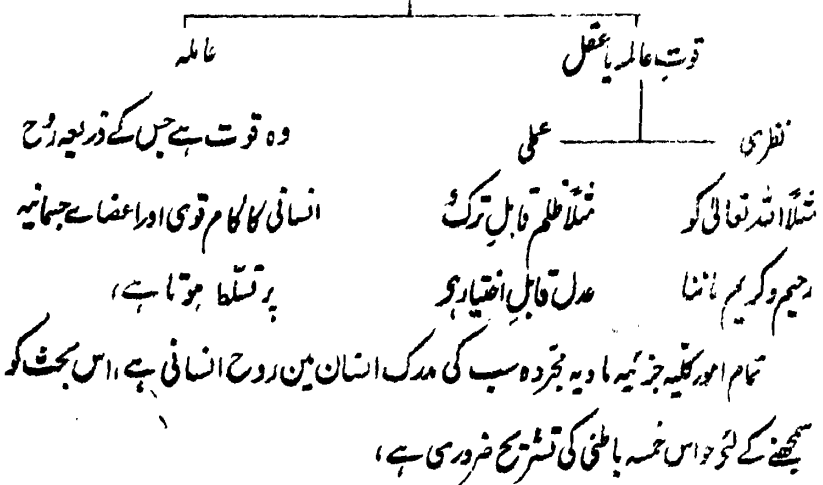
حواس خمسہ باطنی، (۱) حس مشترک، خزانہ حواس ظاہری، دماغ کا اگلا حصہ، اس کا

مرکز ہے،

(۲) خیال، خزانہ حسِ مشترک، دماغ کے اگلے حصہ کا جوف آخر،

(۳) واہمہ، محسوسات کے معانی جزئیہ کا ادراک دماغ کے جوفِ اخیر کا پہلا حصہ،

(۴) حافظہ، ذاکرہ، مسترجعہ، ادراک، خزانہ قوتِ واہمہ دماغ کے آخری حصہ کا جوف آخر،

(۵) متصرفہ، (جنس) متفکرۃ متخیلہ (نوع) اوسط دماغ،

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کسی کے قول و فعل کی بلا کمی بیشی ہوبہو نقش کشی کا نام محاکاۃ ہے، جسم کی ہوبہو تصویر شیشہ کھینچ سکتا ہے، بشرطیکہ شیشہ شفاف اور اعلیٰ درجہ کا ہو، بہت سے شیشے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس میں کثیف جسموں کا پورا نقش نہیں اترا کرتا، بلکہ چھوٹا جسم بڑا، بڑا چھوٹا، سیدھا ٹیڑھا اور ٹیڑھا سیدھا معلوم ہوتا ہے، قوتِ خیالیہ بھی ایک آئینہ ہے جس میں غیر مادی یا لطیف اشیاء کا عکس منعکس ہوتا رہتا ہے، اس لئے محاکاۃ کی تعریف کے مطابق کسی قول و فعل کی ہوبہو صورت کشی مشکل ہی نہیں، بلکہ محال ہے، اس لئے کہ جب شیشہ میں قوت ایجاد و اختراع کا وجود نہیں، اور وہ بھی ہوبہو نقش کشی سے عاجز ہے، تو قوتِ خیالیہ بدرجۂ اولیٰ اس فریضہ کی انجام دہی سے قاصر رہے گی، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے شیشہ میں جسم انسانی کی صورت کشی بلا کم و کاست ہوتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، اس تصویر میں بہت سی صفات معدوم ہوتی ہیں، مثلاً (۱) جسمیت (۲) حیوانیت (۳) ناطقیت، اس لئے کہ آنکھ تو موجود ہوتی ہے، مگر بینائی سے محروم، کان موجود ہوتے ہیں، مگر شنوائی معدوم، ہاتھ پیر پائے جاتے ہیں، مگر حرکت کا پتہ نہیں، ناک موجود ہے، مگر قوت شامہ ندارد، زبان گو دکھائی دے، مگر گویائی اور صفتِ چاشنی سے ناآشنا،

خلاصہ یہ ہے کہ جب جسمانیات کی ہوبہو صورت کشی دشوار ہے، تو قول و فعل کی نقش کشی تو اور بھی

محال ہے، البتہ کمی بیشی کے ساتھ ممکن ہے، اور اس کا دار و مدار مصوّر یا شاعر کی قوتِ خیال پر ہے، جس نے اگر اصلیت کو قائم رکھتے ہوئے، قوتِ خیالیہ سے اس میں تصرف کیا ہو، اور بقدر استطاعت جسم یا قول و فعل کی محاکاۃ کی ہے، تو اعلیٰ درجہ کا مصور یا شاعر کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر اصلیت کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے، اور صرف قوتِ خیال کے زور سے ایک فرضی تصویر دلوں کو لبھانے کے لئے تیار کی ہے، تو ایسی مرقع کشی مصوری کے نگارخانہ میں تحسین و آفرین کی مستحق ہو تو ہو مگر عالم شاعری میں اس کی داد نہیں مل سکتی، اس لئے کہ دراصل وہ کسی کے قول و فعل کی نقش کشی نہیں ہے، اور نہ اس کو محاکاۃ اور اصلیت سے کوئی سروکار ہے، بلکہ وہ محض ایک خیالی طلسم ہے، جس کو ڈرامایا طلسمی نظر یا سوانگ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، مگر شعر کے زمرہ میں داخل نہیں کیا جا سکتا، البتہ جس قول یا فعل کی ترجمانی اس طرح کی جائے کہ اس میں قوتِ خیالیہ کی رنگ آمیزی کے ساتھ ساتھ حقیقت اور اصلیت کا پہلو بھی نمایاں ہو، تو اس کو شعریت کا تمغہ مل سکتا ہے۔

(۲) محاکاۃ میں خود قوتِ فاعلیہ موجود نہیں، یہ دراصل کسی فاعل کا فعل اور کسی مؤثر کا اثر ہے، اور وہ قوتِ گویائی یا بیان ہے، جو ہر انسان کو منجانب اللہ عطا ہوتا ہے۔ محاکاۃ میں سب سے پہلے قول یا فعل کا نقشہ دماغ یا ذہن میں کھنچتا ہے، تصور شوق کا مادہ پیدا کرتا ہے، شوق ارادہ پر تصرف کرتا ہے، ارادہ قوتِ بیان کو حرکت میں لاتا ہے، اور ان تمام قوتوں کی مدد سے محاکات کا فعل وجود میں آتا ہے، قول و فعل کا تصور دراصل قوتِ خیال میں پیدا ہوتا ہے، قوتِ خیال ایک آئینہ خانہ ہے، جس میں قول و فعل کی صورتیں منعکس ہوتی رہتی ہیں، اور جس طرح جسم کی تصویر کشی کی خوبی کا دار و مدار آئینہ کی خوبی پر ہے، ایسے ہی فعل و قول کی نقاشی کا انحصار قوتِ خیالیہ کی قوت پر ہے، شاعر کی قوتِ خیال میں اسی قدر رفعت اور بلند پردازی ہوگی، جس قدر شاعر ذکی الحس ہوگا، جس طرح حواس خمسہ کا خزانہ حسِ مشترک ہے، اسی طرح خیال حسِ مشترک

کا خزانہ ہے، اور مشاہدات اور ادراکات کا سارا ذخیرہ قوتِ خیال مین موجود رہتا ہے، قوت بیان اس سرمایہ کو عقل کی مدد سے .... ایک ہی ترتیب و رنگ سے جلوہ گر کرتی ہے، قوتِ خیال کے دو فرائض ہین،

(۱) وہ تمام انسانی ادراکات کی خزانچی ہے،

(۲) قول و فعل کی تصویر کشی کے بعد اس کو قوت متصرفہ یا مفکرہ کی مدد سے حسن ترتیب کیساتھ قوتِ گویائی کے سپرد کر دیتی ہے، اور وہ اس مین لحن و موسیقی کا اضافہ کرکے سامعین کے کانون تک پہنچاتی ہے،

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ آنکھون نے جس طرح کسی فعل کو ہوتے ہوئے دیکھا، کان نے قول کو جس طرح سنا، زبان کو جو ذائقہ ملا، ہاتھون اور ناک کو جو لطف و اذیت حاصل ہوئی، حواس خمسہ کے ذریعہ یہ احساس حس مشترک کے خزانہ مین داخل ہو گیا، اور حسِ مشترک نے یہ سارا ذخیرہ صورت کشی کے لئے خیال کے کیمرہ کے حوالہ کر دیا، قوتِ خیال اسی سرمایہ کو قوتِ منفکرہ کی مدد سے الفاظ کی سلک گہر مین پرو کر قوتِ بیان یا گویائی کے حوالہ کر دیتی ہے، وہ اس پر لہجہ و لحن کا غازہ و گلگونہ ملکر سامعین کے سامنے پیش کر دیتی ہے، گویا حواس خمسہ گلچین یا عطا کنندہ گل ہین، حس مشترک خزانچی گل، قوتِ متفکرہ اس کی امین یا مالن ہے، اور قوتِ بیان اس سہرے کو عطر آگین کرکے حاضرین کے حلقۂ گوش مین ڈالتی ہے، اس سلسلہ مین اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جیسے انسان کی عمر چار حصون طفلی، شباب، کہولت اور پیری مین تقسیم ہے، ویسے ہی عقل انسانی کے چار درجے ہین، عقل ہیولائی، عقل بالملکۃ، عقل مستفاد اور عقل بالفعل، اول الذکر قابلِ التفات نہین، صرف آخری دو کام کے ہین،

۸۔ محاکاۃ اور تخئیل کی مفصل بحث کے بعد اس کی مزید توضیح ان الفاظ مین کیجا سکتی ہے کہ

فرض کیجئے، زید کے اعلیٰ جود وکرم کو دیکھ کر کسی خاقانی زمن کے دل میں جذبہ تحسین وآفرین پیدا ہوتا ہے، تو اس کے جود وکرم کا جو تصور اس کے دماغ میں موجود ہے، اگر وہ اس کو اپنی قوتِ متفکرہ کی مدد سے قوتِ بیان و تحریر یا محاکاۃ کے ذریعہ عمدہ عبارت میں صفحۂ قرطاس پر کھینچ دے، تو وہ اعلیٰ درجہ کے قصیدہ سے نامزد ہوگا،

مثلاً خواجہ میر دردرحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

خواجہ صاحب اپنے پیر و مرشد کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی توجہ سے خواجہ صاحب کا دل ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتا ہے، اور اس سے ایک وجدانی کیفیت ان پر طاری رہتی ہے، جو اس قدر سرور انگیز ہے کہ اس سے علحدگی اور دوری خواجہ صاحب کے لئے ممکن نہیں، ایسی صورت میں اپنے مرشد سے خطاب کرتے ہیں کہ اجل کا کوئی وقت معین نہیں، ممکن ہے، ابھی آجائے، یا آپ کی توجہ کسی دوسری جانب مائل ہو جائے، اس لئے التماس ہے کہ تا دمِ مرگ آپ کی توجہ مجھ پر ایسی ہوتی رہے کہ میں ذکر الٰہی سے لطف اندوز ہوتا رہوں، یہ نقشہ خواجہ صاحب کے دل میں کھچا، اور اسکی وہ ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، جس کو میری قوتِ خیالیہ نے کئی سطروں میں پھیلا کر بیان کیا ہے، لیکن چونکہ قوتِ متفکرہ کا اعلیٰ رنگ اس میں موجود نہیں ہے، اس لئے اختصار نہیں، جدتِ ادا نہیں، قوتِ بیان کی افسون گری نہیں، سادگی نہیں، وزن نہیں، قافیہ نہیں، جوش نہیں، اس لئے اس کو شعر کا لقب نہیں دیا جا سکتا، لیکن اسی خیال کو جب ان الفاظ میں،

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ادا کیا جاتا ہے، تو شعر بن جاتا ہے، دیکھئے اس شعر مین کئی سطرون کا مفہوم صرف نصف سطر مین ادا کیا گیا ہے، اور اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ کہ اس سے روح لذت گیر ہوتی ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، خواجہ صاحب کی قوت متفکرہ نے پیر کے بجاے ساقی کا لفظ اختیار کیا ہے، جس سے مفہوم مین بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے، اور عام میخوار بھی اس کو پڑھ کر اور سن کر لطف اندوز ہو سکتے ہین، "لگ رہا ہے چل چلاؤ" سے وہ یہ مراد لین گے کہ محفل رندان کے اختتام کا وقت قریب ہے، بزم درہم برہم ہونے والی ہے، اس لئے جو وقت بھی باقی ہے، اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے، اور خواجہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کوچ کا وقت قریب ہے، ایسے وقت مین اور بھی مرشد کی توجہ کی ضرورت ہے، اور بیان کی اس سادگی مین تاثیر کی یہ فسون گری قوت متفکرہ کی بدولت ہے، جس نے شاعر کی زبان سے اس جذبہ کی پوری تصویر کھینچدی ہے، محاکات کی حد وہین تک ہے، جہان تک نقل مین اصل کی مطابقت کا سوال ہے، چل چلاؤ، بس چل سکے، ساغر چلے، ساقی اور ساغر کے الفاظ کا انتخاب اور اس کی خاص ترتیب وغیرہ متفکرہ سے متعلق ہے، لیکن اگر خواجہ صاحب کے ذہن مین ذکر الٰہی اور اس سے لطف اندوزی کا کوئی تصور نہین تھا، تو اس شعر کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ کوئی میخوار عالم مستی مین ساقی سے کہہ رہا ہے کہ جب تک مجھ مین شراب نوشی کی سکت باقی رہے، پلاتا چلا جا، کیونکہ بادہ کشی کا زمانہ ختم ہونے کو ہے، معلوم نہین پھر بادہ نوشی کی نوبت کب آئے، اس صورت مین خواجہ صاحب کی اس مرقع کشی کا شمار شعر کی فہرست مین ہوگا، اور اس کی بنیاد متفکرہ یا محاکات کے بجائے متخیلہ قرار پائے گی، اس لئے کہ خواجہ صاحب کے دماغ مین بادہ کشی کا کوئی نقش موجود نہین بلکہ وہ دوسرون کے خیال کی نقل کر رہے ہین، جب یہ مسلم ہے کہ یہ سب کارنامے قوت متخیلہ کے ہین تو محاکات کے بجائے متفکرہ اس کی علت کیون نہین قرار دیجاتی، اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کے قول و فعل کی ہو بہو نقش کشی کا نام محاکات ہے اور

یہاں نقش وتصور نہ تو خواجہ صاحب کے دماغ میں تھا، نہ کسی اور کے دماغ میں اور جب تصور و احساس نہو تو شوق کا پایا جانا محال ہے، اور بغیر شوق کے ارادہ کا وجود نہیں ہو سکتا، لیکن اگر ارادہ نہ تھا، تو پھر شعر کیسے کہا گیا، کیونکہ بلاارادہ کسی فعل کا صدور ممکن نہیں، جو فعل بلاارادہ ہو وہ طبعی کہلاتا ہے، اور طبعی فعل یا وہ فعل جو بلاارادہ صادر ہو شعر کی تعریف سے خارج ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ارادہ بلا شوق و تصور کے بھی ممکن ہے،

فعل کی دو قسمیں ہیں (۱) اختیاری (۲) اضطراری یا جبری فعل بالارادہ کو اختیاری اور بلاارادی کو اضطراری یا جبری کہتے ہیں،

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس شعر کے مادی تصور کی صورت میں خواجہ صاحب نے اس کے کہنے کا ارادہ ضرور کیا لیکن دوسرے کی طرب انگیزی کے لئے یا جبری طور پر اس لئے کہ اس میں شاعری کے دو عناصر یعنی تصور اور شوق موجود نہیں تھے، صرف ارادہ و تخیلہ نے اس کو خلعت وجود عنایت کیا، اور وہ بھی حقیقی و اصلی نہیں، بلکہ نقلی و مصنوعی، اس طرح تخیلہ کی مصوری سے یہ نقش طیار ہوا ہوگا اگر اس صورت میں روح غائب نہ پایا ہو جب اصلیت اور روح کا پتہ نہ ہو تو شعر کی بنیاد محاکاۃ یا نری قوت متخیلہ پر ہوگی، مگر متخیلہ کا ایوان صرف کذب کی نقش آرائی سے تیار ہوتا ہے جس کی اثر انگیزی صرف زبان تک محدود رہتی ہے، دل تک اس کی رسائی نہیں ہوتی، مگر اس شعر کی افسون گری، جدت ادا اور تاثیر بے اختیار دل کو کھینچتی ہے، اس لئے اس شعر کی بنیاد محض تخیلہ یا دوسرے الفاظ میں کذب پر نہیں ہو سکتی کہ جھوٹ میں تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی،

قوت متخیلہ یا واہمہ کی مثال گھوڑے کی تعریف میں انشار کا یہ شعر ہے،

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

اس مین حاضری، ٹھن کلکتہ، لندن وغیرہ کے نقش تو انشا کی قوت حافظہ وخیال مین محفوظ تھے، لیکن ایسا کوئی نقش اُن کے خزانۂ خیال مین نہین تھا کو کوئی گھوڑا ۵-۶ گھنٹہ مین ۵-۶ ہزار میل کی مسافت طے کرتا ہو، انشا کی قوتِ واہمہ کی طلسم سازی نے ایک ایسا گھوڑا طیار کیا ہے جس کو حقیقت واصلیت سے کوئی تعلق نہین، اس مین محاکاۃ وخیال کی ترکیب نہین، بلکہ تفریق وجدائی اور محض واہمہ کی کارفرمائی ہے، اور اس قسم کے اشعار سے وہی طبیعتین لطف اٹھا سکتی ہین، جو تخیلہ اور واہمہ کے سحر مین گرفتار ہین،

(باقی)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس مین شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیون اور ان کے خصوصیات، اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعرا (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور اُن کے کلام پر تنقید وتبصرہ ہے۔ قیمت: ؎ ر

شعر العجم حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک) مع تنقید کلام

قیمت:- ؎ ر،

شعر العجم حصہ چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے، کہ ایران کی آب وہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور شاعری کے تمام انواع واقسام مین سے مثنوی پر تبصرہ، قیمت ؎ ر،

منیجر

کتاب النبات دینوری

از

جناب محمد حمید اللہ صاحب پیرس

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف دسمبر ۱۹۴۹ء)

کچھ عرصہ ہوا معارف مین اس موضوع پر چند باتین عرض کی گئی تھین، اور مدینہ منورہ کے ایک مخطوطے کا ذکر کیا گیا تھا، جو دینوری کی کتاب النبات کے تین بابون پر مشتمل ہے آج ایک مزید ٹکڑے کی دستیابی کی خوشخبری دینی ہے،

بمبئی کے مرحوم دولسانی رسالہ العروۃ کے شمارہ دوم مین ترمذی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، معلوم نہین اُن کے معلومات کا ماخذ کیا تھا، لیکن وہ زائد چیز نہین، بلکہ مدینہ منورہ کے مذکور صدر مخطوطے ہی سے متعلق ہے، مین نے ۱۳۶۶ھ کے آغاز مین اس کی نقل لی تھی، ترمذی صاحب اور انکے ممدوح کو نہ معلوم اس کا پتہ کب چلا، البتہ ترمذی صاحب کی یہ اطلاع اردو دان طبقہ کے لئے شائع کرنی ہے کہ مصر کے ممتاز عالم نباتات ڈاکٹر احمد عیسی بک نے دینوری کے اقتباسات مختلف کتب لغت وغیرہ سے اکٹھا کئے ہین، اور ان کو شائع کرنا چاہتے ہین، اگر وہ شائع ہو گئے تو انھی کو ولیت حاصل ہو گی، باقی اکٹھا کرنے کی حد تک اس سے پہلے بھی متعدد اصحاب نے یہ کوشش کی اس مقالہ کے پہلے نمبر مین زلبربرگ کا ذکر ہے، جس نے اب سے کوئی چالیس اکتالیس برس پہلے کوشش کی تھی، راقم الحروف نے بھی کئی سو صفحون مین ایسا ہی مواد جمع کیا ہے، لیکن ناتمام ہونے کے باعث

اشاعت کی جانب توجہ نہین کیجا سکی، اس کے لئے ہزارون مطبوعہ اوراق کی دیدہ ریزی سے چھان بین کرنے کے علاوہ مخطوطات سے بھی مواد لینا ہے، جن مین سے بعض نہایت نادر ہین، مثلاً ابن سمجون کی جامع الادویۃ المفردۃ یا ابن سیدۃ کی المحکم وغیرہ،

مجھے آکسفرڈ مین چند ماہ ہوئے اپنے ایک سابق جرمن استاذ کی زبانی معلوم ہوا کہ استانبول مین ایک کامل نسخے کا پتہ چلا ہے، اس کے متعلق جرمن انجمن مستشرقین شاخ استانبول کے ناظم ڈاکٹر ہلموت ریٹر سے معلومات حاصل ہو سکتے تھے، لیکن وہ اب استانبول چھوڑ کر وطن کی خدمت کے جذبہ سے فرانکفورت کنار ماین کی جامعہ مین شعبۂ مشرقیات کے صدر بن کر چلے گئے ہین، انھین وہین خط لکھا، کچھ عرصہ کے بعد جواب ملا کہ افواہ صحیح ہے لیکن مخطوطہ کامل نہین، بلکہ اصل کا ایک ٹکڑا ہے، اور اس پر سویڈن کے ایک مستشرق کام کر رہے ہین،

پھر آخر الذکر کو خط لکھا آج کی صحبت مین ماخذ اطلاعات ان ہی کا خط ہے، ڈاکٹر برنارٹ لیوین جامعۂ اپسالا کے کتب خانہ مین کسی عہدے پر مامور ہین، اور آج کل ابن المعتز کے کلام کی اشاعت مین مصروف ہین، وہ ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء کے خط مین لکھتے ہین،

"یہ واقعی ایک حیرت انگیز اتفاق ہے کہ اس قیمتی کتاب (کتاب النبات للدینوری) کے مختلف ٹکڑے تقریبًا ایک ہی وقت مین دستیاب ہوئے، اور اہل علم کے ہاتھون مین پہنچے ہین، جن مین ایک آپ ہین، اور ایک اس دور دراز سویڈن مین"

ڈاکٹر لیوین نے ازراہ عنایت اپنے نسخے کے چند اوراق کا فوٹو بھی خط مین منسلک کیا ہے، اب تجویز یہ ہے کہ نئے ٹکڑے پر دونون کام کرین، اور دونون ٹکڑے ایک ساتھ شائع ہون، اگر کوئی خلاف توقع حادثہ نہ بھی پیش آئے، تو بھی اس کام مین کچھ عرصہ لگے گا، اس لئے اہل علم کی آگاہی کے لئے فی الحال چند معلومات عرض کئے جاتے ہین،

نیا مخطوطہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے جس میں (۲۳۴) ورق یا (۴۰۸) صفحات ہیں، خط نہایت نفیس، اعراب لگا اور جلی ہے، جن چند صفحوں کا فوٹو آیا ہے، اس میں کہیں تاریخ نہیں ہے، لیکن اندازاً سات آٹھ سو برس پہلے کا نسخہ معلوم ہوتا ہے،

یہ ٹکڑا کتاب کے جزء خامس پر مشتمل ہے، ابتدائی پندرہ ورق غائب بیان کئے جاتے ہیں ورق ۱۶ سے جو متن شروع ہوتا ہے، وہ ڈاکٹر لیوین کے الفاظ میں یوں ہے،

ورق ۱۶ تا ۲۶ ب	ومن الخامس صنعة القسی	(کمان سازی کی قسمیں)
" ۲۷ ب تا ۳۵ ب	من صفات النبل	(تیروں کی صفتیں)
" ۳۶ تا ۳۸ ب	مما فی القدح	(تیروں کا لکڑی کا حصہ)
" ۳۸ ب تا ۵۲	مما یحمل علی القداح	(تیروں میں لکڑی کے حصہ پر چڑھائی جانے والی چیز)
" ۵۲ تا ۷۱	من اسماء الشتھاء	(پہنوں کے لئے عربی مترادفات)

اس کے بعد مخطوطے میں ایک اچنبھا ہے، ڈاکٹر لیوین کے الفاظ میں،

"ورق ۱۷ تا ۲۳۴ میں نباتی نام حروف تہجی پر مرتب ہیں، اور الف سے زا تک یہی ترتیب ہے، اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب النبات دو بڑے حصوں پر مشتمل رہی ہے، پہلے حصہ میں مستقل مقالے تھے، جو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کئے گئے تھے، اور دوسرے حصہ میں ایک قاموس تھی"

اس تفصیل سے متعدد اہم مسائل حل ہوتے ہیں، اگرچہ اُپسالا کا نسخہ بھی اپنی جگہ مکمل نہیں ہے لیکن خوش قسمتی سے یہ وہ ٹکڑا ہے، جہاں کتاب کی ایک اہم خصوصیت یعنی اس کی تقسیم نمایاں ہے، اسی طرح اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن سمجون، الغافقی اور ابن البیطار کی جڑی بوٹیوں میں

حروف تہجی کی ترتیب اُن کی جدت نہ تھی، بلکہ دینوری ہی کی نقالی اور خوشہ چینی تھی، میں اپنے مقالے کی پہلی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ ابن سمجون اور ابن البیطار وغیرہ نباتات پر اپنے بیشتر و تحقیق بیانات جمع تو کرتے ہیں لیکن آغاز عموماً دینوری کے بیان سے کرتے ہیں، اور ابن البیطار کے ہاں بعض وقت یہ فقرہ ملتا ہے، قال الغافقی قال ابوحنیفۃ الدینوری" اس کی توجیہ یہ کرنی پڑتی ہے کہ ابن بیطار نے دینوری کے اس بیان کو جو حروف تہجی کی ترتیب پر نہیں بلکہ مستقل مقالات کی صورت میں ہے اور جس کی تلاش آسان نہیں ہے، کبھی اپنی یادداشت کی مدد سے اور کبھی غافقی کے آسان ذریعہ سے کتاب المفردات میں نقل کیا ہوگا، کتاب النبات کا نودستیاب شدہ ٹکڑا اگر پوری طرح سامنے آجائے خاصکر اس کا حصہ دوم اور اس کا ابن البیطار وغیرہ سے مقابلہ کیا جائے، تو اس پہلو پر زیادہ بہتر رائے قائم کی جا سکے گی،

میں نے مقالہ گذشتہ میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ کتاب النبات للدینوری کے کون کونسے اقتباس مخصص ابن سیدہ کی کس کس جلد میں ہیں، ڈاکٹر لیوین کے بیان کی روشنی میں مخصص کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ متعلقہ ابواب اس کی چھٹی جلد میں ہیں، چنانچہ ص ۲۹ پر بعینہ ہمارے عنوان کا باب ومن انحاء صنعتہ القسی" ہے، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب تو مخطوطۂ اُپسالا کے الفاظ میں نہیں ہے لیکن باب السہام متعدد فصلوں کے ساتھ موجود ہے، ہمارا پانچواں باب من اسماء السّہا ممکن ہو وہی ہو جس کو ابن سیدہ نے ص ۵۱ پر "اسماء ضروب السّہام وصفاتہا" کے عنوان سے لکھا ہے،

ہمارے سامنے مخطوطۂ اُپسالا کے پہلے باب کا پہلا ورق ہے، ابن سیدہ کے ص ۲۹ سے اس کا مقابلہ کرنے پر نظر آیا کہ مخطوطۂ مدینۂ منورہ کی طرح اس حصہ میں بھی ابن سیدہ نے بہت ہی کم حصہ نقل کیا ہے، اور دینوری کے بے شمار بیانات حذف کر دیئے ہیں، جو اس لئے ناگزیر تھا کہ ابن سیدہ کا موضوع و مقصد جدا تھا،

بہرحال اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مخطوطے اور نئے مخطوطے کا کوئی حصہ مشترک نہیں ہے اسلئے دونوں مل کر کتاب کے معتد بہ حصہ پر مشتمل ہو جاتے ہیں، بعض پرانے مولفوں نے کتاب النبات للدینوری کے ذکر میں لکھا ہے، کہ وہ چھ مجلدات کبار میں تھی، ڈاکٹر لیون کے بیان کے مطابق اُن کا مخطوطہ الجزء الخامس پر مشتمل ہے، اگرچہ جزء اور مجلد ایک ہی چیز نہیں ہیں، لیکن موجودہ دونوں مخطوطے مل کر ڈیڑھ جلد نہیں تو ڈیڑھ جسترو ضرور بن جاتے ہیں، گویہ معلوم نہیں کہ اصل میں کتنے جزء تھے، پانچ تھے، یا کم، یا زیادہ،

نوائے حیات

(طبع دوم)

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت:- ۲۱۴ صفحے، قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ہے،

ابن خلدون

مصر کی یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر طہٰ حسین کے فرنچ رسالہ کے عربی ترجمے کا ترجمہ جس میں ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اس کے فلسفۂ اجتماعی کی تشریح و تنقید ہے،

ضخامت ۲۵۱ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

ملفوظات حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتی

از

جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لکچرار اسلامیہ کالج، کراچی

حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی علیہ الرحمہ المتوفی ۹۹۸ھ کے ملفوظات بحر الحقائق کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی تاریخ زبان اردو "(طبع لکھنؤ ۱۹۳۰ء ص ۲۴-۲۵) اور مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" (ص ۲۵-۲۶) سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے مریدوں نے وہ مجموعہ سوال و جواب کے طرز میں مرتب کیا تھا، سوالات فارسی میں ہیں، اور حضرت موصوف کے جوابات ہندی (اردو) میں، مجھے جناب مولانا راشد برہان پوری کے یہاں ایک مختصر مخطوطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو مذکورہ بالا ملفوظات "بحر الحقائق" کے علاوہ ہے، اس میں ۴۴ صفحات ہیں، اور آخر میں یہ عبارت ہے:-

"تمت هذا الملفوظ شاہ وجیہ الحق والدین الخلیفۃ الکامل المکمل للشیخ محمد غوث قدس سرہما، بزہما وافاض علینا فیضہما آمین آمین آمین، (کاتب الحروف محمد اسحق ولد مرزا محمد)"

یہ کاتب مخطوطہ یعنی محمد اسحق اسی ملفوظہ کے مرتب (محمد) کا بیٹا معلوم ہوتا ہے، مرتب نے ص نمبر ۲ میں اپنا نام اس طرح دیا ہے،

"یقول العبد الفقیر الحقیر محمد .... چون کسے را دیدہ شد کہ اکثر اوقات تلاوت می گذارد فرمودند کہ تلاوت کہ می کند، چرا شغل نمی کند؟ دیگرے را فرمودند کہ

می آرد، چرا شغل نمی کند"

اس عبارت کے علاوہ جگہ جگہ شطاریہ طریقے کے ذکر و شغل کی تاکید ملتی ہے، منتخب التواریخ، اور سبحۃ المرجان وغیرہ کے حوالے حکیم شمس اللہ قادری اور مولوی عبدالحی صاحب کی کتابوں میں ہیں، لیکن حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار میں کچھ ذاتی تعلقات اور استفادات کا حال بھی ہے فرماتے ہیں،

"وفات او در سنہ سبع و تسعین و تسعمائۃ و در صحن خانقاہ خود (احمد آباد) آسودہ است محرر سطور در وقتے کہ بقصد زیارت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بدان دیار رسید، بہ ملاقات وے مستسعد شد، و بعضے از کار و اشغال سلسلۂ عالیہ قادریہ مشرف گردید، اکنون جانشین او خلف صدق اوست شیخ عبداللہ موصوف است بعلم و حلم و ریاضت و عزلت و ہمت و عفت و سائر اخلاق درویشان"، (اخبار الاخیار ص ۱۵۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت وجیہ الدین اپنے شیخ حضرت محمد غوث گوالیری (المتوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) کی طرح قادریہ اذکار کی طرف بھی مائل کرتے تھے،

مرزا محمد کے اس مخطوطے میں سوال وجواب تو نہیں ہیں، لیکن جو ملفوظات ہیں، ان میں جابجا ہندی (اردو) کے فقرے ملتے ہیں، اردوے قدیم کے شائقین کے لئے ایسے بعض مقامات ملفوظ کی قدیم کتابت میں پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) می فرمودند۔ نزد ما شریعت و حقیقت است۔ طریقت نیست یعنی تکمیل بطریقت، گفتم چنانچہ آنحضرت عہد ترک بخانہ و ینداران کردہ اند، فقیر ہم کند، فرمودند چرا؟ آیا دنیاداران بیگانہ اند، دنیاداران اپنچ (ہی) ہیں (ہم ہی ہیں)

(۲) می فرمودند۔ حضرت خضر و فقیر از مجلس درس جدا شدہ سخنان می کردیم، پرسیدہ شد، افادہ بود

یا استفادہ؟ فرمودند ہمیں رسول کی لوک یعنی مَن کَانَ معموراً بفیض الرسُول لا یحتاج الی استمداد من غیرہٖ

(۳) می فرمودند، دست حضر محکم گرفتہ گفتم کہ حال گجرات (در قحط) چنین شدہ است. بسا مان کے خواہد بود، بگو مید، گفتند انچہ خداے تعالیٰ اختیار کردہ است، ظاہر نکبھی، ظاہر نکبھی. دست بزور خلاص کنانیدہ بودہ در مجلس درس حاضر نہ شدند۔

(۴) گفتم بارہا میل شود کہ این قفص تن بشکنند، فرمودند چرا بشکند؟ خاصا بنجرا ہی،

(۵) سَألتُ عن تفضیل الولی علی النبّی، فرمودند، کہری نادان، کہری نادان۔ (کھرے سے کچے)

(۶) می فرمودند، رات دن خداجنو کی مدح کرے. (انبیا کی تعریف و تفضیل کے سلسلے میں فرمایا تھا)

(۷) میاں شیخ صالح (مرید) خواستند کہ کسب کتابت کنند. فرمودند ما شطاریم، ما را کسب چہ مناسب؟ از ہر جا کہ بگیریم بخوریم، و در توحید مستغرق باشیم، بفعل زاہدانہ چرا مقید شویم. اگر قوتی باشد، حیلہ کنند یعنی از بقال استقراض کنید، پرسیدم کہ اشیا را اگر مظاہر تصور کنیم، چونست؟ فرمودند:- منہ برن تو ذوق نہووے،

(۸) می فرمودند۔ فیض حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ شاہ مردان علیؓ رسیدہ واز ایشان بحضرت شیخ محمد غوث (گوالیری) قدس سرہ، واز ایشان بمن رسیدہ..... فرمودند، فلان درویش گفتہ کہ بایزیدؒ در میان اولیا چنانست کہ در میان انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، از مختلف الحرمت سوال کردم، فرمودند اتقیا، و علما، سلاطین را برکل آن فتویٰ دادہ اند، باز فرمودند، آنچہ روایت در فقر باید چرا نہ کند، بھو نہ اج ہو دی، سو کری، (بھو نہ اجہ ہوے سو نہ کرے)، یعنی متفق الحرمت نباشد

مکرّر فرمودند، کہ ہر چیزے کہ مہیّج ذوق وشوق باشد صوفی آن را ترک نکند، بملاحظہ اختلاف، بہو مزاج ہوسے سو ترک کرے

(۹) ...... گفتم کسے را کہ کشف خود نمی شود، در اعمال چون اختیار کند، فرمودند استخارہ مسنون منقول کند، پس گو کشف نباشد، اپنوں کون کیا فائدہ؟

(۱۰) می فرمودند کسے کہ منکر توحید و وحدتِ وجود باشد، اور اتصورِ نقش اللہ وشغل طاقچہ باذِ فرمود، چون عمل کند، آپین جنکہ مار کر قبول کرے گا،

(۱۱) فرمودند کہ از مغلان بیاموزید کہ اسپ را می خورانند دمی و دوانند، دعوتِ سہ اربعین شمارا کافی است، تمہاری بلا ریاضت کرے،

(۱۲) می فرمودند کہ سلوک شطاری از ہمہ سلوک اسہل واز ہمہ انفع، بارہا مردم را وصیت می کردند بتاکید کہ یک گھری یا دو گھری یا چار گھری (گھڑی) درحضور شغل می بودہ باشید،

(۱۳) کسے گفت کہ میان شیخ محمد فضل اللہ (برہان پوری) ترک درس کردند، فرمودند جب زتی پکرینگی، آپین درس کہین گی،

(۱۴) می فرمودند شیخ محی الدین ابن عربی ما درا مرفرعون مجتہد مخطی گفتند (کہ فرعون را مومن گفتہ بود) فرمودند شیخ عربی فرشتہ بود مثل او متقی، بر زمین پیدا شدن عجب است، اما شیخ عربی کا تقوی کہان تیرا امکان کہان (صاحب ملفوظ نے یہان یہ مفہوم لکھا ہے، کہ مرتبہ ما از ایشان زیادہ است)

(۱۵) می فرمودند خلفاے حضرت شاہ عالم رحمہ گجراتی - (المتوفی سنہ) گفتند کہ اگر خدمت کنید فائدہ خواہد شد، میری نا مین کی خدمت کی جاتی ہے، (خدمت کی ہمّت نمی توانم کرد)

(۱۶) می فرمودند، سب چھوڑ بھی تو شتابی فائدہ ہو جاتا

(۱۷) می فرمودند، وہ کیا ہوئی جو احمد آباد کے بازار مین ...... برہنہ اللہ اللہ گویان بگردد،

(۱۸) می فرمودند، میاں صبغۃ اللہ (یکے از اولیاے گجرات) جھوڑ دی (چھوڑ دے) یعنی مسودۂ تحشیہ شرح مُلا (کہ شیخ وجیہ الدین نوشتہ بودند) نوا دیتی میرا جیو چلی،

(۱۹) کسے از بندہ قرض می خواست یک ہون، یا دو ہون، حضرت میاں عبد اللہ (پسر شیخ وجیہ الدینؒ) مائل برآن بودند کہ پرتاب بدہند، فرمودند اتھی ایہاں رہتی ہو، یعنی باہلِ محلہ خود بے مروتی نباید کرد، ودر آغاز صحبت، چون زیادہ ادب از بندہ دیدند فرمودند کسے کہ تعظیم من نکند من ہم تعظیمے نکنم، عزیزے شاید حضرت عطا محمد در وقتِ موت آنحضرت را طلب می کردند، فرمودند، ہون مَرون تو بھی کوئی نہ آدو، از تواضع مفرط و تکبر خالی بودند،

(۲۰) وبندہ را فرمودند میاں صاحب را پرسید کہ شما شراب می خورید گفتند آری، فرمودند ولیوں کیاں عقلاں ہوتیاں ہیں،

(۲۱) شکوہ کردم کم عقلی خود را، فقال منجہ تھی اُذکی عقل ہی (مجھ سے زیادہ عقل ہے)

(۲۲) .... قبولِ استدعاے ثمانی سوال کردم وگفتم کہ تفرقہ می دہد فرمودند فقیر پر فرض تو نہیں ....

اس مخطوطہ میں صرف مذکورۂ بالا (خط کشیدہ) فقرے ملتے ہیں، ان کے علاوہ بہت سے صوفیانہ مسائل کا تذکرہ ہے، ردّ وسلب توجہ واستمداد، ذکر وشغل وغیرہ کے متعلق کیفیات اور واقعات ملتے ہیں، حضرت شیخ کی اہلیہ بی بی نازو کے استغراق کا حال لکھا ہے کہ اُن کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہوا لیکن اُنھیں غم کا احساس بھی نہ ہوا، بعض متوسلین میاں ابوجی، شیخ عبد الحکیم اور شیخ عبد القیوم وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے، ایک صاحبزادے غوث اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ بادشاہ اکبر ان کو اپنے دربار میں بلا رہا تھا، لیکن بے نیاز باپ نے جانے کی اجازت نہیں دی، اسی زمانہ کے سید محمد جونپوری المتوفی سنہ ۹۱۰ھ کے فرقۂ مہدویہ کے متعلق ہے :-

"می فرمودند کہ مردم مہدیہ عجب جاہلانند کہ اعتقاد ایشان آن کہ ہر کہ بگرسنگی میرد ہمان بزرگ می فرمودند کہ بدتر از روافض اند، می فرمودند کہ بعضے آشنایان کہ میل بعقیدۂ مہدیہ داشتند دبر ہمان عقیدہ مردند، توجہ کردم تا براحوال ایشان مطلع شوم احوالِ ایشان را بغایت بد دیدم"

یہاں الفاظ کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر ہم صوفیۂ کرام کے ملفوظات کا بغور مطالعہ کریں تو اُن کے ذاتی رُجحانات کے علاوہ اُن کے عہد کے بہت سے تاریخی واقعات اور حالات کے متعلق بھی اشارات مل سکتے ہیں۔

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، اور ساتواں زیر تالیف ہے۔

قیمت بڑی تقطیع	قسم اول	قسم دوم	قیمت چھوٹی تقطیع	قسم اول	قسم دوم
حصہ اول	•	•	حصہ اول	مثے	•
حصہ دوم	ہے		حصہ دوم	۶ے	
حصہ سوم	۶ے	صہر	حصہ سوم	لعہ	
حصہ چہارم	لعہ	معہ	حصہ چہارم	۸ر	
حصہ پنجم	۶ے	صہ	حصہ پنجم	صہر	
حصہ ششم	ے	صہ	حصہ ششم	لعہ	معہ

تلخیص و تبصرے

حصولِ مسرّت کا طریقہ

ایک ماہر نفسیات (Andre Maurios) نے ایک مقالہ مین یہ بتانے کی کوشش کی ہے، کہ انسان کس طرح خوش رہ سکتا ہے، وہ لکھتا ہے۔

زندگی مین مسرتین خارجی حالات سے حاصل نہین ہوتی ہین، بلکہ ان کا انحصار قوتِ ارادی پر ہے، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہو کہ مصیبت و علالت ظلم وستم اور ملک مین جنگ وجدال کی حالت مین مسرتون کا حاصل ہونا ناممکن ہے لیکن زیادہ تر رنج والم خیالی ہوتے ہین حقیقی نہین، ایک مشہور ڈاکٹر نے تجربون کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کے یہان جتنے مریض آتے ہین، ان مین ہر دس مین سے آٹھ کو مطلق کوئی شکایت نہین ہوتی، ان کو کسی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ ان کو مرض لاحق ہوگیا ہے، خیالی مرض سے اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے، جتنی اصلی مرض سے ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات خیالی مرض زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے، بہت سے ایسے آدمی ہین جنھین راتون کو نیند محض اس لئے نہین آتی کہ وہ آیندہ واقعات کے تاریک پہلو سے خوفزدہ رہتے ہین، کبھی وہ یہ سوچتے ہین کہ اگر بازار کی حالت خراب رہی تو اُن کی ساری تجارت بگڑ جائے گی، کبھی اُن کو یہ خیال آتا ہے کہ سکہ کی قیمت کی کمی کی وجہ سے ممکن ہے، کہ ایک نئی عالمگیر جنگ شروع ہوجائے، کبھی اس تصور سے پریشان خاطر رہتے ہین کہ ان کا معاشقہ ناکام نہ ہوجائے، اسی طرح وہ اور بہت سے خیالی خطرات سے خواہ مخواہ رنج والم مول لیتے ہین لیکن آیندہ واقعات کو سوچ سوچ کر رنجیدہ ہونا عقلمندون کا

کام نہین،

حقیقی مصیبت بھی مسرت مین تبدیل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ صحیح معنون مین قوتِ ارادی موجود ہو، اگر کوئی علیل ہے تو وہ اس علالت کا بھی بہترین مصرف لے سکتا ہے، مثلاً وہ اس کے ذریعہ اپنے مین صبر و تحمل کے اوصاف پیدا کر سکتا ہے، یا علالت کی تنہائی مین مطالعہ یا غور و فکر مین اپنے وقت کو مفید طریقے سے گذار سکتا ہو،

بہت سی ایسی مثالین ہین کہ مصیبتون نے اُن کے مبتلا اشخاص کو جری اور بہادر بنا دیا، اور وہ محض آلام و مصائب کی وجہ سے اپنی روح کے نگران بن کر دوسرون کے رہنما اور رہبر ثابت ہوئے بہادر آدمیون سے ان کی موت بھی ان کی خوشی چھین نہین سکتی، سقراط کو جب جیل مین اس کی قسمت کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو اس وقت بھی وہ مسرور اور باوقار رہا۔ اور اس کی مسرت اور وقار سے اس کے ساتھیون کی ہمت قائم رہی،

خارجی اثرات سے حصول مسرت مین کچھ مشکلات ضرور ہین لیکن ان کی وجہ سے مسرت کا حصول ناممکن نہین لیکن اگر کوئی شخص اپنے کو ہر حال مین تکلیف دینے اور رنج پہونچانے ہی کے لئے آمادہ ہو تو پھر اس کا کوئی علاج نہین، اس کے لئے دنیا کی ہر چیز باعثِ تشویش ہو سکتی ہے بعض خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہین جن کو دولت و ثروت، عمدہ صحت، اچھی رفیقۂ حیات، اور خوبصورت اولاد ساری نعمتین حاصل ہوتی ہین، پھر بھی وہ اس خوش قسمتی پر ناز نہین کرتے، ان کو ہمیشہ یہی پریشانی رہتی ہے کہ کہین ان کی دولت برباد نہ ہو جائے، ان کی صحت بگڑ نہ جائے، اور ان کے بچے بیمار نہ ہو جائین، ایسے لوگون کو دنیا کی کوئی چیز مسرت نہین بخش سکتی، ہان اگر کوئی شخص خوش رہنا چاہتا ہے، تو وہ چھوٹی چھوٹی باتون سے بھی خوش رہ سکتا ہے، خوش رہنے کے لئے صرف ذہنی سکون ضروری ہے، اور ذہنی سکون قوتِ ارادی سے حاصل ہو سکتا ہے، اگر ایک شخص ارادہ کر لے کہ وہ ہر بات پر

خواہ مخواہ کفِ افسوس نہ ملا کرے گا، اوہام میں مبتلا نہ رہے گا، اور دل میں تمناؤں اور آرزوؤں کا ہجوم پیدا نہ ہونے دیگا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ خوش نہ رہے، بعض اشخاص فطری طور پر خوش رہتے ہیں اور بعض فطری طور پر رنجیدہ اور ملول رہنے کے عادی ہیں، مثلاً اگر موسم غیر معمولی طور پر ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو ایک شخص ٹھنڈک سے لطف اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، اور بار بار موسم کی تعریف کرتا ہے لیکن دوسرا شخص ٹھنڈک سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں غیر معمولی ٹھنڈک سے اس کو کوئی بیماری نہ ہوجائے،

طبیعتوں میں رجائیت اور قنوطیت کا پیدا ہونا خانگی ماحول پر بھی منحصر ہے، جن ماں اور باپ کے درمیان محبت اور یگانگت اور یکجہتی ہوتی ہے، تو ان کے بچے عموماً خوش اور مسرور رہتے ہیں، وہ زندگی کے تاریک پہلوؤں کی جانب بالکل نگاہ نہیں ڈالتے، ان کو اگر زندگی میں ناکامی بھی ہوتی ہے تو وہ مایوس ہوکر مغموم نہیں ہوتے، لیکن جن ماں باپ کے درمیان طبیعت کی یکجہتی نہیں پائی جاتی اُن کے بچوں سے عموماً مسرت کا مادہ مفقود ہوجاتا ہے،

ایک جھگڑالو بیوی کا شوہر عام طور پر قنوطیت پسند ہوتا ہے، اس کو زندگی میں کوئی روشن پہلو نظر نہیں آتا، لیکن جھگڑالو بیوی کا قنوطیت پسند شوہر بھی قوت ارادی سے اپنی طبیعت کا رنگ بدل سکتا ہے اگر حسبِ ذیل باتیں پیشِ نظر رکھی جائیں تو طبیعت اور اسکے ساتھ ساتھ کیرکٹر کا بھی رنگ بدل سکتا ہے،

ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہئے، اس سے اس کو برابر خوشی حاصل ہوتی رہے گی،

جب سقراط جیل میں تھا، اور اس کو موت کی سزا دی جانے والی تھی تو سزا سے پہلے اُس نے موسیقی کا شغل شروع کیا، کسی نے پوچھا، موت کے سامنے موسیقی کی تفریح سے کیا فائدہ؟ سقراط نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ موت سے پہلے اس کی لذت سے آشنا ہونا چاہتا ہوں،

جس چیز پر اپنا کوئی اختیار نہ ہو اس کے لئے ملولِ خاطر ہونا فضول ہے، بعض لوگ اس لئے مغموم رہتے ہیں کہ ایران میں سیاسی واقعات اُن کی خواہش کے مطابق ظہور پذیر نہیں ہو رہے ہیں،

یا انڈونیشیا کے انقلاب سے ان کو دکھ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ گھر بیٹھے نہ ایران کے لئے کچھ کرسکتے ہیں نہ انڈونیشیا کو مدد دے سکتے ہیں، پھر ان کے لئے رنجیدہ ہونا بالکل بیکار ہے، تمام ملکوں کے واقعات سے باخبر رہنا تو بالکل صحیح ہے، لیکن وہاں کے ناخوشگوار واقعات کے لئے کڑھنا اور پریشان ہونا بالکل غلط ہے،

ماضی کی تلخیوں کو ہمیشہ بھلائے رکھنا چاہئے، بہت سے افراد ایسے ہیں، جو اگر ماضی کی ناگوار باتوں کو بھلا دیں تو بہت خوش رہ سکتے ہیں، میاں بیوی کے تعلقات کی خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں اپنے دلوں میں گذشتہ باتوں کے متعلق کچھ نہ کچھ خلش رکھتے ہیں، اور یہ خلش بات بات پر ظاہر ہوتی رہتی ہے، جس سے دونوں کے تعلقات کی خرابی میں شدت پیدا ہوجاتی ہے، جو شخص ماضی کی ناگوار باتوں کو دل میں پرورش کرتا رہتا ہے، وہ لوگوں کو اپنا دشمن زیادہ بناتا ہے اور دوست کم، عقلمند آدمی ماضی کی ناخوشگواریوں کو نظرانداز کرکے صرف حال سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں،

مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ رکھنا بھی صحیح نہیں، مآل اندیشی اور دوربینی اوصاف ضرور ہیں لیکن امیدوں کا ایک ہوائی قلعہ کھڑا کرنا ایک احمقانہ فعل ہے، آئندہ واقعات پر مطلق کسی کو قابو نہیں ہوتا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زندگی کے آئندہ واقعات پر قابو حاصل ہی نہیں کیا جاسکتا، بڑا وصف یہی ہے کہ انسان زندگی کے تغیرات پر قابو پانے کے لئے اپنے کو ہر وقت طیار رکھے، اور یہ طیاری اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب انسان ذہنی انتشار اور اختلال سے بالکل آزاد ہو اور اس کا دور کرنا اپنی ذات پر منحصر ہے، اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ اپنی ذات ہی سے خوشی حاصل کی جاسکتی ہے، کوئی دوسرا شخص کسی کو خوشی عطا نہیں کرسکتا،

"ص،ع"

کتب بینی کا شغف

ڈاکٹر جانسن کا قول تھا کہ جو شخص روزانہ چار گھنٹے کتابوں کا مطالعہ کرے، وہ یقیناً صاحب عقل ہو جائے گا، لیکن اب ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ جن کو پڑھنے کا اتنا غیر معمولی ذوق رہا ہے کہ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو یقین کرنا مشکل ہو جائے گا، عرب کے لارنس کے بارہ میں مشہور ہے کہ جب وہ آکسفورڈ میں تعلیم پا رہا تھا تو اس وقت اس نے وہاں کے کتب خانہ کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں، کہا جاتا ہے کہ اس نے چھ سال میں پچاس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا یعنی اوسطاً (۲۰) کتابیں روزانہ پڑھتا تھا، وہ تین سال تک رات دن ایک کرسی کے گدے پر بیٹھا پڑھتا رہا جب نیند آتی تو اسی گدے پر تھوڑی دیر سو رہتا، اٹھارہ گھنٹے مسلسل پڑھتا تھا، بڑی ضخیم اور ادق کتاب کو آدھ گھنٹہ میں پڑھ ڈالتا تھا،

لارنس کے بعد سر ولیم رابرٹسن نی کول کا نمبر ہے، وہ برٹش ویکلی کا اڈیٹر تھا، اس کے ذاتی کتب خانہ میں پچیس ہزار کتابیں تھیں، کتب خانہ پر اتنا حاوی تھا کہ جس کسی کتاب کو چاہتا آنکھ بند کرکے اٹھا لیتا، اور اگر کسی کتاب سے کوئی اقتباس لینا ہوتا، تو اسی صفحہ کو کھولتا جس میں اقتباس ہوتا، وہ جب کسی سفر میں جاتا، تو استعمال کے ضروری کپڑے چھوڑ دیتا لیکن کتابیں ضرور ساتھ لے لیتا، اس کی ہر جیب میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی، ہر سال ہزاروں کتابیں پڑھتا، اور بڑی تیزی سے ان کو ختم کرتا، اس کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک پیراگراف یا ایک پورا صفحہ محض ایک مرتبہ نظر ڈالنے میں یاد ہو جاتا، مشہور ہے کہ جتنی دیر میں کوئی دوسرا شخص ایک جملہ پڑھتا، اتنی دیر میں وہ ایک صفحہ ختم کر دیتا، اس کا خود بیان ہے کہ وہ نصف گھنٹہ میں بیس ہزار الفاظ پڑھ سکتا ہے، دن بھر میں دو کتابیں ختم کرتا تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر ہفتہ ۳۵ ہزار الفاظ بھی لکھا کرتا تھا،

ڈ آئرلینڈ کا ایک پروفیسر ہر چوبیس منٹ مین ایک ناول ختم کر دیتا تھا، اور جس دن چھٹی ہوتی، تو اس دن نصف درجن ناول مزید پڑھتا،

میکاؤلے نے تین ہی سال کی عمر مین کتابون کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، اور اسی عمر سے زیادہ تر کتابی الفاظ بولا کرتا تھا، ایک بار اس نے اپنی بہن کو ایک خط مین لکھا کہ اس کی خواہش ہے کہ اسکو کسی بڑے کتبخانہ مین دفن کر دیا جائے، اور بیداری کی حالت مین کوئی لمحہ بھی اس کی نظرون سے کتاب علٰحدہ نہ ہو، ایک بار جب وہ لندن سے آئرلینڈ جا رہا تھا، تو راستے ہی مین تاریخ کی ایک ضخیم کتاب (Lives of Emperors) کا بیشتر حصہ ختم کر دیا، ۱۸۳۳ئہ مین ہندوستان آرہا تھا، اس سفر مین وہ صرف کھانے کی میز پر تو کسی سے بول لیتا، ورنہ سارا وقت یونانی، لاطینی، اسپینی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی کتابین پڑھتا رہتا، وہ لندن اور سورے کی سڑکون پر گھومتے وقت بھی کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا، ایک بار ورسسٹر اور میل ورن کے درمیان ٹہلنے کے دوران مین اوڈیسی کی چودہ کتابین ختم کر دین، وہ جب کسی کتب فروش کی دوکان پر پہنچ جاتا، تو دوکان کی تمام کتابون پر ایک نظر ڈال لیتا، اور جب تک دوسرے خریدار ایک کتاب خریدنے مین لگے رہتے وہ کتابون کا ایک ڈھیر خرید لیتا،

مشہور مؤرخ گبن جب اپنی تاریخ رومن امپائر لکھ رہا تھا، تو روزانہ بارہ گھنٹے پڑھا کرتا تھا، اس کو مطالعہ مین ایسی لذت ملتی تھی کہ کہا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان کی ساری دولت کے بدلے بھی اس لذت سے کنارہ کش نہین ہو سکتا،

کارلائل کا دعوی تھا کہ کوئی کتاب خواہ کیسی ہی ادق اور کیون نہ ہو، وہ تھوڑی دیر مین اس کی مشکلات کو حل کر کے اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے،

روما کے قدیم عہد مین پلینی کو بھی کتابون سے بڑا شغف تھا، وہ غسلخانہ مین بھی پڑھنے کے لئے

کتاب ساتھ لیجاتا، وہ کہا کرتا کہ ایک کتاب میں خواہ وہ کیسی ہی خراب کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ اچھی باتیں ضرور مل جاتی ہیں، اس لئے کسی کتاب کا مطالعہ رائگان نہیں جاتا،

ایسے لوگوں کا حافظہ بھی غیر معمولی قوی ہوتا ہے، سرجیمز میکن ٹوش کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب اُسنے نہ پڑھی ہو اور جب کسی مصنف کی کسی رائے کا ذکر آجاتا، تو وہ بلا تکلف اس رائے کے اصلی الفاظ کو دہرا دیتا، اور جس کتاب کے جس صفحہ پر وہ رائے ہوتی، اس کو بھی بتادیتا،

ڈاکٹر سموئیل کلارک کی جیب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی، اور وہ جو کچھ پڑھتا، اس کو یاد رکھتا، بن جانسن کو بہت سی کتابیں زبانی یاد تھیں، رابرٹ براوننگ بعض اقتباسات اپنے حافظہ سے اس طرح دہراتا کہ معلوم ہوتا کہ اصل کتاب دیکھ کر پڑھ رہا ہے،

جیرمی بنتھم کو بھی بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا اور جب وہ پانچ سال کا تھا تو لوگ اس کو فلسفی کہا کرتے تھے، بلکہ پانچ سال کی عمر سے بھی پہلے ایک دن وہ مشہور مورخ رےپن کی کتاب "تاریخ انگلستان" پڑھتا دکھائی دیا، ازک وٹیس تین سال کی عمر میں آسانی کے ساتھ انجیل پڑھ لیتا تھا، جب اس کو کوئی پیسے دیتا تو وہ اپنے باپ کے پاس دوڑ کر جاتا، اور کہتا ان پیسوں سے مجھکو کوئی کتاب خرید کر لا دیجئے، اسی عمر میں جوتھن سولفٹ انجیل کے مشکل حصوں کو آسانی سے پڑھ لیتا تھا، "ص، ع"

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے، قیمت سے "منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب شفیق جونپوری

کون کرتا تجھے اے خانۂ ویران آباد
تا قیامت رہے میری شب ہجران آباد

حسن کی گرمیٔ بازار فقط عشق سے ہے
چند دیوانون سے ہے کوچۂ جانان آباد

انقلابات تو آتے ہی رہیں گے ساقی
تو سلامت رہے میخانے کی گلیان آباد

زلف جانان شب فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو
تیری نکہت سے رہے شام غریبان آباد

دیکھتے جائیے اجڑے ہوے غم خانے کو
تھا اسی گھر مین کوئی بے سر و سامان آباد

اے فلک تجھکو مبارک مہ و انجم کی ضیا
آنسوؤن ہی سے رہی دیدۂ گریان آباد

دیجئے گا میری شوریدہ مزاجی کو دعا
کون کرتا ہے دیار غم و حرمان آباد

چاندنی ہو کہ نہ ہو شمع جلے یا نہ جلے
تیری بستی رہے میرے دل سوزان آباد

کر گئے تیرگی بخت کے حوالے تم بھی
نہ ہوئی میری غریبی کی شبستان آباد

نہ سہی بالش و زانو کا سہارا نہ سہی
تیری آغوش رہے اے غم جانان آباد

آہ اس گھر کی تباہی کا سمان کیا کہیے
کر چکا ہو جسے کوئی رخ پنہان آباد

بلبلین چپ ہوئین گلزار پہ چھایا ہے سکوت
ہائے کس گل نے کیا شہر خموشان آباد

تجھ سے روشن تھا مرے دل کی امیدون کا چراغ
تو کہان جاکے ہوا اے مہ تابان آباد

مجھ سے جانبازِ محبت آئیں گے ای جانِ بہار تو سلامت رہے تیرا چمنستان آباد
ہائے وہ تیرے گرفتارِ جنون کی راتیں جس کی فریاد سے تھا خانۂ زندان آباد
یہ غنیمت ہین تری خاک اڑانیوالے پھر بگولوں سے بھی ہو گا نہ بیابان آباد
ساری رونق ہوا انھیں سوختہ سامانون سے تیرے کوچہ مین رہین تیرے غزلخوان آباد
یہ شب ماہ یہ وادی کی فضا، یادِ حبیب کس اجالے مین ہوئی شامِ غریبان آباد

لٹ گیا جب سے شفیق اپنا سکونِ خاطر
جی مین آتا ہے کرون کوئی بیابان آباد

غزل

از جناب سید محمد ابراہیم صاحب نجم ندوی بی اے، ال

بیگانۂ مذاقِ سخن ہے دہن ابھی محبوس ہے چمن مین نوائے چمن ابھی
پتھر نہ بن سکا دلِ ہر برہمن ابھی یعنی ہو خام حوصلۂ اہرمن ابھی
زیرِ نظر ہے مسئلۂ ما و من ابھی ہے بے محل سوال فلاحِ وطن ابھی
ناقدردان اہلِ وفاہو وطن ابھی ناآشنا ہے نکہتِ گل سے چمن ابھی
محشر بدوش گردشِ شام وسحر ابھی بدلا نہین فلک کا مزاجِ کہن ابھی
ای شمعِ حسن اف یہ پتنگون کا اژدحام تیری طرح جوان ہو تری انجمن ابھی
اے اعتمادِ نفس فریبِ خودی نہ کھا رہبر بھی راہِ عشق مین ہو راہزن ابھی
گھبرائے کیا سوادِ فضائے قفس سے دل آنکھون مین ہو سفیدیِ صبحِ چمن ابھی
اٹھ جائے درمیان سے اگر دل کی ناشی ہو جائے طے معاملۂ جان و تن ابھی
یادِ نگاہ ناز کے قربان جائیے محسوس ہو رہی ہو جگر مین چبھن ابھی

بیمارِ عشق نزع مین لیتا ہی ہچکیان — پر تولتا ہے مرغِ غریب الوطن ابھی
فصلِ جنون پھر آگئی عمرش دراز باد — تیار ہو رہا تھا نیا پیرہن ابھی
۔۔گی زبانِ دہر پہ کل میری داستان — سُن لیجئے فسانۂ گنگ وجمن ابھی
تکمیلِ ذوقِ عشق ہوائے شامِ زندگی — ہو نا تمام قصۂ دار ورسن ابھی
کیا روحِ نجم بادِ مخالف نے پھونک دی
سونی پڑی تھی محفلِ شعر وسخن ابھی

غزل

از

جناب ندیم جعفری ڈیرہ غازیخان

حسرتِ دید بہ امکانِ نظر باقی ہی — یہی الزام تمنا میرے سر باقی ہی
رات دن آگ برستی ہی نشیمن پہ مرے — ابھی ہنگامۂ صد برق وشرر باقی ہی
عاشقی موردِ الزام نہ ٹھہرے جبتک — غلبۂ حسن مراعاتِ نظر باقی ہی
آب ساده ہوئے ہرچند سرشکِ گلگون — ابھی فریاد مین کچھ رنگِ اثر باقی ہی
کشتیِ عشق کو تا ساحلِ مقصد لے چل — جوشِ گریہ اگر اے دیدۂ تر باقی ہی
ڈھل چکی رات وہ آئے ہین نہ آئینگے کبھی — دل کو امید مگر تا بہ سحر باقی ہی
سجدہ ریزی کے لئے کیون نہ ہون مجبور ندیم!
چلدیئے وہ، کششِ راہ گذر باقی ہے

مطبوعات جدید

آثار ابوالکلام آزاد نفسیاتی مطالعہ | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت نفیس قیمت تحریر نہیں، پتہ: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکشنز لمیٹڈ نیشنل ہاؤس اپالو بندر بمبئی نمبر ۱،

یہ معلوم و مسلم ہو کہ جس طرح ہر زمانہ کا ادب اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہو جس مین اس دور کی خصوصیات نظر آتی ہین، اسی طرح اشخاص کی تحریرین ان کی نفسیات کا آئینہ ہوتی ہین جن سے ان کا نفسیاتی مرقع تیار کیا جا سکتا ہو، مصنف نے اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام کی تحریرون سے ان کی نفسی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے، یہ بھی اصحاب علم و نظر سے مخفی نہیں کہ مولانا یگانہ دل و دماغ رکھتے ہین، اور ان کے علم وفن، تحریر و تقریر، افکار و تصورات، زندگی کے ہر شعبہ مین انفرادیت کا بانکپن، اور عبقریت کی شان پائی جاتی ہے، جو اُن کی تحریرون مین بھی نمایان ہے، مصنف نے تذکرہ، الہلال، البلاغ اور غبار خاطر کی تحریرون سے علم و فن، دین و ملت، قومیات، سیاسیات اور مولانا کی نجی زندگی مین جہان تک ان کی دسترس ہو سکی ہے، مولانا کے فکری اجتہادات اور انفرادیت کے جلوے دکھانے کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہو کہ مولانا کی شخصیت عام انسانون سے اس درجہ مختلف ہو اور اس پر انفرادیت کے اتنے تو بہ تو حجابات پڑے ہین کہ محض زور قلم سے اُن کو ہٹانا آسان نہین ہے، اور مولانا کی حریم عظمت عام نگاہون کی رسائی سے اتنی دور ہے اور اُن کی شانین اتنی مختلف ہین کہ ہر نگاہ وہان تک نہ پہنچ سکتی ہے، اور نہ ان کا احاطہ کر سکتی ہے

... صرف اپنی حد نظر تک ان کو دیکھ سکتا ہے، اس لئے مصنف کا قلم زور انشاء کے باوجود کمال معنوی سے قاصر رہا، تاہم حسنِ عقیدت اور حسن انشاء کے زور سے اس سے بہتر تصویر ممکن نہ تھی، اس لحاظ سے کتاب مولانا کے ساتھ مصنف کے نفسیات اور کمالِ فن کا بھی مرقع ہے، اور اس سے اردو ادب کے لٹریچر میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے،

نور الرحمٰن از جناب مولوی نور الرحمٰن صاحب بچھرایونی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ (۱) شاہ خلیل الرحمٰن صاحب سجادہ نشین، درگاہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ (۲) اردو بک اسٹال بچھرایون ضلع مراد آباد،

حضرت مولانا شاہ عبد الرحمٰن صاحب موحد لکھنوی المتوفی ۱۲۶۵ھ اپنے دور کے جلیل القدر صوفی، درویش کامل اور وحدۃ الوجود کے بڑے عارف و مبلغ تھے، ترک و تجرید میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا، اُن کی وفات کے بعد ان کے خلیفۂ باختصاص مولوی نور اللہ صاحب بچھرایونی نے اُن کے حالات و ملفوظات میں ایک کتاب انوار الرحمٰن تنویر الجنان فارسی میں لکھی تھی، جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے لیکن اس کی زبان اور ضخامت کی وجہ سے ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، اس لئے مولوی نور الرحمٰن صاحب نے جو مولوی نور اللہ صاحب کے احفاد و امجاد میں ہیں، بڑے سلیقہ سے اردو میں اس کے اہم ابواب کی تلخیص کی ہے، اس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح، اخلاق و سیرت، ارشاد و ملفوظات اور مسئلۂ وحدۃ الوجود پر مولانا کے خیالات وغیرہ جملہ ضروری حالات آگئے ہیں، اور اردو دان طبقہ کے لئے بھی اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہوگیا ہے، وحدۃ الوجود کی بحث اردو میں غالباً ناقابلِ فہم ہونے کی وجہ سے اصل فارسی میں رہنے دی ہے، درحقیقت اس قسم کے مباحث عوام کیا خواص کے لئے بھی نہیں ہیں، بلکہ شخصی ذوق و وجدان سے تعلق رکھتے ہیں، مذہبی نقطۂ نظر

سے بعض پہلوؤن پر نگاہ کھٹکتی ہے، لیکن جن لوگون کو اس قسم کی کتابون کا ذوق ... ہے
مطالعہ کے لائق ہے اور مولانا عبدالرحمن کے متوسلین کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت قابل ... ہے،

دلائلِ صدق رسالت از مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی، تقطیع بڑی ضخامت
۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ: ناظم شعبۂ نشر و اشاعت مدرسہ
جھنڈا انگر ڈاکخانہ رادت گنج، ضلع بستی،

اس کتاب مین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل دیئے گئے ہین، کتاب کے شروع مین رسالت کی ضرورت، وحی عصمت انبیاء، رسول کریم صلعم کی بشریت پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد آپ کی نبوت کی صداقت کے مفصل عقلی نقلی اور تاریخی شواہد و دلائل جمع کر دیئے ہین، اس موضوع پر پرانے مذہبی لٹریچر کو چھوڑ کر اس دور مین بھی موجودہ مذاق کے مطابق اردو مین بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اگر مصنف اس پر نگاہ ڈال لئے ہوتے، تو یہ کتاب اس سے بہتر شکل مین اور زیادہ مفید ہوتی، موجودہ شکل مین وہ عام خواندہ مسلمانون کے لئے مفید ہے،

زبدۃ الحکمۃ، مرتبہ مولوی عبدالشاہد خان شروانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۶ صفحے،
کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ: زادیہ علیہ محمد علی روڈ بالائے قلعہ علی گڑھ

ہندوستان کے پرانے علمی دور کے آخر مین مولانا فضل حق خیرآبادی، اور اُن کے صاحبزادے مولانا عبدالحق معقولات کے امام تھے، اور اس کے بیشتر درسی سلسلے انھی پر منتہی ہوتے ہین، مولانا عبدالحق نے اس زمانہ مین جب اصحاب علم سنجیدہ علوم پر اردو مین کچھ لکھنا علمی شان سے فروتر سمجھتے تھے، منطق اور فلسفہ پر دو رسالے زبدۃ الحکمۃ اور یادگار رحمانیہ اردو مین لکھے تھے، جو مصنف کی وفات کے بعد ۱۳۳۳ھ مین شائع ہوئے تھے، لیکن اب وہ نایاب ہین، اس لئے اس سلسلہ کے

یادگار فرزند مولوی عبداللہ خان نے اُن کو دوبارہ مرتب کرکے شائع کیا ہے، انکی خوبی
مصنف کا نام نامی پوری ضمانت ہے، گوان کی زبان آج سے نصف صدی سے بھی پہلے کی
ہے، مگر فن کے مسائل کو پرانے ژولیدہ طرز کے بجائے سلیس اور سلجھے ہوے انداز مین سمجھانے کی
کوشش کی گئی ہے، اب ان علوم کا چرچا کم بلکہ ختم ہورہا ہے تاہم یہ دونون رسالے تاریخی یادگار
کی حیثیت سے قابلِ قدر ہین، اور عربی مدارس کے طلبہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتے ہین، کتاب کے
شروع مین مرتب کے قلم سے مصنف کے خاندانی حالات، اور فنِ منطق وفلسفہ کی مختصر تاریخ ہے،

چھان بین از جناب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحے،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

مصنف کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، وہ فن شاعری مین اُستادی کے ساتھ اردو زبان کے
بھی مستند ادیب ونقاد ہین، مذکورہ بالا کتاب اُن کے پندرہ ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ
ہے، ان تمام مضامین مین اُن کی ادبی بصیرت ودیدہ وری نمایان ہے، اردو شاعری اور زبان وادب
کی اصلاح وترقی اور دورِ جدید کے گمراہ ادیبون کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ایسے مضامین کی بڑی
ضرورت ہے، اُمید ہے کہ ادبی حلقہ مین یہ مجموعہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا،

آسان حج مترجمہ جناب عبدالرزاق سعید صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت
وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ:- ادارہ تبلیغ الاسلام نمبر ۱۰۲ ٹن ٹن پورہ اسٹریٹ بمبئی نمبر ۹،

یہ رسالہ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی کے ایک عربی رسالہ کا جو مسائل حج پر ہے، اردو مین ترجمہ ہے
اس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی روشنی مین مناسک حج اور اس کے مسائل بیان کئے گئے ہین
اسی کے ساتھ مناسکِ حج اور مدینہ طیبہ کی حاضری کے آداب پر ایک اردو نظم بھی ہے، اگو رسالہ مختصر
ہے، لیکن مفید ہے،

ض م"

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

اس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین [illegible]، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت [illegible] الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے [illegible] ایک [illegible] جگہ [illegible] دوسری جگہ نوحکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین [illegible] میں [illegible] متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج [illegible] کی [illegible] ہے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے [illegible] میں [illegible] فقر و فاقہ [illegible] اون کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- [illegible]

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۸ اے

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیسا اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۴۹۵ صفحے قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- للعہ

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت للعہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۳۳۲ صفحے

قیمت :- عہ

جلد ۶۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومت کی زبان ہندی قرار پاجانے کے بعد اردو زبان کی خدمت کی نوعیت اور اس کے طریقہ کار میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ناگزیر ہے، اس لئے انجمن ترقی اردو ہند نے نئے حالات کے مطابق اپنے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل متعین کیا ہے، اس میں دوسرے کاموں کے ساتھ ہندوستانی زبان کی اشاعت دیوناگری اور رومن رسم الخط میں اردو کی معیاری کتابوں کا منتقل کرنا بھی ہے، غالباً اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان اور ہندی رسم الخط کے ذریعہ جو خالص اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے مقابلہ میں ہندی سے زیادہ قریب ہے، اردو کے مخالفوں کی شدت کم اور ان کو اس کی جانب مائل کیا جائے، اور جو نئی زبان بن رہی ہے، اس کو ہندوستانی سے متاثر کیا جائے، اس طرح کسی نہ کسی حد تک اردو کا وجود باقی رہ جائے گا، گو یہ مصلحت حقیقت سے یکسر خالی تو نہیں ہے، لیکن اس میں حسن ظن کو زیادہ دخل ہے، جس ذہنیت کو آسان ہندی تک گوارا نہیں، وہ ہندوستانی کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے،

درحقیقت موجودہ حالات میں جو کچھ خطرہ ہے وہ علمی و ادبی اردو کے لئے ہے، عام بول چال کی زبان کو جسے اردو کہا جائے یا ہندوستانی کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اور اسے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی، زبانیں جبر اور قانون کے ذریعہ نہیں بنائی جاتیں، بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل کے ماتحت صدیوں میں خود بخود بنتی اور بگڑتی ہیں، اس لئے جو نئی مصنوعی زبان بنائی جا رہی ہے، وہ کبھی عوام کی زبان نہیں بن سکتی، اور اس کا دائرہ حکومت کے دفاتر اور علم و فن تک محدود رہے گا، روزمرہ کی زبان پر اس کا بہت کم اثر پڑیگا، زیادہ سے زیادہ اس میں ہندی کے کچھ الفاظ داخل ہو جائیں گے، اور وہ تھوڑے تغیر کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالفین بھی بجز اس کے کہ نیل گھوڑے کی طرح اس کا نام بدل دیں اسکو نہیں چھوڑ سکتے، اس لئے اس کو بچانے کے لئے ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں، اور علمی و ادبی اردو کو جو خطرات ہیں انکے لئے یہ تدبیر کارآمد نہیں ہے، وہ اپنے حامیوں کی کوششوں ہی سے قائم رہ سکتی ہے،

نئی زبان کو اردو سے متاثر کرنے کے لئے بھی ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں، اس مقصد کے لئے اردو اور ہندوستانی دونوں برابر ہیں، اس لئے کہ جب ایک مقام پر ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں گی تو وہ فطری طور سے ایک دوسرے سے متاثر ہوں گی، اس میں اردو اور ہندی کی تفریق نہیں، بلکہ اُن کے بجائے اگر ہندوستان میں عربی اور فارسی بھی بول چال کی زبان ہوتی، تو ہندی ان سے بھی متاثر ہوتی جس طرح ایک زمانہ میں ہو چکی ہے اس لئے نئی زبان پر اثر ڈالنے کے لئے بھی ہندوستانی کی ضرورت نہیں ہے، وہ اردو دشمنی کے باوجود اس سے متاثر ہو کر رہے گی، اور ان دونوں کے میل جول سے جو زبان پیدا ہو گی، وہی اصلی ہندوستانی ہو گی،

اس تحریر کا مقصد ہندوستانی زبان کی مخالفت نہیں ہے، اگر کوئی ادارہ اسکی تبلیغ و اشاعت کرنا چاہے تو یہ بھی ایک مفید کام ہے لیکن انجمن ترقی اردو کا یہ کام نہیں ہے، اس کو ہندوستانی کلچر سوسائٹی الٰہ آباد اور اس کا رسالہ عرصہ سے انجام دے رہا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں، انجمن کا مقصد خالص اردو کی خدمت ہونا چاہئے، اردو کی معیاری کتابوں کو ہندی رسم الخط میں منتقل کرنے کی تجویز البتہ معقول و مفید تھا اس سے ہندی زبان اور ہندی داں طبقہ دونوں متاثر ہوں گے، لیکن رومن رسم الخط کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی یہ محض اندھی تقلید ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں،

انجمن نے دوسرا مفید کام اپنے ذمہ یہ لیا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو کے ساتھ جو بے اعتنائی بلکہ دشمنی برتی جا رہی ہے، اور اسکو ان حقوق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے، جو دوسری مقامی زبانوں کے طفیل میں اس کو حاصل ہوئے ہیں، اُن کی تحقیقات و تدارک کے لئے ایک کمیٹی بنا دی ہے جس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اس کا مرکز لکھنؤ ہے اب یہ اردو کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ شعبہ تعلیم کے حکام کی اردو دشمنی اور اسکولوں میں اردو کی حق تلفی کے صحیح واقعات سے کمیٹی کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے پتہ پر مطلع کریں،

پاکستان کی قومی زبان اردو مان لی گئی ہے، لیکن اخبارات کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے، کہ مرکزی سرکاری دفتروں اور تعلیم گاہوں میں بھی بدستور انگریزی مسلط ہے گو اس بارہ میں اتنی عجلت اور سختی کی ضرورت نہیں کہ تمام دشواریوں اور مقامی زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کر کے فوراً اردو کو جبری رائج کر دیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ مقامی زبانوں کی اہمیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے جلد سے جلد

اردو دفتری اور تعلیمی زبان بن سکے، اور انگریزی کی احتیاج باقی نہ رہ جائے، اردو کسی ضرورت کی تکمیل سے بھی قاصر نہیں ہے، حیدرآباد میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا ہے، اور ساڑھے دو برسوں سے حکومت کے تمام شعبوں اور یونیورسٹی کی تعلیم زبان رہ چکی ہے، اسی کے ذریعہ ہرفن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ہوتی رہی ہے جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، اور کسی شعبہ کو اس کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں ہوئی، اب یہ بارِ امانت پاکستان کو اٹھانا ہے، اس کے لئے اردو کی اہمیت تنہا لسانی نہیں بلکہ مذہبی اور تمدنی بھی ہے، مذہب کے بعد وہی اہلِ پاکستان میں قومی اور تمدنی وحدت کا ذریعہ ہے، اس لئے اس کو جلد سے جلد عملاً قومی زبان بنانے کی ضرورت ہے،

ہم نے لاہور کے اس ناشر کے خلاف جس نے سیرۃ النبی جلد اول چھاپ لی تھی، پاکستان کی حکومت اور وہاں کے اخبارات کو توجہ دلائی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ ان دونوں بلکہ اہلِ پاکستان نے بھی اپنی اخلاقی و علمی ہمدردی کا ثبوت دیا اور لاہور کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی صاحب کے ذریعہ یہ معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، دارالمصنفین اپنے ان تمام ہمدردوں کا شکر گذار ہے، اب اس کی قانونی بندش بھی کر دی گئی ہے، اس لئے آیندہ کوئی صاحب دارالمصنفین کی کسی کتاب کے چھاپنے کا قصد نہ کریں،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے عرصہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وی پی آ جا نہیں سکتے، اب ایک نئی دشواری یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کے تاجر کتب حکومت سے لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان سے کتابیں نہیں منگا سکتے، اس لئے فی الحال پاکستان سے تجارت بالکل بند ہے، لیکن یہ صورت عارضی ہے، اور یقین ہے کہ تاجر کتب جلد لائسنس حاصل کر لیں گے، لیکن سکہ کے تبادلہ کی دشواری پھر بھی باقی رہ جائیگی، اس لئے جب تک اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور دارالمصنفین کے ایجنٹ ہیں، جن لوگوں کو یہاں کی کتابوں کی ضرورت ہو وہ شیخ صاحب سے طلب کریں، اور پاکستان کے معارف کے خریدار اپنا چندہ بھی انہیں کے پاس بھیجیں، ان سب کا چندہ ختم ہو چکا ہے، لیکن ان کے اعتماد پر رسالہ بند نہیں کیا گیا، اس لئے ان کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ فوراً اپنا چندہ ادا کر دیں،

مقالات

جن سے میں متاثر ہوا

از

سید سلیمان ندوی

"آل انڈیا ریڈیو دہلی نے کئی سال ہوئے مذکورۂ بالا عنوان سے ہندوستان کے ممتاز علماء و مشاہیر سے تقریروں کا ایک سلسلہ نشر کرایا تھا، اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ مدظلہ نے بھی تقریر فرمائی تھی، یہ تقریر مختلف حیثیتوں سے قابلِ اشاعت تھی، لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور اب کئی سال کے بعد یہ تحفہ ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔" (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھیں کھل رہی تھیں، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا تھا، کانوں میں دو قسم کی تحریکوں کی آوازیں دمبدم آرہی تھیں، ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسری علماء کو نئے زمانہ کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی از سرِ نو تنظیم کی تحریک جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے، اور یہ بھی عجیب بات تھی، کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڈھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی، اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے،

کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں، مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، اور جیتی گئی، اور یہی میری زندگی کا جز بن گئی،

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علمائے قدیم وجدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی، اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین صاحب کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبہ بہار میں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا نیا مدرسہ دارالعلوم کھولا، میرے والد مرحوم نے مدرسہ احمدیہ میں مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا، مگر میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس نے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی، مگر ابھی داخلہ میں کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا، یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا اثر ہوا، کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا،

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ میں جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا، ایک دو چند ماہ رکھا گیا، یہاں سب سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی، اور لوگوں کی تقریریں سنیں، اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی،

میں نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا، وہ علماء کی ایک مجلس کا نام ہے، جس نے سب سے پہلے علماء کی جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور قوم و ملت اور علم و فن کی خدمت کے نئے راستوں اور نئے طریقوں سے ان کو مانوس کیا، اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے، ۱۹۰۰ء؟ میں جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا، یہ جلسہ کیا تھا، جوش و خروش کا ایک سمندر تھا، دیکھنے کے قابل تھا اور دیکھنے کی چیز یہ تھی کہ پرانے علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک ... بڑھ کر قوم و ملت

کی چارہ نوازی کی فکر ہی کیں، میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا، میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، میں نے اسی جلسہ میں یہ پُراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، اور خود رو رہے تھے، اور بڑے بڑے جبہ و دستار والے علماء اور مشائخ کو رُلا رہے تھے،

اسی جلسہ میں سب سے پہلے میں نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ (سر) عبد القادر لاہور کو دیکھا، وہ اس وقت آبزرور کے اڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید میں ٹرنسوال میں بوئروں کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آرہی تھیں، دلچسپ انداز میں اُن کا حوالہ دیکر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے" اس تمہید کے بعد انھوں نے کہا کہ "میں بھی اخبار نویس ہوں، اور اگر تم سے یہ کہوں کہ تمھارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں اور صندوقوں میں بند پڑی ہے مگر تم کو خبر نہیں، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا" یہ کہکر انھوں نے ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محوِ حیرت بنا دیا، اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد کو ہوئی، جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کئے، اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچا، اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں داخل ہو گیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز، اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا، اور کانوں نے سب کچھ سُنا،

یہاں ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چریا کوٹی، یہ اپنے زمانہ میں ادب اور معقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز اُن کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اسکی مشق کراتے تھے، صرف، ونحو، ادب، عروض، منطق و فلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا، ان کی طرزِ تعلیم کی

بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درسگاہ سے پیدا ہوا،

بہرحال موصوف کے طرز تعلیم نے چند ہی دنون میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھون سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادون کے سمجھانے سے سمجھ مین نہین آئے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا،

مین کہہ چکا ہون کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ مین آئی، اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا،

۱۹۰۱ء مین شیخ عبدالقادر نے لاہور سے مخزن نکالا، آج کل کے بہت سے بوڑھے اہل قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی مین لکھا، بلکہ اسی کو پڑھکر مضمون لکھنے کی تحریک دل مین پیدا ہوئی،

۱۹۰۴ء مین خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا، مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس مین مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا، مین نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھکر پیش کیا، دونون قبول ہوئے اور الندوہ مین لکھنے کو دیئے گئے، مگر مین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء مین ندوہ آگئے، یہ دونون مضمون شرر مرحوم کے طرز مین تھے، مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس مین شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا، اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی، مگر اصل منزل تک پہنچنے مین کچھ دیر لگی کیونکہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا، کہ ۱۹۰۶ء مین شمس العلماء آزاد دہلی کی سخندان پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا، ایک دو مضمون اس رنگ مین لکھے، مگر یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا، اور بدقسمتی سے اگر وہ آورد ہو تو اس سے برا کوئی اور نہین، ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہراہ پر آجانا پڑا، کیونکہ علمی مضامین کے لئے اُن کے طرز تحریر سے بڑھکر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہین، اس لئے بار بار

اُن سے اصلاحیں لیں اُن کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی، اور سالہا سال اُن کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک منہج تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا،

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے، وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود اُن کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے،

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا،

لیکن بہرحال چند روز ادھر ادھر بھٹک کر پھر اسی راستہ پر آگیا، جس پر استاد مرحوم نے لاکر مجھے کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانتے اُن کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے،

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا۔ ہلکا سا اقبال کر لیا ہے یعنی شعر و سخن کا ذوق میں نے جب آنکھ کھولی، تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلما مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دار العلوم جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کر

کرتے تھے، اور اُن کے شعر سناتے تھے، ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری جواب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہیں، اُن کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب (متوسل سرکار نظام) میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت گھر کر گئی، ان کا دیوان مراۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا، دارالعلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے، اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا، لیکن ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس میں بھی استاد کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا، متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونہ میں چھپا، جہاں ان دنوں دکن کالج میں فارسی کا لکچرر تھا، میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبر الہ آبادی ڈاکٹر اقبال عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدردانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا سب نے تعریفیں کیں، اور دل بڑھایا، مگر ایک آزمودہ کار صاحب کمال ایسا تھا جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجئے آپ شاعر نہیں، اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا، انھوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے، اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہئے، میں نے اسی دن بساطِ سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی، اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا، اور اگر چھپ نہ سکا، اور چھپ گیا، تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا، یہ آزمودہ کار صاحب کمال جنھوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی، جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمام تر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے،

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی، یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں، مجھے

اُس زمانہ مین عربی ادب اور منطق کا شوق تھا، ایک دن اونھون نے مجھے بلواکر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے، مین نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا، فرمایا کیون، مین نے کہا اس لئے کہ یہ دونون دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہین، ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی، عرض کی جب اُن مین کمال پیدا ہو جائے گا، فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم مین تو ہمارے علماء کی پوری عمرین بسر ہو جاتی ہین، اور اصل مقصود کی نوبت نہین آتی، اس پر انھون نے یہ حکایت بیان کی، کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہان تک کہ تمام کمرہ قلمون سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیون رکھ رہے ہین ؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا ارادہ تصنیف کا ہے"، پوچھنے والون نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی"؟ فرمایا جب ان قلمون سے فرصت ملے گی"،

تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے، اگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ مؤثر ہوئی کہ مین نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہین کھایا،

دارالعلوم ہی مین تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا، یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمیدالدین صاحب بی اے تھے، یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجوایٹ تھے، فلسفہ مین وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب مین مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے، یہ ان لوگون مین تھے، جو ذریعۂ علوم کی تکمیل کی بھول بھلیون سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے، اُن سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے، اگر بحث بار بار اُٹھائی، اور مشکلات مین مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد مین جو معجزات پر ہے، انہی کے

[illegible]

سب جانتے ہیں کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن میں پرورش پایا ہے، استاذ مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزون کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے، کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے، اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے، پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابون مین بتاتے تھے، طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے، اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتے تو اُن کو لکھ کر اُن کے سامنے پیش کرتے، وہ اس مین کاٹ چھانٹ کرتے، مضمون کے بعد پھر رسالون کی، اور اس کے بعد کتابون کی تصنیف کی باری آتی، تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشے اس محنت سے ڈھونڈ کر پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اُس سے تمھارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے، حوالہ مین سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے، معنی کے ساتھ عبارت کی حسن، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پر ہیز کیا جائے، یہ ان کا طریقہ تھا، اور اسی طریقہ کی پابندی ہماری دارالمصنفین مین جس مین علما اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دیجاتی ہے، اب تک کیجاتی ہے،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا،

ضخامت ۱۹۴ صفحے،

قیمت عہ/ (چوتھا اڈیشن)

منیجر

الجزیہ

از

جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

"جزیہ کے متعلق غیر مسلمون مین مدتون سے جو غلط فہمی چلی آرہی تھی، اس کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے الجزیہ لکھ کر دور کیا لیکن اسکے بعض پہلو پھر بھی تشنۂ تحقیق تھے، اس مضمون مین تمام ضروری پہلوؤن پر مفصل بحث کرکے جزیہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔"

جزیہ کا لفظ | جزیہ کس زبان کا لفظ ہے؟ اس کے متعلق دو خیال ہین،

(۱) پہلا خیال یہ ہے کہ وہ عربی ہے، اس کا مادہ ج ز ی ہے، یہی خیال زیادہ عام ہے، طبری (۳۱۰ھ) جصاص (۳۷۰ھ) ابو بکر سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) جوہری (۳۹۳ھ) راغب اصفہانی (اوائل ۵۰۰ھ) محی السنۃ بغوی (۵۱۶ھ) زمخشری (۵۳۸ھ) معافری (۵۴۳ھ) مرغینانی (۵۹۳ھ) امام رازی (۶۰۶ھ) جمال قرشی ۶۸۱ھ) بیضاوی (۶۸۵ھ) نسفی (۷۱۰ھ) ابن مکرم (۷۱۱ھ) ابو حیان غرناطی (۷۴۵ھ) فیروز آبادی (۸۱۷ھ) مہائمی (۸۳۵ھ) بدر الدین عینی (۸۵۵ھ) جلال الدین محلی (۸۶۴ھ) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ابو سعود (۹۵۱ھ) شربینی (۹۷۷ھ) محمد طاہر (۹۸۶ھ) زبیدی (۱۲۰۵ھ) محمد اشرف (۱۲۴۴ھ) آلوسی (۱۲۷۰ھ) سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) جو مشہور کتب تفسیر، فقہ او لغت کے مصنف ہین، یہی لکھتے ہین،

(۲) دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ فارسی ہے، اصل مین گزیت تھا، جس کے معنی خراج کے ہین، یہ خیال

ابو عبداللہ محمد بن احمد بن یوسف خوارزمی (۳۸۷ھ) نے مفاتیح العلوم (ص ۵۹) میں ظاہر کیا ہے، اس کی کتاب ۱۸۹۵ء میں G. Van Veoten نے شائع کی ہے، اور ایک کتاب منتخب اللغات کے قلمی نسخہ میں بھی جو ناقص الاطراف ہے، یہی لکھا ہے، اس کتاب سے مراد اگر منتخب اللغات شاہجہانی ہے تو اس کا مصنف عبدالرشید حسینی مدنی ٹھٹہ (سندھ) کا رہنے والا تھا جس نے اس کتاب کو حسب روایت دیو انجاؤ، اور اچھے ۱۰۴۶ھ میں تمام کیا،

گزیت کے دو تلفظ ہیں، فردوسی کے ان اشعار

گزیتے نہاد ند بر یک درم — گراید دن کہ دہقان نبودی دژم

گزیتے ز بار د ہ بشش درم — بجز ماستان برہمین زد دقم

اور نظامی کے اس شعر

گہش خاقان خراج چین فرستد — گہش قیصر گزیت دین فرستد

میں گزیت امیر کے وزن پر ہے، لیکن مفاتیح العلوم کے ناشر نے اس کو رہبر کے وزن پر پڑھا ہے،

جزیہ کا تلفظ | جزیہ کو جو لوگ معرب نہیں مانتے، بلکہ عربی سمجھتے ہیں، وہ اس کا تلفظ دو طرح پر کرتے ہیں،

الف :- جِزیہ جیم کے نیچے زیر یہ عام تلفظ ہے، جیسے شکوہ بمعنی شکایت،

ب :- جَزیہ جیم کے اوپر زبر جیسے قعدہ اور جلسہ، یہ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور تفسیر جامع البیان (ص ۶۰ ج ۱۰) میں اور امام ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) نے بحرالمحیط (ص ۳۰ ج ۵) میں لکھا ہے، دوسری کتاب میں قعدہ کی جگہ پر عقدہ چھپ گیا ہے جو غلط ہے،

تنقید | میرے نزدیک عربی جزیہ، معرب جزیہ سے زیادہ قدیم ہے، اور اس کے حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) یہ لفظ قرآن مجید مین موجود ہے، اور چونکہ آیت جزیہ سنہ ۹ھ مین نازل ہوئی ہے[۵۰] اس لئے عربی ادبیات مین اس کو رواج پائے ہوئے تیرہ سو ساٹھ برس کا زمانہ گذرا ہے،

(۲) عرب کے ایک جاہلی شاعر ابو کبیر ہذلی (عامر بن حلیس[۵۱]) جنھون نے اسلام کا زمانہ بھی پایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مشرف ہوئے ہین[۵۲] لسان العرب ابن مکرم (سنہ ۷۱۱ھ) مین جو عربی زبان مین لغت کی سب سے بڑی کتاب ہے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۵۹ جلد ۱)

وازالکماۃ تعادروا طعن الکلی

تذر البکارۃ فی الجزاء المضعف

اس مین جزار کا لفظ جزی اور جزیہ کی جمع ہے، اور یہ دونون لفظ جزیہ کی جمع ہین،

(۳) حدیث کی کتابون مین یہ لفظ عام طور پر ملتا ہے،

(۴) امام ابو یوسف (سنہ ۱۸۲ھ) نے کتاب الخراج خاص خراج اور جزیہ پر لکھی ہے لیکن جزیہ کو معرب نہین کہا ہے،

(۵) امام یحیٰی بن آدم (سنہ ۲۰۳ھ) نے بھی کتاب الخراج تصنیف کی ہے، اور اس مین بعض ایسے الفاظ بھی آئے ہین، جو معرب ہو کر مستعمل ہو چکے ہین، مثلاً زمین کے خراج کے لئے طسق (ص ۵۷) پیمانہ کے لئے دقر، (ص ۵۹) یا دستجہ جو غالباً دستہ کا معرب ہے، (ص ۱۴۴) لیکن جزیہ کو معرب نہین لکھا ہے،

(۶) ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری (سنہ ۲۸۲ھ) نے الاخبار الطوال مین بعض معرب الفاظ لکھے ہین جیسے شمرج جو سمرہ کا معرب ہے لیکن جزیہ کے متعلق وہ بھی خاموش ہین،

---

[۵۰] تفسیر ابن جریر ص ۶۰، ۶۵، ج ۱۰، [۵۱] کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ (۲۹۶) مطبوعہ لیڈن سنہ ۱۹۰۲ء،
[۵۲] اصابہ وغیرہ،

(۷) تمام مفسرین اور فقہا نے جزیہ کو عربی الاصل سمجھا ہے،

(۸) کوئی اہلِ لغت اس کو معرب نہیں کہتا،

(۹) گزیت کا سب سے قدیم عربی ماخذ خوارزمی ہے، جس نے ۳۸۷ھ میں وفات پائی،

(۱۰) فارسی ماخذ میں گزیت کا لفظ سب سے پہلے فردوسی کے ہاں ملتا ہے، جس نے ۴۱۱ھ میں انتقال کیا تھا، اس لحاظ سے اس لفظ کو فارسی اسلامی ادبیات میں آئے ہوئے نوسو اٹھاون برس ہوئے، اور یہ مدت عربی جزیہ سے بقدر ۴۱۵ برس کم ہے،

(۱۱) فارسی میں علم لغت کی پہلی کتاب ابوالحسن علی بن احمد اسدی طوسی نے لکھی، جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری سے قبل فرض کیا جا سکتا ہے، اس کتاب کا نام لغتِ فرس ہے، اور بقول مصنف بلخ، ماوراء النہر اور خراسان (گویا ایران و ترکستان) کی فارسی کے الفاظ جمع کئے ہیں، جو عربی کی آمیزش سے بالکل پاک ہیں، اور ان کی سند میں اشعار بھی پیش کئے ہیں، لیکن بایں ہمہ اس کتاب میں گزیت کا لفظ نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزیت فارسی نہیں، بلکہ جزیہ کا مفرس ہے،

(۱۲) گزیت کے جو معنی خوارزمی (۳۸۷ھ) نے لکھے ہیں، بالکل وہی معنی جزیہ کے ان عربی مصنفین نے لکھے ہیں، جو ان سے متقدم تھے، مثلاً طبری (۳۱۰ھ) اور سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ معرب نہیں، بلکہ گزیت مفرس ہے

(۱۳) چونکہ صحیح لفظ گزیت بروزن امیر ہے، جیسا کہ فردوسی اور نظامی کے اشعار سے ثابت ہے اس لئے جزیہ اس سے معرب نہیں ہو سکتا،

(۱۴) ان تمام باتوں کے باوجود یہ امکان ضرور ہے کہ اسلام سے پیشتر یہ لفظ ایران سے یمن آیا ہو اور معرب ہو کر عرب میں رائج ہو گیا ہو، لیکن یہ امکان ہی امکان ہے، شواہد سے اس کی تائید مشکل ہے،

(۱۵) یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اسلام سے پیشتر نہ صرف ایران، بلکہ چین اور ہندوستان مین بھی جزیہ کا رواج تھا، اور اہل عرب تجارتی سلسلہ سے ان مقامات مین آتے جاتے تھے، اس لئے جس طرح یہ ممکن ہے کہ جزیہ کا لفظ ایران سے لیا گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ چین یا ہندوستان مین جزیہ کا طریقہ دیکھ کر اہل عرب نے اس کا عربی نام جزیہ رکھ لیا ہو،

جزیہ کے معنی | مفسرین فقہاء اور ائمہ لغت نے جزیہ کے معنی خراج کے لکھے ہین، -

(۱) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (سنہ ۳۱۰ھ) جامع البیان (۱۰ ج ۰ مصر) مین لکھتے ہین،

حتّٰی یعطوا الخراج عن رقابھم، یہان تک کہ وہ اپنی گردنون کی طرف سے خراج دین،

(ب) امام ابو بکر محمد بن عزیز سجستانی جنھون نے ۳۳۶ھ سے قبل وفات پائی، اپنی تصنیف غریب القرآن (عرف نزہۃ القلوب) ص ۸۳ (مصر ۱۳۲۵ھ) مین فرماتے ہین،

الجزیۃ. الخراج المجعول علی راس الذمی، جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کی ذات پر لگایا جاتا ہے،

(ج) شمس الائمہ ابو بکر محمد بن ابو سہل سرخسی (سنہ ۴۸۳ھ) مبسوط (ص ۷۷، ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین :-

وضع خراج علی رؤوس الرجال آدمیون پر فی راس خراج لگانا (جزیہ) ہے،

(د) محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی (سنہ ۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل (ص ۶۲ جلد ۲ بمبئی سنہ ۱۲۷۶ھ) مین ہے :-

وھی الخراج المضروبۃ علی اور وہ جزیہ ان (ذمیون) کی گردنون پر

مقررہ خراج ہے،

ک - علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود زمخشری (۵۳۸ھ) کی اساس البلاغۃ (ص ۶۵ جلد ا، مصر) مین مرقوم ہے،

واشتری من دھقان ارضًا	اور اس نے کسی زمیندار سے زمین
علیٰ ان یکفیہ جزیتھا ای	اس شرط پر خریدی کہ اس کا جزیہ
خراجھا،	یعنی خراج ادا کرے گا،

و - علامہ جمال الدین محمد بن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۱۵۹ ج ۱۸ مصر) مین لکھا ہے،

والجزیۃ خراج الارض والجمع جِزَی	جزیہ زمین کے خراج کو کہتے ہین،
وجِزْی،	جِزَی اور جِزْی اسکی جمع ہے،

ز - علامہ اثیر الدین ابوحیان محمد بن یوسف غرناطی اندلسی (۷۴۵ھ) اپنی تالیف تحفۃ الاریب فی القرآن من الغریب (ص ۲۰، حماۃ ۱۳۳۵ھ) مین جس کا نام سیوطی نے نحاۃ (ص ۱۲۲) مین اتحاف الاریب بتایا ہے فرماتے ہین،

الجزیۃ خراج المجعول علی راس	جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کے سر
الذّمی،	پر لگایا گیا ہو،

ح - علامہ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی (۸۱۶ھ) نے القاموس المحیط (ص ۲۱۳) تحریر فرماتے ہین،

والجزیۃ بالکسر خراج الارض	جزیہ (جیم کو زیر) زمین کا خراج ہے اور
وما یوخذ من الذمی	جو ذمی سے لیا جائے (وہ بھی جزیہ) ہے،

ط - علامہ ابن احمد مہائمی (۸۳۵ھ) کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان (ص ۲۹۰ ج ۱) میں ہے،

وھی الخراج المضروب علی الرقاب،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنوں پر لگایا جاتا ہے،

ی - علامہ جلال الدین محمد بن احمد محلی (۸۶۴ھ) اور علامہ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) کی تفسیر جلالین (ص ۱۶۷) میں ہے،

الخراج المضروب علیھم کل عام	(جزیہ) ان (ذمیوں) پر مقرر کیا ہوا سالانہ خراج ہے،

ک - علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب، جنھوں نے سراج المنیر کے نام سے ایک تفسیر ۹۷۸ھ میں تالیف کی، اس کے ص ۴۰۳ ج ۱ میں لکھتے ہیں،

وھی الخراج المضروب علی رقابھم،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو ان (ذمیوں) کی گردنوں پر مقرر کیا جائے

ل - مولانا محمد طاہر جنھوں نے ۹۸۶ھ میں مجمع البحار الانوار کے نام سے ایک لغت تصنیف کیا، اس کی جلد ۱ ص ۱۸۵ میں لکھتے ہیں

من اخذ ارضا بجزیتھا لارض ای بخراجھا،	جو شخص کوئی زمین جزیہ یعنی خراج ادا کرنے کی شرط پر لے،

م - علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی حینی واسطی (۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس (ص ۳، ج ۱۰ مصر) میں قاموس کی مندرجۂ بالا عبارت نقل کرکے اس کے ایک لفظ (دمایوخذ) کی یوں تصریح کی ہے،

(وما یؤخذ) (ای یوخذ)	اور جزیہ ہی ہے جو ذمی سے (قرض) لیا جاتا ہے

ن ۔ مولانا محمد اشرف لکھنوی نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر، ضخیم جلدوں میں تاج اللغات تصنیف کی تھی، اس کتاب کے مصنفین اور سنہ تصنیف کا کچھ پتہ نہیں ہے، مولانا محمد اشرف کا نام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر تحریر فرمایا ہے اور یہ عبارت لکھی ہے،

"یکے از مولفینش مولانا محمد اشرف لکھنوی است در ۱۲۷۸ھ وفات یافت"

بہرحال اس کتاب کے (ص ۲۵۵) میں ہے :۔

"جزیہ بالکسر حاصل زمین و چیزکہ گرفتہ شود از کفار اہل ذمہ"

س ۔ امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) نے تفسیر فتح البیان (ج ۴ جلد ۴، مصر ۱۳۰۱ھ) میں لکھا ہے،

وھو الخراج المضروب علی	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنوں
رقابھو کل عامٍ	پر سالانہ مقرر کیا جاتا ہے،

غرض ۱۰۱ھ سے ۱۳۰۷ھ تک جتنے مشہور عالم گذرے ہیں، بالاتفاق سب نے جزیہ کے معنی خراج کے لئے ہیں،

جزیہ کی اصطلاح جزیہ کے لغوی معنی جو اوپر بیان کئے گئے، انہی سے اس کے اصطلاحی معنی متفرع ہوتے ہیں، لغت میں جزیہ کے معنی خراج کے ہیں، اب اگر وہ خراج رعایا کے ہر فرد سے بحساب فی کس سالانہ وصول کیا جائے، تو اس کو جزیہ کہا جائے گا، اور یہ عام معنی ہونگے لیکن اگر وہ خراج سلطنت اسلام میں صرف غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جائے، تو یہ شرعی اور اصطلاحی جزیہ ہوگا، اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں،

۱۔ لغت میں جزیہ اور خراج محصول کو کہتے ہیں، خواہ وہ کسی چیز کا ہو، اور کوئی شخص ادا کرے

۲- مسلم اور غیر مسلم رعایا پر انفرادی حیثیت سے جو محصول عائد ہو، لغت کے لحاظ سے اس کا نام جزیہ ہے؛ اس مین کوئی تفریق نہین ہے،

۳- صرف غیر مسلم رعایا جو فرداً فرداً محصول ادا کرے، اوس کو شرع کی اصطلاح مین جزیہ کہتے ہین، اور مسلم رعایا جو محصول ادا کرتی ہے، اس کو زکوٰۃ، صدقہ، اور دوسرے نامون سے تعبیر کیا جاتا ہے،

جزیہ اقوام غیر مین | جزیہ کے لغوی معنی سمجھنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا رواج دوسری قومون اور ملکون مین بھی تھا ؟ ہندوستان، ایران، اور چین، اس کا جواب اثبات مین دیتے ہین،

ہندوستان مین جزیہ | منو شاستر سے جو ہندوستان کا مدنی اور سیاسی قانون ہے، اور جدید تحقیقات کے مطابق حضرت مسیحؑ کے دو تین سو سال پیشتر تالیف ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ (رقاب Poll Tax) کا رواج ہندوستان مین کم از کم بائیس سو برس سے ہے، منوجی نے کتاب مذکور کے باب ۷ مین جزیہ کے متعلق حسب ذیل دفعات درج کئے ہین :-

دفعہ ۱۲۸- جس طریق سے کام کرنے والے کو اور راجہ کو فائدہ ہو، اس طریق کو دیکھ کر راجہ اپنے محصولات کو تجویز کرے، جو کہ ہر شخص پر برابر ہو،

دفعہ ۱۳۳- ...... وید پڑھنے والے برہمن سے محصول نہ لیوے،

دفعہ ۱۳۷- راج مین چھوٹے آدمیون سے بھی تھوڑا ساگ، پتا، وغیرہ سال تمام مین بطور محصول کے لیوے،

دفعہ ۱۳۸- رسوئین بنانے والے و ہر قسم کے کاریگر و شودر و جسم کی تکلیف سے اوقات بسر کرنے والے

---

[1] تمدن ہند موسیو گستاولی بان ترجمہ مولانا سید علی بلگرامی ص ۲۱۰۔

(پلہ دار وغیرہ) ان سبھون سے ہر مہینہ مین ایک دن کام کرائے، ان کا یہی محصول ہو،

دفعہ ۱۳۹ - اگر بہ تقاضائے محبت، محصول رعیت سے نہ لیوے تو راجہ اپنی جڑ اُکھاڑتا ہو،

دفعہ ۱۵۴ - آٹھ کامون کو............ بچارے، آٹھ کام یہ ہین، رعیت سے محصول

لینا،.........(باب ۸)

دفعہ ۳۹ - چیز مدفونہ یافتہ کے نصف حصہ کو لینے والا راجہ ہے، کیونکہ حفاظت کرتا ہو اور سب کا مالک ہے،

دفعہ ۳۹۴ - اندھا، بہرا، لنگڑا، ستر برس کی عمر والا، دھن دہانیہ سے ویدیا پاٹھون کا اُپکار کرنے والا، ان سبھون سے راجہ باوجود خالی ہونے خزانہ کے اپنے لینے کے لائق محصول کو نہ لیوے،

دفعہ ۴۰۵ - گاڑی وغیرہ محمولہ اشیاء وغیرہ سے بلحاظ چیز ہائے محمولہ کے سارا سار بچار کرکے محصول مقرر کرنا چاہئے، اور جس گاڑی وغیرہ مین اشیا وغیرہ نہین ہے اور جو آدمی کچھ سامان وغیرہ نہین رکھتا، اُنھون سے تھوڑا محصول لینا چاہئے،

ان دفعات سے اصولی طور پر پتہ چلتا ہے، کہ

(۱) پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب پر جزیہ تھا (۲) عورتین مستثنیٰ نہ تھین، اور نہ بچے مستثنیٰ تھے (۳) غیر مستطیع لوگون کو بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا (۴) معذور، زیادہ معمر اور برہمن مستثنیٰ تھے (۵) مزدور، چمار، نوکر، جو محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، اُن سے محصول کے عوض ہر مہینہ مین ایک دن بیگار لی جاتی تھی (۶) خراج نہ لینا، سلطنت کی بیخ کنی کے مرادف تھا (۷) محصول ہر شخص پر برابر تھا،

ایران مین جزیہ | ایران مین جزیۂ رقاب کب سے رائج تھا؟ اس کا صحیح جواب ہم نہین

دیکھئے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ نوشیروان سے پہلے بھی اس کے وصول کرنے کا دستور تھا، طبری (ص ۹۶۰ ج ۱) میں ہے،

وکان ملوک فارس یاخذون	اور ایران کے بادشاہ نوشیروان سے پہلے
من کور من کورھم قبل ملوک	خراج میں بعض صوبوں سے تہائی بعض
کسریٰ انوشروان فی خراجہا	سے چوتھائی بعض سے پانچواں بعض سے
الثلث ومن کور الربع، ومن کور	چھٹا حصہ شادابی، اور پیداوار کے مطابق
الخمس ومن کور السدس علیٰ	لیا کرتے تھے، اور کھوپڑیوں کے جزیہ
قدر شربہا وعمارتہا، ومن جزیۃ الجماجم	میں بھی کچھ مقرر رقم وصول کیجاتی تھی

قباد بن فیروز نے اخیر زمانہ سلطنت میں خراج کی صحیح تشخیص کرانی چاہی، لیکن اس کا انتقال ہوگیا، اور اس کام کو اس کے بیٹے نوشیروان نے انجام دیا، طبری (حوالہ سابق) میں ہے،

حتی اذا ملک ابنہ کسریٰ امر باستتمامہا	جب اس کا بیٹا کسریٰ بادشاہ ہوا تو
واحصاء النخل والزیتون والجماجم	اس نے اس کام کو مکمل کرایا، کھجور،
..... وامر کاتب خراجہ ان یقرء	زیتون اور کھوپڑیاں شمار کی گئیں...
علیہم الجمل التی استخرجت من	..... اور محکمۂ خراج کے سکریٹری کو حکم
اصناف غلات الارض، و	ہوا کہ لوگوں کو وہ الفاظ پڑھ کر سنائے
عدد النخل والزیتون والجماجم	جو زمین کے متعدد اقسام کے غلوں اور
	کھجور، زیتون، اور کھوپڑیوں کی تعداد کے
	متعلق درج تھے،

کسریٰ نوشیروان نے اس تشخیص کی وجہ یہ بتلائی ہے،

انا قد رأينا ان نضع على ما احصى من جربان هذه المساحة من النخل والزيتون والجماجم وضائع، وتامر بانجامها فى السنة فى ثلثة انجم، وتجمع فى بيوت اموالنا من الاموال مالو اتانا من ثغر من ثغورنا او طرف من اطرافنا فتق او شئ نكرهه واحتجنا الى تداركه او حسمه بذلنا فيه مالا كانت الاموال عندنا معدة موجودة، ولم نرد استئناف اجتبائها على تلك الحال (طبری ۶۰۹-۱۰۹۶ جلد ۲)

مابدولت کی رائے ہے کہ مابدولت کھجور اور زیتون کی پیمائش شدہ جریبوں اور کھوپڑیوں پر ٹیکس لگائیں، اور سال میں اُن کو تین قسطوں میں ادا کرنے کا حکم دیں، تاکہ مابدولت کے خزانوں میں اس قدر دولت جمع رہے، کہ اگر کبھی کسی سرحد یا کسی سمت سے کوئی بغاوت یا بدامنی رونما ہو، اور مابدولت کو اس کے تدارک یا قلع قمع کرنے میں روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑے تو وقت پر ہمارے پاس روپیہ موجود رہے اور نئے سرے سے اس وقت مابدولت کو روپیہ جمع کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے

اور اس جزیہ کی شرح یہ تھی،

والزموا الناس الجزية ما خلا اهل البيوتات والعظماء والمقاتلة والهرابذة والكتاب ومن كان فى خدمة الملك، وصيروها على طبقات اثنى

اور لوگوں پر انھوں نے جزیہ لگایا سوائے اونچے گھرانوں، معززین، فوج پیشیان، مذہبی، محرر اور ملازمین شاہی کے، اور اور اس (جزیہ) کی چند شرحیں رکھیں، یعنی بارہ درہم، اور آٹھ درہم اور چار،

عشر درهما وثمانية وستة و	آدمی کی ثروت اور فقر کے لحاظ سے، اور
اربعة كقدر اكثار الرجل و	جس شخص کا سن بیس سے کم یا پچاس سے
اقلاله، ولم يلزموا الجزية	اوپر تھا، اس پر جزیہ نہیں لگایا،
من كان اتى له من السن	
دون العشرين او فوق الخمسين	

(طبری ص ۹۶۲ ج ۲)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ ایران میں انسانوں پر محصول عائد تھا،

۲۔ ان محاصل کا مقصد بغاوتوں کے رفع کرنے اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری تھی،

۳۔ بیس برس سے کم اور پچاس سال سے زیادہ کے آدمی محصول سے مستثنیٰ تھے،

۴۔ عورتیں مستثنیٰ نہ تھیں،

۵۔ جزیہ حسب حیثیت تھا،

۶۔ اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم جزیہ ادا نہیں کرتے تھے،

چین میں جزیہ | چین میں جزیہ رقاب عرصہ سے تھا، مسلمانوں میں پہلا مصنف جس نے اس کا تذکرہ کیا سلیمان تاجر ہے، جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۷ھ کے حدود میں لکھا ہے، وہ لکھتا ہے،

ولكن عليهم جزية على الجماجم	اور لیکن ان پر حالات کے مطابق جزیہ ہر
الذكور بحسبما يرون من الاحوال	جو سروں (مردوں) سے لیا جاتا ہے
وان كان بها احد من العرب	اور اگر وہاں عرب یا دوسرے ملک کا
او غيرهم اخذ منه جزية ماله	کوئی شخص ہوتا ہے، تو اس سے اس کے

کے متعلق قدرتی طور پر نقطہ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونوں کے لئے چندہ کی طرح مختلف ہو اور اس کا علیحدہ علیحدہ نام رکھدیا جائے تاکہ سننے والوں کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانوں کے محصول کا نام زکوٰۃ اور غیر مسلموں کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکوٰۃ اور جزیہ کا فرق | چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولوں (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانوں کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکوٰۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکوٰۃ (ب) کھجور پر زکوٰۃ (ج) سکوک سونے چاندی پر زکوٰۃ (د) معادن پر زکوٰۃ، (ہ) دفینہ پر زکوٰۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور عنبر پر زکوٰۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکوٰۃ (ح) میراث پر زکوٰۃ (ط) قرض کی پر زکوٰۃ (ی) مال تجارت پر زکوٰۃ، (ک) بکریون پر زکوٰۃ (ل) گائے پر زکوٰۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکوٰۃ، (ن) پھلون پر زکوٰۃ، (س) عید الفطر کی زکوٰۃ،

ان انواع مین سے اگرچہ کبھی کوئی مسلمان محصول (زکوٰۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہاتھ مین جانے سے اس کے امن وامان اور نظم ونسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compalsary dues) کا اتنا

چلا گیا، جو زکوٰۃ سے مقدار مین کم اور اس کی طرح گوناگون نہ تھا، اور یہ ایک صریح رعایت تھی،

(۲) مسلمانون کا محصول (زکوٰۃ) ایک مذہبی فرض تھا، جن کو وہ کار خیر سمجھ کر ثواب کے لئے اداکرتے تھے، اس لئے اس کی مقدار زیادہ ہونے مین کچھ ہرج نہ تھا، بخلاف اس کے غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) محض سیاسی تھا، جس پر ان کے عقیدہ کے مطابق کوئی اُخروی ثواب مرتب نہین ہوتا تھا، اس لئے اس کی شرح زیادہ نہین رکھی گئی،

۳ - مسلمانون کا محصول معاف نہین ہوسکتا تھا، کیونکہ وہ مذہبی فرض تھا، لیکن غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) نقدی شکل مین معاف ہوسکتا تھا، مواتیذ کا مسئلہ جزیہ کے باب کا ضروری مسئلہ ہے، مبسوط (ص ۸۲ ج ۱۰) مین اس کے متعلق جو کچھ ہے ذرا تفصیل کے ساتھ ہے، اور امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے اختلافات دکھائے ہین، لیکن فتاوائے سراجیہ مین جو ۵۶۹ھ کی تصنیف ہے[۱]، یعنی مبسوط کے بعد کی ہے، اس مسئلہ کو بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور "مواتیذ" کے معنی بھی تبلائے ہین، یعنی فی الفارسیۃ ماندہا[۲]، اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ذمی (غیر مسلم) پر برسون سے جزیہ باقی چلا آتا ہو، تو اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، بلکہ جس سال حاکم مطالبہ کرے گا، اسی سال کا جزیہ ادا کرنا ہوگا، اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فقہا جزیہ کو قرض نہین سمجھتے، بلکہ عطیہ اور صلہ سمجھتے ہین، مبسوط مین ہے،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ ولیست بدین واجب (ص ۸۰ ج ۱۰)	اس لئے کہ جزیہ ایک مالی صلہ ہے واجب قرض نہین،

(۴) مسلمانون کی زکوٰۃ مین تخفیف نہین ہوسکتی، لیکن جزیہ مین کمی کی جاسکتی ہے، چنانچہ نجران کے وہ عیسائی جو عراق چلے گئے تھے، انھون نے حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت مین تخفیف جزیہ کی درخواست کی، تو امیر المومنین نے ولید بن عقبہ حاکم عراق کے نام ایک فرمان بھیجا، جس مین یہ فقرے

[۱] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۷، [۲] فتاویٰ سراجیہ قلمی باب الجزیہ،

بھی تھے[۱]

وانی قد خففت عنھم ثلاثین — مین نے اُن کے جزیہ سے تیس حلّے

حلۃ من جزیتھم، — کم کر دیئے،

یحییٰ بن آدم (۲۰۳ھ) نے اپنی تصنیف کتاب الخراج مین جو ابھی حال مین چھپی ہے، لکھا ہے کہ حسن (شاید حسن بن صالح) کا قول تھا کہ جن لوگون پر حضرت عمرؓ نے ۴۸، ۲۴، ۱۲ کے شرح سے جزیہ مقرر کیا تھا، اُن پر اُس سے زیادہ نہ مقرر ہونا چاہئے، اور ان مین سے جو ادا نہ کر سکتا ہو اُس کے جزیہ مین تخفیف کر دی جائے، کیونکہ حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اُن کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے[۲]،

۵- مسلمانون مین جو صاحب نصاب ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہو سکتا، لیکن غیر مسلم خدمات کے صلہ مین نقد رقم جزیہ سے مستثنیٰ ہو سکتے ہین، چنانچہ عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان کے فتوحات کے سلسلہ مین طبری نے حضرت عمرؓ کے فرامین اس مضمون کے متعلق نقل کئے ہین (واقعات ۲۱ھ و ۲۲ھ ہجری)

۶- اگر کوئی اسلامی ملک دشمن کے نرغہ مین ہو تو مسلم رعایا کا محصول (زکوٰۃ) واپس نہین کیا جاتا، لیکن غیر مسلم رعایا کا جزیہ واپس کر دیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام کے تمام عمال سے نہ صرف جزیہ بلکہ خراج تک واپس کرا دیا تھا[۳]،

۷- زکوٰۃ مسلمان عورتون اور بوڑھون بلکہ یتیم بچون سے بھی وصول کیجاتی تھی، لیکن جزیہ غیر مسلم بچون، عورتون اور بوڑھون سے نہین لیا جاتا تھا،

---

[۱] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۲۴، [۲] کتاب الخراج یحییٰ بن آدم قرشی ص ۲۳،

[۳] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۱،

۸- زکوٰۃ مسلمانوں کے مختلف ذرائع آمدنی سے وصول کی جاتی تھی لیکن جزیہ کی یہ حالت نہ تھی،

۹- روپیہ کی تعداد زیادہ ہونے سے زکوٰۃ کی رقم بڑھتی جاتی ہے لیکن جزیہ بڑے سے بڑے مالدار شخص کو بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہیں ادا کرنا پڑتا، رقم جزیہ کی زیادتی کے شاکی، اور غیر مسلم رعایا کی اقتصادی حالت کے مرثیہ خوان سرجدونا تھ سرکار کو حساب لگا کر دیکھنا چاہئے تھا کہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم پر محصول کا بار کس تناسب سے پڑتا تھا؟

۱۰- زکوٰۃ کا نصاب متعین ہے لیکن جزیہ کی کوئی شرح متعین نہیں، اسی لئے اس میں فقہا مختلف الرائے ہیں، جزیہ کا تقرر دو طرح پر ہوتا ہے، صلح سے کوئی رقم طے ہو جائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے اور نجران کے عیسائیوں سے جزیہ طے فرمایا تھا، ایسے جزیہ کی رقم پر اضافہ نہیں ہو سکتا،

غلبہ کے بعد بادشاہ جزیہ مقرر کرے، اس میں بادشاہ کو کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، احکام القرآن مصنفہ امام ابو بکر احمد بن علی رازی الجصاص (سنہ ۳۷۰ھ)، اور رمز الحقائق شرح کنز مصنفہ قاضی بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی (۸۵۵ھ) وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جزیہ کی رقم متعین کرنے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، حنفیہ اور حسن بن صالح ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ایک، دو اور چار درہم ماہوار مقرر کرتے ہیں، جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے ثابت ہے، امام مالک کے نزدیک ہر بالغ پر چار دینار یا ۴۰ درہم ہیں، امام شافعیؒ ایک دینار فی کس تجویز فرماتے ہیں، اور امام احمدؒ تشخیص کا کام بادشاہ پر چھوڑتے ہیں[۱]

ان روایتوں اور خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ذی عقل جزیہ کو غیر ضروری "تمیز" خیال نہیں کر سکتا،

جزیہ کی حیثیت | جیسا کہ اوپر کے عنوان سے معلوم ہوا ہوگا، جزیہ کی حیثیت محض سیاسی تھی، یعنی اس کے

مذہب سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے تعین کا باعث کیا تھا؟ کس مقصد کو سامنے رکھکر اس کی تشخیص ہوئی؟ اور اس کو کس چیز کا معاوضہ یا بدل قرار دیا گیا؟ اس میں علماء کے متعدد اقوال ہیں،

جزیہ جان کا محصول ہے | مبسوط وغیرہ میں بعض علماء کے جو اقوال نقل کئے گئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ جان کا معاوضہ ہے کیونکہ غیر مسلم جزیہ قبول کر کے قتل سے محفوظ رہتے ہیں، یہ وہی خیال ہے جس کی بنیاد پر لین پول نے اؤرنگ زیب میں اور جدو ناتھ سرکار نے تاریخ عالمگیر میں جزیہ کو (...) کہا ہے لیکن درحقیقت اس خیال کی کوئی اصل نہیں شمس الائمہ سرخسی نے اس کو نقل کر کے خود تردید فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں،

ثبوت الحقن لیس بالمال، بل بالعدم او علۃ الاباحۃ وھو القتال،	قتل سے محفوظ رہنا مال کی وجہ سے ثابت نہیں ہوا، بلکہ (خون) مباح ہونے کی علت یعنی لڑائی کے نہ ہونے کی وجہ سے (ثابت) ہوا ہے،
(مبسوط ص ج ۱۰)	

دوسری جگہ فرماتے ہیں،

ولا ھو بدل عن حقن الدم، لان الآدمی فی الاصل محقون الدم، والاباحۃ بعارض القتال فاذا زال ذالك بعقد الذمۃ عاد الحقن	اور نہ وہ (محصول) حفاظتِ خون کا بدلہ ہے، کیونکہ آدمی درحقیقت خون (جان) کے لحاظ سے محفوظ پیدا کیا گیا ہے یعنی اوس کو مارنے کا کسی کو حق نہیں) اور (خون کا) مباح ہونا لڑائی پیش آنے کے سبب سے ہوتا ہے پس

الاصلی (صفحہ ج ۱۰)

جب یہ عارض (لڑائی) ذمہ کے معاہدہ کے سبب سے دور ہو جائے، تو حق اصلی (جان کے محفوظ رہنے کا اصلی حق) واپس آجائیگا۔

جزیہ جان و مال کا محصول ہے؟ یہ خیال بہت قدیم ہے کہ جزیہ جان و مال کا محصول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ جان اور مال سے سلطنت کی امداد کرنے کے بجائے اس کو ایک خاص محصول رعایا ادا کرتی ہے، اور حفاظت کا کام فوج کے متعلق ہو جاتا ہے منو شاستر (باب ۸ دفعہ ۳۳) سے ہندوستانیون کا، اور نوشیروان کے فرمان (مندرجہ طبری ص ۹۶۰-۹۶۱ ج ۲) سے ایرانیون کا جزیہ کے متعلق یہی خیال معلوم ہوتا ہے، مسلمانون مین قرن اول کے بعض حضرات مثلاً حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ نے اور فقہار مین مرغینانی (سنہ ۵۹۳ھ) نے ہدایہ مین اور ابن نجیم (سنہ ۹۷۰ھ) نے البحر الرائق مین اُس کو ظاہر کیا ہے کہ غیر مسلمون کا جزیہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا محصول ہے،

تعجب ہے کہ سر جدو ناتھ سرکار اس کو جدید خیال کہتے ہین[۱] اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ ۱۸۵۵ء (سنہ ۱۲۷۲ھ) تک جزیہ خود ٹرکی مین مذہبی آزادی کا محصول سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد فوجی خدمت سے آزادی کا معاوضہ قرار پایا، لیکن اُن کو معلوم نہین کہ جس جدید مصنف (غالبًا علامہ شبلی مرحوم) کی طرف وہ اس نظریہ کو منسوب کر رہے ہین، اس سے بہت پیشتر پہلی صدی ہجری مین خود صحابہ کرام اور چھٹی صدی ہجری کے بعض مشہور فقہار کا یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے، رہا مذہبی آزادی کا معاوضہ ہونا تو یہ اکثر فقہار کا جزیہ کے متعلق خیال نہین ہے، اور نہ اس کو کوئی خاص وقعت علمی طور دی گئی ہے،

جزیہ کفر کا محصول ہے امام ابو بکر جصاص (سنہ ۳۷۰ھ) نے احکام القرآن مین قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ

---

[۱] تاریخ عالمگیر، حاشیہ ص ۲۷۴ ج ۳،

مازری اندلسی (م ۵۴۳ھ) نے جو ابن العربیؔ کے نام سے مشہور ہیں، احکام القرآن میں، مرغینانی (م ۵۹۳ھ) نے ہدایہ میں، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ) نے مدارک التنزیل میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جزیہ کفر کا محصول تھا، یا بالفاظ دیگر مذہبی آزادی کا معاوضہ تھا لیکن اس کا ثبوت قرآن مجید یا حدیث سے نہیں مل سکتا،

جزیہ مکان کا محصول ہے شمس الائمہ سرخسی ۴۸۳ھ نے مبسوط میں، اور محمد بن احمد شربینی خطیب (موجود ۹۶۸ھ) نے تفسیر سراج المنیر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جزیہ سکونت کا معاوضہ ہے، اس طرح اس کی حیثیت کرایۂ مکان یا محصول مکان (House - Tax) کی ہے، مبسوط میں اس کو بعض کا قول لکھکر اس طرح تشریح کی گئی ہے،

قد قیل انہ بدل من السکنیٰ	بعض نے کہا ہے کہ وہ (جزیہ) سکونت
لانہ مع الاصرار علی الکفر	کا بدلہ ہے، کیونکہ وہ (ذمی) کفر پر قائم رہ
لا یکون من اھل دار الاسلام	کر دار الاسلام کے (اصلی) باشندوں میں
اصلاً ولا یمکن من السکنیٰ	کبھی شامل نہیں ہو سکتا، اور دوسرے
فی دار الغیر الا بکراء،	کے گھر میں سکونت کرایہ کے بغیر ممکن
(صفحہ، ج ۱۰)	نہیں،

پھر آگے چل کر اس خیال کی تردید کرتے ہیں،

لانہ بعقد الذمۃ صار من اھل	کیونکہ وہ ذمہ کا معاہدہ کرکے ہمارے گھر
دارنا، فانما یسکن دار نفسہ	والوں میں سے ہو گیا، تو وہ اپنے گھر میں
ولا یسکن ملک نفسہ حقیقۃ	رہتا ہے، البتہ اپنی ملکیت میں دراصل
وقولنا دار الاسلام نسبۃ	نہیں رہتا، (کیونکہ اب اصلی ملکیت اسلام

للولایۃ ،	کی ہو گئی ہے) اور ہمارا قول دارالاسلام
(صفحہ ج ۱۰)	ولایت (تولیت) کی نسبت کے سبب ہے ،

اس تردید کے الفاظ پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ امام سرخسی غیر مسلم آبادی کو اس سے بلند سمجھتے ہیں کہ اس کو سلطنتِ اسلام کا کرایہ دار فرض کریں ،

جزیہ امن کا محصول ہے امام ابو حیان غرناطی اثیر الدین ابو عبد اللہ محمد بن یوسف حیانی (م ۷۴۵ھ) نے تفسیر البحر المحیط میں لکھا ہے کہ جزیہ امن کا معاوضہ ہے ،

جزیہ کسی چیز کا محصول نہیں بلکہ مالی امداد ہے ان نظریات کے نقل کرنے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچے ہیں، جہاں دراصل غیر مسلم رعایا کی صحیح منزلت اور جزیہ کی اصل حقیقت نظر آتی ہے شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) جنھوں نے ۳۰ جلدوں میں المبسوط لکھی ہے ، جو فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ہے ، جزیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا محصول نہیں ہے ، بلکہ مالی امداد ہے ، ان کے الفاظ یہ ہیں ،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ (ص ، ج ۱۰)	کیونکہ جزیہ مالی امداد ہے ،

دوسری جگہ لکھتے ہیں ،

فاذا ثبت انہ لیس بعوض عن	جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ (جزیہ کا
شیئ عرفنا انہ صلۃ ،	مال) کسی چیز کا عوض نہیں ، تو ہم نے
(ص ۸۲)	سمجھا کہ وہ (مال) صلہ ہے ،

ان الفاظ کو پڑھو اور بار بار پڑھو کیا یہ وہی جزیہ ہے جس کو یورپ اور ہندوستان کے غیر مسلم حد درجہ ذلت آمیز اور نفرت انگیز خیال کرتے ہیں ، اور جس کے باعث ان کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی طرف سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے ، محکوم قوموں کے محصول کا مالی امداد نام رکھنا فاتح و مفتوح کی

اس مساویانہ حیثیت کو نمایان کرتا ہو جس کی نظیر خود اعتراض کرنے والون کی قومی تاریخون مین بھی نہین مل سکتی،

جزیہ ایک خاص عطیہ ہو، شمس الائمہ سرخسی کا نظریہ بیان کرنے کے سلسلہ مین اب یہ دکھانا ضروری ہو گیا ہو کہ مشرق کی طرح مغرب بھی غیر مسلمون کا اسی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا تھا، اور سلطنت اسلامیہ کے پورے طول وعرض سے جزیہ کے متعلق ایک ہی آواز آتی تھی، ابن العربی اندلسی قاضی ابو بکر معافری (۵۴۳ھ) نے جزیہ کو ایک مخصوص عطیہ لکھا ہے، جس سے ان شریفانہ جذبات کا پتہ چلتا ہے، جو غیر مسلم رعایا کے احترام کے متعلق اسلامی قانون سازون اور قانون دانون کے دلون مین موجود تھے، اور جنھون نے فقہ (قانون) کی کتابون مین جگہ پا کر عملی حیثیت اختیار کر لی تھی، کیا وہ محصول جو مالی امداد ہو "عطیہ خاص" ہو کسی شخص کی دل آزاری یا ذلت کا باعث ہو سکتا ہو؟ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیبے است
گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است

جزیہ نشان فرمانبرداری ہو اس حد تک لکھنے کے بعد اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ جزیہ فرمان بردار رعایا ہونے کی ایک علامت ہے، آج بھی جو رعایا محصول ادا نہین کرتی، باغی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے زمانہ مین جو لوگ جزیہ نہین دیتے تھے، حربی (جنگجو) سمجھے جاتے تھے، اور جزیہ ادا کرنے والے سلطنت کے مطیع اور فرمانبردار متصور ہوتے تھے شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہین،

لان الذمی ملتزم احکام الاسلام فیما یرجع الی المعاملات،	کیونکہ ذمی اسلام کے ان احکام کا پابند ہوتا ہے، جو معاملات سے متعلق ہین،

(مبسوط ص ۸۴ ج ۱۰)

(باقی)

تاریخ بابل

سلسلۂ اعلام القرآن

از

مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

"مولانا ابوالجلال صاحب ندوی اعلام القرآن کے نام سے جو کتاب لکھ رہے تھے، افسوس ہے کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے، لیکن اس کے متفرق اجزاء لکھ گئے ہیں، ان میں سے بعض معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں جن کو اہل علم نے بہت پسند کیا، اور ان کو جاری رکھنے کی فرمایش کی اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ٹکڑے ہم شائع کرتے رہیں گے، "م"

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں میں سے ایک کا نام اجیاہ تھا، سفر ملوک میں اسی کو نبی بتایا گیا ہے، حضرت سلیمانؑ کی زندگی ہی میں اُس نے اُن کے ایک نوکر کو حضرت سلیمانؑ سے ان پر کفر و شرک کا الزام لگا کر بہکایا، کہ ان کے خلاف بغاوت کر دو، یربعام نے بغاوت کی، ناکام رہا اور مصر بھاگ گیا، ان کی وفات کے بعد وہ مصر سے واپس آیا اور بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو یربعام نے خاندان سلیمان سے توڑ لیا، ۵ برس بعد فرعون مصر شیشق نے یروشلم پر چڑھائی کی، اور اس کو لوٹ مار کر چلا گیا، اس سے یربعام کی حکومت مستحکم ہو گئی، کچھ عرصہ بعد یربعام نے اپنے زیر اثر بنو اسرائیل کو بہکا کر پھر سے دین سامری کو رواج دیا اور بنو اسرائیل کا یہ طبقہ بچھڑا پوجنے لگا،

یہ واقعہ سفر ملوک ۱ (۱۱: ۲۹، ۴۰ و ۱۲: ۱-۲۰، ۲۰ و ۱۴: ۳۰، ۲۵) اور سفر ایام میں بہ تشریح مذکور ہے۔

عرب کے اندر آغاز اسلام میں ایسے بنی اسرائیل بھی تھے جو حضرت سلیمانؑ کی بابت انبیاء کے فتوی پر ایمان رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض کرتے ہوئے انبیاء کو نبی ماننے والے چند اہل کتاب نے کوئی ایسی بات کہی جس کے جواب میں خدا نے فرمایا،

وَلَمَّا جَاءَ هُمْ رَسُولٌ مِنْ	اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ	تعالی کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں
نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا	اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے، ان اہل
الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَاءَ	کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب
ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ	اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا، جیسے گویا
وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَى مُلْكِ	اصلا علم ہی نہیں اور انھوں نے ایسی چیز
سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ	کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے
الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ	شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی
السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ	سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام
بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ،	نے کفر نہیں کیا، مگر شیاطین
(بقرہ ۱۲: ۱۰۲)	کفر کیا کرتے تھے، اور حالت یہ
	تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے
	تھے، اور اس کا بھی جو ان دونوں فرشتوں
	پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام
	ہاروت و ماروت تھا،

حضرت سلیمانؑ کے حالات سفر ملوک اور سفر ایام کے مؤلفوں نے ناتن نبی (؟) کی کتاب اور سیلانی

اخیاء کی پیشین گوئیوں اور عبد ونیکی کی روایتوں کی کتاب سے نقل کئے ہین (سفر ایام ۹ - ۲۹) یہ کتابین
اب ناپید ہین، حضرت سلیمانؑ پر اس کتاب کے کفر کا فتوی در اصل سیلانی اخیاء کی کتاب کا اعادہ تھا، یہ کتاب
نزول قرآن کے زمانہ تک موجود تھی، اور کلام اللہ سمجھکر اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اسی کتاب کا ذکر قرآن
کی اس آیت مین ماتتلوا الشیاطین کے لقب سے آیا ہے، اس آیت مین خدا نے بتایا کہ سلیمان علیہ السلام
نہین بلکہ اُن پر کفر کا فتوی لگانے والے شیاطین خود کافر تھے، اُن کے کافر ہونے کی دلیل یہ ہو کہ یہ لوگ
ایک دوسرے کو سحر کی اور ہاروت اور ماروت کے لٹریچر کی تعلیم دیتے تھے،

ہاروت اور ماروت کی ہستیون اور ان کے لٹریچر پر بحث کا یہ محل نہین ہے، یہ فرشتے کہلانے والے اشخاص
بابل کے باشندے تھے،

وجہ تسمیہ | بابل کو یہ نام کیون دیا گیا ؟ اس سوال کے جواب مختلف دیئے گئے ہین، یاقوت نے
معجم البلدان مین لکھا ہے،

قال ابو المنذر ھشام بن محمد	ابو المنذر ہشام بن محمد نے کہا کہ ……
….. ومدینته بابل بناھا بیوراسب	بابل کا بانی بیوراسب جبار تھا، بابل کی
الجبار واشتق اسمھا من اسم المشتری	پرانی زبان مین مشتری کو بابل کہتے تھے
لان بابل باللسان البابلی الاول اسم	اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا،

بانی بابل کا نام بیوراسپ غالباً ایران کی کہانیون سے ماخوذ ہے، پرانی کلدانی مین بابل مشتری
کو کہتے تھے یا نہین، اس کا ہم کوئی فیصلہ نہین کر سکتے، یہ بات یاقوت نے تذکرہ بابل مین لکھی ہے،
فسطاط مصر کا ایک زمانہ مین کسی وجہ سے بابلیون نام تھا، بابلیون کے ذکر مین یاقوت نے لکھا ہو،

ذکر اھل التوراۃ ان مقام آدم	اہل توراۃ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام
علیہ السلام کان ببابل فلما قتل	بابل مین رہتے تھے جب قابیل نے ہابیل

قابیل هابیل مقت آدم قابیل	کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام قابیل سے
فهرب قابیل باهله الی الجبال	نفرت کرنے لگے، اور قابیل پہاڑون کی
عن ارض بابل فسمیت بابل یعنی	طرف بھاگ گیا، اس لئے اس کا نام بابل
الفرقه	یعنی "جدائی" رکھا گیا،

معلوم نہین اہل تورات کا یہ قول یاقوت نے کہان سے نقل کیا، سفرِ تکوین مین یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے، اُن کے یہان آنے سے پہلے

وهی کل ارض تسفتیم احد یعو	ساری زمین ایک ہونٹھ اور ایک
دوبریو احدیهو،	بولی تھی،

یہان پہنچنے کے بعد ان لوگون نے ایک برج بنانا چاہا، خدا کو یہ ارادہ ناگوار گذرا اُس نے خدا نے ان کی بولی بات مین اختلاف ڈال کر ان کو تمام روے زمین مین پراگندہ کیا، سووے اس شہر بنانے سے باز رہے" یہ واقعہ نقل کرکے سفرِ تکوین کے جامع نے لکھا ہے کہ

"اس لئے اس کا نام بابل (اختلاف) پڑا کیونکہ خداوند نے وہان ساری زمین مین کی زبانون مین اختلاف (بلبل) ڈالا، اور وہان سے اُن کو تمام روے زمین پر پراگندہ کیا، (تکوین ۱۱: ۱ تا ۹)

یاقوت نے ابوبکر احمد بن مروان المالکی الدینوری کی کتاب المجالس کے حوالہ سے تقریبا یہا قصہ حضرت انس بن مالکؓ کی طرف منسوب کیا ہے جس مین انھون نے اخیر مین فرمایا ہے کہ پھر لوگ بہتر زبانین بولنے لگے،

وتبلبلت الالسن فسمیت	اور زبانین گڈمڈ ہو گئین، اس لئے اس
بابل،	کا بابل نام پڑا،

کسی عمارت کی تعمیر اختلافات السنہ کا سبب نہیں ہو سکتی، جس عمارت کی تعمیر کے عزم کا توراۃ میں ذکر ہے، اور بتایا گیا ہے کہ بولی بات میں اختلاف کی بدولت وہ اس عمارت اور شہر کی تعمیر سے باز رہے، بعد میں ان لوگوں میں جو ہیں رہ گئے، اسے بنایا، اس عمارت کا نام سمیری زبان میں تنتر کی کا دنجر (دیوتا کا آستانہ) تھا، اسی کا ترجمہ یہاں کے سامی باشندوں نے باب ایل (خدا کا پھاٹک) اور باب ایلون (خداؤں کا پھاٹک) کیا، جو مختصر ہو کر بابل ہو گیا، یہ پہلے اسی برج کا نام تھا، جسے تورانی بیان کے مطابق تعمیر کرنے کے عزم کی بنا پر خدا نے وہاں والوں کی بولی بات میں اختلاف ڈالا، پھر تدریج یہ نام اس شہر کا جس میں یہ عمارت تھی، اور اس کے بعد اس پورے علاقہ کا نام ہو گیا، جس پر شاہانِ شہر بابل حکومت کرتے تھے، توراۃ میں جس قسم کی بولی بات کے اتحاد اور اختلاف کا ذکر ہے، وہ مذہبی کلمہ کا اتحاد اور مذہبی کلمہ کا اختلاف ہے، اس بولی بات کے اختلاف کی نظیر بابل کے دو بادشاہوں کے ناموں میں ملتی ہے،

ایک شاہ بابل کا نام تھا ساموابی یعنی میرا باپ سام ہے، اس نام میں کوئی بات ایسی تھی جس سے ایسے نام خدا کو ناپسند تھے، چنانچہ توراۃ کے بیان کے بموجب حضرت ابراہیمؑ کا نام جو اُن کے باپ نے رکھا تھا، وہ ابی رام تھا، (میرا باپ رام ہے) خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ یہ نام بدل دو، اور آج سے تمھارا نام ابی رام نہیں، بلکہ اب راہام ہوگا، حضرت ابراہیمؑ کا نام جس سبب سے خدا نے بدلوایا، اس کو سمجھنے کے لئے حضرت یرمیاہ کے صحیفہ میں خدا کا ارشاد پڑھو،

"جس طرح چور جب پکڑ لیا جاتا ہے رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانا اور ان کے بادشاہ اور امیر اور کاہن اور جھوٹ موٹ کے نبی رسوا ہونگے، جو کاٹھ سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے ... پتھر سے کہ تو نے مجھے جنا، انھوں نے میری طرف رُخ نہیں بلکہ پشت پھیر رکھی ہے، مگر مصیبت کے وقت کہیں گے اُٹھ اور ہمیں بچا، (یرمیاہ ۲: ۲۶، ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابی رام اور ساموا بی جیسے نام رکھنے کا مطلب اس عقیدہ کا اعلان تھا، کہ راموا یلو (رام ایک خدا ہے) اور ساموا یلو (سام ایک خدا ہے) اب ساموا بی کے نام کا مطلب سمجھنے کے بعد اس کے ایک جانشین کا نام سنو، ساموا یلو (سام خدا نہین ہے) اس قسم کے بہت سے نام باشندگان بابل کے پیش کئے جا سکتے ہین مثلاً بال بالی (بعل خالق ہے) اور یا بنی (یا خالق ہے) ان نامون سے ظاہر ہے کہ بابل مین جا کر بسنے کے بعد وہان والون مین جس قسم کا اختلاف اُن کی بول چال مین پڑا تھا، وہ مذہبی اختلاف تھا، اور اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے بابل کو باب ایل نہ ماننے والون نے اسے بدل کر بیل بنا دیا، اور اب اس نام کے معنی طرح طرح کی بولی بولنا ہو گئے، بابل کی توراتی وجہ تسمیہ کو جدید تحقیقات کی روشنی مین غلط نہین کہنا چاہئے، بلکہ اسے ترمیم اسم کی وجہ قرار دینا چاہئے، بابل کے مندر کو باب ایل تسلیم کرنا سفر تکوین کے جامع کے لئے ناممکن تھا اسلئے اختلاف کلمات کے مطلب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس شہر کے نام مین ترمیم کر دی گئی،

محل وقوع | بابل عراق کے ایک شہر کا نام ہے، عراق دریائے دجلہ و فرات کی درمیانی وادی کا نام ہے، عرب کے نقشہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طول بلد ۴۸، ۵۰ اور عرض بلد ۳۰ تک خلیج فارس، ایران و عرب کے درمیان گھسی ہوئی ہے جس مین دریائے دجلہ و فرات گرتے ہین، جو واسط کے پاس پہنچکر ایک ہو جاتے ہین، واسط سے شمال کی جانب طول بلد ۴۵ اور عرض بلد ۳۲ کے پاس فرات کے مغربی کنارہ پر ایک مقام واقع ہے، جو تل نمرود کہلاتا ہے، اسی مقام کا نام بابل تھا، جسے عرصہ دراز کی بول چال نے دوآبہ دجلہ و فرات کے ثلث زیرین کا نام بنا دیا تھا،

باشندگان بابل | بابل کی وجہ تسمیہ مین ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہی مقام آدم کا ابتدائی مسکن تھا، جہان سے قابیل چال خود کو بھاگا تھا، یہ قول قابل استناد نہین ہے، یاقوت نے لکھا ہے،

ویقال ان اول من سکنھا نوح ۔ اور کہا جاتا ہے کہ بابل مین سب سے پہلے

علیہ السلام وھو اول من   حضرت نوح آباد ہوئے، اور یہاں وہ
عمرھا وکان نزلھا بعقب الطوفان   طوفان کے بعد آئے،

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا نام جودی ہے، اور توراتی نام اس پہاڑ کا ارارا ط ہے، آشوری روایات کے مطابق اس پہاڑ کا نام نسر تھا، (دیکھو بحث جودی) حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کشتی اسی پہاڑ کے آس پاس بسے ہونگے، یہ آرمینیہ میں واقع ہے، حضرت نوحؑ کا بابل میں آباد ہونا مشکل سے یقین کیا جاتا ہے، مگر آشوری افسانہ ازدوبار میں جس کا تذکرہ قصہ نوح میں کیا گیا ہے، طوفان سے پیشتر حضرت نوحؑ کا آشوری نام تاسیت ناپش تم (سشیث کا مل) تھا، شہر شوریاک کے باشندہ، ور اُبارا توتو (قوم اُبار) کے فرزند تھے، یہ شہر خود اس فسانہ کے مطابق "ساحل فرات" پر واقع تھا، غالباً اسی روایت نے بعد میں یہ صورت اختیار کر لی کہ حضرت نوح کا مسکن بعد طوفان بابل میں تھا، توراۃ کے بیان کے مطابق بنی نوح جو اس دیار میں بسے یہاں کے قدیم باشندے نہیں تھے، بلکہ وہ اس دیار میں قدم سے آئے،

"اور جب وے قدم سے روانہ ہوئے، تو ایسا ہوا کہ انھوں نے سنعار کے ملک میں ایک میدان پایا، اور وہیں رہ پڑے، (تکوین ۱۱: ۲)

اسی ملک شنعار کے اس حصہ کا جس میں بنی نوح یا بالفاظ دیگر اسلاف ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے، دوسرا نام بابل ہے، (تکوین ۱۱: ۹)

توراۃ کی اس آیت میں میدان کی بجائے اصل عبرانی لفظ "قاعہ" ہے، قاعہ چٹیل میدان کو کہتے ہیں، جہاں نہ آدم ہو نہ آدم زاد، اور وہاں نہ درخت ہو اور نہ کوئی اور سایہ دار چیز، بنی نوح یا اسلاف ابراہیم علیہ السلام یہاں ایسے زمانہ میں آئے جب یہ علاقہ غیر آباد تھا،

حضرت ابراہیم کے اسلاف میں ایسے افراد بہت گذرے ہیں، جو اپنے نام "ساموابی" جیسے رکھتے

تھے، اس لئے وہ بنوسام کہلائے، ان لوگون کے یہان آنے کے بعد لیکن اُن کے برسرعروج آنے سے پہلے
ایک اور قوم اس دیار مین آبسی جس کی زبان اور طرز زندگی کے علاوہ صورت شکل بھی مختلف تھی، آثار
باقیہ کے علمار نے اس قوم کو سمیریون کا نام دیا ہے، سفر تکوین کا جامع اور اس کے اتباع مین بعد
کے عرب مورخین تمام اقوام عالم کو حضرت نوحؑ کے تین بیٹون کی اولاد بتاتے ہین جن مین سے ایک تو
بنوسام کا مورث تھا سام، ایک بیٹے کا نام حام تھا، دراصل یہ نام مصری لفظ خم کی عبرانی صورت ہے
خم سرزمین مصر کا نام تھا، کیونکہ وہان کی زمین سیاہ ہے، اور خم کے معنی ہین کالی مٹی، رفتہ رفتہ یہ
اہل مصر اور ان کے ہم نسلون کے مورث اعلیٰ کا نام ہوگیا، تورات کے بیان کے مطابق بنوحام بھی
ابتدا مین سرزمین بابل مین رہتے تھے، پھر مصر وغیرہ مین جا بسے، تیسری قوم کا تورانی نام بنویافث ہے، وہ
بھی ابتدا مین بابل مین رہتے تھے، ان بابلی بنویافث کو ہم آثار قدیمہ کی سمیری قوم سے تطبیق دیسکتے ہین
حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ شنعار مین جو کہ بعد مین ارض بابل یا کلدانیون کی سرزمین کہلایا، ابتدا
مین تین قومین آباد تھین (۱) بنویافث، (۲) بنوحام، (۳) بنوسام

لیکن بابلی آثار قدیمہ کے علمار اس علاقہ کی دوہی قومون کو جانتے ہین جن مین سے
ایک سومیری قوم تھی اور ایک سامی، لیکن توراۃ کے بیان کو بالکل بے اصل نہین کہا جا سکتا،
اور کی حکومت کے قیام سے پہلے کش نام ایک شہر مین میسلیم نام ایک فرمانروا تھا جس کے جانشینون
کا راج عروج و زوال کے ساتھ سنہ ۲۸۰۰ سے سنہ ۲۱۰۰ ق م تک قائم رہا، یہ خاندان سامی النسل تھا، قائم سنہ ۲۵۰۰
سنہ ۲۱۰۰ ق م تک شہر سرپلا نام ایک شہر مین جس کو جیدسو، تن جرسو، اور سنجر بھی کہا جاتا تھا، ایک بادشاہ
اور کا جا اور اس کے جانشین راج کرتے رہے، ان بادشاہون کو سیمرین قوم سے بتایا گیا ہے، میسلیم کے
برسرعروج آنے سے پہلے سنہ ۲۵۰۰ ق م مین ایک شاہ کنجی گذرا ہے، جس نے میسلیم کے پیش رو حکام کش
کو شکست دیکر ان کا مال غنیمت آثار قدیمہ کی شہادت کے مطابق زمینون کے خداوند "بابل" کی

خدمت مین نذر پیش کیا تھا، اس بادشاہ کی بابت ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ کی پہلی جلد کے مولف نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس یہ بتانے کے لئے مواد موجود نہین ہے کہ وہ کس قوم سے تھا سامی تھا یا سمیری تھا،

لیکن اس کا نام تھا، ان شنگ کوش انا ، جو چار لفظون کا مجموعہ ہے،

(۱) شنگ یا سنگ = سردار (۲) انا = آسمان رتبہ (۳) ان - آقا، (۴) کوش = یہ نام توراتی کوش بن حام کے نام سے ملتا جلتا ہے، جس کے فرزند نمرود کی بابت توراة مین ہے، کہ

"اس کی حکومت کی ابتدا شنعار کی سرزمین مین بابل ارک، اکاد اور کلنہ مین ہوئی مگر پھر وہ اشور کو نکل گیا، اور نینوی، احاب، عبرادسکلح کو بنایا، اور نینوی اور کلح کے درمیان اس کی تعمیر کی، جو بڑا شہر ہے، (تکوین ۲۰: ۱۰ تا ۱۲)"

چونکہ بنو حام بالکل ابتدائی زمانہ مین اس دیار سے نکل گئے تھے، اسلئے اُن کے نشانات یہان نہین ملتے، مگر واقعہ یہ ہو کہ اس دیار مین پہلے تین قومین آباد تھین، ان تینون کو سفر تکوین کے جامع نے حضرت نوحؑ کی اولاد بتایا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ کہان تک درست ہو کہ تمام زبانین بولنے والی دنیا بھر کی تمام قومین حضرت نوحؑ کی اولاد ہین،

بنو سام یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے تھے، قدم کے لغوی معنی سامنے کے ہین، مصر والے مشرق کو قدم کہتے تھے، توراة پر مصری محاورہ کا فی اثر ہے، قدم توراة مین خصوصیت کے ساتھ عرب کا نام ہے دوآبہ فرات وخابور کے علاوہ پورے عرب کو بشمول آرمینیہ جہان دجلہ و فرات کے سرچشمے واقع ہین، توراة مین قدم کہا گیا ہے جس قوم کو سمیری کہا جاتا ہے ہمارے خیال مین اسی کا قرآنی نام یاجوج اور ماجوج ہے،

افسانوی تاریخ | قرآن مجید کی جس آیت مین بابل کا ذکر ہے نہ صرف اُس کے بلکہ قرآن مجید کے

اکثر قصوں کے فہم کے لئے ابتدا سے بنی اسرائیل کی اسیری بابل کے عہد تک دوآبہ دجلہ و فرات کی
اجمال کے ساتھ پوری تاریخ دینا زیادہ مفید ہوگا، ہر قوم خصوصاً ایسی قوم کی تاریخ جس کا زمانہ عروج
فن تحریر کی ایجاد سے پہلے گذرا ہو خلافِ عقلی کتھاؤں سے شروع ہوتی ہے، ان کتھاؤں مین زمانہ
دراز کی بھول بھلیون اور شاعروں کی بلند پروازیون نے بہت مشکلات پیدا کر دی ہین لیکن ہر ایک
کتھا اپنے اندر قدیم تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے،

اہل بابل کی ایک کتھا کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا مین دو ہستیان تھین جن کے نام ہین اپسو اور تیامت
یہ دونون میان بی بی تھے. ان سے لخمو اور لخامو پیدا ہوئے، جو انشر اور کیشر کے والدین تھے، ان دونون
نے انو، بل اور ایا وغیرہ دیبی دیوتاؤن کو جنم دیا، ان دیبی دیوتاؤن سے ناراض ہوکر تیامت نے
چند شریر ہستیون کو چن کر اُن کا امیر کنگو کو مقرر کیا، اور کنگو کی فوج دیوتاؤن سے ان کی خدائی چھیننے
کو چلی، اس کی خبر انشر کو ہوگئی، اس نے اپنے ایلچی جاجا کو بھیج کر دیوتاؤن کو متنبہ کیا، چنانچہ مردوک
اُن سے لڑنے کو اترا اور اس نے تیامت کو چیر کر دو حصے بنا دیئے جن سے آسمان اور زمین، پھر سیارے
اور انسان وجود پذیر ہوئے، (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ا ص ۵۲۰)

اس افسانہ کے اندر قدیم تاریخ موجود ہے، قدیم زمانہ مین عرب کو خالدیہ والے ماتی تیامت،
(ارض البحر) کہتے تھے، لخم عرب مین ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہین، اس لئے ماتی تیامت یعنی ارض البحر
کے قدیم باشندے لخم کہلائے، یہ بنو لخم جب اس سرزمین مین پہنچے، جس کا قرآنی نام بابل ہے، تو وہ
انشر اور کیشر بن گئے، یہان انھون نے انو، بل اور ایا وغیرہ بہت سے دیوتاؤن کو جنم دیا، اور وہ
مشرک اور متعدد دیوتاؤن کے قائل ہوگئے، اس وقت کنگو نام ایک رئیس کے ماتحت تیامت یعنی
ارض البحر کے رہنے والے ایک دوسرے گروہ نے دیوتاؤن کی خدائی سے محروم کرنے کی جد و جہد شروع
کی، ان دونون گروہون مین جنگ ہوئی، ایک گروہ کا رئیس کنگو تھا، دوسرے کا مردوک، مردوک

کے گروہ مین ایک تیسرا گروہ بھی شامل تھا جس کا نام (Gaga) ہے یہ نام توراتی جوج کے نام سے ملتا جلتا ہی، جوج کا نام قرآن مین یاجوج اور آشوری کتبون مین اجی جی ملتا ہے، اس جنگ مین غلبہ اس گروہ کو ہوا، جس کو جوج کی تائید حاصل تھی، اور مردوک نے پھاڑ کر تیامت کے دو حصے کر دیئے، ان مین ایک حصہ آسمان (سام) اور دوسرا حصہ زمین (حام) کے نام سے موسوم ہوا،

اثری تاریخ | یہ تاریخ اس زمانہ کی ہے، جب فن تحریر ایجاد نہین ہوا تھا، اس کی ایجاد کے بعد ہم کو اس دیار مین دو قومین ملتی ہین جن مین سے ایک کو آثار قدیمہ کے علماء نے سمیری قوم کا نام دیا ہے کیونکہ قدیم شاہان عراق جو شمالی اور جنوبی دونون حصون پر حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو "اکاد اور سومیر کا بادشاہ" کہتے تھے، اور دوسرے گروہ کو بنو سام نام دیا گیا ہے جن کی بولی عربی اور عبرانی وغیرہ زبانون کے مطابق تھی،

انسانوی تاریخ مین سمیری قوم کا ذکر جا جا کے نام سے آیا ہے، جو توراۃ کا جوج اور قرآن کا یاجوج ہے اس زمانہ مین یہ قوم لخم اور کنجہ کے مقابل غیر اہم تھی لیکن اثری زمانہ مین جو فن تحریر کی ایجاد کے بعد گذرا ہے ابتدا مین یہی قوم سب سے اہم تھی، اور سب سے پہلے اسی قوم نے اس دیار کے متعدد شہرون مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم کین، پھر کچھ عرصہ بعد سامی زبانین بولنے والون نے بھی حکومت اور اقتدار مین حصہ بٹانا شروع کیا، اسی زمانہ کی بابت توراۃ مین ہے کہ

عابر سے دو فرزند پیدا ہوئے ان دو مین سے ایک کا نام فلج رکھا، کیونکہ اس کے زمانہ مین زمین بانٹی گئی، اور دوسرے کا نام یقطن رکھا گیا،

سب سے قدیم سامی بادشاہ جس نے ارض عراق مین اپنی حکومت قائم کی تھی، حال کی تحقیقات کے مطابق کش کا شہریار سیلم تھا، اس کا زمانہ اندازاً ۲۸۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے، اس کے جانشینون کی حکومت عروج و زوال کے ساتھ ۲۳۰۰ ق م تک قائم رہی، پھر پورے علاقہ مین دجلہ و فرات

پرایک دوسرے سامی خاندان نے قبضہ کر لیا، جس کا مرکز حکومت اکاد تھا، اور اس خانوادہ کے بانی کا نام تھا،

شارجنی سار علی بن اتی بل

اس کو آشوری روایتون کے مطابق سرجون اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ نام توراتی عابر کے پوتے سروج بن رعو کے نام سے ملتا جلتا ہے،

سرجون اکبر کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک شہر سر برلامن پر جس کو جرسو، بن جرسو، اور سنجر بھی کہتے تھے، ایک سمیری خانوادہ حکومت کرتا تھا، جس کے قدیم ترین فرمانروا کا نام اور کا جنا ہے، اس کی حکومت مسیلم سے تقریبًا سو برس پہلے قائم ہوئی، اور سرجون اکبر کے زمانہ تک عروج وزوال کے ساتھ قائم تھی، سرجون اکبر کے بعد اُور، اور گوتی نام دو شہرون مین دو اور حکومتین سومیریون کی تھین، خاندان سرجون کی حکومت ضعیف ہو جانے اور ابرخ، اسی س، اور لارسا مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم ہوئین، سنہ ۲۱۰۰ ق م کے قریب ان تمام حکومتون کو ایک نئے خاندان نے جس کے بانی کا نام ساموابی تھا، اور جس کا پایہ تخت شہر بابل تھا، ختم کر دیا، ساموابی کے خانوادہ کو عربی خاندان بتایا جاتا ہے،

اس طرح بابل مین یکے بعد دیگرے سات خانوادون نے ۶۰۰ ق م تک حکومت کی جن مین سے دوسرے خانوادہ کے گیارہ بادشاہون کے نام سومیریون کے سے ہین، اس خانوادہ کے خاتمہ (سنہ ۱۷۰۰ ق م) کے بعد سے سمیری قوم بتدریج اس طرح نابود ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا سراغ نہین ملتا،

سنہ ۱۳۰۰ ق م کے قریب ملک اشور مین ایک اور سامی قوم نے اپنی عظمت و وقار کی بنیاد رکھی قرآن کریم مین قوم یونس کے نام سے اسی قوم کا ذکر آیا ہے، جس کے ایک بادشاہ تغلات پلاسر

(بپلاشور) نے ۶۲۶ ق م مین بابل کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس علاقہ پر خود اپنا راج قائم کرلیا،
۶۲۶ ق م کے بابل کے ایک اشوری گورنر بنو اپل اشور نے بابل مین ایک نئے خانوادہ کی بنیاد
جس کو ۵۳۸ ق م مین ایرانیون نے شکست دیکر اپنے ماتحت کرلیا،

یہ ہے بابل کے اس عہد تک کی مختصر تاریخ جس عہد کے بابل کا قرآن کریم مین ذکر آیا ہے،
بنو اپل اشور (بنو پلا سر) کے فرزند بنو کدرا وسر کا بابل مین بنو کدرصر کے نام سے ذکر آیا ہے، یہ
کدنصر پھر بنوخت نصر، پھر بخت نصر ہوکر عربی تاریخون مین بخت نصر بن گیا ہے، اسی بخت نصر
نہ کی تاریخ بنی اسرائیل کی طرف خدا نے سورۂ بنی اسرائیل کی پانچوین آیت مین اشارہ فرمایا،
ئیل پر بخت نصر نے چڑھائی کی، اور بہتون کو گرفتار کرلیا اور لیجاکر بابل کی سرزمین مین انکو بسایا،
ن کے زمانہ مین اُن کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی، اسی اسیری بابل کے زمانہ مین بنو اسرائیل
، چیزیں سیکھی جس کی بابت قرآن مجید مین ارشاد ہوا ہے کہ

یُعلمون النّاس السحر و مَا انزل علی الملکین ببَابل ھَارُوتَ وَ مارُوت،

اہل بابل کے دین و مذہب اور اُن کے طور طریقہ پر یاجوج و ماجوج، قوم ابراہیم، قوم یونس
نا بنی اسرائیل کے تحت مشرح بحث کیجائے گی،

ارض القرآن حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح
ئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ
تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے،

قیمت :- ہے ۔۔ منیجر

فتاوی بابری

از

جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری

دودمانِ گورگانیہ کے آخری جلیل القدر شہنشاہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کی بہترین علمی مذہبی یادگار فتاوی عالمگیری محتاجِ تعارف نہیں، مقام حیرت ہو کہ اسی خاندان کے عظیم المرتبت فاتح، عدیم المثال سپاہی اور اولوالعزم بادشاہ ظہیر الدین بابر کے عہد کی فقہ حنفی کی ایک تصنیف فتاوی بابری کے ذکر سے تاریخ ادبیات فارسی کی معروف ومعتبر کتب خالی ہیں[1]، اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ مولینا سید احکام اللہ صاحب بخاری امام جامع مسجد، برہان پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں راقم السطور کی نظر سے گذرا، اس مضمون میں اسی تاریخی تبرک کا تعارف مقصود ہے،

مصنف کتاب شیخ نور الدین خوافی کے حالات کتب متداولہ میں نہیں ملتے، نفائس المآثر میں مختصر حالات درج ہیں، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے میری درخواست پر متعلقہ حصہ نقل کرکے ارسال فرمایا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ شیخ زین الدین خوافی کی اولاد میں سے ہیں، سلطان حسین مرزا کے عہد میں انھوں نے ہرات میں نشو ونما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین، محمد

---

[1] معارف فتاوی بابری اگرچہ کمیاب ہے لیکن نایاب نہیں ہے، اور اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، پٹنہ لائبریری میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے اور اس کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں مصنف کے ساتھ تصنیف کے بھی مختصر حالات ہیں، دیکھو کیٹلاگ مخطوطاتِ فارسی پٹنہ لائبریری، ج ۱۴ ص ۱۶۰

کے شاگرد تھے، جو ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد میں سے تھے۔

"از ابنا حضرت شیخ زین خافی است، بغایت خوش طبع و فہم عالی داشته، شیخ نور الدین و شیخ زین[1] به وفور کمالات ممتاز اند، ایشان در زمان سلطان حسین مرزا به ہرات نشو و نما یافته، به تحصیل فنون و فضائل کمال شناخته اند، شیخ نور الدین شاگرد شیخ الاسلام[2] است که از ابنا مولانا سعد الدین تفتازانی است"۔

مرزا علاؤ الدین قزوینی نفائس المآثر میں رقمطراز ہیں کہ چودہ سال کی عمر میں سلطان حسین مرزا کے مدرسۂ ہرات میں صغر سنی، جمال اور سادہ روئی کے باوجود مسند درس پر فائز ہوئے، دانش مندی اور مولویت میں وہ رتبہ اور استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل اُن کی مجالسِ افادات سے مستفید و بہرہ مند ہوتے تھے۔

"در صغر سن و عنفوانِ شباب رتبۂ مولویت و دانش مندی بجائے رسانیده که دانشمندانِ آن زمان از مجالس افادتش مستفید و بہره وری بودند"۔

"در زمان شاہی بیگ خان اور ادر چہارده سالگی با وجود سادہ روئی و جمال مدرس مدرسۂ سلطان حسین مرزا ساخته بودند"

شیخ مذکور کے کمال علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"از غایت جودتِ طبع و دقت ذہن در اوانِ شباب از تحصیل علوم عقلی و نقلی فراغت یافته، گوش ہوش تلامذه از نتائج بحر خاطر فیض مآثر به لآلی نکاتِ دقیقه گران بار گشت، و پایۂ قدر و منزلتش در سلک زہد و تقوی و تجرد و فنون و علم نحو می از امثال و اقران در گذشته"

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحث و مناظرہ میں شیخ موصوف کا پلہ اکثر بھاری رہتا تھا،

---

[1] بابر کی تزوک میں کے شارح شیخ زین کے حالات نرم تمہید میں آ رہے ملاحظہ کیجیے [2] ترجمہ تیموریہ ...

"مثل ملایان عصر و ملا نورالدین مثل کشتی گیرے است کہ ہر یکے را بہ طریق خاص مغلوب می می سازد کہ ہرگز تصور آن نکردہ اند"،

نفائس المآثر میں ہے کہ شیخ نورالدین اور شیخ زین الدین ۹۲۲ھ میں قندھار آئے، اور حضرت فردوس مکانی بابر کی ملازمت اختیار کی،

"در ۹۲۲ھ (اثنی وعشرین وتسعمایۃ) مجموع برادران بہ قندھار آمدہ بہ ملازمت حضرت فردوس مکانی رسیدہ"،

قانونی بابری کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۲۵ھ کے آخر میں شیخ صاحب اپنے وطن سے روانہ ہوئے،

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی خدمت میں ان کو باریابی کا شرف ۹۲۵ھ میں حاصل ہوا؟

دیباچہ کی سفر کی تاریخ اواخر خمس وعشرین وتسعمایۃ[1] سے اگر آخری دو مہینہ مراد لئے جائیں تو اس زمانہ کی طوائف الملوکی، خلافت وہرات سے قندھار کے بُعد، سفر کی مشکلات، راستہ کی دشواریوں اور ان موانع اور قوافسہ کے پیش نظر جن سے استخلاص شیخ کو دشوار اور مہلک نظر آرہا تھا، بابر کے دربار سے شیخ کے توسل کا زمانہ ذی الحجہ ۹۲۵ھ یا محرم ۹۲۶ھ ہوگا،

شیخ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے، صاحب نفائس المآثر نے ان کی خوش طبعی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے،

"مولانا نازلالی شاعر کہ یکے از خوش طبعان است و معمائی بودہ بجہت آن کہ ستر حیرہ [illegible] او را بہ غلامے نسبت می کردہ اند، در سرچاہ ہری (مقام) بہ شیخ نورالدین رسید و احوال پرسیدہ از پریشانی حال خود شکایت کردہ گفتہ اند کہ بجانہ ابناے روزگاری روییم و حکایات بلا فائدہ

---

[1] دیباچہ ملاحظہ کیجئے،

می گوئیم و می شنوم ملا زلالی این بیت خوانده

تا کے بگرد ما چون شیخ و شیخ زاده

گوئیم ہرزہ ہرزہ گردیم لادہ لادہ

دبنیاد خندہ کردہ است، شیخ نورالدین در بدیہہ فرمودہ کہ این بیت گویا معمہ است باسم شما

کہ ہر بر لالا از الہ حاصل می گردد، شمارا خندہ کردن عجب است ملا در ہم شدہ و ازین مطائبہ و

خوش طبعی نادم گشتہ"

بدیہہ گوئی مین شیخ کو ید طولی حاصل تھا، وہ شعر و ادب کی محفلوں مین جب دوسرے شعراء کے

اشعار سناتے تو اسی ردیف و قافیہ مین خود فی البدیہہ بیس بیس شعر کہہ کر شامل کر دیتے، اور سامعین مشکل

سے یہ تمیز کر سکتے، کہ شیخ موصوف اپنے اشعار سنا رہے ہین،

شیخ نورالدین نے کابل مین وفات پائی،

کیفیت مخطوطہ، | فتاوی بابری کے زیر نظر قلمی مخطوطہ کی تقطیع "۱۰×۱/۲ ۶" کا اور ۶۲۶ صفحات مین ہر صفحہ مین

پندرہ سطرین ہین، خط نستعلیق، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہین، لوح کتاب مطلا و مینا کاری

جدولین شرخ اور سنہری ہین، ناقص الآخر ہین،

سبب تصنیف | کتاب کے دیباچہ مین مولانا خوافی نے لکھا ہے، کہ وہ اپنے جوہر علم و فضل کو تصنیف کی

شکل مین بادشاہ کی خدمت مین پیش کر کے اس کے وسیلہ سے دربار شاہی سے منسلک ہونے کی دیرینہ

تمنا کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن سے ۹۲۵ھ کے آخر مین روانہ ہوئے، اور مراحل و منازل طے

کرتے ہوئے، "ممالک محروسہ" (؟) سے قریب ایک مقام پر پہنچے تھے، اور اس کشمکش مین تھے، کہ کس

فن مین اپنی تصنیف پیش کرین، کہ بادشاہ کا حکم پہنچا کہ مسائل شرعیہ مین ایک کتاب فارسی مین تصنیف

کیجائے، اس حکم پر مصنف نے مستند روایتون اور کتابون سے مسائل شرعیہ کو ضبط تحریر مین لانا شروع

کیا اور ہدایہ (ھ)، کافی (ک) شرح وقایہ (شو) شرح مختصر وقایہ (ش) خزانہ (خ) فتاوی قاضی خان (ق) اور خلاصہ (ص) سے اس کی تالیف میں مدد لی ہے، توسین کی علامتیں مصنف نے حوالہ کے لئے مقرر کی ہیں، جہاں مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے ظاہر کی ہے، وہاں علامت ن سے کام لیا ہے،

دیباچہ کتاب | کتاب کا دیباچہ گو کسی قدر طویل ہے لیکن اس سے مصنف اور تصنیف کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے،

"باز می نماید بندۂ درماندۂ عاصی جانی نورالدین بن قطب الدین بن احمد بن زین الدین الخوافی اصلح اللہ شانہٗ وصانہ عماشانہٗ کہ مدۃ مدید این حقیر قلیل البضاعت را داعیہ آن بود کہ خود را بہ سایۂ دولت پادشہ فضیلت پروری رساند کہ باوجود کمال فطنت، بلند شرائف اوقات ارجمند را بہ ملاحظہ نکات علوم نقلی وعقلی صرف نمودہ بحرے کامل وحظے وافر از ہر علم حاصل کردہ باشند، تا مقتضائے انما یعرف ذوالفضل من الناس ذووہٗ درجہ از درجات فضائل ومرتبہ از مراتب ارباب آن بر ضمیر منیر شان مخفی نماند و فرصت بعید این کسیر عدیم الاستطاعت عزیمت آن می نمود کہ مخزونات خزانۂ سینہ راکہ حاصل حیوات ومحصول اوقات دیرینہ است مطرح مجلس سامی ومحفل گرامی دین پناہے معدلت گسترے گرداند کہ بمقتضائے عدالت ذاتی وموروثی رعایت ہر امرے بہ قدر مرتبہ آن فرمودہ، اجتناب از ترجیح مرجوح واحتراز از تفضیل مفضول بر ذمت ہمت واجب داند والحق احضار این مفہومات در ذات ملک صفات حضرت بادشہ اسلام پناہ مصداق مقولہ السلطان ظل اللہ، سلیمان دوران تاج بخشے وصاحب قرانے، شہسوار میدان عالمگیری وکشورستانی مطیع فرمان شریعت متین، تماشا اعیان سلاطین، صاحب تمکین، تابع احکام ان اللہ یامر بالعدل والاحسان، قامع آثار ارباب ظلمت طغیان،

مشید ارکان دین و ملت، مخرب بنیان کفر و اباحت، حامی ارباب سنت و جماعت، ماحی اصحاب بدعت و ضلالت، افروزندهٔ چراغ علم و تقوی بعد از انطماس و انطفا، افرازندهٔ لوای درس و فتوی، بعد از اندراس و اشتفا، دوائی ممالک جهانداری و رعیت پروری، بانی مبانی شهریاری و معدلت گستری، مهر سپهر جلالت و کامرانی، شاه بارگاه ایالت و جهانبانی، دُرّ درج حشمت و جلال، دری برج سلطنت و اقبال

آنکه چون در مدحش اندیشم مقال
ناطقه حیران بماند عقل لال

الممدوح بلسان ارباب الجزت و اصحاب الانتباه، ظهیر السلطنت والدنیا والدین محمد بابر بادشاه، شید الله ارکان الدین المتین بدوام وجوده و بقایه، و متع العالمین بتوالی جوده و تعاقب عطایه، چون انحصار مفهوم نیر اعظم در جرم آفتاب ظاهر و روشن، بلکه اظهر من الشمس و ابین من الامس است"

بکل زمان واحد یقتدی به
و هذا زمان انت لاشک واحد

و علاوه این امور آنکه همواره آبا و اجداد این بیچاره به وظائف که دعوات درویشان است بخاندان عالی الشان آن حضرت اشتغال نموده، در ظل عواطف پادشاهان این دودمان متوالی الاحسان مرفه و خوش احال می بوده اند، بنابرین مقدمات اکثر اوقات در تمهید اسباب آن می بود که سعی و کوشش نماید تا به هر حیله که از دست برآید، در سلک دعاگویان این دولت قاهره درآید، به واسطهٔ کثرت موانع که بسبب به دمدوی طالع واقع بود، شاهد این مقصود از نقاب خفا چهره نمی کشاد، و وصول بدین مطلوب در حجاب توقف می افتاد تا آنکه دو

آواخر خمس وعشرین وتسع مایه (۹۲۵ھ) به عزیمت آنکه از طواف آن آستانه که قبلهٔ آمال
وکعبهٔ اهل سعادت واقبال است، نموده، بعد از رخصت بجانب حرمین شریفین توجه نماید، از
وطن مالوف مهاجرت اختیار نمود، و بقدم سعی واجتهاد بسیارے از مراحل ومنازل پیموده
تا به موضعے که قریب به ممالک محروسه است، رسید، ودر آن موضع آن مقدار موانع وقواطع
ظاهر گردید، که استخلاص از ان متعسر بلکه متعذر می دید، ناگاه نسیم اقبال از مهب عنایات
وزید ورائحهٔ قبول از نواب بارگه فلک اشتباه و به مشام جان رسانید، بموجب "جذبة من جذبات
الحق توازی عمل الثقلین" کمند شوق در گردن این مستحق انداخته موانع متنوع را مرتفع ساخته
در بیابانی از بوادی بیم ناک که مظنهٔ تلف وهلاک بود، دوانید تا آخر الامر رخت اقامت را به بر
از بلاد که در ظل نواب کامیاب از سائر مخافات مصئون ومحروس است کشید، الحمد لله الذی
هدانا لهذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله، وقبل از استسعاد وتشرف بساط بوسی پرتو الطاف
وعنایات آن آفتاب فلک جاه وجلال برین ذرهٔ شکسته حال تافت و بانواع پرورش ونوازش
نواب گردون جناب شرف اختصاص یافت، شکر این مواهب را واجب بود که تحفهٔ دعا وصحیفهٔ
ثنائے معروض یافت مجلس عالی گرداند، بخاطر خیال افتاد که ادائے آن دعائے والقائے آن
ثنائے بر وجهے مناسب باشد که بعد الایام بر صحیفهٔ روزگار باقی ماند بنا بر آن عزیمت جزم
نموده که در فنے از فنون رساله تالیف نموده، موسوم باسم شریف سازد، فاما در تردد آن بود
که کدام یک از علوم در نظر اشرف مقبول تر است تا بنظم ترتیب آن پردازد، همانا که بموجب
کلمهٔ مشهورهٔ "ارباب الدول ملهمون" پرتو تردد این حقیر بر ضمیر مهر تنویر افتاده وکمال مرحمت
وشفقت پادشاهانه ابقاء آن تردد را در خاطر این کمینه رخصت نداده که درین اثنا حکم جهان
مطیع رسید که به جمع وتالیف قسم عبادات از مسائل شرعیه فرعیه اشتغال نموده، آنچه

جامع و معتبر عندالاکثر است بزبان پارسی در قید کتابت آمده مسط خلافیات و روایات ضعیفه نموده خاطر نشین کردانیده، مشغول شد و ارده، ایجاباً بالحکم المطاع و اطاعةً لامر الواجب الاتباع باوجود قلت بضاعت و عدم استطاعت درین امر خطیر، شروع نموده که بعد از اتمام به مقتضائے حدیث "رب حامل فقه الی فقیه او الی من هو افقه منه" در آن محفل عالی که ملجاے وملاذ افاضل و اعاظم است معروض دارد. از کتب معتبر بجز هفت کتاب بدست نیامد که اسامی آن کتب را عنقریب به تفصیل در می آرد، لاجرم چنان که حکما به واسطهٔ عدم اطلاع بر حرکات ثوابت مدار علوم نجوم را بر سبعهٔ سیاره نهاده اند و به جهت طلب اختصار بر ستاره را برقمی امتیاز داده، این فقیر ضعیف نیز چون کتاب دیگر نداد، بنیاد این رساله برین هفت کتب می گزارد، و هر روایتے را با آنکه متفق باشد به یکے ازین کتب مستند ساخته مرقوم برقمے می گرداند و هر رقم را علامت کتابے می دارد، چنانچه

از هدایه به هه

و از کافی به ک

" شرح وقایه " شو

" شرح مختصر وقایه " ش

" خزانه " خ

" خلاصه " ص

" فتاوی قاضی خان " ق

تبییری نماید چندان که می تواند سخنان اکمل را به حکایات ناقص خود مقرون نمی گرداند، چرا که ناقص مصاحبت کامل را نشاید و اگر احیاناً کلمهٔ چند ضرورت باشد مصدر بقسم "ن" که حرف اول و آخر نقصان و نام این ناتوان است می سازد تا من احول را به علامت نقصان سخن و قائل آن

از سخنان اہل کمال ممتاز گردیدہ کسے را در وظائف نیاز بود واز ہر رقم تا رقم دیگر منسوب بدان رقم اوّل می دارد و اصلاح سخن غیرے در ان میان نمی آرد، مامول از مطالعہ کنندگان مصنف آن کہ چون این ضعیف بکمال عجز و نقصان معترف است اگر بر خطائے خللے اطلاع یابند بذیل عفو و اصلاح بپوشند و بسیار در خصلت عیب جوئی و بدگوئی نکوشند فا ما ہا، وثوق و امید صادق است کہ چون از پرتو توجہ خاطر کیمیا ماثر کہ آئینہ جمال نمائی مخدرات عالم غیب است جلوۂ ظہور یافتہ از شوائب عیب و خلل و مواقع ریب و زلل مصئون و محفوظ ماند، الکون العصمۃ والعون بضمائر اولوالالباب پوشیدہ نماند کہ اوّل چیزے کہ بر مکلف یعنی عاقل و بالغ فرض شود بعد از ایمان نماز است.......

نسخۂ مذکور ناقص الآخر ہے، کتاب الصلوٰۃ سے شروع ہو کر کتاب الحج کی عبارت ذیل پر ختم ہو جاتا ہے:

"حج در لغت قصد کردن است بچیزے از روے تعظیم و در شریعت عبارت است از ارکان مخصوصہ بشرائط مخصوص کہ تفصیل آن معلوم خواہد شد، و این ارکان را حج بواسطہ آن می گویند کہ مشتمل است بر قصد کعبۂ معظمہ و این حج فریضہ است محکم و یکے از ارکان اسلام است و اگر کسے از فریضۂ آن منکر شود کافر گردد و در ہمہ عمر یک بار فرض است و مراد از شرائط است کہ چون وجود گیرد فرض شود بعد از اجتماع ،........."

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں دوبارہ چھپ گیا ہے اس ایڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہوا اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے ضخامت ۱۰۔۳ صفحے، قیمت :۔ مجلد للعہ، غیر مجلد ہے

"منیجر"

کشمیر میں شاہانِ مغلیہ کے چند آثار

از

جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی

مندرجۂ بالا عنوان سے میرا ایک بسیط مقالہ معارف اعظم گڈھ بابت ماہ مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ملاحظہ ہو ص ۲۰۰) چشمۂ شاہی کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا ذکر جب مجھ کو قدیم شاہی زمانے کی کتابوں میں نہ مل سکا، تو دوسرے وسائل سے کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکامی رہی، البتہ مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ غیر معلوم شاعر کا مل گیا،

دوشش دیدم نشستہ بر کوثر ۔۔۔ شاہِ مردان علی جہا ہی

گفتمش السلام، گفت علیک ۔۔۔ گفت، برگو دگر چہ می خواہی

گفتمش بہر چشمہ تاریخے ۔۔۔ گفت برگوئے، کوثر شاہی

۱۰۴۲ھ

اگست ۱۹۴۲ء میں میرا لکھنو جانا ہوا، اتفاقاً عزیزم مولوی نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ چیرمین میونسپل بورڈ سیتاپور سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرے پاس بیٹھتے ہی کچھ فارسی اشعار گنگنانے شروع کئے جن میں چشمۂ شاہی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے، اور میں نے وہ اشعار اُن سے باواز بلند پڑھوائے، یہ ایک قطعہ کے اشعار تھے، جو اُن کے پردادا مولوی منظر علی صاحب نے بزمانۂ قیام کشمیر چشمۂ شاہی کی مرمت کے موقع پر کہا تھا، یہ قطعہ سنانے کے بعد انھوں نے وہ قطعہ بھی پڑھا جو اوپر درج ہے مولوی منظر علی صاحب کے قطعہ سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ سابق کا دستیاب شدہ قطعہ ابو طالب

کلیم کا ہے این نے اس وقت عزیز موصوف کو مختصراً اپنی دلچسپی کی وجہ بتادی اور یہ بھی کہدیا کہ اس وقت کا واقعہ معارف مین بطور ضمیمہ مضمون سابق شائع ہوگا،

لکھنؤ سے واپس آتے ہی ابو طالب کلیم کے کلیات اور اُس کے حالات کی تلاش کی کہ اس کی جانب قطعہ کی نسبت جو معلوم ہوئی ہے، وہ پختہ طور پر ثابت ہو جائے، تذکرون مین حالات ملے، اور کشمیر سے اس کا شغف بھی معلوم ہوا، لیکن افسوس ہے کہ کلیات کا نسخہ نہ ملا، حیرت اور نہایت افسوس اس بات پر ہے کہ مطبوعہ ہوتے ہوئے بھی وہ نایاب ہے، جہان جہان سے مستعار مانگا وہان بھی نہ تھا، پرانی کتابون کے فروخت کرنے والون سے علی گڈھ اور لکھنؤ مین رجوع کیا، مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی، پھر قلمی نسخون کا خیال کیا، ایک ناقص نسخہ ہماری لٹن لائبریری مین ہے، اس کی بنا پر فیصلہ غیر مناسب تھا، بعض احباب کے ذریعہ سے کچھ اور قلمی نسخے ملے جن مین سے بعض ناقص اور بعض مکمل تھے لیکن اس قطعہ سے خالی، بالآخر مصداق

تجری الرّیاح بما لا تشتھی السّفن

اس لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے، کہ جیسا کچھ بھی ہے، اس انکشاف کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کردیا جائے،

مولوی مظہر علی صاحب کا قطعہ تاریخ مرمت چشمہ شاہی درج ذیل ہے،

چشم بد دور چشمۂ ایست کہ ہست — آب و تابش ز ماہ تا ماہی

برد و او نہادہ سر تسنیم — سلسبیلش نمودہ ہمراہی

بود خاکش بسر ز حسرتِ شاہ — آبش افزود تیغ جم جاہی

پیش ازین کلک تر زبانِ کلیم — درفشان شد کہ چشمہ شاہی

سال تاریخ حال چشمۂ شیخ ۱۲۵۰ — گفت مظہر ز روئے آگاہی ۱۲۵۹

چوتھا شعر بتلا رہا ہے کہ پہلا قطعہ کلیم کا ہے، اور یہ کہ مادہ تاریخ چشمہ شاہی ہے، لیکن اس کے

اعداد ۱۰۴۴ ہین، اس وجہ سے یہ مادہ نہین ہو سکتا، بلکہ جیسا اصل قطعہ کے اندر ہے، مادہ کوثر شاہی ہے، جس سے ۱۰۴۲ھ برآمد ہوتے ہین، لہذا ع

درفشان شد کہ چشمۂ شاہی

سے مولوی صاحب کا مقصد اس نام کی طرف اشارہ کرنا ہے جس سے وہ مشہور ہے،

اس انکشاف کے بعد اپنے محولۂ بالا مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خود اس کے اندر شاعر کا نام موجود تھا، جو ماخذ مین کتابت کی غلطی سے مخفی رہ گیا، کیونکہ وہان تحریر ہے کہ "حکم بدیہہ تاریخ گفت" اسکو "کلیم بدیہہ تاریخ گفت" ہونا چاہئے تھا،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مولوی منظر علی صاحب کا مختصر حال لکھدیا جائے، جو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم برادر کلان مولوی نثار احمد صاحب موصوف کی عبارت مین بعینہ ملاحظہ ہو،

مولوی منظر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر علماے عصر مین سے تھے، اور صاحب تصانیف بھی تھے، قبل تعین بصفت صدر امین وقاضی القضاۃ بریاست کشمیر مولوی صاحب مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ مین پرنسپل تھے، اپنے ایک انگریز دوست کی فرمایش پر قلم برداشتہ ۲۹ روز مین ایک کتاب موسوم بہ اصول العلوم عربی زبان مین لکھی، جس مین دس علوم متداولہ پر ایسی اجمالی روشنی ڈالی کہ باریک سے باریک نکات بھی روشن ہوگئے ہین، اس کی نقل میرے پاس بھی موجود ہے، یہ کتاب خود اپنی نظیر ہے،

۱۲۶۲ھ مین جب کہ مولوی صاحب لاہور ہوتے ہوے وطن آرہے تھے، تو بغرض قدمبوسی خلاصۂ دودمان مصطفوی نقاوۂ خاندان مرتضوی سید السادات جناب مولانا سید رجب علی خان بہادر بمقام لدھیانہ قیام کیا، اور جناب مولانا کی فرمایش پر ایک کتاب بزبان فارسی الموسوم بالرحمۃ الناذلہ فی شرح التحفۃ المرسلہ لکھی جو کہ مطبع نیر اعظم ٹپالہ مین چھپی ہوئی یہ کتاب ہم کو بہت تلاش کے بعد کتب خانہ افندی تکیہ شریفیہ کاکوری مین ملی جس کی نقل ہمارے پاس موجود ہے، علاوہ اس کے مولوی صاحب نے ایک تفسیر

کلام مجید بزبان عربی لکھی جس کا نام مجھکو یاد نہیں، یہ تفسیر میرے یہان موجود نہیں، اس کا مسودہ بھی مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو دیا، اور ہنوز انہی کے پاس ہے، اللّٰھُمَّ اردد الینا ضالتنا،

مولوی صاحب کا کشمیر مین بزمانہ مہاراجہ گلاب سنگھ قاضی القضاۃ ہونا اُن کی مہر سے ثابت ہے جس کی نقل ذیل مین درج ہے، یہ نقل مجھ کو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم نے دی تھی،

بہادر مولوی منظر علی
صاحب گلاب سنگھ ۱۲۶۳ ھ
متعینہ سرکار سر مہاراجہ ضی
مہر صدر امین و قا القضاۃ

اس مہر کی عبارت کو اس طرح پڑھنا چاہئے :۔ "مہر صدر امین و قاضی القضاۃ مولوی منظر علی متعینہ سرکار سر مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب بہادر ۱۲۶۳ھ"

مین نے چاہا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مولوی صاحب کے حالات بحیثیت صدر مدرس معلوم کرون مگر اس مین بھی کامیابی نہ ہوئی، معلوم ہوا کہ ملک کی تقسیم کے وقت جو سامان کلکتہ سے ڈھاکہ کو گیا اس مین مدرسہ کی تاریخ بھی چلی گئی، اس لئے یہ پہلو بھی تشنہ رہ گیا،

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار انصار، اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیل مباحث،

(زیر طبع)

ایک نادر کتاب کا تعارف

از

جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی (علامہ فضل حق رحمہما اللہ کے والد ماجد) دنیائے علم مین ایک نامور معقولی اور یگانہ روزگار فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہین منطق مین آپ کی مشہور تصنیف مرقات ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے مدارس عربیہ کے نصاب مین داخل ہے لیکن بہت سے اہل علم بھی اس سے واقف نہین ہین، کہ مولانا کی جولانگاہ محض معقولات تک محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی آپنے طبع آزمائی کی ہو، آمدنامہ[1] جو فارسی قواعد کے تمام شعبون پر حاوی ہے، اور جس کی ایک فصل مین مشاہیر اہل علم کا بھی ذکر ہی، خاص خاص حلقہ مین روشناس ہوچکا ہے، حال مین موصوف کی ایک تاریخی تصنیف حکیم سید مشرف حسین مرحوم خیرآباد کے کتب خانہ مین نظر سے گذری جس سے لوگ واقف نہین ہین، اس لئے اس کا تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوا،

یہ کتاب فن تاریخ وسیر مین ہو اور فارسی زبان مین ہے، اور اتنی خستہ اور بوسیدہ ہوچکی ہے، کہ جابجا اوراق کے ٹکڑے اڑ گئے ہین، کتابت مین کافی غلطیان موجود ہین، بعض مقامات پر کاتب نے پورا صفحہ سادہ چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اگلی اور پچھلی عبارت مین ربط باقی نہین رہ گیا ہے، پوری کتاب چھ سو ساٹھ صفحات مین تمام ہوئی ہے، ہر صفحہ مین سترہ سطرین ہین، قلم متوسط ہے، مصنف نے اس

---

[1] اس کا قلمی نسخہ بخط مصنف کتبخانہ موتو نہ لاہرپور ضلع سیتاپور مین محفوظ ہے ۱۲

تصنیف کا سبب دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے:

"پس می گوید اضعف عباد اللہ المتوکل علی المفضل المنعام الھادی محمد فضل امام بن محمد ارشد
الخیرآبادی غفرلہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ روزے بخاطر فاتر این بندۂ نحیف گزشت کہ چون
انسان را احوال گزشتگان موجب عبرت وحیرت می باشد، وبسا امور دینی ودنیوی ازان انتظام
می یابد لہذا اساتذہ در ہر زمان بتالیف کتب سیر و تواریخ پرداختہ اند و دفاتر ہا ازان پرساختہ
و درین زمان بسبب قصور فہم اکثر ابناے روزگار ازین علم شریف عاری وعاطل اند، وبتبعیت
مبالات ازین فن شریف بسیارے ارباب زمانہ بے بہرہ وغافل اند، مناسب است کہ مختصرے
ازکتب متعارفہ التقاط کردہ اید کہ گزشتگان را تذکارے وبراے آئندگان یادگارے باشد
بنابران این چند اجزا از کتب معتبرہ مانند تاریخ فرشتہ وشمشیر خانی ومنتخب التواریخ و
دیگر کتب بعبارت سلیس و واضح انتخاب کردہ در سلک تحریر کشیدہ شد، وبناے این کتاب
برچند گفتارنہادہ اند"

پوری کتاب سات گفتاروں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے:-

"گفتار اول در ذکر احوال خلقت آدم علی نبینا علیہ السلام وذکر امہاے دیگر وغیر مرسل
گفتار دوم، در ذکر صوفیاے کرام واولیاے عظام، گفتار سوم در ذکر ملوک ایران، گفتار چہارم
در ذکر راجگان کہ حکومت بہ دہلی و دیگر بلاد داشتند، گفتار پنجم در ذکر حکام غزنویہ ولاہور،
گفتار ششم اساطین سلاطین سلجوقیہ گفتار ہفتم در ذکر شاہیر حکما واطبا و شاہیر خوشنویسان،
خاتمہ در بیان بلاد ہفت اقلیم وعجائب وغرائب بلدان"

کتاب کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے جب مولانا دہلی میں افتاء کے منصب پر فائز ہوئے تھے، اس لئے
مشاغل کی کثرت، دربار کی حاضری اور درس و تدریس کی مشغولیت نے کتاب پر نظر ثانی کا موقع بھی نہیں دیا،

اور دوستون کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر مسودہ اسی طرح انکے حوالہ کر دیا اگر مصنف کو اس کتاب کی تکمیل و تصحیح کا پورا موقع ملا ہوتا، تو اس کتاب کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا، اس کا مصنف کو افسوس تھا، وہ لکھتے ہین۔

"تالیف این کتاب وقتے اتفاق افتاد کہ قائد قضا وقدر این کمترین خلائق را در دہلی انداختہ بفتوی نویسی عدالت آنجا مبتلا ساختہ بود، و ذلک فی سنہ ۱۲۴۲ھ ہجری قدسی و چون انتحال این احوال بسبیل استعجال اتفاق افتادہ و فرصت آن نشد کہ نظر ثانی کردہ آید، چہ اکثر در دربار می گزشت و بعضے از اوقات در تدریس صرف می شد و آن قدر مہلت کہ برائے سیر کتب سیر و تواریخ وغیرہ گنجایش تواند داشت دست بہم نمی داد و بعضے دوستان در نقل گرفتن و انتساخ این سخت عجلت و جلدی فرمودند لاجرم ہمان نسخہ مسودہ حوالہ اوشان نمودہ شد، بنا بر آن از ناظرین توقع آن دارد کہ اگر بر سہوے و خطائے وقوف یابند آن را برپے مائگی راقم و بے سوادی مولف حمل کردہ بہ ذیل عفو بپوشند، وَالعفو عند کرام الناس مقبول"

راقم ڈاکٹر سید انتظار حسین نبیرۂ حکیم سید مشرف حسین مرحوم کا ممنون ہے، جنھون نے اس نایاب گران بہا گنجینہ کے جس کا غالباً اور کہین وجود نہین ہے، مطالعہ کا موقع دیا، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کی نقل حاصل کی جائے تاکہ یہ تاریخی یادگار ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

لہ غالباً کاتب نے ۱۲۲۲ھ کو غلطی سے ۱۲۴۲ھ لکھدیا ہے، اس لئے کہ مرزا غالب نے مولانا کا سنہ وفات اپنے قطعہ تاریخ مین ۱۲۳۸ھ لکھا ہے، یعنی اس سے چار سال قبل آپ وفات پا چکے تھے، مرزا کے قطعہ کا شعر یہ ہے،

گفتم اندر سایۂ لطف نبی
باد آرامشگہ فضل امام
۱۲۳۸ھ

(باغی ہندوستان بحوالہ سبد چین غالب)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان مین مسلمانون کے تمدنی اثرات

"موجودہ عہد مین "ہسٹری آف اورنگ زیب" کے مصنف جدوناتھ سرکار مغلیہ دور کے بڑے مستند اور بلند پایہ مورخ سمجھے جاتے ہین، انھون نے اورنگ زیب کی ضخیم تاریخ جس نقطۂ نظر سے لکھی ہے اس کو مسلمانون نے پسندیدہ نگاہون سے نہین دیکھا ہے، اس لئے وہ مسلمانون کی تاریخ اور تمدن کے دوست اور ان کے حامی نہین سمجھے جاتے، لیکن انھون نے اپنے ایک مضمون مین غالبًا بادل ناخواستہ کچھ ایسے حقایق لکھے ہین، جن کا مطالعہ آج کل بعض حیثیتون سے بہت مفید اور دلچسپ ہوگا، ان کا ایک انگریزی مقالہ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہندوستان ریویو مین "اسلام ان انڈیا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، گو یہ مضمون بھی بہت سے غلط واقعات و مفروضات پر مشتمل ہے، تاہم اس مین بہت سی حقیقتون کا بھی اعتراف کیا گیا ہے، اس لئے اس کے خاص خاص حصے ناظرین کی خدمت مین پیش کئے جاتے ہین، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے سنوارنے مین مسلمانون کا کیا حصہ رہا ہے، اس مضمون مین بہت سے ایسے خیالات بھی ہین جو صحیح نہین، اس لئے مضمون نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہین ہے"

مسلمانوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا، تو ان کی فتح گذشتہ تمام فتوحات سے مختلف تھی، وہ ہندوستان آئے، تو اُن کو یہاں کے پرانے باشندے اپنے میں ضم نہ کرسکے، ورنہ اُن سے پہلے یونانی تورانی، تاتاری، اور پارتھین حملہ آور جب یہاں آباد ہوئے، تو چند نسلوں کے بعد ہی وہ اپنے نام، لباس، رسم و رواج اور مذہب میں بالکل ہندو بن گئے، دوسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی ہیلیوڈورس نامی نے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، تو اُس نے وشنو کی پوجا کی، اور اس دیوتا کی یاد میں ایک ستون بھی بنوایا......

لیکن اسلام میں توحید کا تخیل اس قدر خالص اور شدید ہو کہ اس میں اور شرک اور تعدد الہ کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے، اسلام کا خدا ہمیشہ زندہ اور غیور رہتا ہے، وہ کسی کو اپنا شریک نہیں بنا سکتا، اور نہ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے دلوں میں کسی اور خدا کے وجود کو گوارا کرسکتا ہے، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندومت کے ساتھ ضم ہونا ناممکن ہوگیا وہ اپنے اللہ کو نہ وشنو کے کثیر التعداد اوتاروں میں سے ایک اوتار مان سکتے تھے، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک صاحبِ الہام سادھو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہو سکتے تھے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے ایک ہی سرزمین میں رہتے ہوئے بھی دونوں میں آمیزش نہ ہوسکی، اور ان میں جو خلیج پیدا ہوگئی، اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانوں کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا۔ آج بھی جب وہ نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں، تو اُن کا منہ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ میں جب بھی اپنے ذہنی نشو و نما، قوانین کی تدوین، ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت و خواند کے معیار کے سلسلہ میں کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر، عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمانوں کی بہت سی چیزیں مثلاً ان کی مقدس زبان، اُن کا لٹریچر، ان کے اساتذہ، اُن کے اولیا، اللہ وراُن

کی درگاہین مشترکہ ہین جو تمام دنیا مین پھیلی ہوئی ہین، اور ہندوؤن کی طرح صرف ہندوستان ہی مین محدود نہین ہین،

ہندوؤن نے مسلمانون کو اپنے مین ضم کرنے کی کوشش کی اسی سے اونھون نے Allo-panishad لکھی، اور شہنشاہ اکبر کو اوتار تسلیم کر لینے کا خطرہ بھی مول لیا، لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بنیادی باتون کو ترک کرنے، اور ان ہندو رسمون کو اختیار کرنے کے لئے بھی آمادہ نہین ہوئے، جو ہندو سوسائٹی مین داخل ہونے کے لیے ضروری تھین، انھون نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ مشرک نجس ہین، اور کوئی نجس چیز کعبہ مین داخل نہین ہوسکتی،

ہندوستان آنے والے مسلمانون اور اُن سے پہلے کے حملہ آورون مین یہی بنیادی فرق رہا، اس کے علاوہ ایک اور خاص فرق یہ تھا کہ سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۵۶۰ء تک مسلمانون کی ریاست اور سوسائٹی سپاہیانہ اور خانہ بدوشانہ طرز کی تھی، حکمران طبقہ اس ملک مین اس طرح رہا، جس طرح کوئی فوجی کیمپ مین رہتا ہو، سولھوین صدی کے اخیر مین اکبر نے اس ملک کے لوگون مین یہان کی حکومت سے دلچسپی پیدا کرانے کی کوشش کی، اور خود حکومت بھی حاکمانہ فرائض کے علاوہ کچھ معاشرتی اور عمرانی فرائض انجام دینے کی طرف مائل ہوئی، لیکن مسلمان باشندے اس ملک مین رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جزء بن کر نہین رہے،

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانون نے اپنے عہد مین ہندوستان کو کیا کیا چیزین دین؟ ہمارے نزدیک یہ دس چیزین ہین،

(۱) مسلمانون نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازرانی اور بحری تجارت کو ازسرِنو فروغ ہوا، ہندوستان مین چولا کی حکومت کے خاتمہ

مسلمانوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا، تو ان کی فتح گذشتہ تمام فتوحات سے مختلف تھی، وہ ہندوستان آئے، تو اُن کو یہان کے پرانے باشندے اپنے مین ضم نہ کرسکے، ورنہ اُن سے پہلے یونانی، تورانی، تاتاری، اور پارتھین حملہ آور جب یہان آباد ہوئے، توچند نسلون کے بعد ہی وہ اپنے نام، لباس، رسم ورواج اور مذہب مین بالکل ہندو بن گئے، دوسری صدی قبل مسیح مین ایک یونانی ہیلیوڈورس نامی نے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، تو اس نے وشنو کی پوجا کی، اور اس دیوتا کی یاد مین ایک ستون بھی بنوایا......

لیکن اسلام مین توحید کا تخیل اس قدر خالص اور شدید ہو کہ اس مین اور شرک اور تعدد الٰہ کی کوئی گنجایش ہی نہین ہے، اسلام کا خدا ہمیشہ زندہ اور غیور رہتا ہے، وہ کسی کو اپنا شریک نہین بنا سکتا، اور نہ اپنے اوپر ایمان لانے والون کے دلون مین کسی اور خدا کے وجود کو گوارا کرسکتا ہے، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانون کا ہندومت کے ساتھ ضم ہونا ناممکن ہوگیا وہ اپنے اللہ کو نہ وشنو کے کثیر التعداد اوتارون مین سے ایک اوتار مان سکتے تھے، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک صاحب الہام سادھو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوسکتے تھے، اسی لئے ہندو اور مسلمانون کے ایک ہی سرزمین مین رہتے ہوے بھی دونون مین آمیزش نہ ہوسکی، اور ان مین جو خلیج پیدا ہوگئی، اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانون کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا۔ آج بھی جب وہ نمازون مین کھڑے ہوتے ہین، تو اُن کا منہ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ مین جب بھی اپنے ذہنی نشو ونما، قوانین کی تدوین، ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت وخواند کے معیار کے سلسلہ مین کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر، عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمانون کی بہت سی چیزین مثلاً ان کی مقدس زبان، اُن کا لٹریچر، ان کے اساتذہ، اُن کے اولیاء اللہ، اور اُن

ئی درگاہیں مشترکہ ہیں جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، اور ہندوؤں کی طرح صرف ہندوستان ہی میں محدود نہیں ہیں،

ہندوؤں نے مسلمانوں کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش کی، اسی لئے انھوں نے Allo-panishad لکھی، اور شہنشاہ اکبر کو اوتار تسلیم کر لینے کا خطرہ بھی مول لیا، لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بنیادی باتوں کو ترک کرنے، اور ان کی رسموں کو اختیار کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوئے، جو ہندو سوسائٹی میں داخل ہونے کے لیے ضروری تھیں، انھوں نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ مشرک نجس ہیں، اور کوئی نجس چیز کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتی،

ہندوستان آنے والے مسلمانوں اور اُن سے پہلے کے حملہ آوروں میں یہی بنیادی فرق رہا، اس کے علاوہ ایک اور خاص فرق یہ تھا کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک مسلمانوں کی ریاست اور سوسائٹی سپاہیانہ اور خانہ بدوشانہ طرز کی تھی، حکمران طبقہ اس ملک میں اس طرح رہا، جس طرح کوئی فوجی کیمپ میں رہتا ہو، سولہویں صدی کے اخیر میں اکبر نے اس ملک کے لوگوں میں یہاں کی حکومت سے دلچسپی پیدا کرانے کی کوشش کی، اور خود حکومت بھی حاکمانہ فرایض کے علاوہ کچھ معاشرتی اور عمرانی فرایض انجام دینے کی طرف مائل ہوئی، لیکن مسلمان باشندے اس ملک میں رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جزء بن کر نہیں رہے،

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کو کیا کیا چیزیں دیں؟ ہمارے نزدیک یہ دس چیزیں ہیں،

(۱) مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازوں اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ

کے بعد یہ دونوں چیزیں بالکل ختم ہوگئی تھین،

۲۔ ہندوستان کے بیشتر علاقون خصوصًا وندھیا کے شمال مین اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا،

۳۔ ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک مین یکسانیت پیدا ہوئی،

۴۔ مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگون کے عادات واطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور مین یکرنگی پیدا ہوئی،

۵۔ ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا، جس مین ہندوؤن اور جینیون کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس لئے تعمیرات مین ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتون کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین، اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگارین ہین،

۶۔ ایک مشترک زبان پیدا ہوئی جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی مین ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیون نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹون نے بھی اپنی زبان مین رائج کیا،

۷۔ دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی،

۸۔ مذہب مین توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا،

۹۔ تاریخی لٹریچر پیدا ہوا،

۱۰۔ فنونِ جنگ اور تمدن کے عام شعبون کو فروغ ہوا،

بیرونی تعلقات بودھون کے زمانہ مین تو ہندوستان کے تعلقات ایشیا کے اور ملکون سے پیدا ہوئے لیکن جب آٹھوین صدی عیسوی مین از سر نو ہندو سوسائٹی کی تشکیل ہوئی، تو ہندوستان دنیا سے بے تعلق ہو کر خود اپنی سرحد کے اندر محدود ہو گیا، لیکن بارھوین صدی عیسوی مین جب سلاطین

نے ہندوستان کو فتح کیا، تو ایشیا اور افریقہ کے بعض علاقون سے ہندوستان کے تعلقات پھر سے قائم ہوئے، لیکن اس کے بعد بھی ہندو خود باہر نہین نکلے (بلکہ باہر سے ہزارون غیر ملکی ہندوستان آتے رہتے، اور کچھ مسلمان بھی ہر سال باہر جاتے رہتے، افغانی سرحد کے درّون کی راہ سے بخارا، سمرقند، بلخ، خراسان، خوارزم اور ایران سے عام لوگون کے علاوہ تاجرون کی آمد و رفت برابر جاری رہی اور یہ سلسلہ مغلون کی حکومت کے خاتمہ یعنی ۱۷۳۹ء تک قائم رہا، بولن کے درہ سے قندھار اور ایران تک راستہ جاتا تھا، اس راستہ سے جہانگیر کے زمانہ یعنی سترہوین صدی کے آغاز مین ہر سال چودہ ہزار بار شتر تجارتی سامان باہر سے آتا تھا، مغربی ساحل پر بہت سی بندرگاہین ایسی تھین، جن کے ذریعہ بیرونی دنیا مین رسائی ہوتی رہتی تھی، مشرق مین مسولی پٹیم کی بندرگاہ پر گولکنڈہ کے سلاطین کا قبضہ ۱۶۸۶ء تک رہا، جس کے بعد مغلون کا قبضہ ہوا، یہان سے لنکا، سماترا، جاوا، سیام اور چین تک جہاز جاتے رہتے تھے،

یکسانیت | مغلون کے دوسو سالہ عہدِ حکومت مین پورے شمالی ہند اور دکن کے بیشتر حصہ مین سرکاری زبان، نظامِ حکومت اور سکون مین یکسانیت پیدا ہوئی، ایک مشترکہ زبان بھی پیدا ہوئی، جس کو برہمنون اور دیہاتیون کے علاوہ ہر طبقہ کے لوگ بولتے، مغلون کے ملکی نظام، سرکاری خطابات، درباری آداب اور سکون کے ضوابط کو ان ہندو راجاؤن نے بھی اختیار کیا جو مغلون کے زیر اثر نہ تھے،

مغلون کے زمانہ مین بیس صوبے تھے، ہر صوبہ مین ایک ہی قسم کا نظم و نسق تھا، ایک ہی قسم کے خطابات بھی تھے، سرکاری کاغذات مین ایک ہی زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، سرکاری عہدہ دارون اور فوجیون کا تبادلہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین برابر ہوتا رہتا تھا، اس لئے ایک صوبہ کا آدمی دوسرے صوبہ مین اپنے کو اجنبی محسوس نہین کرتا تھا، تاجر اور مسافر آسانی سے

ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں آیا جایا کرتے تھے، اور اس آمد و رفت سے اُن کو اس وسیع ملک کی سیاسی وحدت کا احساس ہوتا تھا،

فنون لطیفہ | فنون لطیفہ میں مسلمانوں کے بڑے احسانات حسب ذیل ہیں،

۱- انھوں نے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد کیا، محلوں اور مقبروں کی تعمیر ان کی خاص چیز ہے،

۲- ان کی وجہ سے مصوری میں ایک خاص اسکول قائم ہوا،

۳- ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

شروع میں مسلمانوں کی مصوری کے جو نمونے خراسان اور بخارا سے ہندوستان پہنچے، ان میں خصوصاً چہروں، چٹانوں، اژدہوں، آگ اور پانی کی چادر کی مصوری میں چینی اثرات کا غلبہ نظر آتا تھا، لیکن ہندوستان کے اصلی قومی بادشاہ اکبر کے دربار میں مسلم آرٹ میں چینی اور غیر ہندوستانی اثرات کے ساتھ ہندو آرٹ کی بھی آمیزش ہونے لگی، جس کی روایات میں اجنتا، بھارہوت اور ایلورا کی مصوری کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اکبر کے زمانہ میں مسلم آرٹ میں پہلی دفعہ تغیر پیدا ہوا، اور چینی آرٹ میں جو سختی پائی جاتی تھی، اس میں نرمی پیدا کی گئی، وہ اس آرٹ کی رسمی باتوں سے پرہیز کیا جانے لگا، چٹان، پانی، اور آگ کی مصوری میں ایک نیا طرز اختیار کیا گیا، جس میں چینی اسکول کے اثرات تو باقی تھے، لیکن وہ فطرت سے قریب تر ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ چینی اثرات زائل ہونے لگے، اور مصوری کی خصوصیات اور مناظر میں طور پر ہندوستانی ہو گئے، اور یہ ترقی اکبر کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ شاہجہان کے عہد میں چینی اثرات پر ہندوستانی اسٹائل غالب آگیا، پھر اس آرٹ نے نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری، اور فطرت نگاری میں بڑا کمال پیدا کیا، اس انڈو مسلم آرٹ کو فروغ مغلوں کے دربار ہی میں ہوا، اور اس زمانہ میں ہندوستان کے مصوروں نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں

ہندوستانی آرٹ یا مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے،

زبانون کی ترقی ۱۱۰۰ء کے بعد سے سنسکرت ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی نہین رہ گئی تھی، اور گو اس زبان مین کتابین لکھی جاتی رہین، اور اب بھی لکھی جاتی ہین، لیکن یہ تمام کتابین بناوٹی ہین یعنی یا تو وہ شرحین ہین، یا شرحون کی شرحین ہین، یا رسمی باتون پر کچھ رسالے ہین، ان مین کوئی ایسی اوریجنل تصنیف نہین ہے جس کو واقعی لٹریچر کہا جا سکتا ہے، اس کی کوئی کتاب نہ دل کو متاثر کرتی ہے، نہ معلومات مین اضافہ کرتی ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک کا زمانہ جس کو عام طور سے پٹھانون کا عہد کہا جاتا ہے، شمالی ہندوستان کا ایک تاریک دور تھا[1]، اس ساڑھے تین سو برس کی مدت مین ہندوؤن کا دماغ بالکل کورا اور بنجر رہا۔ لیکن جب اکبر نے اپنے دشمنون پر غلبہ پاکر شمالی ہند مین ایک وسیع سلطنت قائم کی تو امن وامان اور اچھے نظام سلطنت کے خوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے، امن کی وجہ سے دولت بڑھی، اور دولت کے ساتھ ذہنی تعیشات کی جلوہ آرائی شروع ہوئی، تمام صوبون کی زبانون مین یکایک ترقی ہونے لگی، بنگال مین چیتنیا کے مقلدون نے بنگالی زبان مین ایک نئی روح پھونک دی، اس زبان مین گیتون کے علاوہ بعض اہم کتابین خصوصًا سوانحمریان لکھی گئین،

ہندی زبان مین تلسی داس نے اپنی غیر فانی کتاب رام چرت مناس ۱۵۷۵ء عیسوی مین لکھنی شروع کی، اس سے پہلے محمد جائسی نے پدماوت ۱۵۴۰ء مین ختم کی تھی، اس نے ۱۵۶۲ء مین آخری کلاوت بھی لکھی، اس زمانہ مین ہندی نظمین بکثرت لکھی گئین، انہی مین سے اکھراوت، سپناوت، کندراوت، مادھومالتی، عثمان چتراوتی ہین، کبیر دادو، اور نانک نے بہت سی مذہبی نظمین لکھین، لیکن ان کی حیثیت

---

[1] معارف :- فاضل مقالہ نگار مغلیہ عہد کے مؤرخ ہین، اس سے پہلے کے عہد پر ان کا تاریخی مطالعہ وسیع نہین، اس لئے اُن کی یہ رائے قابلِ قبول نہین،

مستقل لٹریچر کی نہین، وہ محض پند و نصائح ہین جو زبانی یاد کرلئے جاتے تھے،

- اردو سولھوین صدی مین پیدا ہوئی، شروع مین یہ بازاری زبان تھی، اور مصنفون اور اعلیٰ سوسائٹی کی نظرون مین حقیر سمجھی جاتی تھی، لیکن شمالی ہند مین اٹھارہوین صدی کے آخر مین یہ زبان علمی بن گئی، دکن مین ایک صدی پہلے ہی اردو جس کو ریختہ بھی کہتے تھے، شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے گئے۔ تھوڑی اور نگ آبادی اردو کے سب سے پہلے ممتاز شاعر سمجھے جاتے ہین،

اکبر اور اس کے با جگذار حکمرانون نے علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے سولھوین صدی کے آخر اور سترہوین صدی کے نصف تک ہندوستان کے ذہن و دماغ کا حیرت انگیز نشوونما ہوا، اسی زمانہ مین بنگال کی تاریخ سنسکرت مین "شیخ سبھودیا" لکھی گئی، جس مین ایک عجیب و غریب مخلوط زبان استعمال کی گئی ہے، اسی عہد مین شاہجہان کے درباری چندر بھان برہمن کی فارسی تحریرون کی شہرت ہوئی، اسی دور مین ہندی کی تصنیف ستر ابندھو و نود مشہور ہوئی،

مذہبی اثرات | مشہور مورخ کنگھم رقمطراز ہے کہ

"مسلمان ہندوستان مین ایک نئی قوم کی حیثیت سے آئے، وہ اپنی شجاعت مین چھتریون کے برابر یا اُن سے بڑھکر تھے، وہ برہمنون کے تقدس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انھون نے توحید کو بانگ دہل پیش کیا، اور یہ بتایا کہ خدا بتون سے نفرت کرتا ہے، ان تمام باتون نے ہندوستان کے لوگون کے ذہن کو متاثر کیا،...... "ہندو مذہب اور اسلام کے اختلاط کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ چودہوین صدی کے آخر مین بنارس کے راما نند نے ایک مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ہر فرد خدا کی نظرون مین یکسان سمجھا جاتا تھا اور اس مین کسی امتیاز کے بغیر ہر قوم کے لوگ راما نند کے چیلے بن کر شریک ہوسکتے تھے"

[illegible] دوسرے یورو پین مصنفون کا یہ کہنا صحیح نہین ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوؤن

مین توحید کا تخیل اور ذات پات کے خلاف جذبات اسلام کے اثر سے پیدا ہوئے، ہندوؤن مین شروع سے جتنے بڑے بڑے مفکر اور مذہبی مصلح پیدا ہوئے، انھون نے یہی تعلیم دی کہ بے شمار دیوتاؤن کے پیچھے ایک ہی خدا ہے، اور ہر پجاری خدا کے نزدیک برابر ہے، ان مصلحین نے یہ بھی تعلیم دی کہ مذہبی رسم درواج تو بہت ہین لیکن ان تمام چیزون سے بالاتر صرف ایک سیدھا سادہ عقیدہ ہے، انھون نے مذہب کی باتون کو آسان بنا کر ادنیٰ طبقہ تک پہونچانے کی بھی کوشش کی، لیکن اس مین شک نہین کہ ان تمام اصلاحی تحریکون مین مسلمانون کے آنے کی وجہ سے بڑی ترقی ہونے لگی، ہندوؤن کے دماغ پر جو تعصب چھایا ہوا تھا، وہ مسلمانون کی سوسائٹی کے اثر سے دور ہونے لگا،

مسلمان صوفیون نے ہندوؤن اور مسلمانون کے اعلیٰ دماغون کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تیار کیا، اور صوفیون کے فلسفہ کے اثرات سے حکمران طبقہ محکومون سے قریب تر ہوا،

تاریخی لٹریچر | تاریخ نویسی مین ہندوؤن کا دماغ بالکل محدود تھا، مسلمانون کی فتح سے پہلے ہندوؤن نے کوئی ایسی کتاب نہین لکھی تھی، جو صحیح معنون مین تاریخ کہی جا سکتی ہے، اس کے برخلاف عربون کا دماغ خشک، مرتب اور حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ تمام واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے عادی ہین، مسلمانون کا تاریخی لٹریچر بہت ہی وسیع اور متنوع ہے، اور اس مین سنہ و سال کی باضابطہ ترتیب رہتی ہے، ہندوستان کے ہر مسلمان خاندان کے زمانہ مین تاریخین لکھی گئین، مغلون کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد کی تاریخ لکھوائی، ان تاریخون کا نہ صرف مطالعہ کیا گیا، بلکہ ہندو مصنفون اور راجاؤن نے ان کے طرز کو نقل کرنے مین تساہل سے کام نہین لیا، اس طرح ہندوستانی لٹریچر مین ایک نئے اور بہت ہی مفید فن کا اضافہ ہوگیا، چنانچہ سترھوین اور اٹھارھوین صدی مین تاریخون، سوانح عمریون اور خطون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا،

کلچرل اثرات | مسلمانون نے ہندوستان مین صدیون حکومت کی، اس لئے یہان اُن کے تمدنی

اثرات گوناگون ہین ،

شکار خصوصاً باز اور شکرے سے شکار کھیلنے کے طریقون مین مسلمانون کا اثر غالب ہوا ، اس کے لئے ان ہی کی اصطلاحات استعمال ہوئین ، تمدن کے دوسرے شعبون مین بھی فارسی عربی اور ترکی الفاظ ہندی بنگالی بلکہ مرہٹی زبان تک مین استعمال کئے جانے لگے ،

مسلمانون نے فنون جنگ مین بڑی ترقی کی تھی ، انھون نے یہ فن ترکی سے سیکھا تھا ، جو یورپ کے فنون جنگ سے متاثر تھا ، اور کچھ ایرانیون سے بھی سیکھا تھا ، مغلون کی فوج کے نظم ونسق کو ہندو راجاؤن نے بڑی رغبت سے اختیار کیا ، تمدن جیسے جیسے بڑھتا گیا ، اور جنگ مین توپون کے استعمال کی کثرت ہوئی ، تو مسلمانون نے حصار بندی کو بڑی ترقی دی ، مسلمانون ہی نے یہان بارود رائج کی ، ہندوؤن کو جنگ مین ہاتھیون پر بڑا بھروسہ رہا کرتا تھا ، لیکن مسلمانون نے سوارون کے دستے کے طریقۂ جنگ کو اتنی ترقی دی کہ ہاتھی جنگی مصرف کے لئے بیکار ہوگئے اور وہ لڑائی مین صرف باربرداری کے کام مین آنے لگے ،

ملکی نظام ، دربار کے آداب ، لباس پوشاک ، اعلی طبقہ کے طرز زندگی سامان تعیشات ، فنون لطیفہ ، تعمیرات اور فن باغبانی مین مسلمانون کے اثرات بہت نمایان طور پر ظاہر ہوئے ، مغلون نے دربار کے مراسم ، خطابات اور سرکاری عہدیدارون کے آداب مین جن جن باتون کو رائج کیا ، ان کو اکثر ہندوؤن نے فخریہ نقل کیا ، راجپوت اور مالوہ کی بعض ریاستون مین سرکاری زبان آج تک اردو ہے ، اور اس کا رسم الخط دیوناگری کے بجاے فارسی ہے ،

محکمۂ مالیات کا نظام تو وہی رہا جو بہت ہی قدیم زمانہ سے ہندوستان مین رائج تھا ، لیکن اس نظام کی سرکاری ترتیب اور اس کے حساب کتاب کے طریقون اور اس محکمہ کے القاب کو مسلمانون نے رائج کیا اور ان سے ہندو ریاستون نے لیا ،

مسلمانوں کی روزانہ کی زندگی میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تعیش زیادہ تھا، وہ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لئے اُن کی وجہ سے صنعتوں اور فنون لطیفہ کو زیادہ فروغ ہوا، اُن کا ذوق ہندوؤں سے زیادہ بلند اور پاکیزہ تھا، متمول ہند وخصوصاً سرکاری طبقہ ان ہی کے ذوق کو اپنی زندگی کا معیار بناتا تھا حتی کہ معصیتوں میں بھی ان ہی کی ریس کرتا تھا،

مسلمانوں نے کھانے پینے کی بہت سی نئی چیزیں رائج کیں، جمالیات، عطریات اور رقص وسرود میں مسلمان شاہی خاندان کا ذوق پوری سوسائٹی کی رہبری کرتا تھا، گو رقص وسرود میں اُن کا ذوق کچھ بہت ترقی یافتہ نہ تھا،

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا، جیسا کہ اوس کے عربی نام سے ظاہر ہے، کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتیوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہو گیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھوں میں آنے لگیں، مخطوطات کی طلاکاری ایک خاص آرٹ ہے، جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا، اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لئے ہندی اور سنسکرت کتابیں نقل کی جانے لگیں، اور اُن کو مصور بھی کیا گیا، یہاں کی فارسی کتابوں کی طلاکاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی، جس کی وہ مستحق تھی، مسلمانوں ہی کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں، اور علوم وفنون کو پھیلایا جاتا، ورنہ اس سے پہلے ہندو اپنی کتابوں اور علوم وفنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے،

یونانی اطبا اپنے زمانہ کے بہترین طبی مشیر سمجھے جاتے تھے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ضرور تھی کہ سلاطین اور امراء اُن کی سرپرستی کرتے تھے، لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے فن طب کی ترقی بالکل مسدود ہو گئی تھی، اور مسلمانوں کا یہ فن روزافزوں ترقی کر رہا

تھا، کیونکہ وہ مغربی ممالک کی ترقیون سے باخبر رہتے تھے،

مسلمان بیرونی ملکون کا سفر کرکے تجارت کیا کرتے تھے، اس سے اُن کے ذہن و دماغ یین وسعت پیدا ہوتی رہتی تھی، ان کے مقابلہ مین ہندو گھر ہی مین بند رہنا پسند کرتے تھے، فارسی زبان مین "مرد جہاندیدہ" ایک اصطلاح ہے، جو ایسے شخص کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جس نے بہت زیادہ سیر و سیاحت کی ہو، ایسا شخص عقل و دانش اور کلچر کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، جو بالکل صحیح ہے،

"ص ع"

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے اُن کو بیحد پسند کیا،

ضخامت :- ۱۹۴ صفحے، چوتھا اڈیشن، قیمت :- عار

دروس الادب

عربی کی پہلی اور دوسری ریڈرین جن کو مصنف نے عربی کے ابتدائی طالب علمون کے لئے اس طرح لکھا ہے کہ طالب علم کو ادب اور نحو کے ساتھ ساتھ تعلیم اور مشق ہوسکے، اکثر مدارس مین یہ داخل نصاب ہے،

قیمت :- جلد اول ۳ر، جلد دوم ۶ر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام کامل | از جناب مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت
(حصہ اوّل) | ۲۲۴ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت للعہ روپیہ ۱-

محمد زبیر کتب خانہ امجدیہ سترکھ ضلع بارہ بنکی،

مصنف روشناس صاحب قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہین، انھون نے اسلام کی ایک کامل "تاریخ لکھی ہے، جس مین اُن کے بیان کے مطابق ابتداے آفرینش سے قیامت تک کے حالات ہونگے" چنانچہ اس حصہ مین تخلیق عالم سے لیکر بنی امیہ کے خاتمہ تک کی تاریخ ہے، اس کی تالیف مین عربی ماخذون کے علاوہ اردو مین بھی مصنف کو تاریخ اسلام پر جو مستند مواد مل سکا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا ہے، خصوصاً دار المصنفین کی کتب سیرت اور تاریخ اسلام سے بکثرت استفادہ کیا ہے لیکن حوالے اُن کے بجاے بیشتر اصل ماخذون کے دیئے ہین تاہم اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے کہ اس مین اسلام کی ابتدائی سو اصدی کے متعلق سیاسی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور علمی وغیرہ ہر قسم کے ضروری اور مفید معلومات سلیقہ سے جمع کر دیئے ہین، جس سے پڑھنے والون کے سامنے اسلام کی ہمہ گیر برکتون کا اجمالی نقشہ آجاتا ہے، اگر مصنف اس کتاب کا دامن ازل سے لیکر ابد تک وسیع نہ کر دیتے تو بھی اس کی حیثیت مین کوئی فرق نہ آتا اتنی جامعیت اسلامی تاریخ کے لئے ضروری بھی نہین تھی اور سرے اس کا نباہنا بھی آسان نہین تھا، چنانچہ اس کتاب مین تخلیق عالم سے لیکر ظہور نبوت تک کی تاریخ کا کل سرمایہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے چند نا تمام واقعات ہین اور وہ بھی دو چار صفحات سے زیادہ نہین جن کو اس دور کی تاریخ سے کوئی

نسبت نہین قیامت تک کے حالات کے علم کا ذریعہ توغیب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا، اور اگر اس سے مراد قیامت کی پیشنگوئیان ہین، تو ان کی حیثیت تاریخ کی نہین ہے، ایک علمی وادبی کتاب کی توثیق کے لئے وزراے حکومت کی تحریرین بھی بالکل غیر ضروری ہین، اُن کے شکرانے کے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے تھے، تاہم ان پہلوؤن سے قطع نظر یہ کتاب تاریخ اسلام سے متعلق متفرق معلومات کے لئے مفید اور عام لوگون کے مطالعہ کے لائق ہے،

رہنماے انسانیت یعنی دینِ فطرت — از جناب مولوی مغفوۃ الرحمن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۹ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۔ عہ پتہ ۱- ڈیوڑھی شہریار جنگ محلہ سلطان شاہی ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن،

آج کل مسلمانون مین عقیدہ اور عمل دونون قسم کی گمراہیان پھیلی ہوئی ہین، ایک طبقہ جو نئے اثرات سے متاثر ہے، اسلام سے بالکل بےگانہ اور بےعمل ہے، اس کی نگاہ مین اسلامی تعلیمات کی کوئی قدر وقیمت نہین، ایک دوسرا طبقہ جو اس کا منکر نہین، بلکہ اس پر عامل بھی ہے، لیکن بیشتر مروجہ عقائد واعمال کو خود اسلام سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان پر اوہام اور بدعات کے اتنے حجابات پڑگئے ہین، کہ ان مین اصلی اسلامی تعلیمات بالکل گم ہو گئی ہین، اور ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہین، اس لئے مسلمانون کی اصلاح کے ساتھ خود بگڑی ہوئی اسلامی تعلیمات مین بھی اصلاح کی ضرورت ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اس مین رائج الوقت غیر اسلامی عقائد وتصورات کی پوری تردید کی گئی ہے، اور قرآن مجید واحادیث نبوی کی روشنی مین صحیح اسلامی عقائد واعمال پیش کئے گئے ہین، کتاب اپنے مقصد پر حاوی ہے، مصنف نے ان تمام غیر اسلامی عقائد واعمال کی تصحیح کی ہے جن مین نہ صرف عوام بلکہ بہتیرے تعلیم یافتہ تک مبتلا ہین، اس لئے مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین ہے، لیکن جابجا ان کا طرز اصلاحی کے بجائے مناظرانہ اور مجادلانہ ہو گیا ہے اور [illegible] مصنف ان مختلف فیہ

سائل میں جن میں تاویل کی گنجائش نکل سکتی ہے، تشدد مناسب نہیں ہے، اور مصنف کے حسن نیت اور ان کے خیالات کی صحت کے باوجود اس سے بعض طبقوں کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے، تبلیغ و اصلاح میں شدت کے بجائے نرمی کے ساتھ افہام و تفہیم زیادہ مفید اور کارگر ہوتی ہے، خصوصاً جن مسائل کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں ان میں زیادہ سختی مناسب نہیں ہوتی، اس پہلو سے قطع نظر یہ کتاب اپنے مقصد اور خیالات کے اعتبار سے قابل قدر اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

۵۷ء کے ہیرو، از سیدہ انیس فاطمہ صاحبہ بریلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت مجلد ہے، پتہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

۵۷ء کے انقلاب میں جن بلند ہمت اور حوصلہ مند شخصیتوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، اس کتاب میں ان میں سے تین واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، جنرل بخت خان اور ضیاء الملک محمود خان روہیلہ کے مختصر حالات اور کارنامے لکھے گئے ہیں، واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اُن کی بیگم حضرت محل نے اپنے کمسن لڑکے برجیس قدر کو تخت نشین کرکے بڑی بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا، جنرل بخت خان بریلی میں حافظ الملک رحمت خان کے پوتے محمود خان کو گدی پر بٹھا کر مقابلہ میں آئے، اور ضیاء الملک محمود خان نے بجنور میں بہادر شاہ کی حمایت اور سرپرستی میں مخالفت کا علم بلند کیا تھا لیکن انگریزوں کے تدبر اور ہندوستانیوں کی نااتفاقی سے تینوں کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس کتاب میں ان تینوں حوصلہ مندوں کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں حکومت اودھ کی مختصر تاریخ اور اس زمانہ کے متعدد مجاہدین کے حالات بھی آگئے ہیں، مصنفہ کا انداز تحریر ادیبانہ اور موثر ہے، ایک خاتون کے قلم سے ایسی مفید اور سنجیدہ کتاب تحسین و آفرین کی مستحق ہے، کتاب کے شروع میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے قلم سے ایک مفید اصلاحی مقدمہ ہے۔

مرزا شوق لکھنوی از جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ پتہ محمد اسلم نمبر ۵، عماد الملک روڈ مسلم یونیورسٹی

علی گڈھ و اردو بک ڈپو چھراون ضلع مرادآباد،

اردو کی مثنویوں میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں بہار عشق و زہر عشق خصوصاً زہر عشق کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ کسی دوسری مثنوی کے حصہ میں نہیں آیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن بیان و لطف زبان محاورون اور روزمرہ کے استعمال، فصاحت و سلاست، سادگی و بے ساختگی جذبات و کیفیات کی مصوری اور جذب و کشش میں کوئی مثنوی زہر عشق اور بہار عشق کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ان کے جیسے بہتر نمونے ان دونون میں ملتے ہیں، ان سے اردو کی دوسری مثنویاں خالی ہیں، اور اس وصف میں گلزار نسیم اور سحر البیان بھی اپنی تمام خصوصیات کے باوجود ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، زہر عشق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بہار عشق کا پورا حق ادا نہیں کیا گیا تھا، مصنف نے اس کتاب میں اس کو ادا کیا ہے، وہ صاحب ذوق ادیب و نقاد ہیں، اس لئے بڑی خوبی سے زہر عشق اور بہار عشق کا تجزیہ کر کے ان کی خصوصیات اور ان کے محاسن و معائب دکھائے ہیں، انداز بیان دلکش اور ادیبانہ ہے،

ہماری کتاب قاعدہ پہلا دوسرا اور تیسرا حصہ مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم اے بی ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی، تقطیع بڑی کاغذ کتابت بہتر قیمت فی حصہ ۰ مجری عہ پتہ مکتبہ جماعت اسلامی رامپور

مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کی کتابوں کی کمی نہیں ہے، لیکن ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں ان کی تمام تعلیمی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو، یہ نصاب اسی ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے، اس میں اصول تعلیم کے مطابق اردو کی تعلیم کے ساتھ مذہبی و اخلاقی تعلیم و تربیت، مفید مذہبی معلومات، تاریخ اسلام کے متفرق مؤثر واقعات بچوں کے ذوق کی دلچسپ حکایات و منظومات وغیرہ وہ تمام باتیں موجود ہیں جو ایک مسلمان بچے کے لئے ضروری ہیں، اسلئے یہ نصاب تعلیمی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ان کے پڑھانے کے لائق ہے،

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، نظم سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- [illegible]

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہجہان نے شعرا اور فضلا کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائین، دربار کے امرا، شعرا اور فضلا نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت :- [illegible] صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

منیجر

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزمِ صوفیہ

جس میں عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمیدالدین ناگوریؒ، حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدرالدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخرالدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاءالدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح متاثر کیا اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- ؎

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

(دارالمصنفین [illegible]) منیجر

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱۱ اے
اگست ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی ادارون نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیون نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب مین داخل کرلیا، اس لئے چند برسون کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافون کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہین، اور بعض زیر طباعت ہین، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۵۵ صفحے قیمت: [illegible]

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- [illegible]

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیون کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۴۲۲ صفحے

قیمت:- [illegible]

جلد ۶۶ ماہ شوال المکرم ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات

اس صوبہ مین اردو زبان کی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہین نکلا، تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کسی حد تک اردو کا بھی حق مان لیا گیا، اور اسکو بھی تعلیم گاہون مین بار مل گیا لیکن اسکی جو شکل اختیار کی گئی ہے، وہ عملاً بے نتیجہ ہے، اور شعبۂ تعلیم کے حکام اور عہدہ دارون کی اردو دشمنی کی بنا پر اس اجازت سے بھی پورا فائدہ نہین اٹھایا جا سکتا،

اس کی تفصیل یہ ہو کہ نئے نظام تعلیم مین بنیادی طور پر یہ مان لیا گیا ہو کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان مین دیجائے گی، اور مادری زبان وہ مانی جائے گی جو بچون کے والدین بتائین گے، اس اصول کے مطابق پرائمری تعلیم مین اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے، اور اس کی کتابین بھی ملتی ہین لیکن اس کے متعلق احکام اتنے مجمل ہین کہ ان سے فائدہ اٹھا کر پرائمری اسکولون سے عملاً اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے، اور صاف جواب ملتا ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام نہین ہو سکتا، اگر کسی اسکول مین کسی مجبوری کی بنا پر اس کا انتظام ہو بھی تو اردو کے ساتھ ہندی کی تعلیم بھی ضروری ہے حتی کہ اسلامی مکاتب بھی اس پر مجبور ہین، اس سے بچون پر دہرا بار پڑتا ہے، اور جب اعتراض یا گرفت کا خطرہ ہوتا ہو تو یہ جواب دیا جاتا ہو کہ اردو مین پڑھنے والے لڑکے ہی نہین ملتے، یہ جواب ان مقامون کے لئے جہان مسلمانون کی آبادی بہت کم اور محض ادنی طبقون پر مشتمل ہو کسی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہو لیکن ان بڑی آبادیون کے لئے جہان ہر طبقہ کے مسلمان ہون، یہ عذر لنگ کسی حیثیت سے بھی قابل سماعت نہین، ضلع اعظم گڈھ مین مسلمانون کی بڑی بڑی بستیان ہین لیکن کسی پرائمری اسکول مین اردو مین تعلیم کا انتظام نہین، یہی حال دوسرے اضلاع کا بھی ہوگا،

جونیر ہائی اسکول یعنی چھٹے ساتویں آٹھویں میں ہندی لازمی ہے اور اردو کی حیثیت جنرل سائنس اور انگریزی کے ساتھ اختیاری مضمون کی ہے، چنانچہ جن اسکولوں میں جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے وہاں اس کے ساتھ صرف ایک اختیاری مضمون لیا جا سکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اپنی اہمیت کی بنا پر انگریزی زبان ہوگی، اس طرح ان اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی موقع ہی نہیں رہ جاتا، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی طالب علم اردو لینا چاہے تو بھی اس کو مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً ہندو اسکولوں میں جن کی بڑی تعداد ہے، اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے گورنمنٹ اسکولوں میں ممکن ہے یہ صورت نہ ہو لیکن موجودہ ذہنیت میں وہاں بھی اردو کی تعلیم دشواریوں سے خالی نہ ہوگی، اس لئے دیگر مسلمانوں کے اسکولوں میں جن کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام ہے اردو باقی رہ گئی ہے، اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ اردو کی کتابیں نہیں ملتیں، اردو سے بے اعتنائی کا یہ حال ہے کہ اس سال کے نصاب میں دوسری تمام اختیاری زبانوں حتی کہ بنگالی تک کی کتابیں مقرر کر دی گئی ہیں لیکن اردو کتابوں کا کہیں نام نہیں ایسی حالت میں جن اسکولوں میں اردو ہے بھی وہ کونسی کتابیں پڑھائیں، سکنڈری ہائر اسکولوں میں بھی کم و بیش اسی قسم کی مشکلات ہیں، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ان میں ذریعۂ تعلیم ہندی کر دی گئی ہے اور ۵۲ء سے امتحانات کے جواب بھی ہندی میں دینا ہونگے ایسی حالت میں اردو کی حیثیت اور اہمیت کیا رہ جاتی ہے، اس سلسلہ میں اردو کی جانب سے یہ بنیادی غفلت بھی قابلِ ذکر ہے، کہ اس سال سے ٹریننگ اسکولوں سے اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دنوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ نہ ملیں گے،

اگر اردو کے بارہ میں گورنمنٹ کی پالیسی اعتراض سے بچنے کے لئے اس کی تعلیم کی محض قانونی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت اسکی تعلیم بھی چاہتی ہے تو ان ساری مشکلات کا حل یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بارہ میں اسکی پوری صراحت ہونی چاہئے کہ جن طالب علموں کی مادری زبان اردو ہوگی، ان کو صرف اردو میں تعلیم دیجائیگی، اسکے ساتھ ہندی پڑھائی جائیگی اور اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے طلبہ کی تعداد بھی متعین کر دینی چاہئے، تاکہ اجمال کی وجہ سے

اردو کو ختم کر دینے کی گنجایش باقی نہ رہے، جونیر ہائی اسکول مین ایک کے بجائے دو اختیاری مضمون کر دیئے جائین تاکہ دوسرے اہم مضامین کے ساتھ اردو لینے کی گنجایش بھی باقی رہے، کم از کم گورنمنٹ اسکولون مین جو اسکے اختیار مین مین اردو کی تعلیم کے احکام پر سختی کیساتھ عمل کرایا جائے سکنڈری ہائر اسکولون مین جو اردو مین تعلیم دینا چاہین انکو اس کی اجازت دیجائے اور اُس کے نصاب کی کتابین مہیا کیجائین، امتحان کے سوالات کے جوابات اردو مین بھی دینے کا اختیار دیا جائے، ٹریننگ اسکولون مین اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن مقامون پر مسلمانون کی کافی آبادی ہو وہان اُردو کے مستقل پرائمری اور جونیر ہائی اسکول قائم کئے جائین جن مین صرف اردو ذریعہ تعلیم ہو، اسمین کوئی دشواری نہین ہے کیا صوبہ متحدہ مین اردو کی وہ حیثیت بھی نہین ہے، جو بمبئی مین ہے، وہان گجراتی اور مرہٹی کے ساتھ اردو کے بھی مستقل اسکول قائم کئے گئے ہین، اردو سے اس بے اعتنائی کے باوجود اس صوبہ سے اس کا اتنا تعلق تو ماننا ہی پڑے گا کہ

گویان نہین پہ یان سے نکالی ہوئی تو ہے — اس کو بھی اس دیار سے نسبت ہے دور کی

ورنہ موجودہ صورت مین تو اردو کی تعلیم اور اس کا باقی رہنا ممکن نہین ہے،

انجمن ترقی اردو نے اردو کے متعلق شعبۂ تعلیم کی جملہ شکایتون اور بے عنوانیون کی تحقیقات اور اس کے تدارک کے لئے لکھنؤ مین جو کمیٹی مقرر کی ہے ضرورت ہے کہ تمام اضلاع بلکہ ضلع کی بڑی بڑی آبادیون مین اسکی سب کمیٹیان قائم کیجائین، جو اپنے یہان کی تعلیمی شکایات کو لکھنؤ کی مرکزی کمیٹی تک پہنچائین اب اردو کا تحفظ اور اس کی بقا صرف اس کے حامیون کی کوشش پر منحصر ہے، اس لئے گورنمنٹ نے جس حد تک بھی اسکی تعلیم کی اجازت دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی تمام شکلین اختیار کرنی چاہئین، اور باقی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد جاری رکھنی چاہئے، اس کے لئے عمل اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، اگر اردو کے حامی ہمت جرأت اور استقلال سے کام لین تو گورنمنٹ اردو کے واجبی حقوق ماننے پر مجبور ہوگی،

مقالات

الجزیہ

از
مولانا سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین

(۲)

جزیہ اور قرآن | جزیہ کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کرنے کے بعد کہ وہ ذلت کا مرادف تھا، آیت جزیہ پر بحث اور مفسرین کے اقوال سے صغار کی تشریح کی جاتی ہے، سر عبد و ناتھ سرکار کی طرح بہت سے معترضین اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، اور اس سے جزیہ کی ذلت کا مفہوم نکالتے ہیں، بلاشبہ بعض مفسرین اور فقہاء نے جزیہ کو ایسا ہی سمجھا ہے، لیکن اسلامی حکومتوں کے عمل سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اس کی حیثیت ان فقہاء اور مفسرین کے ذاتی اقوال سے زیادہ نہیں ہے،

قرآنی تعلیمات پر عمل کا سب سے مکمل نمونہ عہد رسالت اور عصر خلفائے راشدین ہے، اور ان مبارک زمانوں میں صغار (ذلت) کا مطلق پتہ نہیں چلتا، چنانچہ مفسرین کی جماعت میں سے ایک بڑے عالم علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب جنھوں نے تفسیر سراج المنیر ۹۶۸ھ میں تالیف کی تھی، اپنی اسی کتاب (ص ۶۰۲ جلد ۱) میں لکھتے ہیں،

تفسیر ان مجلس الاٰخذ ..... اوس کی یہ تفسیر کرکے یوں غیر مسلم کو ذلیل

مردود، بان ھذہ الھیئۃ باطلۃ	کیا جائے) مردود ہے کیونکہ یہ (ذلیل
ودعوی سنیتھا اووجوبھا اشد	کرنے کی) شکل غلط اور اس کے سنت یا واجب
بطلانا، ولم ینقل ان النبی صلی اللہ	ہونے کا دعوی کرنا اور بھی غلط ہے اور یہ منقول نہیں
علیہ وسلم ولا احد امن	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے
الخلفاء الراشدین فعل شیئا	راشدین میں سے کسی نے اس میں سے کچھ
من ذالک وعلی تفسیرھا بما	بھی کیا ہو (یعنی ذلت کا کوئی طریقہ بھی
ذکر یمتنع التوکیل اذ قیل بوجوب	اختیار کیا ہو) اور اس تفسیر کے بموجب
	جب یہ ہیئت تذلیل بھی ضروری ہو تو

(ابوحیان غرناطی اور ابن قیم وغیرہ کی تشریحات آگے آتی ہیں)

قرآن کے ایک شارح اور عالم اسلامی کے ایک مشہور مفسر کے اس دعوی کے بعد ہم کو حق پہنچتا ہے کہ پروفیسر جدوناتھ سرکار کی تاریخ دانی سے اُن واقعات کا استفادہ کریں جو غیر مسلموں سے وصول جزیہ کے وقت اسلامی دفاتر میں بطور اہانت و تذلیل پیش آئے ہوں، اسرکار نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بے شبہہ بعض کتابوں میں موجود ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ہندوستان میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا،

صغار کی بحث | بہرحال قرآن مجید میں جزیہ کے متعلق جو آیت ہے یہ ہے،

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَ	تم لڑو ان لوگوں سے جو نہ خدا پر ایمان
لَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا	رکھتے ہیں، نہ اخیر دن پر، اور نہ حرام سمجھتے ہیں
حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ	ان چیزوں کو جو خدا اور اس کے رسول نے
دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	حرام کیں اور نہ سچا مذہب اختیار کرتے ہیں
حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ	ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک

صَاغِرُوْنَ ، (توبہ) کہ وہ جزیہ دین ، ہاتھ سے اور وہ پست ہون

اس آیت مین چند امور غور طلب ہین ،

۱- یہ تمام غیر مسلمون کے متعلق نہین ہے ، بلکہ اس کا تعلق خاص اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہے ،

۲- تمام اہل کتاب کے متعلق بھی نہین ہے ، بلکہ ایک خاص گروہ کے متعلق ہے ، جو اسلام کا دشمن تھا ،

۳- سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت مین جن مشرکون یا یہود و نصاریٰ سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے ، اُن مین یہ معائب موجود تھے ، معاہدہ پورا نہ کرنا مسلمانون کے خلاف دشمن کو مدد دینا ، مسلمانون کے عہد اور قرابت کا لحاظ نہ کرنا ، زبان سے محبت ظاہر کرنا ، اور دل مین عداوت رکھنا ، بدعملی ، لالچ ، اسلام سے نومسلمون کو برگشتہ کرنا ، ظلم ، اسلام پر حملہ کرنا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلا وطن کرنا ، زیادتی مین پہل کرنا ، معمولی مذہبی خدمتون پر فخر کرنا ، خاص یہود و نصاریٰ مین یہ عیوب تھے ، کفر :- یہود حضرت عزیرؑ کو اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ، شرک حضرت مسیحؑ احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے ، اسلام کو فنا کرنے کی کوشش کرتے تھے ، اس سے لوگون کو برگشتہ کرتے تھے ، غلط طریقون سے مال کھا جاتے تھے ، کارِ خیر مین سونا چاندی خرچ نہین کرتے تھے ،

۴- ظاہر ہے کہ جو فرقہ مذہبی اور اقتصادی خرابیون کے ساتھ ساتھ سیاسی حیثیت سے مسلمانون کا مدِ مقابل ہو ، جو اسلام کو فنا کرنے پر تیار رہے ، جو نومسلمون کو ورغلاتا ہو ، اس کی سزا اس سے زیادہ نرم اور مناسب کیا ہو سکتی ہے کہ اوس کو لڑ کر زیر کیا جائے ، اور اپنا ماتحت بنایا جائے ،

۵- ایسے لوگون کا ماتحت ہونا اور محصول (جزیہ) ادا کرنا ، نہ صرف ان کے نقطۂ نظر بلکہ تمام دنیا کے نقطۂ خیال سے ذلت اور پستی کا مرادف ہے ، خواہ حاکم ان کو ذلیل سمجھے یا نہ سمجھے ،

۶- چونکہ یہ لوگ علانیہ اسلام کے دشمن تھے ، اس لئے تہدیداً خدا نے فرمایا کہ مسلمانون کو ان سے برابر لڑتے رہنا چاہیئے تا وقتیکہ یہ پست ہو کر محصول نہ ادا کرین ،

۷۔ آیت میں دو لفظ ہیں جن سے صغار کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے، عن ید اور صاغرون

۸۔ عن ید کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اصالۃً جزیہ کی رقم ادا کرنی چاہئے، وکالۃً داخل نہیں ہو سکتی لیکن یہ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے، فقہ کی متعدد کتابوں میں اس کی تصریح آئی ہے کہ اصالۃً حاضر ہونا ضروری نہیں، گو بہتر ہے[۱]، اور آج بھی عدالتوں، بنکوں، اور ڈاکخانوں میں روپیے کے ادا ہونے کے وقت اصالۃً موجود رہنا بہتر سمجھا جاتا ہے، خود اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی اصالۃً حاضری ضروری نہ تھی، چنانچہ ۱۰۸۹ھ مطابق ۲۲ جلوسی میں چتوڑ کے رانا نے جب اس شرط پر صلح کی کہ

"قبول جزیہ بجد اموں، دو سہ پرگنہ عوض زر جزیہ از ملک خود"[۲]

تو اس شرط کو قبول کیا گیا، حالانکہ اگر اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہوتا، تو نہ پرگنے اس کا عوض ہو سکتے تھے، اور نہ اپنی ریاست کے پایہ تخت میں موجود رہنا کافی ہو سکتا تھا،

۹۔ عن ید کے اور بھی معنی ہیں، امام ابن العربی (۵۴۳ھ) نے احکام القرآن میں پندرہ قول نقل کئے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ید کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں یا مجازی، اگر حقیقی معنی مراد ہوں تو اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہے، اور اگر مجازی معنی لئے جائیں، تو بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، چنانچہ اس دوسری صورت میں ید کے حسب ذیل معنی بھی ہو سکتے ہیں، ہاتھوں[۱] ہاتھ (یعنی دینے والا اپنے ہاتھ سے حاکم جزیہ کے ہاتھ میں دے، خواہ اصالۃً خواہ وکالۃً) نقداً[۲] ادا کرے (زر جزیہ کو باقی نہیں رکھنا چاہئے) بلا ستایش[۳] وطلب (ادا کرے) وغیرہ (ص ۲۰۳ ج ۱ مصر) غرض ان میں سے جو صورت بھی لے لی جائے، صغار (ذلت) کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوتا،

۱۰۔ صاغرون کا لفظ البتہ صغار کو صاف صاف بتاتا ہے، لیکن صغار کی کیا صورت ہو؟ اس میں فقہاء مختلف الرائے ہیں، بعض نے اس کی یہ شکل تجویز کی ہے، کہ غیر مسلم جزیہ کے دفتر میں جائے، اور

---

[۱] ہدایہ ص ۵۸۰ جلد ۲ [۲] منتخب اللباب ج ۲ صفحہ ۲۶۲ مصنفہ خافی خان نظام الملکی،

کھڑے ہوکر اپنی رقم داخل کرے لیکن کھڑا رہنا ذلت کی بات نہین، آج عدالتون، بنکون اور ڈاکخانون مین
عموماً کاروباری آدمی کھڑے ہی رہتے ہین، کیونکہ بیٹھنے کا انتظام نہ ہوتا ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، مسلمانون
کی سلطنت مین اگر دفاتر جزیہ مین کھڑے ہوکر رقم داخل کرنا غیر مسلمون کے لئے ضروری تھا، تو معترضین کو
اس کے بالمقابل یہ بھی دکھانا چاہئے کہ مسلمانون کی نشست کا انتظام زکوٰۃ کے دفاتر مین ہوتا تھا؟ بعض
کا قول ہے کہ حاکم جزیہ، ذمی سے کہے "اد ذمی! جزیہ دے" اس قول کو سرجدوناتھ نے اپنی تاریخ (ص
۲۶۹ ج ۳) مین بڑے آب و تاب سے نقل کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اسلامی فقہ کے رو سے وصول جزیہ
کا بھی ذلیل طریقہ تھا لیکن یہ کہین نہین دکھایا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ مین اسی طرح جزیہ وصول
بھی کیا جاتا تھا، فقہ کی کتابون مین لکھا ہونا اور بات ہے، اور اس پر عمل ہونا اور بات، اس موقع پر
علامہ ابو حیان غرناطی (۷۴۵ھ) کی عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے، وہ البحر المحیط (۹ جلد ۵) مین لکھتے ہین کہ
لوگون نے ذلت کی جو صورتین لکھی ہین، ان مین آیۃ قرآنی مین ایک کا بھی تذکرہ نہین، اسی طرح امام ابن قیم (۷۵۱ھ)
کی یہ رائے قابل توجہ ہے،

وھٰذہ کلّہ مما لا دلیل علیہ	یہ تمام باتین بے دلیل ہین، اور آیت
ولا ھو مقتضی الآیۃ ولا نقل	اُن کو نہین چاہتی، اور نہ رسول اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا	صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے یہ باتین
اصحابہ (فتح البیان ص ۲۹ جلد ۴)	منقول ہین،

علامہ شربینی کا وہ قول بھی دیکھنا چاہئے جس مین انھون نے تصریح کی ہے کہ اہانت کی یہ صورت غلط ہے اور اس کا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ مین کوئی ثبوت نہین ملتا، نواب صدیق حسن خان بھی
لکھتے ہین کہ ان چیزون کی کوئی دلیل نہین ہے" (فتح البیان ص ۲۹ ج ۴)

بعض نے صغار کے زیادہ مناسب معنی بیان کئے ہین یعنی جزیہ دینا خود ذلت ہے، اس بنا پر

غیر مسلمون کے لئے ذلت کی شکلین پیدا کرنے کی ضرورت نہین ہے) یہ امر کہ محکومی اور غیر قوم کی اطاعت ذلت ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ آسٹریلیا، آئرلینڈ اور اُن کے سیاسی رہناؤن سے دریافت کرنا چاہئے۔ بہرحال طبری (۳۱۰ھ) محی السنۃ بغوی (۵۱۶ھ) اور امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیرون مین یہ خیال بھی نقل کیا ہے،

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ صغار یہ ہے کہ اسلامی قانون (معاملات کے متعلق) اُن پر عائد ہو تا رہے، یعنی وہ مذہبی مسائل کے علاوہ دنیاوی باتون مین قانون اسلامی کی پابندی کرتے ہین، یہ خیال جو دنیائے اسلام کے ایک بڑے امام کا ہے، تمام خیالون سے زیادہ صحیح ہے، اور محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل (ص ۷۰ ج ۲) مین امام ابن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۱۲۹ ج ۶) مین اور شربینی نے (۹۷۷ھ) نے سراج المنیر مین اس کو نقل کیا ہے، تیسرے اور چوتھے نظریون کے مطابق صغار کا مفہوم محض ذہنی اور خیالی رہ جاتا ہے، اور اس کا تعلق مسلمان حکام سے باقی نہین رہتا، اب ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہوا کہ

(۱) قرآن مجید کے روسے صغار کے مستحق تمام غیر مسلم نہین ہین، بلکہ وہ مخصوص اہل کتاب ہین جو اسلام اور مسلمانون کے دشمن تھے، اور جن سے لڑائی کا حکم دیا گیا تھا،

(۲) اور غیر مسلم اس لئے جزیہ دیتے تھے کہ ان کے محصول کا یہی نام تھا، اور کوئی نیا نام رکھا نہین گیا تھا،

(۳) صغار کا لفظ قرآن مجید مین دشمنانِ اسلام کے لئے تہدیداً استعمال کیا گیا ہے اور اس پر خود عہد رسالت مین بھی عمل نہین ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زجر و توبیخ ویسی ہی تھی، جیسی کہ ماں باپ اپنی اولاد کو کرتے ہین، اس کا مقصد مسلمانون کے دلون مین غیر مسلمون کی طرف سے منتقمانہ جذبات کی پرورش نہ تھی،

(۴) جو غیر مسلم دشمنِ اسلام نہین ہین، اُن کے لئے صغار بھی نہین ہے،

(۵) صغار کا مطلب ذلیل برتاؤ نہین، بلکہ ماتحتی اور سیاسی معاملات مین اسلامی قانون کی پابندی ہے، معزز ماتحت بھی بہر حال ماتحت ہے، یعقوب بن لیث الصفار کا قول ہے کہ "کمتر چون تو باید داشت"[۵۱]

اب ضرورت ہے کہ سرجدونا تھ سرکار اور ہمارے معترض "ارسطو"[۵۲] اس پر غور کرین کہ اسلامی عہدِ حکومت مین غیر مسلمون کے ساتھ کیا ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا!

جزیہ کی شرح | ہندوستان کے جزیہ کی (جس کا تذکرہ منوسمرتی میں ہے) کوئی شرح منوجی نے مقرر نہین کی، بلکہ ہر شخص پر برابر محصول لگایا (باب ۷، دفعہ ۱۲۸) جو ظاہر ہے کہ بالکل خلاف انصاف تھا، نوشیروان کے فرمان مین رعایا کی مالی حالت کے اختلاف سے جزیہ بھی مختلف مقرر کیا گیا، یعنی ۱۲، ۸، ۶، ۴ درہم (طبری ص ۹۶۲ جلد ۲) لیکن اس مین سلطنت کے مختلف صوبہ جات کی اقتصادی حالت کو سامنے نہین رکھا گیا تھا، بلکہ امرا، متوسطین اور غربا، کی یکسان حالت تمام صوبون میں فرض کر لی گئی تھی اور یکسان جزیہ لگا دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ہی خواص وعوام کی نہایت ناگوار تفریق پیدا کی گئی تھی

لیکن اسلام مین معاشیات کا سوال ابتدا سے سامنے تھا، اس لئے مختلف ممالک کی اقتصادی حالت کے مطابق وہان کی رعایا پر جزیہ مقرر ہوا، اور اس کی مختلف شرحین قرار دی گئین، اہلِ یمن سے بحساب ایک دینار سالانہ، اہلِ شام سے ۴ دینار، مکہ کے ایک نصرانی سے ایک دینار[۵۴]، عراق کی رعایا

---

[۵۱] زین الاخبار ص ۱۳ تالیف ابو سعید عبدالحئی گردیزی در حدود ۴۴۴ھ [۵۲] اس مضمون مین ان تمام اعتراضات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو جزیہ پر کئے جاتے ہین، عرصہ ہوا آمیہ گزٹ لاہور مین "ارسطو" کے فرضی نام سے جزیہ کے خلاف ایک مضمون نکلا تھا، اس مضمون مین ارسطو کے اعتراضات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے [۵۳] احکام القرآن ابن عربی ص ۷۷، ۴، جلد ۱،

[۵۴] کتاب الخراج یحیٰی بن آدم ص ۷۳،

سے (بعض روایات کے مطابق) ۴۸ درہم سالانہ[1] اور عام ممالک وصوبہ جات سے ۴۸، ۲۴، ۱۲ درہم سالانہ فی کس جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یہ آخری شرح جیسا کہ بالتصریح معلوم ہے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے زمانہ میں برابر قائم رہی[2] اور امام ابو حنیفہؒ، امام محمد بن حسنؒ اور (بروایت مصنف فتح البیان) امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کو اختیار کیا[3]، جزیہ کا عالمگیری فرمان اگرچہ مرأت احمدی (ص ۳۱۳ ج ۱) میں بلفظہ منقول نہیں ہے لیکن سرجادوناتھ سرکار نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے، اس کی دفعہ ۷ میں یہی شرح موجود ہے، جو ان کے نزدیک ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، جو غریبوں کے کاندھوں پر ڈالا گیا (اس کا جواب آگے آتا ہے)۔

معاشی حیثیت سے ایک اور اصول زر جزیہ کے متعلق اختیار کیا گیا ہے، قدیم ہندوستان میں محصول نقد کی شکل میں لیتے تھے، مثلاً روپیہ، دھرن، ستمان، تنشک، پن وغیرہ (منوسمرتی باب ۸ دفعات ۱۳۵ تا ۱۳۸)، ایران میں بقول طبری درہم تھے، چین کا کچھ پتہ نہیں لیکن اسلام میں ہر پیشہ والے کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جزیہ کی نقد رقم کے بجائے اپنے اپنے پیشہ کی چیز کو دیسکتا ہے[4]، البتہ مردار سور اور شراب جزیہ کی رقم میں قبول نہیں کئے جائیں گے[5]، اس طرح جو سہولت غیر مسلم رعایا کو اسلامی سلطنت کے اندر میسر تھی، وہ دوسرے ممالک میں نہ تھی، اور نہ آج تک کسی ملک میں میسر ہے،

جزیہ کون لوگ دیتے تھے | قدیم ہندوستان میں ہر شخص سے جزیہ لیا جاتا تھا، (منوسمرتی دفعہ ۱۳۷ باب ۸) جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، ان کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے، غیر مستطیع بھی کچھ نہ کچھ دیتے تھے (دفعہ ۴۰۵ باب ۸) جو لوگ محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، وہ ہر مہینہ میں ایک دن بیگار میں پکڑے جاتے تھے (دفعہ ۱۳۸ باب ۷)، ایران میں اس سے کم سختی تھی، وہاں ۲۰ اور پچاس سال کے درمیان عمر والے مرد جزیہ دیتے تھے، اور عورتیں مستثنیٰ نہ تھیں، چین میں اس سے بھی زیادہ سہولت تھی، وہاں صرف مردوں

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۲۲ [2] عینی شرح کنز ص ۳۲۰ ج ۱ [3] فتح البیان ص ۲۶ جلد ۴ [4] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۶۹ [5]

سے جزیہ لیا جاتا تھا جن کے لئے ۱۸ سے ۶۰ سال تک عمر کی شرط تھی،

اسلام مین ان تمام ممالک سے زیادہ جزیہ مین رعایت کی گئی، صرف عاقل بالغ اور کام کرنے کے قابل مردون پر محصول لگایا گیا، اور کام کی حیثیت سے اُن کے ۳ طبقے قرار دیئے گئے،

۱۔غنی جو دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ کا مالک ہو،

۲۔متوسط جو ۲۰۰ درہم سے دس ہزار تک کا مالک ہو،

۳۔فقیر جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا اس کی آمدنی ضروریات زندگی سے زائد نہ ہو،

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۷۰) مین اس کی پوری تفصیل بیان کی ہو کہ صراف، بزاز، مالک اراضی، تاجر، مطب کرنے والے طبیب مین جو غنی اور متوسط ہون، وہ اپنی آمدنی کے مطابق جزیہ ادا کرین ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر، مثلاً خیاط، رنگریز، موچی وغیرہ تیسرے درجہ مین ہین، وہ اس کی شرح کے مطابق محصول دین، اس موقع پر سر جدو ناتھ نے بعض فقہار کی رائے کے مطابق صرافون وغیرہ کو پہلے درجہ مین اور خیاطون وغیرہ کو تیسرے درجہ مین رکھکر درمیانی طبقہ کو غائب کر دیا ہے، (تاریخ عالمگیر ص ۲۶۹ ج ۳) حالانکہ امام ابو یوسف کی طرح اور فقہار نے بھی صرافون وغیرہ کے دو درجے قرار دیئے ہین، غنی اور متوسط،

ایسے اپاہج، اندھے اور لنگڑے لولے جو متمول ہون اور جن کا کاروبار اچھا چلتا ہو، اُن پر جزیہ ہے، اسی طرح دولت مند مقدس راہب اور پجاری بھی اس سے مستثنیٰ نہین ہین، (اورنگزیب کے عہد کے مالدار برہمن بھی اسی حکم مین آتے ہین،)

کون لوگ جزیہ نہین دیتے تھے قدیم ہندوستان مین صرف تین قسم کے لوگ جزیہ سے مستثنیٰ تھے، شودر، ستر برس کے بوڑھے اور برہمن، (منوسمرتی دفعہ ۳۹۴ باب ۸) ایران مین ۲۰ سال سے کم اور پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگ محصول ادا نہین کرتے تھے، اُن کے علاوہ خاندان شاہی منصبدار

فوج، مذہبی پیشوا و فاتر کے منشی، اور ملازمین سلطنت جزیہ کے مطالبہ سے آزاد تھے، بچین مین عورتین جزیہ نہین دیتی تھین، اور ۱۵ سال سے کم اور ۵۰ سال سے اوپر عمر والے مرد بھی مستثنیٰ قرار دئیے گئے تھے،

اسلام نے عورتون، بچون، پاگلون، غلامون، محتاج اور راز کار رفتہ بڈھون، نادار راہبون، اور بیمارون (نادار برہمن اورنگ زیب کے زمانہ مین اسی حکم مین شامل تھے،) مفلس، اندھون، اپاہجون، اور لنگڑے لولون کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اورنگ زیب نے عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ایک حکم بھیج کر غیر مسلم ملازمین سلطنت کو بھی جزیہ سے بری کیا تھا، مرأت احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) مین یہ الفاظ ہین،

"بندگان حضرت قدر قدرت عنایت اللہ خان را بتمشیت این کار تفویض فرمودند حکم اشرف اعلیٰ شرف صدور یافت کہ از ملازمان سرکار دولت مدار موافذہ نکنند، وسوائے آنان از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

تعجب ہو کہ ہمارے ارسطو صاحب کی نظر اس نکتہ اور اس عبارت پر نہین پڑی اور نہ وہ یہ تکلیف نہ فرماتے، کہ ۱۶۷۹ء مین اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جزیہ سب سے وصول کیا جائے خواہ اسلامی ہندوستان ہو یا راجپوتانہ کوئی سرکاری ملازم ہو یا نہ" (آریہ گزٹ)

جزیہ کے مصارف | مصارف عامہ کا بنیادی اصول بہبود عامہ ہے، اور اسلام مین جزیہ کے مصارف کو مختلف مدون مین اس طرح تقسیم کیا گیا ہے، کہ عوام کو ہر مد کے مصارف سے بیشتر فائدہ حاصل ہوتا تھا،

۱- مصارف عامہ کی سب سے پہلی اور ضروری مد فوجی انتظام ہے، اور یہ اسی جزیہ کی رقم سے ہوتا تھا امام ابو یوسفؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے[1]

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۴،

وَاضَعُ علیھم فیھا الخراج و فی — اور میں ان (ذمیوں) پر زمین میں خراج

رقابھم الجزیۃ یؤدونھا — اور اُن کی گردنوں میں جزیہ مقرر کرتا ہوں

فتکون فیئاً للمسلمین المقاتلۃ — جس کو وہ ادا کریں گے اور جو مسلمان فوج

والذریۃ ولمن یاتی من — اور اس کی اولاد اور آئندہ آنے والوں

بعدھم، — کے لئے نئے (غنیمت) ہوگا۔

یہ فوج سرحدوں کے علاوہ بڑی بڑی چھاؤنیوں (مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر) میں بھی رہتی تھی، جس کا اسی تقریر میں ذکر ہے، اور یہ سب فوجی وظیفہ دار تھے، خلیفہ کا فقرہ ہے واد دارالعطاء علیھم، اور مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) میں بھی ہے،

فیوخذ منھم المال لیصرف — یعنی ذمیوں سے جو وصول ہوگا، وہ اُن

الی الغزاۃ الذین یقومون — غازیوں کو ملے گا، جو دارالاسلام کی حفاظت

بنصرۃ الدار — کرتے ہیں،

(۲) ایک مد تحصیل کے اخراجات کی تھی، اس سے عمال کو تنخواہ ملتی تھی، مصنف کنز الدقائق (باب العشر) اور صاحب درمختار نے اس کی تصریح کی ہے،

(۳) سول یا دیوانی محکموں کی تنخواہوں اور اخراجات کی مدیں بہت سی مدیں شامل تھیں، مثلاً

امورِ نافعہ (پبلک ورکس) میں پتھر کے پلوں (قناطر) اور لکڑی اور مٹی کے پلوں (جسور) کی تعمیر کا کام اسی مد سے ہوتا تھا، (کنز و درمختار)

محکمۂ عدالت میں قاضیوں اور مفتیوں کی تنخواہیں، (کنز و درمختار) دفاتر قضا کے محرروں اور تقسیم کے گواہوں کے معاوضہ (کنز و درمختار) اسی سے ادا کئے جاتے تھے،

نباہر کی نگرانی کرنے والے اسی رقم سے تنخواہ پاتے تھے، (کنز و درمختار)

تعلیمات مین علماء اور طلبہ کے وظائف اسی سے نکالے جاتے تھے، (در مختار و رد مختار ص ۳۰۳ جلد ۳)

۴۔ مسلمانون کے علاوہ خود ذمیون کے ایسے افراد کو جو قابل امداد ہوجاتے تھے، اسی سے مدد دیجاتی تھی، حضرت خالد بن الولیدؓ نے حیرہ والون کو جو فرمان عطا کیا، اس مین یہ الفاظ درج تھے[1]

ایما شیخ ضعف عن العمل او	اور جو بوڑھا کام کرنے مین کمزور ہو یا اس
اصابتہ آفۃ من الآفات او	کو کوئی آفت آگئی ہو، یا مالدار ہونے کے بعد
کان غنیا فافتقر وصار اھل	محتاج ہوگیا ہو، اور اس کے مذہب والے
دینہ یتصدقون علیہ طرحت	اس کو خیرات دینے لگے ہون، تو اس کا
جزیتہ، وعیل من بیت المال	جزیہ معاف کیا جائے، اور مسلمانون کے
المسلمین وعیالہ ما اقام	بیت المال سے اس کو اور اس کے بچون
بدار الھجرۃ ودار الاسلام	کو امداد دیجائے جب تک وہ دار الہجرۃ اور دار الاسلام میں رہے

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت مین اور مقامات کے معذور بوڑھون کے لئے بھی یہ عام قاعدہ بنا دیا گیا تھا، اونھون نے ایک دفعہ ایک بوڑھے نابینا یہودی کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جزیہ کی رقم اور دوسری ضروریات کے لئے بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اُس کا اور اُس کے جیسے تمام بوڑھون کا جزیہ معاف کر دیا جائے[2]

اسلامی اور غیر اسلامی جزیون کا فرق (۱) اسلامی اور غیر اسلامی محصولون مین نمایان فرق یہ ہے کہ اسلام نے ربانی ذمہ داری کی بنا پر دنیا کا نظم و نسق اپنے ہاتھ مین لیا تھا، اس لئے وہان محصول کا اصل مقصد روپیہ نہ تھا، شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۷۷، ۸۰، ج ۱۰) مین جابجا اس کا تذکرہ کیا ہے اور ذمیون کی بقایا رقم (موانید) کے معاف کر دینے کی وجہ بھی یہ بتلائی ہے کہ جزیہ کے ذریعہ مال جمع کرنا

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۷۲

مقصود نہیں ہے، بخلاف اس کے دوسرے ممالک اور اقوام میں محصول کے متعلق ہر زمانہ میں ٹھو کی شہنشاہیت کی گرج سنائی دی ہے جس نے غربا کی جیبیں خالی کرا کر امراء کے عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا ہے، اور اس طرح ان بے زبان طبقہ کی سادہ مزاجی اور بھولے پن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے منوسمرتی باب ۷ دفعہ ۱۲۹ و ۱۴۰ اور باب ۸ دفعہ ۵ بہ خاص طور سے اس سلسلہ میں قابل ملاحظہ ہیں۔

(۲) دوسرا عظیم الشان فرق اس سیاسی تخیل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جو مسلمان اور غیر مسلموں کے "ملک و سلطنت" کے متعلق تھا، مسلمانوں نے نظریۂ "تولیت" (Trustee Ship) کا صحیح مفہوم سمجھ کر اپنے کو اس کا پورا عامل بنایا تھا، وہ اپنے کو ملک کا مالک نہیں، بلکہ متولی سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے محصول رعایا کی مالی حالت کے مطابق لگایا جس سے اس کی خوشحالی میں فرق نہ آسکے، اور ملک کی سرسبزی قائم رہے، بخلاف اس کے دوسری قوموں نے اپنے کو ملک کا متولی نہیں بلکہ مالک سمجھا تھا، اس لئے انھوں نے رعایا کی مالی حالت کے بجائے دوسرے اصول پر محصول متعین کئے، چنانچہ قدیم ہندوستان کے قانون منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۳۹) میں راجہ کو بالتصریح مالک کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہاں محصول بمعیار خدمات کی ایک شق "مساوات" کا اصول پیش نظر رکھا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ محصول سرکاری خدمات کا معاوضہ ہے لیکن چونکہ سرکاری خدمات کا تخمینہ انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اور ان خدمات سے تمام ملک مستفید ہوتا ہے، اس لئے محصول بلا امتیاز بمقدار مساوی قائم ہونا چاہئے، منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۱۲۸) کا حکم اس بارہ میں نہایت صریح اور صاف ہے لیکن اس اصول میں معاشی حیثیت سے چند نقائص ہیں، یہ مانا کہ خدمات منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا، کہ سب

لے صحیح بخاری (کتاب الاعتصام باب یکرہ من التعمق) میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے انا ولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر حضرت عمرؓ کا یہ قول لکھا ہے، انا ولی رسول اللہ صلعم وابی بکر، اور مبسوط (ص ۱۰، ج ۱۰) میں ہے، وقولنا دار الاسلام نسبتہ للولایۃ۔

لوگ سرکاری خدمات سے یکسان مستفید نہین ہوسکتے، اور بالعموم دولتمندون کو غرباء کے مقابلہ مین بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، پھر جب غرباء کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہورہا ہو، اور بسر اوقات کے لئے دوسرون کی فیاضی کے دست نگر ہون تو اُن سے ٹکس طلب کرنا کہان تک قرین انصاف اور وصول کرنا کہان تک ممکن ہے؟ اس لئے مساوی ٹکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی وبربادی ہے[۱]۔

ایران مین مساوات کے بجائے سرکاری خدمات کی انفرادی حیثیت پر نظر رکھی گئی، جس طرح مزدور کو محنت کی اُجرت دیجاتی ہے ٹکس بھی سرکار کی خدمت کا معاوضہ ہے، اس لئے جو سرکار سے جتنی خدمت لے، اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹیکس ادا کرے، اسی بنا پر ایران مین ۱۲-۸-۶-۴ درہم کی شرح سے مختلف حیثیتون کے لوگون پر جزیہ مقرر ہوا، اور وہ لوگ جو سرکار کے مفہوم کی "وسعت" مین آتے تھے مثلاً اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم، جزیہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے، لیکن عورتین جو سرکار کے مفہوم مین شامل نہ تھین، قدیم ہندوستان کی طرح ایران مین بھی جزیہ ادا کرتی تھین، معاشی حیثیت سے اس اصول مین بھی متعدد خامیان ہین، سب سے ناگوار چیز تو وہ تفرقی ہے، جو اونچے گھرانون اور عوام مین رکھی گئی ہے، حالانکہ محصول کو "فرقہ داری" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے (اسلام مین زکوٰۃ خود خلیفہ کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے،) دوسرے سرکاری خدمات اس قدر بے شمار اور اُن کے نتائج اس قدر گوناگون ہین، کہ ان مین کسی شخص کے حصہ کا تخمینہ کرنا بالکل محال ہے، بیرونی فوجون، حکام کی تنخواہون، شہر کی صفائی، سڑکون کی درستی، داک درکس، غرض لوکل یا امپیریل محصولون سے ہر شخص کو جو فائدہ پہونچتا ہے، اس کا جداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے؟ اور پھر جو ٹکس ان مصارف کے طلب کیا جائے، وہ سرکاری خدمات منفردہ کے مساوی کیونکر مقرر ہو سکتا ہے؟

---

[۱] اصول معاشیات برنی ص ۲۹۸، ۲۹۹،

کیا شرح جزیہ میں ایران کی تقلید کی گئی ہے

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۹۰ ج ۲) نیز اپنے مضامین الجزیہ اور غیر قومون کی مشابہت (مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۳۰، ۱۶۲) مین صاف صاف لکھا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے نوشیروانی قواعد جاری کئے تھے، اس سلسلہ مین انھون نے ابو حنیفہ دینوری اور شاہ ولی اللہ صاحب کا نام بھی لیا ہے، اور اصلی ماخذ طبری کو قرار دیا ہے، جس نے یہ الفاظ لکھے ہین،

وھی الوضائع التی اقتدی بھا	اور یہ وہی شرحین ہین، جن کی عمرؓ بن
عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد	الخطاب نے پیروی کی، جب انھون نے
الفرس وامر باجتباء اھل الذمة	فارس کے شہر فتح کئے، اور انھون نے اہل
علیھا	ذمہ سے انہی (شرحون) کے مطابق وصول
(طبری ص ۹۶۲ ج ۲)	کرنے کا حکم دیا،

شاہ ولی اللہ صاحب طبری سے متاخر ہین، اس لئے اُن کی رائے عین طبری کی راے ہو سکتی ہے تاہم وہ بھی حضرت عمرؓ کا نام لینے مین تامل کرتے ہین، ابو حنیفہ دینوری (۲۸۲ھ) البتہ طبری سے مقدم ہین، لیکن انھون نے اس کا ذکر ہی نہین کیا ہے، اب رہے، امام طبری (۳۱۰ھ) تو ان کے متعلق حسب ذیل امور قابل لحاظ ہین،

(۱) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے جہان جزیہ کی شرح بیان کی ہے، حضرت عمرؓ کی تقلید کا ذکر نہین کیا ہے،

(۲) امام موصوف نے کتاب الخراج (ص ۱۴) مین یہ بھی لکھا ہے کہ عراق فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے وہان کے بعض زمیندارون کو بلایا، اور پوچھا کہ زمین کا محصول تم عجمیون کو کیا ادا کرتے تھے، ؟ انھون نے کہا، ۲۷، فرمایا مین اس پر راضی نہ ہون گا،

۳- امام یحیی بن آدم (۲۰۳ھ) بھی تقلید کے ذکر سے ساکت ہیں،

۴- امام طبری (۳۱۰ھ) نے آگے چل کر جو عبارت لکھی ہے وہ تمام کتب فقہ اور تاریخ کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں،

ولم یخالف عمرؓ بالعراق خاصة	اور عمرؓ نے خاص کر عراق میں کسریٰ کی اُن
وضائع کسریٰ علی جریان الارض	شرحوں کی مخالفت نہیں کی جو اُس نے زمین
وعلی النخل والزیتون والجماجم	کی جریبوں اور کھجور اور زیتون اور سروں
(ص ۹۶۳)	پر مقرر کی تھیں،

(الف) اس عبارت کی رو سے نیموں کے طبقات چار ہونے چاہئیں کیونکہ چار شرحیں طبری نے مقرر کی تھیں (طبری جلد ۲ ص ۹۶۳)

(ب) شرح ۱۲، ۸، ۲، ۴ درہم ہونی چاہئے،

حالانکہ اسلام نے تین طبقے قرار دیئے ہیں، اسی طرح ۴۸، ۲۴، ۱۲ درہم شرح رکھی ہے، اور اس کے حوالے اوپر آچکے ہیں،

(۵) طبری نے تقسیم کا جو طریقہ لکھا ہے مسلمانوں کا طرز عمل اُس کے خلاف شہادت دیتا ہے کیونکہ وہ عموماً سالانہ جزیہ وصول کرتے تھے،

(۶) طبری کی روایت کے مطابق کسریٰ نے خاندان شاہی، معززین، فوج، مذہبی پیشوا اور ملازمین سلطنت کو جزیہ سے مستثنیٰ کیا تھا، حالانکہ حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا،

(۷) شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۷۸ ج ۱۰) میں لکھا ہے کہ جزیہ کی مقدار کا علم حضرت عمرؓ کی حدیث سے ہوا ہے، اور وہی اصل ہے، انھوں نے مردوں پر ٹیکس ۱۲ درہم اور ۲۴ درہم اور ۴۸ درہم مقرر کئے، اور مقدار اپنی رائے سے مقرر نہیں ہوتی، اس سے ہم نے سمجھا کہ انھوں (حضرت عمرؓ) نے رسول اللہ صلعم سے سماعت پر اعتبار کیا ہوگا، (یعنی انھوں نے خود یا کسی اور صحابی نے رسول اللہ صلعم سے

سنا ہوگا) تو ہم نے اُس کو لے لیا،

(۸) عموماً مفسرین اور فقہا تقلید کے ذکر سے خاموش ہیں،

اب ایک طرف یہ تمام قدمائے اسلام ہیں جن کی کتابوں میں نوشیروان کی پیروی کا ذکر تک نہیں ہے

اور دوسری طرف مولانا شبلی ہیں جن کو طبری کی روایت پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ جزیہ کے اختلاف

شرح کو بھی نوشیروانی پیروی کی طرف منسوب کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ محصول اور اس کی مختلف شرحیں

مقرر کرنا نوشیروان کا کوئی تمغائے امتیاز نہ تھا، یہ تو معمولی سی بات ہے، اور ہر مدبر اس کو سوچ سکتا ہے،

جزیہ اور سیاسیات | اب تک جزیہ کے متعلق جو گفتگو کی گئی، وہ قانونی (فقہی) اور کسی حد تک تاریخی پہلو لئے ہوئے

ہوتی تھی، لیکن اب یہ دکھایا جائے گا، کہ پالیٹکس میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

(۱) اوپر جزیہ کے متعلق فقہاء کے جو سات نظریات بیان کئے گئے ہیں، اُن سب کا قدرِ مشترک

نکلتا ہے کہ وہ ایک محصول ہے اور محصول کی تعریف ببٹیل (Bastable) نے اپنی کتاب

"سرکاری مالیات" (Public Finance) میں اس طرح کی ہے،[۱]

"محصول (Tax) کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی

یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جاتا ہے"

پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے ال ال بی نے اصولِ معاشیات (ص ۲۹۶) میں اس تعریف

کو یوں واضح کیا ہے،

"ٹیکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارفِ حکومت

کے واسطے ادا کریں"،

پھر اسی کتاب اور اپنی دوسری تصنیف علم المعیشت میں اس تعریف کے بعض الفاظ کو غور طلب فرما

---

[۱] معاشیات ص ۳۵۲ مصنفہ مولوی حبیب الرحمن ایم اے ایل ایل بی جامعہ عثمانیہ،

دیا ہے، جن میں ایک لفظ دولت بھی ہے وہ اس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں،

اصطلاح "دولت" اپنے وسیع معنون میں استعمال کی گئی ہے، گویا مال و جائداد کے علاوہ "خدمات" بھی اس میں شامل ہیں چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹکس ہے۔

لفظ "دولت" کی اس وسعت کو سمجھنے کے بعد جزیہ کے متعلق ایک بڑا مغالطہ دور ہو جاتا ہے، علّامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۰۶ جلد ۲) میں جہان جزیہ کی بحث لکھی ہے، اس کو حفاظت کا معاوضہ قرار دے کر تاریخ سے چند تائیدی دلائل بھی تحریر فرمائے ہیں، اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

" اس سے بھی زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ جن لوگون سے کبھی کسی قسم کی فوجی خدمت لی گئی، اُن کو باوجود اُن کے مذہب پر قائم رہنے کے جزیہ معاف کر دیا"

پھر شواہد میں ۱۷ھ اور ۲۲ھ میں عراق، آذربائجان، آرمینیہ اور جرجان کے غیر مسلمون سے جو معاہدے ہوئے تھے، اُن کو نقل کیا ہے،

لیکن "معاشیات" میں دولت کا لفظ جن عام معنی میں استعمال ہوتا ہے، اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے، کہ ذمیون کی جنگی خدمت بھی "دولت" کے وسیع مفہوم کے اندر داخل تھی، اس لئے اپنی جان کو لڑائی کے لئے پیش کرنا، گویا زرِ جزیہ کو نقدی صورت میں ادا کرنا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جزیہ معاف نہین کیا گیا، بلکہ دوسری شکل میں وصول یا قبول کیا گیا،

حقیقت یہ ہو کہ جو سلطنت کسی ملک پر سیاسی حیثیت سے تسلّط حاصل کرتی ہے وہ قانوناً اس کی مجاز ہے کہ بروقت ضرورت رعایا سے جانی اور مالی خدمات کا مطالبہ کرے، مسلمانون کی ابتدائی سلطنت (خلافتِ راشدہ) جو آج کل کے اعلیٰ ترین جمہوری طرزِ حکومت "متفقیہ" سے بدرجہا بہتر تھی، اس نے بھی اپنی رعایا سے دونون قسم کی خدمتین لین،

۱- ابتداءً جیسا کہ ہر قوم میں ہوتا ہے، صرف مسلمان فوج میں شامل تھے، ۱۷ھ میں جب غیر مسلمون

کا اس کو اعتماد حاصل ہو گیا، تو اُن کو بھی فوج مین شرکت کی اجازت مل گئی، جو حفاظت سلطنت کے لئے جانی امداد تھی ؟

۲۔ مالی امداد مصارفِ حکومت کے لئے تھی جس کو مسلمان بشکل زکوٰۃ اور غیر مسلم بصورتِ جزیہ دیتے تھے، اس کو فوجی خدمت سے کچھ واسطہ نہ تھا، جس طرح صاحبِ نصاب مسلمان فوجی خدمت کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہوتے تھے، مستطیع غیر مسلمون کا جزیہ بھی معاف نہین کیا جاتا تھا؟ خلافتِ راشدہ کے بعد شخصی سلطنتون مین بھی یہ نکتہ ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا ہے، چنانچہ سلطنتِ مغلیہ مین برابر راجپوتون کی فوج رہتی تھی، اور خود وہ شہنشاہ (اورنگ زیب) جس پر ارسطو نے اعتراضات کئے ہین، راجپوتون کو فوج مین بھرتی کرتا تھا، اور اُن سے فوجی خدمت لینے کے باوجود جزیہ بھی لیتا تھا، چنانچہ ہمارا معترض حیرت سے لکھتا ہے،

"مگر جو ہم ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کر لیتے ہین کہ یہ فوجی خدمت کا معاوضہ تھا، جو غیر مسلمون سے لیا جاتا تھا، تو اُن ہندوؤن سے جزیہ کا وصول کرنا کسی طرح بھی جائز نہ تھا، جو فوج مین ملازم تھے، پھر اورنگ زیب کا دسواہند اور راجپوتانہ کے راجپوت راجاؤن سے جزیہ وصول کر لینا کیسے درست ہو سکتا ہے"...... پھر فوج کے ساتھ امیر جزیہ مقرر کئے گئے تھے، جو جزیہ وصول کرتے تھے، ۱۲ رجولائی سنہ (سنہ) کا اعلان اُن فوجی امیرون کا ذکر کرتا ہے، اس کا صاف مطلب یہ کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ فوج مین اُن کی موجودگی کی اور کیا تاویل ہو سکتی ہے، پھر دوسری طرف کوئی ایسا حکم نہین جس مین فوجی ملازم ہندوؤن کو جزیہ کی ادائگی سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، یہ صرف معمولی فوجی ملازمون سے ہی وصول نہین ہوتا تھا، بلکہ ہندو افسر تک اس حکم سے باہر نہ تھے؛ (اودیہ گزٹ)

لیکن معترض کی حیرت کا اصلی سبب علامہ شبلی مرحوم کا یہ خیال ہے کہ جزیہ صرف جنگی خدمت کا معاوضہ تھا، اور گو تاریخی واقعات سے انھون نے اس کا تائید بھی کی ... [illegible]

حیثیت پر اس کی نظر نہیں گئی تھی، اسی لئے جزیہ کو فوجی خدمت کا معاوضہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں جس طرح نوشیروان عادل نے عموماً اہل فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے، اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پر خطر خدمت کے لئے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کیلئے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا" (ص ۲۳۱-۲۳۲)

لیکن اوپر سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے جس اصول اور عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی خدمت اور مالی امداد بالکل دو جداگانہ چیزیں تھیں، مولانا نے یہ تو لکھا ہے کہ مسلمانوں کو جزیہ سے مستثنیٰ ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ نہیں بتلایا ہے کہ ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ ہوتا تھا، مسلمانوں کا محصول جزیہ نہ تھا، بلکہ زکوٰۃ تھی، اور جب وہ فوجی خدمت کے صلہ میں زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں کئے گئے، تو غیر مسلم فوج میں رہ کر جزیہ سے کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتے تھے؟ پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت لینے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، ہر سلطنت کو اپنی رعایا سے فوجی خدمت لینے کا حق حاصل ہے، اور اسلامی سلطنت کو تو بدرجۂ اولیٰ یہ حق حاصل تھا، کیونکہ اولاً تو وہ مسلم اور غیر مسلم کی نارو اتفریق پسند نہیں کرتی تھی، دوسرے زمین کا مالک اس نے عام طور پر غیر مسلموں ہی کو بنا رکھا تھا،

رہا یہ امر کہ ابتدا میں غیر مسلم فوج میں کیوں شریک نہیں کئے گئے؟ اس کا سبب یہ تھا کہ غیر مسلم مفتوح تھے، جو مسلمانوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنی قومی سلطنت کو دوبارہ واپس لانے کا خیال ان کے دماغوں میں موجزن رہتا تھا، اس بنا پر آغاز فتح میں سیاسی حیثیت سے ان کو فوج میں بھرتی کرنا قرین مصلحت نہ تھا، البتہ جب عہد نبوت سے لے کر خلافت فاروقی تک اُن کو مسلمانوں سے

سابقہ پڑا، جس مین اسلام کی عادلانہ حکومت کا سکہ اُن کے دلون پر بیٹھ گیا، اور انھون نے خود دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو سنہ ھ مین اُن کو اجازت دے دی گئی، اور معاشی نقطۂ نظر سے اُن کی اس فوجی خدمت کو جزیہ کا قائم مقام سمجھ لیا گیا، جو اُن کے ساتھ مزید رعایت تھی،

۲۔ تعین محصول کے سلسلہ مین "مساواتِ محصول" (Parity of tax) کا اصول اختیار نہین کیا گیا، جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ سب کو سرکار سے یکسان آرام اور فائدہ پہنچتا ہے اس لئے سب لوگ برابر محصول دین، بلکہ جزیہ اشخاص کی مختلف قابلیتون اور حیثیتون کے مطابق مختلف نرخ سے مقرر ہوا، کیونکہ "اصولِ مساوات" سے غربا پر جس قدر ظلم ہو سکتا ہے، محتاجِ بیان نہین، مزید برآن سیاسی لحاظ سے بھی یہ اصول ناقابلِ عمل ہے[1]"

۳۔ ورودِ محصول (Incidence of Taxation) کی بنا پر محصول کی دو قسمین قرار دی گئی ہین (۱) یہ کہ ٹیکس کا اداکنندہ (Payer of tax) اور مورد (Subject to Tax) ایک ہی شخص ہو، یعنی جو دوسرون پر منتقل نہ ہو سکے، (۲) یہ کہ جس کے اداکنندے اور مورد مختلف اور متعدد لوگ ہون یعنی جو اداکنندے سے گذر کر بہت سے لوگون پر منقسم ہو جائے، اصطلاحاً اول کو ٹیکس بلاواسطہ (Direct Tax) اور دوم کو ٹیکس بالواسطہ (Indirect Tax) کہتے ہین[2]،

جزیہ بلاواسطہ ٹیکس (Direct Tax) ہے جس سے عام "سیاسی بیداری" پیدا ہوتی ہے کیونکہ ٹیکس بلاواسطہ، لگان، سود، اجرت، یا ملک و جائداد مین سے براہِ راست وصریحاً اپنا حصہ نکالتا ہے، یہ ٹیکس "سیاسی تربیت" کا نہایت کارگر آلہ ہے، انسانی خاصہ ہے کہ جس کام مین کسی کا روپیہ لگتا ہے اُس سے

---

[1] معاشیاتِ ہند ص ۲۶۲، مصنفہ پرمتھا ناتھ بنرجی، مترجمہ مولوی الیاس برنی [2] اصولِ معاشیات ص ۳۰۸ مصنفہ مولوی الیاس برنی،

خواہ مخواہ تعلق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ بعض انجمنوں میں تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی بڑھانے کی غرض سے بھی ممبروں سے چندہ طلب کیا جاتا ہے، جب لوگ جان بوجھ کر مصارف حکومت ادا کرتے ہیں، تو ان کو سیاسی معاملات سے خود بخود تعلق زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے، اور اس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے،

(اصول معاشیات ص ۳۰۹)

اور واقعات شاہد ہیں کہ جزیہ کے سبب سے ہمیشہ غیر مسلموں میں سیاسی بیداری قائم رہی ہے، گو کبھی کبھی اس کا ظہور مظاہرہ کی نامناسب شکل میں بھی ہوا ہے، جیسا کہ سرکار نے "تاریخ اورنگ زیب" (ص ۱، ۲ ج ۳) میں اور علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۴۷) میں دکھایا ہے،

جزیہ اور معاشیات | جزیہ کو معاشیات (Economics.) سے بڑا گہرا تعلق ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ص ۲۶۷ جلد ۲۲، طبع ۱۱) میں آدم اسمتھ (Adam Smith) کی کتاب "دولتِ اقوام" کے حوالہ سے ٹکس کے حسب ذیل قوانین بیان کئے گئے ہیں،

(۱) قانونِ معدلت: ہر مملکت کی رعایا کو چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو سکے اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے یعنی اُس آمدنی کے تناسب سے جو انھیں مملکت کے زیرِ حفاظت اپنے اپنے طور پر حاصل ہوتی ہے، حکومت کے اخراجات میں شریک ہوں،

(۲) قانونِ تیقن: جس ٹکس کا ادا کرنا ہر فرد پر لازمی ہو وہ بالکل باقاعدہ اور یقینی ہونا چاہئے، وقتِ ادائگی، طریقۂ ادائگی، مقدار ٹکس، یہ تمام امور نہ صرف ادا کرنے والے پر بلکہ دوسرے تمام اشخاص پر بھی واضح ہونے چاہئیں،

(۳) قانونِ سہولت: ٹکس ایسے وقت پر اور اس طریقہ سے عائد کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق میں زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو،

(۴) قانونِ کفایت: ہر ٹکس اس طور پر تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جس قدر رقم سرکاری

خزانہ مین داخل ہوتی ہے اس کے علاوہ حتی الوسع کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبون سے خارج ہو۔۔۔۔

ان چار کے علاوہ بعض مصنفین نے دو قانون اور بھی لکھے ہین،

(۵) قانون پیدا آوری: ٹکس بدرجۂ اولی پیدا آور (Productive) ہونا چاہئے یعنی ماحصل ٹکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے، کیونکہ ٹکس قائم کرنے کا منشا مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہے، اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو، تو ظاہر ہے کہ ٹکس ناقص ہوگا، اور اس سے حصول آمدنی کی غرض بدرجۂ ادنی پوری ہوگی،

(۶) قانون تغیر پذیری: ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ وتخفیف ہو سکے،

یہ ۶ قانون ہوئے جن کا ٹکس قائم کرنے مین لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیون کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے،

جزیہ قائم کرتے وقت ان قوانین کو پیش نظر رکھا گیا تھا یا نہین؟ اس کا جواب ذیل مین دیا جاتا ہے:

پہلا قانون معدلت یا عدل ہے اس کی تعریف مین یہ الفاظ "اپنی اپنی قابلیت کے تناسب" ہمیشہ سے معاشی علماء کے اختلاف کا آماجگاہ رہے ہین، یہ امر کہ محصول انصاف سے قائم کرنا چاہئے بالکل مسلم ہے لیکن یہ کیل کیونکر ہو سکتی ہے؟ اور محصول کے تقرر مین کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئین؟ اس کے متعلق علماء نے چند راستے اختیار کئے ہین، جو محصول تعیا بمعیار خدمات، محصول مساوی، محصول متناسب (Proportional Tax) وغیرہ کی شکل مین موجود ہین،

لیکن ان سب سے بہتر طریقہ محصول متزاید یا تدریجی (Progressive Tax) کا ہے جو آج کل ہر جگہ اختیار کیا جا رہا ہے، اس طریقہ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ٹکس لگانے مین تدریج سے کام لیا جائے یعنی

(الف) ٹکس مالی حالت کے فرق کے بموجب بشرح مختلف قائم ہو، امرار پر بشرح اعلیٰ متوسطین پر بشرح متوسط، اور غربا پر بشرح ادنیٰ تاکہ تمام ٹکس ادا کرنے والے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں تشخیص جزیہ میں امرار، متوسطین، اور غربار کے ۳ طبقے مالی حالت کے اختلاف کی بنا پر قرار دیئے گئے ہیں، اور ان پر بشرح مختلف ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ۴/۱ ر ۲ ر اور ۱ ر ماہوار محصول لگایا گیا ہے۔

(ب) شرح محصول مختلف ہونے کے باوجود ایک حد تک محدود ہو یعنی اس پر متواتر اضافہ نہو سکے، تاکہ اضافہ آمدنی کسی حالت میں لوگوں کے لئے ضرر رساں نہ ہو، اور اجتماعِ دولت، بلند حوصلگی، اور کفایت شعاری کے راستہ میں نامناسب مزاحمتیں پیدا نہ ہو جائیں، یہ بالکل بدیہی ہے کہ "طلائی انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں"، تاہم موجودہ معاشیین محصول متزائد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس چیز کو بہت کم پیش نظر رکھتے ہیں، اور اس لئے آمدنی کی مقدار بڑھنے کی حالت میں وہ برابر شرح محصول میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، بخلاف اس کے اسلام نے دولت و افلاس کے لحاظ سے انفی طبقوں کے لئے جزیہ کی جو شرح مقرر کی، وہ اگرچہ بذاتِ خود مختلف ہے، تاہم ہر شرح محدود ہے یعنی بالفاظ دیگر ہر طبقہ کی آمدنی کے متعدد مدارج قرار دے کر ان کے لئے علحدہ علحدہ شرحیں قائم نہیں کی ہیں، بلکہ تمام غربار کے لئے ایک شرح ہے، تمام متوسطین کے لئے ایک اور تمام امرار کے لئے ایک، اس سے ہر طبقہ پر جزیہ کا یکساں الگ الگ بار پڑتا ہے اور کسی خاص طبقہ کو زیادہ استطاعت کی وجہ سے جزیہ بار گراں نہیں معلوم ہوتا،

(ج) آمدنی جب تک ایک خاص مقدار تک نہ پہنچے، محصول کا مطالبہ نہ کیا جائے، چنانچہ جزیہ اس شخص سے نہیں لیا جاتا، جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا جس کی آمدنی خاندان کی پرورش کے لئے ناکافی ہو، کیونکہ ایسا شخص محصول ادا کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا، چنانچہ زکاۃ کے لئے بھی کم سے کم دو سو درہم کا مالک ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے،

دوسرا قانون **تیقن** ہے جس کو تعیین بھی کہتے ہیں، اُس کے رو سے جزیہ کی شرح ہمیشہ معین رہی ہے جزیہ ادا کرنے والے کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق واجب الادا رقم کی صحیح مقدار کا علم ہوتا ہے، جس کی بنا پر بریادھوکے سے کوئی شخص سرکاری مطالبہ سے زیادہ وصول نہیں کر سکتا، جزیہ کی شرح میں تغیر و تبدل نہیں ہے، اس کی ادائگی کا وقت مقرر ہے یعنی سالِ تمام پر وصول کیا جائے[۱]، ادائگی کا طریقہ بھی تبلایا گیا ہے یعنی جانور، سامان، اور پیشہ کی ہر چیز رقم جزیہ کے عوض پیش کی جاسکتی ہے، صرف مردار، سور، اور شراب پیش نہ کرنا چاہئے، اور اگر یہ چیزیں آئیں تو اہلِ پیشہ کے ذریعہ سے ان کو فروخت کرا کر اُن کی قیمت دفتر میں جمع کرنی چاہئے، کیونکہ اس میں اہلِ جزیہ کو سہولت ہوتی ہے[۲]،

تیسرا قانونِ **سہولت** ہے، جزیہ کے ذرائع اور اس کی وصولی کے اوقات جن کا دوسرے قانون میں ذکر ہوا، درحقیقت ایسے تھے کہ جزیہ دینے والوں کا کوئی نقصان اور ہرج نہ ہوتا تھا، نہ ان کو کوئی دقت اور دشواری محسوس ہوتی تھی،

چوتھا قانونِ **کفایت** ہے، اس کے ۳ مفہوم ہیں، پہلے مفہوم کے رو سے جو کچھ فراہمی جزیہ میں صرف ہوتا ہے، اس کی مقدار بمقابلہ ماحصل جزیہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہوتی ہے یعنی اس کے فراہم کرنے کے مصارف اصلی مطالبات سے کم اور بہت کم ہوتے ہیں، دوسرے مفہوم کے رو سے جزیہ ادا کرنے والوں کو مقدار جزیہ سے زیادہ دینا نہیں پڑتا، کیونکہ وہ کاروبار میں بہت کم حارج ہوتا ہے، تیسرے مفہوم کے رو سے جزیہ افزونی دولت، اور اضافۂ مرفہ الحالی میں مانع اور مزاحم نہیں ہے،

پانچواں قانون پیداآوری جزیہ کی رقم کی آمدنی نہایت معقول ہوتی ہے، اور اس سے مصارفِ حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنے کا منشا حاصل ہوتا ہے، اور سلطنتوں کو چھوڑ کر خود اورنگ زیب کے زمانہ میں صرف گجرات سے جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوتی تھی، وہ سرجدونا تھ سرکار اور ہمارے معترض آرسطو دونوں

---

[۱] بسوط ص ۸۲ ج ۱۰ [۲] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۶۹،

کو گھٹتی ہے،

چھٹا قانون تغیر پذیری ہے ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہوسکے، یہ نہین کہ مصارفِ حکومت کے واسطے خواہ رقم زیادہ درکار ہو، یا کم ہر حالت مین احصل ٹکس کی مقدار وہی ایک رہے، جو کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہو، اور کبھی زائد بچ رہے، بہ الفاظ مختصر، ماحصلِ ٹکس جس حد تک کمی وبیشی مصارف کی متابعت کرے بہتر ہے، جزیہ مین اس شکل کے علاوہ جب کسی شہر یا علاقے سے کوئی خاص رقم طے ہو جائے ہمیشہ اس قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے، وہ مختلف پیشون پر مختلف شرحون سے حسبِ حیثیت وصول کیا جاتا ہے، اس مین کمی وبیشی کا بھی اختیار ہے، چنانچہ تخفیف جزیہ کے بعض واقعات امام ابو یوسف اور یحییٰ بن آدم کی ہمنام تصنیفات (کتاب الخراج) سے اوپر نقل کئے گئے ہین، اور معافی جزیہ کی نسبت موانید کا مسئلہ بھی درج کیا گیا ہے، بیانات بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ چونکہ جزیہ ان تمام قوانین و اصول کا پابند ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے وہ نہایت عمدہ محصول ہے، کیونکہ وہ تمام محصول جو ان اصول کے پابند نہ ہون یا کم پابند ہون معاشیین کے نزدیک ناقص ہوتے ہین، (باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجا سکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندے ہین، اُن کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائین گی جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگا لین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"منیجر"

ہاروت اور ماروت

بسلسلہ سابق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

ہاروت اور ماروت فرشتے نہین لیکن چونکہ اُن کی بابت خود قرآن مین ملکین کا لفظ وارد ہے اسلئے فرشتون ہی کے ساتھ اُن کا تذکرہ بھی ضروری ہے،

لفظ بابل کے ماتحت ہم نے وہ آیت نقل کی ہے جس مین ہاروت اور ماروت کا ذکر ہے، قرآن کے بیان کے مطابق یہ دونون بابل کے دو معلم تھے، جن سے بنو اسرائیل نے میان بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا ہنر سیکھا تھا، جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے اُن بنی اسرائیل کے کافر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے،

بعض وقت خود بولنے والے کسی لفظ کو اپنے عقیدہ اور تصور کے برخلاف مخاطب اور فریق بحث کے عقیدہ اور تصور کے مطابق بولتے ہین، لغات مین اس کی نظیرین بہت ہین، یہود حضرت عیسیٰ کو نہ مسیح مانتے تھے اور نہ رسول اللہ، مگر نزول قرآن کے ایام مین انھون نے یہ کہکر ناز کیا تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ بعینہ اسی طرح چونکہ یہود ہاروت اور ماروت کو الملکین کہتے تھے، اس لئے قرآن مین بھی بطریق طنز ان کو الملکین کہا گیا ہے،

ہاروت | بابل کے ذکر مین بتایا گیا ہے کہ یہان دو قومون کے آثار پائے جاتے ہین، ایک قوم کو بنو سام اور دوسری کو سمیری قوم کہا جاتا ہے، اس دوسری قوم کا اہم ترین مرکزی شہر اُور تھا، بعد مین یہ لفظ شہر کا

مرادف بن گیا، اصل میں اس لفظ کا ترجمہ ہے روشنی، یہ قوم روشن اجرام کی پجاری تھی اور یہ شہر ایک روشن جرم فلک کا معبد ہونے کی وجہ سے اُور کہلایا، اس لفظ کو سمیریون کے یہان اس قدر اہمیت حاصل تھی، کہ ان کے اکثر بادشاہون کے نامون مین یہ لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً

۱- آدرکاجان ۲۸۵۰ء (۲) آدرلان ۲۴۲۰ء (۳) اُورنینا ۲۴۲۹ء (۴) اُدرمن حرسو ۲۷۰۰ء (۵) اور زاکدون ۳۵۵۸ء، یہ پانچون سمیری بادشاہ تھے،

سمیریون کے بے نام و نشان ہوجانے کے بعد بھی بعض غیر سمیریون کے نامون مین اُور کا لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً کنعان کے ایک اشوری فرمانروا کا نام جو ۱۳۰۰ء ق م مین گذرا ہے اور وملک تھا، مصری بولی مین تا کے معنی ہین زمین، چنانچہ بونت کو تانتر کہتے تھے، اور جو بادشاہ بالائی اور زیرین دونون مصرون کا بادشاہ ہوتا تھا، اس کو نب تا وی کہتے، اور تا کے معنی ہوئے ارض نور قدیم بابلی مین تا اور تو کے معنی تھے نسل اور قوم اس لئے اور تا کے معنی اُور کی قوم ہین، اسی لفظ کا دوسرا تلفظ ارتو ہے، جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا تورانی نام اراراط ہے، یہ اور ارتو کی بدلی ہوئی شکل ہے، یہ آرمینیہ کا کلدانی اور اشوری نام ہے، اور ارتو کے معنی ہین، آرتو کی بستی، بابل کے سمیری اصل مین جہان سے بھی اس دیار مین آئے ہون، مگر آرمینیہ ہوتے ہوئے آئے تھے، اسی اورتا اور آرتو کا نام عربی لب ولہجہ مین ہاروت بنا، قرآن مین جس ہاروت کا ذکر ہے، اگر وہ نسلی حیثیت سے نہین تو مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے اسی قوم کا ایک فرد تھا،

ماروت | اشوری بادشاہ اشوربنی پال (۶۶۸-۶۲۶ ق م) کے زمانہ مین عیلام مین ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جس کا نام تھا اُورتا کی (حاکم ہاروت) یہ پہلے اشوربنی پال کا حلیف تھا، بعد مین کسی وجہ سے اس کا مخالف ہوگیا، اور اس نے بابل پر جو ان دونون شاہان اشور کے ممالک مقبوضہ مین داخل تھا، حملہ کردیا، لیکن اشوریون نے شکست کھائی، اُورتا کی کے مرنے کے بعد عیلام کا بادشاہ تی اُمّان ہوا جس کی

بابت اشوری تحریر بتاتی ہے، کہ وہ اپنے پیش رو دو بادشاہوں کی طرح مثیل شیطان "تھا، تی امان کے بعد عیلام کا حاکم اُورتا کی کا فرزند تم مار تو ہوا، یہ اشوریوں کا وفادار حلیف تھا، اس بادشاہ کا نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے، پہلا لفظ تم ہے، جسے عربی لب ولہجہ مین تام پڑھ سکتے ہین، بائبل کے عبرانی نسخون مین یہ لفظ عموماً مردِ کامل کے معنی مین آیا ہے، اور ہمیشہ نیکی اور راستی مین باکمال کو تم کہتے تھے، "نوح اپنے قرن مین صدیق (راستباز) اور تم (کامل) تھا، (تکوین ۶: ۹) اس کے نام کا دوسرا جز مارتو، عربی لب ولہجہ مین ماروت بنا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن مین اسی ماروت کا ذکر ہے، جو اپنے خیال مین تم یعنی مردِ کامل تھا، اور جس کا باپ اُورتا کی (حاکم ہاروت) اشوریوں کی نظر مین مثیل شیطان تھا بلکہ مارتو کے لغوی معنی ہین "انسان کی نسل" سفر تکوین مین وارد ہے، "کہ نفلیم جن کو گبور تم بھی کہا جاتا ہے بنی الوہیم اور بنات آدم کی اولاد تھے، (تکوین ۶: ۱ تا ۴) اس سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ مین دو قومین ایک ساتھ رہتی تھین ایک کو خدا اون کی اولاد ہونے کا ادعا تھا، اور دوسری قوم کو یہ ادعا نہین تھا، بلکہ وہ خود کو معمولی آدم زاد کہتی تھی، اسی قوم کا نام مارتو تھا، اطراف بابل مین جو بنو سام تھے، وہ خود کو امورو کہتے تھے، یہ نام عربی لفظ امرؤ (انسان) کی قدیم شکل ہے، اسی قوم کا ذکر توراۃ مین اموری قوم کے نام سے ایا ہے بابل کے سامری بولنے والے اس قوم کو مارتو کہتے تھے، یہی نام عبرانی لب ولہجہ مین مروت اور عربی لب ولہجہ مین ماروت ہو گیا، فلسطین مین بھی چونکہ ایک وقت مارتو، ماروت، مروت اور امورو کہلانے والی قوم بستی تھی، اس لئے ایک زمانہ مین اطراف بیت المقدس کو بھی مروت کہتے تھے، چنانچہ صحیفۂ میکاہ مین ہے،

"مروت کی رہنے والی اپنے اموال کے لئے کڑھتی ہے، کیونکہ خداوند کی طرف سے بلا نازل ہوئی جو یروشلم کے پھاٹک تک پہنچی، (میکہ ۱: ۱۲)

قرآن کریم مین جس شخص کا ماروت کے نام سے ذکر ہے، وہ اسی مارتو کہلانے والی قوم کا ایک فرد تھا

افسانۂ ہاروت و ماروت | قرآن میں ہاروت اور ماروت کو طنزاً فرشتے کہا گیا ہے لیکن مفسرین نے بہت سی ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن کا ماحصل یہ ہو کہ یہ دونوں واقعی فرشتے تھے، فرشتوں نے بنی آدم کی خطائیں دیکھ کر خدا سے کہا کہ ہم ہوتے تو ہم سے یہ گناہ نہ ہوتے، خدا نے کہا اچھا اپنے درمیان سے دو کو امتحان کے لئے چنو، چنانچہ ہاروت اور ماروت چنے گئے، اور انسان بنکر زمین میں اترے اور ایک خوبصورت عورت پر ریجھ گئے، اس عورت کو انھوں نے اسم اعظم سکھانے کے بعد اس کے کہنے سے شراب پی، بت پوجا، اور بہت سے گناہ کئے، پھر اس نے ان کو تمتع کی اجازت دی، وہ عورت اس کے بعد اسم اعظم کے زور سے آسمان پر اڑ گئی، خدا نے اسے ستارۂ زہرہ کی صورت میں مسخ کر دیا، اور ان فرشتوں سے کہا گیا، کہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں سے ایک کو پسند کریں دونوں نے عذاب دنیا کو پسند کیا، چنانچہ وہ دونوں ایک تاریک کنوئیں میں قیامت تک کے لئے لٹکا دیئے گئے، یہ ہے متعدد روایتوں کا مجموعی مفہوم، یہ تمام روایتیں سیوطی نے دُر منثور میں نقل کی ہیں، ہم نے سب کا ملخص لے لیا ہے، ورنہ خود ان میں ان روایتوں میں اختلاف ہے، ایک روایت میں اس واقعہ کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام کا عہد بتایا گیا ہے، حضرت ادریسؑ طوفان نوح کے بعد پیغمبر مبعوث ہوئے اور وہ کشتی نوح کے سواروں میں سے ایک تھے، لیکن متقدمین نے ان کو حضرت نوحؑ کے مورث حنوک سے تطبیق دی ہے، دوسری روایت میں ہے کہ ان فرشتوں کے پاس خدا کا یہ پیغام کہ دُنیا یا آخرت کے عذابوں میں سے ایک کو پسند کرلو، حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بھجوایا تھا،

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جو عورت زہرہ بن گئی تھی، وہ ایک روایت میں ایرانی عورت تھی، اور ایک میں اسرائیلی،

قرآن کریم میں ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہیں ہے، اور نہ اسے بطور تفسیر ذکر کرنے کی آیت کا کوئی فقرہ اجازت دیتا ہے، البتہ چونکہ ہاروت اور ماروت کو طنزاً خدا نے دو فرشتے کہا ہے، اسلئے

طرز کو نہ سمجھنے والے روایت کے اس حصہ کو قرآن کی تفسیر مین اس طرح شامل کر دیتے ہین کہ تھے تو وہ دونون فرشتے ہی، مگر بعد مین کافر ہو گئے، کیونکہ انھون نے تانہ کیا تھا، کہ اگر بنی آدم کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم سے یہ خطائین نہ ہوتین، اس لئے امتحان کی غرض سے خدا نے اُن کو انسان بنا کر زمین مین اُتارا، اور وہ امتحان مین ناکام رہے، باقی قصہ کا قرآن کے کسی فقرہ سے ذرہ برابر واسطہ نہین ہے،

روایات کی نوعیت | اس افسانہ کی بدولت قرآن پاک پر اعتراضات کئے جاتے ہین، اس لئے اس کی پوری حقیقت کھولنا ہمارا فرض ہے، لیکن قصہ کے سرچشمون پر بحث سے پہلے روایات کی نوعیت دکھا دینا ضروری ہے،

صحاح ستہ مین ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہین ہے، مستدرک مین حاکم نے اس قصہ کی حضرت علیؓ سے تخریج کی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ سے صرف اتنے ٹکڑون کی تخریج کی ہے، کہ زہرہ پہلے ایک عورت تھی، جس کو اس کی قوم والے بدبخت کہتے تھے، گو حاکم نے ان دونون روایتون کی اسناد کو شیخین کی شرط پر صحیح بتایا ہے، لیکن شیخین کا اس کو روایت نہ کرنا ہی یہ بتاتا ہے کہ اس کی سند مین ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہے،

جہان تک حضرت علیؓ کی روایت کا تعلق ہے، حاکم کی تصحیح قابل رد ہے، عمیر بن سعید نخعی کی بابت جن سے حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے، ابن حزم نے کتاب الملل والنحل مین لکھا ہے، کہ

"وہ مجہول ہے حضرت علیؓ سے اُس نے دو روایتین نقل کی ہین، ان دو کے علاوہ اس کی کسی اور روایت کا ہم کو علم نہین ہے، ایک تو شارب خمر کی حد سے متعلق ہے، یعنی وہ جس کی امام بخاری نے تخریج کی ہے، اور ایک ہاروت و ماروت کے قصہ مین، اور یہ دونون جھوٹی روایتین ہین"

تہذیب التہذیب مین حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ افرط ابو محمد بن حزم یعنی محمد بن حزم نے افراط و مبالغہ سے کام لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کی دونون روایتون کو جھوٹی قرار دینا حد سے تجاوز ہے، امام بخاری والی روایت قطعاً جھوٹی نہین ہو سکتی، رہی قصہ ہاروت و ماروت والی روایت تو اس کی بابت اتنا کہہ دینا کافی ہے، لہ عندہ حدیث واحد عن علی فی حد شارب الخمر"

یعنی ائمۂ حدیث کی رائے مین حضرت علیؓ سے انھون نے صرف ایک ہی حدیث شارب خمر کے بارے مین روایت کی ہے،

حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کی "زہرہ پہلے ایک عورت تھی" کی روایت وہم سے خالی نہین ہے ممکن ہے کہ انھون نے عربون کے قدیم تصور کی روایت کی ہو، لیکن اسے ان کا قول سمجھ لیا گیا ہو، حضرت ابن عباسؓ کے راوی ابوعثمان النہدی آنحضرت صلعم کے زمانۂ حیات مین مسلمان ہوئے، مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، اُن کے راوی سلیمان بن بلال التیمی کی ثقاہت پر شبہہ کرنا روا نہین ہے، مگر ان کی اس قسم کی بعض کمزوریون کی بنا پر اُن کی روایات کے بارہ مین عثمان بن سیبہ کا خیال تھا کہ اُن سے روایت کرنے مین ہرج نہین ہے، مگر اس پر اعتماد نہین کیا جا سکتا،

سیوطی نے دُرِ منثور مین کئی کتابون کے حوالہ سے کئی بزرگون سے اس افسانہ کو نقل کیا ہے اور اکثر روائتین صحابی اور تابعی کے قول پر منتہی ہوتی ہین، ایام جاہلیت مین یہ قصہ مشہور تھا صحابۂ کرام کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مشہور ماجرا سنانے کے بعد اس کے متعلق قرآن مجید کی آئتین پڑھ دیتے تھے، اس طرح قرآن کی آیت مشہور عوام قصہ کی اصلاح کر دیتی تھی، ، ور سننے والے قصہ کو قرآن کی تفسیر نہین، بلکہ قرآن کی آیت کو قصہ کے باطل حصہ کی تردید اور سچے حصہ کی تصدیق سمجھتے تھے، اس لئے اگر صحیح سند سے کسی صحابی تک کسی ایسے قصہ کی سند پہنچتی ہے، جس کا قرآن سے رابطہ ہونے کے باوجود اس مین قرآن سے زائد ناقابل یقین باتین ہین، تو ہم کو چاہئے کہ روایت کو مسترد کرنے کے بجائے مضمون قرآن کو قصہ کی اصلاح قرار دین، لیکن دشواری یہ ہے کہ بعض روایات مین ایسے الفاظ بھی ہین، جو اس کریہہ کہانی کے بعض اجزاء کو آنحضرت صلعم کی زبان مبارک پر بھی رکھ دیتے ہین، ایسی روائتین یقینی طور پر قابلِ تسلیم نہین ہین، حضرت علیؓ کی طرف منسوب روایت کو جسے حاکم نے صحیح بتایا ہے، ابن حزم نے جھوٹی کہا ہے، اور محدثین اُسے حضرت علیؓ کا قول ہی نہین مانتے، وہ اگر درست بھی مان لیجائے

تو چونکہ حضرت علی پر منتہی ہوتی ہے، اور عام عربی تصور کے مطابق ہے، اس لئے کوئی ہرج نہیں، مگر در منثور مین خطیب وغیرہ کے حوالہ سے سیوطی نے نافع کا قول نقل کیا ہے، کہ ایک سفر مین انکا اور حضرت عبد اللہ بن عمر کا ساتھ ہوا اتنے مین سرخ تارا طلوع ہوا اسے دیکھ کر ابن عباس نے کہا لا مرحبا بھا ولا اھلا، مین نے کہا سبحان اللہ نجم سحر سامع مطیع ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا ما قلت لک الا ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

یہ فرمانے کے بعد ہاروت اور ماروت کا قصہ نقل کیا ہے لیکن ابن جریر نے عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار سے اس قصہ کی تخریج کی ہے، اور یہی واقعہ ہے اس قصہ کی روایت مفسرین کسی شخص تک بھی منتہی کرین لیکن ان تمام روایتون کا سرچشمہ انھین کعب احبار یا کسی دوسرے عالم اہل کتاب کا قول ہوگا، قرآن مجید کی آیت کو ہاروت وماروت اور زہرہ کی کہانی سے کوئی واسطہ نہین ہے۔ البتہ قرآن مین اُن کی بابت طنزاً دو فرشتون کا لفظ ہے، مگر وہ واقعی فرشتے نہ تھے، بلکہ ایک ایسے ہنر کے معلم تھے جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے مکفرین سلیمان علیہ السلام کے کفر کی دلیل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ خود اُن کو بھی اپنی بابت فتنہ اور اپنے ہنر کی بابت کفر ہونے کا یقین تھا، چنانچہ فرمایا کہ یہ مکفرین سلیمان،

یعلمون الناس السحر وما انزل	آدمیون کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے
علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور اس کی بھی جو کہ ان دونون فرشتون پر
وما یعلمان من احد حتی یقولا	نازل کیا گیا تھا بابل مین جن کا نام ہاروت
انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون	وماروت تھا، اور وہ دونون کسی کو
منھما ما یفرقون بہ بین المرء و	نہ تبلاتے، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا
زوجہ وما ھم بضارین من	وجود بھی ایک امتحان ہے اسو تو کہین

اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰہُ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِہٖٓ اَنْفُسَھُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ

کا فرمت بنائیو، سو لوگ ان دونوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفرقہ پیدا کر دیتے تھے، اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے حکم سے اور ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں، جو ان کو ضرر رساں ہیں، اور ان کو نافع نہیں ہیں، اور ضرور یہ بھی اتنا جانتے ہیں، کہ جو شخص اس کو اختیار کرے، ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بے شک بُری ہے وہ چیز جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں، کاش ان کو عقل ہوتی۔

قصہ کا سرچشمہ | حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف منسوب ایک روایت سے ظاہر ہے کہ ہاروت اور ماروت کا افسانہ مسلمانوں میں کعب احبار کے ذریعہ آیا، حضرت کعب احبار یمنی اور مذہبا یہودی تھے، ان کی طرف منسوب اقوال سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نصرانی لٹریچر سے بھی واقف اور کسی حد تک متاثر تھے، موجودہ دور کے نصرانی علماء اب تو ہاروت اور ماروت کے قرآن میں مذکور ہونے پر معترض ہیں، لیکن اس کے ناپسندیدہ عناصر جن کو تفسیر قرآن سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، خود نصرانی اور یہودی لٹریچر سے آئے،

مسلمانوں کا فرشتوں کی بابت یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کر سکتے، اور

وہ وہی کرتے ہیں جو اُن کو خداوند عالم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے" اس عقیدہ کو اہلِ علم کے مباحث نے ایجاد نہیں کیا، بلکہ قرآن مجید میں فرشتوں کی بابت صریحاً یہ ارشاد ہے، قدیم نصرانیوں کے خیال میں ایسے فرشتے بھی ہیں، جنھوں نے گناہ کیا، اپنی اصلی حالت پر نہیں رہے، بلکہ اپنے مقام کو چھوڑ دیا (یہوداہ کا خط ورس ۶ پطرس کا دوسرا خط ۲: ۴) چونکہ قرآن میں ایسی چیز کے دو معلمون کو خدا نے ظرفاً دو فرشتے کہا ہے جس کا سمجھنا مشکل نہ تھا، اسی لئے حضرت کعب احبارؓ نے ہاروت اور ماروت کو انہی فرشتے میں سے خیال کر لیا جن کا ذکر یہوداہ اور پطرس کے مقدس خطوں میں ہے،

نصرانیوں کا یہ تصور اُن کی اپنی ایجاد نہ تھا، بلکہ یہودیوں کے تصور میں فرشتے دو قسم کے تھے، نیک اور بد، علاوہ برین ہر ملک کا حامی اور نگران ایک ایک فرشتہ کو مانا جاتا تھا، سفر دانیال میں ہے کہ حضرت جبرئیل نے ان کو خبر دی کہ

"فارس کی مملکت کا سردار ۲۱ دن تک میرے مقابلہ میں ڈٹا رہا، اور دیکھ میکائیل جو سرداروں میں پہلا ہے میری مدد کو پہنچا، (۱۰: ۳) اور اب دیکھ میں فارس کے سردار سے لڑنے کو پھر جاؤنگا تب یونان کا سردار آئے گا، (دانیال ۱۰: ۳)

ان آیتوں سے سمجھا گیا کہ جس طرح فارس اور ایران کے جدا جدا غیبی سردار تھے، جو میکائیل اور جبرئیل کے حریف تھے، اسی طرح ہر ملک کا حامی اور مددگار خدا کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے، مصر کے حامی اور مددگار فرشتہ کا نام عزی تھا، چنانچہ ایک مدراس کی روایت ہے کہ جب بنو اسرائیل مصر سے نکلنے لگے،

"مصر کے موکل عزی نے تخت الٰہی کے سامنے عرض کیا جس قوم کو تو مصر سے نکال رہا ہے اس پر میرا حق ہے،

مگر اسرائیل کے موکل میکائیل نے سامنے آکر عزی کے تمام دلائل خاک میں ملا دئے،[1] عزی نے

---

[1] My The onlegund of Ancient Israel [illegible] Midrach Ab-Kie gonted by yalkal 241

یہ بھی کہا تھا کہ "تونے حضرت ابراہیم سے فرمایا تھا، کہ تیری نسل ۴۰۰ برس مصر کی غلامی کرے گی، ان لوگون نے میری قوم کی صرف ۲۰۰ برس غلامی کی ہے، اس لئے ابھی ۲۱۰ برس اور میرے لوگون کو ان سے خدمت لینے کا حق ہے، لیکن میکائیل نے بحث کرکے قائل کردیا، کہ یہ مدت صرف مصر مین قیام کے لئے مقرر تھی،[۵]

عزی یعنی حمایت مصر پر مامور فرشتہ کے متعلق یہود کے تصورات ایسے تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بولی مین یہ اہل مصر کے دیوتا آمن رع کا نام تھا، اکثر وہ فراعنہ جن کا تاریخ بنی اسرائیل سے رابطہ ہے خود کو آمن رع کی نسل باور کرتے تھے،

عزی کے ایک ساتھی فرشتے کا نام عزازیل تھا، جو کہ مسلمانون کے لٹریچر مین ابلیس کا ایک نام ہے،

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندان لعنت گرفتار کرد

سفر احبار کے مطابق نعوذ باللہ خود خدا نے اس کے لئے بکرے چھوڑنے کا حکم دیا تھا، یہودی افسانون کے مطابق یہ دونون فرشتے تھے جو آسمان سے زمین پر اتارے گئے تھے، ان دونون نے بنی آدم کو ایسے جادو کی تعلیم دی کہ اس کے زور سے انھون نے ایام الوحش مین سورج اور چاند تک کو گرلیا تھا،[۶] ہاروت وماروت کو عربی روایتین سحر اور جادو کا معلم بتاتی ہین، قرآن مجید کی آیت:-

"یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ"

سے ظاہر ہے کہ سحر اور چیز ہے، اور جس چیز کی ہاروت اور ماروت تعلیم دیتے تھے، وہ اور چیز ہے، کیونکہ عربی قاعدہ سے معطوف کو معطوف علیہ کا غیر سمجھا جاتا ہے جن عربی روایات مین ہاروت اور ماروت کو معلمین سحر بتایا گیا ہے، وہ عزی اور عزازیل کو قرآن کے ہاروت اور ماروت سے تطبیق دینے کا نتیجہ ہین،

یہودی تصور مین گھڑے ہوئے فرشتے صرف دو ہی عزی اور اسرائیل نہین تھے، بلکہ اور بھی کئی ایک تھے، سفر تکوین مین نظم کی بابت جو حضرت نوح کے زمانہ مین دنیا کے اندر آباد تھے، یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بنات آدم اور بنوالوہیم کی اولاد تھے، بنوالوہیم (ہرچند بیٹے یا خدا کے جنے ہوئے) جیسے کسی قدیم نام کا ترجمہ ہے

خود کو "بنار اللہ" کہنے والی کسی قوم کا اس نام سے ذکر ہے، یہودی روایات نے ان بنی الوہیم کو ان فرشتون مین شمار کیا ہے جنھون نے گناہ کرکے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، اور اپنی قدیم حالت مین نہ رہے، ان مین چند کے نام یہ ہین،

"برق ایل، کوکب ایل، ارض ایل، شمس ایل، شہر ایل"

اُن کے رئیس اعظم کا نام شمحزی تھا، یہودی کہانی بولتی ہے، کہ یارد کے زمانہ مین برق ایل وغیرہ فرشتون نے جو زمین پر اُتارے گئے تھے، بنات آدم کو خوبصورت دیکھ کر کہا،

"ہم اپنے لئے صرف بنات آدم سے بیبیان چنین گے، اور ان سے اولاد پیدا کرین گے"،

چنانچہ باہمی مشورہ سے انھون نے اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا[1]،

اس افسانہ کے اندر ہاروت اور ماروت کے ایک عورت سے ملوث ہونے کا ذکر ہے، اس کی حقیقت بھی ہے، کہ قرآنی طنز کو نہ سمجھ کر بنات آدم سے ناجائز تعلقات پیدا کرنیوالے خطا کار عزی اور عزازیل کو ہاروت و ماروت سے تطبیق دی گئی،

ہاروت اور ماروت کا زمانہ ہماری روایتون نے حضرت ادریس کا زمانہ بتایا ہے، عام طور پر حضرت ادریس کو جناب حنوک سے تطبیق دی جاتی ہے، جو حضرت نوح کے مورثون مین سے تھے، یہودی افسانہ بتاتا ہے کہ جب ان گرے ہوئے فرشتون کی شرارتین حد سے گذر گئین، تو خدا نے حضرت حنوک کو ان کی تنبیہ پر مامور کیا، انھون نے عزازیل وغیرہ تمام گرے ہوئے فرشتون کو خدا کا حکم سنا دیا، جسے سُن کر وہ سہم گئے، اور حضرت حنوک کی معرفت خدا کے پاس درخواست رحم بھیجی لیکن خدا نے جواب مین کہلوایا، کہ بنی آدم کی شفاعت تم کو کرنی چاہئے تھی، نہ کہ خود تم نے ایک ابن آدم کو اپنا شفیع بنایا، اور اُن کی درخواست مسترد کردی، اس کے بعد اُن کے جرائم گنوا کر یہ فیصلہ کہلا بھیجا، کہ تمھارے لئے اب آرام اور چین نہین ہے[2]"،

انھی کوکب ایل، اور شہر ایل جیسے فرشتون کی بابت یہ درس کا بیان ہے کہ خدا نے ان کو نہین چھوڑا"

---

[1] دی لیجنڈ آف جیوز ج اول ص ۱۲۶ [2] ایضاً،

بلکہ تاریکی کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کے حوالہ کیا تاکہ عدالت کے دن تک اُن کی نگہبانی ہو، (۲ پطرس ۲:۴) جناب یہودا فرماتے ہیں، کہ "اُن کو خدا نے ابدی زنجیروں سے جکڑ کر تاریکی میں روزِ عظیم کی عدالت تک رکھا ہے۔" (یہوداہ ۱:۶) یہ ہیں بھٹکنے والے ستارے جن کے لئے تاریکی کی سیاہی ہمیشہ کے لئے دھری ہے۔ (یہوداہ ۱:۱۳) عربی روایت نے ہاروت اور ماروت کو چاہِ بابل کی تاریکی میں قید کیا، جو یہ کہانی کا ایک دوسرا رنگ تھا، یا قرآن کے ہاروت و ماروت کو جن سے ۵۸۶ اور ۵۳۸ ق م کے درمیان بنی اسرائیل بابلی فنون و علوم سیکھے تھے، ان فرشتوں سے تطبیق دینے کی بدولت اُن کے محبس کو جنوبی ارضِ بابل میں اتار دیا گیا،

وہ عورت جس سے ہاروت اور ماروت ملوث ہوئے تھے، اس کو ستارہ زہرہ کی صورت میں مسخ ہو جانے کے واقعہ کا اصل ماجرا یہ ہے کہ اہلِ بابل کے ایک دیوتا کا نام دوموزی تھا جس کا ذکر بائبل میں تموز کے نام سے آیا ہے جس کے لئے عورتیں نوحہ کیا کرتی تھیں، اس کو دیوی عشتر کا جسے یمن میں عشتر اور فلسطین میں عشتار کہا جاتا تھا، اہلِ بابل کی دیومالا میں شوہر بتایا گیا تھا، بابلی اور آشوری روایت یہ تھی، کہ دوموزی مر گیا، اور اسکی روح دیوی اللات کے ملک ارالو (یعنی بے نور ملک) میں قید کر دی گئی، اس کے بعد عشتار نے ازدوبار (گلگامش) کو اپنا شوہر بنانا چاہا۔ مگر اس نے اُس کی درخواست قبول نہ کی، اس لئے وہ اللات کے بے نور ملک میں جاکر دوموزی کو دوبارہ زندہ کر لائی یہ ہے افسانہ ازدوبار کا ملخص،

تموز اور عشتار دونوں دراصل آسمانی اجرام کے نام ہیں جن کو پوجا جاتا تھا، لیکن انسانوں کے بھی یہ نام ہوتے تھے، ان ناموں کے ایک انسانی جوڑے کو ان ناموں کے دیوتاؤں کا اوتار بھی مانا جاتا تھا، یہی خیال بعد میں اس شکل میں بدل گیا، کہ عشتار نام ایک عورت جس کا عربی نام زہرہ ہے، اپنے شوہر تموز سے سیکھے ہوئے جادو یا عربی روایت کے مطابق اسمِ اعظم کے زور سے زہرہ بن گئی،

قرآنی آیت کی تفسیر میں ان تفصیلات کے تذکرہ کی ضرورت نہیں تھی، لیکن چونکہ کتب تفسیر میں یہ افسانہ مذکور ہے، اور اس کی بدولت قرآن پر اعتراضات کئے جاتے ہیں! اس لئے ہم کو اس قدر تفصیل سے کام لینا پڑا،

قرآن میں یقیناً ہاروت اور ماروت کو طنزاً دو فرشتے کہا گیا ہے، لیکن یہ دونوں یہودی لٹریچر کے گھڑے ہوئے فرشتوں میں سے نہ تھے، کیونکہ اُن کے اسماء میں اُن کے نام نہیں ملتے، یہ دونوں درحقیقت تاریخی اشخاص اور بابلی استادوں میں سے دو استاد تھے، جن کو ان کے ماننے والے حسنِ اعتقاد کی بنا پر فرشتے کہتے تھے، قرآن نے طنزاً اُن کو فرشتے کہا، اُن کے معتقدین بھی اُن کو حقیقی معنوں میں فرشتے نہیں کہتے تھے بلکہ اپنے گمان کے مطابق اُن کے حسنِ سیرت اور تقدس کے سبب سے ان کو تشبیہاً اسی طرح فرشتے کہتے تھے، جس طرح زنانِ مصر نے حضرت یوسف کی بابت کہا تھا، اِنَّ ھٰذا اِلَّا مَلَکٌ کریم،

ارض القرآن حصہ اوّل

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر، اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے، ضخامت ۴۴۳ صفحے قیمت سے ر

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، قیمت للعہ ر ضخامت ۴۴۰ صفحے،

تفخیم

الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ

کا

ایک نادر نسخہ

از

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو

گذشتہ مہینہ مین، مدرسہ مفتاح العلوم (جامع مسجد شاہی، مئو، ضلع اعظم گڈہ) کے کتب خانہ مین حافظ ابن حجر عسقلانی کی تلخیص نصب الرایہ مسمّی بالدرایہ کا ایک نادر اور اہم نسخہ داخل ہوا ہے، یہ اس کتاب کا نصف ثانی ہے، جو کتاب النکاح سے لے کر آخر تک کے تمام ابواب پر مشتمل ہے، ہمارے علم مین یہ نسخہ اپنی گوناگون خصوصیات کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے، سطور ذیل مین اس نسخہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ممکن ہو کوئی صاحب علم اُس کے نصفِ اوّل کا سراغ لگا سکین، اور اصحاب علم کے شکریہ کے مستحق ہون،

نسخہ زیر نظر تقریبًا ۲۰×۳۰ کے ۱۶۲ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ مین اکیس۲۱ سطرین ہین، خط نہایت پاکیزہ ہے کاغذ بہت دبیز اور اتنا پائدار و بہتر ہے، کہ تقریبًا ساڑھے پانچسو برس گذرنے پر بھی بوسیدگی و کہنگی کا کوئی اثر اس مین نہین ہے، ابواب کے عنوانات، ہر حدیث کی ابتدا مین لفظِ حدیث یا قولہ اور ایک حدیث کے دوسرے حوالہ یا اس کے دوسرے طریق کے بیان کے لئے لفظ تخریجہ یا ورواہ اور لہ طریق آخر وغیرہ شرح روشنائی سے لکھے ہوئے ہین،

اس نسخہ کا سنہ کتابت ۸۵۳ھ ہے، اس اعتبار سے خود مصنف کی زندگی مین اور تصنیف کے صرف تین سال بعد لکھا گیا ہے، اس لئے کہ حافظ ابن حجر کی وفات ۸۵۲ھ مین ہوئی ہے، اور درایہ کا سالِ تصنیف ۸۲۷ھ ہے،

اس نسخہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہو کہ وہ ابو الفتح محمد بن احمد خطیب طوخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بزرگ نوین صدی ہجری کے مشہور عالم و کاتب ہین، حافظ ابن حجر کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین ان کا ذکر کیا ہے، وہ زرکشی، ابن الملقن اور دمیری وغیرہ کے شاگرد اور سبعہ کے قاری تھے، اور زین بن الصائغ سے کتابت کی مشق کی تھی، حافظ سخاوی فرماتے ہین کہ

"انھون نے ہمارے شیخ (ابن حجر) کی بہت سی تالیفات کی کتابت کی تھی"

حافظ ابن حجر کی مجلس املا مین ان کے امالی بھی لکھتے تھے، اور بہت تیز لکھتے تھے، اُن کی وفات ۸۴۳ھ مین ہوئی، (ضوء اللامع جلد، ص ۸۸)

سخاوی کے اس بیان کی بنا پر زیرِ نظر نسخہ خود حافظ ابن حجر کے معتمد علیہ اور ان کی تالیفات کے ناقل و کاتب خاص کے قلم کا ہے، اور اس لحاظ سے یہ نسخہ نوادر روزگار مین سے ہے،

تیسری خصوصیت یہ ہو کہ یہ نسخہ ایک زمانہ مین ہندوستان کے مشہور و نامور بزرگ و عالم و مصنف حضرت مولانا غلام یحیٰی بہاری قدس سرہ کی ملک رہ چکا ہے، اور اس پر اُن کی مہر ثبت ہو جس مین اُن کے نام کا سجع بیشرک بغلام اسمہ یحیٰی کندہ ہے، اور مہر کے اوپر مولانا کے دست خاص کی یہ تحریر ہے، ثم دخل فی ملک غلام یحیٰی البھاری فی دار الخلافۃ بالشراء،

یہ تو اس نسخہ کے ظاہری خصوصیات ہین، اسی کے ساتھ اس کی سب سے بڑی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کتاب مین بہت سی حدیثون کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے کہ

لم اجدہ — مین نے اس کو نہین پایا،

اس نسخہ مین ہر جگہ تو نہین لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر کسی قدیم حنفی محدث کے مختصر تعلیقات ہین، ان تعلیقات کا خط اصل کتاب کے خط سے بہت مختلف ہے، پھر بھی بہت قدیم ہے، اور اغلب یہ ہو کہ اسی عہد کے کسی بزرگ کے تعلیقات ہین، ان تعلیقات مین ان بزرگ نے یہ بتایا ہے کہ حافظ ابن حجر کو فلان حدیث نہین ملی مگر وہ فلان فلان کتاب مین موجود ہے،

اس قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر حاشیہ مین ایک مٹی مٹی سی عبارت ہو، جس کے بعض الفاظ کیڑون نے چاٹ لئے ہین، اور کچھ جلد بند کی بے احتیاطی سے کٹ گئے ہین، اس لئے اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے، تاہم بڑی کوشش سے اس کے بعض فقرے پڑھنے مین کامیابی ہوسکی، وہ فقرے یہ ہین،

"الحمدُ للہ طالعت ھذہ النسخۃ وَعلقت فی ھوامشھا مالو یجد مولفھا ...... وکتب قاسم الحنفی"

ان فقرون کو پڑھکر مین خوشی سے اچھل پڑا، اس لئے کہ ان فقرون نے ساری گرہ کھول دی، اور ان سے کاتب تعلیقات کا سراغ مل گیا، جس سے ان تعلیقات کی قیمت میری نگاہ مین بہت بڑھ گئی،

یہ قاسم حنفی، شیخ ابن الہمام اور حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نوین صدی ہجری کے مشہور حافظ حدیث، وفقیہ حنفی، علامہ قاسم بن قطلوبغا ہین، جن کا ذکر نزائر الہ آبادی نے یون کیا ہو،

آن کہ از جمع حلقۂ اعلام

ابن قطلوبغاست قاسم نام

اور جنھون نے متعدد کتابون (مثلاً عوارف المعارف، الاختیار شرح المختار، اصول بزدوی، تفسیر ابی اللیث، منہاج الاربعین، الاربعین فی اصول الدین، جواہر القرآن، بدایۃ الہدایۃ، اور شرح العقائد) کی تخریج احادیث لکھی ہو، اور امام عراقی و امام زیلعی جن احادیث کی تخریج مین ناکام رہے ہین، ان کی تخریج کرکے ان کی کتابون کا تکملہ لکھا ہے، ایک کا نام اتحاف الاحیاء بما فات العراقی من تخریج احادیث الاحیاء اور دوسری

کا نیۃ الالمعی بما فات الزیلعی ہو، اُن کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین اُن کا مطول ترجمہ درج کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ یعرف بقاسم الحنفی یعنی قاسم حنفی کے نام سے معروف ہین، سخاوی نے یہ بھی لکھا ہو کہ حافظ ابن حجر نے اُن کو الامام العلامۃ المحدث الفقیہ الحافظ کے القاب سے یاد کیا ہے، اور اعتراف کیا ہو کہ علامہ قاسم نے میری کتاب ایثار کے پڑھنے کے دوران مین خود مجھکو فائدہ پہنچایا، اور نئی باتین بتائین، اور بہت سی جگہ مجھکو تنبہ کیا، تو مین نے اصل کتاب مین اُن کی تنبیہات و فوائد کا اضافہ کر لیا، جس سے میری کتاب کی نورانیت بڑھ گئی، (ضوء اللامع ص ۱۸۵ جلد ۶)

اس عبارت کے حل ہوجانے سے اس نسخہ کی یہ عظیم الشان خصوصیت ظاہر ہوئی کہ وہ علامۂ قاسم کے مطالعہ مین رہ چکا ہے، اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک کی تعلیقات ہین،

درایہ اب سے بہت پہلے ہمارے ہم وطن عالم مولانا محمد علی ابو المکارم صاحب مرحوم کی سعی و اہتمام سے ۱۲۹۹ھ مین طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، ہم چاہتے ہین کہ اس مضمون مین زیر نظر نسخہ سے علامہ قاسم کے تعلیقات بھی نقل کر دین، تاکہ مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ کرنے والے حضرات ان تعلیقات کو بھی پیش نظر رکھین، اور حافظ ابن حجر کی وسعتِ نظر کے اعتراف کے ساتھ ساتھ فوق کل ذی علم علیم کے یقین و اذعان سے بھی ذہول نہ ہو،

تعلیقات علامہ قاسم علی الدرایۃ

۱- حدیث لانکاح الا بشھود کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے لم ارہ بھذا اللفظ (مین نے ان لفظون کے ساتھ اس کو نہین دیکھا ہو)، اس پر علامہ قاسم فرماتے ہین، قلت اخرجہ محمد بن الحسن فی الاصل بلاغاً و وصلہ الخطیب من حدیث علی (مین کہتا ہون اس کو امام محمد نے اصل مین بلاغاً ذکر کیا، اور خطیب نے موصلاً حضرت علیؓ کی حدیث سے)

۲- حدیث الثیب تشاور کی نسبت حافظ کا ارشاد ہے لم ارہ بھذا اللفظ۔ اس پر علامہ قاسم

فرماتے ہیں، قلت روی الحارثی فی المسند من حدیث ابی ھریرۃ لا تنکح الثیب حتی تشاور،

۳۔ ظہار کرنے والے کے حق میں ارشاد نبوی ہے، استغفر اللہ ولا تعد حتی تکفر، حافظ فرماتے ہیں کہ اس کے کسی طریق میں میں نے استغفار کا ذکر نہیں پایا، علامہ قاسم فرماتے ہیں:۔

قلت رواہ محمد بن الحسن بذکر الاستغفار من مرسل طاؤس ووصلہ الحاکم بذکر ابن عباس،

۴۔ حدیث الحناء طیب کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہیں:۔

قلت رواہ الطبرانی فی الکبیر عنھا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطیبی وانت محرمۃ ولا تمسی الحناء فانہ طیب،

۵۔ ہدایہ میں ہے، لم یاذن علیہ السلام للمعتدۃ فی الاکتحال والدھن اس پر حافظ فرماتے ہیں، اما الاکتحال فھو فی حدیث ام سلمۃ واما الدھن فلم اجدہ اس مقام پر علامہ قاسم نے لکھا ہے، قلت قولہ فی الھدایہ والدھن کلام مبتدأ من قبل نفسہ فانہ قال تنھی المعتدۃ عن الاکتحال والدھن لا یعری عن الطیب،

۶۔ ہدایہ میں ہو کہ حدیث فاطمہ بنت قیس کو حضرت زید و اسامہ نے بھی رد کر دیا تھا، حافظ فرماتے ہیں اما حدیث زید بن ثابت واسامہ بن زید فلم اجدھما علامہ قاسم فرماتے ہیں قلت ما عن اسامۃ بن زید رواہ الطحاوی،

۷۔ ہدایہ میں ہے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تعذیب الحیوان حافظ فرماتے ہیں، لم اجدہ علامہ قاسم نے لکھا، قلت الفقیہ یذکر الحدیث بالمعنی وقد روی البخاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن تصبیر البھائم،

۸- ہدایہ میں ہے روی سعید بن المسیب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بعتق امہات الاولاد وان لا یبعن فی دین ولا یجعلن من الثلث، حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:- رواہ محمد بن الحسن فی الاصل،

۹- بیع امہات الاولاد میں ہدایہ کی ایک حدیث کے لئے حافظ نے بیہقی کا حوالہ دیا ہے اس پر علامہ قاسم تحریر فرماتے ہیں، قلت ما رواہ البیہقی خلاف ما ذکر صاحب الہدایۃ والذی ذکرہ صاحب الہدایہ عند محمد فی الاصل،

۱۰- حدیث ادرؤا الحدود بالشبہات کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہیں، قلت رواہ الحارثی فی المسند من حدیث ابن عباس،

۱۱- ہدایہ میں ہے ومن زفت الیہ غیر امرأتہ وقال النسوۃ انہا زوجتک فوطئہا فلا حد علیہا وعلیہ المہر قضی بذلک علیؓ حافظ نے یہاں لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ عبد الرزاق،

۱۲- حدیث لا قطع فی الطعام کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ بہذا اللفظ علامہ قاسم فرماتے ہیں:- قلت رواہ بہذا اللفظ محمد بن الحسن فی الاصل،

۱۳- ہدایہ میں ہے وقد صح انہ علیہ السلام نہی قتل النساء والذراری اس پر حافظ نے فرمایا لم اجدہ ہکذا علامہ نے فرمایا قلت روی الحاکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل الحق خالد او لا تقتلن ذریۃ ولا عسیفا،

۱۴- حدیث ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعطی الفارس سہمین والراجل سہما کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم حنفی نے اس پر لکھا ہے، قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل وابو یوسف فی کتاب الخراج وابو یعلی الموصلی فی مسندہ،

۱۵- حدیث اِنَّ النَّبِی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ کَانَ یاکل مِنْ صدقتہ (رواہ المراد وتفقدہ) کی نسبت حافظ نے لکھا کہ لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الخصاف فی کتاب الاوقاف،

۱۶- حدیث من اشتری ارضاً فیھا نخل فالثمرۃ للبائع الا ان یشترط المبتاع کے باب میں حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم لکھتے ہیں قلت فی الطبرانی من حدیث ابن عمران رجلا باع ارضاً فیھا ثمرتھا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الثمرۃ للذی ابرّھا الا ان یشترط المبتاع،

۱۷- حدیث: لا تاخذ الا سلمک اوراس مالک کے حق میں حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الدارقطنی بلفظ مَن اسلف فی شیٔ فلا یاخذ الا ما اسلف فیہ اوراس مالہ،

۱۸- حدیث: لا تقبل شہادۃ الولد لوالدہ ولا الوالد لولدہ ولا المرأۃ لزوجھا ولا الزوج لامرأتہ ولا العبد لسیدہ ولا المولی لعبدہ ولا الاجیر لمن استاجرہ کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ نے اس پر کہا، قلت رواہ الخصاف فی کتاب ادب القضاء من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنہا،

۱۹- ہدایہ میں ہے، عن علی لا یجوز شہادۃ علی شہادۃ رجل الا شہادۃ رجلین حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم نے اس کا یوں پتہ بتایا، قلت اخرجہ محمد فی الاصل بلاغا عنہ،

۲۰- حدیث عمر اذا اقر المریض بدین جاز ذالک علیہ فی جمیع ترکتہ کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل عن

ابن عمرؓ واللہ اعلم،

۲۱- حدیث انّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اجاز العمری و ردّ الرقبی کو حافظ نے لکھا لم اجدہ کا علامہ نے لکھا: قُلت رواہ الامام محمد بن الحسن فی الاصل بھٰذا اللفظ،

۲۲- ضمان اجیر کے باب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر کو حافظ نے لکھا کہ لم اجدہ، علامہ قاسم نے تحریر فرمایا کہ قلت رواہ ابن ابی شیبۃ فی مُصنفہ ومحمد بن الحسن فی الاصل،

۲۳- حدیث لیس للنساء من الولاء الا ما اعتقن او اعتق مَن اعتقن، او کاتبن، او کاتب من کاتبن او دبرن او دبّر من دبرن او جرّ ولاء معتقھن کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ ھٰکذا اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت فی مسند رزین عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال میراث الولاء للا کبر من الذکور ولا یرث النساء من الولاء الا ولاء من اعتقن او اعتق من اعتقن،

۲۴- حدیث کان عمر اذا رأی جاریۃ متقنعۃ علاھا بالدرۃ وقال القی عنک الخمار یا دفار اتتشبھین بالحرائر حافظ ابن حجر نے فرمایا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ہے: قلت تقدم فی شروط الصلوٰۃ انہ لم یعرف منہ الایاد فار ولا یتوقف الحکم علیہ واللہ اعلم،

۲۵- حدیث: من آجر ارض مکۃ فکانما اکل الربا کی نسبت حافظ نے فرمایا، ھٰذا کانہ تصحیف من قولہ فانما یاکل ناراً، اس پر علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، قلت رواہ الدارقطنی بلفظ اکل الرباء

۲۶- حدیث حریم العین خمس مایۃ ذراع وحریم بیر العین[۵] اربعون ذراعاً و حریم بیر الناضح ستون ذراعاً کے باب مین حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے، لم اجدہ ھکذا علامہ قاسم فرماتے ہین، رواہ ھکذا الامام محمد بن الحسن،

۲۷- ہدایہ مین ہے وتعلیم الکلب ان یترک الاکل ثلاث مرات وتعلیم البازی ان یرجع ویجیب اذا دعوتہ وھو ماثور عن ابن عباس، اس پر حافظ نے لکھا لم اجدہ[۵] علامہ قاسم فرماتے ہین رواہ محمد بن الحسن فی کتاب الآثار

۲۸- ہدایہ مین ہے، اجمع الصحابۃ علی ان الرھن مضمون واختلفوا فی کیفیتہ حافظ نے لکھا لم اجدہ مگر اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے آثار نقل کئے، اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قد شرح المؤلف ما قال انہ لم یجدہ،

۲۹- حدیث لا یعقل العواقل عمداً ولا عبداً ولا صلحاً ولا اعترافاً کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا، لم اجدہ مرفوعاً الا ماروی الخ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ساقہ مرفوعاً رزین العبدری فی مسندہ،

مین نے اس نسخہ کی اطلاع علامہ زاہد کوثری کو دی تو انھون نے اس کو فاخرۃ جداً قرار دیا، اور منیۃ الالمعی بما فات الزیلعی کے ساتھ تعلیقات قاسم حنفی کو منگوا کر چھپوا رہے ہین،

---

[۵] ھکذا فی الاصل والصواب بئر العطن،

شہاب الدین محمود آلوسی

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دارالمصنفین

تفسیر روح المعانی ابھی حال ہی یعنی تیرہوین صدی کے وسط کی تصنیف ہے لیکن مقبولیت کے لحاظ سے اس کو بہت سی متقدم تفسیرون پر بھی فوقیت حاصل ہے، یہ کتاب مصنف نے بارگاہِ قدس کے اشارۂ غیبی پر تصنیف کی تھی، تفسیر کے مقدمہ مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے،

مصنف کے نام اور اُن کی تفسیر سے تو عام طور سے اہل علم واقف ہین، مگر ان کی دوسری تصانیف اور اُن کے سوانح حیات سے کم لوگون کو واقفیت ہے، اس لئے اردو مین ان کے حالات لکھنے کی ضرورت تھی لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی شخصیت اور اُن کے علمی کارنامون کی اہمیت کے لحاظ سے اُن کے حالات بہت کم ملتے ہین، تلاش سے جو معلومات حاصل ہو سکے ہین، وہ پیش کش ناظرین ہین،

خانوادۂ آلوسین آلوس عراق مین ایک بستی ہے جو دریاے فرات کے ساحل پر واقع ہے[1] یہ قدیم آبادی ہے، دوسری تیسری صدی ہجری مین اس کی حیثیت ضلع کے مرکزی مقام کی تھی، اس کی جانب بہت سے علما وصلحا بھی منسوب ہین، معجم البلدان مین اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے، لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہین ہے، تیرہوین صدی مین یہان کے ایک خاندان نے علم وفضل مین بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، اس خانوادہ کو عام طور پر خانوادۂ آلوسین کہا جاتا ہے، یہ خاندان علم وفضل کے لحاظ سے پورے

[1] معجم المطبوعات جلد ۱ صفحہ ۳۱،

عراق میں ایک خاص حیثیت کا مالک تھا، اور پورے اہلِ عراق کا مرجعِ علم تھا، صاحبِ روح المعانی اسی خاندان کے ایک فرد تھے،

نام و نسب اور ابتدائی حالات | شہاب الدین محمود نام، ابو عبد اللہ کنیت تھی، ۱۵ / شعبان بروز جمعہ ۱۲۱۷ھ کو آلوس میں پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام عبد اللہ صلاح الدین تھا، جو بڑے صاحبِ علم و فضل تھے انھی کی آغوشِ فیض میں اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، صاحبزادہ کو عربی اور فقہ، اور منطق کی متوسط تعلیم دینے کے بعد وہ عراق کے دوسرے علما کی خدمت میں لے گئے، جن سے انھوں نے تکمیل کی، اُن کے اساتذہ کے متعلق صاحبِ جلاء العینین[1] نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

اخذ العلوم عن علماء المحققین واجلاء مدققین، (صفحہ ۲۷)

انھوں نے محقق علما اور اہلِ نظر فضلا سے علم حاصل کیا،

لیکن کسی کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، الاب نویس شیخو نے اپنی کتاب آداب العربیہ میں اُن کے ایک استاذ علاء الدین سُوَیدی ۱۲۳۷ھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

علاء الدین واحد شیوخ شہاب الدین آلوسی،

آلوسی کے شیوخ میں ایک شیخ علاء الدین بھی تھے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھی شیوخ تھے،

ذہانت اور قوتِ حافظہ | بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے، حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، جلاء العینین میں ہے،

وکان ذا حافظۃ غریبۃ وفطنۃ عجیبۃ (صفحہ ۲۸)

عجیب و غریب ذہانت اور حافظہ پایا تھا،

---

[1] جلاء العینین کے مصنف شیخ آلوسی کے صاحبزادے ہیں،

قوتِ حافظہ کا خود ان کے بیان کے مطابق یہ حال تھا،

ما استودعت ذھنی شیئًا فخاننی[۱]	ایسا نہین ہوا کہ مین نے اپنے ذہن مین کوئی بات رکھی ہو، اور وہ پھر ذہن سے نکل گئی ہو

اسی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ۱۳ برس کی عمر مین ابن ہشام کی کتاب شرح قطر الندی پر حاشیہ لکھا[۲]، ابھی بیس برس سے بھی کم عمر تھی کہ مسند درس کے زینت بنے، اور اسی زمانہ مین صاحب تصنیف بھی ہوئے، جلاء العینین مین ہے،

وقد الف ودرس وھو دون العشرین (ص ۲۷)	بیس برس سے کم ہی کے تھے، کہ صاحب درس و تصنیف ہو گئے،

تلامذہ ابتداے عمر سے لے کر آخر عمر تک افادہ و تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس مدت مین ہزارون تشنگان علم اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہون گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا مفصل تذکرہ نہین ملتا، اُن کے صاحبزادہ کا بیان ہے کہ

وانتفع بہ خلق کثیر، (جلاء ص ۲۷)	اُن سے ایک مخلوق نے استفادہ کیا،

متفرق طور پر حسب ذیل تلامذہ کے نام ملتے ہین،

۱- ان کے دو صاجزادے عبد الباقی سعد الدین (۲) خیر الدین ابو البرکات جو اپنے وقت کے جید علماء مین تھے اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہین، جلاء العینین خیر الدین ابو البرکات ہی کی تصنیف ہے (۳) الشیخ عبد الفتاح شواف زادہ اُن کو حدیث و فقہ اور عربی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی، ادب کی تعلیم خاص طور سے انھون نے شیخ آلوسی سے حاصل کی تھی، اُن کی متعدد تصانیف ہین، حدیقۃ الورود کے نام سے دو جلدون مین شیخ آلوسی کی سوانح حیات بھی لکھی ہے، کاش یہ کتاب مل جاتی تو شیخ کے مفصل

---

[۱] جلاء العینین ص ۲۷ [۲] آداب العربیہ ج ۱ ص ۷۰ [۳] معجم المطبوعات،

حالات اور کارنامے سامنے آجاتے (۴) محمد الاخفش، یہ شیخ کے خاص تلامذہ مین تھے، ان کی تحریری یادگارون مین شرح الفیہ زیادہ مشہور ہے (۵) عبدالفتاح الاخرس انھون نے شیخ سے اور کتابون کے علاوہ کتاب سیبویہ خاص طور سے پڑھی تھی،[۱]

افتاء اس علم و فضل کے باوجود عام مجالس وعظ مین جانا پسند نہین کرتے تھے، ۱۲۵۰ھ مین اُن کو جامع بغداد مین وعظ کے لئے بلایا گیا، تو بہت بار خاطر ہوا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو بکراہت گئے، اس وعظ مین والی بغداد بھی موجود تھا، وہ بہت متاثر ہوا، اور اس کو اسی دن سے شیخ سے ایک خاص عقیدت ہوگئی، اور اس کے بعد سے وہ برابر ان کی خدمت مین حاضر ہوتا رہا، اور بعد مین بغداد کے مفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر کردیا، شیخ نے ۱۵ برس تک یہ خدمت نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دی،[۲]

وفات ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ۵۳ برس کی عمر مین وفات پائی، اور حضرت شیخ معروف کرخی کے پہلو مین سپرد خاک کئے گئے، .... وفات کا صدمہ خواص اور عوام سب کو ہوا، آج بھی آپ کی قبر زیارت گاہ عام و خاص ہے،[۳] متعدد شعراء نے طویل مرثیے لکھے، زندگی مین شعراء نے جو مدائح لکھے، اور موت کے بعد جو مراثی کہے گئے، ان سب کو الاب لوئیس نے کتابی شکل مین جمع کر دیا ہے،[۴] اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

اولاد و احفاد ان کے دو صاحبزادون عبدالباقی اور خیرالدین کا ذکر اوپر آچکا ہے، اُن کے علاوہ ایک اور صاحبزادے عبداللہ بہاء الدین تھے، دوسرے بھائیون کی طرح یہ بھی صاحب علم تھے، اُن کے صاحبزادے (یعنی شیخ آلوسی کے پوتے) ابوالمعانی متوفی ۱۳۴۲ھ نے علم و فضل مین باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، متعدد قیمتی تصانیف یادگار چھوڑین، ان مین بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب بہت مشہور ہے، اور چھپ کر شائع ہو چکی ہے،

اخلاق و عادات شیخ کے صاحبزادے نعمان نے ان کے ظاہری و باطنی محاسن کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے،

وکان حسن المنظر والمحاضرۃ نہایت خوبصورت اور خوش گفتار تھے اور

---

[۱] یہ پچھلے تینون آدمیون کا ذکر آداب العربیہ مین ہے جلد ۲ ص ۹۳ تا ۹۵ [۲] معجم المطبوعات ص ۵ [۳] جلاء العینین ص ۵ [۴] آداب العربیہ

والمفاکہتہ ورعاً تقیاً عفیفاً (ص۳۳ علامہ)	پرہیزگار اور پاک دامن تھے،

صاحب حدیقۃ الورود لکھتے ہیں :-

کریم النفس بدیع الاخلاق	کریم النفس اور اخلاق میں نادر روزگار تھے،

ارج الند کے مصنف کا بیان ہے،

ولم نسمع بمثلہ فی کافۃ الآفاق	بہت دنوں سے ان ممالک میں ایسا صاحب علم
منذ سنین عدیدۃ مع تقویٰ	و فضل سننے میں نہیں آیا، اس علم و فضل کے
وصلاح ودیانۃ قویۃ وسخاء	ساتھ صلاح و تقویٰ، راست بازی اور
وکرم وصدقات خفیۃ	سخاوت اور پوشیدہ صدقات کرنے میں وہ
(جلاء ص۲۷)	اپنی مثال تھے،

فضل وکمال | شیخ آلوسی کے علم و فضل کا صحیح اندازہ تو اُن کی تصانیف ہی سے ہو سکتا ہے لیکن انکے معاصرین بھی اُن کے کمالات کے معترف تھے،

ویس شیخو نے لکھا ہے،

کلف بالعلوم منذ حداثۃ	اوائل عمر ہی سے اُن کو علوم سے دلچسپی اور
سنہ وبذل النفس والنفیس	لگاؤ تھا اور علمی جواہر پاروں کے جمع کرنے میں
فی احراز جواھرھا فی ان رغبتہ	انھوں نے اپنی جان و مال ہر چیز لگا دی
فی طلب المعارف شغلتہ عن	تھی، طلب علم کی رغبت و شوق نے ان کو
حطام الدنیا وانستہ ھناء	اپنی طرف اتنا مشغول کر لیا کہ وہ زخارف
العیش وملاذ الحیاۃ وبرز	دنیوی اور لذت ایام سے بھی بے نیاز ہو گئے،
بالعلوم الدینیۃ فصار اماماً	اس ذوق و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم دینیہ

فی التفسیر والافتاء وکان مع ذلک کاتباً بلیغاً[1]

مین اُن کو پورا کمال حاصل ہوگیا، چنانچہ تفسیر اور افتاء مین اُن کی حیثیت امام کی ہوگئی، اسی کے ساتھ انشا پردازی اور بلاغت مین بھی کمال حاصل تھا،

صاحب حدیقۃ الورد جو اُن کے شاگرد ہین لکھتے ہین،

کشاف رموز الحقائق وغواص بحر الدقائق، علامة الفضلاء وحید الدهر بالاتفاق، خاتم المفسرین وسعد المحققین وفخر علماء المسلمین الواصل الی رتبة الاجتهاد ذکره فی البلاد (جلد ۔ صفہ ۲)

حقائق علم کا راز فاش کرنے والے اور بحر معانی کے غواص تھے، اہل فضل کی نشانی اور بالاتفاق نادرۂ روزگار تھے، خاتم المفسرینؒ اور اہل تحقیق اور علمائے اُمت کیلئے سعادت اور فخر کا موجب تھے، اُن کو اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا، تمام ممالک مین ان کا چرچا ہے،

صاحب اریج الند کا جو شیخ کے شاگرد ہین، بیان ہے،

وکان نادرة الدهر وان حصّل العلوم النقلية والعقلية فتفرد بها ودرس العربية والبيان والحديث والتفسير ووقف علی غامضة العسير... ولو سمع

نادرۂ روزگار تھے، انھون نے علوم نقلیہ اور عقلیہ کی تحصیل کی اور اس مین تفرد حاصل کیا، ادب عربی، معانی و بیان تفسیر و حدیث کا درس دیا، اور انھی علوم کی مشکلات حل کرتے رہے،........

[1] آداب العربیہ ج ۱ ص ۵۸،

بمثلہ فی کافۃ الاقالیم (صفحہ ۲۷) اُن کے جیسا نادرۂ روزگار سننے میں نہیں آیا،

عربی نظم و نثر | عربی نظم و نثر دونوں پر پوری قدرت تھی، نثر میں ان کی قدرت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں، صاحب آداب العربیہ ان کی تحریر کے متعلق لکھتے ہیں،

کان السید محمود سریع الخاطر ونسیج وحدہ فی قوۃ التحریر وسهولۃ الکتابۃ (ج ۴ ص۵۲) شیخ محمود نہایت ذکی الفہم اور اپنے انداز تحریر اور عبارت کی سلاست و روانی میں منفرد تھے۔

جلاء العینین میں ہے :-

والنثر العجیب الذی لم یلحق حسن اسلوبہ (صفحہ ۲۲) ایسی اچھوتی نثر لکھتے تھے، کہ اُن کے اسلوب تحریر کی مشکل ہی سے تقلید کیجا سکتی تھی،

عربی شعر و شاعری کا بھی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مذاق تھا، نثر کی طرح ان کی نظم میں بھی دو خصوصیتیں یعنی رقت و سلاست زیادہ نمایاں ہیں، نمونۂ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ایک موقع پر عراق کے چھوٹنے پر کہا ہے،

أهيم بآثار العراق وذكره وتغرق عيوني من مسرتها عبري

والثم اخفافاً وطئن ترابہ واكحل اجفاناً بتربته العطري

واسهر ارعی فی الدّیاجی کواکبا تمر اذا سارت علی ساکنی الزورا

بغداد کی تعریف اور اس کے فراق میں کہتے ہیں،

ارض اذا مرت بها ریح الصّبا حملت من الارجاء مسکا اذفرا

لا تسمعن حدیث ارض بعدها یروی فکل الصید فی جوف الفرا

فارقتها لا عن رضی وهجرتها لا عن قلی ورحلت لا متخیرا

لکنہا ساقت علی برجیہا — لما رایت بہا الزمان تنکرا

آخری شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کو انھوں نے خوشی سے نہیں، بلکہ حالات سے مجبور ہو کر چھوڑا،

علم نحو | نحو ان کا خاص فن تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ کتاب سیبویہ خاص طور سے وہ پڑھایا کرتے تھے، اس فن سے اُن کی دلچسپی کا انداز ہ اُن کی تفسیر سے ہوتا ہے، اس میں نحو کے جو مسائل آئے ہیں اگر ان کو الگ کر لیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے،

امر بالمعروف | امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علمار کا خاص فریضہ ہے، شیخ آلوسی کو اس فرض کا پورا احساس تھا، اور وہ درس میں علمی و دینی خدمت کے ساتھ اس فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے، ان کے صاحبزادے نعمان اُن کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

والامر بالمعروف والنھی عن المنکر	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور سُنّت
والذب عن السّنۃ (جلاء ص ۳۵)	نبوی کی طرف سے مدافعت بھی ان کی
(جلاء ص ۳۵)	خاص خصوصیت تھی،

مسلک | پورا خانوادہ آلوسیین شافعی المسلک تھا، اس لئے شیخ آلوسی بھی شافعی تھے، لیکن ان میں تشدد نہیں تھا، چنانچہ بعض مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند تھے، شاید اسی وسعت کا نتیجہ تھا کہ عہدۂ افتار پر ان کا تقرر ایک حنفی مفتی کی حیثیت سے ہوا تھا[1]،

تصانیف | شیخ کا اصل کارنامہ ان کی بیش بہا تصانیف ہیں، جن کی ... اہمیت اُنکی کمیت کی وجہ سے نہیں بلکہ معنوی کیفیت کے لحاظ سے ہے، اور اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے اس مضمون میں صرف اُن کے نام اور مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے،

---

[1] معجم المطبوعات ص ۔

قل انّه کانَ لا یقصر ما لیقصق

الیوم لی اللیلۃ عن اقل من ورقتین

کبرتین (صعف)

صاحب جلا العینین نے اُن کی ۸۰ تصانیف کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ۱۳ مطبوعہ ہیں،

۱- الاجوبۃ العراقیہ عن الاسئلۃ الایرانیہ :- ایران کے علماے شیعہ نے چند سوالات کئے تھے، یہ کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، ۱۳۱۴ھ میں آستانہ سے شائع ہو چکی ہے،

۲- الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ اللاہوریۃ، یہ بھی چند سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۷ھ ہے، بغداد سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کی ضخامت ۵۶ صفحات ہے،

۳- قطر الندیٰ: فن نحو کی کتاب ہے، ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۲ھ کی تصنیف ہے، خود اس نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی ہے، اس کتاب کی صاحب کشف الظنون نے بڑی تعریف کی ہے، اس پر متعدد حواشی لکھے گئے ہیں، شیخ آلوسی نے بھی اس پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، صرف باب الحال تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا، انکے بعد انکے صاحبزادے نعمان نے اسے پورا کیا، ۱۳۲۰ھ میں بیت المقدس سے شائع ہو چکی ہے،

۴- الخریدۃ الغیبیہ فی تفسیر قصیدۃ العینیہ، عبد الباقی موصلی نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایک قصیدہ عینیہ لکھا تھا، مصنف نے اس کی تشریح کی ہے، قصیدہ مع تشریح ۱۲۷۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس کی ضخامت ۱۵۶ صفحات ہے،

۵- سفرۃ الزاد لسفرۃ الجہاد :- یہ جہاد سے متعلق ہے، ۱۲۷۰ھ میں مطبع دار السلام مصر نے اُسے شائع کیا ہے،

۶- الطراز المذہب شرح قصیدۃ الباز الاشہب: عبد الباقی عمری کے ایک قصیدہ کی شرح ہے، مطبع جریدۃ الفلاح نے ۱۳۱۳ ہجری میں اسے شائع کیا ہے، اسکی ضخامت ۹۶ صفحات ہے،

۷- غرائب الاغتراب ونزھۃ الالباب: مصنف نے فلسطین کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں، اسی میں ان تمام علماء و صلحاء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں، جن سے انھوں نے اثنائے سفر میں ملاقات کی تھی، ۱۳۲۷ھ میں بغداد سے یہ سفرنامہ شائع ہو چکا ہے، کتاب کے شروع میں احمد شاکر آلوسی کے قلم سے مصنف کا ترجمہ بھی ہے، اسکی ضخامت ۴۵۱ صفحے ہیں،

۸- الفیض الوارد: سید محمد جواد نے اپنے شیخ الشیوخ خالد الکردی النقشبندی کا ایک طویل مرثیہ والیہ لکھا تھا، یہ اس کی شرح ہے، ۱۳۰۰ھ میں مطبع کاستلیہ نے شائع کیا، ضخامت ۴۲ صفحات ہے،

۹- کشف الطرۃ عن الغرۃ درۃ الغواص فی اوھام الخواص، ابو محمد قاسم الحریری متوفی ۵۱۶ھ کی تصنیف ہے، اس کتاب میں مصنف نے خواص کے معائب، اور اُن کے اوہام باطلہ پر بڑی اچھی بحث کی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، دو شرحیں نظم میں بھی کی گئی ہیں، شیخ آلوسی نے بھی کشف الطرہ کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، یہ کتاب دمشق سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، کتاب کے شروع میں شیخ کے صاحبزادے نعمان آلوسی کا ایک مقدمہ بھی ہے، کتاب کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہیں،

۱۰- المقامات الخیالیہ: یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے، بغداد یا کربلا سے شائع ہو چکی ہے،

۱۱- نشوۃ الشمول: یہ سفرنامہ ہے، ۱۲۶۶ھ میں مصنف نے استنبول کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں،

۱۲- نشوۃ المدام فی العود الی مدینۃ السلام، یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، غالباً یہ سفر سے واپسی پر بغداد کے متعلق کچھ لکھا ہے، واللہ اعلم، یہ کتاب دوبار بغداد سے شائع ہوچکی ہے،

۱۳- تفسیر روح المعانی: اُن کی زندگی کا اصلی اور سب سے اہم علمی اور دینی کارنامہ یہی تفسیر ہے، اس کی تالیف ۱۲۵۲ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۴۲ برس کی تھی، شروع ہوئی، اور ۱۲۶۷ھ میں اختتام کو پہنچی، یہ کتاب دوبار چھپ چکی ہے،

کتاب کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوانی ہی میں قرآن کے بہت سے حقائق و معارف اُن پر منکشف ہونے لگے، اور بہت سے دقائق اُن کے ذہن میں ایسے آئے، جو متداول تفسیروں میں نہیں ملتے، چنانچہ ان کو ان دقائق و معارف کے قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا، ابھی وہ اس ادھیڑبن ہی میں تھے کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین و آسمان کے لپیٹنے اور اس میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اس کو پُر کرنے کا حکم دے رہا ہے، اسی حالت میں انھوں نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اور دوسرا پانی کی طرف بڑھایا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، اور تفسیر لکھنے میں جو کچھ تامل و تردد تھا، وہ رفع ہوگیا، اور انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا،

کتاب کے شروع میں، فائدے دیئے ہیں جن میں تفسیر کے تمام اہم مسائل آگئے ہیں، مثلاً تفسیر و تاویل، تفسیر بالرای، اسمار قرآن، کلام اللہ غیر مخلوق، حروف سبعہ، جمع و ترتیب قرآن، اعجاز القرآن وغیرہ مباحث پر مختصر طور سے اچھی بحث کی ہے، پوری تفسیر ۳۰ حصوں میں ہے،

اس خاندان کے دوسرے اکابر شیخ کے صاحبزادوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، جن میں ہر ایک صاحب علم و فضل تھا، اُن کے دو پوتوں نے بھی اس لحاظ سے بڑی ترقی کی، ان میں ایک ابو المعالی محمود شکری ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، دوسرے علی علاء الدین ہیں، جنھوں نے پوری زندگی علم دین کی تدریس میں گذار دی،

تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہین، ۱۲ دین اور تیرھوین صدی کے اکابر کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہین پہنچ سکا، اس کے علاوہ نحو مین ایک کتاب لکھی ہے، جو چھپ گئی ہے، ۱۲۷۳ھ مین پیدا ہوئے، اور ۱۳۴۲ھ مین وفات پائی،

شیخ آلوسی کے دو بھائی عبدالحمید اور عبدالرحمان بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علما مین گذرے ہین، عبدالرحمن نہایت فصیح و بلیغ تھے، خطابت مین خاص طور سے مشہور تھے، اس کے علاوہ کرخت کی جامع مسجد مین زندگی بھر درس و تدریس کا کام کرتے رہے، ۱۲۸۴ھ مین وفات پائی، دوسرے بھائی عبدالحمید نابینا تھے، لیکن اپنے وقت کے بہترین ادبا و شعرا مین ان کا شمار ہوتا تھا، نہایت مقبول عوام تھے، ایک آدھ تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہین، ۱۳۲۴ھ مین وفات پائی،

نواے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نواے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ۱ؔ

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

"پروفیسر رام پرشاد کھوسلا، ام اے (پنجاب) بی اے (آکسن) پنجاب کے رہنے والے تھے، اور پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، تاریخ ہند پر اُن کی ایک کتاب Mughal Kingship and Nobility ۱۹۳۴ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اس کے خاتمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ موجودہ جمہوری، اور سکولر حکومت کے زمانہ میں مطالعہ کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں، ص، ع"

فیض رسان بادشاہت | مغلوں کی بادشاہت ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے لئے بیّن طور پر فائدہ مند تھی، ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی، لیکن انھوں نے اس ملک کے باشندوں کے قدیم حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، ان کی بادشاہت کے عیوب اپنی جگہ پر ہیں، اور کوئی مطلق العنان حکومت کلیۃً باعثِ رحمت نہیں ہو سکتی، لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی بادشاہت اپنی شان و شوکت کے ساتھ اس زمانہ کے لئے بالکل مناسب تھی، اور اپنی خوبیوں ہی کی وجہ سے یہ پرشکوہ حکومت ایک طویل مدت تک قائم رہی، اس خاندان میں مسلسل چھ ایسے بادشاہ گذرے جن کی شخصیتیں بہت ہی اعلیٰ تھیں، عام طور پر ان کی حکومت میں نرمی اور رحمدلی تھی، انھوں نے کبھی اپنی فوجی قوت کو رعایا کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہو کر استعمال نہیں کیا، وہ کبھی لوگوں کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے، ملک کے رسم و رواج کو کسی قانون کے ذریعہ پس پشت نہیں ڈالتے تھے، نظری طور پر ان کی حکومت مطلق العنان ضرور

تھی لیکن عملی طور پر بڑی ہی فیض رسان رہی،

قیام امن پورے ملک مین ایک ایسا دبدبہ قائم تھا کہ دور دراز صوبون کے حکام بھی اُن کے خلاف سر اُٹھانے کی جرأت مشکل ہی سے کرتے تھے،

مغلون کے زمانہ مین جب کہین بدامنی ہوتی، تو سختی سے دور کردی جاتی تھی، اس عہد کے حکمرانون نے امن وامان قائم کرکے ملک کو کمزور حکومت اور متزلزل نظام سلطنت کی خرابیون سے بچائے رکھا، اُن کو قوت واقتدار کی ہوس ضرور تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے بھی برابر کوشان رہتے اگرامراء کو شاہانہ سرپرستی مین ترقی ہوئی تو ادنیٰ درجہ کے لوگون کو بھی شاہانہ عنایتون کی بدولت خوشحالی نصیب ہوئی،

کاشتکارون کی حفاظت حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لئے بڑی کوشش اور نگرانی کی جاتی، آمدنی کا بڑا حصہ زمین ہی سے حاصل ہوتا تھا، اس لئے کاشتکارون کی فلاح وبہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا جب کسی علاقہ سے فوج گذرتی تو وہان کی رعایا کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہان (۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء) مین لاہور جارہا تھا، تو اس نے بخشیون کو حکم دیا کہ وہ تیرانداز کو لے کر راستہ کے ایک جانب کی حفاظت کرین اور میرآتش کو بندوقچیون کے ساتھ راستے کی دوسری سمت تعینات کیا تاکہ شاہی فوج کھیتون کی فصل کو نقصان نہ پہنچا سکے لیکن یہ بھی احتمال تھا کہ اس انتظام کے باوجود فصل کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچ جائے گا، اس لئے پہلے ہی سے داروغہ مشرف اور امین مقرر کر دیئے تھے، کہ رعایا اور ایک ہزار سے کم کے جاگیرداروں کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے، ایک بار شاہی فوج ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء مین قندھار کی طرف جارہی تھی، جس سے غزنی مین کھیتون کو بڑا نقصان پہنچا چنانچہ وہان کے کاشتکارون کو اس کے معاوضہ مین دو ہزار اشرفیان دی گیئن، ہر بادشاہ کاشتکارون کی بڑی پاسداری کرتا تھا، کیونکہ انہی پر حکومت کی اصلی آمدنی کا انحصار تھا،

فنون کی ترقی صرف زراعت ہی کو شاہانہ سرپرستی حاصل نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ میں دوسرے قسم کے آرٹ نے بھی بڑی ترقی کی، اور یہ ترقی بادشاہوں کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، یورپین سیاحوں نے اس زمانہ کے آرٹ کی بڑی تعریف کی ہے، جہانگیر کے عہد میں مصوری کو بڑا فروغ ہوا، پادری فرانیکو کا ٹرو کا بیان ہو کہ جہانگیر کے عہد میں ایسے باکمال مصور تھے کہ جو یورپ کی مصوری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کی نقل اس طرح اُتار دیتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا،

ملک میں اعلیٰ قسم کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، اس زمانہ کا مشہور کپڑا بافتہ ہالینڈ کے کپڑوں سے بہتر ہوتا تھا، اونچے طبقہ کے لوگ جو کپڑے پہنتے، ان میں طلائی اور نقرئی تار بھی استعمال کیا جاتا،

تعمیراتِ عامہ میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیجاتیں، ان تعمیرات کے نمونے آج بھی موجود ہیں، ملک کے ہر حصہ میں محلوں، مسجدوں، حماموں، مقبروں، قلعوں اور دوسری قسم کی عمارتوں کی تعمیر بکثرت ہوتی رہی، شاہراہوں کے کنارے مسافروں کی راحت وآسایش کے لئے سرائیں اور مسافرخانے بنائے گئے، مغلیہ عہد کی شاندار عمارتوں کے دیکھنے کے لئے آج تک دنیا کے مختلف حصوں سے سیاح آتے رہتے ہیں،

علوم کی سرپرستی مغل بادشاہ علوم کے بھی بڑے سرپرست تھے، اُن کی فیاضی کا شہرہ سُن سُن کر دوسرے ملکوں کے علماء وشعرا اُن کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے، ان بادشاہوں میں بعض خود بھی بلند پایہ اہلِ قلم تھے، بابر کی تزک ایک علمی شاہکار ہے، اکبر نے ملک الشعرا کا ایک نیا عہدہ قائم کیا، اور سب سے پہلے غزالی اس عہدہ پر فائز ہوا، آئینِ اکبری میں ابو الفضل کا بیان ہو کہ اکبر کے دربار میں ایران کے بہت سے ممتاز شعراء کا اجتماع ہوگیا تھا، ان میں سے بعض شعراء کے نام یہ ہیں حکیم ثنائی، نظیری نیشاپوری، ہاتفی اصفہانی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسین ہروی، حیاتی گیلانی، انیسی، خسروی، وفائی، رفیقی، عرفی شیرازی، فسونی، نادری، قدسی، حیدری، تبریزی، اشکی، فہمی، آذری، جذبی، سنجر کاشی، تشبیہی، سرمدی، قاسم ارسلان، مشہدی، باباطالب، باباغیوری وغیرہ،

جہانگیر شاعر بھی تھا، اور شعر و سخن کا نقاد بھی، اُس نے بھی ایک تزک لکھی ہے،

بادشاہون اور شاہزادون کے علاوہ امرار بھی علم و ادب کے سرپرست تھے، ابو الفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کی قدر دانی نے شعر و سخن کی ایک اکیڈیمی ہی قائم کر دی تھی، خان زمان شعرار کا بڑا مربی تھا، غزالی نے اس کی شان مین ایک ہزار اشعار کا ایک قصیدہ لکھا، خان زمان نے اس کے ہر شعر کے صلہ مین ایک اشرفی دی، کشمیر کا صوبہ دار ظفرخان مشہور شاعر صائب کا مربی تھا، بیرم خان بھی شاعر تھا، نظیری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی، اکبر کا رضاعی بھائی خان اعظم کوکلتاش اہل قلم تھا، سبزواری، بدخشی، جعفر ہروی ثنائی، اور مدامی وغیرہ شعرار اس کی فیاضیون کے رہین منت رہے، عرفی نے ایک قصیدہ کے صلہ مین ایک لاکھ روپیے انعام پائے، امرار کے یہان برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے، شہزادہ دانیال ہندی زبان کا شاعر تھا، شہزادہ مراد نظیری نیشاپوری کا سرپرست رہا، جہانگیر کے عہد مین طالب آملی ملک الشعرار تھا، شاہجہان نے ابو طالب کلیم کو یہ اعزاز بخشا، جہانگیر کے زمانہ مین قندھار کا صوبہ دار غازی وقاری شعرار اور علمار کا بڑا دلدادہ تھا، ایران سے جو شعرار ہندوستان آتے وہ پہلے اسی کے دربار مین قیام کرتے تھے،

ملک مین بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے، جب بابر کی فوجون نے لاہور کے پاس قلعہ ملوٹ مین داخل ہو کر اس کو لوٹنا شروع کیا، تو بابر نے وہان کے کتب خانہ کو بچا لیا، اس کو لاہور کے علم نواز غازی خان نے قائم کیا تھا،

ملک مین ماہرین فن اور شعرار کی کثرت اس کا ثبوت ہے کہ مغل بادشاہ ان فنون کی جانب سے کبھی غافل نہین رہے، جن کو امن و امان کے زمانہ مین فروغ پانا چاہیے تھا، اُن کو جنگ و جدل سے جب بھی فرصت مل جاتی، تو رعایا کی حالت سدھارنے کی کوشش مین لگ جاتے، اُن کی آمدنی وافر تھی، لیکن جو روپیہ بادشاہ کے ہاتھ مین آتا تھا، وہ مختلف ذرائع سے پھر رعایا کے ہاتھ مین پہنچ جاتا تھا،

عدل گستری | مغل حکمران عدل کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے، اُن کے زمانہ مین ادنیٰ آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت مین پہنچکر انصاف کا طلب گار ہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی، بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا،

مذہبی رواداری | عدل و انصاف مین اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستون مین سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلون کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ پیدا ہونے نہین پایا، اور کسی زمانہ مین بھی یہ کوشش نہین کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکومون کا بھی مذہب بنایا جائے، حتی کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہین رکھی تھی، مغلون کے عہد مین ٹیسٹ ایکٹ (Corporation Act) یا فائیو مائیلز ایکٹ (Five Miles Act) کی کوئی مثال نہین ملتی ہے، لوگون کے ضمیر کے خلاف کوئی ایکٹ آف یونیفارمیٹی (Act of Uniformity) جیسا قانون نہین بنایا گیا، ایلزبتھ کے زمانہ مین ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلون کے زمانہ مین اس قسم کا جبر نہین کیا گیا،

(St. Bartholomew Slaughter) کے جیسے قتل عام سے مغلون کی تاریخ کبھی داغدار نہین ہوئی، مذہبی جنگ کی خونریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلون کے عہد مین ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر کوئی دباؤ نہین ڈالا، بابر سے لیکر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک مغلون کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریباً پاک رہی،

مغلون مین ولندیزیون سے زیادہ رواداری تھی، یورپین مؤرخ اورم کا بیان ہے کہ ولندیزیون نے متعصبانہ مذہبی پالیسی اختیار کی تھی، اور جب مرہٹون نے عیسائی مذہب اختیار کرنے

سے انکار کیا تو بہت سے مرہٹہ خاندانوں پر بڑی سختیاں کی گئیں، ان ولندیزیوں سے سیواجی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی، وہ ولندیزیوں کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھتا تھا، اسی انتقام میں اس نے ہندوستان کے مغربی حصہ کے ولندیزیوں سے چوتھ وصول کیا،

رعایا نوازی | مغلوں کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے، اُن سے مغلوں کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے، اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ خود دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے،

بہر نگہبانی خلقِ خدا | شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پئے آسودگی جملہ تن | رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگ زیب نے شاہ جہان کو اس کی معزولی کے بعد ایک موقع پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے، جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور اُن کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

مغل اپنے ان اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، ان کا نظام سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگوں کے حق میں بہت مفید تھا، اسی کی بدولت ایک عرصہ تک ملک میں امن اور اقتصادی خوشحالی رہی،

مغلوں کا طرز حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا، لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرز حکومت موزون تھا، حکومت کے لئے عوام کی نمائندہ جماعت کی ضرورت سمجھی نہیں جاتی تھی، تمام لوگ اس طرز زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کر لیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا، لیکن عملاً وہ فیض رسان تھا، رعایا کی تمام پرانی چیزیں باقی رہنے دی گئیں، ان کے رسم و رواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو ترقی ہوتی رہی، اور مطلق العنانیت کو روکے رکھا گیا، امن و امان پر زیادہ

زور دیا گیا، مغلون کے شخصی استبداد مین مستعدی اور ہوشمندی تھی، اس لئے وہ کامیاب رہا، ازمنۂ وسطیٰ مین اصلی خطرہ انار کی یعنی طوائف الملوکی کا پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ مین تمام اقتدار کا مرکوز ہوجانا خطرہ نہین سمجھا جاتا تھا، مغلون نے ملک مین تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہین دیا، قانون کا اقتدار اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال مین برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر بادشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے لیکن لوگون نے اس زمانہ کے طرز حکومت کو آسانی سے تسلیم کرلیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طرز اُن کے سیاسی خیالات و رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ بڑے مدبر اور سیاست دان بھی تھے،

"ص،ع"

کثیر التصانیف مصنفین

قدیم مسلمان علماء مصنفین مین بہت سے ایسے اہل قلم پیدا ہوے جن کی تصانیف کی تعداد سینکڑون سے متجاوز ہے، اور ان کی تحریر کا اوسط روزانہ کئی کئی جز پڑتا ہے، ہر قوم اور ہر زمانہ مین کثیر التصانیف اہل قلم موجود رہے ہین، چنانچہ یورپ کے بہت سے ایسے مشہور ناول نگار ہین، جنھون نے بے شمار ناول لکھے، ڈوما نے بارہ سو جلدین لکھین، لوپ ڈی وی گا نے اٹھارہ سو ڈرامے لکھے، عورتون مین مرجری بوون کی تصانیف مین ایک سو ساٹھ ناول ہین، وہ کبھی مرد کبھی عورت کے نام سے اپنی کتابین شائع کرتی تھی، مسز ہمفری وارڈ اور ایولن ایورٹ گرین نناوے ناولون کی مصنفہ ہین، مسز اولی فینٹ نے ایک سو بیس ناول لکھے، ای فلپس اوپنہیم کے نام سے تقریباً دو سو ناول شائع ہوے، ایک فرانسیسی اہل قلم ایبل ہرمنٹ کے ناولون ڈرامون، افسانون اور مضامین کی تعداد سو سے زیادہ تھی، رابرٹ ہوب مون کریف نے دو سو کتابین تصنیف کین، وہ بچون کے لئے چھوٹے چھوٹے قصے بھی اسکارٹ اور ہوپ کے نام سے لکھا کرتا تھا، پادری اس بارنگ گولڈ نے

تین سو معیاری کتابیں لکھیں، ان میں بہت سی ایسی بھی ہیں جو برسوں کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں، مشہور ناول نگار جی۔ پی۔ برجیں نے نوّے کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کی، ایڈگر ویلیس زود نویسی میں ضرب المثل تھا، اور وہ خود لکھنے کے بجاے بول کر دوسروں سے قلمبند کراتا تھا، اس نے ڈیڑھ سو ناول، چودہ ڈرامے اور ہزاروں مضامین اور افسانے لکھے، اس کا خود بیان ہے کہ اُس نے ۱۹۲۷ء میں یعنی ایک سال میں چھ ڈرامے اور چھبیس ناول لکھے، ایچ جی ویلس کی تصانیف کی فہرست بڑی لمبی ہے، اس کے ناول، افسانے، اور دوسری سیاسی اور عمرانی تصانیف کی تعداد ایک سو اسی سے اوپر ہے، ارنلڈ بنیٹ نے زیادہ عمر نہیں پائی، اور اپنی مختصر زندگی میں ستر کتابیں لکھیں، سر والٹر اسکاٹ اور مسز کریک دونوں نے ساٹھ ساٹھ کتابیں تالیف کیں، والٹے نے ایک سو چالیس کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، بیل زیک نے پچاسی کتابیں تصنیف کیں، ان میں بعض بہت ضخیم تھیں، کرن راڈ ایک دن میں ۳۵۰ ، اور ڈبلیو۔ ڈبلیو جکیبس ۲۵۰ ، الفاظ لکھا کرتا تھا، بعض مشہور ناول نگار تین ہزار الفاظ تک روزانہ لکھتے ہیں، ایڈن فل پوٹس کی عمر اسّی سال سے زیادہ تجاوز کر چکی ہے، برناڈ شا کا سن بھی نوّے سال سے زیادہ ہے، اور ان دونوں کی زندگی میں مختلف قسم کے مشاغل رہے ہیں، تاہم وہ اب تک لکھتے رہتے ہیں، فل پوٹس نے بیس ناول اور بیسیوں قصے اور ڈرامے لکھے، برناڈ شا کے ڈرامے کی تعداد تو گنی جا سکتی ہے، لیکن اس کے مقالات، تنقیدی مضامین، ہجووں، بے شمار خطوط اور تقریروں وغیرہ کا شمار آسان نہیں ہے، وہ بوڑھا ہو چکا ہے، لیکن کام کرنے میں اب تک نہیں تھکتا، ٹھ و لپ سامنے گھڑی رکھ کر ہر نیدرہ منٹ کے بعد ڈھائی سو الفاظ لکھتا ہے، وہ عموماً صبح کے ناشتے سے پہلے لکھا کرتا ہے، اُس نے جو ناول لکھے ہیں، وہ بہت مفید ہیں، زین گرے نے بھی بہت سی دلچسپ اور حیرت انگیز کتابیں لکھیں، لکھتے وقت اس میں مشین کی جیسی تیزی اور باقاعدگی ہوتی ہے، اگا تھا کرسٹی نے پچاس طلسمی ناول لکھے، جو سب کے سب بہت

مشہور ہوئے، بو تھ ٹار کنگٹن ۱۸۹۹ء سے اپنی موت تک ہر سال ایک کتاب لکھ کر شائع کرتا رہا،
جی ٹی کالپی فرانس کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہے، یہ کریمیا کی جنگ سے پہلے پیدا ہوئی، اور ۱۹۲۶ء
تک برابر لکھتی رہی،

بہت سے ایسے اہل قلم گذرے ہیں جنھوں نے بہت کثرت سے لکھا لیکن بہت زیادہ مشہور
نہ ہو سکے، ایک ناول نگار نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان تیس ناول لکھے، لیکن اس نے زیادہ
شہرت نہیں پائی، ص،ع

اقبال کامل

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ وشاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن
ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کیلئے
لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانحِ حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں
کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، پہلے سوانح حیات ہیں، اس کے بعد ان کی اردو شاعری، پھر فارسی
شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام
ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی،
نظریۂ طبیعت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف یعنی عورت، فنونِ لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح
کی گئی ہے، ضخامت چارسو صفحے قیمت للعہ

"منیجر"

ادبیات

رنگِ تغزل

از

جناب عارف عباسی بلیاوی

"معارف کے ذریعہ متعدد شعراء ادبی حلقہ مین روشناس ہوئے آج ایک ایسے نوجوان و ہونہار شاعر کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے کم لوگ واقف ہونگے، نئے شعراء مین بہتون نے جگر کے رنگ مین کہنے کی کوشش کی مگر وہ نقالی سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن عارف کا تغزل جگر کے رنگ مین اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اگر تخلص موجود نہ ہو، تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ یہ جگر کی غزل نہین ہے، ابتدائی مشق مین یہ رنگِ تغزل اُن کے مستقبل کے لئے فالِ نیک ہے"۔ "م"

جس جگہ عشق کو احساسِ نظر ہوتا ہے — عالمِ حسن وہین زیر و زبر ہوتا ہے

لالہ و گل کہین خورشید و قمر ہوتا ہے — حسن ہر رنگ مین فردوسِ نظر ہوتا ہے

ایک وہ بھی طلبِ دوست کی منزل ہے جہان — وقت خود ساتھ مرے گرمِ سفر ہوتا ہے

کعبہ بھی راہ مین ہے، جلوہ گہِ ناز بھی ہے — دیکھنا ہے کہ مرا عزمِ سفر ہوتا ہے

اب مٹی جاتی ہے یہ لذتِ ناکامی بھی — کیا قیامت ہے کہ آہون مین اثر ہوتا ہے

ہر طرف چشمِ تمنا نگران ہے لیکن — تیرا جلوہ کہین پابندِ نظر ہوتا ہے

وسعتِ کون و مکان ڈوب کے رہجاتی ہے — وہ بھی عالم کبھی اے دیدۂ تر ہوتا ہے

میری اس نیند پہ بیداری کونین نثار آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہے
ہائے اس سوختہ ساماں کا مقدر عارف
ایک جلوہ میں جو برباد نظر ہوتا ہے

حشر جذبات

از جناب ثاقب صاحب کانپوری

جہانِ عشق میں یہ انقلاب کیا کم ہے قرار ہو کہ نہ ہو اضطراب کیا کم ہے
شعاعِ حسن سے رنگیں نقاب کیا کم ہے کہ تیرے لطف سے تیرا عتاب کیا کم ہے
بچھ نہ عشق میں آزار اس ودیعت کو دلِ خراب بحالِ خراب کیا کم ہے
سکونِ دل کا تو مژدہ کسی کو اور سنا ترے خیال میں یہ پیچ و تاب کیا کم ہے
ہے آشیان میں بھی بیچارگی کا اک عالم نہیں قفس تو قفس کا خواب کیا کم ہے
وہ جس نے جادۂ الفت میں جان کٹ بدی کسی کی راہ میں وہ کامیاب کیا کم ہے
یہی ہے عشق میں وجہ سرور کیف و نشاط جبیں آنکھوں میں یہ رنگ شراب کیا کم ہے
کروں میں اپنی تباہی کا اس سے کیا شکوہ ہجوم غم میں وہ چشم پُرآب کیا کم ہے
وہی ہے اب بھی ترے التفات کا عالم خرابِ عشق ترا کامیاب کیا کم ہے
نہیں ہے بحر میں نظارۂ جمال اگر کنارِ آب و شبِ ماہتاب کیا کم ہے
حیاتِ عشق تھی تابندہ جس سے اے ثاقب
یہ سوچتا ہوں کہ وہ اضطراب کیا کم ہے

مطبوعات جدیدہ

جامع المجددین از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۔ صر پتہ :۔ شبستان قدم رسول، بارڈنگ روڈ لکھنؤ ۔

اسلام چونکہ آخری اور ابدی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی اور اسلام کے بعد کوئی نیا دین آنے والا نہیں ہے، اور امت مسلمہ ساری دنیا کی قومون کے لئے شاہد اور نمونہ بنائی گئی ہے، اس لئے اللہ تعالی ہر زمانہ مین ایسے صلحاء واخیار و مصلحین و مجددین پیدا کرتا رہا، جو اسلام اور مسلمانون کی تجدید و اصلاح کا فرض انجام دیتے رہے، اس مفہوم کی حدیثین بھی ہین، اور اسلام کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے، اس دور کے مسلمانون کی پوری زندگی اسلام کی شاہراہ سے ہٹ گئی ہے، اور مذہب و معاشرت، حکومت و سیاست، علوم و فنون، عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق زندگی کا ہر شعبہ اصلاح کا محتاج ہے، اس لئے یہ زمانہ بھی مصلحین و مجددین سے خالی نہین، اور بہت سے صلحاء واخیار اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اصلاح و تجدید کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن جو جامعیت حضرت مولینا اشرف علی رحمہ اللہ کی تجدید و اصلاح مین پائی جاتی ہے، وہ کسی دوسرے مصلح مین نظر نہین آتی انھون نے خواص و عوام، علماء و جہلاء، عورت مرد، ہر طبقہ اور ہر صنف کے معاملات و مسائل اور مذہب و معاشرت و سیاست وغیرہ کے دقیق سے دقیق مسائل سے لے کر روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتون تک کی جن کی جانب نظر بھی نہین جاتی اصلاح فرمائی ہے، اور دین و دنیا کے جملہ معاملات کے متعلق صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کر کے اسلامی زندگی کا ایسا قدآدم آئینہ بنا دیا ہے جس مین ہر مسلمان اپنی صورت دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کہان تک

اسلام کے مطابق ہے، اور اس کے کون کون سے گوشے اصلاح کے محتاج ہیں، فاضل مرتب نے جو اس سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و مواعظ و ملفوظات سے سلوک و تصوف کی تجدیدات کو مرتب کر چکے ہیں، اب جامع المجددین کے نام سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی زندگی کے متعلق حضرت کی ہمہ گیر اصلاحات و تجدیدات کو مرتب فرمایا ہے، اور اپنی تعلیق و تشریح سے اس کو نہایت مؤثر و دلنشین بنا دیا ہے، جس کے ذریعہ ہر مسلمان اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرکے اپنی زندگی کو صحیح اسلامی سانچہ میں ڈھال سکتا ہے، مباحث و مسائل کے تنوع کثرت اور جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے حقیقت شناس قلم سے ایک فاضلانہ اور حکیمانہ مقدمہ ہے، اس میں ایک طرف منصب تجدید کی حقیقت و ضرورت اس کی تاریخ اور حضرت مولینا رحمہ اللہ کی تجدیدی جامعیت کی تفصیل ہے، دوسری طرف ان خطرات کو بھی دور فرمایا ہے، جو تجدید و مجددیت کے عقیدہ میں افراط و تفریط سے پیدا ہو سکتے ہیں، اور خود مولانا رحمۃ اللہ کی تحریروں سے اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ کسی مجدد کا مجدد ہونا اذعانی اور یقینی مسئلہ نہیں ہے، اور نہ اس کے دعوی پر موقوف ہے، بلکہ خواص امت کو اس کے دینی کارناموں کی بناء پر یا خود اس شخص کو اپنی کوششوں کی مقبولیت کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس کو اس صدی کا مجدد بنا کر بھیجا ہے (ص ۲۴) "یا مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جز بھی نہیں ہے، خصوصاً کسی ایک زمانہ کے کسی خاص مجدد کو مجدد تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں ہے" (ص ۲۰) بلکہ یہاں تک احتیاط فرمائی ہے، کہ "اس تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین نہیں ہے، بلکہ یہ مصنف و مرتب (جامع المجددین) کی عقیدتمندانہ تعبیر ہے، کہ وہ حضرت (مولانا اشرف علیؒ) کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں" (ص ۴۸) ان تشریحات کی اس لئے ضرورت تھی کہ مجددیت کے عقیدہ میں افراط و تفریط نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے ہیں، اسی لئے خود حضرت مولانا رحمہ اللہ نے بھی دوسری اصلاحات کی طرح اس عقیدہ کی

بھی اصلاح کی ضرورت سمجھی تھی، یہ کتاب اپنے گوناگون فوائد کے لحاظ سے مسلمانون کے مطالعہ کے لائق تو ہی ہے اسکے بہت سے مسائل سے غیر مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہین، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس خدمت دین کی جزائے خیر دے،

نور النور از مولانا غوث علی شاہ صاحب قادری چشتی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت مجلد ے/ غیر مجلد ۱۲/ پتے :- (۱) بیت النور جنگل گوڑہ (۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد دکن،

اس کتاب مین مسئلہ وحدۃ الوجود کا اثبات اور اس کی تشریح کی گئی ہے، دیباچہ نگار کا بیان ہے کہ اس مین توحید حقیقی (وحدۃ الوجود) خود شناسی و حق شناسی، کا صحیح راز کتاب و سنت کے مطابق آسان فہم ہے؟ دوران عام خیال، غلط فہم بے تحقیق اور ادھ کچے اسلامی خیالات کے مدعیون کی غلط فہمیون کو دور کیا گیا ہے، جو عنوان وحدۃ الوجود کے صحیح اعتبار کو جو مترادف توحید حقیقی ہے یعنی فہم لا الہ الا اللہ اور آیت ہو یت ہے، اپنی نافہمی سے غیر اسلامی اور ہندی وغیرہ سمجھتے ہین،" راقم نے اس کتاب کو غور و تامل سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی، لیکن یہ اسکا قصور فہم ہے، یا مصنف کا انداز بیان اتنا پیچیدہ ژولیدہ اور متصوفانہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہا، یہ انداز تحریر عوام کیا، خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے فہم سے بھی باہر ہے، جن لوگون کو اس کا ذوق ہو وہ شاید اس چیستان کو سمجھ سکین، اور اس مین ان کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو ورنہ عام مسلمانون کے لئے اس قسم کی کتابون سے کوئی فائدہ نہین، بلکہ ان سے گمراہی کا اندیشہ ہے اور جو لوگ توحید کے اس مقام پر فائز ہین، اُن کے لئے اس کے اثبات کی ضرورت نہین،

کارنامہ اسلام از جناب میان بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا اڈیٹر ہمایون تقطیع اوسط ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ے/ پتہ مکتبہ :- رسالہ ہمایون نمبر ۳۲ لارنس روڈ لاہور،

مصنف نے جن کو تاریخ اسلام سے ذوق اور اس پر ان کی نظر بھی ہے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا ہے، اور دنیا میں اسلام کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج مسلمانوں کے سیاسی علمی اور تمدنی کارنامون، اور تاریخ اسلام کی تمام قابلِ ذکر حکومتون کا اجمالی نقشہ اور ان کا عروج و زوال دکھایا ہے اور قیام پاکستان تک ہندوستان کے مسلمانون کی مختصر سرگذشت بیان کی ہے جس سے مسلمانون کا سیاسی مدوجزر سامنے آجاتا ہے، اس کو رنگین نقشہ سے بھی دکھایا گیا ہے، کتاب کے آخر مین اقبال مرحوم کے منتخب ولولہ انگیز اشعار بھی دیدیئے ہین، اس کے مطالعہ سے مسلمانون کے شاندار ماضی کے ساتھ ان کا مستقبل بھی درخشان نظر آتا ہے، البتہ وہابی سنوسی اور اتحاد اسلامی کی مذہبی اصلاحی تحریکون مین بابی تحریک کو شامل کرنا تعجب انگیز ہے، اس کو سرے سے اسلام ہی کو کوئی علاقہ نہین، تو اصلاح کا کیا ذکر ہے۔

کلمۂ طیبہ کی حقیقت از مولانا منظور صاحب نعمانی اڈیٹر الفرقان تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ ر پتہ: مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ

کلمۂ طیبہ کا حقیقی مقصد محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہین ہے، بلکہ اس مختصر کلمہ مین اسلامی عقائد و اعمال کی پوری روح پوشیدہ ہے البتہ اس کے مدارج ہین، زبان سے اقرار اس کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، اور آخری درجہ تفویض کامل یعنی تمام اعمال اور پوری زندگی کو مرضی الٰہی کے تابع کر دینا ہے، اس رسالہ مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح کی گئی ہے، اور غیر اللہ کی نفی، توحید الٰہی اور رسالت محمدی کی تصدیق کا حقیقی مفہوم و منشا، اس کے مدارج، اس کے حصول کی تدبیر، عقائد و اعمال مین اس کے آثار و نتائج محبت رسول وغیرہ کلمہ طیبہ کے تمام مضمرات، و متعلقات کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، رسالہ گو مختصر لیکن نہایت مفید، اور مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، انداز بیان مؤثر و دلکش ہے،

عربی سیکھنے کا آسان طریقہ از جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب طاہر سورتی، فاضل آ د

تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۱ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

پتہ :- انجمن ترقی عربی ہند، محمد علی روڈ بمبئی، نمبر ۳

یہ اردو میں عربی قواعد کی کتاب ہے۔ مصنف نے اس میں جدید طرز کے مطابق صرف و نحو کے اسباق مرتب کیے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو عربی زبان کا صحیح مذاق اور تعلیم کا بھی تجربہ ہے، اور انھوں نے اس نئی کتاب کی تالیف میں دونوں امور کا لحاظ رکھا ہے۔ اردو میں عربی قواعد کی جتنی کتابیں نظر سے گذریں ان سب میں یہ بہتر نظر آئی، اس کے ذریعہ جلد اور آسانی سے عربی زبان سیکھی جا سکتی ہے، خصوصاً جو تعلیم یافتہ اشخاص عربی سیکھنا چاہیں ان کے لیے زیادہ کارآمد ہے۔

نوائے حیات (طبع دوم) از جناب یحییٰ اعظمی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۴ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ، پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

ناظرین معارف جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے پوری طرح واقف ہوں گے، کئی سال ہوئے اس کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے شائع ہوا تھا، اب مزید ترمیم و اضافوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن نکلا ہے، اس مجموعہ کا بیشتر حصہ منظومات پر مشتمل ہے، کچھ غزلیں بھی ہیں، مصنف کے کلام میں بڑا اعتدال و توازن ہے، جو نئے شعراء میں کم پایا جاتا ہے، اس میں مذہبی و ملی روح بھی ہے، وطنی و قومی حرارت بھی، جذبات و تاثرات اور واقعات و مناظر کی مصوری بھی، تغزل کی رنگینی و لطافت بھی، اور مشق و مہارت کی پختگی بھی، غرض یہ مجموعہ شاعری کے تمام ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ اسم بامسمّی اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہوئی۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مکمل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ ملت، نظام سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعرو شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و آثار کو چمکایا، شاہجہان نے شعرا اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت :- ۳۷۵ صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزمِ صوفیہ

جس مین عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز مین پیش کی گئی ہین، ہندوستان کے اسلامی عہد مین جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی مین مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین انسانون کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتین قائم ہوگئین، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہان جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر مین فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والون کے ذریعہ ہندوستان مین اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمائین،

قیمت :- ؎

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیقی (احمد)) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اے

ستمبر ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت :- چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیسا
اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے ہم
بہت دنوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور
اضافہ کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ
جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے
اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی
اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۵۵ صفحے قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی،
تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- عہ

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق
متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی
تاریخ، قیمت صعہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ
تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۴۳۲ صفحے

قیمت:- عہ

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب المراسلہ والمکاتبہ

استفسار وجواب

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہوگئی جس سے یہ تو نہ بزم کمال منور رہی یعنی ۱۱ راگست کو نواب صدریار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر میں اس خاکدان سفلی کو الوداع کہا، عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والوں کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہوجاتی ہے، مولانا شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات انہی میں ہے، وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل، فضل و کمال، دین و تقویٰ، وقار و متانت، اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانوں کی قومی زندگی سے وابستہ رہے، اس لئے ان کی وفات شخصی نہیں بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرقع کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے،

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیادی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے، اور اپنے اوصاف میں دورِ زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحبِ علم، اصحابِ علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز، اور علم و فن کے شیدائی اور سرپرست تھے، اُن کی پوری زندگی علمی مشاغل میں گذری، مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرسۃ العلوم، مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین، معاون و مددگار، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری، انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دارالمصنفین کے صدر نشین تھے، عرصہ تک ریاست حیدرآباد کے شعبۂ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے، اُن کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے، کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ان کی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی،

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب و مصنف تھے

سخن فہم اور سخن گو تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم و تمدن اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف ایک مجموعۂ مضامین مقالات شیروانی اور دیوان فارسی، ان کی علمی یادگارین ہین، نادر کتابون کا بڑا شوق تھا خود اپنی تلاش و محنت اور زر کثیر صرف کرکے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، اس کو اپنی زندگی مین مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے،

ان کی ذات مین جدت و قدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے، ان کا وطن علی گڈھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکون کے حامی و مددگار رہے لیکن اس کے سحر سے مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب مین بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے، قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی، ان کی تحریرون مین جہان اس کا ذکر آجاتا، اور ان کی بہت کم تحریرین اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھین، ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار گفتار نشست برخاست ہر چیز مین تہذیب و نفاست نمایان تھی، بڑے خوش لباس اور عمامہ زیب تھے بڑھاپے کے نور نے اس مین اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کر دی تھی، زندگی کے تمام معمولات مین وضعداری کی شان تھی، پوری زندگی کسی معمول مین کوئی فرق نہین آیا، ان کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگون کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ الگ رہے لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے اور ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے ان کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے جو ان کے بعد ساختہ ارکان دار المصنفین کے حصہ مین آئے

آخر تک برابر قائم رہی، وہ دار المصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کیساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی جب آنا ہوتا تو بلا لحاظ عمر و مرتبہ ہر شخص کی قیامگاہ پر جاکر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت و حالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملیگی،

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دوست اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملےگا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اَللّٰھُمَّ صَبِّب علیہ شَآبِیبَ رِضْوَانِکَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

دار المصنفین کے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، اس لئے آیندہ کسی نمبر میں انکے تفصیلی حالات پیش کئے جائینگے

اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا تھا، کہ سیوہارہ کے کسی تاجر کتب نے سر اقبال مرحوم کی بعض کتابیں چھپوائی ہیں لیکن پھر اخبار الجمعیۃ کے بیان سے معلوم ہوا، کہ کتابیں حیدرآباد کے کسی تاجر نے چھپوائی ہیں اور سیوہارہ کے تاجر نے صرف اُن کے ٹائٹل چھپوائے ہیں، جس نے بھی کتابیں چھپوائی ہوں ہندوستان کے کسی شخص کا پاکستان کی کتابیں چھپوانا صریحہ ناز یبا اور بڑا اخلاقی جرم ہے، اگر یہ صورت قائم رہی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفوں اور علمی و تجارتی اداروں کو بڑا نقصان پہنچیگا، اور قانونی بندش کے بغیر محض اخلاقی اثر سے اس کا انسداد نہیں ہوسکتا، اور دونوں ملکوں کا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے اس لئے انکی حکومتوں کو اس کی جانب توجہ کرنا چاہئے، اور ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ایک ملک کی کتابیں بغیر اجازت کے دوسرے ملک میں نہ چھپ سکیں اور اخبارات کو ایسے جری اور بددیانت ناشروں کا پردہ فاش کرنا چاہئے کہ اس سے کچھ تو اُن کو عبرت حاصل ہو،

مقالات

الجزیہ

(۳)

از مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

یہ ثابت ہونے کے بعد کہ جزیہ موجودہ معاشی معیار سے ایک بہترین محصول ہے، آیندہ یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام کے علماے معاشیات نے اس پر کس حیثیت سے بحث کی ہے، ہم نے جہان جزیہ کے سات نظریات بیان کئے ہیں، وہین میسوطا کے حوالہ سے یہ بھی دکھایا ہے کہ جزیہ کی حیثیت محصول مکان کی ہے، یہ حیثیت کس طرح نمایان کی گئی ہے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

معاشیات کے متعدد مسائل کی طرح محصولِ مکان کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے، تاہم مختصراً بعض اہم پہلوؤن پر روشنی ڈالی جاتی ہے، محصول سے مراد مکان کی ملکیت کا خراج ہے، لیکن اسلام نے غیر مسلمون کے ساتھ جو رعایتین کی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ مکان کو غیر مسلم کی ملکیت[1] تصور کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ملکیت کا محصول طلب نہین کرتا، بلکہ سکونت کا محصول مانگتا ہے، اس طرح زمین کے متعلق مکاندار کی اصل پوزیشن کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلام وصولی محصول کے وقت اس کو کرایہ[2] دار فرض کرلیتا ہے،

---

[1] میسوط ص ۷۸ جلد ۱۰ قانتا الیسکن دار نفسہ یہ مصنف کا نظریہ ہے۔ [2] ایضاً صفحہ مجلد ۱۰، ولا یسکن جن استحقی فی دار الغیر الا بکراء یہ معاشی علماء کا خیال ہے،

الجزیہ

اور اس پر ہلکا ٹیکس لگتا ہے، پھر دوسری رعایت یہ بھی ہو کہ ۲۰۰ درہم سے کم آمدنی والے پر کرایہ کا کوئی محصول نہین اور وہ مستثنیٰ ہے،

مسلمان معاشی علما نے محصولِ مکان کے نظریہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فقیر کو مکان کے لئے ایک درہم (چار آنہ) ماہوار دینا کافی ہے، متوسط الحال کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے، اس لئے اس کا دوگنا (دو درہم یا آٹھ آنے ماہوار) ہونا چاہئے، اور جو بہت بڑا غنی ہو، اس کی بھی یہی حالت ہو، (یعنی اس کو متوسط الحال سے بھی زیادہ بڑے مکان کی ضرورت ہوتی ہو) اس لئے دو درہم کا دوگنا چار درہم یا ایک روپیہ ماہوار اس کا کرایہ ہونا چاہئے) یہ نظریہ مبسوط (ص ۸، جلد ۱۰) مین درج ہے، اور اس کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو مالی حالت کا معیار فرض کیا گیا ہے،

گذشتہ عنوان مین جن چھ قانونون کا حوالہ دیا گیا ہے، جزیہ محصول مکان ہونے کے بعد بھی ان کا پابند نظر آتا ہے، مثلاً اس کی پیدا آوری یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم سے کم مالیت والون پر عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی مقدار معقول رہتی ہے، کفایت یہ ہو کہ اس کی فراہمی مین زیادہ خرچ نہین پڑتا، نہ مقدار معین سے زیادہ دینا پڑتا ہے نہ ترقی دولت اور مرفہ الحالی مین فراحم ہے، کیونکہ اس کی شرح مناسب ہو، عدل یہ ہو کہ کرایہ مکان (دراصل خود مکان) کی حیثیت مکاندار (اب کرایہ دار) کی مالی حالت کے مطابق ہے، (بلکہ دراصل مکان کی حیثیت کرایہ سے بدرجہا زیادہ ہے) تغیر پذیری یہ ہے کہ معاشی ترقیون کے ساتھ مکانات کی قیمت اور کرایہ بڑھتا رہتا ہے، تعین خود اختیاری ہے، سہولت ظاہر ہے،

کیا جزیہ فرقہ وارانہ محصول ہے؟ | معاشیات مین یہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک مین فرقہ وارانہ محاصل قائم کئے جائین، ہمارے ملک کے سفری پردے جو بقول مسٹر ہولینڈ ہندوستان کے ذریعہ انگلستان کو تونگر بنانا چاہتے تھے

لے مالیات عامہ احمد جامعہ افلاس کے اسباب ص ۳۴، انجے سی، کمان، بی اے ایم اے، بی ایس سی، مترجمہ قاضی محمد حسین بحوالہ انڈیا ان اوٹ لک،

اسلام کو اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہین کہ اوس نے فرقہ وارانہ محصول غیر مسلمون پر قائم کیا تھا، اور اس طرح معاشی حیثیت سے ایک فاش غلطی کی تھی، نظریۂ ثنویت کے یہ مبلغین جب اس الزام کا اعادہ کرتے ہین تو ان کے چہرون پر فرحت و انبساط کی لہرین دوڑنے لگتی ہین، ہم الزامی جواب کے طور پر اگرچہ اس سلسلہ مین انگلستان کی تاریخ کے اس دور کو پیش کر سکتے ہین، جس مین ٹیوڈر خاندان حکمران تھا، لیکن ایسا کرنے سے صرف ایک عیب کی پردہ پوشی ہوگی، جس کو ممکن ہے کہ معاشیین کے لائق اور تعلیم یافتہ دماغ اپنی توہین خیال کرین، اس لئے ہم اصل حقیقت پر متوجہ ہوتے ہین،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ محصول کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان مین دو لفظ پہلے سے موجود تھے، خراج اور جزیہ، اور دونون فرقہ داری اور ذلت کے مفہوم سے خالی تھے، اسلام کے بعد زمین کے محصول کا اصلاحی نام خراج رکھا گیا، جو (Land Tax) کا مرادف ہے، انسانون کی آمدنی کے محصول (Income Tax) کے دو نام رکھے گئے،

(۱) اگر وہ عام یکسان شرح یا دوسری شرحون سے قائم کیا گیا ہو، اور اس کا طریقہ آج کل کے محصول مجموعی (Plural Taxation) کا ہو تو اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور یہ مسلمانون سے لیا جاتا ہے) اس مین بہت سی چیزون کی زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی زکوٰۃ دینے والون پر مساوی بار پڑتا ہے،)

(۲) اور اگر محصول مجموعی کے طرز پر ہونے کے باوجود مختلف طبقون کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف شرحون سے قائم کیا گیا ہو، تو اس کا نام جزیہ ہے، اور غیر مسلمون سے لیا جاتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ اور جزیہ کے نامون کا فرق، فرقہ وارانہ جذبات کی وجہ سے نہین پیدا ہوا بلکہ شرح محصول کے اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس طرح انکم ٹکس، ہاؤس ٹیکس، امپیریل ٹیکس، پرسنل اینڈ فرنیچر ٹیکس وغیرہ علحدہ علحدہ نام شرحون کے مختلف ہونے کی وجہ سے رکھ لئے گئے ہین،

کیا جزیہ بھاری محصول ہے؟ زکوٰۃ اور جزیہ کا بلاواسطہ متزاید محصول جو اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر لگایا تھا، اگرچہ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں رائج نہیں ہو سکتا تاہم یہ اسلام کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ اس نے تمام ادوار حکومت (یعنی جمہوریت و شخصیت) میں یہ محصول ہمیشہ قائم رہا، اور آج کل کے سرمایہ داروں کے علی الرغم اوس زمانہ کے دولتمندوں نے اوس کو بطیب خاطر برداشت کیا، اس محصول کا تقرر دو مختلف اصول کو پیش نظر رکھ کر ہوا ہے،

(۱) اسلامی سلطنت چونکہ مسلمانوں کی قومی سلطنت تھی اس لئے محصول متزاید [illegible] [illegible] ([illegible]) کی شکل اختیار کی گئی جس میں آمدنی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ محصول کی رقم برابر بڑھتی جاتی ہے گو شرح یکساں رہتی ہے اور اس محصول کا بار دولت مند طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے،

(۲) اسلامی سلطنت چونکہ غیر مسلموں کی قومی سلطنت نہ تھی اس لئے محصول متزاید کی دوسری شکل پسند کی گئی جس میں ہر طبقہ کی الگ الگ حسب حیثیت ایک ایک شرح ہوتی ہے تاکہ کوئی طرح پر کسی ایک طبقہ پر زیادہ بار نہ پڑے اور رقم محصول میں شرح کی وجہ سے اضافہ نہ ہو سکے،

چونکہ یہ دونوں محصول (زکوٰۃ اور جزیہ) آج کل کی اصطلاح میں انکم ٹکس (Income Tax) کہے جا سکتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ انکم ٹکس سے جزیہ کا موازنہ کیا جائے تاکہ معترضین کو یہ نظر آسکے کہ آج کل کا یہ مقبول ٹکس اسلام کے اس ناپسندیدہ محصول پر کیا فضیلت رکھتا ہے؟

انکم ٹکس کی شرح ۱۹۱۶ء تک یہ تھی،

ہزار سے لے کر دو ہزار سے کم تک	۴ پائی فی روپیہ
۲ ہزار " ۵ ہزار " "	۵ " "
۵ ہزار " ۱۰ ہزار " "	۶ " "
۱۰ ہزار " ۲۵ ہزار " "	۹ " "

۷۵ ہزار سے لے کر زیادہ	۸ر فی روپیہ

۱۹۱۱ء میں سوپر ٹیکس (Super tax) حسب ذیل ہوگا،

۲۵ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک	۱ ر فی روپیہ
۵۰ " ایک لاکھ	۲ ر "
ایک لاکھ " ڈیڑھ لاکھ	۲ر "
ڈیڑھ لاکھ " دو لاکھ	۳ ر "
دو لاکھ سے لیکر ڈھائی لاکھ تک	۳ر "
ڈھائی لاکھ " اوپر	۴ ر "

یہ بھی واضح رہے کہ اس میں عورتیں، بچے، پاگل، بوڑھے، اپاہج، اور ہر صاحب آمدنی جو ایک ہزار سے اوپر کماتا ہو، سب شامل ہیں، ٹیکس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے، البتہ جو ایک ہزار روپیہ سے کم آمدنی رکھتے ہیں، وہ مستثنیٰ ہیں، خواہ تندرست ہوں یا بیمار، عورتیں ہوں یا مرد، بوڑھے ہوں یا بچے،

جزیہ کی شرح یہ تھی، اور ہمیشہ یہی رہی،

فاضل رقم صہ تک	سے رسالانہ
صہ سے لے کر ڈھائی ہزار تک	سے رسالانہ
ڈھائی ہزار سے " اوپر	عہ ر "

یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ عورتیں، بچے، اور مخبوط الحواس جزیہ سے بالکل مستثنیٰ تھے، ان کے علاوہ اور لوگ جن کا کاروبار چلتا ہو خواہ اس کو وہ خود چلاتے ہوں، یا کارندوں کے ذریعہ سے انجام پاتا ہو،

لہ معارف: انکم ٹیکس کی موجودہ شرح اس سے کہیں زیادہ ہے جو شاید مضمون نگار کو معلوم نہ ہوسکی، اس حساب سے انکم ٹیکس کا بار حاشیہ کی شرح سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے،

جزیہ ادا کرتے تھے،

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے، تو دو پائی فی روپیہ کے حساب سے اس کو سال میں عمہ انکم ٹکس ادا کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے جزیہ کی رقم صرف سے رسالانہ ہوگی، اسی طرح اگر ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپیے ہیں تو ان کا انکم ٹکس ۴ر فی روپیہ کے حساب سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور جزیہ صرف عہ ر،

ناظرین انصاف فرمائیں کہ سوا لاکھ کی رقم گران ہے یا بارہ روپیے! اور انکم ٹکس رعایا کے لئے سہل و مفید ہے یا جزیہ ؟

<u>جزیہ کا اثر معاشیات اسلام پر</u> شاید اس موازنہ سے یہ خیال پیدا ہو کہ جزیہ کا بار امرار پر بہت کم پڑتا تھا لیکن متوسطین اور غربا اس کے بار کے نیچے دبے ہوئے تھے، اس لئے سلطنتِ اسلامیہ کی معاشی حالت کا سرسری طور پر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اسلامی سلطنت کے زیر سایہ معاشی حیثیت سے کس حالت میں زندگی بسر کرتے تھے،

مسٹر ہوبسن (J. A. Hobson) نے کام اور دولت (Work and Wealth) میں اندازۂ تونگری کے لئے پیمانۂ زر کے بجائے انسانی خوشی کے ایک درجہ کو پیمانہ بنانا پسند کیا ہے[۱] لیکن اسلام نے ایک درجہ کے بجائے انتہائی درجہ کو پیمانہ بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا، چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پایۂ تخت کے ایک دور افتادہ صوبہ (عراق) کی سب سے کمزور آبادی (بیوہ عورتوں) کی بہترین معاشی حالت کو وفات سے ۴ روز قبل ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا،[۲]

"اگر خدا نے مجھکو زندہ رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسی حالت میں چھوڑ جاؤں گا،

---

[۱] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص، از جے سی کمان ریا مترجمہ قاضی محمد حسین [۲] بخاری کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ،

کہ میرے بعد اُن کو کسی شخص کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"،

اور اپنے خلیفہ کو عین اُس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے، غیر مسلمون کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی، [1]

اور مین اس کو اُن لوگون کے حق مین وصیت کرتا ہون، جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے کہ اُن سے جو معاہدہ ہے وہ پورا کیا جائے، اور اُن کی حمایت مین لڑا جائے، اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے"،

ان احکام اور اعلانات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے زمانہ مین ہمیشہ غیر مسلم رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا، جزیہ کی شرح جس قدر کم تشخیص کی گئی تھی، اس کا بیان ابھی ہو چکا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جزیہ کی یہ شرح مجموعی آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرکے تخمینی دولت و ثروت کے لحاظ سے سہولۃً مقرر ہوئی تھی ورنہ اندرونی طور پر بعض صوبون مین گذشتہ معیارِ دولت کے علاوہ بعض اور معیار بھی پائے جاتے تھے، اور انھی کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اسی بنا پر شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) مین لکھا ہے، کہ

"یہ ممکن نہین ہے کہ مال کا کوئی (صحیح) اندازہ کیا جا سکے، کیونکہ وہ شہرون کے (حالات کے) مطابق مختلف ہوتا ہے"؛

اس کا یہ مطلب ہو کہ غربا، متوسطین اور امرا کی دولت کا جو معیار ۲۰۰، ۱۰ ہزار، اور زیادہ کی شکل مین قائم کیا گیا ہے، وہ دراصل غربت و تمول کا کوئی صحیح معیار نہین ہے، کیونکہ بعض صوبے زیادہ متمول ہین، بعض اُن سے کم، اور بعض ان سے بھی کم، اس لئے ہر جگہ کا معیار بالکل مختلف ہوگا، اسی نکتہ کا خیال کرکے امام ابو جعفر (طحاوی) کہتے ہین، [2]

ہر شہر کا عرف معتبر ہے، جس شخص کو لوگ اپنے شہر مین فقیر یا متوسط، یا غنی شمار کرین، وہ ویسا ہی سمجھا جائے گا، اور یہی کم مذہب ہے"۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما جاء فی قبر النبی ﷺ [2] فتاوائے عالمگیری ص ۲۴۴، ج ۲

اس نقطۂ نظر کے مطابق تشخیص جزیہ مین جو تغیر پیدا ہوا، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا،

پہلی صدی ہجری مین شام کا صوبہ ذرائع آمدنی زیادہ رکھتا تھا، اس لئے زیادہ خوشحال تھا، یمن کا صوبہ معاشی حیثیت سے اس کی برابری نہین کرسکتا تھا، اس لئے دونون صوبون کے جزیہ کی شرح مختلف رکھی گئی، شام مین فی کس ۴ دینار سالانہ، اور یمن مین ایک دینار سالانہ وصول کیا جاتا تھا، اس کا سبب جب مشہور تابعی مجاہد سے دریافت کیا گیا، تو بولے کہ

"دولت مندی کی بنا پر ایسا کیا گیا"[1]

پانچوین صدی کے آخر مین اسلامی سلطنت کے دو اور صوبون عراق، اور ترکستان کی معاشی حالت کے متعلق ایک تصریح ملتی ہے، شمس الائمہ سرخسی، مبسوط (ص ۸۰، ج ۱۰) مین لکھتے ہین کہ

"عراق مین پچاس ہزار کا مالک متوسط الحال سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے ملک مین دس ہزار درہم کا مالک غنی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ امام کی رائے پر چھوڑنا چاہئے"

اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ صوبون کے معیار دولت کا صحیح اندازہ امام کرسکتا ہے اور وہی شرح جزیہ کو مالی حالت پر منطبق کرنے کا بھی مجاز ہے، مثلاً جس صوبہ مین ۲۰۰ درہم سے لے کر ۱۰ ہزار تک کا مالک متوسط سمجھا جاتا ہے، وہاں وہ اس رقم پر چھ روپیے سالانہ جزیہ دیگا، لیکن عراق مین چونکہ پچاس ہزار کا مالک بھی متوسط ہے، اس لئے وہاں پچاس ہزار پر چھ روپیے لئے جائین گے، اور اس کے اوپر بارہ درہم جو امراء کی شرح جزیہ ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر کسی صوبہ کی استعداد پیداوار بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر جزیہ کا بار ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور یہ اسلامی حکومت کی منفعت بخش پالیسی کا ایک بین ثبوت ہے، (موجودہ انکم ٹکس مین جس قدر استعداد پیداوار بڑھتی ہے ٹکس کا بار بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے، جو اخیر مین ناقابل برداشت ہوجاتا ہے،)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الجزیہ والموادعۃ،

سرجادو ناتھ سرکار کا مغالطہ | پروفیسر جدو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ دانی کے زعم میں جزیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں پے درپے بہت سی غلطیاں کی ہیں، جن کا دور کرنا ضروری ہے، سب سے پہلی غلطی بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انھوں نے جزیہ کا نام (Poll Tax) رکھا ہے، جو نہ صرف غیر مسلموں بلکہ خود انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے، پروفیسر صاحب نے اگر یہ لفظ خود ایجاد کیا، یا اس کے استعمال میں علماے یورپ کی تقلید پسند کی، تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے لیکن اگر اس کا جواز کسی اسلامی سند کی بنیاد پر ہے، تو واضح ہونا چاہئے کہ طبری وغیرہ نے جو "جزیۃ الجماجم" یا "جزیۃ الرؤس" کا لفظ لکھا ہے، وہ ظلم نہیں ہے، یعنی اس ٹکس کا یہ نام نہیں ہے بلکہ اس ٹکس سے پہلے چونکہ زمین کی پیداوار اور محصول کا ذکر آگیا ہے، اور اخیر میں اس کا نام آیا ہے، اس لئے دوسری پیداوار مثلاً گیہوں، جو، ترکاریوں وغیرہ کی طرح انسانوں کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ ذکر کے بغیر یہ کیونکر معلوم ہوسکتا تھا، کہ کس چیز کا محصول ہے؟ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ طبری نے یہ الفاظ نوشیروانی محصول کے تذکرہ میں لکھے ہیں، اس لئے اسلامی عہد کے جزیہ کی نسبت اُن کا اطلاق ثبوت طلب ہے،

دوسرا مغالطہ | دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھوں نے جزیہ کی رقم کا نہایت غلط اندازہ لگایا ہے، اور جزیہ کی مقدار کی زیادتی کو "مثال کے طور پر گجرات کے صوبہ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہاں سالانہ پانچ لاکھ روپیہ کی آمدنی تھی[1]، اور اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ انڈیا آف اورنگ زیب کے بیان کے مطابق (جس کا حوالہ حاشیہ ص ۴، ۲ تاریخ اورنگزیب میں ہے،) تقریباً ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) میں گجرات کی تحصیل محض یا محاصلِ خام (Gross Revenue) ۱۴۵ لاکھ روپیہ (ایک کرور پینتالیس لاکھ روپیہ) سالانہ تھی، جس میں اور جزیہ کی آمدنی میں ۳½ فیصدی کا تناسب ہے، جو اُن کے نزدیک بہت زیادہ ہے اس کے متعلق چند باتیں عرض کرتا ہوں،

[1] تاریخ اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۷۴

(۱) گجرات کے جزیہ اور اس کے تناسب پر تمام ہندوستان کے جزیہ اور اس کے تناسب کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ گجرات میں اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی، تاہم پنجاب، کشمیر، اور سندھ وغیرہ میں مسلمان زیادہ آباد تھے، اس لئے ان صوبوں میں جزیہ کی آمدنی کم اور نہایت کم ہوگی، اور تناسب بھی ۳½ فیصدی سے بہت کم ہوگا،

(۲) گجرات کے جزیہ کا تناسب دکھاتے وقت گجرات کی زکوٰۃ کا تناسب" بھی دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ بقول پروفیسر صاحب (ص ۲۰۲ ج ۳) گجرات میں بہت زیادہ مسلمان آباد تھے،

(۳) زکوٰۃ کی شرح ۲½ فی صدی ہے، اور دو مختلف قسم کے چیزوں سے وصول کی جاتی ہے، اسلئے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں اس کی تعداد گجرات کے جزیہ کی رقم کے قریب قریب ہوسکتی ہے، اور تناسب بھی شاید وہی ہوسکتا ہے، اس بنا پر اورنگزیب پر مسلمانوں کی پاسداری اور ہندوؤں کی طرف سے ذاتی نفاق کا الزام غلط ہے،

(۴) گجرات کے جزیہ اور حاصلِ خام کا تناسب صرف ⅔ فیصدی ہے، جو بہت کم ہے لیکن پروفیسر صاحب اس پر بھی متحیر ہیں، حالانکہ اگر اُن کو محصولوں کی اس تعداد اور تناسب کا علم ہوتا، جو آج کل حکومت برطانیہ کے اندر رائج ہیں، تو اُن کی حیرت سکون و خاموشی سے بدل جاتی، مثلاً مطالبات وطن (Home Charges) کی رقم کو لے لیجئے، جو ہر سال انگلستان چلی جاتی ہے، وہ پرمتھ ناتھ بنرجی کی تصریح کے مطابق مجموعی مداخل (یعنی دو ارب ایک کرور روپیہ) میں چالیس فی صدی سے زیادہ ہے[1]، افیون، نمک، اسٹامپ، چنگی و آبکاری، ابواب، کروڑگیری، انکم ٹکس، رجسٹری، جنگلات، ریلوے وغیرہ سے پچاس کرور روپیہ سے زیادہ وصول ہوتا ہے، جو مجموعی مداخل (دو ارب ایک کرور) کا کم از کم پچیس فی صدی ہے، (یہ واضح رہے، کہ اورنگزیب کے زمانہ میں آج کل

---

[1] معاشیات ہند ص ۲۹۵، مترجمہ مولوی محمد الیاس برنی،

کی طرح کثرت سے محصول نہ تھے، بلکہ اکثر محصول معاف کر دیئے گئے تھے،) جزیہ کو اگر فوجی محصول مانا جائے، (جیسا کہ بعض علمار کا خیال ہے) تو اس ۳ ½ فی صدی محصول کا موازنہ اس ۳۲ کرور روپے سالانہ سے کرنا چاہئے، جو ہندوستان کے فوجی انتظام پر حکومتِ برطانیہ صرف کرتی ہے، اور جو محاصل خالص (Net Revenue) کا ۴۲ فی صدی ہے،[1]

غالباً محصولوں کی یہ تعداد اور تناسب حیرت دور کرنے کے لئے کافی ہوگا،

تیسرا مغالطہ | تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھوں نے اشخاص کی آمدنی سے جزیہ کی شرح کا تناسب معلوم کرکے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ غربا پر اس کا بہت زیادہ بار پڑتا تھا، اس کے لئے انھوں نے غریب کی شرح چھ روپیہ فی صدی، متوسط کی چھ فی صدی سے ۲ فی صدی تک (یعنی ۲۰۰ درہم سے ۱۰ ہزار درہم تک حسب مدارج) اور امیر کی ۲ ½ فی ہزار شرح بتلائی ہے (ص۲ جلد ۳) اگرچہ آج بھی امراء کے بہ نسبت غربا پر محصول کا بار جس قدر زیادہ پڑتا ہے، اس کی شہادت میں فرد ورلیڈز مسٹر میکڈانلڈ، سابق صدر اعظم حکومتِ برطانیہ کے اقوال گورنمنٹ آف انڈیا میں درج ہیں، اور سر اسے کولن، اور سر ولیم ہنٹر وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، تاہم موجودہ انکم ٹکس کی شرح سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ اس کی شرح ایک ہزار روپیہ سے لے کر ۲ ہزار سے کم تک ۱ع ۴ پائی فی صدی پچیس ہزار سے زیادہ کی ۳ع فی صدی، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی ۴ع فی صدی اور ڈھائی لاکھ سے اوپر کی ۵ع فی صدی ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جزیہ کی سب سے کم شرح (بقول پروفیسر صاحب) ۲ ½ فی ہزار ہے لیکن انکم ٹکس کی سب سے کم شرح ۱۲ع ۴ پائی فی ہزار ہے، اسی طرح جزیہ کی سب سے زیادہ شرح ۳۳ ⅓ فی ہزار ہے لیکن انکم ٹکس کی آخری شرح ۵۱ عہ فی ہزار ہے، ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جزیہ میں اگر ایک طبقہ کسی قدر زیادہ بار برداشت کرتا تھا، تو انکم ٹکس میں ہر طبقہ

---

[1] محاصل خالص ۷۵ کرور اور محاصل عام ایک ارب ۲۰ کرور ہیں، دیکھو معاشیات ہند صفحات ۲۴۴، ۲۴۰، ترجمہ برنی، یہ مضمون گذشتہ سال [illegible] کا لکھا ہوا ہے،

محصول کے بار گران سے دبا ہوا ہے، اور جزیہ میں غربا، اگر محصول سے کچھ پریشان ہو سکتے تھے، تو انکم ٹکس سے امراء اس سے کہیں زیادہ پریشان ہو سکتے ہیں، شاید پروفیسر صاحب بارکے اس "تناسب" کو حساب لگاتے وقت بھول گئے تھے،

اگر تمام طبقوں کو یکجا کر کے اس بار کا اوسط نکالا جائے، تو جزیہ کا اوسط صرف ۴ر فی صدی ہوتا ہے (کیونکہ متوسطین کا سب سے کم اوسط یہی ہے) لیکن آج کل محصول کا بار اوسطاً آمدنی کے نو فیصدی (یعنی ۱۵ر فیصدی) رہتا ہے[1]، ناظرین ۴ر فی صدی اور ۱۵ر فی صدی کے تناسب پر غور فرمائیں، !

سرجادو ناتھ نے غربار کے متعلق جو متن لکھا تھا، ہمارے "ارسطو" نے اس پر ایک پرلطف شرح تصنیف فرمائی ہے، ارسطو کہتے ہیں "تقریباً ۲۰ سال میں ساری جائداد ہی غائب غلّہ ہو جائے گی" (آریہ گزٹ) اُن کی خدمت میں یہ عرض ہو کہ

(۱) معاشیات کے رو سے جزیہ پر جہاں نظر ڈالی گئی ہے، وہاں یہ لکھا ہے کہ چونکہ جزیہ بلا واسطہ متزاید ٹکس ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ شرح کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آمدنی کا بھی اضافہ ہو، مثلاً اگر ایک شخص کے پاس پہلے سال ۲۰۰ درہم موجود ہیں، تو وہ غربار کا جزیہ (۱۲ درہم) ادا کرے گا لیکن اگر اس کے پاس آیندہ سال صرف ۵۰ درہم رہ گئے ہیں، تو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا، اسی طرح اگر ایک متوسط نے پہلے سال ۲۴ درہم جزیہ ادا کیا، اور آیندہ سال اس کا سرمایہ فقرار کے برابر ہو گیا تو اس سے متوسط کا جزیہ وصول نہ کیا جائے گا، بلکہ فقرار کا محصول لیا جائے گا، اس کی تصریحات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، اس بنا پر جزیہ کی وجہ سے جائداد کے تلف ہونے کا خطرہ نہیں،

(۲) جزیہ میں غریب پر پہلے سال جو بار پڑتا ہے وہ آمدنی کا سولہواں حصہ ہے یعنی پچاس پر سے لیکن انکم ٹکس میں پہلے ہی سال امیر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ (شرح اعلیٰ میں) نکل جاتا ہے یعنی ۵ لاکھ پر سوا لاکھ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غریب پر جزیہ سے تباہی (اگر آمدنی میں اضافہ نہو) بہ تدریج اور دیر میں آتی ہے اور انکم ٹکس پہلے ہی سال امیر کی کمر توڑ دیتا ہے،

---

[1] معاشیات ہند پرتھو ناتھ بنرجی ص ۹۰۲، مترجمہ مولوی الیاس برنی ۱۲

(۳) جزیہ سے غریب طبقہ دیر مین متاثر ہوتا ہے، اور متوسطین و امرار پر کچھ اثر نہین پڑتا، لیکن انکم ٹکس مین سب سے زیادہ امرار تباہ ہوتے ہین، اور متوسطین و فقرار بھی بربادی سے محفوظ نہین رہتے،

(۴) بیس سال مین اگر جزیہ پچاس کی جائداد یا آمدنی کو برباد کرسکتا ہے، تو اسی قدر عرصہ مین انکم ٹکس ۵ لاکھ کی رقم اور جائداد پر پانی پھیر سکتا ہے،

چوتھا مغالطہ | چوتھا مغالطہ، تیسرے مغالطہ کی دوسری شکل ہے یعنی اونھون نے جزیہ کی شرح اور غلہ کے نرخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب طبقہ مظلومی کی انتہائی حد تک پہنچا ہوا تھا، کیونکہ ایک غریب کی شرح ٹکس اس کے سال بھر کے مصارفِ طعام کے برابر تھی، (تاریخ اورنگزیب جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

اس "تاریخی دیانت" کی "تحلیل" کے لئے حسبِ ذیل امور ذہن نشین ہونے چاہئین،

(الف) جیسا کہ مسٹر ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ نے "ہندوستان وفاتِ اکبر کے وقت"[1] مین لکھا ہے، آج کل ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہین ہے،

(ب) بقول مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی اس زمانہ مین جماعتِ کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط اور فی اٹھارہ شلنگ یعنی للعہ فی کس ہے، (معاشیاتِ ہند مترجمہ برنی ص ۴)

(ج) مورلینڈ کی تصریح کے مطابق اگرچہ عہد مغلیہ و برطانیہ مین آمدنی کے اوسط کے لحاظ سے کوئی فرق نہین ہے، تاہم اجناس کے نرخ مین سات گنے کا فرق پیدا ہوگیا ہے، (اکبر تا اورنگ زیب[2])

(د) ۱۶۲۳ء (مطابق ۱۰۳۳ھ) کے نرخ سے ایک من گیہون کی قیمت ایک روپیہ تھی (معاشی

---

[1] مترجمہ مولوی حبیب الرحمٰن خان ایم، اے، ال ال بی ہاشم "ہند کی معاشی حالت شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت" ص ۲۹۰ [2] مترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، ہاشم معاشی حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب ص ۲۲۵ ص ۲۲۶،

حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب، مترجمہ ہاشمی ص ۲۴۶ لیکن ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) کے نرخ سے اس کی قیمت چار روپیہ ہے، (سات گنے کا فرق اس لئے نہین ہے کہ ہم نے مغلیہ کے گران نرخ اور برطانیہ کے ارزان نرخ کو لیا ہے،)

(ھ) محصول زمین بزمانۂ اکبر کے لحاظ سے ۱۰ بسوہ کی مالگذاری ۸/ تھی، (۱۰ بسوہ مین ۴ من ۲۰ ار غلہ بآسانی پیدا ہو سکتا ہے، مالگذاری ثلث پیداوار ہوتی تھی، دیکھو آئین اکبری ص ۲۰۷ ج ۱) اور آج کل کے مطابق ۲/ ہے، (بحساب للعہ رفی بگھہ)

(و) اگرچہ اورنگ زیب کے زمانہ مین محصول کا بار فی کس وہ نہ تھا، جو آج کل ہے، کیونکہ اس نے بہت سے محصول معاف کر دیے تھے تاہم اس زمانہ کے سرکاری حساب کے مطابق ہم دونون زمانون (مغلیہ و برطانیہ) مین محصول کا بار فی کس ۱۱/۴ پائی فرض کئے لیتے ہین.

اب یہان سے ۳ طریقہ پر حساب شروع ہوتا ہے،

(۱) اگر غلہ کے مصارف فی کس ۴ من ۲۰ ار سالانہ (بحساب ۱۰ روپیہ) رکھے جائین، تو ۱۴ روپیہ سالانہ آمدنی والا شخص عہد مغلیہ مین للعہ کا غلہ ۸/ مالگذاری اور ۱۱/۴ پائی محصول ادا کرکے ۵/ پائی کپڑے وغیرہ کے لئے بچا سکتا تھا، لیکن عہد برطانیہ مین وہ ۱۰ کا غلہ ۲/ مالگذاری اور ۱۱/۴ پائی محصول دیکر ۱۱/۴ پائی کا قرضدار ہو جائے گا،

(۲) اگر غلہ کا حساب فی کس ۹ من رکھا جائے، جو سرکار نے (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۰۰) رکھا ہے، تو عہد مغلیہ مین للعہ کا غلہ ۲/ مالگذاری (ایک بگھ کی) اور ۱۱/۴ پائی محصول پر خرچ کرنے کے بعد وہ صرف پانچ آنے دس پائی کا قرضدار ہوتا ہے جس کو وہ معمولی سی محنت سے ادا کر سکتا ہے لیکن عہد برطانیہ مین ۲۰ کا غلہ للعہ مالگذاری (ایک بگھ کی) اور ۱۱/۴ پائی محصول پر صرف کرکے وہ ۱۱/۴ پائی کا قرضدار ہو جائے گا، جو سال بھر کی آمدنی کا پورا دوگنا ہے، اور جس کو وہ سال بھر محنت کرکے بھی ادا

نہین کرسکتا،[۱]

(۳) اگر جزیہ اور انکم ٹکس وغیرہ کا اوسط نہ نکالا جائے، بلکہ ان کی پوری شرح کے مطابق پوری رقم فرض کر لی جائے، تو عہدِ مغلیہ مین للعہ کا غلہ عہ مالگذاری، اور سے ر جزیہ ادا کرکے ۲ صہ ۹ پائی پس انداز ہونگے، اور سر جادوناتھ کے حساب سے اس رقم کو دوگن کرکے بھی وہ صرف دس آنے ۲ پائی کا قرضدار ہوگا، لیکن عہدِ برطانیہ مین عہ کا غلہ، عار مالگذاری اور عہ ۴ پائی انکم ٹکس ادا کرکے وہ عہ ۴ پائی کا قرضدار ہوجائے گا (واضح ہو کہ محصول مین صرف انکم ٹکس کی رقم رکھی گئی ہے، اور بہت سے محصول جو اس زمانہ مین ادا کرنا پڑتے ہین، ان کا حساب نہین لگایا گیا ہے) اور جادوناتھ صاحب کے حساب سے اس پر للعہ سالانہ کا ایسا وزنی بوجھ پڑے گا، جس سے چند ہی سال مین اس کی ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد بالکل ہی غائب ہوجائے گی، اس سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، جزیہ والا صہ ر کی جائداد یا آمدنی مین جس قدر مطمئن تھا، انکم ٹکس والا الف ہزار کی آمدنی یا جائداد مین بھی اتنا مطمئن نہین ہے، (جزیہ اور انکم ٹکس بالترتیب صہ ر اور ہزار سے کم پر نہین ہین)

پہلے اور تیسرے حسابون کے لحاظ سے عہدِ مغلیہ مین نصف آمدنی سے کچھ کم رقم پس انداز رہتی ہے، ہر دوسرے حساب کے رو سے پانچ آنے دس پائی کا قرض رہتا ہے جو ۳ وین حصہ سے کسی قدر زائد ہے بخلاف اس کے عہدِ برطانیہ مین پہلے اور تیسرے حساب کے مطابق سال کی پوری آمدنی صرف غلہ کے لئے بھی کافی نہین ہوتی، بلکہ للعہ رکی مزید ضرورت ہوتی ہے، اور مالگذاری و محصول وغیرہ کے لئے علٰحدہ قرض لینا پڑتا ہے، جو دوسری صورتِ حساب مین سالانہ آمدنی کا پورا دوگنا، اور تیسری صورتِ حساب

---

[۱] معارف :- یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، جب یہ ہوش ربا گرانی نہ تھی، ورنہ اگر آج کل کے نرخ سے حساب لگایا جائے، تو ۹ من غلہ کی قیمت دو سو روپیے کے قریب ہوئی، اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے،

کی ایک شکل مین تین گنے سے کچھ اوپر ہو جاتا ہے[1]

ان حسابات سے ظاہر ہو گا کہ سرکار نے جو یہ لکھا ہے کہ جزیہ مین غریب طبقہ کے سال بھر کے مصارف طعام غائب ہو جاتے تھے، وہ کسی حسابی اصول پر مبنی نہین ہے، بلکہ ایک ساحرانہ خطابت ہے، جو صرف عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کام مین لائی گئی ہے، !

پانچوان مغالطہ | پانچوان مغالطہ جزیہ کی "تحصیل" کے متعلق ہے، جس کو انھون نے سخت تحصیل سے تعبیر کیا ہے، اور اس سلسلہ مین چند واقعات لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جزیہ کی وصولی مین اورنگ زیب کے حکم سے اتنا تشدد ہوتا تھا کہ غیر مسلم رعایا شورش، مظاہرہ، بلکہ بعض اوقات بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی،

اس مغالطہ مین پہلی قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ باقاعدہ تحصیل کو "سخت" تحصیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور امیر عبدالکریم محصلِ جزیہ برہان پور کو سخت وصول کنندہ (a strict collector) کے لقب سے یاد فرماتے ہین، حالانکہ جس کتاب سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے، اس مین میر عبدالکریم کے متعلق یہ الفاظ آئے ہین،

"میر عبدالکریم را کہ ضابطہ واستاد زادہ بادشاہی شد وبحلیۂ فضیلت ودیانت آراستہ بود"

(خافی خان ص ۲۰۰ ج ۲)

کیا ضابطہ ہشیار اور باقاعدہ شخص کو سخت (strict) کہتے ہین؟

دوسری چیز یہ ہے کہ پروفیسر جادو ناتھ نے جزیہ کی سخت تحصیل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا ذکر غائب کر دیا ہے، جو تاریخی دیانت کے خلاف ہے، (تفصیل آگے آتی ہے)

تیسری قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے ان واقعات کو بالکل فراموش کر دیا ہے جو

---

[1] اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے

انہی کے ماخذون مین جزیہ کی "نرم تحصیل" کے متعلق مذکور ہین، مثلاً مرأۃ احمدی (ص ۳۲۱ ج ۱) مین "اورنگزیب" کا دیوانِ صوبہ کے نام یہ حکم مذکور ہے،

"ونیز حکم والا بنام دیوان صوبہ مددو یافت کہ کسانیکہ بعد وضع جزیہ پیش ازادائے آن یکسال برآنہا گذشتہ و سالِ دوم درآمدہ باشد اگر بے تسا بلِ متصدیان سالِ اول نداده باشد "موافق قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ اصل را اعتبار نمودہ جزیۂ سال اول از آنہا نگیرند، و جزیۂ سال دوم بگیرند، و اگر از راہ تمرد جزیۂ سالِ اول ادا نکردہ باشد، موافق صاحبینؒ ہر دو سال از آنہا ستانند"

اس سے زیادہ رعایت کیا ہوسکتی ہے کہ تحصیلدارون کے مطالبہ کے باوجود اگر غیر مسلمون نے جزیہ نہین دیا ہے، تو وہ معاف کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ نہ دینا "سرکشی" کے باعث نہ تھا! (یہ گرہ آگے کھولی جائے گی)

خود پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ (ص ۲۷۳) مین ایشور داس ناگر کی کتاب فتوحاتِ عالمگیری (باب ۳) سے نقل کیا ہے کہ

"شہنشاہ (اورنگ زیب) نے حیدرآباد فتح کرنے کے بعد وہان ایک سال کے لئے جزیہ، سائر اور تمام محاصل معاف کر دیئے، کیونکہ گورنر نے یہ اطلاع دی تھی کہ رعایا غربت کی وجہ سے محصول ادا کرنے کے قابل نہین ہے، اور اگر محصول لیا گیا تو ملک برباد ہو جائے گا"

ایشور داس ناگر گجرات کے "شیخ الاسلام" کے دفتر مین ملازم تھا، اور پٹن مین رہتا تھا، اس کی کتاب کو سرکار نے اپنی تاریخ (جلد اول) کے دیباچہ مین مستند قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود انھون نے متن مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ حمید الدین خان نیمچہ کی احکام کے حوالہ سے (جس کا سرکار نے انگریزی مین ترجمہ کیا ہے) اس کے متضاد یہ واقعہ لکھا ہے کہ

"چونکہ جزیہ کی تحصیل کا کام سختی سے ہوتا تھا، اس لئے ہندو تاجر دکن کو چھوڑ کر چلے گئے، اور غلہ کی کمی فوجِ شاہی میں محسوس ہوئی، اس وقت اورنگزیب نے امراء کی رائے کے مطابق دکن کا جزیہ معاف کیا"

حیرت ہو کہ اس روایت کے استناد اور پہلی روایت کے عدم استناد کی نسبت کوئی رائے نہ رکھنے کے باوجود سرکار نے خواہ مخواہ اس روایت پر کیونکر اعتماد کر لیا ؟ کیا ایک مورخ کی حیثیت سے تحقیق کی کی ذمہ داری اُن کے سر نہ تھی !

ان گرفتوں کے بعد اب اصل مغالطہ کی جانب توجہ کیجاتی ہو، لیکن اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر سرکار کی حسب ذیل عبارت پیش نظر رہنی چاہئے،

"قدیم مسلم فرمانروایان ہند کے زمانہ میں جزیہ برہمنوں کو مستثنیٰ کرکے تمام ہندوؤں پر مقرر ہوا تھا، جو اس مبصرانہ اور مسالمانہ نظام میں معاف رکھے گئے تھے، جس کو سندھ میں محمد بن قاسم نے پیدا کیا تھا، فیروزشاہ نے اپنی پیرانہ سالی میں اس امتیاز کو مسترد کر دیا، اور برہمنوں پر دوسرے کفار کی طرح محصول لگایا، اکبر کی دانشمندانہ سیاست دانی نے اس محصول کو منسوخ کر دیا اور ذلت کی ایک ہیجان انگیز علامت کو رعایا کی اکثریت سے ہٹا دیا، ایک صدی کے بعد اورنگزیب نے اس سیاست کو پلٹ دیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۰، ۱۲۹)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ آغاز حکومتِ اسلامیہ سے لے کر عہد اورنگزیب تک برابر ہندوستان میں جاری رہا، صرف اکبر کی حکمتِ عملی کے سبب سے سو برس تک اس کا نفاذ نہیں ہوا، اورنگزیب نے پھر قدیم دستور کے مطابق اس کو جاری کر دیا،

اب سوال یہ ہو کہ وہ محصول جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے تھا، اور جس پر غیر مسلم رعایا نے کبھی شور نہیں مچایا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں اس کے متعلق ناراضی پیدا

ہوئی ؟ بلاشبہ فیروز شاہ نے جب برہمنوں پر جزیہ تشخیص کیا تھا، تو ان کی طرف سے پُرامن نافرمانی ہوئی تھی اور بھوک ہڑتال چند روز تک قائم رکھی گئی تھی لیکن چونکہ برہمنوں کا جزیہ سے استثنا سلاطین قدیم کی غلطی تھی، اس لئے فیروز شاہ نے کچھ پروانہ کی، اور خود ہندوستان نے برہمنوں کو سمجھا کر بھوک ہڑتال سے باز رکھا[۱]، اور پھر عرصہ تک جزیہ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی لیکن اورنگزیب کے زمانہ میں دفعتہ ایک ہیجان پیدا ہوا جس نے ملک کے متعدد حصوں میں آگ لگادی، فیروز شاہ کے زمانہ کے برہمن تو اپنی امتیازی شان قائم نہ رہنے پر ناراض تھے، اورنگزیب کے زمانہ کے ہندوؤں کو کس بات کا گلہ ہوسکتا تھا ؟

علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۴۰) میں اس سوال کا یہ جواب دیا ہے، کہ چونکہ یہ محصول (جزیہ) ایک مدت سے موقوف ہوچکا تھا، اوس کا نئے سرے سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہوسکتا تھا؟ لیکن جب یہ واقعہ ہے کہ جزیہ نہایت قدیم محصول تھا، اور ہندوستان صدیوں سے اس کا عادی تھا، اور اورنگزیب نے ۱۰۷۷ھ سے لے کر ۱۰۸۸ھ تک تمام خلاف شریعت محصول اور نذرانے بند کردیئے تھے[۲]، اور اُن کے بجائے نہایت خفیف محصول (جزیہ) ۱۰۹۰ھ میں جاری کیا تھا تو پھر ایسے محصول کی اتنی شدید مخالفت اور اس کے خلاف بغاوتیں سمجھ میں نہیں آتیں،

سرجادوناتھ سرکار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ محصول "ذلت" کی ایک علامت تھی جس سے بغض وحسد کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا تھا، نیز تحصیل کی شدت بھی مظاہروں اور بغاوتوں کا باعث تھی آخر بات کا جواب اسی عنوان میں اور پہلی چیز کا گذشتہ صفحات میں آچکا ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بغاوتوں سے اسلامی سیادت کی مخالفت مقصود تھی، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ بلا واسطہ ٹکس سے سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے، اور جزیہ اس کا شاہد عدل ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بیداری ہندوؤں میں پیدا ہوئی، سب سے پہلے فیروز شاہ کے زمانہ میں برہمنوں نے سیاست میں قدم رکھا،

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۸۲، ۳۸۳ [۲] یہ واقعات خافی خان نے لکھے ہیں، اور الفنسٹن کی تاریخ میں اس کا تذکرہ کیا ہے،

اور ہمارے اس زمانہ کے لیڈرون کی طرح اُس زمانہ مین بہت سے لیڈر پیدا ہوگئے جنھون نے پرامن ترک موالات کا مقاطعۂ جزیہ کی شکل مین آغاز کیا جس سے شہر کے تمام ہندوون کو اُن سے ہمدردی پیدا ہوئی بعد مین شاید آگے چل کر یہ چنگاری اندر اندر سلگ کر اور بھڑکتی لیکن اکبر کی حکمت عملی نے اس کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے، خود اس محصول ہی کو موقوف کر دیا[51] اور یہ آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی، اورنگزیب کے زمانہ مین راجپوتانہ کے راجپوتون اور مہاراشٹر کے مرہٹون نے از سرِ نو اس آگ کو ہوا دی، جس پر جزیہ کی دوبارہ تشخیص نے تیل کا کام دیا، اور سیواجی، مہارانا چتور اور راجہ جسونت[52] وغیرہ نے سلطنتِ مغلیہ کے خلاف وہ فضا پیدا کی کہ راجپوتانہ کی طرح دکن بھی اس سے متاثر ہوا، اور مختلف مقامات مین مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی، سیواجی نے جزیہ کے متعلق بارگاہ سلطانی مین جو خط بھیجا تھا، اس کو سرجادوناتھ نے نقل کیا ہے[53]، راجپوتانہ کے راجاؤن کی سرکشی کے واقعات خانی خان وغیرہ نے قلمبند کئے ہین، گجرات والون کی مخالفت کا پتہ اس فرمان شاہی سے چلتا ہے، جو دیوان صوبہ کے نام آیا تھا، اور مرآۃ احمدی کے حوالہ سے اوپر نقل ہو چکا ہے، برہانپور اور دکن کے ہنگامون کا تذکرہ خانی خان مین ہے، اور سرکار نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے،

---

[51] گو کہ اس کے بجائے اور دوسری قسم کے محصول بڑھا دیئے، جن پر ہمیشہ مغلون کے عہد حکومت مین اورنگزیب کے زمانہ تک عمل رہا۔ [52] خانی خان ص ۲۶۱، ۲۶۲، ج ۲، [53] سیواجی کے اس خط کے متعلق سخت اختلاف ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ مین اس کو سیواجی کی طرف منسوب کیا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مسودہ مین شمبھوجی کا نام آیا ہے، آرم (Orme) کے اقتباسات مین جسونت سنگھ اور ٹاڈ (Tod) نے مہاراناراج سنگھ کا نام لیا ہے، شمبھوجی اور جسونت تو تاریخون کی وجہ سے خارج از بحث ہو جاتے ہین، البتہ اندرونی شہادت اُسکے خود نوشت سوانحی تفصیلات راج سنگھ کے بجائے سیواجی پر منطبق ہوتے ہین، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خط کا مضمون نیلا پربھو نے بنایا تھا جو سیواجی کا فارسی کاتب تھا لیکن تحریر کا انداز

ان واقعات کی روشنی مین جزیہ کی تحصیل مین باقاعدگی یا پروفیسر جدو ناتھ کے الفاظ مین تشدد کا سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے جس کو ہم بہ تفصیل لکھتے ہین،

(۱) **مقاومتِ مجہولہ**: اورنگ زیب کے زمانہ مین ہندوؤن نے آزادی کے لئے جو لڑائی شروع کی، اس کی ابتدا "قیصر شاہی" برہمنون کی تقلید مین مقاومتِ مجہولہ یا پرامن ترک موالات سے کی گئی، سرجادوناتھ نے لکھا ہے، کہ ۲ اپریل ۱۶۷۹ء (یکم ربیع الاول ۱۰۹۰ھ) سے تمام سلطنت مین جزیہ کا قانون نافذ ہوا جب یہ خبر پھیلی تو دہلی اور مضافات کے صدہا ہندو جمع ہو کر جمنا کے کنارے قصر شاہی کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، اور جزیہ کی منسوخی کے لئے شور مچایا، اس کے بعد جمعہ کے دن نماز کے وقت باب قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک سڑک پر دہلی شہر اور چھاؤنی کے ہندو کھڑے ہوئے اس کے بعد بھی چند روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ مین سیواجی کا خط آیا، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۷۱،۲۷۲) ظاہر ہے کہ ان شورشون مین جزیہ کی آمدنی کم ہو گئی ہوگی،

(۲) **بغاوت**: چونکہ عالمگیر کی رعایا مسلح تھی، اس "پرامن" مقابلہ نے جنگ کی شکل بہت جلد اختیار کر لی، اور رانا راج سنگھ والی جے پور اس تحریک کا سرگروہ بن گیا، رانا کو "سیواجی" نے اپنے خط مین ہندوؤن کا سردار لکھا ہے، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۸۹، Appendix VI) **سیواجی** پہلے سے مخالف تھا، اور ہندو حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس تحریک مین شامل ہوا، اورنگ زیب کے نام ایک سخت خط لکھا، ان دو کے علاوہ راجپوتانہ کے بہت سے راجا مخالف ہو گئے، پھر دکن کی رعایا بگڑ گئی اور ایسی سرکشی اختیار کی کہ تحصیلدارون کے تقاضے کے باوجود جزیہ دینا بند کر دیا، خافی خان لکھتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) بتلاتا ہے کہ اس خط مین بہت سے ٹکڑے الحاقی ہین، اس کا لکھنے والا اورنگ زیب کا معاصر اور کمزور رعیت سیواجی نہین معلوم ہوتا، بلکہ آج کل کا "مصلح" اور ملک کا "نجات دہندہ" سیواجی معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس خط مین راج سنگھ کو ہندوؤن کا لیڈر کہا گیا، یہ اور اس جملہ پر خود سرجادوناتھ کو بھی اعتراض ہے، اور چونکہ ۱۹۰۸ء کے ماڈرن ریویو مین انھون نے اس پر تنقید بھی لکھی ہے اس لئے اس خط کی صحت بہت مشکوک ہے، تا وقتیکہ اصل خط نہ ملے قابل اعتبار نہیں ہے۔

" ازانکہ کفار بلدہ و پرگنات دراداے جزیہ بسیار بہ سختی یا منصوب کردہ پادشاہی پیش می آمدند

و ہیچ پرگنہ نبود کہ رعایا بہ امداد فوجداران و مقدمان سرکش جنگ و ہنگامہ فساد ننماید "

(صفحہ ۲۷ ، جلد ۲)

گجرات کی رعایا مین بھی بعض ایسے سرکش موجود تھے، چنانچہ "شہنشاہ" کے فرمان بنام دیوان صوبہ

مین یہ فقرہ بھی ہے،

" واگر ازراہ تمرد جزیہ سال اول ادا نکردہ باشد" (مراۃ احمدی ص ۱۲۳ ج ۱)

غور کرو! وہ رعایا جو سلطنت کے تحصیلدارون کے ساتھ زیادتی کرے، سرکش چودھریون، اور

فوجدارون کے جتھون مین شامل ہو کر آمادۂ فساد ہو، اس کا جزیہ نہ دینا، کیا غربت اور مسکنت کی بنا پر ہو سکتا

ہے؟ ایسی سرکش رعایا کے متعلق اگر اورنگزیب نے یہ حکم دیا کہ تحصیلدارون کی مستعدی اور طلب و تقاضے کے

باوجود جس نے جزیہ نہ ادا کیا ہو، اور سرکشی کی نیت بھی نہ رہی ہو، تو اس کا جزیہ (بقایا) معاف کر دیا جائے،

اور جس نے سرکشی سے جزیہ بند کیا ہو، اس سے وصول کیا جائے، تو اس مین کیا بے انصافی ہوئی؟ اور اگر یہ

بے انصافی تھی، تو سرجدوناتھ کو "انصاف" کی کوئی مثال تاریخ ہند سے پیش کرنی چاہئے تھی.

سرجدوناتھ نے اعتراض کیا ہو کہ دکن کی رعایا سے بجبر جزیہ وصول کیا جاتا تھا، بے شبہ میر عبدالکریم

کے ساتھ سوار اور پیادے گئے تھے، اور کوتوال کو بھی حکم پہنچا تھا کہ "جو ادائے جزیہ مین سستی کرے، اس کو سزا

دی جائے" (خافی خان ص ۲۷۸، جلد ۲) اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی رعایا تحصیلدارون پر سختی کرتی تھی، اور

سرکش فوجدارون اور چودھریون سے اس معاملہ مین مدد لیتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، جسے معترض

نے نظرانداز کر دیا ہے،

اس سرکشی کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی پر جو اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک صوبہ (دکن) کے

ایک واقعہ سے کرنا چاہئے، میر عبدالکریم امین جزیہ برہان پور، بارگاہ سلطانی مین اطلاع دیتے ہین،

"جزیہ تمام بلدۂ برہان پور سال گذشتہ بست وشش ہزار روپیہ داخلِ خزانۂ سرکار گشتہ خانہ زاد در مدتِ سہ ماہ از پورجاتِ نصفِ بلدہ یک لک وہشت ہزار روپیہ عائدِ سرکار ساختہ" (خافی خان ص ۲۷۹)

آدھے شہر کے مواضعات سے تین ماہ مین ایک لاکھ ۸ ہزار روپیہ وصول ہوا، جو میر عبدالکریم کے حُسنِ انتظام کا نتیجہ تھا، حالانکہ اُن سے پیشتر بُرہان پور کے تمام مواضعات کا سالانہ جزیہ ۲۶ ہزار وصول ہوا تھا، پروفیسر سرکار کے نزدیک یہ حاکم کی سختی کا نتیجہ تھا، حالانکہ خافی خان کے مطابق یہ اس وصف کا کرشمہ تھا جو لفظِ "ضابطہ" کے اندر جھلک رہا ہے "ضبط" کے معنی ہین کسی چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا،

(۳) **رقم جزیہ کی معافی**:۔ تیسری چیز جس نے جزیہ کی آمدنی پر اثر ڈالا یہ تھی کہ بعض رحم دل اور سادہ لوح مسلمان حکام نے ہزارون ہندوؤن کو غیر مستطیع سمجھ کر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا، حالانکہ وہ غیر مستطیع نہ تھے، ان حکام مین سے ایک امانت خان بھی تھا، خافی خان (ص ۳۷۷ و ۳۷۸) اس کے متعلق لکھتا ہے:

"آثار وزرے رشید خان دیوانِ خالصہ کہ با امانت خان پارۂ سوے مزاج بہمشی داشت، پروانہائے معافی جزیہ را کہ امانت خان بادست آویز ہائے مختلف بہنود نوشتہ میداد وبادشاہ دراجرائے جزیہ نہایت تقید بود از نظر گذرانیدہ، عرض نمود کہ از نصف ہنود بیشتر را امانت خان سندِ عدم مزاحمت جزیہ دادہ خلافِ مرضی بظہور آمد"،

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤن کی آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، پھر آمدنی کیون کم نہ ہوجاتی؟

اورنگ زیب نے اسی موقع پر امانت خان سے فرمایا تھا کہ

"در مقدماتِ دیگر مالی وملکی آنچہ سندِ معافی بہر دم می دہند، مختارید، اما جزیہ کہ بہزار دشواری بر کفار جاری ساختہ ایم، معاف نمودن آن بدعت، وباعثِ برہم خوردن بند وبستِ جزیہ می گردد" (خافی خان)

سرکار نے اس فرمان کو اورنگزیب کی سختی اور وصولی جزیہ میں تشدد پر محمول کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ
چونکہ جزیہ کی آمدنی بہت کم رہ گئی تھی، اور انکم ٹکس کے طور پر غیر مسلموں کا وہی ایک محصول تھا، اس لئے بادشاہ
نے تاکید کی کہ اور معاملات میں معافی کی سند دینے کا اختیار ہے لیکن جزیہ میں ایسا نہیں کرنا چاہئے، سرکار نے "بڑا
دشواری" اور "بدعت" کے الفاظ کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس میں کیا چیز خلاف واقعہ ہے؟ کیا شورشوں،
بغاوتوں اور مظاہروں نے جزیہ کے نفاذ میں دشواری نہیں پیدا کی تھی؟ اور کیا پرانے اور صحیح دستور کو اٹھا دینا
"بدعت" (نئی بات) نہیں ہے؟

ناظرین! گذشتہ تینوں صورتوں سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ جزیہ کے باقاعدہ نظم و نسق کا کیا سبب
تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ عموماً ان مقابلہ بغاوتوں اور جزیہ کی معافی کے سبب سے آمدنی کم ہو گئی تھی، اس لئے
محکمہ کو باضابطہ کیا گیا تھا، سرجادوناتھ نے سبب کو مسبب اور مسبب کو سبب قرار دیکر معاملہ کو بالکل الٹ
دیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ چونکہ محکمہ میں سختی تھی، اس لئے گذشتہ واقعات پیش آئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ
واقعات پیش آئے اسلئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا،

بعض اور غلط فہمیاں | گذشتہ پانچ بڑے مغالطوں کے علاوہ پروفیسر جادوناتھ کی بعض خوش فہمیاں اور بھی
ہیں، مثلاً

(۱) جزیہ اشاعت اسلام کا ذریعہ تھا، اس کا جواب اگرچہ علامہ شبلی مرحوم نے نہایت معقول اور
دلچسپ دیا ہے کہ.

"ایسا ہلکا ٹکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی،.... کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے
بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا
ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے"!!

(مقالات شبلی مضمون جزیہ ص ۲۲۰)

لیکن یہ جواب معترض کے لئے اس بنا پر کافی نہین ہے، کہ وہ ساری ذمہ داری عالمگیر کے ضعیف کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہین، وہ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہین کہ اس محصول (جزیہ) کا مقصد اسلام کی اشاعت اور کفر کا ازالہ تھا، حالانکہ یہ مقصد اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہان سے نکلتا ہے کہ عالمگیر کی یہ راے تھی، جزیہ کا فرمان اگر بلفظہٖ موجود ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ الفاظ خود عالمگیر نے لکھوائے تھے، تو بے شبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا، لیکن عمال حکومت کے منشی اور محرر یا اس زمانہ کے مورخ اپنے جذبات کو اگر فرامین شاہی یا اپنی عبارتون کی تمہید مین ظاہر کرین، تو اُن کا ذمہ دار عالمگیر کیسے قرار پائے گا؟ مآثر عالمگیری یا مرأۃ احمدی جس کو بھی اٹھایا جائے، الفاظ خود مصنفین کے ہین، اس لئے عالمگیر اُن کی بنا پر مورد الزام نہین ہو سکتا،

(۲) جزیہ زائد ٹکس تھا جس سے صرف مسلمان محفوظ تھے، یہ غلط ہے اورنگزیب نے جزیہ کی طرح وصولی زکوٰۃ کا فرمان بھی نافذ کیا تھا، جو مرأۃ احمدی وغیرہ مین درج ہے، اس لئے پروفیسر صاحب کے الفاظ کو ذرا بدل کر یون بھی کہا جا سکتا ہے "کہ زکوٰۃ زائد ٹکس تھا جس سے صرف ہندو محفوظ تھے"

(۳) ملازمین سلطنت جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اس خیال مین سر کار اور ار سطو "مختلف ہین" ار سطو نے فوج مین امراے جزیہ کی موجودگی سے جن کا ذکر ۲۱ر جولائی ۱۷۰۲ء (۱۱۱۳ھ) کے اعلان مین ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ امراے جزیہ کی موجودگی کے کوئی معنی نہین ہین، لیکن مرأۃ احمدی (ص ۳۴۱ ج ۱) مین اورنگ زیب کے اس حکم کی موجودگی مین جو عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ہے،

"از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکند وسواے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریعت بگیرد"

ارسطو کے خیال کی کوئی اصلیت نہین رہتی، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نقدی صورت

مین ملازمین سلطنت سے جزیہ لیا جاتا تھا، اور نہ خدمت کی صورت مین، بلکہ اُن کی خدمات پر اُن کو
اتنا معاوضہ ملتا تھا، فوج مین امراے جزیہ کی موجودگی کے ایک اور معنی بھی ہوسکتے ہین یعنی امیر جزیہ
کے ساتھ امداد کے لئے فوج ہو، جیسا کہ میر عبدالکریم کے ساتھ فوج بھیجی گئی تھی، کیونکہ رعایا باغی تھی،
اور یہ تو بہر صورت ممکن ہے، کہ فوج مین جزیہ کا کوئی دفتر ہوتا ہو تاکہ باغی علاقون کے قبضہ مین آنے
کے بعد جزیہ وصول کیا جاسکے،

(باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان
وی پی اور منی آرڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجاسکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی
صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندہ ہین، اُن کے یہان ہماری تمام
مطبوعات مل جائین گی، جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگالین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی
ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین، "مینیجر"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین

اس مین سندھ کا جغرافیہ اسلامی حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت
راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ
اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی
پوری تفصیل ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت ہے، "مینیجر"

اعجاز القرآن

اور

اس کے وجوہ اور دیگر متعلقہ امور

از

جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑہ

عم محترم جناب مولانا سید محمد بدرالدین علوی صاحب نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی فرمایش پر اس مقالے کو انگریزی زبان میں لکھا تھا، مضمون کی اہمیت کی وجہ سے بعض اصحاب نے اصرار کیا کہ اس کو اردو کے سانچے میں ڈھال کر ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جائے، موصوف نے اسے منظور فرماکر مجھے ترجمے کی خدمت پر مامور فرمایا، میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع اصل کی خوبی ترجمے میں باقی رہے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے اس لئے کہ یہ میری پہلی علمی کوشش ہے"

"محمد فخرالدین علوی بی اے علیگ"

کلام پاک کو اپنے متبعین کی بے نظیر عقیدت حاصل ہے، بہت سے مسلمانوں نے پوری کتاب کو حرف بحرف حفظ کرنے کے علاوہ اپنی ساری زندگی مختلف طریقوں پر اس کی خدمت کے لئے وقف کردی، ان کے لئے کلام پاک علوم کا گنجینہ رہا ہے، محض پچھلے علوم ہی کا نہیں، بلکہ ان نئے علوم کا بھی جن کا سرچشمہ صرف قرآن ہی ہے، قرآن پاک کے علوم پر بحیثیت مجموعی اور ہر فن پر علحدہ علحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، اس مضمون میں

ان سب کا مفصل ذکر ممکن نہیں، اس لئے اس مضمون میں صرف اعجاز قرآنی پر بحث کی جائے گی، کہ اس کی مثال پیش کرنے سے کیوں انسان قاصر رہا ہے،

اس علم کی ابتداء اور ترقی | قرآن خود اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز پیش کرنی محال ہے اور مندرجۂ ذیل آیات اس دعوی کا اعلان کرتی ہیں،

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ،	پس ان کو اس جیسا اسلوب بیان پیش کرنا چاہئے،
(۲) قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات	کہہ دو کہ اس جیسی دس سورتیں بنا کر لائیں
(۳) وان کنتم فی ریب مما نزلنا	اگر تمھیں اس میں کچھ شبہ ہے، جو ہم نے اپنے
علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ	بندے پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورۃ
وادعوا شھداءکم،	بنا لاؤ، اور اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لو،

نزول وحی کی تیئیس سالہ مدت میں اس تحدی کا نہ تو کسی مخالف نے مقابلہ کیا، اور نہ اس جیسا کلام پیش کیا، اس طرح قرآن شریف کے اعجاز کا عقیدہ قائم ہو گیا، جو تیسری صدی ہجری کی ابتداء تک اسی صورت سے قائم رہا، تاآنکہ معتزلہ پیدا ہوئے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کی بلاغت کے مثل لانا ممکن ہے،

اس زمانہ کے عوام عربی زبان میں مہارت نہ رکھتے تھے، اور بلاغت کا کیا ذکر وہ جملے کی صحیح و غلط شکل میں بھی تمیز نہ کر سکتے تھے، اس لئے اہل سنت نے پیش بندی کے طور پر وجوہ اعجاز تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس موضوع پر پہلے مصنف محمد بن یزید واسطی متوفی ۳۰۶ھ تھے، ان کے بعد مشہور عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ ہوئے جنھوں نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا ذکر خود اپنی کتاب الحیوان میں کیا ہے، ان کے بعد رمانی نحوی متوفی ۳۸۲ھ کا نمبر آتا ہے، اسی زمانے کے ایک دوسرے محدث خطابی متوفی ۳۸۸ھ ہوئے، جنھوں نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، علامہ باقلانی متوفی ۴۰۳ھ اس موضوع پر بہترین مصنف تسلیم کئے گئے ہیں،

متاخرین میں سے جنھوں نے اس موضوع پر لکھا ان میں مشہور متکلم امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ،
ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ .... ابن سراقہ شاطبی متوفی ۶۶۲ھ قابل ذکر ہیں کشف الظنون سے
معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، زملکانی ۷۲۷ھ، دور حاضر کے
مصری عالم مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، ایسے علما جنھوں نے اس موضوع
پر سرسری طور پر قلم اٹھایا، اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کی صحیح تعداد بیان نہیں کی جا سکتی، ان میں ایسے جنھوں نے اس
موضوع پر بہت لطافت کیساتھ عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا ہو مندرجۂ ذیل ہیں :-

(۱) ماوردی متوفی ۴۵۰ھ جنھوں نے رسالہ اعلام النبوۃ میں اس مسئلہ کو بہت خوبی کے
ساتھ لکھا ہے،

(۲) علامہ عبد القاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ علم بلاغت کے بانی عالم جن کی کتاب دلائل الاعجاز
میں قرآن مجید کے اعجاز پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے،

(۳) قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفاء نے قبولیتِ عامہ حاصل کی، بہت سے
علما نے اُس کی شرحیں لکھیں،

جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا، یہ مضمون علامہ جرجانی، علامہ باقلانی، ماوردی اور قاضی عیاض کی تصانیف
سے ماخوذ ہے،

قرآن شریف کے اعجاز کے معنیٰ علامہ جرجانی نے اس اعجاز کی تشریح اس طرح کی ہے،
قرآن پاک کی طرف سے عربوں کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کریں،
لیکن انھوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا، اور اس سے روگردانی کرکے تلوار سے لڑنا پسند کیا، اگر قرآن
پاک کی مثال لانا اُن کے بس کی بات ہوتی، تو یہ اُن کے لئے مقابلہ لڑائی کے زیادہ آسان تھا، یہاں یہ
سوال پیدا ہوتا ہے جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہو کہ قرآن پاک کی وہ کونسی خصوصیت تھی،

جس نے اہلِ عرب کو اس کی نظیر لانے سے قاصر رکھا؟ کیا وہ قرآن مجید کے صحیح، عمدہ اور خوبصورت مضامین یا محض الفاظ؟ اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، کہ الفاظ کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی مثال وہ نہ لا سکے؟ ان سوالات کے جوابات حسب ذیل ہوں گے،

قرآن شریف کے مخالفین نے اس کی شستگی الفاظ، اُن کی ترتیب، بیان کی خصوصیات، آیات کا غیر معمولی آغاز و اختتام، الفاظ کی روانی، واقعات کا بیان، اسلوب نصیحت اور یاددہانیوں اور دلائل کو خوب دیکھا، اور اس کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر غور کیا، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو اپنی جگہ پر غیر موزون ہو، یا جس پر اعتراض کیا جا سکتا ہو، اور اس میں ترمیم کیجا سکتی ہو، ان خصوصیات کی وجہ سے کسی شخص کو بھی اس کی مثال لانے کی ہمت نہ پڑی، علامہ جرجانی کے جوابوں کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ اور مضامین دونوں نے مجموعی طور پر وہ خوبی پیدا کر دی جس نے کلام پاک کو ناقابلِ مثال بنا دیا،

علامہ جرجانی ایک طویل بحث کے بعد مندرجۂ ذیل آیت کی خوبیوں کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیان کی توضیح کرتے ہیں کہ

وقیل یا ارض ابلعی مَاءَكِ وَیَاسَمَآءُ	کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی سوکھ لے اور
اقلعی وغیض المَاء وقضی الامر	اے آسمان پانی کو روک لے، پانی کم ہو گیا
وَاستوت عَلی الجودی وقیل بعدًا	اور حکم کی تعمیل ہو گئی، اور کشتی جودی کی پہاڑی
لِلقوم الظّالمِین ہ	پر رک گئی، اور کہا گیا کہ ظالموں پر لعنت ہو،

ان آیات کا حسن ان کے الفاظ اور جملوں کی مخصوص ترتیب سے ظاہر ہے، موقع کی اہمیت کی وجہ سے زمین کو حرف ندا سے پکارا گیا ہو، یا ایتھا سے نہیں، اُس کے بعد آگے اور پیچھے کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ابلعی کو لیجئے، یہاں پانی کو کاف خطاب سے منسوب کیا گیا ہے، جو زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ طرز خطاب بڑی خوبی کیساتھ منتخب کیا گیا ہے، اور ابلعی الماء کا سادہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا، اس کے بعد آسمان کو

پکارا گیا، اور اس کو اپنا کام انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد تعمیل حکم کی خبر بصیغۂ مجہول یہ ظاہر کرنے کے لئے دی گئی ہے، کہ پانی خود اپنے اختیار سے زمین میں جذب نہیں ہوا، بلکہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا، پھر تعمیلِ حکم کے بیان سے واقعہ کی تائید لائی گئی ہے، اور اس کشتی کے بیان سے جس کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے، بلاغت کی رو سے یہ طرز بیان واقعہ کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، آخر میں لفظ قیل کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ جملے کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو جائے، یہ تمام خوبیاں سننے والے کے دماغ پر عظمت طاری کرتی ہیں محض سادہ الفاظ کی مدد سے ہی نہیں بلکہ ان عجیب و غریب مضامین سے بھی جو ان الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں،

علامہ جرجانی نے اپنی راے کو اسی کتاب میں ایک اور جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جب عربوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن پاک کی مثل بنا لائیں، اس وقت اُن کو قرآن کی وہ مخصوص خوبیاں جو اپنی عبارتوں میں وہ نہیں پیدا کر سکتے تھے، ضرور معلوم رہی ہوں گی" کیونکہ یہ مہمل بات ہے کہ کوئی شخص اپنے فعل کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح اس کام کو نہیں کر سکتے، قرآن کی یہ خاص خوبی محض اس کے الفاظ حروف اعراب اور مسجع جملوں ہی میں مخصوص نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی، اس لئے وہ خوبی محض ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے نامعلوم تھے"

یہاں علامہ جرجانی نے اپنے بیان کی تائید میں اشتعل الراس شیبا کی تشریح کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سر ضعیف العمری سے چمک نکلا" تاوقتیکہ کلمہ راس کو معرف بالام نہ بنایا جائے، اور اس کو اشتعل کا فاعل نہ قرار دیا جائے، اور دونوں کلموں کے ساتھ شیباً کو حالت نصبی میں بصورت نکرہ اضافہ نہ کیا جائے

جملے مین کوئی خوبی نہین پیدا ہوگی، کیونکہ جو مضمون بیان اوا کیا گیا ہے وہ اسی طرز کے ساتھ مخصوص ہے،

وجوہ اعجاز | علامہ باقلانی کی رائے کے مطابق قرآن کے اعجاز کی تین خاص وجوہ ہین، انھون نے آخری وجہ کو دس قسمون مین تقسیم کرکے کل تعداد بارہ تک کر دی ہے، ماوردی نے اُن کی تعداد بیس قرار دی ہے، قاضی عیاض چار وجہین بتاتے ہین، مگر آٹھ کا اضافہ کرکے انھون نے بھی تعداد بارہ تک پہنچا دی ہے، اُن سب کی میزان چالیس ہوتی ہے، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

(۱) الفاظ کی صحت اور ان مین آپس کی ایسی مشابہت جو عربون کی رسائی سے باہر تھی، اہل عرب زبان مین غیر معمولی مہارت کے باوجود بھی قرآن کی مثال پیش نہ کرسکے، حالانکہ یہ دعویٰ ۲۳ سال تک قائم رہا، ولید بن مغیرہ نے جو مکہ کا بڑا آدمی تھا، آنحضرت صلعم کو آیۃ

اِنَّ اللّٰہ یامُرُ بِالعَدْل   بیشک اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے

پڑھتے ہوئے سُن کر کہا، "اُس بیان مین مٹھاس اور حُسن ہے، اُس کا زیرین حصہ پانی مین ڈوبا ہوا اور بالائی حصہ پھلون سے لدا ہوا ہے، اور یہ انسان کا کلام نہین ہے" ایک بدوی کسی شخص کو آیت

فَاصْدَعْ بِمَا تُوْمَرُ   تمھین جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اعلان کرو۔

تلاوت کرتے ہوئے سُن کر سجدے مین گر گیا، اور کہا کہ "مین اس کی فصاحت کے سامنے سجدہ کر رہا ہون" ایک رومی بطریق نے جو اچھی عربی جانتا تھا کسی مسلمان کو یہ آیہ پڑھتے سنا،

وَمَنْ یُطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَی اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ   کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہین جو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت اور خدا کا ... [illegible]

تو کہا کہ صرف ایک آیت مین دنیا و آخرت کے وہ تمام مسائل موجود ہین، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے،

(۲) قرآن شریف کی حیرت انگیز عبارت اور اس کا غیر معمولی طرز بیان جو مختلف مضامین سے

متعلق ہونے کے باوجود عربوں کے مروجہ طرز بیان سے علحدہ تھا، ان کے مروجہ طرز میں صرف دو چیزیں تھیں، نثر اور نظم، نثر کی دو قسمیں تھیں مسجع اور غیر مسجع، نظم کی بہت سی قسمیں تھیں، شاعری بلند پایہ فن تھا، لیکن نثر ہر ایک کے بس کی تھی، قرآن ان میں سے کسی قسم کی نثر یا شاعری سے مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن آیات کے آخری حروف شعر کے قافیوں اور نثر کے سجع سے مختلف تھے، ان بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا، جو اہل عرب کے بس سے باہر تھا، اور معاصر اہل عرب اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوئے،

(۳) عرب میں ایسے بلیغ کلام کا وجود نہ تھا جس میں نازک خیالات اور پختہ حقائق بیان کئے گئے ہوں، اور اسالیب بیان میں طول کے باوجود باہم مشابہت بھی ہو، یہ صحیح ہو کہ عقلا نے اچھے اچھے جملے بھی کہے، اور شعرار نے اشعار بھی، مگر ان جملوں اور اشعار میں اختصار کے باوجود بھی خامیاں موجود تھیں، اس کے برعکس قرآن پاک ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے،

(۴) قرآن شریف کے طرز ادا میں نہ کوئی اختلاف ہو اور نہ بیان میں کوئی نقص ہے، اگرچہ اس میں قصے، نصیحتیں، دلائل، حقائق، قوانین، معذرتیں، وعدے وعید، محاسن اخلاق کی تعلیم اور دوسرے مختلف قسم کے مضامین ہیں، اور کسی ایک تحریر میں ان تمام خوبیوں کا مجتمع ہونا ناممکن ہے، مختلف لوگ بیان کی مختلف شاخوں میں ماہر ہوتے ہیں، مثلاً شاعر جو مدح کرنے میں ماہر ہو وہ ہجو کا ماہر نہیں ہو سکتا، اور جو شخص ہجو نگاری میں بلند پایہ ہوگا، وہ مدح میں کمتر ہوگا، اگر بعض مرثیہ گوئی میں بہتر ہیں، تو دوسری اصناف شاعری سے بے بہرہ ہیں، بعض رجز میں مہارت رکھتے ہیں، تو دوسرے اقسام پر قادر نہیں بعض اونٹوں اور گھوڑوں کے اوصاف، رات کے سفر، باغ، شراب اور جذبات کی مصوری کرنے میں استاد مانے گئے ہیں، اگر امرؤالقیس سواری کا بیان کرنے میں مشہور ہے، تو نابغہ ڈرانے اور ترغیب دلانے میں ماہر ہے، اسی طرح تقریروں پیاموں اور دوسرے قسم کے بیانات میں اختلاف ہوا

ایک شخص اپنی دلچسپی کے کسی خاص مضمون مین اپنے تبحر کا مظاہرہ کرسکتا ہے لیکن جب وہ کسی اور موضوع کو ہاتھ لگاتا ہے تو پیچھے رہ جاتا ہے، اور اس کی عبارت کی خامی نمایان ہوجاتی ہے، اسی بنا پر مندرجۂ بالا شعرا جن کی برتری اُن کے خاص مضامین مین مسلم ہو دوسرے مضامین مین کمتر سمجھے گئے ہین، ایک ہی جملہ جس میں کوئی بندش نہ ہو، ادا کرنے والون کے اختلاف سے اختلاف پذیر ہوجاتا ہے، قرآن پاک اپنی تمام تفصیلات مین ایسی منضبط قوت کا حامل ہے، جو تمام نقائص سے پاک ہے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کیجا سکتی جس مین قرآن پاک اپنی فصاحت کے یکسان معیار کو قائم نہ رکھ سکا ہو، ایک ہی مضمون کو بار بار دہرانے مین طرز بیان کا یکسان رہنا ناممکن ہوتا ہے لیکن قرآن مضامین کی تکرار کے باوجود بھی اپنے معیار کا طرز بیان سے کبھی نہین ہٹا، اور اپنی بلاغت قائم رکھی،

(۵) فصحا کی عبارتون مین جہان وہ مختلف جملون اور خیالات کو آپس مین ملاتے اور جدا کرتے ہین ایک نمایان بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اُن کی یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی زبان کے اسالیب بیان کے مطابق کسی مضمون کو اس کے ابتدائی درجہ سے آغاز کرکے انتہا تک پہنچاتے ہین، یا اس کے برعکس انتہا سے ابتدا مین لیجاتے ہین، یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہو جب کسی مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانے یا کسی مضمون کو غیر دلچسپ اور مشکل بنانے کی کوشش کرتے ہین، لیکن قرآن مین اس قسم کی کوتاہی نہین بلکہ اس کے ہر قسم کے بیانات مین مناسبت ہو،

(۶) آیات قرآنی کی ساخت سے تین خصوصیات ظاہر ہوتی ہین،

(الف) الفاظ کا اس طریقہ سے استعمال کہ وہ موثر ہون،

(ب) خیالات کی ایسی جامعیت جو ابتدا ہی سے واضح ہین، اور ان کے سمجھنے کا دار و مدار آیت کے اختتام پر نہین ہے، اور خیالات اور الفاظ مین بھی مطابقت ہے، اس مین نہ کمی ہے اور نہ زیادتی،

(ج) آیات کی ساخت مین حسن ہے، اور غیر موزون بندشون کا کہین وجود نہین، اوزان مین مشابہت ہے،

(۷) عربی زبان مین متعدد اسالیب بیان ہین، مثلاً تفصیل و تطویل، اختصار، اجتماع و افتراق اور استعارہ وغیرہ، یہ تمام اصناف قرآن پاک مین موجود ہین، جب اُن کے قرآنی استعمال کا مقابلہ دوسرون سے کیا جاتا ہے، تو یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ قرآن کا طرز بیان انسانی طاقت سے بالاتر ہے،

(۸) قرآنی خیالات جو مذہب اور شرع کی بنیاد ہین، اس استدلال و مباحثہ اور ایسی ہم آہنگی نزاکت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین کہ اس کی مثال انسانی کلام مین ملنا ناممکن ہے، اس مین اگر بہت سے معمولی اور جانے بوجھے ہوئے خیالات ہین، تو بہتیرے نئے اور غیر معمولی بھی ہین، جدید خیالات کے مقابلہ مین جانے بوجھے ہوئے خیالات کے لئے الفاظ منتخب کرنا آسان ہے، اور معمولی تخیل کے لئے بہت عمدہ الفاظ کے استعمال کے مقابلہ مین بلند اور بہترین تخیل کے لئے بہترین الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اسی کے ساتھ اگر الفاظ خیالات کے مطابق ہون، اور خیالات الفاظ کے اور دونون اپنی جگہ پر بے مثال ہون جیسا کہ قرآن مین ہے، تو اس کی ندرت اور کمال فصاحت مین کوئی شبہ نہین ہوسکتا،

(۹) کلام کا اصل حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی نظم یا نثر مین اس کا اقتباس دیا جائے، اور اس وقت اس کی خوبی ہیرے کی طرح چمکے، قرآنی اقتباسات کو جب اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، تو انکی خوبی اور نمایان ہوجاتی ہے، اور وہ دوسرے کلام مین نگینہ کی طرح چمک اٹھتے ہین،

(۱۰) عربی مین حروف تہجی ۲۹ ہین، اور قرآن کی وہ سورتین جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہین، ۲۹ ہین، اور ان حروف مقطعات کی تعداد جو ان مین لائے گئے ہین، ۱۴ ہے، شاید ایسا اس لئے ہو کہ قرآن اُن کی زبان کے الفاظ سے مرکب ہے، یہ حروف بعد کے نحویون کی راے کے مطابق دو قسم کے ہین مہموسہ اور مجہورہ، دس مہموسہ ہین، اور باقی انیس مجہورہ، دونون قسمون مین سے نصف نصف سورتون

کے شروع مین لائے گئے ہین، حروف کی ایک اور تقسیم بھی ہے حلقی وغیر حلقی، پہلے حروف تعداد مین چھ ہین اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین لائے گئے ہین، ایک تیسری تقسیم بھی ہے شدیدہ اور منطبقہ، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون قسمون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین موجود ہین، یہ تقسیمین نزول قرآن کے بہت بعد دریافت ہوئی ہین، اس لئے اس متاخر انکشاف کے مطابق سورتون کا افتتاح اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن انسان سے بالاتر ہستی کا کارنامہ ہے،

(۱۱) قرآن کا طرز بیان سادہ آسان اور غیر مانوس بندشون اور الفاظ سے پاک ہے، اس کی ترکیب مین کہین گنجلک نہین، اس کے مضامین ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، مگر اس سادگی کے باوجود بھی قرآن کی مثال نہین لائی جا سکتی کسی بھی انسانی کلام مین یہ خوبی نہین پائی جاتی، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اچھے شاعرون کی نظمون تک مین غیر مانوس الفاظ اور دور افتادہ خیالات بہت پائے جاتے ہین، اور اُن کی ساری کی ساری نظمون مین یکسانی نہیں پائی جاتی، اور ان مین اچھی، بُری، اور اوسط درجہ ہر قسم کی عبارتین ہین،

(۱۲) طویل مضامین اور خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقہ سے ادا کئے گئے ہین، مثلاً آیہ:-

لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ، یعنی قصاص مین تمھارے لئے زندگی ہے،

کا القتل انفی للقتل سے موازنہ آیہ کی برتری ثابت کرتا ہے، اس کی دوسری مثال

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ؕ (قصص ۱)

یعنی ہم نے موسیٰ کی مان پر وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ، اور جب تم اس کے بارے مین خوف زدہ ہو تو سمندر مین پھینک دو، اور ڈرو مت اور نہ رنجیدہ ہو، ہم اُس کو تمھارے پاس لوٹا لائین گے، اور اس کو پیغمبرون مین

ہ، اس آیت میں دو امر و دو نہی کے صیغے، دو خبریں اور دو بشارتیں ہیں،

(۱۳) ایک ہی سلسلہ میں مختلف اقسام کے مضامین کا یکجا کرنا جو انسانی طاقت سے باہر ہے، قرآن میں بعض وقت یہ خوبی ایسے الفاظ کے استعمال سے پیدا کی گئی ہے جن کی مختلف تشریحات ممکن ہیں،

(۱۴) اطلاعات اور پیشین گوئیاں جو آیندہ سچی ثابت ہوئیں، مثلاً یہی دعویٰ کہ مخالفین کبھی بھی قرآن کی مثال لانے میں کامیاب نہ ہونگے یا جنگ بدر کے بارے میں کفار کی شکست کی پیشینگوئی،

(۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدیم صحیفوں سے ناواقف تھے، آپ کو اُن لوگوں سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا جن کو ان صحیفوں کا علم تھا، مگر قرآن میں پچھلی قوموں کے قصے ابتدائے آفرینش یعنی آدم و حوا کا قصہ، اُن کا جنت میں قیام اور پھر وہاں سے نکلنا، طوفانِ نوح اور فرعون کے قصے، انبیاء علیہم السلام کی سوانح اور خصوصیت کے ساتھ ان واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے، جن کے بارے میں امتحاناً دریافت کیا گیا تھا، یہ تمام بیانات اصلی واقعات کے مطابق تھے، اُن کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے علم پر نہ تھی

(۱۶) لوگوں کے دلوں کے راز جن کو وہ چھپاتے تھے، اور جنہیں کوئی بھی معلوم نہ کر سکتا تھا، قرآن نے کھول دیئے، مثلاً

اِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا،	یعنی جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا؛
اور: وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ ان دو میں سے ایک گروہ تمہارے لئے ہوگا، اور تم نے یہ چاہا کہ تمہارے لئے وہ گروہ ہو جو غیر مسلح ہے۔

یہاں جن رازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر نہیں تھے،

(۱۷) قرآن مین علم و حکمت کے ایسے اصول موجود ہین جن سے عرب نابلد تھے،

(۱۸) قرآن مین خالق کے وجود اس کی توحید اور معاد کے ثبوت اور دوسری جماعت سے مقابلہ اور اس کی تردید کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کئے گئے ہین جن کو ایک امی خود اپنی انسانی کوشش سے پیش نہین کرسکتا،

(۱۹) مضامین کو پختگی کے ساتھ ایسے آسان طریقہ سے بیان کرنا کہ سہولت بیان کی وجہ سے کلام میں عامیانہ پن پیدا نہ ہو، اور غیر مانوس مضمون بھی مشکل نہ معلوم ہو، جملے کی ساخت مین آسانی اس کو عامیانہ بنا دیتی ہے اور نادر ترکیبون کا استعمال مشکل بنا دیتا ہے، دونون کا یکجا ہونا غیر مانوس تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام باتون کو بڑی خوبی سے نباہا ہے، اور جہان بھی آسان اور نادر مضمون کو یکجا کیا گیا ہے، وہان ان مین پوری مطابقت ہے اور کوئی اجنبیت نہین معلوم ہوتی،

(۲۰) قرآن کو یاد کرنا اور اس کو اپنے حافظہ مین محفوظ کرلینا آسان ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی کتاب یا صحیفہ قرآن کی برابری نہین کرسکتا، قرآن کو حفظ کرنے مین کسی شخص کی خصوصیت نہین، خواہ وہ عرب ہو یا عجم بالغ ہو یا نابالغ، ہر ایک بڑی آسانی کے ساتھ یاد کرلیتا ہے، ابتدائے اسلام ہی سے ایسے لوگون کی ایک بڑی جماعت ہوتی آئی ہے، اور اب بھی موجود ہے جس نے قرآن کو حفظ کیا ہے، اور کرتی ہے،

(۲۱) قرآن ایک غیر فانی معجزہ ہے، جو ابدالآباد تک رہے گا،

(۲۲) قرآن شریف مین رعب کا ایک ایسا عنصر ہے، جس سے سننے والون اور خصوصیت کے ساتھ کفار کے دل بہت مرعوب ہوتے ہین، جیسا کہ محدثین کے روایت کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے،

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انھون نے کفر کی حالت مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز مین سورۂ طور تلاوت کرتے سنا جب آپ اس آیت پر پہنچے،

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ... کیا اُن کی تخلیق بغیر کسی خالق کے ہوئی ہے

..........................امْ هُمُ یا وہ خود اپنے خالق ہین یا وہ اپنے (تقدیری)

الْمُصَیْطِرُوْن ، معاملات کے خود مالک ہین"

تو اُن کا دل ہیبت سے لرز گیا، اور وہ سمجھے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو ئی، اس طرح اُن کے دل مین ایمان راسخ ہو گیا،

(۲۳) قرآن کے مختلف حصّے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت و مطابقت رکھتے ہین، اور اس مین مختلف اقسام کے مضامین کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اور جب اس کا انداز بیان ایک موضوع سے دوسرے کی طرف جاتا ہی، تو اس تبدیلِ موضوع مین بھی خوبی ہوتی ہے، اور بے لگاؤ نہین معلوم ہوتا، حالانکہ دونون مضمونون مین بڑا اختلاف ہوتا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی سورہ مین جو مختلف مضامین بیش کیے گئے ہیں کہین بھی کوئی خلا، یا بے تعلق تبدیلی نہین معلوم ہوتی، قرآن پاک جگہ جگہ اپنے موضوع کا رُخ وعدے سے وعید کی طرف، ترغیب سے ترہیب کی طرف، ماضی سے مستقبل کی طرف، قصوں سے امثال کی طرف اور حکم سے نزاع کی طرف بدلتا ہے، لیکن اس سے مضمون مین کوئی ناموافقت نہین پیدا ہوتی، جو نہایت ہی مشکل امر ہی، اور موضوع بدلتے وقت غیر موزونیت کا ہونا لازمی ہے، اسی لئے بہت سے شعرا، ایسے مواقع پر ناکام رہتے ہین، بحتری گو عمدہ بندش اور خوبی بیان مین مشہور رہے لیکن جب وہ غزل سے مدح کی جانب آتا ہے تو اس تبدیلی کو وہ مناسب طور پر نباہ نہیں سکتا، اور اس مین ناکام رہتا ہی،

(۲۴) قرآن پاک کی نقل و روایت مین اس توجہ سے کام لیا گیا ہے، کہ اس کے الفاظ، مضامین و ترتیب مین تغیر کا کیا ذکر حرکات تک مین بھی ذرہ برابر تغیر نہین ہوا، ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگون کی بس یہی کوشش رہی، کہ قرآن پاک اُن کے پاس بعینہٖ اسی حالت مین بغیر ذرہ برابر تغیر کے محفوظ رہے جس مین ان تک پہنچا،

(۲۵) آیات کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے قرآن مجید کے مخصوص طرز بیان مین کسی قسم کا فرق نہین پیدا ہوتا، انسانی کلام مین اس قسم کا تفاوت ہونا لازمی ہے،

(۲۶) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والے اس سے کبھی نہین گھبراتے، اور یہ ان کے لئے ہمیشہ تازہ اور نیا رہتا ہے، جو انبساط اور حُسن بیان کا نتیجہ ہے، یہ خوبی کسی کلام مین نہین پائی جاتی، خواہ وہ کتنا ہی شیرین کیون نہ ہو،

(۲۷) جب ایک شخص بلاغت کے مطالعہ مین مشغول ہوتا ہے، تو وہ اس مین ماہر ہو جاتا ہے، اور فصاحت مین عبور حاصل کر لیتا ہے یعنی فصاحت اس کے مطالعہ کو وسیع کرتی ہے، لیکن قرآن پاک اُس شخص کو فصیح و بلیغ نہین بناتا، جو اس کو مسلسل پڑھتا رہتا ہے، اور اس مین لگا رہتا ہے، یہ خصوصیت صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہے (تاکہ دوسری بلاغت کی کتابون سے ممتاز رہے)

(۲۸) قرآن شریف مین اگر کوئی بھی اضافہ کیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ تمیز کی جا سکتی ہے، اور اگر الفاظ مین کوئی تبدیلی کیجائے، تو وہ بھی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، اور چھپائی نہین جا سکتی،

(۲۹) قرآن کے مخالفین اس کی مثال لانے سے قاصر رہے، باوجودیکہ اس کا یہ دعویٰ اب بھی قائم ہے، اور اس کی مثال لانے سے اپنی ناقابلیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے،

ان کا حسد کچھ کام نہ آیا، اور انھون نے اس کی مثال لانے سے مایوس ہو کر تلوار سے لڑنے کو ترجیح دی جس کے نتیجہ مین اُن کے آدمی قتل و غارت ہوئے اور قیدی بنائے گئے،

(۳۰) علامہ ماوردی کے نزدیک سب سے آخری وجہ الصرفہ ہے یعنی خود قرآن نے اپنی مثال لانے سے مخالفین کا منھ پھیر دیا، اس بارہ مین اختلاف ہے کہ آیا قرآن کی مثال لانا اُن کے بس ہی مین نہ تھا، یا یہ کہ ان مین اس کی صلاحیت تھی، مگر سلب کر لی گئی تھی، پہلا عقیدہ معتزلہ کا ہے اور دوسرا اہل سنت کا، چونکہ فلسفیانہ نازک مسئلہ ہے، اس لئے مین اس بحث مین نہین پڑنا چاہتا،

کیا قرآن مین سجع ہے؟ پچھلے صفحات مین بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک کا ایک جداگانہ طرز بیان ہے جسے نہ تو نثر کہا جا سکتا ہے، اور نہ نظم، اب اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے، نثر چونکہ عموماً مسجع ہوتی تھی اس لیے پہلے

اسی کو لینا چاہئے، اس مسئلہ مین اختلاف ہو کہ قرآن مین سجع ہے یا نہین، علماء کی ایک جماعت جو سجع کو حسن بیان اور فصاحت کا جزو تصور کرتی ہے، اس خیال کی ہے کہ قرآن مین سجع ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى، ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے،

مین ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھا گیا ہے، حالانکہ معکوس ترتیب عموماً استعمال ہوتی ہے، جیساکہ دوسری آیتون مین ہے، مگر یہ تبدیلی (یعنی ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھنا) سجع کی غرض سے کی گئی ہے، سجع کا تقاضا ہو کہ اس جگہ الف مقصورہ ہو، یہان یہ نہین کہا جا سکتا کہ یہ تغیر بے ارادہ ہوا ہے، جیساکہ اس جگہ کے لئے کہا جاتا ہو جہان کوئی قرآنی آیت وزن شعری کے مطابق پڑ گئی ہو جس کی مثالین بہت ہین،

علامہ باقلانی کی رائے سجع کے خلاف ہو، وہ لکھتے ہین، "قرآن مین سجع ہونے کی جو یہ دلیل پیش کیجاتی ہو وہ پوری طرح صحیح نہین معلوم ہوتی، اول یہ کہ قرآن مین اگر سجع ہوتا، تو وہ عربون کے طرز بیان سے جداگانہ نہ ہوتا، اور اس صورت مین اس کی مثال لانا ممکن ہوتا، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ قرآن کا سجع بھی غیر ممکن المثال ہے لیکن قرآن کو شعر ماننے کی صورت مین بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی، اور پھر اس کے کوئی معنی نہ رہ جائین گے کہ قرآن شعر نہین ہو، دوسرے یہ کہ سجع شاعری کی بنیاد ہے، یعنی وہ شاعری کا پہلا درجہ تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے شاعری کی موجودہ صورت اختیار کر لی، قرآن مین شاعری کی مذمت اور اس سے احتراز کا اعلان اس شدت سے کیا گیا ہے کہ دونون مین دور کا تعلق بھی نہین مانا جا سکتا، اور قرآن مین سجع ماننے کی صورت مین اس تردید کا زور باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، تیسرے یہ کہ جاہلیت کے کاہن سجع سے واقف تھے، خود قرآن شریف اور حدیث نبوی دونون نے اس کا انکار کیا ہے،

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یعنی کسی کاہن کی تصنیف نہین ہے،

ایک مرتبہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے جنین کے بارے مین کہا:-

كَيْفَ نَدِيْ مَنْ لَا شَرِبَ وَلَا اَكَلَ — اس کا انتقام کیسے لین جس نے کھایا نہ پیا،

وَلَا صَاحَ فَاسْتَهَلَّ اَلَيْسَ دَمُهُ — اور نہ آواز کی، کیا اس کا خون بغیر انتقام

قَدْ يُطَلُّ، — کے رہے گا؟

آنحضرت صلعم نے جواب مین فرمایا :-

" اَسَجَاعَةً كَسَجَاعَةِ الْجَاهِلِيَّةِ — یعنی کیا یہ جاہلیت کی سی سجع ہے، یا کاہنون

اَوْ اَسَجْعًا كَسَجْعِ الْكُهَّانِ — کی سی،

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم سجع کو برا سمجھتے تھے،

اب ان آیات کا سوال رہ جاتا ہے جو بظاہر سجع معلوم ہوتی ہین، لیکن درحقیقت وہ سجع نہین ہین، بعض موقعون پر قرآنی ترکیب سجع کے طرز کی ضرور ہے، مگر وہ حقیقۃً سجع نہین، سجع کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اور معنی و مضامین کی کم اور قرآن مین زیادہ اہمیت معنی کی ہے، اوران دونون مین بڑا فرق ہے،

اس کے علاوہ سجع جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک مخصوص طرز ادا کا نام ہے جس مین اگر ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا جائے، تو کلام انمل بے جوڑ ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری فصاحت خاک مین مل جاتی ہے، جیسا کہ اگر شاعری مین اس کے اصول کا خیال نہین کیا جاتا، تو وہ شعر نہین رہ جاتا، اور اس کی فصاحت بھی ختم ہو جاتی ہے، بعض آیات قرآنی جن کو سَجع کہا گیا ہے، وہ دراصل سجع کے اصولون کے مطابق نہین ہین، کیونکہ اُن کے بعض جملے چھوٹے اور بعض اتنے لمبے ہین کہ سجع کا حرف اس وقت آتا ہے، جب کہ دوسرا جملہ پچھلے کا دوچند ہو جاتا ہے، جو سجع کے لئے ناپسندیدہ اور فصاحت کے خلاف ہے، اس سے قرآن کی فصاحت مین خلل ماننا پڑے گا، جس کو اس کے مخالفین بھی نہین کہتے، اگر ایسا ہوتا تو مخالفین خاموش نہ رہتے، انھون نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا، اور اس کو سحر کبھی نہ کہتے اس لئے سجع کو آیات قرآنی پر منطبق نہین کیا جا سکتا،

آیاتِ قرآنی کے آخری حروف فواصل خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص طرز کے ہیں، ان میں اور سجع و شعر کے قافیہ میں کوئی چیز مشترک نہیں، ایک آیت میں ہارونؑ کو اول اور موسیٰؑ کو بعد میں اور دوسری جگہ اس کے برعکس رکھنے کی وجہ سجع نہیں، بلکہ اس سے مقصود ایک مفہوم اور ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ میں بیان کرنا ہے، جو لوگ فنِ بیان کے ماہر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ اور مختلف طریقوں سے بیان کرنا کتنا مشکل ہے، اس میں فصاحت کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ اور مختلف پیرایوں میں بار بار بیان کرنے کے باوجود اپنی فصاحت کے معیار کو قائم رکھا ہے، اور تکرار کی وجہ سے اس کی بلاغت میں کہیں بھی خامی نہیں پیدا ہوئی، اور یہ تنوع بھی اس خوبی کا ایک رُخ ہے جس نے قرآن کو معجزہ بنا دیا، الفاظ کو آگے پیچھے رکھنے کا مقصد دوسرا ہے، اور سجع سے فواصل کی یہ ظاہری مشابہت آیاتِ قرآنی کو حقیقۃً سجع کے زمرے میں نہیں لاسکتی،

قرآن شاعری نہیں | شاعری کے تمام اصناف عربوں میں عام تھے، یہاں تک کہ لڑکے بھی نظمیں کہا کرتے تھے، اور اس میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتے تھے، پچھلے صفحات میں یہ بات بار بار کہی جا چکی ہے کہ قرآن پاک کا طرزِ بیان شاعری سے مختلف ہے، اور یہ فرق قرآن کے معجزہ ہونے کی وجہ ہے، ورنہ اگر قرآن شعر ہوتا تو اس کی مثال لانا ممکن ہوتا،

قرآن بڑے زور و قوت سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ شعر نہیں ہے، حسب ذیل آیات اس کی شاہد ہیں،

(۱) وَمَا علمناہُ الشِّعرَ :- ہم نے رسول کو شعر نہیں سکھایا،

(۲) وَمَا هُوَ بقولِ شاعرٍ :- اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں،

قرآن پاک کی آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن پاک ایک شاعر کا کلام ہے، اس اعتراض کی تحقیق بہت آسان ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جب مخالفین قرآن اس کے طرزِ بیان

پر متحیر ہوئے، قرآن کو بے اصل اعتراضات پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ انھوں نے کبھی کہا کہ یہ شاعری ہے، اور کبھی دعوی کیا کہ کسی کاہن کا کلام ہے، علامہ باقلانی کا خیال ہے کہ ان اعتراضات سے مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو شاعری ہی کی کوئی صنف سمجھتے تھے، (مگر پورے طور پر نہیں) جس سے وہ آشنا نہ تھے، اس پر شعر کا اطلاق انھوں نے اس وجہ سے کیا تھا کہ قرآن فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، یعنی جس معنی میں فلسفیون نے شعر کو لیا ہے اگرچہ اہل عرب کے نزدیک شاعری کی تعریف دوسری تھی، ایک اور ضعیف وجہ یہ بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ عوام نے اوزان شعر سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو شعر کہہ دیا،

قرآن مین ایسی آیات بھی ہین جو وزن مین مصرعہ سے مطابقت رکھتی ہین، علامہ باقلانی نے ان آیات کو مع اوزان کے پیش کیا ہے، اختصار کے خیال سے یہان صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

وجفان کالجواب وقدور راسیات	اور پانی کے بڑے بڑے برتنوں جیسی نادین
. . . .	اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگین (دسلیمان
. . . .	کے تابع جنات اُن کے لئے بنایا کرتے تھے)

لیکن اس اعتراض کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کہتے کسے ہین، شعر کی تعریف ہے کہ

"وہ کلام جو ارادۃً مقفی رکھا گیا ہو، اور جو وزن پر منطبق ہو، اور جو اپنی جگہ پر، مکمل تخیل پیش کرنے کیساتھ ساتھ ایک سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو شعر کہا جاتا ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ شعر کے لئے دو شرطین ہین ایک یہ کہ وزن اور قافیہ ارادۃً ہو، اور دوسری یہ کہ اس مین ایک ایسے زیادہ اشعار ہونے چاہئین، اور قرآن پاک کی بعض آیات غیر ارادی طور پر علم عروض کے مطابق ہین، جیسے بعض اوقات روزمرہ کی گفتگو مین بھی اتفاقاً کوئی فقرہ شعر کے وزن پر ہوجاتا ہے جیسے کوئی کہے : .

اغلق الباب واتنی بالطعام   یعنی دروازہ بند کرلو اور میرے لئے کھانا لاؤ،

یا ۔ اسقنی الماء یا غلام سریعا، یعنی اے لڑکے مجھے پانی جلدی پلا،

یہ جملے وزن کے مطابق ہین، مگر ایسا ارادۃً نہین کیا گیا، اس لئے اُن کو شعر نہین کہا جا سکتا، اس کے علاوہ دوسری شرط کہ شعر مین ایک سے زیادہ بیتیں ہونی چاہئین، قرآن پاک کی آیات پر منطبق نہیں ہوتی، دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شعر ہوتا، تو یہ حقیقت یقیناً مخالفین قرآن کے علم مین ہوتی، اور بغیر کسی پس و پیش کے وہ یہ سمجھتے کہ قرآن شعر ہے، اور یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ پچھلے لوگون نے وہ سمجھا جس کو معاصرین نہ سمجھ سکے تھے، ایک اور جواب یہ ہے کہ اگر مخالفین قرآن نے اس کو شاعری سمجھا ہوتا، تو انھون نے اس کا مقابلہ کیا ہوتا، کیونکہ تمام اصناف شاعری پر انھین قدرت حاصل تھی، قرآن شریف کی مثال لانے سے اُن کی عاجزی اس بات کا بین ثبوت ہو کہ وہ قرآن کو شاعرانہ کلام تصور نہ کرتے تھے،

قرآن کے معارضین تاریخ مین ایسے چند لوگون کے نام بھی ملتے ہین، جنھون نے پچھلی ۱۴ صدیون کے دوران مین یا تو خود قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا دوسرون نے اُن کی تصنیف کو قرآن کے مقابلہ مین پیش کیا، ایسے لوگ دو قسم کے ہین (۱) وہ جنھون نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا، اور جھوٹا الہامی کلام بھی پیش کیا (۲) وہ جنھون نے محض فن کی حیثیت سے کچھ لکھا، او تھون نے یا دوسرون نے سمجھا کہ اس کو قرآن شریف کے مقابلہ مین پیش کیا جا سکتا ہے پہلی قسم کے لوگون مین پانچ نام لئے گئے ہین، اُن کے اس مشن کا نتیجہ خود ان کے انجام سے ظاہر ہے، ان مین سے دو تو بغیر کسی کامیابی کے مارے گئے، دو مسلمان ہو گئے، اور پانچوان اپنی معمولی حالت پر آگیا،

(۱) مسیلمہ یمامہ کا رہنے والا تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام مین پیغمبری کا دعویٰ کیا، اُس نے مدینہ آنے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ڈھونگ رچایا، اس سے اس کا مقصد بادشاہت کا حصول تھا، چنانچہ اُس نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین صلح کی یہ شرط پیش کی کہ آپ اس کو اپنا شریک بنا لین یا اپنا جانشین مقرر کر دین، اس کا یہ دعویٰ تھا کہ رحمان نامی فرشتہ اس پر قرآن لایا تھا، جس مین فصلین اور

جملے تھے، اس کا دعویٰ تھا کہ منصب پیغمبری بھی کہانت کا جز و ہے، اس لئے اس کا کلام کاہنون کی سجع کے مشابہ تھا، اس کا نمونہ یہ ہے:۔

الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل	(یعنی ہاتھی ! ہاتھی کیا ہے، اور تم نے یہ کیسے
لہٗ ذنب وبیل وخرطوم طویل،	جانا کہ ہاتھی کیا ہے، اس کے ایک سخت دم ہے
	اور لمبی سونڈ،

اس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا کلام احمقانہ اور ذلیل خیالات سے بھرا ہوا تھا، اس کے انجام نے ثابت کر دیا کہ نہ وہ پیغمبر تھا اور نہ اس کا کلام وحی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ اول نے ایک بہت بڑی فوج بھیجکر اس کا خاتمہ کرایا، اُس نے اپنا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا، جو اس کا ذکر زندہ رکھتا اور صرف مسلمانون کی تاریخون مین اس کا ذکر آتا ہے،

(۲) اسود عنسی اُس کا نام ابہلہ تھا، یمن کا رہنے والا تھا، اپنی فصاحت و بلاغت، خطابت، شاعری سجع اور کہانت مین مشہور تھا، اُس نے آنحضرت صلعم کے آخری عہد مین دعویٰ کیا کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہین کیا، جب مفروضہ وحی اس پر نازل ہوتی تو وہ اپنے سر جھکا لیتا، اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو اٹھا کر کہتا، وہ (خدا) مجھ سے یہ باتین کہتا ہے یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چوبیس گھنٹے قبل مارا گیا،

(۳) طلیحہ بن خویلد قبیلۂ اسد کا آدمی تھا، اور عرب کے بہادرون مین گنا جاتا تھا، وہ اپنے قبیلے کے وفد کے ساتھ ۹ھ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آیا، اس کے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، جن مین وہ بھی تھا، جب وہ وطن واپس آگیا، تو پیغمبری کا دعوی کر بیٹھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبیلہ مین بڑا مرتبہ حاصل کر لیا، اس کا دعوی تھا کہ کوئی ذوالنون نامی اُس پر وحی لاتا تھا، لیکن اس نے بھی اس کو قرآن نہین کہا، اس کے ساتھ کچھ فصیح لوگ تھے، جو اس کا اتباع

محض فرقہ بندی کے جذبہ اور باد شاہت حاصل کرنے کی غرض سے کرنے لگے، اس کی صرف ایک وحی یاقوت نے نقل کی ہے، خلیفہ اوّل نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، فریقین مین جنگ ہوئی، اورانجام کار طلیحہ شکست کھا کر ملک شام کو بھاگ گیا، اس کے بعد پھر مسلمان ہو گیا، اور جنگ قادسیہ میں بڑی شجاعت دکھلائی،

(۴) قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح بنت حارث اپنے ننھیالی خاندان بنو تغلب مین رہتی تھی، یہ قبیلہ عیسائی تھا، سجاح نے اُن کے مذہبی گیت یاد کرکے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پیغمبری کا دعوی کر دیا، قبیلہ کے چند لوگون نے اس کی پیروی کی، ان کو ساتھ لے کر اس نے خلیفہ اوّل کا مقابلہ کیا، راستہ مین بعض قبیلون سے لڑی اور بعض سے صلح کی، اسی زمانہ مین مسیلمہ کی قوت بھی بڑھ رہی تھی، وہ سجاح کے اس پروپگنڈے کا حال سُن کر خوفزدہ ہوا، اور اس سے مل کر شادی کا پیام دیا، سجاح نے منظور کر لیا، اور دونون کی شادی ہو گئی، سجاح نے بھی اپنی وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہین کیا بلکہ اسود اور طلیحہ کی طرح اس کا صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اور کچھ مسجع عبارت بھی تیار کر لیتی تھی، مسیلمہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا دعویٰ ترک کر دیا، اور دوسری مرتبہ اسلام مین داخل ہو کر اپنی بقیہ زندگی ایک مسلمان کی حیثیت سے گذار دی،

(۵) مشہور شاعر احمد بن الحسین متنبی نے جو ۳۵۴ھ مین مارا گیا، اپنی زندگی کے ابتدائی ایام مین پیغمبری، اور اپنے اوپر ایک قرآن نازل ہونے کا دعوی کیا، کچھ لوگ اُس کے پیرو ہو گئے، لیکن بعد مین وہ اس دعوی سے باز آگیا، اور اپنی بقیہ زندگی ایک معمولی انسان کی طرح گذار دی،

دوسری قسم کے لوگون مین چار نام بتائے گئے ہین :-

(۱) نضر بن حارث یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصر تھا، اس کی لڑکی کے اشعار حماسہ مین درج ہین، اُس نے پیغمبری کا دعوی تو نہین کیا، لیکن کچھ لوگون کا خیال تھا کہ اُس نے اہلِ عجم کی تاریخ اور ان کے

ایسے قصے بیان کرکے جن سے عرب بالکل واقف نہ تھے، قرآن کا مقابلہ کیا، اس دعوی کی حماقت کی بنا پر کسی مورخ نے اس کی عبارتوں کا نمونہ تک دینا گوارا نہین کیا،

(۲) ابن مقفع اپنے زمانہ کا فصیح و بلیغ مصنف تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو قرآن کے مقابلہ کے لئے وقف کردیا، لیکن پھر جو کچھ لکھا تھا، چاک کر دیا، اور اس کو ظاہر کرنے مین بھی شرم محسوس کرنے لگا، دہریون کا خیال ہے کہ اس کی الدرۃ الیتیمہ قرآن کے مقابلہ مین لکھی گئی تھی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہین ہے، کہ ابن مقفع نے کبھی قرآن کے مقابلہ کا دعوی کیا ہو، یہ محض دہریوں کی من گھڑت ہے کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا تھا، اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارہ مین متہم تھا،

(۳) راوندی موسوم بہ احمد بن یحیٰی ابوالحسین متوفی ۲۹۳ھ یہ بھی دہریہ تھا، اس نے مذہب کے خلاف بہت سی کتابین لکھین، اور کہا جاتا ہے کہ التاج لکھ کر قرآن کا مقابلہ بھی کیا، ابوالفدا کا بیان ہو کہ مسلمان علما نے راوندی کے تمام دلائل کی تردید کی، خاص کر اس دعوی کی کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا مگر اس کا کوئی ثبوت نہین کہ اس نے قرآن کے مقابلہ کے لئے التاج لکھی تھی، قیاس یہ ہو کہ اس نے دوسری کتابون کی طرح اس مین بھی اعجاز قرآنی کے خلاف دلائل پیش کئے ہون گے، معری نے اپنی کتاب الغفران مین راوندی کی التاج کے بارے مین لکھا ہو:

واما التاجه فلا يصلح ان يكون نعلا وهل تاجه الا كما قالت الكاهنة اُفٍ وتُفٍ،	رہی اس کی کتاب التاج تو وہ جوتی ہونے تک کے قابل نہین، اس کی کتاب التاج کی کوئی حقیقت نہین، بجز اس کے جیسا کہ کاہنہ نے اس پر تف کیا ہے،

(۴) ابوالعلاء معری متوفی ۴۴۹ھ کے بارے مین کہا جاتا ہے کہ اس نے الفصول والغایات فی

فی مجاراۃ السور والآیات لکھ کر قرآن کا مقابلہ کیا لیکن معری پر دہریون کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہے،

اس الزام کے خلاف ایک بین ثبوت یہی موجود ہے کہ خود معری نے اپنی کتاب الغفران مین اپنے خیالات

کا یون اظہار کیا ہے،

واجمع ملحد ومھتد ان ھذا الکتاب	ملحد اور مومن سب ہی اس بات پر متفق ہین
الذی جاء بہ محمد صلی اللہ علیہ	کہ محمد کی لائی ہوئی کتاب اپنے معجزے کی وجہ
وسلم کتاب بھر بالاعجاز ولقی	سے سب پر چھا گئی، اور اپنے دشمن کا مقابلہ
عدوہ بالارجاز ماحوی علیٰ	سزاوہی کے ساتھ کیا، یہ کتاب کسی خاص
مثال ولا اشبہ غریب الامثال	نمونے پر تیار نہین کی گئی، غیر مانوس طرز بیان
ما ھو بالقصد الموزون ولا رجز	سے مشابہت نہین رکھتی، یہ نہ تو مقفی نظم ہے اور
ولا شاکل خطابۃ العرب ولا	نہ رجز، اسے نہ تو عربون کی خطابت سے کوئی
سجع الکھنۃ،	مشابہت ہے اور نہ کاہنون کی سجع سے"،

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے مقابلہ مین پیش کی گئی ہے، اس کا نام الفصول والغایات ہے اور

یہ الفاظ "فی مجاراۃ السور والآیات" محض تہمت کی بنیاد پر اضافہ کرلئے گئے ہین،

مصر کے ایک جدید رسالہ الزہراء جلد اول ص ۳۰۱، ۳۱۰ اور ۵۸۹ مین اس کتاب کا ذکر آیا ہے

اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرز قرآن شریف سے بالکل مختلف ہے، معری پر قرآن

کے مقابلہ کا الزام لگانا بالکل غلط ہے، ذاتی اور ملحدانہ خیالات سے قطع نظر اس نے قرآن کے بارے

مین بڑی ہی عمدہ رائے دی ہے،

رحمت عالم

ملا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل

از

سید سلیمان ندوی

استاد ملا احمد معمار کے جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عمارتیں بنوائی تھیں، اور اسکی فاضل و نامور اولاد کے احوال پر جو مقالہ مین نے کچھ سال پہلے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور مین پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف مین چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس مین اضافہ کی گنجایش نہ تھی، لیکن چونکہ تلاش و تفحص برابر جاری رہی، اس لئے ان مین سے بعض کی مزید تصنیفات ہاتھ آتی رہین، جن کی بناپر اُن کے متعلق معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد ملا لطف اللہ مہندس کی تصانیف مین ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] مین ملا جو فصاحت و بلاغت کے فن مین فارسی مین شاہزادی زیب النسا کے لئے مصنف نے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف مین اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہوا ندوہ ہی کے کتب خانہ مین اتفاق وقت سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالون کا ایک قلمی مجموعہ[2] کئی سال ہوئے کہ نظر سے گذرا تھا، مین نے اس کی یادداشت لے لی تھی، لیکن اس کی تکمیل اس لئے نہ ہو سکی کہ دل و دماغ اب ان مباحث سے اُچاٹ ہو چکے ہین، اور اب کوئی اور رنگ طبیعت پر غالب ہے مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہین ہو سکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی"

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابون مین،

[2] واحد علی سندیلوی کی کتابون مین،

کے نام سے میرے بیس پچیس مضمونوں کا مجموعہ[1] چھاپا ہے، اس میں یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے کہ تحقیق کے میدان میں ایک قدم کی اور وسعت پیدا ہو جائے،

رصدخانہ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ مہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالوں پر مشتمل ہے، پہلا طب میں ہے، دوسرا تصوف میں، اور تیسرا نجوم میں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعبیر میں ید طولی رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے اور منجم بھی، اب ذیل میں تینوں رسالوں کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے:

۱۔ پہلے رسالہ کا نام **التتبع الثوابت** ہے یہ طب میں ہے اور عربی زبان میں ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے کسی معاصر طبیب نے **التتبع السیارات** کے نام سے سات مسئلوں کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا تھا اُسی لئے اس کا نام التتبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب میں التتبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ میں جن سات مسئلوں پر بحث ہے، وہ یہ ہیں، (۱) دردسر کی حقیقت (۲) دوا معتدل کے معنی (۳) خلط کی تعریف، (۴) اخلاط کی تعداد، (۵) مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان میں (۶) گھوڑے ہونے کے کچھ حصہ میں کیا کھو کھلا پن ہے، (۷) ادھیڑ عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ ۱۱۴۹ھ میں لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام **الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیۃ الحقیقیۃ** ہے یہ تصوف میں وحدۃ الوجود کی تحقیق میں ایک عربی رسالہ ہے جس میں اس مسئلہ کے باب میں چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۵۱ھ ہے،

۳۔ تیسرے رسالہ کا نام **مدخل** ہے، یہ فارسی نظم میں نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع میں اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب میں

---

[1] پتہ: تیغیق احمد، سکونت کلاں، بہار شریف پٹنہ اور محمد سلیمان اشرف ۶/۲ بتیا پوکھر روڈ کلکتہ ۱۴

اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرسالہ

بندۂ ذرّہ وار خیراللہ | کہ نہ دارد بہ اہلِ دنیا راہ
لیکن از محض فضل لطف وعطا | شاہ والا نژاد بحرِ سخا
بازوے داورِ زمین و زمان | وارثِ حاکمِ مکین و مکان
مرشدِ فیض بخش، دین پرور | قبلۂ اہلِ حق بلند اختر

دوسرے شعر مین "لطف وعطا" مین ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اُس کے باپ کا اور عطاء اللہ اس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعرون مین غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ مین لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے اس لئے اس کے شہزادون مین سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اُس کے شہزادون کے نام پیش نظر نہین، اس لئے تعیین نہ کرسکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف والتاریخ" کے عنوان سے ہے، جس مین مؤلف نے اپنے بزرگون کا حال بتایا ہے،

بہ مہندس شہیر در افواہ | والد این فقیر لطف اللہ
کسب این علم از پدر فرمود | نادر العصر آن کہ احمد بود
ہست از علم این حقیر نحیف | در ریاضی رسالہ ہاے لطیف
در ریاضی ہمین برادر من | چند تصنیف ہست در ہر فن
ہم ازین ذرّہ وار تصنیفات | ہست گز درج جل واد نکات

نظم این چند گوہر دل خواہ   در ہزار است و یکصد و پنجاہ

پہلے شعر مین مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے مین اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہین بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر مین اس کا نام مذکور ہے، یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر مین ہے :-

"از تصانیف نادر العصر معلم عالمیان مرزا ابو الخیر عرف خیر اللہ غفر لہ ذنبہ لقیلہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخون کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۱۸ھ سے سنہ ۱۱۶۵ھ تک تقریبًا چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابون کی تصنیف مین رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل مین اس کی تصنیفات کے سنین یکجا لکھدیئے جاتے ہین،

۱- الرسالۃ القدسیۃ	سنہ ۱۱۱۸ھ	۴- مدخل فی النجوم	سنہ ۱۱۵۰ھ
۲- البیع الثوابت	سنہ ۱۱۱۹ھ	۵- تقریب التحریر	سنہ ۱۱۶۱ھ
۳- شرح زیج محمد شاہی	سنہ ۱۱۴۰ھ کے بعد	۶- حاشیۂ شرح بیت باب	سنہ ۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمین یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور مین تھا، پھر یہ دہلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ مین مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرمئوی لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود مین ایک بستی ہے، سمجھ مین نہین آتا کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام مین چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر مین حاشیہ شرح چغمنی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح مین اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے دیکھیے تصریح ص ۱۳، و ۲۴۲، مطبوعہ مجتبائی۔

امام الدین نے تصریح مین (ص۵۱ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے، جس کا ذکر گذشتہ مضمون مین نہین آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑون اور گہرے غارون کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اُس کے جواب مین محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتوین حصہ سے اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہین محقق رومی نے شرح چغمنی کے حاشیہ مین اس جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب مین یہ رسالہ لکھا ہے۔

باب المراسلۃ والمناظرۃ

طنز لطیف

از

از جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری حکومت صوبہ متحدہ

راج رشی ٹنڈن جی نے چند دنون سے ہندو مسلمانون مین ازدواج کی تحریک شروع کی ہے، اس کی مصلحت جو بھی بیان کیجائے لیکن ٹنڈن جی کے خیالات کے پیش نظر اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہین ہو سکتا کہ شادی بیاہ کے ذریعہ مسلمانون کو ہندؤون مین ضم کر لیا جائے یا کم از کم ان کا کلچر بدل کر اُن کی امتیازی حیثیت ختم کر دیجائے، وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری نے بھی اس تحریک کے بارے مین پائنیر مین اپنے خیالات ظاہر کئے تھے جن سے بظاہر ٹنڈن جی کی تجویز کی تائید ہوتی تھی، اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی اس کی مخالفت مین شذرات لکھے تھے اب وحید احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کا مضمون طنزیہ و مزاحیہ تھا، اور اس میں انھون نے ٹنڈن جی کی تجویز کا مذاق اڑایا تھا، اس کو سنجیدگی پر محمول کرنا معترضین کا قصور فہم ہے لیکن عجیب اتفاق ہے یا معترضین کی بدذوقی کہ ان مین سے کسی کو بھی طنز اور سنجیدگی مین امتیاز نہ ہو سکا، اور سب نے اسے سنجیدگی پر محمول کر کے اس کی مخالفت مین مضامین لکھے، لیکن لکھنے والے کو اپنی تحریر کی تشریح کا زیادہ

حق ہے اس لئے ہم کو وحید احمد صاحب کے بیان کے ماننے مین تامل نہین ہے، اور اس سے مسرت ہوئی
کہ الحمدللہ اس مسئلہ مین وہ جمہور مسلمانون کے ہم عقیدہ ہین، وہ اپنا یہ جواب اخبارات مین بھی
شائع کرا چکے ہین، اس کے بعد **معارف** مین اس کی اشاعت کی ضرورت نہین تھی لیکن ان کا
اصرار ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے، باقی انھون نے مسلمانون کی جس ذہنیت اور احساس کمتری
کی جانب اشارہ کیا ہے اس کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہین ع :-

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

البتہ اس دعا مین ہم اُن کے ساتھ شریک ہین، کہ اللہ تعالیٰ مسلمانون کو قوتِ ایمانی عطا فرمائے آمین

"م"

جناب محترم ایڈیٹر صاحب رسالہ معارف :-

السلام علیکم،

رسالہ معارف مین "مختلف فرقون مین شادیان" والا بصیرت افروز نوٹ دیکھا، مسرت ہے کہ ایک
مغالطہ کی وجہ سے ایک خاص مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت آپنے گوارا فرمائی لیکن افسوس ہے کہ اس نوٹ
کی بنیاد میرے پاینیر والے مضمون پر رکھی گئی ہے، اگر آپ اجازت دین، اور گستاخی معاف کردین تو مین
وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ میری تحریر آپ کی نظر سے نہین گذری، بلکہ کسی اور صاحب نے آپ سے اس کا تذکرہ
کیا ہوگا، ورنہ نہ اس قدر مغالطہ پیدا ہوتا، اور نہ آپ کو سخت تکلیف پہنچتی، مین کہہ سکتا ہون کہ آپ کی
اس سخت تکلیف کے باعث وہ سخن فہم ہین جنھون نے آپ کو وہ مضمون سنایا، اور مین نہین ہون، مگر باین ہمہ
مجھے سخت ایذا ہوئی، اور میری گردن شرم سے جھکی جا رہی ہے، اس امر کی کہ باعثِ تکلیف مین نہین ہون
میرے مضمون کی وضاحت بہترین شہادت ہو سکتی ہے،

آپ کا آخری قیاس صحیح ہے جو آپنے میرے مضمون سے سمجھا کہ ٹنڈن جی کی یہ تحریک مسلمانون کی

ی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھی، یہی احساس تھا جس کے ماتحت وہ مضمون لکھا گیا تھا، میرے
ں کی سرخی تھی Tandon ji The grand mughal یہ سرخی بولتی ہوئی تھی، اس کا ترجمہ
لم ٹنڈن جی" نہیں ہو سکتا، بلکہ ٹنڈن جی مغل اعظم کے بھیس میں" ہو سکتا ہے، اردو میں میں نے اپنے اس
ں کی سرخی "ٹنڈن جی کی اپج" رکھی تھی، اور یہ مضمون قومی آواز اور ذوالقرنین میں شائع ہوا تھا، مذاق سلیم
ست ان سرخیوں سے ثابت کر رہی ہیں کہ مجھے اکبر اعظم پر بھی اعتراض تھا، چہ جائیکہ ٹنڈن جی، اب
ں کو کیا کروں کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں ٹنڈن جی کو اعزازی لقب اکبر کا دے رہا ہوں، میں نے اس
میں مزاح اور طنز آمیز ظرافت سے کام لے کر ٹنڈن جی کو جواب دیا تھا کہ اکبر نے بھی یہی تحریک شروع
، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہم مذہب اس سے خفا ہو گئے، مگر تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہو گیا، اسی
ٹنڈن جی سے اُن کے ہم مذہب خفا ہو جائیں گے، اور راج رشی کا لقب چھین لیں گے، مگر تاریخ
ن کی خوبیاں یادگار رہیں گی، ابھی تک ٹنڈن جی زبان و کلچر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، اب
ں تحریک سے ان کے گذشتہ منصوبوں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے، کیونکہ مشترکہ شادی سے نئی زبان
ے کلچر اب وجود میں آئیں گے لیکن مسرت ہے کہ غلط روی نے ٹنڈن جی کو صحیح راستہ پر لگا دیا، اور
ریک شروع کر دی،........ مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب سے شادی کا جواز پہلے سے موجود
ب مسلمان اگر کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ ہندو اہل کتاب ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں، تو ہم
ں تحریک کو لبیک کہنے کو تیار ہو سکتے ہیں،...... ہر قوم اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے گئے ہیں ہندوستان
ں کوئی نبی آیا ہو گا،..... وغیرہ وغیرہ،

ملاحظہ ہو کہ باہمی شادی پر مسلمانوں کے متعلق کتنے بریک لگا کر میں نے بات کہی ہے، گویا اس امر
ں مفتی و مفسر نہیں بنا ہوں، بلکہ مستفسر کے حدود میں رہا ہوں،

معارف:۔ مذکورہ انگریزی فقرے کا یہ مفہوم صرف مضمون نگار ہی کے ذہن میں آسکتا تھا،

یہ شگفتہ ڈھنگ میں نہیں سمجھ سکتا کہ متانت و سنجیدگی کا کبھی بھی پہلو اختیار کر سکتی ہے، اس اظہار کے بعد باعثِ مغالطہ ہونے کا مجھے اعتراف ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے، احساس کمتری کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ نظر قطعی بندہ کر رہ گئی ہے، لہٰذا تمنا اور دعا ہے کہ خداوند کریم مسلمانوں کو اپنی رحمت سے قوتِ ایمانی مرحمت فرمائے، اور اُن کے صدقہ میں مجھ گنہگار کو، آمین،

مجھے امید ہے کہ میری اس معذرت اور وضاحت کا تذکرہ رسالہ معارف میں شائع فرما کر میری خفت و ندامت کو دور کرنے کی سعی فرمائیے گا،

نیازمند :- "وحید احمد"

استفسار و جواب

تقویم الابدان

قاضی نورالدین حسین صاحب
رانچند دیپ چند لائبریری بھروچ بمبئی

مکرمی جناب مدیر صاحب معارف اعظم گڈھ،

سلام مسنون

براہ کرم ذیل کے استفسار کا جواب بذریعہ معارف تحریر فرما کر مشکور فرمائیں، صوبہ گجرات کے ایک قصبہ آنکلیسر (ضلع بھروچ) مین ایک رئیس سید محمود علی بن سید غلام علی انعامدار صاحب کے کتب خانہ مین طب کی ایک عربی قلمی کتاب تقویم الابدان مصنفہ و مرتبہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ (کتابت ۵۸۶ھ) کا نایاب نسخہ ہے حضرت قبلہ ... مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے مذکور کتاب کے متعلق نقوش سلیمانی مین اپنے سفرنامہ مین ذکر فرمایا ہے، اس راقم الحروف نے بھی معارف کے گذشتہ جولائی ۱۹۷۰ء کے پرچہ مین ضمیمہ گجرات کے کتب خانہ کے عنوان والے مضمون مین حکیم روح اللہ بھروچی جہانگیری کے کتب خانہ کی کتاب کے ذکر مین اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کتاب کے کہان کہان نسخے موجود ہین، اور آیا یہ کتاب طبع ہوئی ہے یا نہین، وہ تحریر فرما کر مشکور و ممنون فرمائین، مذکورہ کتاب حسب ذیل حصص مین منقسم معلوم ہوتی ہے، ۹ × ۱۵ جلد و لون مین واضح خط سے لکھی گئی ہے، کل صفحات ۲۰۲ ہین،

(۱) تقویم الابدان (نقوش سلیمانی مین تقویم الادویہ مسطور ہے) صد ۹۶،

(۲) مختصر لجالینوس فی علاج الامراض ومزاج الطبائع .... الخ صفحہ ۱۲

(۳) تقویم الصحت بالاسباب رر ص ۴۲

(۴) تقویم الادویہ المفردۃ والاغذیہ رر ص ۵۳

کاتب (۱) حمد بن عمر بن جبار، ابتدا بسم اللہ کے بعد.....کتاب تقویم الابدان،

بعدادۃ الامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابھۃ والیہ

...... والازمنۃ والبلدان.....الخ

اختتام:- تم کتاب تقویۃ الابدان بعون اللہ تعالیٰ وحسن توفیق

علی ید الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفرانہ (ا)حمد بن عبد الجبار

الورزقنی وقد وقع فراغ تحریرہ فی منتصف ذی القعدۃ سنہ ثمان

وثمانین خمسمایۃ والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ.....اجمعین،

معارف: تقویم الابدان کوئی نایاب کتاب نہین ہی، اس کا ایک حصہ چھپ بھی چکا ہے، اس کی تصحیح سلیمان الدخیل نے کی تھی، اور امیر ابن الرشید امیر نجد کے ایجنٹ رشید پاشا نے ۱۳۳۲ھ مین دمشق مین اس کو چھپوایا تھا، ہندوستان کے بہت سے کتب خانون مین اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہین، پٹنہ لائبریری کتب خانہ ریاست رامپور اور سبحان اللہ لائبریری مسلم یونیورسٹی مین اُس کے قلمی نسخے موجود ہین، اور کتب خانون مین بھی ہون گے، اس کتاب کا لاتینی ترجمہ بھی ۱۵۳۲ء مین اسٹرا برگ سے شائع ہو چکا ہے،

لغاتِ جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری معہ ضمیمہ مسعود عالم صاحب ندوی۔

اَدَبیات

دورِ حاضر

اور

اُسوۂ فارُوقی

از جناب یحییٰ اعظمی

بنا عدل و اخوت کی جہان مین جس نے محکم کی وہ جس نے زندہ سنت کی شہنشاہِ دوعالم کی
تمنا سرورِ دین کو تھی جس کے خیر مقدم کی ضرورت ہے جہان کو پھر اُسی فاروقِ اعظم کی

کہ ظلمت ہر طرف چھائی ہے پھر باطل پرستی کی
مگر حد ہو گئی ہے نوعِ انسانی کی پستی کی

کوئی بھی انتہا ہو اس کے اخلاقِ ذمائم کی کہ انسان سے کہین بہتر ہو اب حالت بہائم کی
کرے شرح آہ کوئی کس طرح اسکے عزائم کی کہ آغشتہ بخون ہے داستان اس کے جرائم کی

کیا ہو تازہ اُس نے عصرِ نو مین دورِ چنگیزی
ہے کھیل اس کا تیمون اور معصومون کی خونریزی

صف آرا ہین گھٹائین نیرِ حق کے مقابل مین نہ جانے کا وشین کب کی بھری ہین قلبِ باطل مین
تشتت رونما ہے ملتِ بیضا کی محفل مین پریشانی سی ہے ہر بندۂ توحید کے دل مین

غزیمت ہے نہ وہ عہدِ سلف کی شان باقی ہے
نہ اس کا نفس لاتحزن پہ اب ایمان باقی ہے

جہان مین کیا یہی مسلم کے جینے کا قرینہ ہے کہ خودداری کا اس کی چور چور اب آبگینہ ہے
پڑا موجِ بلا مین آکے اُمت کا سفینہ ہے نشیمن خوفِ غیراللہ کا مومن کا سینہ ہے

اکھڑتا جا رہا ہے پائے عزمِ استوار اس کا
کہ شیوہ بن گیا ہے رزمِ ہستی سے فرار اس کا

نہین کیا یاد اسے لا تقنطوا کی نصِ قرآنی نہین کیا یاد اُسے کم من فئۃ کا عہدِ ربانی
بتائے کوئی پھر ہو کس لئے یہ ضعفِ ایمانی رہی ہے اس سے پہلے کیا یہی شانِ مسلمانی

ملین گے تم کو ایک ایک حرف سے اس کے سبق اب بھی
کتب خانون مین ہین تاریخ ماضی کے ورق اب بھی

مسلمان کے لئے یہ دور دورِ سرفرازی ہے کہ رنج و ابتلا، مومن کی شانِ امتیازی ہے
حقیقت مین اسی کا سب یہ فیض کارسازی ہے کہ دنیا مین ابھی تک سرخرو دینِ حجازی ہے

ملا ہے بہرہ اس کو روئے گلگونِ شہادت سے
کہ تاریخ اس کی ہے تابندہ ترخونِ شہادت سے

ہمارے کارنامون سے ہے دہر اب تک پرآوازہ حنین و بدر کی ہے داستانِ فخر ابھی تازہ
زمانہ کو ہو پھر زورِ یداللّٰہی کا اندازہ خداوندا مرتب کردے پھر ملت کا شیرازہ

ہمارے بازوؤن مین پھر وہی اگلی سی قوت دے
وہی جوشِ شجاعت دے وہی ذوقِ عزیمت دے

اٹھا دے پھر کوئی فاروق یثرب عصرِ حاضر سے جہان مین کردے بزمِ عدل و صدق آراستہ پھر سے
نہین کچھ بھی یہ مشکل تیری قدرت کے مظاہر سے خداوندا سبھی ممکن ہے تیرے دستِ قادر سے
عمر جیسا جلیل القدر پھر دنیا مین پیدا کر

سکھا دے جو جہانِ نو کو آئینِ جہانبانی | بتا دے جو زمانہ کو رموزِ فقر و سلطانی
وہ جس کا شہرۂ آفاق دورِ عدلِ لاثانی | بلند اک بار پھر کردے مقامِ نوعِ انسانی

ہو قلبِ دہر پر سکہ رواں اس کی جلالت کا
مساوات و اخوت کا صداقت کا عدالت کا

غزل

از جناب فضل آختر سیتاپوری

سما گیا ہے کچھ ایسا جمالِ جانانہ | مری نگاہ میں رقصاں ہے آئینہ خانہ
تری نگاہ وہی ہے اثر جداگانہ | کہ جس سے ہے کوئی دیوانہ کوئی فرزانہ
فروغِ سجدۂ اخلاص کا یہ عالم ہو | کہ بڑھ کے چومے قدم کعبہ ہو کہ بتخانہ
حیات اس پہ نہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے | نکل گیا حدِ فرزانگی سے دیوانہ
حیات و مرگ کے پھر اُٹھ کھڑے ہوئے جھگڑے | یہی ہے حشر یہی حشر کا ہے افسانہ
اب اس مقام پہ ہے عشق کی جنوں خیزی | کہ حسنِ یار ہوا آپ اپنا دیوانہ
کبھی یہ سوچتا ہوں کاش وہ مرے ہوتے | کبھی یہ کہتا ہوں اچھا ہے جو ہیں بیگانہ
چراغ لے کے بڑھا رہنمائی کو شعلہ | قریبِ شمع دکھائی دیا جو پروانہ
سکونِ حسن کا اور بیقراریاں دل کی | ہر ایک چیز کا اسلوب ہے جداگانہ
میں رازِ عشق چھپاتا ہوں اور نہیں چھپتا | مرا سکوت بنا جا رہا ہے افسانہ
پیامِ یار تو دیتی ہیں دھڑکنیں دل کی | نگاہِ شوق سناتی ہے دل کا افسانہ

کرشمہ اس نگہِ مست کا ہے یہ آختر
چھلک رہا ہے جو چھلکا ہوا تھا پیمانہ

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین

ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے ان ہی کے فیوض سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہوا، اور ان کے وصال کو سات سو برس سے زیادہ گذرے، لیکن ان کی روحانی برکات کا سرچشمہ ابھی تک جاری ہے، مگر افسوس ہو کہ اب تک فارسی یا اردو زبان کی کسی کتاب میں اُن کے مبسوط حالات زندگی نہیں ملتے، تذکروں میں زیادہ تر یا تو اُن کے کشف و کرامات یا ان کے اوراد و وظائف کی تفصیلات ملتی ہیں، اب سے پہلے ان ہی چیزوں کی زیادہ تلاش رہتی تھی، اسلئے تذکرہ نویس انہی کی تفصیل لکھکر اپنے ناظرین کی تشنگی بجھاتے تھے لیکن اب جب کہ زمانہ کا ذوق بدل گیا ہے، صوفیۂ کرام سے عقیدت رکھنے والا گروہ ان کی سیرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات زندگی پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ چند اوراق

لہ ملنے کا پتہ:- منیجر شعبۂ اشاعت معتمد گذری شاہی انجمن جوالرہ، اجمیر شریف : قیمت :- صر

سے زیادہ مبین تحلیل سکا ہے معلومات کی کمی کی وجہ سے ایک اہل قلم اپنے کو چند اوراق ہی مین محدود کر دینے پر مجبور پایا تھا لیکن ہم جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب کے ممنون ہین کہ انھون نے معین الارواح مین حضرت خواجہ صاحب کے مفصل اور مبسوط حالات لکھنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کے شروع مین جناب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ام اے پی، اچ ڈی، ڈائرکٹر اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا طویل دیباچہ ہے، پھر فاضل مؤلف کا معروضہ ہے، جس مین ان کتابون کا بھی ذکر ہے جن کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جدید ذوق کے مطابق اگر ان ماخذون کے مصنفین کے نام اور سنین تالیف بھی لکھدئیے جاتے، تو بہتر تھا، فاضل مؤلف نے اپنی محققانہ کتاب مین مسالک السالکین کا حوالہ کثرت سے دیا ہے لیکن یہ پتہ نہین چلتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، اور کس زمانہ مین لکھی گئی ہے، شاید یہ تیرہوین صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے، حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے مین ۔۔۔ حال کی کسی تصنیف کو بکثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے،

ماخذون کے سلسلہ مین فاضل مؤلف نے ان کتابون کی بھی فہرست دی ہے جو ان کو دستیاب نہین ہوسکین، ان مین خیر المجالس، مونس الارواح، مرأة الاسرار، تواریخ فیروزشاہی (شاید ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروزشاہی مراد ہو) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اور اکبرنامہ اور سیر العارفین کے نام بھی ہین، یہ کتابین تو ایسی ہین کہ تھوڑی سی تلاش اور جستجو کے بعد ہر اچھے کتب خانہ مین مل سکتی تھین،

حاشیہ مین ماخذون کا حوالہ دیتے وقت صفحون کا حوالہ نہین دیا گیا ہے، صرف کتابون کے نام لکھ دیئے گئے ہین، آج کل کی تحقیق و تدقیق مین صفحون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، فاضل مؤلف اگر صفحون کا بھی حوالہ دیدیتے، تو ان کی تحقیق مین وزن پیدا ہو جاتا،

پوری کتاب چھ حصون مین منقسم ہے، پہلے حصہ مین سوانح مبارکہ، دوسرے مین سیرۃ مقدسہ تیسرے

مین حلقۂ ارادت، چوتھے مین آپ کی درگاہ اور مراسم، پانچوین مین آپکے درباری اور چھٹے مین تاریخ اجمیر درج ہے،

پہلے حصہ مین حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو آج تک حضرت خواجہ کے کسی سوانح نگار نے نہین کی، گو ان سنین کے تعین کرنے مین فاضل مؤلف نے زیادہ تر قیاسات ہی سے کام لیا ہے، جو ممکن ہے کہ صحیح ہون، اور اگر ان مین تسامح بھی ہو گیا ہو، تو آیندہ جب کوئی اہل قلم حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے گا، تو ان سنین سے اس کو واقعات قلمبند کرنے مین بڑی مدد ملے گی،

کتاب کے مطالعہ سے حضرت خواجہ کی سیاحت کا بہت ہی واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، فاضل مؤلف کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ اپنی سیاحت کے دوران مین چار بار ہندوستان آئے، ممکن ہو یہ صحیح ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے، اور اُن کا وصال ۶۳۲ھ مین ہوا، اکھتر برس کے طویل وقفہ مین بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون، اور پھر واپس آئے ہون، اُن کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہرسال حج کے لئے جاتے تھے (ص۵۵) حج سے واپسی مین بلاد اسلامیہ کی سیاحت بھی کرتے ہون، اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان نہین تشریف لائے ہون گے، لیکن اس سلسلہ مین فاضل مؤلف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین،

حضرت خواجہ کے پہلی بار ہندوستان آنے کے ذکر کے سلسلہ مین لکھتے ہین،

"غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر بتاریخ ۱۰ محرم الحرام ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا، (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)

مگر اس زمانہ مین چونکہ رونق اسلام صرف لاہور اور ملتان تک تھی، اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنے جانے کے لئے قیام و سیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس

در دو ہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے؟

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ)

مذکورۂ بالا دعوی کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہیں ہوتی، تاریخ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے:-

"و خود بغزنین آمدہ شمس العارفین عبدالواحد را کہ پیر شیخ نظام الدین ابوالمؤید است دریافتہ بلاہور آمد و از آنجا بدہلی تشریف آورد، چون اثر دحام خاص و عام از حد گذشت و آن بزرگوار ازان متنفر بود، بر آئینہ از آنجا نیز متوجہ بلدۂ اجمیر شد، در دہم ماہ محرم سنہ ۵۶۱ھ (احدی وستین خمسمآۃ) سایہ وصول بر آن خطہ انداخت و سید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود و بصلاح و تقوی آراستہ در سلک اولیاء اللہ انتظام داشت و سلطان قطب الدین ایبک او را داروغۂ آن بلدہ ساختہ بود قدوم شیخ را باعزاز و اکرام تلقی فرمود، چون از علم و تصوف و اصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت صحبت خواجہ را نعمت شگرف دانستہ اکثر اوقات بمجلس شریف حاضر می شد و بسیارے از کفار اجمیر ببرکت انفاس آن پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آنانکہ ایمان نیاوردند محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد و عد بحضرت او می فرستادند و خواجہ در عہد شمس الدین التمش دو مرتبہ جہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی، بدہلی تشریف برد"

(جلد دوم ص ۳۷۷)

فرشتہ کے مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنین سے لاہور اور لاہور سے دہلی آئے، یہاں لوگوں کا ہجوم بڑھا، تو اس جگہ سے متنفر ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں بتاریخ ۱۰ محرم سنہ ۵۶۱ھ پہنچے، پھر فرشتہ یکا یک سید حسین مشہدی کا ذکر کرتا ہے، جن کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر کا داروغہ مقرر کیا تھا، سلطان قطب الدین سنہ ۶۰۲ھ میں تخت نشین ہوا، فرشتہ نے اکتالیس برس کے وقفہ کے حالات کو صرف ایک سطر میں تلمیذ کر دیا ہے، لیکن مذکورۂ بالا اقتباس سے

معین الارواح کے فاضل مؤلف کا یہ دعوی ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے تو لاہور اور ملتان تک آکر پھر مراجعت فرمائی، فرشتہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے اجمیر مین آکر قیام پذیر ہو گئے،

حضرت خواجہ کے دوسری بار ورود ہند کے سلسلہ مین فاضل مؤلف رقمطراز ہین،

"حسب دلیل العارفین آپ کے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤن کی ملکیت تھی، اور حسب مسالک السالکین و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر مین پرتھوی راج کی حکومت تھی اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخری بار حملہ کر کے اجمیر فتح کیا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کیا چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ مین ہوا، اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ مین ثابت ہے"

حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۸ھ مین اجمیر آئے، تو دونون سنہ مین اجمیر ہندوؤن ہی کی ملکیت تھی، لیکن اجمیر کا ہندوؤن کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہین کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے،

"ورود ہند بار سوئم" کے بارہ مین فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہین،

"صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) مین داخل بحق ہوا اس زمانہ مین آپ وارد لاہور ہوئے"

فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ مین لکھا ہے کہ ان کو سیر العارفین دستیاب نہین ہو سکی، (ص، د) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۰۱ء مین شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے، اس مین حضرت خواجہ کے اجمیر شریف مین نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ مین ہے :-

"بعدہ خواجہ صاحب شہر غزنی کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ عبد الواحد غزنوی پیر شیخ

نظام الدین ابوالموید کے ہیں وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی، پھر وہاں سے روانہ ہوکر
لاہور میں آئے، اس ایام میں پیر علی ہجویری قدس سرہٗ...... کا انتقال ہوچکا تھا لیکن شیخ
حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعدالدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہیں، زندہ تھے، اُن سے اور خواجہ صاحب سے
بےحد دوستی اور محبت ہوگئی، کچھ دنوں تک وہاں قیام فرماکر پھر وہاں سے متوجہ دارالخلافہ
دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے، چند عرصہ تک وہاں قیام فرمایا، وثاق متبرکہ
جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہاں کہ قبر شیخ رشید مکی کی ہے، اور آج تک اس
زمانہ کی نشانیوں میں سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرضکہ دہلی میں ہجوم خاص
وعام اہلِ اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا، تب آپنے طرف دارالخیر اجمیر کے سفر کیا
اگرچہ اس زمانہ میں اجمیر شریف میں اہلِ اسلام کی رونق شروع ہوگئی تھی لیکن غلبہ کفار
نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفہ وقت سلطان قطب الدین
ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف میں داروغگی کی خدمت پر ممتاز
فرمایا تھا، (حصہ اول ص ۱۲)

سیر العارفین کے مندرجۂ بالا اقتباس سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد
ہوئے جب معزالدین سام غزنی جاتے ہوئے (۵۸۶ھ) میں داخل بھی ہوا،

درود ہند بار چہارم کے بارہ میں فاضل مؤلف ارقام فرماتے ہیں،

حسب خزینۃ الاصفیا بموجب ارشاد حضرت قطب صاحب جب آپ خراسان سے ہندوستان
وارد ہوئے، اس وقت قباچہ بیگ اور کفار مغلوں کے درمیان جنگ شعلہ زن تھی، اور قطب
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استعانت باطنی سے قباچہ بیگ نے فتح پائی، چونکہ حسب منتخب التواریخ
یہ جنگ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد قباچہ بیگ اور کفار مغلوں سے ۶۱۱ھ میں ہوئی

لہذا غریب نواز کا چوتھی بار وارد ہندوستان ہونے کا سال بھی یہی ہے"

مذکورۂ بالا بیان خزینۃ الاصفیار کی حسب ذیل روایت سے مرتب کیا گیا ہے جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ذکر مین درج ہے،

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان وارد ہندوستان شد، خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس تشریف می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند، و لشکر بیشمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ بایشان نیست برائے خدا امداد فرمائید، اتفاقاً خواجہ قطب الدین دران وقت تیرے بدست خود داشت حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن بیندازد و فارغ بنشین، قباچہ ہمچنان بعمل آورد در لشکر دشمن متنفسے نماند کہ زخم سر با و نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار بفرار نہادند" (ج ۱ ص ۲۶۰)

خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب (ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے ساتھ ہندوستان نہین آئے، انھون نے یہ خبر سُنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہین؛ تو مرشد کے شوق ملاقات مین وہ بھی ہندوستان روانہ ہو گئے، ملتان پہونچے، وہان سے دہلی آئے، اور دہلی سے مرشد کی خدمت مین حاضر ہونے کی اجازت مانگی لیکن اُن کو حکم ملا کہ وہ وہین قیام کرین، لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت مین آئے، دلیل العارفین کی مجلس یازدہم مین ہے،

"چو خواجہ درین خواہد رسید چشم پر آب کرد، فرمود مسافر می شوم، جائیکہ مدفن ما خواہد بود

یعنی در اجمیر می روم ہر کسے را وداع کرد، دعا گو بر در راہ بودیم، بعد ازان در اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر از ان ہند و آن معمورہ و آباد و مسلمانی چنان نبود، چون قدم مبارک خواجہ انجا رسید، چندان اسلام ظاہر شد کہ ان را حد نبود" (ص ۵۵-۵۴)

اب سمجھ مین نہین آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کو یا سیر الاقطاب اور خزینۃ الاصفیاء کے بیانات کو قابلِ قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر مین خزینۃ الاصفیاء کا ایک بہت ہی واضح بیان ہے جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ مین اجمیر وارد ہوئے، اور وہین مستقل قیام فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ بیان ملاحظہ ہو،

"من بعد حضرت خواجہ از بلخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد فائز لاہور شد تا دو ماہ مزار پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہ معتکف ماند بعد حصول فوائد باطنی از لاہور روانہ دہلی گشت و چندے در دہلی قیام پذیر ماندہ بتاریخ دہم ماہ محرم سال پانصد و شصت و یک رونق افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصے کہ بشرف ارادت آنحضرتؒ مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار بود کہ اول ازان مذہب شیعہ داشت و بعد ازان تائب شدہ مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید، و من بعد ہزار در ہزار از صغار و کبار بخدمت آن محبوب کردگار حاضر شدہ، مشرف بشرف اسلام و ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالی شان روشن گشت" (ج ا ص ۲۵۹)

عاجز راقم کے ان معروضات سے معین الارواح کے لائق مؤلف کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انھون نے حضرت خواجہ کے چار بار ہندوستان آنے کے سلسلہ مین جو دلائل پیش کئے ہین وہ صحیح نہین ہین،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

ہزار سال پہلے از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸۸ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ پتہ:- انجمن ثمرۃ التربیۃ دار العلوم دیوبند،

مسلمانون کے دور عروج مین اُن کو علمی تلاش و تحقیق اور نئے نئے اکتشافات اور اس کے لئے سیر و سیاحت کا شوق اتنا غالب تھا کہ انھون نے اس زمانہ مین جب سفر مین بڑی دشواریان تھین زمین کا چپہ چپہ چھان مارا، اور اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہین تھا، جہان اُن کے قدم نہ پہنچے ہون یورپ کے برف پوش پہاڑ افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا، اور ایشیا کے مرغزار یکسان اُن کی جولانگاہ تھے، ان مین سے بہت سے اہل علم و قلم سیاحون نے اپنے سفر کے مشاہدات و نتائج کتابی شکل مین قلمبند کئے، ان مین سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، ابن بطوطہ اور ناصر خسرو کے سفرنامے، ابو جعفر خوارزمی، ابن رستہ ابن خرداذبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، ابن حوقل اصطخری، بشاری مقدسی اور ادریسی وغیرہ کے جغرافیے چھپ کے شائع ہو چکے ہین جو اس زمانہ کے جغرافی اور تمدنی حالات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہین، فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ مین اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرنامون اور جغرافیہ کی کتابون کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو غالباً رسالہ دار العلوم مین شائع ہوا تھا، اسی کو کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقون کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن غالباً

مضامین کی تحریر کے وقت کتاب کی شکل میں اُن کی اشاعت کا خیال نہیں تھا، اس لئے اس موضوع سے متعلق معلومات کا پورا استقصار اور مضامین میں ترتیب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو دوران مطالعہ میں جو معلومات حاصل ہوتے گئے، ان کو قلم برداشتہ لکھتے گئے، اور ناشرین نے اسی طرح انکو شائع کر دیا، ورنہ مصنف جیسے وسیع النظر کے قلم سے یہ کتاب اس سے زیادہ جامع اور مرتب شکل میں ہوتی لیکن موجودہ شکل میں بھی وہ بہت مفید اور دلچسپ ہے،

اشتراکیت، روس کی تجربہ گاہ میں | مرتبہ جناب اصغر علی صاحب عابدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۲ مرتبہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن،

کمیونسٹ، اشتراکی نظام کو دنیا کے سارے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل، حریت و آزادی عالمگیر انسانی و معاشی مساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور ساری پہلو سے انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، ممکن ہے کارل مارکس، انجلس اور لینن کی تخیلہ اشتراکیت میں یہ خوبیاں رہی ہوں، لیکن سویٹ حکومت میں جو اشتراکیت عملاً قائم ہے، اس میں سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں ہیں، جس کا اعتراف بہت کمیونسٹوں تک کو ہے، اور اس کے متعلق انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں، مرتب نے اُن کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان میں دلائل و شواہد سے دکھایا گیا ہے کہ موجودہ روسی اشتراکی نظام سیاست، معاشیات اور اخلاق و معاشرت ہر پہلو سے بدترین استبدادی نظام ہے، اس میں کسی قسم کی مساوات کا وجود نہیں بلکہ شخصی آزادی تک مفقود ہے، اور وہ ساری اخلاقی قدریں ختم کر دی گئی ہیں جن کو دنیا اب تک مانتی چلی آتی ہے، اور خود اس کے نظام اخلاق کی بنیاد تمامتر جبر و استبداد، مکر و فریب اور حیوانیت پر ہے، اس کتاب سے روس کی اشتراکیت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہیں،

کلیل بین غلیل از جناب ناطق گلاوٹھوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:- کرشنا بک ڈپو مسکر بنگلور،

عرصہ ہوا رسالہ خیام لاہور مین یہ بحث چھڑی تھی کہ حالی کے اس شعر

حالی اب آؤ پیروی مغربی کرین — بس اتباعِ مصحفی و میر کر چکے

مین "پیروی مغربی" سے کیا مراد ہے یورپ کے خیالات کی تقلید یا مغربی شاعر کی، اس بارہ مین ادیبون اور سخن سنجون کی رائین مختلف تھین، جناب ناطق کے نزدیک یورپ کے خیالات کی تقلید مراد تھی، اور اس صورت مین "مغربی کی ی" کو مولانا حالی کی غلطی پر محمول کرنا ناگزیر تھا، لیکن اس سلسلہ مین انھون نے اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی، اور مسدس کی مخالفت کے زمانہ کی یہ روایت بھی نقل کر دی کہ وہ مولانا آسی کی تصنیف ہے، اس پر اعتراضات ہوئے، اس کے جواب مین انھون نے جو خط اڈیٹر خیام کے نام لکھا تھا، اس کو کلیل بین غلیل کے فصیح نام سے شائع کیا ہے، اس مین حالی اور دورِ جدید کے دوسرے شعراء ادیبون اور نقادون کی نااہلیت، پارٹی بندی اور رشک ورقابت، پروپیگنڈے اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پر جو مذکورۂ بالا امور سے متعلق ہو سکتے ہین، اپنے خیالات ظاہر کئے ہین، اور اس لپیٹ مین بعض پرانے اساتذہ تک آگئے ہین، شعر و ادب مین مصنف کے صاحب نظر ہونے مین کلام نہین، انھون نے موجودہ زمانہ کے معیار علم و شاعری کے متعلق بہت سی باتین صحیح لکھی ہین، اگر وہ سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کرتے، تو اُن کی یہ تحریر وقیع اور غور و توجہ کی مستحق ہوتی، لیکن غیر سنجیدہ اور حریفانہ انداز تحریر، دوسرون کی تنقیص کے ساتھ خود اپنے قلم سے اپنے کمالات کے اظہار کی بنا پر یہ کتاب بھی پارٹی بندی اور پروپیگنڈے کے دائرے مین آگئی ہے، مصنف نے ایک دلچسپ روایت یہ بھی نقل کی ہے، کہ مسدس حالی کی تصنیف مین سرسید کی محنت اور کاوش کو زیادہ دخل تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسدس اُن کی تصنیف ہے، یا کم از کم اس پر اُن کی اتنی اصلاح ہے کہ گویا ان کی

تصنیف سمجھنا چاہئے، جن لوگوں کو سرسید اور حالی سے واقفیت ہے، وہ اس قسم کا تصور بھی نہین لا سکتے، سرسید کو شعر و شاعری سے کیا علاقہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ مسدس کے خیالات سرسید کے ہین، تو یہ بھی صحیح نہین، مولانا حالی مسلمانون کے مد و جزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ سے سرسید سے کم واقف اور ان کی زبون حالی سے ان سے کم متاثر نہین تھے کہ مسدس کے خیالات کو سرسید کا القا سمجھا جائے یہ اور بات ہے کہ مسدس سرسید کی تحریک سے لکھی گئی ہو، یا اس کی تصنیف کے دوران مین مولانا حالی سرسید سے بھی صلاح و مشورہ کرتے رہے ہون، لیکن اس سے مسدس کو سرسید کی جانب منسوب نہین کیا جا سکتا، اس قسم کا علمی افادہ و استفادہ اہل علم مین عام ہے، بہر حال یہ کتاب لطف و دلچسپی سے خالی نہین ہے، نام کی جدت و فصاحت خصوصیت کے ساتھ مصنف کے حسن ذوق کا نمونہ ہے،

جمہوریۂ ہند کے دستورِ اساسی کا خاکہ
از جناب محمد ہاشم صاحب قدوائی ایم اے لکچرار شعبہ پولیٹکل سائنس مسلم یونیورسٹی تقطیع اوسط ضخامت ۲، صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ :- ایجوکیشنل ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علی گڈھ،

جمہوریہ ہند کے دستور کا متن خاصہ ضخیم ہے، اور غالباً ابھی اردو مین اس کا ترجمہ نہین ہوا ہے، لائق مرتب نے اردو مین اس کا خلاصہ لکھا ہے، اس مین دستور کی مختصر تاریخ اس کی خصوصیات، شہریت، اس کے حقوق و فرائض، ملکی پالیسی کے اصول، ہندیونین کے اجزاء اور اس کا نظام، مرکزی حکومت، پارلیمنٹ، ریاستون، ریاستی مجالس قانون ساز، عدلیہ، ہائیکورٹ، ماتحت عدالتون، پبلک سروس کمیشن وغیرہ سے متعلق دستور کے تمام آئین و قوانین کا پورا خاکہ آگیا ہے، زبان صاف اور سلیس ہے یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن عام اردو خوانون کے مطالعہ کے لائق بھی ہے،

حبیبِ خدا، چاند ستارے اور مہاجرین و انصار، از جناب الیاس احمد صاحب مجیبا

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل لکھی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:۔ ۴۰۰ صفحے،

قیمت:۔ عہ

"منیجر"

بزمِ تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دولت کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت:۔ ۴۰۵ صفحے،

قیمت:۔ سعہ

"منیجر"

سنہ ۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس مین عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز مین پیش کی گئی ہین، ہندوستان کے اسلامی عہد مین جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی مین مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین انسانون کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتین قائم ہوگئین، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہان جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر مین فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والون کے ذریعہ ہندوستان مین اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمائین،

قیمت :- عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیقی احمد) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اے　　　　اکتوبر ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغازِ اسلام سے لے کر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۹۵ صفحے قیمت: سے

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- سے

"منیجر"

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت معہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۳۳۲ صفحے

قیمت:- عہ

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات

کانگریس کی صدارت مین ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستون نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی خوشیان منائین کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، قوم پرستون کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھین فرقہ وارانہ مسائل مین کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، لیکن ہندوستان کی فلاح کا صرف ایک راستہ ہے، سیکلر حکومت تمام فرقون کے حقوق مین قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی، اور پاکستان و ہندوستان کے تعلقات مین خوشگواری، اسکے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائیگا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کیطرف لیجائیگا، اسلئے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے بہی خواہ ہین تو انکو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد اگرچہ انکا لب و لہجہ بدل چلا ہے اور ادھر انھون نے جو تقریرین کی ہین ان مین وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور پرچین بھارت کے نمایندے نہین معلوم ہوتے، بلکہ انکی زبان سے غیر مذہبی حکومت، مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، مسلمانون کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہین، بلکہ بعض تقریرون مین تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہانتک کہا ہے کہ "ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانون نے مل کر بنایا ہے، اور انکا اور انکے وطن الہ آباد کے مسلمانون کا کلچر ایک ہے"، اگر وہ بھی اسکو مانتے ہین تو پھر انکے اور مسلمانون کے نقطۂ نظر مین کوئی اختلاف نہین رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہین کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانون کے میل جول سے بنا ہے، اور جسمین دونون کے اثرات ہین اور اسی کو ہندوستان کا مشترک کلچر ہونا چاہیئے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہے، اس نعرہ کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہے، اگر وہ حقیقۃً اتحاد چاہتے ہین تو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے، اتحاد کے معنی ہندو ون مین ضم ہوجانے کے نہین ہین، اس کے بغیر بھی اتحاد ہوسکتا ہے اور ہو کر رہے گا، ٹنڈن جی کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان ہی مین رہین گے اور پورے اتحاد قومی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھین گے۔

ٹنڈن جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت کی قیادت سپرد کی گئی ہے، انھیں اپنے کو اسکا اہل ثابت کرنا چاہیے اور اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں، کانگریس تمام فرقوں کی نمائندہ جماعت کہی جاتی ہے، اور مسلمان اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، اسکے علاوہ صدارت کی کامیابی میں ٹنڈن جی کو مسلمانوں کے ووٹوں سے بھی مدد ملی ہے، اسلیے انکی نمائندگی بھی کرنا انکا قانونی اور اخلاقی فرض ہے، غلط نقطۂ نظر ہمیشہ نہیں چل سکتا، یا اسکو صحیح کرنا ہوگا یا ملک کو تباہی کے حوالہ کرنا ہوگا، ٹنڈن جی کے محب وطن ہونے میں شبہ نہیں، اسلیے کیا عجب ہے کہ صدارت کی ذمہ داری انکے خیالات کی تصحیح کردے، حق و صداقت میں بڑی طاقت ہے، اگر ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو باطل اسکو مغلوب نہیں کر سکتا، اور بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی، ناسک کانگریس کے فیصلے اس کے شاہد ہیں، ٹنڈن جی کو بھی ان فیصلوں کی پابندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے؛

گائے اور زبان کے بارہ میں بھی ان کے خیالات میں اصلاح کی ضرورت ہے، ہندی کے حکومت کی زبان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اردو کو مٹا دیا جائے، اسکے بعد بھی ملکی زبان کی حیثیت سے اسکو زندہ رہنے کا حق ہے، اسلیے اگر ٹنڈن جی اردو دشمنی چھوڑ دیں تو انکا کیا حرج ہے، گائے کی اقتصادی اہمیت سے انکار نہیں، ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، یہاں گائے کی نسل کو ترقی دینے کی ضرورت ہے، اسی بناء پر اسکو قدیم ہندوستان میں مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا تھا، لیکن اس اہمیت کو اسکی حد کے اندر رکھنا چاہیے، اسکو ملکی مفاد پر ترجیح نہ دینا چاہیے، ایک طرف ٹنڈن جی کی عقل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ اس ترقی کے دور میں الہامی اور مذہبی کتابوں کی ہدایات ماننے کیلیے تیار نہیں ہیں، دوسری طرف انکی قدامت پرستی یہ ہے کہ گائے کے تقدس کو ٹھیس لگانا گوارا نہیں اور اسکے لیے وہ ربڑ اور کرمچ کے جوتے اور نواڑ کے بستر بند استعمال کرنے کے بجائے ہر قسم کا اقتصادی نقصان برداشت کرنے کیلیے آمادہ ہیں، اپنی ذات کیلیے تو وہ اس سے بھی زیادہ سادگی اختیار کر سکتے ہیں، ربڑ کے جوتے کے بجائے لکڑی کی کھڑاویں، رسی کے بستر بند اور کھاروے کے تھیلے استعمال کریں، لیکن ملکی بلکہ فوجی ضروریات کو تو وہ گائے کے لیے قربان نہیں کر سکتے، کیا فوجی سپاہیوں کو بھی وہ ربڑ اور کینوس کے جوتے پہنا کر انکی کمر میں نواڑ کی پٹیاں باندھ کر میدان جنگ میں بھیجیں گے، ان کے اسلحہ سوت کی ڈوری سے کسے اور کینوس کے تھیلوں میں رکھے جائیں گے، ان کے گھوڑوں کی لگامیں، رسی کی ہونگی، چارجامے نمدے کے اور ساز نواڑ کا ہوگا، یہ فوج کیا ہوگی عجوبہ روزگار ہوگی'

اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی مین ہے، اور اس زمانہ مین تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہو ہزارون لاکھون بوڑھے بیل اور ناکارہ گائین کہان جائین گی، ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا، مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہین اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوؤن کو روکنا چاہیے، جو بوڑھی گائین قصابون کے ہاتھ خفیہ بیچ دیتے ہین،

صوبہ بمبئی اگرچہ اردو زبان کے مرکز یو، پی اور دہلی سے دور ہے، اور وہان کی صوبائی زبانین گجراتی اور مرہٹی ہین لیکن ہر زمانہ مین وہان اردو زبان و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا مذاق رہا ہے اردو کے بہت سے اخبارات و رسالے نکلتے ہین، اردو کی خدمت کے لیے متعدد ادبی ادارے قائم ہین، ان مین مشہور انجمن اسلام کی خدمات خصوصیت کے ساتھ اہم ہین، اسی سلسلہ مین ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب مرحوم پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی نے ۱۹۴۸ء مین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا مقصد گجرات کے قدیم اردو ادب کی تحقیقات، وہان کے کتب خانون مین اس کے قلمی نوادر کی تلاش اور ان کی فہرست کی ترتیب، اردو کے ریسرچ اسکالرون کی علمی اعانت ہے، یہ ادارہ وقتاً فوقتاً اردو کے فضلاء سے مقالات بھی پڑھاتا رہتا ہے، اسکے لائق کارکنون نے گذشتہ جنوری سے ایک سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے نام سے جاری کیا ہے، اسکا مقصد تقریباً وہی ہے جو پرانی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا تھا، اس وقت تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہین، اور ہر نمبر اردو زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین و معلومات پر مشتمل ہے، اسکے روح روان ہمارے پرانے رفیق پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہین، امید ہے کہ ان دونون صاحب ذوق فضلاء کی نگرانی مین یہ رسالہ ترقی کریگا، اور رسالہ اردو کے پاکستان منتقل ہوجانے سے جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہو جائے گی۔

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

"کلام مجید لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، اس کے لفظی اور ظاہری اعجاز پر گذشتہ مہینہ مولانا سید بدر الدین صاحب علوی کا مفید مضمون شائع ہو چکا ہے لیکن ارباب بصیرت کی نگاہ میں اس کا اصلی اعجاز معنوی ہے جس نے دلوں کی کایا پلٹ دی اس لئے اس مہینہ اعجاز القرآن کے اس پہلو پر مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا فاضلانہ مقالہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ دونوں پہلو سامنے آجائیں،

"م"

اعجاز قرآنی کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اعجاز قرآنی کی نوعیت کیا ہے ؟ معجزہ چونکہ دلیلِ نبوت ہے، اور دلیل کی قسمیں اور اُن کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہیں، اس لئے معجزہ کی بھی مختلف قسمیں ہیں،

۱۔ بعض دلیلیں ایسی ہوتی ہیں جن سے صرف مدلول علیہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن اُن سے دل میں ترغیب و ترہیب یا دوسرے قسم کا اور کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوتا،

مثلاً اگر ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ فلاں مقام پر کچھ لوگ موجود ہیں جن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں

تو اس سے اس مقام پر اُن لوگون کے موجود ہونے کا علم تو اس کو ہوجائے گا، لیکن اس کے دل مین اُن لوگون کے بغض و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا، پیغمبرون کے عام مادی معجزے اسی قسم مین داخل ہین کہ اُن سے صرف اُن کی صداقت کا علم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی صداقت کے تسلیم کر لینے کے بعد اُن کے اوامر و نواہی اور وعد و وعید کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کے معجزات کا بالذات نہین، بلکہ بالواسطہ اثر ہے، خود ان معجزات مین ترغیب و ترہیب کا کوئی عنصر شامل نہین،

۲- اس کے بخلاف بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین، جو مدلول علیہ کے علم کے ساتھ ترغیب و ترہیب اور بغض و محبت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہین، مثلاً اگر اسی شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دوست واحباب، اعزہ و اقارب اور اہل و عیال موجود ہین تو اس کو اس مقام پر صرف اُن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل مین اُن کی محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ بے اختیار اُن سے ملنے کا مشتاق ہوگا،

اسی طرح اگر اس سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دشمن یا ڈاکو موجود ہین، جو تم کو مار ڈالینگے یا تمھارا مال لوٹ لینگے، تو اس کو صرف دشمنون اور ڈاکوؤن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے دل مین خوف کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ وہان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا،

قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے اور اس حیثیت سے اس کو تمام گذشتہ پیغمبرون کے معجزات پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہی پر دلالت نہین کرتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے پیغمبرون کے پیروؤن کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟ اُن کی کیونکر مدد کی ؟ اُن کو دشمنون سے کیونکر بچایا ؟ دنیا مین کیونکر اُن کا بول بالا کیا ؟ اور آخرت مین اُن کو کس طرح سرفراز کیا ؟ اس کے بخلاف جن لوگون نے پیغمبرون کی تکذیب کی، وہ کیونکر تباہ و برباد کئے گئے ؟ اور دین و دنیا مین مستوجب لعنت ہوئے ؟ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جن لوگون کے سامنے اس قسم

کا معجزہ پیش کیا جائے گا، اُن کے دل مین پیغمبر کی صداقت کے یقین کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ اس کے اوامر ونواہی کی پابندی کی طرف خود بخود مائل ہون گے۔

علامہ ابن تیمیہ ان دونون قسم کی دلیلون کا فرق بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی دلیل کے متعلق لکھتے ہین:-

وَهٰذِهِ الطَّرِيقُ اكمل وابلغ	مقصد کے حاصل کرنے کا یہ کامل ترین اور
فی حصول المقصود فَاِنَّهَا	موثر ترین طریقہ ہے، کیونکہ وہ پیغمبرون
تفید العلم بصدقهم و	کی صداقت کے علم کے ساتھ اُن کی پیروی
الرَّغبة فی اتباعهم والرهبة	کی رغبت دلاتا ہے، اور ان کی مخالفت
من خلافهم،	سے ڈراتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے مجمعون مثلاً عیدین مین سورۂ قاف اور سورۂ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور جمعہ مین سورۂ قاف پڑھتے تھے، کیونکہ ان سورتون مین توحید اصول دین اور نبوت اور معاد کے اثبات کے ساتھ پیغمبرون کے پیرون اور اُن کے مخالفین کا حال بھی بیان کیا گیا ہے[1]

اس لئے قدرتی طور پر ان واقعات کا اثر پڑتا ہے، اور لوگون کے دلون مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ دوسری قسم کی یہ دلیل جس کی بہترین مثال قرآن مجید ہے پہلی دلیل کیطرح بالکل سادہ نہین ہوتی، بلکہ اس مین ترغیب و ترہیب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہین، اس لئے یہ دلیل جس قدر زیادہ موثر ہوگی اُسی قدر اُس کی معجزانہ حیثیت زیادہ نمایان ہوگی، اور قرآن مجید اس حیثیت

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۲۰۲،۲۰۴،۲۰۲،

سے حد اعجاز تک پہونچ گیا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ خود کہتا ہے،

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	کرتے، تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر-۳)	سے دب جاتا اور پھٹ جاتا،

اگرچہ قساوت قلبی کی وجہ سے کفار نے اُس کے معجزانہ اثر کو قبول نہین کیا، تاہم اُن کو یہ یقین تھا کہ یہ ایک موثر کلام ہے، اس لئے اُس کے اثر کے روکنے کے لئے بعض سفیہانہ تدبیرین اختیار کین مثلاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور یہ کافر لوگ کہتے ہین کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ	کو سنو ہی مت، اور اُس کے بیچ مین غل
تَغْلِبُوْنَ (حمٓ السجدۃ-۴)	مچا دیا کرو، شاید تم ہی غالب رہو،

امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین کہ کفار کو یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید لفظاً و معنیً دونون حیثیتون سے کامل ہے، اور جو شخص اس کو سنے گا، وہ اُس کے الفاظ کی جزالت سے واقف ہوجائیگا، اور اس کی عقل اس کے معانی کا احاطہ کرے گی، اور وہ یہ فیصلہ کر دے گی کہ یہ کلام حق ہے اور اسکا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے انھون نے لوگون کو اُس کے سننے سے روکنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ آپس مین یہ کہنے لگے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب وہ پڑھا جائے تو شور و غل کرو، اشعار پڑھو، اور دوسرے قسم کے خرافات بکو تاکہ قاری کی قرأت مین گڑبڑی پیدا ہوجائے، قریش باہم ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا، کہ اس طریقہ سے لوگ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکین،

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے متعلق متعدد شہادتین موجود ہین، مثلاً کفار و مشرکین پر تو اس کا یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیتون کو سُن کر اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے، اور ان کے دلون مین اسلام کے قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری باب الہجرۃ مین ہے کہ

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی،
اور مقام برک الغماد تک پہنچ گئے، تو راستے میں ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا مل
گیا، اور پوچھا کہ "کہاں کا قصد ہے" انھوں نے کہا کہ مجھکو میری قوم نے گھر سے نکال دیا ہے، اب دنیا
میں گھوم پھر کر اپنے خدا کی عبادت کرونگا" لیکن ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقی
فضائل گنا کر کہا کہ "تم جیسا شخص گھر بار سے نکالا نہیں جا سکتا، میں تمھارا ضامن ہوتا ہوں، واپس چلو
اور اپنے شہر میں اپنے خدا کی عبادت کرو"

چنانچہ ابن الدغنہ نے سرداران قریش کو اس پر راضی کر لیا، اور انھوں نے اس کی ضمانت کو اس
شرط پر منظور کر لیا، کہ وہ اپنے گھر ہی میں اپنے خدا کی عبادت کریں اور قرآن اور نماز پڑھیں لیکن
اس کا اعلان نہ کریں کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتیں اور ہمارے بچے اسلام کی طرف مائل ہوجانگے
اس شرط پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک عمل کیا لیکن اس کے بعد اپنے گھر کے صحن میں انھوں
نے ایک مسجد بنائی جس میں نماز پڑھتے تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے جس کا یہ اثر ہوتا تھا
کہ مشرکین کی عورتیں اور اُن کے بچے اُن کے اوپر ٹوٹے پڑتے تھے، اور ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے
دیکھتے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کفار گھبرا گئے، اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے ابوبکر کو صرف اس شرط
پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے گھر میں خدا کی عبادت کریں لیکن انھوں نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا
ہے، اور اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا لی ہے، اور کھلم کھلا اس میں نماز ادا کرتے ہیں، اور قرآن
پڑھتے ہیں، ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتیں اور ہمارے بچے اسلام کی طرف نہ مائل ہو جائیں، تم
اُن کو منع کردو، اگر وہ صرف اپنے گھر میں عبادت کرنے پر اکتفا کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں لیکن
اگر وہ علانیہ عبادت کرنا چاہتے ہیں تو تمھاری ضمانت کو منسوخ کر دیں" ابن الدغنہ نے اُن کے
سامنے یہ مطالبہ پیش کیا، تو انھوں نے اس کو نامنظور کر دیا، اور اس کی ضمانت منسوخ کر دی،

لیکن باوجود اس شور وغل اور روک تھام کے قرآن مجید کے اثر کا کلیتہً ازالہ نہ ہوسکا، اور بہت سے لوگ قرآن مجید کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہوئے، اور متعدد لوگوں نے اس کے اثر سے اسلام قبول کیا، مثلاً:-

حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اتری،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	خدا عدل واحسان اور قرابتداروں کے
وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ	ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ	بدکاری برائی اور ظلم سے روکتا ہے وہ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ،	اس لئے یہ نصیحتیں کرتا ہے کہ شاید تم
(نحل-۱۳)	لوگ اس کو قبول کرلو،

تو اس کے سننے کے ساتھ ہی ایمان ان کے دل میں گھر کر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو محبوب[۱] ہو گئے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے، جب اس آیت تک پہنچے،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ	کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہوگئے ہیں؟ یا یہ
الْخٰلِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ	لوگ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا
وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ اَمْ	آسمان اور زمین کو انہی لوگوں نے
عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ اَمْ	پیدا کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ ان کے
هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ،	دل میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس
(طور-۲)	خدا کے خزانے ہیں؟ کیا یہ لوگ سربراہ کار ہیں

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد اص ۳۱۸،

اور حضرت جبیر بن مطعمؓ نے اس کو سنا تو ان کا دل اڑنے لگا، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔[۱]

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ شاعر اور اپنی قوم کے سردار تھے، وہ مکہ میں آئے، اور سرداران قریش سے ملے، تو ان لوگوں نے کہا کہ تم شاعر اور اپنی قوم کے سردار ہو، اس لئے ہم کو خوف ہے کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے ملے، اسکی بعض باتیں تم کو متاثر کر دیں، کیونکہ اوس کی باتیں جادو کا اثر رکھتی ہیں، اور وہ ان کے ذریعہ سے باپ، بیٹے، اور میاں بی بی میں جدائی ڈال دیتا ہے، سرداران قریش نے بار بار اس پر اصرار کیا، تو انھوں نے دل میں ٹھان لیا کہ میں مسجد میں داخل ہوں گا، تو کان بند کر لونگا، چنانچہ انھوں نے کان میں کپڑا ٹھونس لیا، اور مسجد کے اندر گئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپکے قریب کھڑے ہو گئے، اور بے ساختہ قرآن مجید کی بعض آیتیں سن لیں تو دل میں کہا کہ میں ہوشیار آدمی ہوں، اور برے اور بھلے میں امتیاز کر سکتا ہوں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ضرور سنوں گا، اگر وہ اچھی ہیں تو ان کو قبول کر لوں گا، ورنہ ان سے احتراز کر دن گا، اب کان سے کپڑا نکال کر پھینک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن مجید سننے لگے، ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی اس سے بہتر کلام نہیں سنا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پلٹے تو وہ بھی ساتھ ہو لئے، اور آپ کے گھر کے اندر گئے، اور قریش کی ممانعت کا پورا واقعہ سنا کر کہا باوجود اس ممانعت کے میں نے بے ساختہ آپ کی بات سن لی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حق ہے، میرے سامنے اپنا دین اور اپنے اوامر و نواہی پیش کیجئے، آپ نے ان کو دعوت اسلام دی اور وہ مسلمان ہو گئے،[۲]

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے لئے نکلے لیکن مسجد میں آپ کی زبان مبارک سے چند آیتیں سنیں اور ان سے متاثر ہوئے، پہلے تو ان کے دل میں چند شکوک پیدا ہوئے، اور قریش کی طرح دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاعر ہیں، کاہن ہیں، لیکن جب آپ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور مع فتح الباری [۲] استیعاب تذکرہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ

سورہ ختم کر چکے، تو یہ تمام شکوک دور ہوگئے، اور اسلام ان کے دل مین پوری طرح جاگزین ہوگیا،[۱]

نجاشی کے دربار مین حضرت جعفرؓ نے جب سورہ کھیعص کی ابتدا کی آیتین پڑھ کر سنائین

تو وہ رو پڑا اور اس کی داڑھی تر ہو گئی، پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ

کے پر تو ہین[۲]،

اشخاص سے الگ کفار کی جماعت کی جماعت قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہو کر اسلام لائی، حبش

مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس عیسائی آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے

آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور اُن کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، تو اُن کی آنکھون سے آنسو جاری

ہوگئے، اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا[۳]،

حضرت ابو عبیدہ بن حارث، حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسدؓ، حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ اور حضرت

عثمان بن مظعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور آپؐ نے ان کو دعوتِ اسلام دی

اور قرآن مجید کی آیتین پڑھ کر سنائین، تو اُن لوگون نے فوراً اسلام قبول کر لیا[۴]، لیکن مسلمانون پر قرآن مجید

کا اثر اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا، خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

تقشعر منه جلود الذين يخشون	جس سے ان لوگون کے جو اپنے رب
ربهم ثم تلين جلودهم و	سے ڈرتے ہین، بدن کانپ اٹھتے ہین،
قلوبهم الى ذكر الله،	پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے
(زمر - ۳)	ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہین،

حضرت عبد اللہ بن زبیر نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابۂ کرام جب قرآن مجید پڑھتے تھے تو

اُن کا کیا حال ہوتا تھا؟ بولین وہی جس کو خدا نے اُن کا وصف قرار دیا ہے یعنی اُن کی آنکھین

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۱؂ [۲] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۲۰۳ [۳] ابن ہشام مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱۲،
[۴] اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ بن عبد الاسد،

اشکبار ہوجاتی تھیں، اور اُن کے بدن کانپ اٹھتے تھے۔

اس اثر پذیری کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام کے دلوں میں خوف وخشیت کا ایک مستقل جذبہ پیدا کردیا تھا، اس نے وہ ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے تھے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ عہد نبوت میں ہم لوگ اس خوف کے مارے عورتوں سے ہنسی خوشی کی باتیں نہیں کرتے تھے کہ مبادا اس بارے میں کوئی آیت نازل نہ ہوجائے،

صلح حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا، جواب نہ ملا تو آگے نکل گئے، اور دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں انکے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہوجائے، ایک دن رسول اللہ صلعم خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ آگئے، تو آپ نے اُن کو دیکھ کر فرمایا ھُمُ الخاسرون یعنی وہ لوگ گھاٹے میں ہیں، وہ گھبراگئے کہ میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی،

بالخصوص جن آیتوں میں کسی فعل پر عذاب کی دھمکی دی جاتی تھی، صحابۂ کرام اُن سے اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ	جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ	ان کو خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ان
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ؕ	کو سخت عذاب کی بشارت دو،

تو تمام صحابہ پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے، حضرت مالک بن ثعلبہؓ کا جو ایک دولتمند صحابی تھے، گذر ہوا، تو آیت کو سُن کر اُن پر غشی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے، تو خدمت مبارک میں حاضر ہوکر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا یہ آیت اُن لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے، جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، ارشاد ہوا، ہاں" بولے شام تک مالک کے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہ ہوگا، چنانچہ

شام تک انھوں نے اپنی کل دولت خیرات کر دی، قرآن مجید کا یہی اثر ہے جس کو خطابی نے قرآن مجید کی ایک وجہ اعجاز قرار دیا ہے، اور اس نکتہ آفرینی پر ان کو ناز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن مجید کے وجہ اعجاز کے متعلق ایک بات کہتا ہوں جس سے اور لوگوں نے غفلت برتی ہے، اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب و روح پر پڑتا ہے، کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں باوجود خوف و ہیبت پیدا کرنے کے دل میں لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہیں پیدا کرتا، جو قرآن مجید پیدا کرتا ہے خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"۔ اللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ"[1]

اس کے بخلاف اور انبیاء کے بعض معجزے تو بالکل بے اثر تھے، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ معجزے :-

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (انبیاء - ۶)

اور ہم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے، (مراد ملک شام سے) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں اور بعض بعض شیاطین ایسے تھے، کہ سلیمان کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ لگاتے تھے، (تاکہ موتی نکال کر دیں) اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کیا کرتے تھے اور ہم ان کی حفاظت کرتے تھے۔

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۲۱

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ
وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ
الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ
یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ
مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ
وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ
اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا وَقَلِیْلٌ
مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ،

(سباء-۲)

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو
مسخر کر دیا کہ اُس کی صبح کی منزل ایک
مہینہ بھر کی اور اس کی شام کی منزل ایک
مہینہ بھر کی ہوتی، اور ہم نے اُن کے لئے
تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں بعضے
وہ تھے، جو اُن کے آگے کام کرتے تھے اُن
کے رب کے حکم سے اور ... جنات اُن کے لئے
وہ چیزیں بناتے تھے جو اُن کو منظور ہوتا،
بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے
حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں
اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ
میں نیک کام کیا کرو، اور میرے بندوں
میں شکرگزار کم ہی ہوتے ہیں

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّ
اٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ،

(ص-۳)

اور جنات کو بھی اُن کا تابع کر دیا یعنی تعمیر
بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی
اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں
جکڑے رہتے تھے،

تابع اور متبوع دونوں کے قلب و روح میں کوئی مذہبی اور اخلاقی اثر نہیں پیدا کرتے، بلکہ سرے سے
اُن کو منصب نبوت ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جن و شیاطین کی یہ اطاعت پیغمبرانہ اطاعت نہ
تھی، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کا نتیجہ تھی، اور وہ اُن سے اُسی طرح کام لیتے

جس طرح غزوات میں گرفتار ہونے کے بعد کافر قیدیوں سے لیا جاتا ہے[51]،

البتہ جن و شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو اطاعت کرتے تھے، وہ اس اطاعت سے مختلف تھی، جو وہ کاہنوں اور جادوگروں کی کرتے تھے، کیونکہ کاہنوں اور جادوگروں کو جن وشیاطین ناجائز کاموں میں مدد دیتے تھے،

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اُن سے جائز اور مباح کام لیتے تھے، اس لئے یہ ایک دنیوی احسان تھا، جس پر خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے[52]،

غرض معجزہ کی یہ وہ قسم ہے جو شرعاً محمود ہے نہ مذموم، اس سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، تو وہ ایک احسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے، ورنہ ایک فعل عبث اور تماشا بن جاتا ہے[53]، مثلاً اگر کوئی شخص بلا ضرورت شیر کے اوپر سوار ہوتا ہے، یا پل کے موجود ہوتے ہوئے پانی کے اوپر چلتا ہے، تو یہ ایک فعل عبث اور محض تماشا ہے[54]،

لیکن معجزہ کی ایک قسم اور ہے، جو اُس سے اعلیٰ واشرف ہے، اور وہ صاحب معجزہ اور اسکے پیرووں کو نیکی اور پرہیزگاری پیدا آمادہ کرتی ہے،

معجزہ کی یہی قسم منصب نبوت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، اور قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے! جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی اطاعت قبول کی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مطیع ہوئے تھے، لیکن دونوں اطاعتوں کے نتائج مختلف تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ اطاعت سے ان کو ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں ملا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ اطاعت کا جو نتیجہ ہوا اس کو قرآن مجید نے خود انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

---

۵۱ کتاب النبوات لابن تیمیہ، صفحہ ۳۱۱،

۵۲ کتاب المعجزات والکرامات لابن تیمیہ، صفحہ ۹، ۵۳ ایضاً صفحہ ۵۴ ایضاً صفحہ ۱۳

قُلْ اُوحِیَ اِلَی اللّٰہ استمع نفر من
الجن فقالوا انا سمعنا قرانا عجبا
یھدی الی الرشد فامنا بہ
ولن نشرك بربنا احدا ۱

(جن - ۱)

آپ کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی
آئی ہے، کہ جنات میں سے ایک جماعت نے
قرآن سنا، پھر انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک
عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا
ہے، تو ہم تو اُس پر ایمان لے آئے، اور
ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک

واذ صرفنا الیك نفرا من الجن
یستمعون القرآن، فلما حضروہ
قالوا انصتوا فلما قضی ولوا الی
قومھم منذرین، قالوا یقومنا
انا سمعنا کتبا انزل من بعد موسی
مصدقا لما بین یدیہ یھدی
الی الحق والی طریق مستقیم، یا
یقومنا اجیبوا داعی اللہ وآمنوا
بہ یغفر لکم من ذنوبکم و
یجرکم من عذاب الیم،

(احقاف - ۴)

اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ
کی طرف لے آئے جو قرآن سنتے تھے، غرض
جب وہ لوگ قرآن کے پاس آ پہنچے تو
کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن
پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر
پہنچانے کے واسطے واپس گئے، کہنے لگے
کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر
آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے،
جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی
ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی
کرتی ہے، اے بھائیو! تم اللہ کی طرف
بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر
ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ

ان دونون اطاعتون کا مقابلہ کرکے علامہ ابن تیمیہ کتاب النبوات مین ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ جن وانس کے ساتھ ہمارے پیغمبر کا معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے معاملہ سے زیادہ مکمل ہے کیونکہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت شاہانہ اقتدار کی وجہ سے کرتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پیغمبرانہ اطاعت تھی[1] دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنون کو فرمانبردار بناکر اُن سے چند مباح کام لیتے تھے لیکن ہمارے پیغمبر اُن کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے، اس لئے آپ کی پیروی کرکے وہ سعادت مند ہوگئے تھے، اور پیغمبر کے لئے اور ان کے لئے زیادہ کامل ترین طریقہ ہے[2] لیکن بہت سے معجزے ایسے بھی ہوتے ہین، جن کا اثر خود صاحب معجزہ پر بھی پڑتا ہے، اور دوسرون پر بھی وہ اثر ڈالتے ہین لیکن باین ہمہ قرآن مجید کے روحانی اثر کے مقابلہ مین اُن کا درجہ بہت کم ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ خداوند تعالیٰ کے کلمات کی دو قسمین ہین

۱- ایک کلمات کونیہ جن مین تمام کائنات داخل ہے، انبیاء کے مادی معجزے ان ہی مین شامل ہین،

۲- دوسرے کلمات دینیہ جن مین قرآن، خدا کی شریعت اور اس کے اوامر و نواہی شامل ہین، اور بندہ کا کام یہ ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، اور اس پر عامل ہو جس طرح کلمات کونیہ کے متعلق بندہ کا کام یہ ہے، کہ تکوینی امور کا علم حاصل کرے، اور اُن پر اثر ڈالے،

پہلی قسم کے معجزات سے تکوینی امور کا اور دوسری قسم کے معجزات سے شرعی امور کا علم حاصل ہوتا ہے، اور پہلی قسم کے معجزات مادیات پر اثر کرتے ہین، اور دوسری قسم کے معجزات شرعیات پر، اور جس طرح پہلی قسم کے معجزات کا خود صاحب معجزہ پر تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے ہوا مین اُڑ سکتا ہے، اور آگ کے اندر گھس سکتا ہے، اور دوسرون پر وہ اُن کے ذریعہ سے یہ اثر

---

[1] کتاب النبوات ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۱۰،

ڈال سکتا ہے کہ ان کو بیمار کر سکتا ہے، اُن کو تندرست بنا سکتا ہے، اُن کو مار ڈال سکتا ہے اور اُن کو محتاج اور دولت مند بنا سکتا ہے، اسی طرح دوسری قسم کے معجزات کا صاحب معجزہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اور کتاب وسنت کا پابند ہو جاتا ہے، پھر دوسروں پر وہ یہ اثر ڈالتا ہے کہ اُن کو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اور لوگ شرعی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں لیکن معجزات کا تعلق جہاں تک علم وقدرت سے ہے، اگر وہ موجود نہ ہوں، تو اس سے کسی مسلمان کو کوئی دینی نقصان نہیں پہنچتا، اگر ایک شخص کو غیبی امور کا علم حاصل نہ ہوا اور مادیات اس کے زیر اثر نہ ہوں، تو اس سے خدا کے نزدیک اس کا درجہ کم نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص امور دینیہ کا پابند نہ ہو، تو اس سے اس میں ایک ایسا نقص پیدا ہو جائیگا جس سے یا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا، کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم اور اس کی پابندی کا حکم دینا ایسی چیز ہے جس سے آدمی کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن کائنات کا علم حاصل کرنا اور اس پر اثر ڈالنا، تو اس سے یہ چیزیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں، جب وہ دین میں شامل ہوں، ورنہ کبھی کبھی اس سے آدمی گنہگار بھی ہو جاتا ہے[1]،

معجزات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے پیغمبروں کا دعوے نبوت ثابت نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں معاش ومعاد کا سیدھا راستہ دکھاتا ہوں لیکن وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں، تو یہ دلیل گو کتنی ہی عجیب وغریب ہو، لیکن اس کو دعوی کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اس کا یہ دعوی تو صرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے، جب وہ معاش ومعاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتائے اور

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۹،۰،

لوگوں کو ان کا پابند بنائے، لیکن یہ اعتراض کلمات کونیہ یعنی مادی معجزات پر ہوتا ہے، کلمات دینیہ یعنی قرآن مجید پر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتاتا ہے اور لوگوں کو ان کا پابند بناتا ہے، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کے ساتھ نہایت گہرا ربط و تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہی آپ کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی،

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر آئے وہی خداوند تعالیٰ کی شریعت اور اس کے دینی کلمات ہیں، اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے، دعوت بھی ہے، اور معجزہ بھی ہے،[۱]

بہر حال قرآن مجید ایک معجزۂ ناطق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیتا ہے وہ زبان قال ہے لیکن اور انبیاء کے مادی معجزے صرف زبان حال ہیں، زبان قال نہیں، وہ پانی کے اوپر چلنے ہوا میں اڑنے اور آگ میں گھسنے کی طاقت تو نہیں پیدا کرتا، لیکن نیک کاموں پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے، جو دین و دنیا دونوں میں مفید ہیں، مثلاً جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم لوگ جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں
(آل عمران - ۱۰)	کو نہ صرف کروگے نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے،

تو حضرت ابو طلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ "خدا ہمارا مال مانگتا ہے آپ گواہ رہئے کہ اریحا میں میری جو زمین ہے میں اس کے نام پر وقف کرتا ہوں"، زمانہ جاہلیت میں عرب کی عورتیں نہایت بے پروائی کے ساتھ ڈوپٹہ ڈالتی تھیں، اس لئے سینہ اور سر وغیرہ کھلا رہتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	عورتوں کو چاہئے کہ اپنے ڈوپٹوں کو سینے پر ڈال لیں

---

[۱] المعجزات والکرامات ص ۱۰،

اس کا یہ اثر ہوا کہ عورتون نے اپنے تہ بند اور متفرق کپڑون کو پھاڑ کر دوپٹے بنائے اور اپنے آپ کو سیاہ چادرون سے اس طرح ڈھانپ لیا کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سر کوون کے آشیانے بن گئے ہین،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ ناپ جوکھ مین سخت خیانت کرتے تھے، اس پر سورہ ویل للمطففین نازل ہوئی، اور لوگ دیانت سے کام لینے لگے،

اصحاب صفہ کی معاش کا بہت کچھ دارومدار انصار کی فیاضی پر تھا، یہ لوگ کھجور کے خوشے لاکر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، اصحاب صفہ آتے تھے، اور چھڑی سے اُن کو ہلاتے تھے، جو کھجورین ٹپک پڑتی تھین اُن کو کھا لیتے تھے، لیکن انصار مین کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو سڑے گلے خوشے لاکر لٹکا دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یاایھا الذین آمنوا انفقوا من طیبات	مسلمانو! اپنی بہترین کمائی اور بہترین
ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض	پیداوار سے صدقہ دو، بُرے مال کو
ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون، (بقرہ ۳۷)	خیرات نہ کرو،

اس کے بعد دفعۃً اس حالت مین انقلاب پیدا ہوگیا، اور تمام لوگ بہترین کھجورین لانے لگے،

اسلام کے فرائض و اعمال مین جہاد سب سے خطرناک کام ہے لیکن صحابۂ کرام کو قرآن مجید ہی کے اثر نے جہاد پر آمادہ کیا تھا، اور اسی اثر کی بدولت وہ سخت سے سخت جنگی خطرات مین ثابت قدم رہتے تھے، ایک بار قسطنطنیہ مین رومیون سے مسلمانون کا مقابلہ ہوا، رومی بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے متصل صف زن تھے، ایک مسلمان نے جرأت کرکے حملہ شروع کیا، تو لوگ پکارے "ہان ہان اپنی جان کو ہلاکت مین ڈالتے ہو" حضرت ابوایوب انصاریؓ ساتھ تھے، بولے "یہ آیت تو ہم انصار کے بارے مین نازل ہوئی ہے" جب اسلام نے قوت حاصل کرلی تو ہم لوگ اپنی معاش کے کام

دھندے مین مشغول ہوگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَانفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَا تُلقُوا بِایدِیکُم اِلَی التَّھلُکَۃِ (بقرہ - ۲۴)   اور خدا کی راہ مین خرچ کرو اور اپنی جانون کو ہلاکت مین نہ ڈالو،

اس لئے اصلی ہلاکت یہ ہے کہ ہم معاش کے کاروبار مین مشغول ہوجائین، اور جہاد کو چھوڑ دین، راوی کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہمیشہ مصروف جہاد رہے، یہان تک کہ قسطنطنیہ مین وفات پاکر مدفون ہوئے، جنگ یمامہ مین جب حضرت سالمؓ کو علم عطا کیا گیا، تو ایک شخص نے کہا کہ ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے، اس نے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ مین دینا چاہتے ہین، بولے تو مین اس حالت مین قرآن مجید کا بدترین حامل ہون گا، چنانچہ انھون نے علم کو داہنے ہاتھ مین لیا، جب وہ کٹ گیا، تو بائین ہاتھ مین لیا، وہ بھی کٹ گیا، تو علم کو سینے سے چمٹا لیا، اور یہ آیت پڑھنے لگے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ ... وَکَاَیِّن مِن نَبِیٍّ قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّونَ کَثِیرٌ، (آل عمران - ۱۵)   محمد صرف ایک پیغمبر ہین ..... اور بہت سے پیغمبر گذرے ہین جن کے ساتھ ہوکر بہت سے علماء نے جنگ کی ہے،

(باقی)

اجتماعیت کا قرآنی تصور

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

کائنات ہستی فطرت کی عجوبہ زایون اور جدت طرازیون کی آماجگاہ ہے اور اس جہان رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین و پرکشش واقع ہوئی ہے کہ اس مین نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتین ابھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہان تاب ہے، جو پوری کائنات کو اپنے جلو مین لئے ہوئے ہے، صحن گلشن کا حسین منظر ہو، یا لق و دق صحرا کی تا بحد نظر وسعت، شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلین ہون، یا دشت وحشت خیز کی خاموش، اور پرسکون خلوتین، صبح حیات کی مسکراہٹین ہون، یا شام زندگی کی وحشتناکیان آبشارون کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑاک، بزم طرب شادی کے نغمہ ہائے مسرت ہون، یا مجلس تعزیت کی دلفگار آہین، یہ سب کچھ دل خوذ آگاہ و حقیقت شناس کی نظر مین ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیان ہین، ایک ہی نور مطلق پر اُن کی انتہا ہوتی ہے،

وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون،	زمین اور خود تمھارے وجود مین اہل یقین ایمان کے لئے نشانیان ہین، کیا تم دیکھتے
(الذّٰریات)	نہین ہو ؟
ان فی ذٰلک لذکری لمن کان له	بلاشبہہ اس مین نصیحت و عبرت ہے، اس کیلئے

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ جو اپنے پہلو مین حساس دل رکھتا ہے،

(ق) یا پوری طرح متوجہ ہو کر کان ... لگاتا ہے

ارض وسما کی یہ کائنات جو روزمرہ ہمارے مشاہدہ مین آتی ہے، اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہے اور اپنے کام اور وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیائے عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے مگر پردہ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر حقیقت پر نگاہ ڈالئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاق گیر نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے، اور ہر وجود و شخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے، عالم لاہوتی ہو، یا کائنات ناسوتی محفل انجم ہو، یا جہان نباتات ارضی، نظام سحاب و باد و باران ہو، یا سلسلۂ کوہ و بیابان غرض اس عالم کی ہر چیز ہمہ گیر نظام کائنات کی ایک کڑی ہے، یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہے جس کا وجود و بقا کارخانہ کے وجود و بقا پر موقوف ہے،

قرآن کریم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور ان کی اجتماعی تاثیر و افادیت مین غور و فکر کی دعوت دیتا ہے عالم افلاک، عالم جو سما اور ہمارے جہان رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیاء کے معنوی اور افادی تعلق و ربط کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ بشیتر مقامات مین قرآن خود ہی اشیائے عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان مین ذکر کرتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ	کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہین دیکھا کہ اس
شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ	نے سایہ کو کیسے پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اسکو
عَلَيْهِ دَلِيْلًا، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا	ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل
قَبْضًا يَّسِيْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ	قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی
الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ	طرف کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمھارے لئے
النَّهَارَ نُشُوْرًا، وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ	رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا اور

الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ،

(الفرقان - ۵)

اسی نے زمین کے اندر پھیل جانے کی غرض سے دامن بنایا، وہی ذات ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی ہیں، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اتارا، تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیوں کو آباد کریں اور یہ پانی اپنی مخلوق میں سے چارپایوں، اور بہت سے لوگوں کو پلائیں،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

(النور)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر ان کو جمع کرتا ہے پھر ان کو تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑوں کی بلندی کی جانب سے برف (جو فضا میں ہوا سرد سے منجمد ہوتی ہے) اتارتا ہے، پس یہ برف جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر لیتا ہے قریب ہے کہ بجلی (جو بادلوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے) کی چمک آنکھوں کی

عالم ارض و سما کے اس وسیع تر نظام افادہ و اشتراک اور اس کے حسین و جمیل مناظر میں اہل بینش کے لئے جو چیز وجہ کشش ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے، چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ذرہ سے لے کر پہاڑ

تک، آب جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمان کی بلندی تک عالم نباتات سے لے کر جہان مہر و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے، گویا وہ کیف و مستی کے عالم میں مستانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے،

وابرح مایکون الشوق یوماً

اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے، یا دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے، جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے اور عصر حاضر کے کچھ حواس باختہ اور خود ساختہ مفسرین اسلام کو نازی ازم اور فیسی ازم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست، اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملی قوانین (انٹرنیشنل لاز) کا منشور تصور کرتے ہیں، لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے، ایک ہمہ گیر اور آفاقی نظام اطاعت ہے، کائناتی دستور حیات ہے، اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم	کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر
من فی السموٰت والارض طوعا	دوسرا دین اختیار کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمان
وکرھا والیہ یرجعون،	اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت
(آل عمران)	گذار ہیں، اور ان کو بالآخر اسی کی طرف

دراصل اسی نظام اطاعت اور سررشتۂ اجتماعیت سے اس عالم کا بنا و سنگار اور حسن بہار آفرین قائم ہے، بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے، اور جو چیز اس آفاقی گیر نظام سے کٹ جاتی ہے اس کا انجام بہرحال خسران و نامرادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن	جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو تلاش

یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین، (آل عمران)

کرے گا تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا، اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا،

بلکہ ایسی چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے، درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے، اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا پاؤں کی رگڑ سے ذرہاے خاک میں تحلیل ہوا، یا ہوا سے تند و تیز اس کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی، دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے لگ حاصل کر رہی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود ہی کو باقی نہیں رکھ سکتی،

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ و دستور اور نظام اطاعت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہان کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف ہے، کارز

خلافت آدم کا مفہوم | نوعِ انسانی اسی عظیم الشان کارخانہ، قدرت کا ایک فعال اور موثر عنصر ہے، عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامۂ ایجاد و تخلیق کی نو بہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے رنگارنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجود موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں، اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگی، اور وحشت انگیز ہوتی، آخر یہ حضرت انسان ہی تو ہیں جس کی پیدائش پر دیار عشق میں ہنگامہ و شور اٹھا، جہانِ حسن میں تہلکہ بپا ہوا، اور فطرت نے ممکناتِ وجود کی تمام راہیں اس کے لئے واکردیں،

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد | حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور | خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے لیکن خود انسان کیا ہے اور عالم امکان میں اسکا مقام و موقف کیا ہے؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع

کی حقیقت خود بخود ہی منکشف ہو کر سامنے آجائے گی،

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا، تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا جو اپنی طبعی اور فطری قوت تخلیق سے انواع کائنات میں تصرف کر سکے، اس کا آہنی عزم ویرانوں کو آباد کرے، دریاؤں سے نہریں نکال کر خشک زمینوں کو شاداب کرے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت و صحرا کو کشت گل و لالہ میں تبدیل کرے، خوش منظر اور بارونق شہروں کی بنا ڈالے اور اس کا علمی و تحقیقی جوہر اشیاء کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے، موالید و عناصر کی مدد سے نئے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو مسخر کرے، ہوا پر اپنا تسلط جمائے، یہاں تک کہ ارض و سما کی ناپائدار کنار وسعتیں اس کے لئے سمٹ جائیں اور وہ اپنے علم و عمل سے کائنات پر حکمرانی کرے، اسرار فطرت کی آگہی کے ساتھ عالم وجود کی ہر شے کو منشائے قدرت کے مطابق کام میں لائے، اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد و اختلال کا باعث ہو، بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی میں پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو اور کوہ و بیابان اس کی ہمارا آفرینیوں سے مہک اٹھیں،

حاصل یہ ہے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کے ارتقاء کے لئے کچھ قوانین طبعی بنا دیئے ہیں تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی وجود و تشخص کی حفاظت و صیانت میں مصروف کار رہیں، لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانہ فطرت میں حسن و دلکشی پیدا کرنے، ان کو خلاق عالم کے منشاء کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور صاحب ارادہ ہستی کی ضرورت تھی، اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسانوں کو پیدا کیا،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی	خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (اقبال)

بس لئے انسان کا تصور حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرار فطرت کی کھوج لگائے اور حقائق کائنات کی طلب وجستجو مین اپنی علمی اور عملی قوتین صرف کرے، بلکہ اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ اسرار فطرت کی دریافت اور حقائق اشیا کے انکشاف سے اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیاء عالم اور قوانین فطرت مین زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو اور خالق عالم کے ذریعہ اثرات نتیجہ و عمل کو کام مین لائے، لہذا خلافت آدم کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے قدرۃً انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے شعور وارادہ اور قوائے علم وعمل سے کائنات مین تصرف کرے، اور یہ حیثیت طبعی یہ حق مطلق انسان کو حاصل ہے کسی خاص گروہ انسانی سے مخصوص نہیں ہے، لیکن یہ مسلّم ہے کہ قدرت کے اس کارخانہ مین حق یونہی مفت تقسیم نہیں ہوا کرتا، بلکہ اس کے لئے علم وعمل کی مخصوص صلاحیتین ضروری قرار دیگئی ہین،

وَلِکُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا اور ہر ایک کے مرتبے اس کے اعمال کے مطابق ہوتے ہین،

مثلاً یون سمجھئے کہ خدا نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، اور زیادہ سے زیادہ دولت کمائے لیکن اس دنیا مین بہت سے لوگ ایسے ہین جو اس حق سے محروم ہین محض اس لئے کہ اس مقصد کے لئے جس طرز کی کوشش وسعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اس کو وہ کام مین نہین لاتے، بالکل یہی حال خلافت کا ہے، کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہین تمام انسانون کے لئے یکسان وا کردی گئی ہین لیکن اس کو علم وعمل کی صلاحیتون سے مشروط کر دیا گیا ہو، چنانچہ قرآن حکیم نے ایک جگہ ذکر خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا، (بقرہ) خدا نے آدم کو حقائق اشیاء کا علم عطا کیا،

اور ایک دوسرے مقام پر خلافت کو عمل سے مشروط کیا گیا ہے،

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ	پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ	میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل
(سورۂ یونس)	کرتے ہو

زمانہ حال کے خود ساختہ شارحین اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت و اقتدار کی ہم معنی ہے اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ اُن کی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک علی درجہ مقام بندگی ہے، شرفِ انسانیت کی معراج ہے، علم و عمل اور فضائل خلاق کی وہ پاکیزہ تر منزل ہے، جو عصرِ حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، ؎

با تو چہ گویم کہ تو مجنون تنی!

یعنی خلافت آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتداے آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے کہ وہ خدائی صفات کمال کا مظہر اتم بن کر کائناتِ ارض کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لے، اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشاے خداوندی کے مطابق چلائے،

نائبِ حق در جہان بودن خوش است	بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است	ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو کل آگاہ بود	در جہان قائم بامر اللہ بود
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است	از جلالِ اُو نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیر نو

می دہد این خواب را تعبیر نو

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اس طرح

انجام دے جس طرح اُس کے منوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے، اور اس ہدایت نامہ سے سرِ موانحراف نہ کرے، اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہے تو وہ اصولاً اپنے منصبِ نیابت کا اہل نہیں رہتا، کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور انتفا، شرط انتفا، مشروط کو مستلزم ہے،

لہٰذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے، البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے لیکن حکومت و اقتدار خلافت کو مستلزم نہیں ہے یعنی جس گروہِ انسانی کو منصبِ خلافت عطا ہوگا، حکومت و اقتدار کی مسند بھی اُسے حاصل ہوگی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو' وہ منصبِ خلافت سے بھی سرفراز ہو، گویا خلافت ایک عظیم القدر مقامِ حریت ہے جو اس عالمِ رنگ و بو میں نہیں سما سکتا، بلکہ وہ سپہرِ نیلگون اور جہانِ انفس و آفاق کو محیط ہے،

نکتہ می گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیاز عبد و حر
عبد گردد یا وہ در لیل و نہار در دلِ حُر یا وہ گردد روزگار (اقبال)

آج اہلِ مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی، عالمِ انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا، چنانچہ پروفیسر جوڈ اور یہودی النسل فلسفی اسکونٹ سموئل اور دیگر کئی علما، و مفکرین نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے دوامی اور مستقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے لیکن جس حقیقت کو ہم "خلافت" کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں، دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تصورات پر مبنی ہے، اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطۂ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کافی نہیں ہے' بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے، جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے،

اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اسکی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت مظلوم
ہوتی ہے، وہاں اس کا دامن عدل و انصاف وا ہوتا ہے، اور جہاں فسق و بہیمیت کی وبا پھوٹتی ہے
وہاں وہ تقوی و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے غرض خلافت کیا ہے؟ سراپا برکت و خیر، سراسر عدل
و انصاف اور یہ ہمہ جہت اصلاح و تعمیر کی سیاہی ہے

اجتماعِ انسانی کا قرآنی تصور

ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، کہ انسانی اجتماعیت
کا حقیقی موقف کیا ہے، اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک
مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں، جو انسان کے علاوہ جہان
ارض و سما میں ہر لمحہ جاری و ساری ہیں، اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں، لیکن اُن کی خارجی
اور عملی تشکیل کی ابتدا حضرت آدم کی پیدائش سے ہوتی ہے، جب کہ اُن کو پیدا کرنے کے بعد منصب خلافت
سے نوازا گیا یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہونا سلسلۂ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے
اور خلافت کا مفہوم ہی اس خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کر رہا ہے، کیونکہ خلافت کا
لفظ انسانوں کی سیاسی و تمدنی اور اجتماعی ہیئت وحدانی پر دلالت کرتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ
پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کا شعور ہی موجود نہ تھا، اور وہ پہاڑ کے غاروں میں رہتا، درختوں کی پتیاں
کھا کر گذارا کرتا تھا، قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفۂ فطرت ہے اس کا دعوی یہ ہے کہ انسان اول
ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے، اور پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں
وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ان کی خارجی تشکیلات بڑھتی پھیلتی اور بدلتی رہی ہیں،

غرض قرآن حکیم کے نزدیک وحدتِ انسانیت یا اجتماعیت کی اساس ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس
اخلاقی نصب العین ہے، جو رأی العین سے دمزار اور ہی ہے، اور وہ اسی تصور و اجتماع کی بنیادوں پر
انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہی وہ تصورِ حیات ہے جس سے انسان کو پہلے دن ہی آگاہ

کر دیا گیا تھا، لیکن جہان تک کہ مادی نظریہ ہائے اجتماع کا تعلق ہے، وہ انسانون کی عقل خودبین کی جدت کوشیون اور مفاد پرستیون کی پیداوار ہین، اور سراسر غیر فطری ہین، لیکن سطور بالا مین جس تصور اجتماع کا ذکر ہوا ہے، وہ دینی تصور اجتماع ہے، اور اسکی اساس عالمگیر اور محیط کل اصول حیات ہین جو کسی مخصوص نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص نہین رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماع قبیلہ و نسب اور قوم و وطن کی حد بندی پر مبنی ہین اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے نسلی طبقون اور وطنی قومیتون مین تقسیم کرنیوالے ہین،

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے، اور اس کا اگر عالم مین انسان کو زندگی کے مرحلۂ اول پر ہی اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے، تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، اور پھر وہ جس قدر نشو و نما کے مرحلے طے کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر اس کے علائق مین توسیع ہوتی چلی جاتی ہے، یہان تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقۂ علائق مین جکڑا ہوا پاتا ہے، اور یہان پہنچکر اس کو گردوپیش کے اجتماعی اور تمدنی تصورات سے سابقہ پڑتا ہے، اور وہ یا تو ایک ہمہ گیر رشتۂ اخوت دینی مین منسلک ہو جاتا ہے اور یا وہ محدود اور سطحی علائق کے تنگ دائرہ مین سمٹ کر رہ جاتا ہے،

انسانون کے بنائے ہوئے تصور اجتماع کو مختلف ارتقائی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا، اور رفتہ رفتہ تعلقات مین وسعت پیدا ہوتی گئی، اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے مقصود بنا لیا، اور یہان پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہے، اور آج وطنی قومیت نے اُس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط جما لیا ہے، کہ اس کی نظر مین انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہین رکھتا، ایک قوم دوسری قوم پر درندون کی طرح چل پڑتی ہے، اس کے گوشت سے شکم پر کرتی، اُس کی ہڈیون سے اپنے مستقبل کی سر بفلک عمارت تعمیر کرتی، اور اُس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے، غرض اس بنا پر

کے ہاتھون آج انسانیت بسترِ مرگ پر کراہ رہی ہے ،

فکرِ انسان بت پرستے بت گرے ہر زمان در جستجوے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند پیش پائے این بتِ ناارجمند

مغرب کی نشأۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ قائم کیا ، اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا ، تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصورِ زندگی سے پُر کیا جائے ، یعنی کوئی ایسا تصورِ زندگی ڈھونڈھ نکالا جائے ، جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقار کے لئے ایک قوی تر اور مضبوط تر محرک کا کام دے سکے ، لیکن اس کا انسانی ذہن گردوپیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گذر رہا تھا ، اُن کے تقاضون نے انسان کو تہذیبِ حاضر کے نوتراشیدہ بُت (ملک وطن) کے آگے سرنگون کر دیا ، یہ زمانہ اٹھارہوین صدی کے اوائل کا زمانہ تھا ، جب کہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ اور مستقل تصورِ مملکت کی حیثیت سے منظرِ ظہور پر آئی ، اور اُس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا ، اس وقت سے آج تک وطنیت کا زہرناک تصور اقوامِ حاضرہ کی سیاست و معیشت کی روح روان ہے اور وطنی قومیتون کی سرفرازی کا مضبوط محرک بنا ہوا ہے ، لیکن اس کے ساتھ اُس نے انسانی قدرون کو جس طرح رسوا کیا ہے ، اس کی چند مثالین گذشتہ عالمگیر جنگون اور تقسیمِ ہند کے بعد کی وحشتناکیون مین دیکھی جا سکتی ہین ،

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اُس سے محبت کرتا ہے ، اسکے ریگ زارون ، بیابانون ، کہسارون ، دریاؤن اور چمنستانون مین اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے ، لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ زمین کے کسی خطہ کو جو محض اسکی رہائش اور تمتع کے لئے بنایا گیا ہے ، اپنا کعبۂ مقصود بنالے ، آخر انسان کو اسی لئے تو نہین پیدا کیا گیا کہ وہ

زمین کی پہنیوں میں اپنے آپ کو گم کر دے ؟ حضرت اقبال نے اس ضمن میں کیا خوب نکتہ بیان کیا کہ

با وطن اہلِ وطن را نسبتے است ‌ ‌ ‌ زانکہ از خاکش طلوع ملتے است

اندریں نسبت اگر داری نظر ‌ ‌ ‌ نکتۂ بینی ز مو باریک تر

گرچہ از مشرق برآید آفتاب ‌ ‌ ‌ با تجلیہاے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوز درون ‌ ‌ ‌ تا ز قید شرق و غرب آید برون

بر دمد از مشرق خود جلوہ مست ‌ ‌ ‌ تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

گرچہ او از روے نسبت خاوری است

مملکت کا جدید تصور اس نئی وطنی شریعت میں قوم اور مملکت ایک ہی معنوں کے دو عنوان ہیں یعنی جب ایک ملک میں بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، تو اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ کو مملکت کا نام دیا جاتا ہے، اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے گویا مملکت ہو یا قوم اس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجود وطنیت کا تصور ہے، اور عہد حاضر میں افراد انسانی کے باہم اشتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ ہو، ایک ملک کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں لیکن اس لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطۂ زمین میں اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہیں، اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ سیاسیہ کو مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ ان میں اتحاد وطن کا رشتہ موجود ہے اس لئے وہ ایک مستقل اور جداگانہ قوم ہیں، رہا عقیدہ اور مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور اُن کی قومیت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا، گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی درجہ دیتا ہے بلکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ہنگاموں سے دور اور گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہوں

مین محدود رکھنا چاہتا ہے، اور جہان تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے، وہ ایک با اقتدار اور معصوم سیاسی ادارہ ہے جو بلا شرکت غیرے مقتدر بھی ہے اور اخلاقی قدرون کا خالق بھی ہے، اس کو کسی مذہب اور ضابطہ اخلاق کی ضرورت نہین ہے، بلکہ وہ بذات خود ایک دین و مذہب ہے، جس چیز کو یہ صواب کہے وہ صواب اور جس کو وہ خطا کہے وہ خطا ہے۔

دین و سیاست اور مذہب و ریاست کی تفریق جدید تصور تو سے بہت پہلے سولہوین صدی مین منظر شہود پر آچکی تھی، اور اس کا سہرا مشہور فلسفی میکیاولی کے سر ہے، اس شخص نے سب سے پہلے مملکت کو مذہب و اخلاق کی گرفت سے آزاد کیا، اور بالکل ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی یعنی اس نے بتایا کہ مقصود بالذات مملکت کی ترویج و ارتقاء اور اس کی خوشحالی ہے، اس راہ مین جو چیز بھی حائل ہو اس کو مٹا دینا چاہئے خواہ وہ مذہب و اخلاق ہی کیون نہ ہو، ہان اگر مذہب و اخلاق سے مملکت کی توسیع اور قوت و اقتدار کے حصول مین مدد مل سکتی ہو تو محض اس غرض کے لئے مذہب کے نام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض ایک فریب کارانہ نقطۂ نظر اور سیاسی حکمت عملی (پولٹیکل سٹنٹ) کے طور پر ہی ہونا چاہئے، ورنہ مقصود بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے، بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا جرم اور بڑی سے بڑی بد اخلاقی بھی عین ثواب ہے، جب کہ اس سے مملکت کو کوئی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو اور جہان کسی اخلاقی منصد کی خاطر مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہان یہ اخلاقی مقصد اس کے نزدیک ناقابل معافی گناہ ہے۔

مغرب کی تاریک فضا مین جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی کارستانیون، غرض پرستیون اور اوہام طرازیون سے سخت نالان تھے، اور کلیسا و شاہی کے باہمی تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش مین مبتلا تھے، انھون نے میکیاولی کے اس نئے دین کو بہت آسانی سے قبول کر لیا، بالخصوص وقت کے بادشاہون نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، اور کلیسا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا، مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے

پایا تھا کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقوں کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت میں نمودار ہوا، اور اب مغرب کے انقلاب پسندوں نے ایک جدید سیاسی جمہوری اور صنعتی انقلاب بپا کرنے کی ٹھان لی، بیشتر مغربی ممالک میں انقلابی تحریکیں اٹھیں، ہنگامے بپا ہوئے، اور عوامی طبقوں اور حکمرانوں میں شدید تصادم رونما ہوا، بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان حکمرانوں کو سرنگوں ہونا پڑا، اور انھوں نے ہٹ ہٹا کر مسند اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشأۃ ثانیہ کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے، جب کہ مغرب میں جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتیں قائم ہوئیں، اور قدیم مملکتی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریوں (تھیوریز) نے جنم لیا، چنانچہ وطنی قومیت اور مملکت کا جدید تصور اسی عہد کی پیداوار ہے، مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا، وہ اتنا ہی ہے کہ انھوں نے ملک و وطن کی بنیادوں پر جدید فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر رشتۂ اخوتِ انسانی کو تار تار کر کے رکھ دیا، چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و ایمان بن گیا، اور اُن کے جینے مرنے صلح و جنگ اور تمام اعمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد پایا،

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد — زیر گردون رسم لادینی نہاد

یعنی جہاں تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے، اس میں میکیاولی کا تصور ہی کارفرما تھا، چنانچہ عہد جدید کے یورپ میں جو علماء و مفکرین پیدا ہوئے، ان میں سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصورِ مملکت کو سراہا، بلکہ اُن کے جدید نظریوں نے اس کو اور زیادہ تقویت دی، اور اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا، چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا، کہ اُس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا، یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے، یہاں تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے، گویا مملکت کسی چیز کی تابع نہیں اور باقی تمام چیزیں مملکت کی تابع ہیں،

ہیگل کے تصور مملکت نے مذہب، اخلاق کی روحانی برتری پر چوٹ لگائی تھی، وہی کیا کم تھی
کہ ڈاروِن کے نظریۂ کائنات نے اس کے جسد نیم جان پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب و
خدا کا تصور محض عجوبۂ روزگار یا دگار بن کے رہ گیا، اور اس کے بعد اس جدید مملکتی تصور نے ہمہ گیر نوعیت
اختیار کرلی، چنانچہ کارل مارکس اور اینجلز جو دنیائے جدید کے خالق مانے جاتے ہیں، ہیگل اور ڈارون
کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی یعنی مارکس کا نظریۂ
تاریخ دراصل ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا غماز ہے، اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگن
کی جدلیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے، لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمام تر دوسروں کے دماغی کارنامو
سے استفادہ کرکے ایک عجیب و غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا، آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور
کیا جاتا ہے، اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا بھکاری ہے۔
بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر یہی ہے جس کی ابتداء سولہویں صدی میں ہوئی
تھی، لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے، اور
خدا و مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کردیا، چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک
مذہب و خدا کا تصور محض ایک فریب ہے، سرمایہ دارانہ ذہن کی اُپج ہے جس کو عوامی طبقوں کی دولت و
دعزت کا شکار کرنے کے لئے بطور ہتھکنڈے کے استعمال کیا جاتا رہا ہے، اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی
مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہر لحظہ بدلنے والی چیز خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار اُن کے نزدیک
یہ ہے کہ جو چیز اشتراکی ریاست و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو، وہ خیر اور صواب ہے، اور جو اسکی
تخریب و فساد پر منتج ہو وہ شر اور خطا ہے،
لینن کہتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظام اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطر
طاقت کا بنایا ہوا ہو، اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظام فکر و اخلاق سراسر فریب ہے،

نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استحصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ میں ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب سرمایہ دار سے لڑیں گے، تو اس جنگ میں جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہیں،

غرض زمانۂ حال کا جدید تصور ملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر سے ترکیب پاتا ہے، ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہیں، وہ اُن کو خلفشار و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس اتھاہ سمندر کی پہنائیوں کی طرف لئے جارہا ہے، جہاں سے اُن کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے،

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہاں ہمہ گیر اصول انسانیت اور آفاق گیر اقدار حیات کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہاں احترام آدمیت کا معصوم جذبہ قطعی ناپید ہو، جہاں ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزاروں ناکردہ گناہ انسانوں کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جارہی ہو، جہاں وحشت و درندگی کو نا قابلِ فخر کارنامہ، اور معصوم بچوں، ضعیفوں اور عورتوں تک کو انتہائی بے دردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو، کیا وہاں انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسّر آسکتا ہے ؟

بس یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزوں خلفشار اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانوں کی درندگی و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنا دیا ہے کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوت انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں ہے،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ	نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ	نہیں کیا، اُن کے لئے ہی امن

مُهْتَدُوْنَ۔ کی زندگی ہے، اور وہی لوگ ہدایت

(الانعام) پانے والے ہیں،

ان ہمہ گیر اصول انسانیت کے سوا جو کچھ ہے، وہ ظن وتخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے، اور اس

کارحیات کی الجھنیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائیں گی، سہ

ع :۔ راہبر ہو ظن وتخمین تو زبوں کارحیات

مولینا عبد الملک بنبانی محدّث

از

ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی

مولینا سید سلیمان صاحب ندوی نے عرصہ ہوا ہندوستان کے محدثین کرام کے تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن چند کڑیون کے بعد یہ اہم سلسلہ کسی وجہ سے جاری نہ رکھا جا سکا، اس کے بعد معارف مین ہندوستان کے محدثین پر چند اور مضامین شائع ہوے، ذیل کی سطرین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہین،

ہندوستان مین گجرات وہ خوش قسمت صوبہ ہے جہان علم حدیث کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی، عام طور سے ہندوستان مین علم حدیث کی اشاعت کی ابتدا حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، حضرت موصوف کی جلالت شان اور حدیث نبوی کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ہندوستان مین یہ علم شریف پہلے پہل صوبۂ گجرات مین اشاعت پذیر ہوا، چنانچہ علامہ سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی (متوفی سنہ ۹۲۹ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بحرق (متوفی سنہ ۹۳۰ھ) شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے دو شاگرد شیخ عبد المعطی بن الحسن باکثیر المکی (متوفی سنہ ۹۸۲ھ) اور شیخ شہاب الدین احمد العباسی المصری (متوفی سنہ ۹۹۲ھ) علامہ ابن حجر کے دو شاگرد شیخ محمد ابن عبد اللہ الفاکہی الحنبلی اور شیخ سعید شافعی اور دیگر کئی محدثین کرام نے صوبۂ گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، اور احمد آباد مین مدارس کھولے، اس کے علاوہ خود گجرات کے بے شمار علماء کو احادیث نبویہ کا بڑا ذوق تھا، حضرات صوفیہ نے اس کی تحصیل مین والہانہ انہماک کا ثبوت دیا، اور دربار کے اعلیٰ

عہدہ داروں نے اس علم شریف کے حصول کے لئے بوریانشینوں کا تلمذ اپنے لئے باعث نجات سمجھا، علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے ایک بنیانیوں کا خاندان ہے، اس خاندان نے بہت سے علماء پیدا کئے، جو آسمان علم کے درخشاں ستارے ثابت ہوئے، اور افتاء و قضا کے جلیل القدر مناصب پشتوں تک اُن کے خاندان میں رہے، اور اس خاندان کے باکمال افراد نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا، بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی، علماء کی قدردانی صلحاء و اتقیاء سے عقیدت نیازمندی اور اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا، بنبانیوں کی اصل کے متعلق جمعات شاہیہ جلد چہارم (قلمی) میں اس طرح لکھا ہے:-

"بنبان ولایتی ست، ما بین خراسان و ملتان و این جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بنبانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از حضرت عبد اللہ بن عباس اند"

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس خاندان کے بزرگوں نے کس زمانہ سے گجرات میں سکونت اختیار کی لیکن اس کے علماء میں شیخ صدر الدین کا زمانہ سب سے مقدم معلوم ہوتا ہے، شیخ صدر الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کو انھوں نے شاہان گجرات کے نام سے معنون کیا، شیخ مذکور کو عربی ادب اور صرف و نحو سے خاص لگاؤ تھا،

قصیدۃ البردہ، قصیدہ کعب ابن زہیر، قصیدہ لامیہ (قاضی عبد المقتدر) وغیرہ پر انھوں نے حواشی لکھے ہیں، نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی انہی کی ہے، ہندوستان میں غالباً اس کتاب کی سب سے پہلی شرح یہی ہے، شیخ نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام تفسیر بحر المعانی رکھا، وہ غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بقید حیات تھے،

شیخ منہاج الدین بنبانی غالباً شیخ صدر الدین کے بیٹے تھے، انھیں علم حدیث تصوف اور صرف و نحو سے بہت دلچسپی تھی، علم النحو میں اُن کے مرتبہ کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

جب مشہور مصری عالم شیخ بدرالدین دمامینی احمد آباد مین قیام پذیر تھے، اس وقت ان مین اور شیخ منہاج

مین چند نحوی مسئلون کے متعلق بحث چھڑ گئی اور دمامینی کو اُن کے رد مین ایک کتاب الفتح الربانی

فی الرد علی البنبانی لکھنی پڑی، اُن کی تصانیف کی تعداد ۸۰ سے متجاوز تھی، لیکن حدیث کی تالیفات

مین سے صرف بخاری اور مسلم کی شرحون کے نام ہم تک پہنچے ہین،

شیخ فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی کا ہمین شکر گذار ہونا چاہئے کہ انکی مجمع النوادر سے اکثر

حالات ماخوذ ہین، شیخ فیض اللہ گجرات کے مشہور سلطان محمود بیگڑے (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ) کے خزانچی تھے،

شیخ نے قرآن مجید کی تفسیر دستور الحفاظ اسی سلطان کے نام سے معنون کی ہے،

اس کے علاوہ اُن کی تاریخ صدر جہان[۵۱] اور مجمع النوادر[۵۲] نہایت مفید تصانیف ہین، اتفاق سے

یہ تینون نوادر دست وبرد زمانہ کے ہاتھون برباد ہونے سے بچ گئے ہین،

اسی خاندان کی ایک مایۂ ناز ہستی شیخ عبدالعزیز المعروف بہ عبدالملک بنبانی ہے، ان کا سلسلہ نسب

حضرت عبداللہ بن عباس سے ملتا ہے جس کی چند کڑیان حسب ذیل ہین،

شیخ عبدالملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیرالدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ

عیسیٰ بن شیخ حسن بن شیخ ایاس،

شیخ عبدالملک زین البلاد احمد آباد مین پیدا ہوئے، اور وہین ۹۷۰ھ کے قریب قریب انتقال

فرمایا، خاندان کے اور بزرگون کی طرح شیخ عبدالملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالباً

اُنہی کی خانقاہ مین تعلیم پائی ہوگی، حدیث اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین بنبانی سے پڑھی جن کو

---

۵۱ مختصر نوٹ کے لئے دیکھو روئداد کل ہند تاریخ کانفرنس اجلاس بمبئی گجرات کی چند تاریخی کتابون کی تعیین

۵۲ اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے ایک پر مغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو لاہور کے اورنٹیل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۹ء مین شائع ہوا ہے،

مشہور مصری عالم شیخ شمس الدین سخاوی سے سند حاصل تھی، حدیث مین مولانا عبدالملک کے ممتاز شاگردون مین مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، شیخ عبدالملک نے تفسیر و حدیث مین کمال حاصل کیا، اور استاذ کے رتبۂ عالی پر فائز ہوئے، انھین صحیح بخاری از بر تھی، ہمیشہ مسجد اور حجرے مین ورد اوراد مین مشغول رہتے، توکل اور تجرید مین آپ کی مثال نہ تھی، تمام علوم کا زبانی درس دیا کرتے تھے[1]، افسوس ہے کہ مولانا جیسے باکمال محدث کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہین، اُن کے ایک فرزند شیخ عبداللطیف (متوفی ۹۱۵ھ) نے مشارق الانوار کی شرح مبارق الازهار لکھی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی صاحب سید نورالدین احمد حسین کے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھا، شیخ خلیل محمد عباسی شیخ عبداللطیف کے صاحبزادے ہین، والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریون کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید محمد مقبول عالم[2] انہی سے روایت کرتے ہین، چنانچہ علامہ نورالدین (متوفی ۱۱۵۵ھ) نورالقاری فی شرح البخاری مین فرماتے ہین :-

"وبه قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی والدی عبداللطیف حدثنی والدی عبدالملک حدثنی محمد المدعو بجار الله عن والده، الخ"

ذیل مین ہم شیخ عبدالملک بنانی محدث گجراتی کی اسناد حدیث پیش کرتے ہین، یہ اسناد شیخ رشید الدین چشتی کی کتاب مخبر الاولیاء سے لی گئی ہین، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی

---

[1] ہم قاضی سید نورالدین صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہین، انھون نے ازراہ کرم مبارق الازہار اور نورالقاری کے چند اقتباسات نقل کرکے ارسال فرمائے۔

[2] مختصر ترجمہ کے لئے دیکھو مرأت احمدی خاتمہ ص ۲۰، طبع بمبئی،

کے کتب خانہ میں موجود ہے، چونکہ سلسلہ اسناد میں زیادہ تر نام ہی ہیں، اس لئے ہم عربی متن کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں،

صحیح بخاری | انہ یروی من الشیخ محمد العدعو بجار اللہ عن والدہ عزالدین عبد العزیز عن شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمد الھاشمی عن قاضی القضاۃ محب الدین محمد بن محمد بن محمد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شہاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعمہ بن حسن بن علی بن بیان بن شحمۃ الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبد اللہ الحسین بن المبارک بن محمد بن یحیٰی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسٰی بن شعیب بن اسحاق بن ابراھیم الصوفی السجزی ثم الہروی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمٰن بن محمد بن المظفر بن محمد بن داؤد بن احمد بن معاذ بن اسھل بن الحکم الداؤدی عن ابی محمد عبد اللہ بن احمد بن حمویہ بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر بن ابراھیم البخاری الفربری عن محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمھم اللہ،

صحیح مسلم | انہ یروی من محمد المدعو بجار اللہ عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانہ یروی عن محمد بن ابی السعادۃ الحاکم قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمٰن بن محمد بن اسحٰق بن مندۃ الاصفھانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد اللہ الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد اللہ التمیمی قال اخبرنا الامام ابو الحسین مسلم رحمہ اللہ،

سنن ابی داؤد | انہ یروی من محمد المد عو بجار اللہ قال اخبرنی والدی عزالدین عبد العزیز

سماعاً قال اخبرنا ابوالعباس بن ابی بکر الواسطی وابو عبد اللہ محمد بن احمد بن کامل

الترمذی عن الخطیب ابی الفتح محمد بن محمد المنذری قال اخبرنا ابوالفضل عبدالرحمٰن

بن یوسف بن یحیی الموصلی سماعاً قال اخبرنا ابوالفتح المفلح الدین بن احمد الدومی

وابوالنصر ابراهیم بن محمد الکرخی سماعاً عن المسند ابی طاهر محمد بن محمد بن عبداللطیف

قال انبأنا ام عبد زینب ابنة احمد بن عبد الرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب

قال حدثنی الحافظ ابوالطاهر احمد بن محمد السلفی اذناً قال کتب ابوجعفر العبادانی

من البصرة قال اخبرنی القاضی ابوعمر القاسم بن جعفر بن عبد الواحد الهاشمی قال

اخبرنا ابوعلی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال اخبرنا الامام ابوداؤد السجستانی رحمهم اللہ تعالیٰ

سنن الترمذی | انہ یروی من الشیخ محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عزالدین عبد

العزیز قال اخبرنی شیخ الحنفیہ ابن الدین یحیی بن محمد القاهری قال اخبرتنا

الاصلیة ام محمد سارة ابنة عمر الحموی قال انبأنا الصلاح عمر بن الحسین

المراغی قال اخبرنا الفخر ابوالحسن علی بن احمد البخاری المقدسی قال اخبرنا

ابوالفتح عبد الملک بن عبد اللہ الکرخی سماعاً قال اخبرنا ابوعامر محمود بن

قاسم الازدی قال اخبرنا ابوالعباس احمد بن محمد بن احمد بن محبوب المحبوبی قال اخبرنا

الامام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمہم اللہ،

سنن نسائی | انہ یروی من محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عزالدین عبدالعزیز

قال اخبرنا الحافظ تقی الدین محمد بن علوی المالکی اذناً قال اخبرنا قاضی القضاة

ابن زین الدین ابی بکر بن الحسین المراغی المدنی قال اخبرنا المسند برهان الدین

ابراھیم بن محمد الدمشقی المؤذن سماعاً قال اخبرنا مسند الدنیا شھاب ابوالعباس
احمد بن ابی طالب، قال أخبرنا ابوطالب عبدُاللطیف بن محمد قال اخبرنی ابوذرعہ
طاھر بن محمد بن طاھر المقدسی سماعاً قال اخبرنا محمد عبدالرحمٰن سماعاً قالَ
أخبرنا ابوالنّصر احمد بن الحسین بن محمد الدینوری قال حدّثنی ابوبکر احمد بن محمد
بن السحق السّنی قال حدّثنی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی،

سنن ابن ماجہ | انہ یروی محمد المرعو بجاراللہ عن والدہ عزالدّین عبدالعزیز
قال أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدّین محمد علوی المکی و قاضی القضاۃ
شھابُ الدّین احمد بن علی بن حجر اذناً قال البُرھان ابراھیم بن صدّیق الدّمشقی
سماعاً، قال اخبرنا مسند الدّنیا ابوالعبّاس احمد بن ابی طالب الصّالحی
إذناً قال اخبرنا ابو محمّد عبداللطیف بن محمّد بن علی قال اخبرنا
ابو منصور محمّد بن الحسین القزوینی سماعاً قال اخبرنا ابو طلحۃ
القاسم بن المنذر الخطیب قال اخبرنا ابوالحسن علی بن ابراھیم بن العطار
قال اخبرنا الامام ابوعبداللہ محمّد بن یزید القزوینی المعروف
بابن ماجہ۔

موطا امام مالک | یرویہ بن محمّد المدعو بجاراللہ عن والدہ عزالدّین
عبدالعزیز عن شھاب الدّین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر قال اخبرنا
العلّامہ برھان ابراھیم بن احمد بن الواحد قال أخبرنا المسند ابوعبداللہ
محمّد بن جابر بن محمّد بن القاسم وادی آشی تونسی قال اخبرنا ابو محمّد
.....عبداللہ بن ھارون القرطبی الطائی سماعاً قال اخبرنا القاضی ابوالقاسم

احمد بن زید بن عبد الرحمن بن تقی قال اخبرنا ابو عبد اللہ بن فرخ الفقیہ

مولی محمد بن الطلاع قال اخبرنا ابو ولید یونس بن عبد اللہ بن مغیث

عن ابی عیسیٰ یحییٰ بن عبد اللہ عن ابیہ عبید اللہ بن یحییٰ عن ابیہ الامام

یحییٰ بن یحییٰ اللیثی عن الامام مالک،

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین، قیمت :- ۸؍

ہندستان کی کہانی

ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے تاکہ ہمارے مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، ضرورت ہے کہ رسالہ چھوٹے بچون کے نصاب مین شامل کیا جائے تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ وہ کون تھے، اور اب کیا ہین،

ضخامت ۴۰ صفحے قیمت :- ۵؍

(از مولوی عبد السلام قدوائی ندوی)

منیجر

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

(بسلسلہ ماہ مئی سنہ ۳۰ء)

فارسٹر نے جس کتبہ میں اپنے زور تحریف سے حضرت ہودؑ کا نام پڑھکر اس میں نصرانیت کے جراثیم دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کا چربہ دیکھئے،

میری قرأت کے مطابق یہ ایک نظم[1] ہے جو حسب ذیل ہے،

سُمیقُ. السَسَ... وذْ یمن...

وَشَرَح ذاکَلَة یُکملا.

اکَرُ ذَ دِیَ.. قراذْ نَذِ لْ

حَیثَ بَحُ خُوبیسلُ ھِتاکل

نوَ.. ذِ یتَ شَنَہِ.. لَدُ نْ مَا... مَثَلَنَہُ.. شُرُ تُنَا.. حَبِ مَا.. یَیَنِ..

یسَرُ مَا.. یرِذَعُ.. مُکرذمَا...

قھتَا.. ذزشَیْنَا.. یَلِلُ ذو..

لِیمُنی.. یصذِعُ.. لِذْ حَمَیَّ..

یَلُ.. یَنَا.. کُزُرُنَا.. رَمَیتا..

لِرَدُ نا.. قذ لَنَا.. شرلیا.. ذَنِي ولُحُو.. شَشُ.. ذَحَرَ.. وَ.. خُکتا.

شَلَھُنَا.. سَلَقَنَا.. ذُیقَتِہُ..

رَنحُمَا.. رَکَفنَا.. مِطلَنِ نَا

سکا کُلنا.. زکُرُدا.. کُدَ.. را..

مھرلوس ین نون نَصقا سطر..

وذْ نامرزَندُ نوُ ذِ رَنا مزُ..

یتوکَت.. ذ ۷. ولِنُشَتِہ..

وخلقہ.. ومُسلکتہ..

---

[1] اسے نظم کی صورت دیکر پڑھنے میں کاتب حروف اپنے محترم دوست مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مشورہ کا ممنون ہے،

ومنقل.. کستہ صبن.. وذہ..
وکل ذک

وذ نوش رضا حبشنا. شرپی

وشلہ ذشن وذرق تنو، ذکر ذو خمیر ماکہرل،
وملث وخمیرما.. شق.. لہ.. وشح مرنو.. شرح ذو.. ہ خن..
وغل تنوذ وشر ذ.. یا..
سنا مرشتو وخرق تمر،

اس کو نظم کی صورت مین لکھنے کی غرض سے ہم نے سطر سطر کا اتباع نہین کیا، اصل کتبہ کی سطر جس لفظ سے شروع ہوتی ہے، اس پر نمبر لگا دیا گیا ہے، قرأت مین کوئی نقش محذوف نہین ہے، تشدید، تنوین اور تطویل حرکت، کے علاوہ کوئی حرف زائد نہین ہے، فارسٹر اور رونیٹ جہ دونون کی قرأت کے برخلاف یہ قرأت حذف و اضافہ سے پاک ہے،

وزن و قافیہ | یہ نظم ۲۸ مصرعون کا مجموعہ ہے جن مین سے ۲۷ مصرعے تو فعولن فعولن فعولن فعو کے وزن پر ہین، اکیسوان مصرعہ فعولن فعو کے وزن پر ہے، یہ حیرتناک امر ہے، قوافی کا عجب انداز ہے

مصرعہ نمبر ۱ و نمبر ۲
مصرعہ نمبر ۳ و نمبر ۴
مصرعہ نمبر ۷ و نمبر ۹
مصرعہ نمبر ۱۸ و نمبر ۱۹ و نمبر ۲۰
مصرعہ نمبر ۲۵ و نمبر ۲۶،
} ہم قافیہ ہین، باقی مصرعون مین قافیہ کی پابندی نہین کی گئی ہے،

زبان کتبہ | اس کتبہ کے اکثر الفاظ متداول عربی کی کتب لغت مین ملین گے، اس لئے زبان کتبہ

عربی سمجھنا چاہئے، عبارت کو متداول عربی کے قواعد پر ڈھال کے ہم نے پڑھا ہے، مگر چند مقامات پر عربی نحو کے خلاف جانا پڑا،

(۱) [illegible]ین مصرعہ مین لیمنا اور لن حما کے الفاظ مین عربی قاعدہ سے لیمن اور لن حم ہونا چاہئے، عربی کی نحو سے تطبیق کی غرض سے ہم نے ان دونون لفظون کے آخری الفون کو ی سے لکھا، عربی مین ایسے الفاظ کی بکثرت مثالین ہین،

(۲) گیارہوین مصرعہ مین شرلیا کا لفظ ہے، جسے قاعدہ سے شرلئے ہونا چاہئے لیکن ہمدانی نے اکلیل مین لکھا ہی کہ اہل حمیر خُذ بعیریک کی جگہ خذ بعیراک کہتے تھے،

(۳) مصرعہ دوم مین عربی قاعدہ سے اکملانہین تو کملان ہونا چاہئے، مگر ضرورت شعری یا زمانہ کتبہ کے جواز نے اسے یکملا کر دیا،

لغات | کتبہ کے اکثر الفاظ لغت کی متداول کتابون مین ملتے ہین جن الفاظ کو عام ناظرین بآسانی تلاش کر سکتے ہین، اُن کو چھوڑکر باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے،

مکرذما، ذحمی، ذحم، ذنی، ید نون اور تسرذ مین ذال کو دال بنا دینے پر یہ الفاظ لغت مین مل جائین گے، وذہ کو ودہ پڑھکر استیدہ کا مرادف قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح ذیل کے الفاظ کو بھی ذرا تغیر کے ساتھ ناظرین لغت مین پا سکتے ہین،

۱- حَیت = حوت (منڈلانا) سے فعل کے وزن پر

۲- ذیت شنہ = ذات سنتہ

۳- یصنذ = یصادی (مقابلہ کرتا ہے)

۴- ینا عَ = ونی (عربی کی مثال داوی عبری مین مثال یائی ہوتا ہے اور ہمزہ آخر بکثرت ی سے بدل جاتا ہے)

(۵) نقا سطر = نسقا سطر = قاف کے پہلے کی سین عموماً صاد سے بدل جاتی ہے تاج العروس مین ہے کہ ابن عباد نے کہا

" نسقان فلک کے قریب دو ستارے ہین، ایک یمانی ہے، ایک شامی (ن س ق) فلکہ چند دائرہ نما تارے ہین، سماک رامح کے پیچھے بنات النعش کے سامنے جن کو بچے قصعۃ المساکین کہتے ہین (ف ک ک)"

لفظ نسقا کی سطر کی طرف اضافت تعلق ہے، سطر سے مراد ستارون کی وہ جھرمٹ مراد ہے جن مین نسقان واقع ہین،

(۶) ذکی = ذکی، ذہین، تیز فہم،

ذیل کے الفاظ کا ترجمہ عبرانی لغت کی مدد سے کیا گیا ہے

(۷) کلہ = تباہ کاری

(۸) کزز = سخت دلی

(۹) ثلہنا = ہم نے نکال دیا،

(۱۰) نحلی = فرمان روا ہوا،

(۱۱) کستہ = عرش

ذیل کے الفاظ نہ عربی لغت مین ملے، نہ عبرانی لغت مین، مگر اُن کے مطالب قرینہ سے معلوم ہوتے ہین

(۱۲) اگر = ذوی کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ لفظ نباتات سے متعلق ہے، مواکرت کے معنی ہین مزارعت، اکر بمعنی زراعت،

(۱۳) ہتاکل = اکال وصول کیا، عربی مین اس چیز کو اکال کہتے تھے، جو امرا اور حکام کو رعایا سے ملتا تھا، عربی افتعل عبرانی مین اتفعل اور ہتفعل ہے،

۱۴- ذوز = غالباً ایرانی دز (قلعہ)

۱۵- لرونا = غالباً لرونیا (ہماری سنگ اندازی سے)

۱۶- شرلیا = سابق لفظ قذلن بتاتا ہے کہ یہ قذالین کا مرادف ہے، پشت سر کے بین یُیا کو قذالین کہتے ہیں،

۱۷- مطلق = م = من } محض قیاساً
طلن = دیار }

۱۸- سکاکل = دشمن محض قیاساً

۱۹- یتوکت = ؟؟؟

۲۰- شمسی = خادم بن گیا، (مصری "حرشسو" کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اتباع حور)

۲۱- ہرل = ؟؟؟

۲۲- ستنام = غالباً مجرم

ترجمہ نظم: ان الفاظ کے علاوہ اور جتنے الفاظ ہیں، یا تو اسماء و القاب ہیں یا ذرا سی توجہ پر ناظرین اُن کو کُتب لغت میں تلاش کر لیں گے، اس لئے اب ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے،

سمیق نے بنیاد ڈالی اور ذونین نے،

اور ذو شرح نے تباہ کاری کی حد کر دی

کھیتی مرجھا گئی اور گاؤن گاؤن میں گیا کمینہ

منڈلانے والا گدھ یسیل محصول لینے کو

ارادہ کیا اوس نے ایک بھولی بھالی کا پانی کے پاس، اس کی ناک اور کان کاٹ لئے ہماری آفتاب

دشون نے، کیا... خوب ہے مین کا پانی،

یسار آفیتن ڈھانے لگا یکجا کر کے

قلعہ سینا کے نہات کو۔ یا لل دو

یمن کی طرف سے مقابلہ کرنے لگا، مدافعت سے

ایک بازو عاجز ہو گیا، ہماری سنگ دلی بڑھ گئی

اپنی سنگ اندازی سے کینہ کی پشت سر ہم نے زخمی کر دی، شاس اور حاکہ کے بافدہ نے

مدافعت کی،

ہم نے نکال دیا، اذیت دی، ذویقہ

ریاح کو ہم نے لاتین مار کر اپنے دیار سے بھگا دیا

ہمارے دشمن ہماری کے تھیلے بن گئے ایسا دیکھ کر

بہادر سرہ نکہ کے دو نون ستارون تک پہنچے

اور زند نوذ کے مغنی نے ترانہ گایا،

... یہ شخص اور اپنی وزہ بازی

اور طور طریقہ اور شمشیر بازی

اور صین کی حکومت کے نکل جانے سے مغلوب ہو گیا،

اور عاجز ہو گیا تیز فہم

اور ذونوش نے حبش کو راضی کیا، وہ خدمت گار بن گئے،

اور صورت بگڑ گئی، بدحال کرنے والے کی اور نیزے مارے کرذ کے تنوذ نے اور حمیر... جیسا ہو گیا،

اور بادشاہ اور حمیر کو اس کا دکھ ہوا

و شیح سخت اور ذو شرح کمزور ہو گیا

اور تنوز حاکم ہوا، اور غدار نے پراگندہ کیا،

بدزبانی کے مجرم کو اور پاش پاش کر دیا، -- ختم

املاکن | اس نظم مین نام اماکن کے ہین، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

صین | عربی روایات مین کئی کہانیان ہین جن مین تبابعہ یمن کو صین پر حکمران بتایا گیا ہے، ان تبابعہ مین سے ایک شمر الصباح تھا، جس کی بابت شاعر کہتا ہے کہ

من بعد ملک الصین اصبح هالکا

اکرم به من هالک محتاج

عام طور پر اس صین کو چین کا معرب سمجھا جاتا ہے، بعض کہانیان بھی اس کی تائید کرتی ہین، مگر ایک صین وہ ہے جس کی بابت شمر دل بن شریک نے کہا،

حیث یقال للریاح اسفین	ہواؤن کو بہنے کا حکم ہوتا ہے، تو زور
هوج یصبحن فلا ینبین،	زور سے بہنے لگتی ہین، اور ہر سمت بہنے
وکل وجهه للسری یسرین	لگتی ہین، یبرین اور حضرموت سے چل
یلغن اقصی الرمل من یبرین	کر ریگ زار کی حد اور صین تک
وحضرموت و یلغن الصین	پہونچتی ہین،

(جزیرۃ العرب ہمدانی صفحہ ۳۰۲)

ان اشعار کے صین کو بھی چین ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن شاعر صریحًا اس ہوا کا ذکر کرتا ہے، جو یبرین اور حضرموت سے شمال کو روانہ ہوتی، اور ریگ زار عرب کی آخری حد اور صین تک پہنچ جاتی ہے، اب توراۃ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کوہ طور کے مشرق مین جو علاقہ ہے، توراۃ مین اس کا نام سینی (عربی سینا) ہے، اور اس کے مغرب مین مصر سے ملا ہوا جو علاقہ ہے، اس کا نام دشت سین ہے، اسی سین کا صین کے نام

سے ایک قصاص شاعر ایک تبع کی زبان سے یون ذکر کرتا ہے کہ

وعلی بنی حام غدوت بطوعہ   بالصین حتی بدد واتبدیدا

صین مین بنو حام پر مین نے حملہ کیا، اور اُن کو پراگندہ کر دیا، زبور مین ارض حام مصر کا نام ہے، اور تورات مین حام کو مصر و کنعان اور کوش و فوط کا مورث بتایا گیا، ہو اس کتبہ کے اندر صین کے نام سے اُس علاقہ بنو حام کا ذکر ہے، جو طور و مصر کے درمیان ہو، اس کتبہ کے مطابق اس کے اندر مذکور واقعہ سے پہلے تک صین پر ملوک یمن کی حکومت تھی، مگر انہی دنون وہ وہان سے محروم اور بے دخل ہوگئے۔

| شیا | مراد سینا طور سے مشرق کا علاقہ

| حاکہ | معجم البلدان مین ہے کہ حاکہ بلاد عذرہ کی ایک وادی کا نام ہے، بنو عذرہ کی شان مین نابغہ نے کہا،

عظام اللهی ابناء عذرۃ انھم   لھا میم یستلھونھا فی الحناجر

ھم منعوا وادی القری من عدوھم   بجمع شدید للعدو والمکابر

(یعنی)

"بنو عذرہ بڑے کھاؤ بیر ہین، انھون نے اپنے دشمن سے وادی القریٰ کی حفاظت کی تھی"

"بلاد عذرہ وادی القری مین تھے، اس لئے حاکہ بھی وادی القریٰ کے اندر واقع تھا"

| شش | شش سے مراد ایک مقام شاس ہے"، ابن موسیٰ نے کہا کہ یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک راستہ کا نام ہے، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کو چلے، تو شاس کی راہ چھوڑ کر مرحب کی راہ سے چلے (معجم البلدان)

| یین | مدینہ منورہ سے ایک برید کے فاصلہ پر صاخک اور صویک نام دو پہاڑون کے درمیان ایک وادی کا نام یین ہے، حضرت اہبانؓ الاسلمی یہین کے باشندہ تھے، یہان بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم رہتی تھی،

سیرت ابن ہشام مین ذوبانہ کا ذکر آیا ہے، غزوۂ بدر کے سفر مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تربان، ملل غمیس یحام اور مرمین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے اور غزوۂ بنو لحیان کے سفر مین غراب جبل مخیض، البتراء پھر مین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے،

یمنی | یمن کے مقام مین سیل نام ایک سرکاری محصل کی توہین کی گئی، یسار نام ایک حاکم مہات کی فوج نے کرسینا سے انتقام کو چلا جس کا مقابلہ حاکہ اور شاس وادون نے کیا، یمن کی طرف سے ذوبائیل نے یمن پر چڑھائی کی، اس لئے سینا، حاکہ اور شاس کے ساتھ کتبہ مین یمن کا ذکر بھی آیا ہے،

حبشی | اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمن والے غالب رہے، یسار اور ذوبائیل کی فوجون نے شکست کھائی، مجبوراً ذونوش نے جو غالباً ان دنون یمن کا بادشاہ ہوگا، اہل حبش کو خوشامد کرکے اپنی فوج مین داخل کیا، اس حیثیت سے کتبہ کے اندر حبش کا ذکر آیا ہے، (باقی)

تلخیص تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو آج کل ہمارے جمہوریۂ ہند کے صدر ہین، ۱۹۴۷ء عیسوی مین ایک کتاب "India Divided" لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب تک اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہین، اس کے ابتدائی حصہ مین ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کی مذہبی، سیاسی اور علمی روا داری پر بھی تبصرہ ہے، جس کے خاص خاص حصے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہین، آج جب کہ ایک خاص حلقہ مین یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت بہت ہی جابرانہ اور متعصبانہ تھی، ذیل کی تحریر پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی باتین عدم واقفیت اور محض تعصب کا نتیجہ ہین،

ڈاکٹر راجندر پرشاد رقمطراز ہین:

"عملی طور پر ایسی بہت سی مثالین ملین گی کہ مسلمان بادشاہون نے مندرون اور مٹھون کیلئے جائدادین وقف کین، اور عبادت گذار اور صاحب علم و کمال پنڈتون کو جاگیرین دین، یہ بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہون نے ہندوؤن کے کتنے مندرون اور عبادت گاہون کو مسمار کیا، لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیرون کی فہرست تیار کردے، جو مسلمان حکمرانون

کی طرف سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو دی گئی ہیں، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا، جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہوں نے برہمنوں کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپیے ہے، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مہنت لال گیر گوسائیں پورتارا ڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے، یہ اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو دی تھی، جو زہد وفضل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیریں وقف کیں، ان جاگیروں کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، شیر شاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ میں مقبول تھا، کشمیر کا حکمران سلطان زین العابدین امرناتھ اور شاردا دیوی کے مندروں میں گیا، تو وہاں کے زائرین کے آرام وآسائش کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ۱۸۵۷ء میں سردار نجیب آباد کے پٹھانوں کے زیرنگین تھا، نجیب آباد کے نواب نے سردوار کے جاتریوں کے لئے بڑے بڑے مکانات بنوائے، جو آج تک موجود اور ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں،

عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان رائے خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے کہ دیپالپور میں جو کالانور کے پاس واقع ہے شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اُن سے بڑی عقیدت تھی لیکن ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر اُن کے مزار کا متولی بنایا، چند سال کے بعد کچھ مسلمانوں نے شورش کرکے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کردینا چاہا لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جارہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

حیدرآباد دکن میں ایک مشہور درگاہ کی تولیت کا سلسلہ ایک برہمن خاندان میں چلا آتا ہے، نظام

حیدرآباد نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کی ہے، بعض مسلمانون نے ہندو متولی کو علٰحدہ کرنا چاہا، مگر نظام نے نہین ہونے دیا، حیدرآباد شہر کے اندر سیتا رام کا ایک مندر ہے ایک اور مندر ماہور (عادل آباد) میں ہے ان دونون مندرون کے لئے حکومت نظام کی طرف سے جائداد وقف ہے، جس کی سالانہ آمدنی پچاس ساٹھ ہزار ہے، ناندیر میں سکھون کے ایک گرودوارے کے لئے بھی نظام نے ایک جاگیر عطا کی ہے، جسکی سالانہ آمدنی بیس ہزار ہے،

۱۷۶۸ء مین احمد شاہ بہادر غازی نے ایک سند عطا کی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے،:-

ضلع اکبرآباد کے قصبہ اچھنیرا کے زمینداروں اور کاشتکارون کو معلوم ہو کہ شتیل داس بیراگی کو پینارتھ کے طور پر شری ٹھاکر جی کے بھوگ اور نوید کے لئے سترہ بیگھے کھیت کی معافی دیجاتی ہے، تاکہ اُن کی آمدنی سے شری ٹھاکر جی کے اخراجات پورے ہوسکین اور پوجا پاٹ ہوتا رہے، اچھنیرا کے بازار کے چودھری کو معلوم ہو کہ وہ شری ٹھاکر جی کے لئے بیس سیر غلہ ادا کرے، بیراگی کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے، تاریخ ۳ رمضان ۱۱۳۹ ف

ایک اور سند شہاب الدین خان کی ہے، جو اُس نے چنچواد کے مشہور گنیش مندر کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی اس سند کے لئے قول نامہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

"یہ قول نامہ چنچواد کے سدا نند گوشائین کے لئے پرگنہ پونا کے بارہ مین ہے، جس کے لئے خان حکمت نہاد خان نے اطلاع دے کر جاگیر کے ایک قول کی درخواست کی ہے، اس لئے یہ تحریر دیجاتی ہے کہ وہ اس گاؤن کے لوگون کے ساتھ رہے، اور اسکی زمین کو زرخیز اور بہتر بنائے، اللہ تعالی کے فضل سے اس کو کوئی تسریا دبے اٹھانی پڑیگی، اس قولیت نامہ کی تاریخ ۲ ذی قعدہ ۱۱۲۲ھ ہے"،

الہ آباد مین اسی طرح کے دو فرامین ہین، ایک مشہور مندر سومیشور ناتھ کے پجاریون کے نام ہے جسکو اورنگ زیب نے کیا تھا

اورنگزیب نے جنگموں کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی، ضلع بنارس جدو مشرا ساکن بیش، پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر مصرا، کو بھی جاگیریں دیں، یہ سب کے سب مندروں کے پجاری تھے، اورنگزیب نے ملتان کے مندر توت لامی کے لئے مشرا کلیان داس کو سو روپیے کا وظیفہ عطا کیا، یہ مندر اب تک موجود ہے،

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۰۵۳ھ میں حکم دیا کہ اوجین کے گدام سے دھاکل کے مندر کی روشنی کے لئے چار سیر گھی روزانہ دیا جائے،

بہت سے مسلمان حکمران علوم و فنون کے سرپرست رہے ہیں جنھوں نے صرف فارسی اور عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی، انھوں نے ہندوستان میں علوم و فنون کو جو ترقی دی، اُن کو یہاں مختصراً بھی لکھنا ممکن نہیں، شاہانہ سرپرستی میں سنسکرت کی متعدد کتابیں فارسی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں، بہت سے مسلمان حکمرانوں نے خود سنسکرت زبان کی تحصیل اور اُن میں سے بعض نے سنسکرت کی کتابوں کو ترجمہ بھی اس غرض سے کیا کہ ہندوؤں کے علوم کے خزانے مسلمانوں تک بھی پہنچ جائیں، انھوں نے دوسروں کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دلائی، ہندو طلبہ کے تعلیمی نصاب میں سنسکرت زبان بھی ہوتی تھی، غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی، ڈاکٹر جیمز ایچ، کربنس نے اسلامی ہند میں تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

مسلمان بادشاہ اور شہزادے ہندو کلچر کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، مسلمانوں کی تعلیم میں ہندو ادب کا اختلاط اسی طرح ہو گیا تھا جس طرح مغل مصوری راجپوتوں کی مصوری سے مل جل گئی تھی، ہندو کے ادب العالیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اور رفتہ رفتہ فارسی کلچر سے ہندو کلچر متاثر ہوتا گیا،

بنگالی مورخ فارسی [illegible] لکھتا ہے، کہ

"ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے، مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں

پر مامور کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب عطا کرتے تھے" اس کے یہ معنی ہین کہ ہندوٗون کے ساتھ مسلمانون کے مقابلہ مین کوئی تفریق نہین کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم کو ادا کرنے مین بالکل آزاد تھے اور مسلمان ہندوؤن کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے،

سر الفرڈ لائل ایشیاٹک اسٹڈیز مین رقمطراز ہین کہ مسلمان حکمران ہندوستان کو اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے تخیل سے اتنے دور تھے کہ کبھی مسلمانون نے بھی اسکی کوشش نہین کی کہ ملکی نظم و نسق کے بڑے بڑے عہدے صرف مسلمانون ہی کے لئے مخصوص رہین،

اورنگزیب نے بہت سے لائق ہندوؤن کی ملازمت کے لئے شاہجہان کے پاس سفارش لکھی [illegible] کے دیوان کی جگہ خالی ہوئی، تو اورنگزیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی بعض اسباب کی بنا پر شاہجہان نے اس سفارش کو قبول نہین کیا، تو اورنگزیب نے پھر شاہجہان کو لکھا کہ اس جگہ کے لئے کوئی اس سے بہتر آدمی مل نہین سکتا، اورنگزیب کی سفارشون کی اور مثالین بھی رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری مین مل سکتی ہین۔

عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤن سے زبردستی اسلام قبول کرایا لیکن ہم یہان پر ایک عجیب غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہین جس سے اورنگزیب کے رجحانات کا اندازہ ہوگا، شاہجہان نے دندھیرا کے راجہ اندرامن کو سرکشی کی بنا پر قید کر دیا جب اورنگزیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے راجہ کی رہائی کے لئے شاہجہان سے سفارش کی لیکن شاہجہان اندرامن سے بہت زیادہ برہم اور ناخوش تھا، اس لئے اورنگزیب کی سفارش قبول نہین کی اور اس کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے بار بار تکلیف پہنچائی ہے وہ صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرلے، اس پر اورنگزیب نے سخت احتجاج کیا اور شاہجہان کو لکھا کہ اس شرط پر عمل نہین کیا جا سکتا، یہ بہت ہی غیر مدبرانہ اور ناعاقبت اندیشانہ فعل ہوگا، اسکی رہائی خود اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے اس سلسلہ مین اس نے شاہجہان کے وزیر اعظم کو ایک رقعہ لکھا جو آداب عالمگیری مین موجود ہے،

"س ع"

ادبیات

فطرت اور مومن

از

جناب شہ زور کاشمیری

لحد کے خواب کا ہے سلسلہ اسکی گران خوابی — جو فطرت کے تقاضوں سے کرے دانستہ سرتابی

ہے فطرت ایک مجموعہ قوانینِ الٰہی کا — ازل سے جن کا پیرو ہے جہانِ خاکی و آبی

بصارت ہے تو فطرت کا صحیفہ پڑھ کبھی تو بھی — بصیرت کے لئے کافی ہے اک جگنو کی شب تابی

صلاحیت ہے ہر ذرہ میں صحراؤں پہ چھانے کی — ہر اک قطرہ کی فطرت میں ہے طغیانی و سیلابی

دلِ ظلمت میں پوشیدہ ہیں صدہا چاند اور سورج — نہاں ہر خار کے دامن میں ہے جنت کی شادابی

کتابِ فطرتِ رنگین کے اوراق پریشاں ہیں — دلِ رومی، دماغِ طوسی و چشمانِ فارابی

ہے فطرت ایک دستور العمل مردِ مجاہد کا، — ہے جس کا مقصدِ ہستی جہان بانی جہان تابی

ہے فطرت کی سی گیرائی نگاہِ مردِ مومن میں — ملی ہے اُس کے دل کو فطرۃً تقدیرِ سیمابی

ہے گر نغمات سے معمور اک سازِ ازلِ فطرت — تو مومن کی نظر اُس کے لئے ہے ضربِ مضرابی

ہے مومن ایک بحرِ بیکرانِ رحمتِ یزداں — مسلمانی ہے صلح و امن کے تشنوں کی سیرابی

بجز علم الیقین ممکن نہیں ادراک فطرت کا — اُنہی انوار کی ہو تیرے دل میں بھی ضیا تابی

بجھانے دی یقین کو عقل کی افسردہ شمعیں سب طلوع مہر کا مژدہ ہے تارون کی تنک تابی

تری تخئیل پہ ہو باز در اسرار فطرت کا

عطا تجھکو کرے خالق دل مومن کی بیتابی

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن ولی ڈپٹی کلکٹر آرہ

عقل الجھ کے رہگئی وہم کے تار و پود مین حسن کی دیکھ لی جھلک عشق نے ہر وجود مین

کعبہ ہو یا کہ بتکدہ جھک گئی خود جبین شوق کس کو دماغ امتیاز بے خودی سجود مین

ڈھونڈھ چکا ہون جو بہ جو دشت بہ دشت کو بہ کو ایک بھی ہم نفس نہین کارگہ وجود مین

جن کے ہین دل جنون بہ دوش کان ہین جن کے حق نیوش پاتے ہین کیف سرمدی نغمۂ چنگ و عود مین

کافر عشق کے لئے عین حرم ہے دیر بھی گو ہے در بتان پہ سر محو ہے دل درود مین

کاکل عطر بیز کی دوش پہ چھا گئی گھٹا ڈوب گئی فضائے جان نکہت مشک و عود مین

جان ہو وقف جستجو دل ہو شہید آرزو امن و سکون نہ کر تلاش معرکۂ وجود مین

کعبۂ آرزو ہوا ہر نفس حیات عشق مل گیا نافۂ مراد کاکل مشک سود مین

مرگ بھی عین زیست ہے گرم سفر ہو گر حیات زیست بھی عین مرگ ہے منزل فتح بود مین

عشق ہے حسن کا جواب حسن ہے عشق کا جواب حسن ازل کی ہے نمود عشق کی ہر نمود مین

مسلک عشق مین ولی یاس و امید ہے حرام

دل کو رہین غم نہ کر فکر زیان و سود مین

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے علیگ رفیق دار المصنفین

(۲)

اب ایک علمی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام تذکرہ نویسوں کے لکھنے کے بموجب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت ان کا سن شریف کیا تھا؟

معین الارواح کے فاضل مولف نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۰ھ قرار دیا ہے لیکن اس سنہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کچھ تامل اس لئے ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے حضرت خواجہ کے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا سال ولادت ۵۲۶ھ لکھا ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۲ جلد اول) گمان ہوتا ہے کہ مرشد و مرید میں سن و سال کا تفاوت کچھ اور زیادہ ہوگا، فاضل مولف لکھتے ہیں کہ اکثر مورخین نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۷ھ لکھا ہے، (ص ۵) اگر حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی تاریخ ولادت ۵۲۶ھ صحیح تسلیم کر لی جائے، تو اُن کے مرید حضرت خواجہ کا سال ولادت

۵۳۷ھ تسلیم کرنے مین زیادہ تامل نہین ہوتا ہے اب اگر ہم حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ قرار دیتے ہین، تو ۵۶۱ھ مین ہندوستان آنیکے وقت اُن کی عمر اکتیس سال کی ہوتی ہے، اور اگر ۵۳۷ھ کو صحیح سمجھتے ہین، تو ہندوستان مین اُن کے ورود مسعود کے وقت ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے، قیاس کہتا ہے کہ اکتیس یا چوبیس سال کی اتنی کم عمری مین ہندوستان آکر مستقل سکونت اختیار نہ فرمائی ہو، خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ مرشد کی خدمت اور پھر سیاحت مین کافی مدت گذاری، ایک اور چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اگر ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے، تو گویا اجمیر کے ہندو حکمران سے ۵۸۷ھ یعنی شہاب الدین غوری کے حملہ تک متصادم رہے، بعض تذکرہ نویسون نے لکھا ہے کہ ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے تو پرتھوی راج کو اجمیر مین اُن کا قیام گران گذرا، لیکن یہ صحیح نہین معلوم ہوتا کیونکہ تاریخون مین پرتھوی راج کی تخت نشینی کی تاریخ ۵۷۱ھ ہے[1] اور تھوڑی دیر کیلئے اگر تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت خواجہ کے اجمیر مین آنے کے دس برس کے بعد پرتھوی راج گدی پر بیٹھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد سے حضرت خواجہ کے قیام مین مزاحمت شروع کی، تو اس کی مطلق العنانی سے یہ توقع نہین ہوسکتی تھی کہ ۵۷۱ھ سے ۵۸۸ھ یعنی سترہ برس تک اُن کے تصادم کو اپنی راجدھانی مین برداشت کرتا رہا

---

[1] راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ مین تذکرہ نویسون پر بھروسہ کرکے یہ لکھدیا ہے کہ

"دہلی سے اجمیر گئے، اور وہان دسوین محرم ۵۶۱ھ مین نزول اجلال فرمایا، اور یہین آخر وقت تک قیام رہا۔ اس زمانہ مین اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا"

اب مزید تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہوگیا ہے، بزم صوفیہ مین ایک اور تسامح ہوگیا ہے، ص ۲۱، پر محمد یادگار کو اصفہان کا حاکم لکھدیا گیا ہے، اس سلسلہ مین بھی تذکرہ نویسون مین کچھ اختلاف ہے، خزینۃ الاصفیاء (جلد ۱ ص ۲۵۸) مین ہے کہ محمد یادگار ہرات کا حاکم تھا، لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسون نے اسکو سبزوار کا حاکم بتایا ہے، اور یہی صحیح ہے،

اب یا تو ہم تسلیم کرلیں کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر لوٹ گئے، لیکن جب اس کے لئے کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ۵۶۱ھ کی تاریخ غلط لکھی ہے، انھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے کچھ ہی پہلے یعنی ۵۸۷ھ میں اجمیر میں نزول اجلال فرمایا ہو، یہ تھوی راج نے اُن کو تکلیف پہنچائی تو اُن کی دعا دن سے شہاب الدین غوری ۵۸۷ھ میں حملہ آور ہوا، اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تاریخ خود معین الارواح کے فاضل مؤلف نے ۵۸۷ھ بتائی ہے، ابھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اپنے مرشد کے ساتھ اجمیر آئے،

اب یہ مان لیا جائے کہ حضرت خواجہ اجمیر پہلی دفعہ ۵۸۷ھ میں آئے تو اُن کے ۵۳۷ھ کے سنہ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں حضرت خواجہ کو جب اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ سے خرقۂ خلافت ملا تو اس وقت ان کا سن شریف باون برس کا تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۸۷ھ میں اجمیر آکر پھر اپنے مرشد کے پاس گئے لیکن ابھی بحث ہو چکی ہے کہ یہ ایک متنازعہ فیہ واقعہ ہے، اب اگر حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ میں مان لیں تو ۵۸۷ھ میں اجمیر آنے کے وقت اُن کی عمر ستاون برس کی ہوتی ہے یعنی وہ اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت لے کر اجمیر تشریف لائے۔

لیکن یہ ساری بحث گنجلک ہوتی جارہی ہے، اور ہم کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں، حضرت خواجہ کے حالات قلمبند کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کچھ ایسی مبہم، غیر واضح، مختلف اور متضاد باتیں لکھی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے، تو ایک لامتناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اور کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا ہے

ایک آدھ مثال اور ملاحظہ ہو، سلطان شمس الدین التمش کو کسی تذکرہ نویس نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین کا اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے

ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں سلطان التمش کا ذکر بار بار آتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو حضرت بختیار کاکی سے ارادت تھی، چنانچہ ایک موقع پر حضرت بختیار کاکی فرماتے ہیں :-

"ایک بات وہ یعنی التمش میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھکو کب تک تکلیف پہنچاتے رہوگے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اس نے کہا رب العزت مجھ کو مملکت تو دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور اس کا حساب دینا ہوگا، تو اس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں، وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اس کی بات قبول نہ کر لی" (فوائد السالکین ص ۲۹)

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان التمش حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید تھا تو چشتیہ سلسلہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ سلطان التمش کو اپنے مرشد کے مرید سے والہانہ عقیدت ہو گئی تھی، خزینۃ الاصفیا کے مؤلف نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ

بادشاہ یعنی سلطان التمش رحم دل و عادل و سلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیار است" (جلد اول ص ۲۷۰)

لیکن ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین کی ایک تصنیف گنج اسرار کی سند پر سلطان التمش کو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید بتایا ہے (ص ۹۰) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا گنج اسرار یا اور دوسری کتابیں جن کو فاضل مؤلف نے حضرت خواجہ کی طرف منسوب کیا ہے، اُن کی تصانیف تسلیم بھی کی جا سکتی ہیں ؟

خواجگان چشت کی تصانیف کے متعلق حضرت خواجہ نصیر الدین کا بیان خیر المجالس میں اس طرح ہے :-

"میرے حضرت پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس سرہٗ العزیز فرماتے تھے میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فریدالدین اور شیخ الاسلام حضرت مولینا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرہ میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی ہے میں (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت میں عرض کی میں نے ایک معتبر سے سنا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی تصنیف سے ایک کتاب دیکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس نے غلطی کی، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، اس واسطے کہ ہمارے خواجگان نے کوئی تصنیف نہیں کی، یہ سن کر حضرت خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر نے ارشاد کیا کہ واقعی ہمارے حضرت سلطان الاولیاء نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، پھر میں (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ یہ جو رسالے اس وقت میں دستیاب ہوئے ہیں ملفوظات حضرت شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ملفوظات حضرت شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کے وقت میں ظاہر نہ ہوئے تھے، خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ تھے، اگر ان حضرات کی تصنیف سے ہوتے، تو بڑے حضرت ذکر اُن کا فرماتے، اور دستیاب ہوتے"

(اردو ترجمہ سیر المجالس ص ۳۰۶-۳۰۵، ترجمہ کی عبارت ہوبہو نقل کر دی گئی ہے)

خیر المجالس کی مذکورۂ بالا روایت ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری کی نظر سے گذری ہے لیکن ان کو اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"ہر چند کہ ان ملفوظات سے مولانا حمید قلندر نے انکار کیا ہے، اور خیر المجالس (ملفوظات حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی مرتبہ مولانا حمید قلندر) میں صاف لکھا ہے کہ یہ ملفوظات آنحضرت کے نہیں ہیں، کیونکہ اُن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو آنحضرت کے علم و ارشاد

کے مناسب نہیں ہیں، نیز ان حضرات کی کوئی تصنیف نہیں، مگر افضل الفوائد جس میں حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات مرتبہ حضرت امیر خسرو ہیں مرقوم ہے کہ خواجہ بزرگ اور حضرت سلطان المشائخ جو کچھ اپنے پیر و مرشد سے سنتے تھے، وہ لکھ لیتے تھے، ان دونوں روایات کے اختلاف میں اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک یہ رسالے بہ شکل رسالہ جات ظاہر نہیں ہوئے تھے، بلکہ تبرک کا شجرہ کے ساتھ تھے، اور جزو شجرہ سمجھے جاتے تھے، نہ کہ رسالہ جات، علاوہ ازین کسی دوسرے شخص کو ان حضرات کے ملفوظات مرتب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوئی، غیر متعلق شخص اتنی محنت کر کے یہ رسالے کیوں مرتب کرتا، نیز حضرت امیر خسرو کے بیان کو کسی طرح غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، (صفحہ ۲۲۲)

عاجز راقم کے سامنے اس وقت افضل الفوائد نہیں، فاضل مؤلف اگر امیر خسرو کی وہ فارسی عبارت نقل کر دیتے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے مرشد کے ملفوظات لکھ لیتے تھے، تو بہتر ہوتا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے جانشین تھے، اس نے انکے قول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کی رائے تو صرف اپنے مرشد کے متعلق ہے، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے مرشد اور دوسرے خواجگان چشت نے کتابیں لکھیں اور ان کی جو متعدد تصانیف بازاروں میں بکتی ہیں، وہ انھی کی ہیں،

فاضل مؤلف نے گنج اسرار کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصانیف میں حدیث المعارف اور رسالہ موجودیہ (شاید رسالہ وجودیہ مراد ہے) کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں کسی کی نظر سے نہیں گذریں، صرف ان کے نام سے منسوب ہیں، علمی دنیا میں ایسی مثالیں سینکڑوں ملیں گی کہ ایک تصنیف مالی فوائد اور دنیاوی اغراض کی خاطر دوسرے کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے، حضرت خواجہ کی عظیم المرتبت شخصیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مجاوروں نے کوئی تصنیف اُن کے نام سے منسوب کر دی ہو تو

کوئی تعجب انگیز بات نہیں،

فاضل مؤلف کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان معین جو عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے، وہ حضرت خواجہ ہی کا دیوان ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہرچند کہ ایک گروہ دیوان معین کو معین الدین کاشفی کی تصنیف کہتا ہے آپ کا نتیجۂ فکر نہیں مانتا، مگر شوکت کلام زبان حال سے کہہ رہی ہے یہ معمولی عارف کا کلام نہیں، بلکہ اس میں جن اعلیٰ مقامات معرفت نکات تصوف اور فنائے تامہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ آپ ہی جیسے عالی مرتبت اہل اللہ فرما سکتے ہیں" (ص ۹۵)

آگے چل کر پھر رقمطراز ہیں :-

"ہماری رائے میں موجودہ دیوان آپ ہی کے جذبات صادقہ، فکر بلند اور اعلیٰ ترین سیر جبروتی و ملکوتی اور لاہوتی کا نتیجہ مبارکہ ہے، منکرین دیوان نے بلا کسی دلیل کے صرف آپ کا ہمنام ہونے کی وجہ سے اس دیوان کو معین الدین کاشفی کا دیوان بتایا ہے، مگر اسکی تائید میں کوئی قابل قبول ثبوت کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے ہم اس دیوان کو غریب نواز کی نسبت سے محروم نہیں کرسکتے، (صفحہ ۹۵)

شاید فاضل مؤلف کی نظر سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مقالہ "دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری" جو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا نہیں گذرا، اگر یہ محققانہ اور مدلل مضمون اُن کی نظر سے گذرا ہوتا، تو وہ ہرگز یہ تحریر نہ فرماتے کہ کوئی قابل قبول ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا، ابھی چند سال پہلے پروفیسر عبدالغنی کی ایک انگریزی کتاب "پری موغل پرشین ان ہندوستان" شائع ہوئی ہے، اس میں پروفیسر موصوف نے غالباً حضرت خواجہ معین الدین کی ذات سے غایت عقیدتمندی کے اظہار میں دیوان معین کو انہی کا دیوان سمجھکر اُن کو حافظ سے زیادہ بہتر ا

زیادہ شیرین کلام شاعر ثابت کیا تھا، پروفیسر موصوف کی اس کتاب پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء میں بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دینا، بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ؎

آرزو خوب است اما این قدر ہا خوب نیست

پروفیسر عبد الغنی نے اس تنقید کا جواب دینے کی کوشش کی، اور اپنا جواب ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کے ٹائٹل پر انھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر "ضمیمہ رسالہ معارف" لکھ دیا ہے حالانکہ ان کا یہ لکھنا بالکل درست نہ تھا، اس رسالہ میں انھوں نے حضرت خواجہ کو بعض تذکرہ نویسوں کے حوالہ سے شاعر تو ثابت کر دیا لیکن اُن کے صاحبِ دیوان ہونے پر اصرار نہیں کیا ہے، اس رسالہ کا جواب بجواب اورینٹل کالج میگزین کے ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے مختلف شماروں میں پروفیسر ابراہیم ڈار اسماعیل کالج بمبئی نے دیا، اور ابھی اگست ۱۹۴۸ء کے رسالہ اردو میں بھی ان کا ایک مقالہ "دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا معین الدین فراہی (کاشفی نہیں) کی تصانیف معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں، جو دیوان معین میں پائی جاتی ہیں، اس لئے دیوان معین دراصل مولانا معین الدین فراہی کے کلام کا انتخاب ہے، معین الارواح کے فاضل مؤلف اگر ان تحقیقات سے باخبر ہوتے تو دیوان معین کو حضرت خواجہ کا دیوان تسلیم کرنے پر اصرار نہ کرتے، اور یہ اصرار اس لئے بھی بے جا ہے کہ حضرت خواجہ کا صاحبِ دیوان ہونا ان کا کوئی وصف یا کمال نہیں، اور نہ اُن کی شاعری اُن کے لئے وجہ امتیاز ہے؛

معین الارواح کے حصۂ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش

کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا، کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگانِ دین کے ہرگز نہیں ہوسکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظ ملاحظہ ہو جس کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے،

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر تھا، اور اہلِ صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے فرمایا اس شرط پر مرید ہوسکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، چونکہ وہ راسخ العقیدۃ تھا، اُس نے فوراً اس طرح کہا، غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا،

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے لیکن یہ روایت کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے، کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورۂ بالا الفاظ شرعاً قابلِ اعتراض معلوم ہوتے ہیں، مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابلِ اعتراض نہیں، نیز صاحبانِ حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید البغدادی اور حضرت بایزید بسطامی وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالم نے بھی طائف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقعہ پر ارشاد فرمایا "میں نے اُن سے سرگوشی نہیں کی، بلکہ خدا نے کی" نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اُس نے خدا کو دیکھا"

اس تاویل کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورہ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لیں، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے:

ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود دہلی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے آپنے جواب میں فرمایا کہ بالکل غلط ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے، حاشا للہ یہ کلام ان کا نہیں ہو، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہیں جو بجاور ونے بڑھائے ہیں کسی طرح قطب صاحب قدس سرہٗ کے حال و اعمال کے موافق نہیں ہیں، (جلد ۲ ص ۲۶)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین ؒ کے بعض ملفوظات الحاقی ہیں، جو اُن کی علمی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہیں،

کتاب کے حصہ سوم میں حضرت خواجہ کی درگاہ اور اُن کے عُرس کے مراسم کی تفصیلات درج ہیں، حصہ چہارم میں حلقۂ ارادت کے عنوان سے گذشتہ اور موجودہ عہد کے ان اکابر کا ذکر ہے جن کو حضرت خواجہ سے عقیدت رہی، حصہ پنجم میں حضرت خواجہ کی درگاہ شریف کے گذشتہ اور موجودہ درباریوں کا ذکر ہے حصہ ششم میں اجمیر کی مختصر تاریخ ہو، کتاب کے آخری تین حصے اجمیر شریف کے زائرین کے مطالعہ کے لئے مفید ہیں،

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کہ اس میں حضرت خواجہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر اکٹھا کر دیا گیا ہے، اور آیندہ جب کوئی اہلِ قلم حضرت خواجہ کی سوانحعمری سلیقہ سے مرتب کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ کتاب بلاشبہہ بہت مفید اور معاون ہوگی،

مطبوعات جدیدہ

یادِ ایام از نواب سر حافظ محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت چار روپیہ، پتہ غالباً راحت منزل علی گڈھ سے ملے گی،

ہمارے صوبہ کے رؤسا میں خاندانی امارت و وجاہت، ذاتی قابلیت و صلاحیت، تدبر و ہوشمندی، اخلاق و سیرت اور دینداری میں نواب سر محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری کا ممتاز درجہ ہے، اُن کی صلاحیت و سلامت روی کی بدولت کونسل کی ممبری سے لے کر وزارت، (ہوم ممبری)، گورنری اور ریاست حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ تک کے اعزازات کو حاصل ہوئے، قومی اور سیاسی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہا ہے، جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، زیرِ نظر کتاب سے اُن کی نئی تصنیفی صلاحیت کا علم ہوا، آپ بیتی جگ بیتی سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہے، لیکن اردو میں خود نوشت سوانح عمریوں کا بالکل رواج نہیں ہے، اور سر سید رضا علی مرحوم کے اعمالنامہ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمری موجود نہیں ہے، یادِ ایام اردو میں دوسری کتاب ہے، اس کے دو پہلو یا دو حصے ہیں، ایک صاحبِ سوانح کے نجی اور ذاتی حالات، دوسرے اُن کی قومی و سیاسی زندگی، ذاتی حالات میں خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت، انتظامِ ریاست اور حکام کے تعلقات وغیرہ کے حالات ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن دلچسپی سے خالی نہیں، اور اُن سے اس دور کے رؤسا کی سوسائٹی اور ان کے مذاق و مشاغل پر روشنی پڑتی ہے، کتاب کا اصل حصہ مصنف کی سیاسی و قومی زندگی کا ہے، اُن کی سیاسی زندگی چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ یعنی

سنہ ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتی ہے اور کانگریس کی وزارتون کے قیام کے زمانہ ۱۹۳۶ء تک قائم رہتی ہے، اس درمیان مین کونسل کے ممبر، صوبے کے وزیر، ہوم ممبر اور گورنر ہوئے، اور وقتاً فوقتاً قومی معاملات مین بھی حصہ لیتے رہے، اسلیے حکومت و ملکی سیاست دونون سے انکا واسطہ رہا، یہی زمانہ ہندستانی سیاست کے طوفان کا تھا، ہمارے قومی، ملکی اور سیاسی مسائل اسی زمانہ مین پیدا ہوئے، ان کو اپریشن اور خلافت کی تحریکین شروع اور ختم ہوئین، گورنمنٹ کے ساتھ آئینی اور غیر آئینی معرکے ہوئے، سائمن کمیشن آیا، کانگریس اور لیگ کے اختلافات شروع ہوئے، ہندو مسلم مسائل نے شدت اختیار کی، زمیندارون اور کاشتکارون مین کشمکش پیدا ہوئی، غرض ایوان حکومت کے اندر اور باہر دونون جگہ بہت سے معاملات و مسائل چھڑے، مصنف کو چونکہ حکومت اور قومی سیاست دونون سے تعلق تھا، اس لیے ان کو ان تمام معاملات سے سابقہ رہا، اس لیے اس کتاب مین مصنف کے سوانح کے سلسلہ مین اس دور کی عموماً اور صوبہ متحدہ کی خصوصاً پندرہ سالہ سیاسی سرگذشت آگئی ہے، یہ سارے واقعات ہم مین سے اکثرون کی نگاہون کے سامنے گذرے ہین، اس لیے اس کتاب کے مطالعہ سے وہ دور نگاہون کے سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والا ان کو لطف و دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس تاریخی سرگذشت کے ضمن مین اس دور کے ارکان حکومت اور قومی رہنماؤن کے حالات اور مختلف النوع دلچسپ واقعات بھی معرض تحریر مین آگئے ہین، غرض کتاب گوناگون [illegible]بات اور دلچسپیون کا مجموعہ ہے، انداز تحریر دلکش اور شگفتہ ہے، کتاب بلکہ مصنف کا نمایان وصف جو اس کے صفحہ صفحہ سے نمایان ہے، انکی متانت و سنجیدگی، اعتدال و میانہ روی، اور تحریر کی شائستگی ہے، جس دور کے یہ حالات ہین وہ حکومت اور عوام کی کشمکش اور ہندو مسلم اختلاف کا دور تھا، اور بہت سے معاملات مین مصنف کی حیثیت فریق کی تھی، اس لیے اس کتاب مین جا بجا اختلافی مسائل بھی آئے ہین، لیکن ان کا قلم کہین بھی اعتدال و متانت کے جادہ سے نہین ہٹا ہے، اور مصنف کی شگفتگی تحریر، اور لطائف کی آمیزش نے ان خشک واقعات مین خاصی ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے یہ خیال مین بھی نہ تھا کہ مصنف کا ادبی مذاق اتنا ستھرا ہے، اور وہ ایسی اچھی کتاب لکھ سکتے ہین، یہ کتاب اپنی گوناگون دلچسپیون کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ

کے لائق ہے۔

دیارِ عرب میں چند ماہ از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت للعبہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، نمبر ۹ ٹوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ، کراچی،

مصنف نے اسلامی جماعت کی تبلیغ واشاعت کے لیے گذشتہ سال عراق ونجد وحجاز کا سفر کیا تھا، اور اس سلسلہ میں ان ملکوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی، اور حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے، مذکورہ بالا کتاب اس سفر کی علمی سوغات ہے، یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے کسی قدر مختلف ہے، مصنف کا ذوق خالص دینی اور علمی ہے، اور انھوں نے ایک مذہبی مقصد کے لیے سفر کیا تھا، اس لیے سیر وتفریح کے بجائے خصوصیت کے ساتھ وہ ہر مقام کے علما، اور دینی حلقہ سے زیادہ ملے، ان سے مذہبی معاملات ومسائل پر تبادلۂ خیال کیا، مذہبی اور علمی اداروں کو دیکھا، مذہبی نقطۂ نظر سے عقائد وخیالات واعمال کا جائزہ لیا، اسلیے اس سفرنامہ میں زیادہ تر ان ملکوں کے علمی ومذہبی حالات ہیں، اور مصنف نے بڑے درد لیکن بڑی سچائی اور جرأت کے ساتھ ان اسلامی ممالک کے مذہبی تساہل وتفریح پر تنقید کی ہے، اور جلالۃ الملک ملک الحجاز کی شریعت پناہی کی حقیقت بھی پوری طرح واضح کی ہے، یہ اس سفرنامہ کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو ہے، اس سے ان ملکوں کی مذہبی وعلمی حالات کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، ضمناً ان مقامات کے دوسرے حالات اور سفر کے مشاہدات وتجربات بھی آگئے ہیں، مصنف کا سنجیدہ علمی ومذہبی ذوق اور قلم کی پختگی پورے سفرنامہ میں نمایاں ہے، البتہ ان کے قدرشناسوں اور ہواخواہوں میں انھی کے بقول ان کی "خشک وہابیت" ہمیشہ کھٹکی ہے، جو اس سفرنامہ میں بھی موجود ہے، لیکن ان میں دین کا سچا جذبہ ہے، اس لیے ان کا دل باطنی کیفیتوں سے خالی نہیں ہے، اور اس کے اثرات اس سفرنامے میں بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں، مثلاً مدینہ طیبہ کی حاضری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "وہابیت کی خشکی کے باوجود دل پسیج رہا ہے" (ص ۳۰۵) اسی

سلسلہ مین آگے چل کر قصیدہ بردہ کے متعلق لکھتے ہین" بلاشبہ اس مین کہین کہین مقام نبوت سے تجاوز ہوگیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز مین ڈوبا ہے، راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا اور اور لطف اندوز ہوتا رہا" (ص ۱۳۱) مصنف مین دین کی سچی تڑپ ہے، اس لیے یقین ہے کہ انشاء اللہ آیندہ چلکر ان کی وہابیت کی خشکی مین محبت و روحانیت کی تری بھی پیدا ہوجائے گی، سفرنامہ اپنے مفید علمی و مذہبی معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ | از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر،

قیمت: ۱۲؍ پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ،

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ دین کے لیے وقف تھا، انکے تمام افکار و تصورات اور اعمال و اقوال کا مرکز تبلیغ تھا، ان کی کوئی مجلس اور کوئی گفتگو اس مقصد سے خالی نہ ہوتی تھی، اور انکی زبان فیض ترجمان سے ہر وقت مسلمانون مین دینی روح کی تجدید، اور اس کے احکام کی تبلیغ اس کے علمی و عملی طریقون اور اس کے جملہ متعلقات کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا، مولانا منظور صاحب نعمانی مولانا مرحوم کی زندگی ہی مین ان کی دینی دعوت کے سرگرم مبلغ تھے، اور اس سلسلہ مین ان کو وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت مین حاضری اور قیام کا اتفاق ہوتا تھا، اور وہ مسلمانون کی دینی تجدید اور دعوت و تبلیغ کے متعلق مولانؒا کے ملفوظات قلم بند کرتے جاتے تھے، اب ان کو انھون نے افادۂ عام کی غرض سے شائع کردیا ہے، ان ملفوظات مین اسلامی تعلیمات، اور اسلامی زندگی کے حصول کی پوری روح آگئی ہے، اور وہ اپنے گوناگون مذہبی و روحانی فوائد کے اعتبار سے مسلمانون کے ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہین،

تردید حاضر و ناظر از مولانا عبدالرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ

کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ پتہ : مدرسہ جھنڈے نگر، رامت گنج، ضلع بستی،

بریلوی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق حاضر وناظر اور عالم الغیب مانتی ہے، مولوی عتیق الرحمن صاحب بریلوی نے اسکے اثبات مین کوئی رسالہ خیر الانبیاء لکھا تھا، مذکورۂ بالا کتاب اس کی تردید مین لکھی گئی ہے، اس مین خیر الانبیاء کے تمام دلائل کا رد کیا گیا ہے، یہ جھگڑا بہت پرانا ہے، اس پر دونون جانب سے ہزارون صفحات لکھے جا چکے ہین، اور اب اسکا کوئی پہلو تشنہ باقی نہین ہے، اور اس پر کوئی نیا اضافہ نہین کیا جا سکتا، اس لیے ان مسائل پر لکھنا محض اضاعتِ وقت ہے، اسکے علاوہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے، نئے نئے سیاسی ومعاشی کلامی مسائل درپیش ہین، ہر طرف الحاد ودہریت کا طوفان بپا ہے، کفر واسلام کا معرکہ چھڑا ہوا ہے، نام کے مسلمانون کا ایک طبقہ سرے سے اسلام ہی سے منحرف ہو رہا ہے، ایسی حالت مین اسکو چھوڑ کر پرانے وقیانوسی مسائل مین اپنی قوت اور وقت ضائع کرنا اسلام کی کوئی مفید خدمت نہین ہے، افسوس ہے کہ ہمارے علماء کا ایک طبقہ خواہ بریلوی ہون یا اہل حدیث، وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو چھوڑ کر انہی غیر ضروری مسائل مین الجھا ہوا ہے جنکی جانب اس زمانہ مین کسی کو توجہ کرنے کی بھی فرصت نہین ہے، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ انکو چھوڑ کر سارا زور کفر والحاد کے مقابلہ مین اسلام کی نصرت وحمایت مین صرف کیا جائے، تاہم مصنف کی نیت نیک اور انکا مقصد صحیح ہے، اسلیے انکا دینی جذبہ قابل قدر ہے، اور اس کا اجر انشاء اللہ ان کو ملے گا،

آسان قرآنی کورس کے بیس سبق | از جناب مولوی عبد السبحان صاحب اعظمی ربانی منشی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۹ر پتہ : بزم قرآن مسجد سعیدیہ کوچہ معروف، سپاری کنٹھ، ہونٹ روڈ، مدراس۔

خاص قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا ترجمہ سمجھنے کیلیے اردو مین عربی قواعد کے متعدد قرآنی نصاب مرتب کیے گئے ہین، ان مین سب سے زیادہ مشہور ومفید ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنؤ کا نصاب ہے، مصنف نے بھی اسی مقصد کے لیے یہ نیا رسالہ لکھا ہے، اس مین ادارہ تعلیمات اسلامی کی کتابون سے بھی انھون نے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے تجربہ سے نئے اضافے بھی کیے ہین، اس رسالہ مین بیس سبق ہین، اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق کے لیے مفید ہین

"م"

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- ے ر

"منیجر"

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری عہد کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت:- ۴۵۰ صفحے،

قیمت:- عہ ر

"منیجر"

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزمِ صوفیہ

جس میں عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی اور حضرت خواجہ گیسو دراز کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ نوعکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین دلوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اے
نومبر ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۵۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ہندوستان کے فرقہ پرستون کی تنگ دلی اور تنگ نظری اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کے دشمن بن گئے ہین جس کو مسلمانون کے ساتھ کسی قسم کی نسبت ہو، وہ اُن کی کسی یادگار کو دیکھنا گوارا نہین کرتے اور ہندوستان مین اُن کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتے ہین، جو ایک متمدن قوم کی شان سے فروتر ہے، اُس کا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم وفن کی ہر متاع اور تہذیب وتمدن کے ہر نقش کو خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ یا قوم سے ہو باقی رکھکر اپنی تعمیر وترقی مین اُس سے مدد لے، اور جدید ہندوستان اور ہندو مسلمانون کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے،

اس بارہ مین ہم کو یورپ کی قومون سے سبق حاصل کرنا چاہئے، عیسائی دنیا مسلمانون کی پُرانی حریف ہے، ان دونون مین بڑے سخت مذہبی اختلافات اور سیاسی معرکے برپا رہ چکے ہین، مسلمانون نے اُن کے مذہبی مرکز بیت المقدس پر جو مسلمانون کا بھی مقدس شہر اور اُن کا قبلہ رہ چکا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین قبضہ کر لیا تھا، پھر ایک صدی کے اندر اُن کے سارے مشرقی مقبوضات چھین لئے، اور خود یورپ کے ملکون مین اسپین، سسلی، یونان، قسطنطنیہ، بلقانی ریاستون، بحر روم کے بڑے بڑے جزیرون، اور فرانس، پرتگال اور اٹلی کے بعض حصون پر قبضہ کر لیا، اور صدیون یہان کے حکمران رہے، دونون مین مدتون جنگ صلیبی کا خونریز سلسلہ جاری رہا جس مین سارا یورپ مسلمانون کے خلاف صف آرا تھا غرض مذہبی وسیاسی دونون حیثیتون سے مخالفت اور دشمنی کا کوئی دقیقہ باقی نہین رہا، لیکن مسلمانون نے اپنے دورِ حکومت مین اپنے تمام مقبوضہ ملکون کو تہذیب وتمدن کے زیور سے آراستہ کیا

علم و فن کی روشنی سے منور کیا، تا یورپین قومین اپنے دورِ جہالت تک تو اُن کی دشمنی پر قائم رہین لیکن علم کی روشنی پھیلنے کے بعد جب اُن کی آنکھون سے تعصب کا پردہ ہٹا اور اُن کو مشرقی دنیا اور خود اپنے ملکون مین مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامے نظر آئے تو انھون نے اُس کا پورا اعتراف اور احسان شناسی کا حق ادا کیا، گو استعماری اغراض کی بنا پر ان کا ایک طبقہ مسلمانون کے خلاف زہر بھی اگلتا رہا لیکن اُس کے مقابلہ مین مسلمانون کے مداحون اور حامیون کی جماعت ہر دور مین زیادہ رہی اور یورپ کے ہر ملک کے علما و محققین نے مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامون پر سیکڑون کتابین لکھین، چنانچہ آج یورپ کی کوئی علمی اور بڑی زبان اس قسم کی تصانیف سے خالی نہین ہے، اس کے ساتھ انھون نے اسلامی علوم و فنون کو زندہ کیا اور عربی و فارسی کی ہر فن کی سیکڑون نادر و نایاب کتابون کو تلاش کرکے بڑی محنت و قابلیت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنی اپنی زبانون مین بہت سی اہم کتابون کے ترجمے کئے اور آج مسلمانون کے قدیم علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ انہی کے بدولت زندہ ہے، اس کے علاوہ طب، طبعیات، نباتات، حساب، ہندسہ، ہیئت و جغرافیہ وغیرہ کی مسلمان مصنفین کی کتابین اور ان کے لاطینی ترجمے کئی صدی تک یورپ کی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل رہے، یورپ کے قرونِ مظلمہ مین ان کے ہاتھون مسلمانون کے جو آثار مٹ چکے تھے وہ مٹ چکے تھے لیکن جو باقی رہ گئے تھے، اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جس کا مشاہدہ آج بھی اسپین مین کیا جاسکتا ہے، غرض یورپین قومون نے علم و روشنی کے دور مین مذہبی و سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانون کے آثار کو مٹایا نہین بلکہ اُن کو زندہ رکھکر اُن سے فائدہ اٹھایا، ورنہ وہ آج تک جہالت کی تاریکی مین بھٹکتی رہتین، یا کم از کم ترقی کی منزلین اتنی جلد طے نہ کرتین،

اس کے مقابلہ مین ہندو مسلمانون مین ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا تعلق رہا، گو مسلمان ہندوستان کے حاکم تھے لیکن وہ اجنبی حکمرانون کی طرح نہین رہے، بلکہ انھون نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہین شادی بیاہ کرکے رہ بس گئے، یہان کی بہتیری رسمین تک اختیار کرلین، اور مسلمانون اور یورپین قومون کے مقابلہ مین ہندو مسلمان مختلف حیثیتون سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، دونون مشرقی ہین، ہندوستانی مسلمانون کی بڑی تعداد نسلاً بھی ایک ہے، انہین

بہت سے تہذیبی اور کلچرل پہلو مشترک ہیں، ہندوستان کی ترقی میں دونوں کا حصہ ہے چنانچہ اسلامی ہند کے بہت سے علمی و تمدنی کارنامے دونوں کے مشترکہ ہیں لیکن اس کے باوجود بعض اس جرم میں کہ وہ اسلامی دور کی یادگار ہیں، فرقہ پرست انکو برداشت نہیں کر سکتے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی عہد کا باب ہی خارج کر دینا چاہتے ہیں، جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی شان سے بعید ہے، تو ان یادگاروں کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہئے بلکہ ان کے جو نقش دھندلے ہو گئے ہوں، انکو اجاگر کرنا چاہئے کہ درحقیقت وہ دونوں کے مشترک کارنامے دونوں کے لئے باعثِ فخر اور ہندوستان کی تمدنی عظمت کا نشان ہیں، ع :- یہ ٹوٹے آئینے ہیں زیب و زینت ان کی محفل کے

اس لئے ان کا جو نقش بھی مٹیگا اس سے تنہا اسلامی عہد کا نہیں بلکہ ہندوستان کی عظمت کا ایک نشان مٹ جائے گا،

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما　　گلستان میرد اگر میریم ما

ان حالات میں یہ سُن کر حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ نولکشور پریس نے جس نے اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور اردو زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، اپنی پرانی روایات و خصوصیات کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس مطبع سے حسبِ دستور تینوں زبانوں کی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا، فرقہ پرستی کے اس دور میں یہ فیصلہ قابلِ ستائش اور یہ نمونہ قابلِ تقلید ہے، درحقیقت علم و فن کی خدمت کو مذہب و فرقہ کی قید سے بلند رکھنا چاہئے ورنہ ساری ترقیاں مسدود ہو جائیں گی اگر مطبع کے کارکن اودھ اخبار کو بھی دوبارہ جاری کر دیتے تو ایک پرانی یادگار زندہ ہو جاتی،

مسلمانوں میں زبانی تو اردو زبان کی محبت کا بڑا دعویٰ اور ہندوستان میں اسکے زوال کا بڑا ماتم ہے لیکن اسکی جانب سے اُن کی غفلت و بے توجہی کا حال یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم اور ضروری اخباروں اور رسالوں کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صدق جیسا اہم اور مفید اخبار جس کی قیمت بھی بہت کم ہے، مالی دقتوں کی بنا پر چند دنوں سے بند ہو گیا تھا، اس کے فاضل اڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ نے دوبارہ اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور آیندہ مہینہ سے وہ نکلنے لگے گا، اگر مسلمانوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو اُن کو صدق کا خریدار بن کر اس کی زندگی کا سامان فراہم کرنا چاہئے،

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۲)

گذشتہ نمبر مین معجزۂ قرآنی کی جو خصوصیات بیان کی گئین اُن سے ثابت ہوگیا کہ وہ کوئی دنیوی احسان یا مادی طاقت نہین ہی بلکہ خالص روحانی طاقت ہے، جو جن وانس دونون کو نیک کامون کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب اس نمبر مین یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ روحانی طاقت کوئی وقتی چیز نہین تھی، بلکہ ایک ابدی دولت ہی جو مسلمانون کے دینی خزانے مین ہمیشہ محفوظ رہیگی اور ان پر قیامت تک اپنا اثر ڈالتی رہیگی کیونکہ

معجزات کی دو قسمین ہین حسی اور عقلی، حسی معجزات کا اثر محدود ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جو لوگ اُن کو دیکھتے ہین، صرف انھی پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جب انکا زمانہ ختم ہوجاتا ہے، تو یہ معجزات بھی ختم ہوجاتے ہین، اور ان کا اثر بھی زائل ہوجاتا ہے لیکن عقلی معجزات کی حالت اُن سے مختلف ہوتی ہے، وہ دل کی آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جب تک دنیا مین صاحب عقل وصاحب بصیرت لوگ موجود ہین، اُن کا معجزانہ اثر باقی رہتا ہی اور وہ ہر زمانہ مین پیغمبر کی صداقت

کی شہادت دیتے ہیں، انبیائے بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسی ہوتے تھے جن کا اثر ان کے زمانہ تک محدود تھا، اور اب ان معجزات کا نہ وجود ہے، اور نہ اُن کا اثر باقی ہے، اب عصائے موسیٰ، لحن داؤد، دم عیسیٰ اور ناقۂ صالح کا نہ وجود ہے، اور نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں، اس کے علاوہ اس قسم کے معجزے ان انبیاء کے لئے موزوں ہوتے ہیں جن کی شریعت خود دائمی اور ابدی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق ایک محدود زمانے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے جو پیغمبر اس قسم کی محدود الوقت شریعت کو لے کر آتے ہیں، اُن کو اسی قسم کے محدود الوقت معجزے بھی عطا کئے جاتے ہیں،

لیکن اسلام ایک ابدی مذہب تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی صورت میں ایک عقلی معجزہ عطا کیا گیا، جو اب تک موجود ہے اور ہر صاحب عقل و بصیرت کو اسلام کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من	ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے جن
الآیات ما مثلہ آمن علیہ	پر لوگ ایمان لائے لیکن مجھ کو جو
البشر وانما کان الذی اوتیتہ	معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے، اس لئے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجوان اکون	مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن
اکثرھم تابعا یوم القیامۃ،	میرے پیرو اور پیغمبروں سے زیادہ
(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن	ہوں گے،
باب کیف نزل الوحی واول ما نزل)	

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئے، اور ان کو انہی لوگوں نے دیکھا جو اس وقت موجود تھے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک موجود رہے گا، اور اسلوب بیان، بلاغت، اور غیبی خبروں کے دینے کی وجہ سے اس کی

معجزانہ حیثیت قائم رہے گی، اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس مین کوئی واقعہ جس کے ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے ظاہر نہ ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صحت کی دلیل نہ ہو، اس حدیث کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہین کہ گذشتہ پیغمبرون کے معجزات حسی ہوتے تھے، جو آنکھون سے دیکھے جاتے تھے، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا لیکن قرآن مجید کا معجزہ چشم بصیرت سے نظر آتا ہے، اس لئے آپ کے پیرو اور پیغمبرون سے زیادہ ہون گے، کیونکہ جو معجزہ آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ دیکھنے والون کے فنا ہونے کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے، اور جو معجزہ عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور یکے بادیگرے اس کو لوگ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

افلا یتدبرون القرآن، (نساء - ۱۱)	تو کیا یہ لوگ قرآن مین غور نہین کرتے،

اور یہی وجہ ہے کہ دور نبوت مین جو لوگ صاحب فہم و بصیرت تھے، قرآن مجید کا اثر ان پر سب سے زیادہ پڑتا تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ نے جب سورہ طور کی یہ آیتین ام خلقوا مِن غیر شیئٍ ام ہم سنین تو اُن کا دل اُڑنے لگا، لیکن یہ اثر صرف اُن کے فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

قال الخطابی کانه انزعج عند سماع هذه الآية لفهمه معناها و معرفته بما تضمنته نفهم الحجة	خطابی کہتے ہین کہ چونکہ وہ اس آیت کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گئے، اس لئے اس کو سُن کر بیساختہ متاثر ہو گئے، غرض انھون نے اس دلیل کو سمجھ لیا

فاستدل دکھا بلطیف طبعہ اور اپنی طبیعت کی لطافت کی وجہ سے
اس کو پا گئے،

حضرت انیسؓ خود شاعر تھے، وہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور واپس جاکر اپنے بھائی حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس کی اطلاع دی، تو انھوں نے پوچھا کہ لوگ آپکے بارے میں کیا کہتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا کہ "لوگ آپ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں"؟ لیکن میں نے کاہنوں کی باتیں سنی ہیں، لیکن محمد جو کچھ کہتے ہیں وہ کاہنوں کی بولی نہیں، میں نے اُن کی باتوں کو اوزان واصناف شعر کے مقابلہ میں رکھا تو وہ شعر بھی نہیں، خدا کی قسم آپ سچے اور لوگ جھوٹے ہیں[۵]؟

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات احادیث وسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کو گذشتہ انبیاء کے مادی معجزات پر ہر حیثیت سے تفوق اور فضیلت حاصل ہے، لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں تورات وانجیل کا کیا درجہ ہے؟ ہمارے علماء نے چونکہ قرآن مجید کو فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ مانا ہے اور تورات وانجیل میں یہ فصاحت وبلاغت موجود نہیں ہے، اس لئے وہ ان دونوں کتابوں کو معجزہ تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ تمہید ابو شکور سالمی میں جہاں اعجاز قرآنی پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید صرف اپنے الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے، اور بعض لوگ اس کو معنی کی بنا پر معجزہ کہتے ہیں، لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ لفظ ومعنی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، کیونکہ اگر ہم اسکو صرف معنی کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو اس سے گذشتہ انبیاء کی کتابوں کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ صحیح نہیں ہے، اور اگر صرف لفظ کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو ایسی حالت میں اگر الفاظ معنی سے

---

[۵] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب اسلام ابی ذرؓ

خالی ہون، تو وہ ایک لغو کلام ٹھہرے گا اور یہ محال ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید لفظاً اور معنی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، آگے چل کر ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ گذشتہ کتابین معجزہ تھین یا نہین ؟ اور اس عنوان کے تحت مین لکھا ہے کہ گذشتہ کتابین اس معنی مین معجزہ تھین کہ وہ خدا کا کلام ہین، اور قرآن مجید بھی خدا کا کلام ہے، توجب اس حیثیت سے قرآن مجید معجزہ ہے، تو اور کتابین اور صحیفے بھی لازمی طور پر معجزہ قرار پائین گے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام گذشتہ کتابین اور صحیفے بھی اگرچہ خدا ہی کا کلام تھے، لیکن وہ معجزہ نہین تھے، کیونکہ خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ ان کتابون اور صحیفون مین تحریف کیا کرتے تھے لیکن اگر وہ معجزہ ہوتین، تو اُن مین تحریف نہین کی جا سکتی تھی، اور تمام کتابین خدا کا کلام تو ضرور ہین لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ مین اور ایک شخص کے لئے تو معجزہ ہو لیکن دوسرے زمانہ اور دوسرے شخص کے لئے معجزہ نہ ہو، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے ہاتھ اور اُن کے زمانہ مین تو معجزہ تھا لیکن اُن کے زمانہ کے بعد معجزہ نہین رہا، یہی حالت اُن کی کتابون کی بھی ہے[1]،

قاضی ابو بکر باقلانی اعجاز القرآن مین لکھتے ہین، "اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ کیا خداوند تعالیٰ کا دوسرا کلام مثلاً توراۃ انجیل اور صحیفے بھی تمھارے نزدیک معجزے ہین ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان مین جو غیبی خبرین ہین، ان کے لحاظ سے وہ بھی قرآن مجید کی طرح معجزے ہین لیکن نظم و تالیف کے لحاظ سے ان مین کوئی کتاب معجزہ نہین، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ان مین کسی کتاب کے وہ اوصاف نہین بیان کئے، جو قرآن مجید کے بیان کئے ہین، نیز یہ کہ اُن کے متعلق تحدی نہین کی گئی ہے جیسا کہ قرآن مجید کے متعلق کی گئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابون کی زبان مین فصاحت کے ایسے وجوہ نہین پائے جاتے، جن کی وجہ سے کلام مین مقابلۃً ایسے محاسن پیدا ہو جائین، جو حدِ اعجاز

---

[1] تمہید ابو شکور سالمی ص ۵۸ ،

تک پہنچ جائین، ان زبانون مین جو کلام موجود ہے، وہ تقریباً یکسان ہے، ہمارے اصحاب تمام زبانون کی یہی خصوصیت بیان کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ ان مین باہم وہ فرق و امتیاز نہین پیدا ہو سکتا جو عجیب و غریب طریقہ پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے، اس کو یون بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہان تک ہم کو ان زبانون کا علم ہے ان مین ایک چیز کے اس قدر متعدد نام نہین پائے جاتے، جس قدر عربی زبان مین پائے جاتے ہین (یعنی ان مین مترادف الفاظ موجود نہین) اس طرح ان مین ایک لفظ بہت سے معانی پر دلالت نہین کرتا، جس طرح عربی زبان مین ایک ہی لفظ بہت سے معانی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ان زبانون مین مشترک الفاظ موجود نہین) استعارات، اشارات اور استعمالات کے نادر طریقے بھی ان زبانون مین نہین پائے جاتے:

اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ عربی مبین کی زبان مین ہے، اس کی یہ خصوصیت بہت سے مقامات مین بیان کی ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید کا درجہ اس سے بلند ہے، کہ اس کو عجمی زبان مین نازل کیا جائے، اس لئے اگر اہل عجم کی زبان مین اسی قسم کی فصاحت پیدا ہو سکتی، تو خداوند تعالیٰ قرآن مجید کو اس سے بالاتر نہ سمجھتا اگرچہ عربی زبان مین قرآن مجید کے نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اہل عرب اس کو خود سمجھ سکین، اور اس کی تفسیر مین دوسرون کے محتاج نہ ہون، تاہم ہم نے جو فائدہ بیان کیا ہے وہ بھی ممکن ہے،

بہت سے مسلمان جو عربی زبان کے ساتھ ان زبانون کے بھی ماہر ہین، اُن کے نزدیک ان زبانون مین وہ فرق و امتیاز اور وہ فصاحت نہین پائی جاتی جو عربی زبان مین پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ نہ تو خود توراۃ و انجیل کے ماننے والے اور نہ خود مسلمان ان کتابون کے معجز ہونے کا دعویٰ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اعجاز قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ قوموں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ بالمعنی بیان کئے گئے ہیں یعنی خداوند تعالیٰ نے اُن کے معانی کو عربی زبان میں بیان کر دیا ہے، کیونکہ عجمی زبانوں میں یہ فصاحت نہیں پیدا ہو سکتی تھی،[له]

لیکن خداوند تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کو کہیں قرآن مجید کا وصف نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے یہ اوصاف بتائے ہیں،

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، (بقرہ - ۱۲)	وہ رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے، ایمان والوں کو،
يَااَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا، (نساء - ۲۴)	اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے،
فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ، (الانعام - ۲۰)	سو اب تمہارے پاس تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور رہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے،

اور قرآن مجید میں بعینہٖ یہی اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی بیان کئے گئے ہیں، مثلاً:-

وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ، (آل عمران - ۱)	اور اسی طرح بھیجا تھا توریت و انجیل کو اسکے قبل کے لوگوں کی ہدایت کے واسطے

له اتقان جلد دوم صفحہ ۱۳۵،

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰاۃَ فِیْھَا ھُدًی وَ نُوْرٌ۔ (مائدہ - ۷)	ہم نے توراۃ نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا،
وَقَفَّیْنَا عَلٰی اٰثَارِھِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰاۃِ وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰیۃِ وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ (مائدہ - ۷)	اور ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توراۃ کی تصدیق فرماتے تھے، اور ہم نے اُن کو انجیل دی تھی جن میں ہدایت تھی اور وضوح تھا، اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ۔
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّھُدًی (الانعام - ۱۱)	آپ کہئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے،
ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً، (الانعام - ۲۰)	پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو، اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے، اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو،
وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً (ھود - ۲)	اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے)

(حاشیہ: ۔۔۔ ہدایت ۔۔۔)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ مِنْ	اور ہم نے موسیٰ کو اگلی اُمتوں کے ہلاک کئے
بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولٰى	پیچھے کتاب دی تھی، جو لوگوں کے لئے دانشمندی
بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً	کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت
لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ، (قصص - ۵)	حاصل کریں،
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدٰى وَ	اور ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ دیکھے ہیں، اور
أَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتٰبَ (مومن ۶)	ہم نے وہ کتاب بنو اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ
هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ،	وہ ہدایت اور نصیحت تھی اہل عقل کے لئے،

غرض قرآن مجید کے جس قدر اوصاف قرآن مجید میں مذکور ہیں، بعینہ وہی اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی مذکور ہیں، اس لئے اگر ان اوصاف کی بنا پر جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا، قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کیا جائے تو توراۃ و انجیل کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور بعض محققین نے اس حیثیت سے ان کو معجزہ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ توراۃ یا انجیل یا زبور اس لئے معجزہ ہیں کہ اُن میں علوم، غیبی خبریں اور امر و نہی وغیرہ موجود ہیں، تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ یہ اُن پیغمبروں کی نبوت کی اور اس پیغمبر کی نبوت کی جس کی نبوت کی انھوں نے خبر دی ہے، دلیل ہے، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں معجزہ نہیں ہیں، اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح لفظ و نظم کی وجہ سے معجزہ نہیں ہیں، تو یہ ممکن ہے اور اس کا تعلق عبرانی زبان کے جاننے والوں سے ہے لیکن معانی یعنی غیبی خبروں اور امر و نہی کی وجہ سے توراۃ کے معجزہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، اور انبیاء کی کتابوں کے معجزہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی آپ کی بعثت سے بہت پہلے خبر دی گئی ہے، اور بغیر خداوند تعالیٰ کی اطلاع دینے کے اس کا علم نہیں ہو سکتا،[1]

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ

"قرآن مجید کے معانی میں اُس کے الفاظ سے زیادہ اعجاز ہے، اور توراۃ و انجیل میں جو معانی ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مثل ہیں، تو اُس سے مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کی کتاب ہیں، اور اگر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے معجزہ کے مثل کوئی معجزہ لائے تو یہ ناممکن نہیں ہے[۱]۔"

توراۃ و انجیل کے ساتھ قرآن مجید کی طرح بے شبہ تحدی نہیں کی گئی، لیکن معجزات کے لئے تحدی کوئی ضروری چیز نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "دلائل نبوت کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے کہ وہ دعوی نبوت کے ساتھ ساتھ ہوں، اُن کو بطور حجت کے پیش کیا جائے، ان کے مثل لانے کی تحدی کی جائے، اور اس پر مخالفین کو آمادہ کیا جائے، اس قسم کی باتیں بعض معجزات کے ساتھ تو ضرور پیش آتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جن معجزات کے ساتھ یہ باتیں پیش نہ آئیں، وہ معجزہ ہی نہ ہوں، بلکہ اس سے انبیاء کے اکثر معجزات باطل ہو جائیں گے، کیونکہ اُن میں یہ شرط موجود نہیں ہے، اور یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ دلیل کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ مدلول علیہ کا وجود لازمی طور پر پایا جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی مساوی یا راجح دلیل اُس کی معارض نہ ہو، لیکن اگر کوئی دلیل ایسی موجود ہے، جس کی معارض کوئی مساوی اور راجح دلیل نہیں ہے، تو اس کو دلیل ماننا پڑے گا، چاہے مستدل یہ کہے کہ اُس کے مثل پیش کرو "تم لوگ اُس کے مثل پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے" یا نہ کہے، کیونکہ جب وہ دلیل فی نفسہ ایسی ہو جس کے مثل لانے پر لوگ قادر نہیں ہیں، تو مستدل کا یہ کہنا، اور نہ کہنا برابر ہے، نہ اس کے کہنے سے وہ دلیل بن سکتی، اور نہ اُس کے نہ کہنے سے اس کی دلالت باطل ہوتی، دلیل بہرحال دلیل ہے، خواہ

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۷۵

متدل اس کے ساتھ استدلال کرے یا نہ کرے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبوت کی دلیل اس وقت تک دلیل نہیں ہو سکتی، جب تک دعوی نبوت کے ساتھ پیغمبر اس کے ساتھ استدلال نہ کرے یعنی جو لوگ دعوی نبوت، پیغمبر کے استدلال اور معارضہ کے مطالبہ سب کو دلیل کا جزو قرار دیتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں، بلکہ ان باتوں سے سکوت اختیار کرنا بہتر ہے، اور ان باتوں سے دلیل میں کوئی قوت نہیں پیدا ہوتی خداوند تعالیٰ نے

فلیاتوا بحدیث مثلہٖ، تو وہ لوگ بھی اس کے مثل ایسی ہی ایک بات بھی لائیں،

اس وقت کہا جب کفار نے یہ دعوی کیا کہ قرآن مجید ایک بنائی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس قول کو دلیل کی شرط قرار نہیں دیا، بلکہ جب وہ اس کے معارضہ سے عاجز ہو گئے، تو اس سے یہ دلیل مکمل ہو گئی،[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام معجزات کے ساتھ تحدی نہیں کی گئی، آپ نے قرآن مجید کے ساتھ بھی ابتداءً تحدی نہیں کی، بلکہ اس وقت تحدی کی جب کفار نے کہا کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے"[2]

اس بنا پر اگر توراۃ و انجیل کے ساتھ تحدی نہیں کی گئی تو اس سے ان کے معجزہ ہونے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، لیکن اگر تحدی ضروری بھی جائے، تو گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے ساتھ تحدی نہیں کی تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ توراۃ کو بھی تحدی میں شامل کر لیا ہے،

---

[1] کتاب النبوت ص ۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۹۶،

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (قصص - ۵) آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ و انجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ و انجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں، لیکن قرآن مجید لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ و انجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ و انجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت، اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے، اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہلِ علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہلِ علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علمِ تشریح کی باریک باتیں ستاروں کی مقدار، اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اس سے صرف اہلِ علم واقف ہو سکتے ہیں[1]"

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴، ص ۸۰،

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام[1]

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم میں مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانوں کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہیں" (احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱)

یہ تو ایک اجمالی شہادت ہے لیکن ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر میں وہ مدتوں گھومتے رہے ہیں، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہیں یہ وہ زمانہ ہے جس میں سارے علوم و فنون جو غیر قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

---

[1] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل سنہ ۱۹۵۰ء ہی میں اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف میں بھیج دی تھی، لیکن گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون سنہ ۵۰ء میں شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر بھی پڑا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر میں روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک میں ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، لیکن معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا دشوار کام کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے، گویا یہ صورت حال اضطراری مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً یہ دعویٰ غلط ہوگا،

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانون کے دینی احساسات مین رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے،

آخر مین پوچھتا ہون کہ غزالی مانا کہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہین لیکن مین تو دیکھتا ہون کہ غزالی سے سینکڑون سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے زمانہ مین پیدا ہونے والے امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابون مین یہ شہادت منسوب کی گئی ہے، یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصون مین ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے،

ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و — علم کے تہائی حصہ کو مسلمانون نے یہود و

النصاری (توالی التاسیس لابن حجر ص) — نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے،

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانون مین اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان مین پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری مین بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیون کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہین ہے، ما لکم کیف تحکمون،

لہ بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس مین امام شافعی تھے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادب لغت ان ہی تین علوم کو اہمیت دیجاتی تھی، خود امام شافعیؒ نے علم کی ان تینون قسمون مین کمال پیدا کیا تھا، علم الادیان اور علم اللسان مین ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کی گو یا عام شہرت نہین ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم مین بھی ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابین مصر کے بعض اطبا نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی، (دیکھو توالی التاسیس ص)

اور یہی بات تو یہ ہے کہ مسلمانون کے جس دین کی طرف تنگ نظریون، کوتاہ فکریون کو منسوب کرنے کے لیے آج منسوب کررہے ہین، کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا، تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قومون کے ساتھ ساری فراخ چشمیان اور رواداریان جن کا ذکر مسلمانون کی تاریخ مین کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانون کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع طرز عمل مین پوشیدہ ہے،

اس قسم کے چھوٹے موٹے، نا قابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے عربی زبان مین جیسی کہ چاہیے گفتگو نہین کر سکتے تھے، تو تاریخ خمیس وغیرہ مین لکھا ہے کہ

طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
ترجماناً وکان فی المدینۃ یھودی	ترجمان کو مدینہ مین ایک یہودی تھا، جو عربی
عارفاً بالعربی والفارسی (ص ۳۵۲ ج ۱ خمیس)	اور فارسی زبان سے واقف تھا،

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا،[1]

---

[1] غیر قومون کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونون کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام جب عرب سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانون کو بھی انھون نے سیکھا، اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہؓ مین امام المحدثین سمجھے جاتے ہین، خطیب نے تاریخ بغداد مین مشہور محدث ابراہیم حربی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابوھریرۃ یکلم صبیانہ واھلہ بالنبطیۃ (ص ۲۰۶ ج ۵) یعنی ابوہریرۃ اپنے بچون اور اپنے گھر کے لوگون سے نبطی زبان مین گفتگو کرتے تھے، عراق کے سواد و دیہاتی علاقہ مین جو زبان بولی جاتی تھی اور فارسی و عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ مین صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابون مین ملتے ہین، بلکہ تاریخ خمیس کی مشہور بالا روایت مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلؑ نے فارسی زبان سکھائی ۱۲

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا، یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے؟ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ

استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے
وابوبکر رجلا من بنی الدیل ھادیا	قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا)
خریتا وھو علی دین قریش	راستہ بتائے گا، اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی
(بخاری ج ۱ ص ۳۰۱)	مسلمان نہ تھا)

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں

عامل النبی صلی اللہ علیہ وسلم	خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ
یھود خیبر	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی، دراصل یہ اور اسی کی قوم کے نبوی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر جیسا کہ شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

الفقہاء یجیزون استیجارھم	علمائے اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ
عند الضرورۃ وغیرھا	دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ
(حاشیہ بخاری)	ضرورت ہو یا نہ ہو،

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال مین مسلمانون کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہین،

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہین، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبون سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک مین موجود تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا، ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے وہ یمن پہنچا، جہان اس زمانہ مین ایرانیون کی حکومت قائم تھی، لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب مین حارث نے یمن ہی مین حاصل کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیون سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جند سابور مین باضابطہ علاج و معالجہ مین حذاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا، طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا، اور عرب ہی مین عوام و خواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا،

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین موجود تھا، لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ مین نقل کیا ہے:

لا یصح اسلامہ (ص ۳۰۲ ج ۱) حارث کا مسلمان ہونا درست نہین ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مین اس نے اسلام قبول نہین کیا، اور جیسا کہ طبقات الاطباء مین لکھا ہے:

حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین بھی تھا، اور آیندہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ تعالی عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا (ص ۱۱۰ ج ۱)

اس نے چارون راشدین خلفا، اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا، مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف مین بلکہ ایام حج مین مکہ معظمہ پہنچکر علاج و

معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا، اور کیوں جاری نہ رکھتا معمولی تاریخی کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے، تو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعد کو مشورہ دیا،

ایت الحارث بن کلدۃ اخا ثقیف — ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کی طرف

فانہ متطبب (ابوداؤد) — رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے،

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

عالج سعدا مما بہ (اصابہ ج ۱ ص ۳۰۱) — سعد جس مرض میں مبتلا ہیں تم اسکا علاج کرو،

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانوں نے آیندہ مسلسل قائم رکھا، ان میں خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کرکے صحابہؓ کو آپؐ نے دکھایا تھا،

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے، خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر میں بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ، اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجایش اس مسئلہ میں باقی رہتی ہے کہ آیندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشاء خود مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا،

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی حارث کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت مین حاصل ہوئے، کتابون مین لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حارث سے بسا اوقات طبی مسائل مین گفتگو بھی فرماتے، اور یہی طریقہ امیر معاویہ کا بھی تھا، سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانون پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک مین مسلمان جب پہنچے، اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتون کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہین کہ عمرو بن عاصؓ صحابی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے اور مصر پہنچکر عمرو بن عاص کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تامسطیوسؒ تھا، لیکن مسلمانون مین یحیی نحوی کے نام سے مشہور رہا، علاوہ طب و فلسفہ وغیرہ کے دین مسیحی مین اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی دربار مین بڑا رسوخ اسے حاصل تھا، اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت مین رہا تھا، قیصر کے دربار سے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلو نیوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان مین فیلو نیوس مجتہد کو کہتے ہین، خالکدونیہ نامی مقام مین صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علماے دین مسیحی کی جو مجلسین ہوتی رہین، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جسمین (۶۳۰) اسقف یعنی پادریون نے نمایندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا،

مگر باوجود ان تمام باتون کے حضرت عمرو بن عاصؓ کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاصؓ نے بلایا،

واکرمہ ورای لہ موضعا اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اسکی

لہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین پہلے نام کو اور تاریخ الحکما مین قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے، غیر عربی نامون کے متعلق عربون مین اس قسم کا اختلاف پیدا ہوجانا محل تعجب نہین ہوسکتا، مسلمانون کے نام کو آج یورپ والے کن شکلون مین بگاڑ رہے ہین اسی پر قیاس کرنا چاہیے

(مصر ۴، ۱۰۴) ان کی نظر میں قائم ہوگئی،

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

فلازمہ وکان لا یکاد یفارقہ (۲۳۲) اور اسکو عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے،

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے،

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے، اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے صیغوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطباء کے ہاتھوں میں ہے، جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابو الحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ میں مشہور تھا، اور ابو الحکم دوا سازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ

جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن آثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح و شام اس سے گفتگو کرتے۔" (ص ۱۱۶ ج ۱)

اسی طرح ابو الحکم کے متعلق یہ لکھکر کہ کان طبیبا نصرانیا یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا لکھا ہے کہ

طبی امداد امیر معاویہؓ اس سے بھی حاصل کرتے تھے، اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے (ص)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھکر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کی اسلام

کے عہد آغاز یعنی عہد صحابہ ہی مین یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانون مین ان غیر مسلم طبیبون کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی ،

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لیکر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیون کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانون کے عام علاقے غیر مسلم طبیبون سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورۂ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ دین سے بُعد یا طول امد کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا ،

مین تو کہتا ہون کہ تاریخون مین یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دواساز ابو الحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم مین مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیون کے زمانہ مین اسی ابو الحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی، مکہ کے عباسی گورنر عبد الصمد بن علی نے اپنے علاج کیلئے مکہ بلوایا،[۱] اور مسلمانون کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہین ہوا، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حارث بن کلدہ مکہ معظمہ مین مسلمانون کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انجام دے چکا تھا،

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات مین کیا ہے، یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبد الرحمن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہین اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہین کہ

کان عبد الرحمن ابو داؤد نصرانیا	عبد الرحمن جس کی کنیت ابو داؤد تھی ایک عیسائی تھا،
وکان رجلا من اہل الشام وکان	شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ
یتطبب فقدم مکة فنزلها (ج ۵ ص ۳۶۵)	آیا، اور وہین رہ پڑا،

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبد الرحمن الطبیب النصرانی کے تذکرہ مین اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے

---

[۱] دیکھیے طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۹

کہ مکہ معظمہ مین اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہان قائم کیا تھا، ابن سعد کا بیان ہے کہ

عبدالرحمن یجلس فی اصل منارۃ	کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو مینارہ
المسجد الحرام من قبل الصفا (۱)	تھا عبدالرحمن اسی مینارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھا،

جیسا کہ مین نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجئے مسلمانون کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر مین آکر قیام کرتا ہے جہان ان کی نمازون کا قبلہ اور بیت اللہ ہے جس کا وہ حج کرتے ہین، اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے مینارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے، لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفائے قریش مین آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی، ابن سعد ہی مین ہے

ولائی آل جبیر بن مطعم بن	موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے
عدی	خاندان والون سے عبدالرحمن نے قائم کیا تھا،

آج دنیا مین ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہین، جہان اس لیے کہ مسلمانون کی آبادی اتفاقاً اقلیت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والون نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد اقتدار مین غیر قومون کے ساتھ موجودہ مسلمانون کے باپ دادون نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے،

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلہ مین تاریخ کی شہادتین کیا ہین؟ یا جرم کی سزا ان لوگون کو دینی جنھون نے خود کوئی جرم نہین کیا ہے، مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمھارے باپ دادون نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً و عقلاً کس حد تک غیر مجرمون سے بدلہ لینا درست ہو سکتا ہے، ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے مین صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہون، اور پوچھتا ہون کہ مسلمانون کے ان ہی باپ دادون کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، جو اپنے مقدس ترین شہر مین بھی اپنی سب سے

بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے تھے

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ آباء و اجداد جن تنگ نظری اور قومی و ملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہیں، کاش! اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہو کر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے، تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگوں کو طعن و تشنیع کا آج نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہیں اتنی وسیع تھیں، اور اسی بنا پر ایسی باتیں وہ کر گذرتے تھے، کہ جن کو کرنا تو کرنا شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہیں لا سکتے،

دور کیوں جایئے، اسی طب و طبابت کے قصہ میں ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بختیشوع کے تذکرے میں یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار میں بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کر کے کہا کہ

"تم جانتے ہو میرے دل میں تمھاری کتنی جگہ ہے"

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانوں سے بھرے ہوئے دربار میں کہنا شروع کیا کہ

"خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہاں کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہیں ہوتا اسی موقف میں) ہے، جبرئیل میں نے تیرے لیے دعائیں کیں، اور بہت زیادہ دعائیں کیں" (طبقات الاطبا ج ۲ ص ۱۲۰)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانوں میں جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہیں، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہارون اس وقت کیا کہہ رہا تھا، اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبۂ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جسے عمل کر کے ہارون نے دکھایا، مسلمانوں پر جنھوں نے احسان کیا ان کو وہ کبھی نہیں

بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان، اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نامقبول نہیں ہوتی، دربار سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ

"میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے،

اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے"

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا

صدقت یا امیر المومنین (- -) آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینیا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محل وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر لے سکتے تھے، مگر اسی جذبۂ امتنان و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشورکشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقوں میں گھستے چلے گئے، لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اس لیے نگاہ غلط انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی، حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے،

کچھ بھی ہو، میرا ناچیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے خدمات سے استفادہ کے سلسلہ کو آئندہ جو جاری رکھا، اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت

و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی،

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطبا کے ساتھ مروانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں کیا تھا، اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اس کی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا، اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے۔ (طبقات الاطبا، ص ۱۶۳ ج ۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطبا تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے نہ ڈالا جائے،

الا حیۃ ذکیۃ (ص ۲۰۸ - ج ۵) مگر ذبح کیا ہوا سانپ،

حالانکہ سانپ خواہ میتہ (مردہ) ہو، یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خیال بھی وہی تھا، جو بہت سے دوسرے ائمۂ اسلام کا ہے کہ دوا ً حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہو جاتا ہے[۱]، میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں

---

[۱] حرام چیزوں سے دواءً استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطبا صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کریں، اس وقت تک ان کا استعمال

سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے، آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤن مین مسلمانون کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آگئی ہے، ارباب علم و فتوی چاہین تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس "اثر" سے سہولت کی راہ پا سکتے ہین،

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، مین کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھون مین سیاسی اقتدار آیا، تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہین، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان زمانہ مین بھڑک اٹھے تھے، جس اسلامی نظام مین ایران کا نو مسلم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج مین دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہین،[۱]

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام مین بنی امیہ کے فرمانرواؤن نے عربی و عجمی موالی و غیر موالی کے سوال کو اٹھایا، اور جہان تک ان کے امکان مین تھا، اس کلمۂ منتنہ[۲] (بدبودار) سے نفع اٹھانے مین کمی نہ کی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) جائز نہ ہوگا، یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے، تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہئے، لیکن دوسرے ائمہ کا فتوی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دواءً حرام چیزون کا استعمال حرام ہی نہین ہے، تفصیل کے لئے فقہ کے مطولات کا مطالعہ کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ مین لیا جاتا ہے، یعنی دواءً حرام چیزون کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر الدمیری نے حیات الحیوان مین نقل کیا ہے کہ جس تریاق مین سانپ ڈالا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہین دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے، جس مین قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے (ج ۱ ص ۲۴۵ حیات الحیوان دمیری، ۱۲) [۱] میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے، ۱۲۔

[۲] عہد نبوت و رسالت مین نسلی و وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی، دعوہ فانہا کلمۃ منتنۃ (اسکو چھوڑو یہی بدبو بات ہے)

مگر باوجود اس کے ہم اطبا کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خوابگاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ یہ ما مروانی حکمران عبد الملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا، تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابو الحکم رکھ دی تھی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو حجاز بھیجا تھا، اسی ابو الحکم کا بیان ہے کہ عبد الملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلا لیا، اسکی روایت کے الفاظ ہیں:۔

	ترجمہ	
فانی مجالس وعنده بنات له		میں عبد الملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبد الملک کی لڑکیاں بھی وہاں تھیں
(ج ا صـ۱۱۶)		

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا، یا برقع اوڑھکر باپ کے پاس عبد الملک کی یہ شہزادیاں آئی تھیں میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جا سکتا ہے،[۵۲]

---

[۵۱] آگے جو قصہ ابو الحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبد الملک کا ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبد الملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے، عبد الملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ۔

"ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے، اور چاہ رہا ہے کہ میں مر جاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں)

[۵۲] صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطبا ہی میں ابو سہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابو سہل پیش ہوا، تو نام پوچھنے پر اُس نے اپنا اصلی ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام "خرّہ خشاذ زادہ طیماذاذا ماہ ضیاد خسرو ابحشاذ" ہے اس طویل لمبے نام کو سنکر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمہارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہے اب دو ہی صورتیں ہیں، تمام الفاظ میں سے طیماذ کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائیگا اور جی چاہو تو اپنی کنیت ابو سہل"

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم تھا، حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں جو اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا، لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بیک اشارہ چشم بدل دیا تھا، اس کے لئے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطبار کو اپنے اردگرد جمع کر لیتا، خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطبار کا ذکر لوگوں نے کیا ہے، یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا، اور اس کو بھی جانے دیجئے، حجاج کے لئے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ جند سابور کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لئے عربی النسل اطبار کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی سب سے زیادہ سربرآوردہ اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی ہی تھا، نام اس کا لوگ تیا ذوق بتلاتے ہیں، لفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب اخبار الحجاج گذر چکی تھی، جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کئے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کے تیا ذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ

کان یعتمد علیہ و یثق بمداواتہ	حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا، اور
وکان لہ منہ الجامکیۃ	اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا حجاج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) رکھ لو، ابو سہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا، اور بعد کو "ابو سہل" کے نام سے مشہور ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی، ۱۲

الوافوکا، والاقتصاد الکثیر، کے ہان سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی، اور یون بھی اس کی بہت زیادہ خبرگیری کرتا تھا، (ص ۱۲۱ ج ۱)

یہ بھی لکھا ہو کہ جب تیاذوق مرض موت مین مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لئے براہ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ

لما حضرتہ الوفاۃ دخلت علیہ اعودہ، (ص ۱۲۳) جب تیاذوق مرض الموت مین مبتلا ہوا تو مین اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لئے،

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہین کر سکتے تھے لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا، اور نخوت و کبر مین اس کا جو حال تھا، ان امور سے جو واقف ہین، وہ سمجھ سکتے ہین کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس مین تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ

"بقاے صحت کے متعلق تیاذوق کے طبی مشورون کو مین نے اپنے تجربہ مین بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا" [۱]

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیون سے حجاج کے دل مین غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا، اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات مین گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ مین لوگون نے تیاذوق کے متعدد لطیفون کا ذکر کیا ہے جن مین اُس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر

---

[۱] اگر یہ واقعہ ہو جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق مین نقل کیا ہے کہ بعضون نے حجاج کو دسترخوان پر کھاتے ہوئے پایا، جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انھین وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی مین ایک کف دست

مین درد تھا، تیاذوق بُلایا گیا، اُس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤن پر گرم پانی ڈالا جائے، اور تیل کی مالش کی جائے، ایک خواجہ سرا جو عموماً خفی ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر مین ہے اور عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤن دھویا جائے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعوی کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمھارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہان تھی، اور ڈاڑھی تمھارے چہرے سے غائب ہو گئی، خواجہ سرا شرمندہ ہو گیا،

بہرحال عبدالملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہونچے تھے، بداوت کے یا مہقانیت سے زیادہ دور نہین ہوئے تھے، جب اُن کے درباروں مین غیر مسلم اطبا کو عزت و جاہ کی ان بلندیون پر ہم پا رہے ہین، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ ان مروانی حکمرانون کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبون کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہونچ گئی ہوگی جنھون نے شاہی خانوادہ مین پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانون مین جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جو فخر کرتے تھے کہ مین کسری کا بیٹا ہون، اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے، اور

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) کھن بھرتا اور گھٹنا جاتا تھا، اس طرح (۴۰) ٹھیے مین نے اس کے گنے غالباً تیاذوق کی دوا بن نے اس کے معدے مین ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو ابن عساکر ج ۵ ص ۲) طبقات الاطبا مین ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجئے، اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے، حجاج نے درباریون سے کہا کہ بھنے ہوئے پستون کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے، کہتے ہین کہ مختلف درباریون کے گھر سے بھنے ہوئے پستون کے خوان کے خوان نازل ہونے لگے، حجاج نے بھی مٹھیون مین بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا، اور آننا کہا گیا کہ بدہضمی ہو گئی، تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! مین نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کر کے اسے چکھئے گا، آپ نے تو پھانکنا شروع کیا، حجاج شرمندہ ہو گیا، پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہو گئی

نا تاں بھی،

سوچا جاسکتا ہے کہ اپنی ہمرشتہ قوموں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک میں اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگوں سے وہ آگے بڑھ گئے ہوں، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے،

افسوس ہے کہ مروانیوں کے اسی سال کے دور حکومت میں دربار سے جن جن اطبار کا تعلق رہا، لوگوں نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی میں پاتے ہیں کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصبیعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لئے تیاذوق نے "کناش کبیر" بھی لکھی تھی، اور کتاب الادویہ بھی جس میں بیان کیا ہے کہ

کیفیۃ دقہا و ایقاعہا و اذابتہا	دواؤں کے کوٹنے اور اُن کے ڈالنے
وشیٔ من تفسیر الادویۃ،	گھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کئے گئے تھے، اور بعض دواؤں کے نام کی
(صفحہ ۱۳۲)	بھی تشریح کی تھی،

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردوں کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی جن میں یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطبار میں لکھا ہے کہ

کان تیاذوق المتطبب یقدمہ	تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن
علی جمیع تلامذتہ،	شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردوں

عام تاریخوں میں یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ کہا کرتا تھا،

انا ابن کسری و ابی مروان — وقیصر جدی وجدی خاقان

دیکھو ص ۳، ابن کامل اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام سار بنت تھا کہتے ہیں کہ اس میں واقعی ایران کے کسری، روم کے قیصر ترکوں کے خاقان کا خون شریک تھا، ۱۲

(جلد ۱ صفحہ ۱۶۱) پر ترجیح دیتا تھا،

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

خدم الحجاج بن یوسف و	اُس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس
ھو حدث	زمانہ میں خدمت کی تھی، جب یہ یہودی

(ج ۱ ص ۱۶۱) طبیب جوان تھا،

فرات نے کافی عمر پائی، مروانیوں کا دور جب ختم ہوگیا، اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار میں فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسیٰ کا وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسیٰ کہا کرتا تھا کہ

فرات! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہو کر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہیں، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا، (صفحہ ۱۶۳)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشوروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں افسوس ہے کہ اُن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، اُن کے پڑھنے سے ایک طرف جہاں اس کا پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبوں پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانوں کے سلاطین و امراء کرتے تھے تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدر شناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیوں پر مبنی تھے،

جیسا کہ میں نے عرض کیا، مروانی حکمرانوں کے دربار کے ان طبیبوں کا تفصیلی تذکرہ کتابوں

نہین پایا جاتا لیکن جب عباسیون نے اپنے ہاتھ مین مسلمانون کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ مین پیش آیا، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

عباسیون نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین زیادہ تر کامیابی غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرتًا ان کا دربار عجمیون سے بھر گیا، عمومًا مالی کاروبار کا عباسیون کے زمانہ مین یہودی جھبذون یا موجودہ اصطلاح مین یہودی بنک کارون سے تعلق تھا،

عباسیون کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطبار اور معالجین کا قصہ ہے، آئیے پہلے اس کو سُن لیجئے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے جہابذہ کی داستان بھی سُنائی جائیگی، اگر اجل مسمی نے فرصت نہ دی تو مین دوسرے ارباب علم و قلم سے درخواست کرتا ہون کہ آیندہ اس مضمون کی تکمیل فرما دین گے،

سچ پوچھئے تو غیر مسلم اطبار کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیون ہی کا عہد ہے، ان کے دربار مین یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اطبار کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبون کا بھی داخل ہو گیا تھا، کہتے ہین کہ عباسیون کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ضعف معدہ مین مبتلا تھا، اچھا نہ ہوتا تھا، ایک ہندوستانی طبیب نے جھنگی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی، اور اُس کے دل مین ہندی طریقۂ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندی علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیون کے دربار مین "ہندی طب" بلکہ دوسرے ہندی علوم و فنون کی روشناسی مین بہت دخل ہے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہون، ہندوستانی اطبار کی کافی تعداد مختلف زمانہ مین بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابون کا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، اردو زبان مین کافی مواد اس مسئلہ مین جمع ہو چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطبار و در ہندی طب کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین ان کی فہرست درج کی ہے، جس مین دلچسپ بات یہ ہے، کہ منجملہ اور

کتابوں کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام علاجات النساء تھا یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

کتاب روسی الھندیہ فی علاجات النساء، (ج ۲ صفحہ ۳۲)

روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتون کے علاج کے متعلق ہے،

مین نہین جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اُس نے انجام دی تھی، دوسرون نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہین، اور اس زمانے مین اُس کے متعلق لوگون کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والون کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو، مسلمانون کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والون کے حوالہ کرکے مین اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہون،

سب سے پہلے تو اس سلسلہ مین دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دربارِ خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطبار کی تعداد کیا ہو گی، جب ہم دیکھتے ہین کہ عباسی عہد کے امرا بھی اپنے ہان طبیبون کی ٹولیون کو ملازم رکھتے تھے، طبقات الاطبار مین مشہور عباسی امیر ابودلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان مجلس ابی دلف مجمعًا للمتطببین،

ابودلف کی مجلس مین طبیبون کا مجمع رہتا تھا،

طبیبون کے اس مجمع مین جو لوگ شریک تھے، اُن مین بعضون کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان معہ من المرتزقۃ جماعۃ منھم یوسف بن صلیبا وسلیمان بن داؤد بن بابان ویوسف القصیر ویونس بن حنون، (ج ۱ ص ۱۶۰)

امیر ابودلف کیساتھ تنخواہ یاب طبار کا ایک گروہ تھا جن مین یوسف بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان، یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے،

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہیں تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے، کہ مرتزقہ کے سوا

رُبما اجتمعوا فی مجلسه منهم	بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطبا کے)
عشرون رجلاً	بیس بیس آدمی اس کی مجلس میں جمع ہو جاتے تھے،

افسوس ہے کہ لوگوں نے مفصل فہرست ان طبیبوں کی نہیں دی ہے، جو مختلف عباسی خلفاء کے دربار سے تعلق رکھتے تھے لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل میں ایسی چیزیں مل جاتی ہیں، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، جس میں اُس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان بیان کی ہے، اسی رسالہ میں حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطبا جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہیں، اور خلفاء کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے، ان کی تعداد،

ستة وخمسون رجلاً كلهم	چھپن ہے، اور سب ہمارے ہم
من اهل المذهب، (ص ۱۹۳)	مذہب ہیں،

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہوں گے، جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے مددگاروں، دواسازوں وغیرہ کی تعداد کیا ہو گی،

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتوں کی بنا پر یہ میرا خیال ہے کہ طب اور علاج ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور میں غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والوں نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہو گی، ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت و فراخی کا تصور کیجئے، اور سوچئے کہ اس وسیع علاقے کے باشندوں

کی طبی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت تھی، چونکہ اس پیشہ کو مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیوں کے زمانہ میں طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتوں کو ترک کرکے یا ان سے لاپروائی اختیار کرکے مسلمانوں کے دلوں میں ان لوگوں نے جگہ پیدا کی تھی،

(باقی)

خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ

از

حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبون کی طرح علم و فن کے شعبہ مین بھی خواتین کے کارنامون کا بہت کم سراغ ملتا ہے، خاص طور سے عرب مین تو اس صنف کی حالت اور زیادہ زبون تھی، پورے ملک مین مشکل سے دو چار عورتین پڑھی لکھی مل سکتی تھین لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ مین مردون کی طرح عورتون مین بھی اس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ان کی دنیا بدل گئی، اور زندگی کے مختلف شعبون کے ساتھ علم و فن مین بھی انھون نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، اور اسلام کا یہ چشمۂ فیض عرب ہی تک محدود نہین رہا بلکہ ساری دنیا اس سے سیراب ہوئی،

لیکن سوء اتفاق سے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ مین پردہ کی وجہ سے مسلم خواتین زندگی کے کسی شعبہ اور خاص طور سے علم و فن مین کوئی خاص حصہ نہین لے سکین، اور نہ انھون نے کوئی قابلِ ذکر یادگار چھوڑی، اور اس زمانہ مین بھی ان کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، پھر اسی وہم و خیال کے ماتحت یہ نتیجہ نکالا جاتا ہو کہ پردہ مین رہ کر مسلم خواتین کی ترقی ممکن نہین ہو، اس لئے ضرورت ہو کہ ان کو اس قید سے آزاد کرکے میدانِ عمل مین آنے کی اجازت دیجائے کہ وہ بھی مردون کے دوش بدوش زندگی کی جد وجہد مین حصہ لے سکین، اس وقت اس پر بحث کرنا مقصود نہین ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور مسلم خواتین کی واقعی ترقی پردہ مین رہ کر ہو سکتی ہے، یا اس قید سے آزاد ہو کر، لیکن تاریخ سے مذکورۂ بالا خیال کی تائید نہین ہوتی

بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک سیکڑون ہزارون پردہ نشین مسلم خواتین نے حدودِ شریعت مین رہتے ہوئے گوشۂ علم و فن سے لیکر میدانِ جہاد تک ہر شعبۂ زندگی مین حصہ لیا، اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر مین اپنا پورا حق ادا کیا، اس مضمون مین صرف اُن کی علمی کوششون کے ایک گوشہ یعنی علم حدیث کے سلسلہ مین ان کی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے،

خواتین نے علم حدیث کی جو خدمات انجام دی ہین، اُن کی سب سے پہلی نمایندگی صحابیات پھر تابعات کرتی ہین، اس لئے سب سے پہلے انہی کے کارنامون کا اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

صحابہ کی طرح صحابیات بھی اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ کی نہین تھین، اور نہ سب کو یکسان طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لئے اُن کی خدمات بھی اسی اعتبار سے کم و بیش ہون گی، کیونکہ حدیث کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبت، اور فہم و فراست ہی کی تھی، صحابیات مین ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر لحاظ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی اس لیے اس سلسلہ مین ان کی خدمات سب سے زیادہ ہین، اُن مین بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ کے کارنامے سب سے زیادہ ہین،

حضرت عائشہؓ مکثرین رواۃ صحابہ (یعنی وہ صحابہ جن کی روایات .... کثرت سے موجود ہین) مین ہین ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جن مین ۲۸۶ حدیثین بخاری و مسلم مین موجود ہین، مرویات کی کثرت کے لحاظ سے صحابہ مین ان کا چھٹا نمبر ہے،

مرویات کی کثرت کے ساتھ ان احادیث سے استدلال اور استنباطِ مسائل اُن کے علل و اسباب کی تلاش و تحقیق میں بھی اُن کو خاص امتیاز حاصل تھا اور انکی اس صفت مین بہت کم صحابہ اُن کے شریک تھے، کتب حدیث مین کثرت سے اس کی مثالین موجود ہین، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت متعدد صحابہ سے مروی ہوتی ہے، اور حضرت عائشہؓ بھی وہی روایت کرتی ہین لیکن وہ اپنی روایت مین اس کی علت و حکمت کا بھی تذکرہ کر دیتی ہین

جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے لئے زیادتی شوق کا سبب بنجاتی ہے، مثلاً غسل جمعہ کے سلسلہ مین حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس دن غسل کرنا چاہئے، اوّل الذکر دو صحابی صرف اتنا بیان کرتے ہین کہ جمعہ کا غسل ضروری ہے، مگر حضرت عائشہؓ نے اپنی روایت مین اسکی علت و حکمت بھی بیان کر دی ہے، فرماتی ہین،

كان الناس ينتابون من منازلهم	لوگ اپنے اپنے گھرون اور مدینہ کے باہر
والعوالی فیاتون فی الغبار تصیبهم	کی آبادیون سے (نماز کے لئے) آتے تھے، اُن
الغبار والعرق فیخرج منهم العرق	گرد و غبار اور پسینہ مین تر ابور ہوتے تھے
فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان	ایک دفعہ ایک صاحب آپ کے پاس آئے
منهم وهو عندی فقال النبی صلی اللہ	وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے، آپ نے اُن
علیہ وسلم لو انکم تطهرتم لیومکم هذا	سے فرمایا کہ اگر تم آج کے دن غسل کر لیتے
(بخاری کتاب الجمعہ)	تو کیا بہتر ہوتا،

ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ نے اسے دائمی حکم سمجھا، حضرت عائشہؓ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا، کہ یہ حکم دائمی نہین، بلکہ مستحب ہے، اس حکم سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ قربانی کا گوشت لوگ جمع نہ کرین، بلکہ دوسرون کو کھلا پلا دیا کرین[1]،

بعض مرتبہ راوی کو پوری حدیث محفوظ نہین ہوتی تھی، صرف حدیث کا ایک ٹکڑا یاد رہ جاتا تھا، یا روایت کے مغزِ سخن تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جب وہ حدیث روایت کی جاتی تھی تو روایت کا پورا مفہوم سامنے نہین آتا تھا بلکہ بسا اوقات معنی بھی بدل جاتے تھے، حضرت عائشہؓ جب بھی ایسی حدیث سنتی تھین، تو اُن کی تصحیح

---

[1] سیرت عائشہ ص۲۳۲ء

تردید کر دیتی تھین، اس سلسلہ مین انھون نے اکابر صحابہ تک سے اختلاف یا ان کی روایات پر استدراک کیا ہے، تقریباً ایسی چالیس احادیث ہین جن مین انھون نے صحابہ پر استدراک کیا ہے، امام سیوطی نے ان روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کا نام عین الاصابہ ہے، اس کے دیکھنے سے احادیث مین ان کی دقت نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، توضیح کے لیے دو ایک مثالے پیش کیے جاتے ہین، ایک دفعہ لوگون نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین کہ تین چیزون مین بدشگونی ہے، عورت مین، سواری مین، اور گھر مین، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہ نے پوری حدیث نہین سنی، پوری حدیث یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی یہود کو ہلاک کرے وہ کہتے ہین کہ بدشگونی تین چیزون مین ہے، عورت مین، گھوڑے مین اور گھر مین، ابوہریرہ نے حدیث کا آخری ٹکڑا تو سنا اور پہلا نہین سنا[1]،

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والون کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے کبھی یہ نہین فرمایا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن ایک یہودی کے جنازہ پر سے گذرے، اس کے گھر والے اس کا ماتم کر رہے تھے، آپ نے فرمایا یہ روتے ہین اور اس پر عذاب ہو رہا ہے" یعنی مقصود یہ ہے کہ یہ تو رو رہے ہین، اور مردہ اپنے اعمال کی سزا مین مبتلا ہے، پھر فرمایا کہ ہر شخص اپنے فعل کا جواب دہ ہے، اور استدلال مین یہ آیت تلاوت کی،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، — اور کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہین اٹھائیگا،

عین الاصابہ مین اس کی اور بہت سی مثالین ہین، حضرت عائشہؓ سے جن بزرگون نے حدیث مین استفادہ کیا ہے، ان مین بہت سے صحابہ اور کبار تابعین ہین مثلاً عروہ بن زبیر، سعید بن المسیب، عبد اللہ بن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ، علقمہ، صفیہ بنت جنید، عطا بن یسار، یہ چند نام لکھ دیے گئے ہین، ورنہ ان سے

---

[1] عین الاصابہ

روایت کرنے والوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے،

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ ممتاز نظر آتی ہیں، محمد بن لبید کا قول ہے،

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ازواج مطہرات کو کثرت سے احادیث یاد تھیں،
یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ	لیکن حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سب سے زیادہ
وسلم کثیراً ولا مثلاً لعائشۃ وام سلمۃ[1]	ممتاز تھیں،

انھیں حدیث سننے کا بید شوق تھا، ایک مرتبہ گھر میں بال گندھوا رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے زبان مبارک سے جوں ہی ایھا الناس (اے لوگو) نکلا آپ نے مشاطہ سے کہا کہ بال باندھ دو، اس نے کہا جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایھا الناس ہی کہا ہے، بولیں کیا خوب ہم آدمیوں میں نہیں ہیں؟ اس کے بعد خود بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اور پورا خطبہ سنا،[2]

حضرت عائشہؓ حدیث میں گو خود بلند درجہ رکھتی تھیں لیکن بعض مرتبہ انھیں بھی ام سلمہؓ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے واسطے سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، حضرت عائشہؓ کے پاس تصدیق کے لیے آدمی بھیجا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث ام سلمہؓ سے پہنچی ہے، حضرت ام سلمہؓ کے پاس آدمی گیا، اور قول نقل کیا، تو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ عائشہ کی مغفرت کرے، انھوں نے بات نہیں سمجھی، کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]"،

حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد (۳۷۸) ہے، ان کے فتاوے بھی کثرت سے ہیں، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے (ص ۱۳ ج ۱)

ان کا شمار محدثین کے تیسرے طبقہ میں ہے، حضرت ام سلمہؓ کے تلامذۂ حدیث میں بے شمار تابعین اور بعض

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶ [2] مسند ج ۶ ص ۳۰۲ [3] بخاری ج ۲ ص ۹۲۷،

صحابہ شامل ہیں، چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:-

اسامہ بن زید، سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب، عبد اللہ بن رافع نافع مولی ابن عمر، عروہ بن زبیر، عکرمہ، ابو سلمہ، ابو عثمان النہدی، ہند بنت الحارث، خیرۃ والدہ حسن بصری، زینب آپ کی صاحبزادی وغیرہ

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات نے بھی حدیث کی روایت اور اشاعت میں حصہ لیا، حضرت حفصہؓ سے مسند میں (۶۰) حدیثیں مروی ہیں، حدیث میں ان سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ روایت کرتے ہیں، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ حدیثیں مروی ہیں اور انکے تلامذۂ حدیث بھی کچھ کم نہیں ہیں، مثلاً عروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، ابو صالح السمان وغیرہ، حضرت میمونہؓ سے (۴۶) حدیثیں منقول ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عبد الرحمٰن بن سائب، یزید بن عاصم، عطاء ابن یسار وغیرہ ہیں، آنحضرت صلعم کی صاحبزادیوں میں حضرت فاطمہؓ سے بھی متعدد روایتیں مروی ہیں،

عام صحابیات میں مشکل ہی سے کوئی صحابیہ ایسی ہونگی جن سے کوئی نہ کوئی روایت موجود نہ ہو جن سے متعدد روایتیں موجود ہیں، ان کے نام مع تعداد حدیث یہ ہیں،

حضرت ام الفضلؓ ان سے (۳۰) حدیثیں مروی ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، حضرت ام رومانؓ اور ام سلیمؓ سے بھی چند حدیثیں مروی ہیں، ام سلیمؓ سے بڑے بڑے صحابہ مسائل دریافت کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ میں اختلاف ہوا، تو دونوں بزرگوں نے ان ہی کو حکم مانا[۱]، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ متعدد صحابہ اور تابعین نے ان سے روایت کی ہے، حضرت ام عمارہؓ اور حضرت ام عطیہؓ سے بھی متعدد روایتیں منقول ہیں، حضرت ام عطیہؓ سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت انسؓ، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، صحابہ و تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے[۲]، حضرت ربیع بنت مسعودؓ

---

[۱] مسند ج ۶ ص ۴۳۰ [۲] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۵

سے (۲۱۰) حدیثیں صرف مسند میں مروی ہیں، علمی اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس اور امام زین العابدین ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان بزرگوں کے علاوہ عائشہ بنت انس سلیمان ابن یسار، ابو سلمہ، نافع مولی ابن عمر، وغیرہ ان کے رواۃ میں ہیں[1]، حضرت ام ہانی گو قدیم الاسلام نہیں تھیں، لیکن ان کی روایت سے (۴۶) حدیثیں مسند میں موجود ہیں، ان کے رواۃ کی تعداد بیس کے قریب ہے، ان میں عبد اللہ بن عباس کے علاوہ متعدد کبار تابعین مثلاً امام شعبی، عروہ بن زبیر، مجاہد، ابن ابی لیلی، عطا بن یسار، کریب، محمد بن عقبہ وغیرہ ہیں،

خانوادۂ صدیقی میں حضرت اسماء بنت عمیس حضرت صدیق کی زوجۂ مکرمہ، اور حضرت اسماء آپ کی صاحبزادی روایت حدیث میں ممتاز تھیں، بلکہ عام صحابیات میں کثرت روایت کے اعتبار سے ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اسماء بنت عمیس سے (۶۰) حدیثیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکر سے (۵۸) حدیثیں مروی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، جن میں حضرت عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن زبیر جیسے صحابہ اور سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر فاطمہ بنت علی، ام عون، عبد اللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ جیسے تابعین اور تابعات شامل ہیں، ان کے علاوہ فاطمہ بنت قیس، تماضر بنت عبد اللہ، زینب بنت ابی معاویہ، اسماء بنت یزید، زینب بنت ابی سلمہ و سبیعہ بنت الحارث وغیرہ بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہیں،

مسانید صحابیات | صحابیات کی کثرت روایت اور ان کی خدمت حدیث کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے امام احمد بن حنبل نے ایک سو تیس[2] صحابیات کی مسانید جمع کی ہیں، جن کی مجموعی ضخامت ۲۴۴ صفحات ہیں ان میں کئی ہزار حدیثیں ہیں، حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں ۳۰۸ صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے، اسی طرح اسد الغابہ اور اصابہ میں ۵۰۰ سے زائد صحابیات کے تراجم موجود ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی صحابیہ

---

[1] اصابہ و مسند [2] اسد الغابہ ج ۵ اور تہذیب ج ۱۲

ہوں گی جن سے کوئی روایت نہ موجود ہو، تہذیب میں ۳۳۳ عورتوں کا تذکرہ ہے، جن میں بیشتر صحابیات ہیں،
اگر ان تمام صحابیات کی روایتیں جمع کی جائیں تو ان کی مسانید کے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی کاش اللہ تعالیٰ
کسی کو اس کی توفیق دیتا کہ وہ ان کی مسانید کتب احادیث سے چھانٹ کر ایک جگہ جمع کر دیتا تو بڑا مبارک
اور مفید کام انجام پا جاتا،

تابعات صحابیات کی صحبت میں جن خواتین نے پرورش پائی یا ان سے استفادہ کیا ان کو تابعات کہا
جاتا ہے، صحابیات کی طرح تابعات نے بھی فن حدیث کی حفاظت و اشاعت اور اس کی روایت اور
درس و تدریس میں کافی حصہ لیا، اور بعض نے تو اس فن میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ بہت سے کبار تابعین نے
ان سے اکتساب فیض کیا، چند مشہور تابعات کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

حفصہ بنت سیرین، انھوں نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے جن میں انس بن مالک
ام عطیہؓ، ام الرائح، خیرۃ ام الحسن البصری، ابو العالیہ، ربیع بن زیاد وغیرہ ہیں ان سے روایت کرنے والوں
میں ابن عون، خالد الحذاء، قتادہ، ہشام بن حسان وغیرہ تابعین شامل ہیں، جرح و تعدیل کے امام
یحییٰ بن معین نے ان کو ثقۃ حجۃ فرمایا ہے[۱] ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ ما ادرکت احدا افضلہ
من حفصۃ میں نے حفصہ سے زیادہ فضل والا کسی کو نہیں پایا، ان کے اس فضل کا اندازہ اس سے
ہوتا ہے کہ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے قرآن و حدیث پڑھ لیا تھا[۲]،
امام بخاری اور ابو داؤد نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے[۳]، سنہ ۱۰۱ھ
میں وفات پائی، امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے[۴]،

معاذۃ بنت عبد اللہ۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور ام عمرو سے اور ان سے
ابو قلابہ، قتادہ، یزید الرشک، ابو عاصم حسن بصری کی والدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، یحییٰ بن معین نے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۹ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

ثقہ و حجہ کہا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے، جن احادیث کا انھیں علم تھا ان پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں، ابو شبہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے پیٹ میں درد تھا، انھوں نے مجھ سے درد کا حال بتایا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کچے گھڑے میں رکھی ہوئی نبیذ ان کو استعمال کرائی جائے (اس میں نشہ آجاتا ہے) چنانچہ میں نے ایک پیالہ نبیذ لاکر ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے نبیذ دیکھکر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا، اللہ کی پناہ! تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے نبیذ جر سے منع فرمایا ہے، خیر تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ کافی ہے، خدا کی شان کہ وہ پیالہ الٹ گیا، اور نبیذ زمین پر گر پڑی اور ان کو افاقہ بھی ہو گیا[1]

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص۔ مشہور صحابی حضرت سعدؓ کی صاحبزادی تھیں، چھ امہات المومنین کو دیکھا تھا، اپنے والد حضرت سعدؓ اور ام ذرؓ سے روایت کی ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں ۸ تابعین ہیں، امام ذہبی نے ان کا شمار حفاظ حدیث میں کیا ہے، اور تابعین کے تیسرے طبقہ میں ان کو جگہ دی ہے[2] یہ تنہا خاتون ہیں جن سے امام مالک نے روایت کی ہے[3] ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

صفیہ بنت عبید۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی اہلیہ تھیں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، قاسم بن محمد وغیرہ سے روایت کرتی ہیں، ان سے متعدد اکابر تابعین مثلاً سالم بن عبد اللہ، نافع، عبد اللہ بن صفوان وغیرہ نے روایت کی ہے، عجلی نے ان کو تابعیہ ثقہ لکھا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[4]

عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت ابو بکرؓ کی نواسی تھیں، اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں، ان سے اجلہ تابعین نے روایت کی ہے، ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، عجلی مدنیہ تابعیہ و

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۴ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۳۹ و [3] ایضاً ج ۱۲ ص ۴۳۶ [4] ایضاً ص ۴۳۰

ثقہ لکھتے ہین، ابو زرعہ فرماتے ہین کہ ان کے فضل کی وجہ سے بہت لوگون نے ان سے روایت کی ہے اور اہل علم ان کا ادب کرتے تھے،[۱]

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن - یہ حضرت عائشہؓ کی خاص تربیت یافتہ اور ان کی احادیث کی امین تھین، ابن حبان کا قول ہو کہ کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ (حضرت عائشہؓ کی احادیث کی سب سے بڑی جاننے والی تھین) ابن المدینی فرماتے ہین" حضرت عائشہؓ کی حدیثون میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرۃ قاسم اور عروہ کی ہین"۔[۲] عمرہ کے بھائی محمد بن عبدالرحمٰن فرماتے ہین کہ مجھ سے عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ ما بقی احد اعلم بحدیث عائشۃ (اسوقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے بڑا جاننے والا کوئی موجود نہین ہی) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابن حزم کو خاص طور سے لکھا تھا" عمرۃ کی تمام احادیث ان کے لیے لکھ لین"، ابن سعد نے انکو" عالمۃ" لکھا ہو[۳] امام ذہبی نے ان کو تابعین کے تیسرے طبقہ مین شمار کیا ہو[۴] اور ان کو "فقیہۃ" لکھا ہے، ابن معین نے انکی شان مین ثقۃ حجۃ اور عجلی نے تابعیۃ ثقۃ" اور ابن المدینی نے احد الثقات العلماء[۵] کے الفاظ استعمال کیے ہین،

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی انھون نے روایتین کی ہین، ان سے روایت کرنے والون مین ۱۳ سے زیادہ کبار تابعین ہین، ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ مین وفات پائی،[۶]

فاطمہ بنت المنذر حضرت زبیر بن العوامؓ کی پوتی مشہور تابعی ہشام بن عروہ کی بیوی تھین، انھون نے متعدد صحابیات و تابعات مثلاً حضرت اسماء، حضرت ام سلمہؓ ام المومنین اور عمرۃ بنت عبدالرحمٰن وغیرہ سے روایت کی ہے، اپنے علم و فضل کے باوجود ہشام بن عروہ نے ان سے روایت کی ہی، عجلی نے انکے بارے مین مدنیۃ تابعیۃ ثقۃ" لکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے،[۷]

قمیر بنت عمرو مشہور محدث مسروق بن الاجدع کی بیوی ہین، انھون نے حضرت عائشہؓ اور اپنے شوہر مسروق سے روایت کی ہے،

---

[۱] تہذیب ج ۱۲ ص ۳۰۴ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۴۹ [۵] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸ [۶] ایضاً [۷] ایضاً ص ۴۴۴

ان کو روایت کرنے والون مین امام شعبی، محمد بن سیرین، مقدام بن شریح اور عبداللہ بن شبرمہ وغیرہ کبار تابعین

ہین، ابو داؤد اور نسائی مین ان کی روایات موجود ہین، عجلی نے تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے،[1]

ام الدرداء صغریٰؓ۔ حضرت ابودرداؓ کی بیوی تھین، اور عمر مین ان سے بہت چھوٹی تھین، یہ

یتیم تھین حضرت ابو درداؓ نے ان کی پرورش کی تھی، اور وہ چھوٹی ہی عمر سے ہر وقت حضرت ابو درداؓ

کے ساتھ رہتی تھین، اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسون مین شریک ہوتی تھین، ان ہی کی تربیت کا

فیض تھا کہ تابعین کے دوسرے طبقہ مین شمار کی جاتی ہین، انھون نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ

فضالہ بن عبیدؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے علاوہ ام الدرداء الکبریٰ صحابیہؓ سے کثرت سے روایت

کرتی ہین، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وھی تروی عنھا الحدیث الکثیر[2] یہ ام الدرداء کبریٰ سے بہت کثرت سے حدیثین

(تہذیب ج ۲ ص ۴۶۴) روایت کرتی ہین

ان سے روایت کرنے والون مین تقریباً بیس تابعین ہین جن مین زید بن اسلم، مکحول الشامی، مورق

العجلی اور عون بن عبداللہ وغیرہ ہین،

خیرہؔ حضرت حسن بصری کی والدہ ہین، یہ حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھین، اور ان ہی سے استفادۂ

حدیث بھی کیا تھا، حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کرتی ہین، ان سے ان کے دونون صاحبزادے

حسن اور سعید اور علی بن زید، حفصہ بنت سیرین وغیرہ روایت کرتے ہین،

ان مذکورۂ بالا تابعات کے علاوہ بے شمار تابعات ہین، جنھون نے اس فن کی ترقی واشاعت

مین حصہ لیا ہے، چند نام یہان درج کیے جاتے ہین،

جبلہ بنت مصفح، جسرہ بنت دجاجہ، جمیلہ بنت وائلہ، ہیابہ بنت عجلان، حلیمہ بنت میسرہ

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۴ [2] ایضاً

حفصہ مخزومیہ، زینب بنت ابوسعید خدریؓ، صفیہ بنت الحارث، صفیہ بنت شیبہ، الرباب حفصہ بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ، زرقہ، رمیثہ، فاطمہ بنت حسین، فاطمہ بنت علی، ام بلال، کریمہ بنت المحساس وغیرہ، یہ وہ تابعات ہیں جنھوں نے متعدد صحابہ سے روایتیں کی ہیں، اور ان سے صحاح میں روایات موجود ہیں، اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے،

ہم نے زیادہ تر ان تابعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تذکرہ تہذیب یا تذکرۃ الحفاظ میں ہے، ورنہ ان تابعات کی تعداد جنھوں نے روایت حدیث میں حصہ لیا، اس سے بہت زیادہ ہے، صرف ابن سعد نے ۹۳ تابعات کا تذکرہ کیا ہے، اصابہ میں تیسری اور چوتھی قسم میں جن خواتین کا تذکرہ ہے تقریباً ان سب کا شمار تابعات میں ہے، اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ ہے،

تابعات کے بعد دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی بے شمار خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترقی و اشاعت میں حصہ لیا لیکن افسوس ہے کہ ان صدیوں میں خواتین کے کارناموں کے سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب ناپید ہیں، مثلاً ابن مندہ متوفی ۳۹۵ھ، ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ، ابوموسیٰ اصفہانی متوفی ۵۸۱ھ کی کتابیں اور خصوصیت سے ابن اثیر جزری کی تاریخ النساء وغیرہ، تاہم جن کا تذکرہ متداول کتابوں میں ملتا ہے ان کا ذکر کیا جاتا ہے،

دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی جن خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اسکی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا ان کے نام اور کارنامے حسب ذیل ہیں،

ام عمر۔ حسان بن زید تابعی کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے اپنے والد اور اپنے شوہر یحییٰ بن سعید سے متعدد روایتیں کی ہیں، اور ان سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابوابراہیم محمد بن الصباح، ابراہیم بن عبداللہ، علی بن مسلم وغیرہ ہیں، ان کے والد نے حضرت علیؓ کو دیکھا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے والد کی روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ ایک دن

آپ خطبہ دے رہے تھے، اور بلند آواز سے لوگون کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے، کہ لوگو! تم نے میرے اور عثمان بن عفان کے بارے مین عجیب عجیب باتین مشہور کر رکھی ہین لیکن ہمارا اوران کا حال بالکل وہی ہے جو نقشہ قرآن نے اہلِ جنت کا کھینچا ہے، پھر یہ آیت پڑھی،

ونزعنا ما فی صدورھم من	اوران کے دلون مین جو کینہ تھا ہم وہ
غلٍ اخوانا علی سرر متقابلین[1]	سب دور کردین گے، اورسب بھائی بھائی
	کی طرح تختون پر آمنے سامنے بیٹھے ہون گے،

امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین ام عمر کے بارے میں فرماتے ہین کہ دار معاذ بن مین نے اُن سے سماع کیا ہے، ان مین کوئی خاص بات نہین ہو، مگر میرے بہت سے اصحاب اُن سے روایت کرتے ہین[2]،

زینب بنت سلیمان الہاشمیہ: یہ اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھین جس کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی یعنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی پر پوتی تھین، اُن کے والد سلیمان کا شمار حفاظ حدیث مین تھا، انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زینب کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا، ان سے متعدد اتباع تابعین نے روایت کی ہے، مثلاً قاضی جعفر بن عبداللہ، عاصم بن علی، احمد بن خلیل وغیرہ خطیب اُن کی روایت سے متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین،

من افاضل النساء (جلد ۱۴ص ۴۳۴)	خواتین مین نہایت فاضلہ تھین،

خلفاء تک ان کا احترام اوران کی عظمت کرتے تھے چنانچہ مامون جس کا معمول تھا کہ پردۂ شاہی کے اوٹ سے گفتگو کرتا تھا، لیکن جب زینب پہنچتی تھین تو پردہ ہٹا دیا جاتا تھا[3]،

اُن کے علاوہ اسی خانوادہ کی انہی کی ہم نام ایک دوسری زینب بھی تھین جنسے کوئی مرفوع حدیث تو مروی نہین ہے لیکن اپنے والد کی سند سے عبداللہ بن عباس کے دو ایک اثر کی روایت کرتی ہین،

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۴ص ۴۳۴ [2] ایضاً ج ۱۴ص ۴۳۴ [3] ایضاً ص ۴۳۴،

عبدہ بنت خالد بن معدان حمص کی رہنے والی تھیں، خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی ہیں، اپنے والد سے روایت کرتی ہیں، افسوس ہے کہ اُن کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے، تہذیب میں اُن کے والد کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ امام اوزاعی خالد بن معدان کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا کہ ان کی اولاد میں کوئی ہے؟ لوگوں نے عبدہ کا نام لیا، انہوں نے کہا کہ جاکر ان سے خالد کے حالات دریافت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[۱]

عبدہ بنت عبدالرحمٰن بغدادیہ، ان کا نسبی تعلق ابوقتادہ انصاریؓ کے خانوادہ سے تھا، یہ حضرت ابوقتادہ کی پرپوتی ہیں، اپنے والد عبدالرحمٰن سے روایت کرتی ہیں، اُن سے روایت کرنے والوں میں محمد بن مخلد، سلیمان بن احمد وغیرہ شامل ہیں، ابوالقاسم طبرانی نے اُن سے چند مرفوع احادیث نقل کی ہیں، اُن کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ احادیث حضرت ابوقتادہؓ کی اولاد ہی سے مروی ہیں، اور میں نے ان احادیث کو عبدہ کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں :-

وکانت امرأۃ عاقلۃ فصیحۃ متدینۃ (بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴)	یہ ایک عاقل، فصیح البیان اور حدیث کی روایت میں متدین تھیں،

خدیجہ ام محمد، انہوں نے امام احمد بن حنبل سے سماع کیا تھا، اور ان سے روایت بھی کرتی ہیں، امام احمد کے علاوہ یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف اور ہاشم بن القاسم سے روایت کرتی ہیں، امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اُن سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

کانت تجیٔ الی ابی تسمع	میرے والد (امام احمد) کے پاس سماع کے لئے آتی تھیں،

خطیب نے ام محمد کی سند سے ام درداء کا ایک اثر نقل کیا ہے، جس کے ایک راوی عبداللہ ہیں، وہ اثر یہ ہے،

---

[۱] تہذیب ج ۳ ص ۱۱۲،

حدثنا عبد اللہ بن احمد قال حدثتنی خدیجۃ ام محمد سنۃ ست وعشرین وماتین قالت حدثنا اسحاق الازرق حدثنا المسعودی عن عون بن عبد اللہ، قال کنا نجلس الی ام الدرداء فنذکر اللہ عندھا فقالوا لعلنا قد امللناک؟ قالت تزعمون انکم قد امللتمونی فقد طلبت العبادۃ فی کل شئی فما وجدت شیئا اشفی لصدری ولا احری ان اصیب بہ الذی ارید من مجالس الذکر (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۶)

۲۲۶ھ کے بعد تک زندہ ہین،

یہ ذوق صرف آزاد خواتین ہی تک محدود نہین تھا، بلکہ اس مین لونڈیان اور باندیان بھی شریک تھین امام محمد کے پاس متعدد لونڈیان، رات کے وقت آکر تحصیل حدیث کرتی تھین ابراہیم بن سعد ایک حافظ حدیث گذرے ہین، اُن سے ایک بار مسند ابو بکر کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھون نے اپنی لونڈی سے فرمایا، کہ مسند ابو بکر کی ۲۳ وین جلد نکال لاؤ، اس سے ان کے علم حدیث کی واقفیت اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

سمانہ بنت حمدان، تیسری صدی کے اخیر مین وضاح بن حسان ایک محدث گذرے ہین، جنھون نے حدیث مین ایک تحریری یادگار بھی چھوڑی ہو، سمانہ انہی کی نواسی ہین، وہ اپنے نانا سے روایت کرتی ہین، اُن سے روایت کرنے والون مین ابو بکر شافعی اور ابو القاسم طبرانی ہین، خطیب نے اُن سے متعدد روایتین نقل کی ہین،[1]

اسی صدی کے آخر مین ایک خاتون فاطمہ بنت محمد بھی تھین جنھون نے حدیث کی خدمت مین حصہ لیا، اُن کی زندگی نہایت ہی زاہدانہ تھی، وہ مصلے ہی پر سوتی تھین، ۳۱۲ھ مین وفات پائی،

(باقی)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۴۴،

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال ندوی

(۲)

اقوام یہ عجیب بات ہے کہ یہ کتبہ اگرچہ حضرموت مین ملا لیکن اطراف حضرموت کے اماکن مین سے ایک مقام کا بھی ذکر اس مین نہین ہے، یہ تحریر یقینی طور پر یمن کے باشندون اور ان کے حلفاء اور اقربا مین سے کسی ایک کی ہے، اس مین جن قومون کے نام ہین، وہ یہ ہین،

حمیر حمیر ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے، کتبہ کے ایام تحریر مین اسی قبیلہ کی حکومت تھی، کتبہ اس قوم کے مخالفین کا ہے،

قہات بنو اسرائیل کے ایک سبط کا نام لاوی ہے، اس سبط کی ایک شاخ کا نام قہات ہے، حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اسی خاندان کے افراد تھے، اس کتبہ مین قہات کا ذکر سینا کے باشندون، یسار کے معاونون اور باشندگان یمن کے دشمنون کی حیثیت سے آیا ہے،

نہرہ بنو قضاعہ کی ایک شاخ کا نام جو یمن مین رہتی تھی، اس قوم کو اس کتبہ کے اندر مذکور جنگ کے انجام سے بہت خوشی ہوئی تھی، خاکہ کی تشریح سے ظاہر ہے کہ وہان کے باشندے بنو عذرہ تھے، یہ نہرہ کی طرح بنو قضاعہ کی ایک شاخ ہین، نہرہ کو جنگ کے انجام کی جو خوشی ہوئی تھی، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ بنو عذرہ کے ہم خاندان تھے،

زند نوذ زند نوذ دو نامون کا مجموعہ ہے، نوذ سے مراد وہی ارض نود ہے جس کا ذکر فرزندانِ آدم کے تذکرے

تفصہ مین آیا ہے اور تورات کے مطابق بنو قین کا علاقہ ہے ارض نود کے مقام کی تعیین طویل بحث کی مقتضی ہے لیکن مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مدین کا علاقہ دراصل علاقہ بنو قین تھا، یہود مدینہ مین سے ایک گروہ بنو قینقاع تھا، یہ نام قاعہ قین کا مقلوب ہے، اس لئے نوذ کو یمن اور شام اور حاکہ کے علاقہ سے تطبیق دینا بے جا نہ ہوگا،

زند نوذ اسی علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کا نام ہے، عدنان کے نسب نامہ مین ایک نام زند بن عری ابن اعراق الثری کا نام آتا ہے (تاج العروس) زند نود سے مراد اطراف یمن مین بسنے والے بنو عدنان ہین جن کو اس کتبہ کے اندر مذکورہ جنگ کے انجام سے خوشی ہوئی،

کرذا | کرذ کو کرد سمجھنا چاہئے، اس کتبہ کے بیان کے مطابق یمن والون نے شاہی نوکر یسل کی ناک اور اس کے کان کاٹ لئے جس کے انتقام کے لئے سینا سے یسار اور مین سے ذو یالیل فوج لے کر بڑھے لیکن ان دونون فوجون نے شکست کھائی، تب شاہ یمن نے اہل حبش کو خوش کیا اور حبش والون نے شاہ یمن کی نوکری کر لی لیکن کرذ نے جن کے سردار کا نام تنوذ تھا، نیز بنو واشح نے جنگ کی، اور اہل حبش کی امداد سے ذو نوش اور ذو شرح کو کوئی فائدہ نہین پہنچا، حکومت یمن پر تنوذ نے قبضہ کر لیا،

کرد ایک عجمی قوم کا نام ہے جن کے کچھ افراد یمن مین بستے تھے، ان ہی کردون کی بابت نشوان نے لکھا ہے، کہ

یقال انّھم من الازد، قال	کہتے ہین کہ وہ بنو ازد مین سے ہین شاعر
لعمرك ما کرد من ابناء فارس	نے کہا قسم ہے کرد فارس کے بیٹے نہین
ولکنّہ کرد بن عمرو بن عامر	بلکہ عمرو بن عامر کی اولاد ہین نیز کہا شاعر نے:
وقال	
لعمرك ما کرد بن عمرو بن عامر	قسم ہے عمرو بن عامر کا بیٹا کرد عجمی نہین تھا،
بعجم ولکن خالط العجم فاعتجم	البتہ اہل عجم کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے عجمی ہو گیا تھا،

نسبتهم الشعراء الی الیمن ثم الی الازد، — شعراء ان کو یمن پھر ازد کی طرف منسوب کرتے ہین،

یمنی کرد تھے تو پھر غیر عرب مگر بنو ازد مین شمار ہوتے تھے، بجیل ہونے کی حیثیت سے یہ انصار مدینہ کو نیز بنو خزاعہ کو جن کی ایک شاخ یمن مین بستی تھی، اپنا ہم نسب بتاتے ہونگے،

داشح | بنو داشح بن الحرث، یہ بنو ازد کی ایک شاخ تھے،

رجال کتبہ | اماکن واقوام کے بعد ایک نظر رجال کتبہ پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد کتبہ کا مضمون آئینہ ہو جائے گا،

سمیق | پہلا نام اس کتبہ مین سمیق کا ہے، اس کی بابت ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ سموق درخت اور نبات کے طویل ہونے کو کہتے ہین، سمیق کا مفہوم طویل ہے، یہ شخص کون تھا اس کا عہد کیا تھا، اس کے متعلق ہم کچھ نہین کہہ سکتے،

ذو نین | حصن غراب کے سہ سطری مختصر کتبہ کے نیچے اس شخص کا سماتی دستخط موجود ہے، معارف میں ہم بتا چکے ہین کہ یہ شخص ذو شرح کا چچا تھا، ذو کے معنی ہین صاحب اور نن ایک مصری لفظ ہے جس کا مطلب پانی دینا ہے لفظی مفہوم اس لقب کا ہے "رئیس محکمۂ آب رسانی" اس لقب کے اور معانی بھی ہو سکتے ہین مثلاً ذو نون (مچھلی والا) ذو نون (صاحب السیف) ذو نون (صاحب الدواۃ) لیکن کتبہ کے اندر چونکہ زراعت کے مرجھانے کی ذمہ داری سمیق، ذو نین اور ذو شرح کی تباہ کاری پر عائد کی گئی ہے اس لئے اس لقب کا مناسب تر مفہوم رئیس محکمۂ آب رسانی ہی ہو سکتا ہے،

شرح ذو | یہ نام کتبہ مین دوبار آیا ہے، یہی عربی روایات کا ذو شرح ہے سیف بن ذو یزن سے امیہ بن ابی الصلت نے غمدان کی بابت کہا،

تهیر ثباه ابوک القیل ذو شرح

اس مصرع میں ذو شرح کو "قیل" کہا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ میں نہیں تھا البتہ کسی تبع کے ماتحت امیروں میں سے ایک امیر تھا، عربی میں ذو شرح مشہور ہے، اس کتبہ میں ذو کا لفظ شرح سے موخر ہے تاج العروس میں ہو کہ

قال ابو عمرو الشارح الحافظ وھو	ابو عمرو نے کہا شارح حافظ کو کہتے ہیں، اہل
فی کلام اھل الیمن حافظ الزرع	یمن کی بولی میں شارح وہ ہے جو کھیتوں
من الطیور،	سے چڑیوں کو اڑاتا ہے،

شرح کے معنی ہیں اس نے زراعت کی رکھوالی کی "ذو شرح کے معنی ہیں، محکمہ زراعت کا رئیس اعلیٰ" اس لقب کے بہتیرے افراد گذرے ہوں گے، عربی روایات کے مطابق یہ ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا کا یا اس کے دادا کا لقب تھا، اس کتبہ کا سنہ تحریر پچھلے مضمون میں ۳۳۰ئہ بتایا جا چکا ہے، یہ سنہ ہم کو بتاتا ہے کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہمعصر ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا سے اس ذو شرح کو تعلق دینا بیجا ہے،

یسل | اس کتبہ کی اہم ترین شخصیت کا نام ہے، تاج العروس میں ہے،

الیسل اھملہ الجوھری وصاحب	جوہری صاحب صحاح اور صاحب لسان
اللسان وقال الزبیر بن بکار ھو	نے یسل کا ذکر نہیں کیا، مگر زبیر بن بکار
ید من قریش الظواھر قال و	کا کہنا ہے کہ یسل اور یسل قریش ظواہر کے
بالباء الموحدۃ الید الاخری	دو بازو تھے، بنو عامر بن لوی کو بسل (بے)
اعنی بنی عامر بن لوی ھکذا	کہا جاتا تھا، اس کی خبر مجھے (زبیر کو)
حدثنی محمد بن الحسن کما فی العباب	محمد بن حسن نے دی جیسا کہ العباب میں ہے
وقد تقدم ذکر البسل فی موضعہ،	(بقیہ)

البسل لقب بنی عامر بن لوئی	بسل بنو عامر بن لوی کا لقب ہے، ان کا یہی
هکذا ایدعوت وکانوایدّ ین	دعوی ہے وہ دو بازو تھے، دوسرے بازو
والیدالاخری الیسل بالمثناة	کو یسل (می سے) کہتے تھے، زبیر بن بکار نے
تحت قاله الزبیر بن بکار عن	محمد بن الحسن سے اس کی روایت کی، العباب
محمد بن الحسن هکذا ذکرفی العباب	مین یونہی وارد ہے، حافظ نے تبصیر مین یہ قول
ونقله الحافظ فی التبصیر ولکنه	نقل کرتے ہوئے بات الٹ دی ہے یعنی
عکس القضیة، (ب س ل) نقال	کو بنو عامر اور ان کے غیر کو بسل بنادیا،
الیسل بالتحتیة بنو عامر بن لوی	
والبا قون بموحدة، (ی س ل)	

اس سے معلوم ہوا کہ بنو عامر بن لوی یا اُن کے ہم جد کسی خاندان قریش اور اس کے مورث کو یسل کہا جاتا تھا، اس کتبہ مین اسی قرشی کا ذکر ہے، جو یسل کہلاتا تھا،

یسار اس کتبہ مین یسل پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اُس نے یمن کے مقام مین ایک یا کباز بھولی بھالی لڑکی کی آبرو لینی چاہی جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ یمن کی عورتون نے اس کی ناک اور کان کاٹ لئے اور اس پر برہم ہو کر یمن کی سمت سے ذویالیل نے ادھین اور سینا سے ایک شخص یسر نامی یمنی والون پر چڑھائی کر یسر کے نام مین جو مالگا ہوا ہے اس کی حقیقت براقد ما کے تذکرہ (معارف مئی ۱۹۵۰ء) مین بتائی جا چکی ہے، اصلی نام یسر رہ گیا ہے یا سر اور یسار کا مخفف قرار دیا جا سکتا ہے ہم نے اسے یاسر کے بجائے یسار سے تطبیق دی جس کی وجہ یہ ہو کہ جن لوگون نے یسل کی توہین کا انتقام لینے والون سے جنگ کی، ان مین بنو مرہ اور باشندگان حائل بھی تھے جو کہ بنو قضاعہ مین سے تھے، بنو قضاعہ کا ایک گروہ اپنے کو قریش کا ہم خاندان یعنی بنو عدنان مین خیال کرتا تھا، ایک گروہ قضاعہ کو بنو حمیر مین گنتا تھا تو دو کو حمیری بتانے والے بنو قضاعہ

پر ایک دوسرا قضاعی شاعر اعتراض کرتا ہے،

اذنیتم عجوز کم وصانت قد یتما لا یثمر لہا خمار

کیا اپنی مورثہ کو بدکار بتاتے ہو جس کی اوڑھنی سو نگھی نہین جاتی تھی،

عجوز لو دنا منہا یمان للاقی مثل مالاقی یسار

ایسی بڑھیا کہ اگر کوئی یمنی اس کے پاس جاتا تو اس کا انجام یسار کا سا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتبہ جو الزام یسل پر لگاتا ہے اور اس کا جو مآل بتاتا ہے تقریباً وہی الزام روایت یسل کی بجائے اس کے معین دمہ دگار یسرما پر لگا کر اس کا وہی انجام بتاتی تھی جو کتبہ مین مذکور ہے،

ذو یالیل | جوہری نے لکھا ہے کہ یالیل ایک شخص کا نام ہے سید مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کہتے ہین کہ یہ غلط ہے یالیل ایک بت کا نام تھا، جیسا کہ عبد یالیل کے نام سے ظاہر ہے، ذو یالیل ایک مذہبی لقب معلوم ہوتا ہے یالیل نام کے دیوتا کے مندر کا محافظ ذو یالیل تھا،

یمن والون پر یسل کی توہین کا بدلا لینے کے لئے دو شخصون نے چڑھائی کی، ایک نے جنوب سے ایک نے شمال سے، جنوبی حملہ آور ذو یالیل کا نام بتاتا ہے کہ یہ ایک بت پرست رئیس تھا، شمال کی فوج کا رئیس علی یسرما تھا، اور اسکی فوج مین قہات یعنی یہود کا مذہبی گروہ شامل تھا، گویا یمن والون کے برخلاف موحدین اور مشرکین کے دو گروہ متحد ہو گئے، خود یمن والون کا مذہب ان دنون کیا تھا، اس کا اس کتبہ سے پتہ نہین چلتا،

ریاح | ذو یالیل کے بعد ایک نام ریحا ملتا ہے حمیرا اور یسرما کے نامون کی طرح ا کے حذف کے بعد یہ نام ریح رہ جاتا ہے جو عربی کے متداول لہجہ مین بنو ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ ابن تمیم کے مورث یا اس کے ہم نام کسی شخص کا علم ہو، ایک یربوعی شاعر کہتا ہے

ولکن لی علیاء تدیو مجد وعالی مفخر صعب السلوک

بیریوع وثعلب بنی بنیه لهم کانت ردافات الملوک

یعنی یریوع اور اس کے فرزندون کی بدولت جن کو روافت ملوک کا شرف حاصل تھا مجھے تجھ پر بزرگی حاصل ہو۔ اس کتبہ مین ثمو یریوع ہی جیسی عظمت رکھنے والے ایک ریاح کا ذکر ہے،

الردف جلیس الملک عن یمینه	ردف بادشاہ کے ہمنشین راست کو کہتے
اذا شرب یشرب بعده قبل	تھے، بادشاہ جب شراب پیتا تو بادشا
الناس ویخلفه علی الناس اذا	کے بعد اور سب سے پہلے ردف پیتا، اور
غزا ویقعد موضع الملک حتی	بادشاہ جب غزوہ پر جاتا تو وہ اس
ینصرف واذا عادت کتیبة الملک	کی جگہ قائم مقامی کرتا یہان تک کہ بادشا
اخذ الردف المرباع،	واپس آجاتا تھا، بادشاہ کی فوج جب واپس
	آجاتی تو ردف چوتھ وصول کرتا تھا،

ردف کا جو کام تھا وہی اس کتبہ مین ریاح کا نظر آتا ہے جس کا لقب ہے ذویقتہ، یہ لفظ دو لفظون سے مرکب ہے، (۱) ذو بمعنی وہ شخص (۲) یقتہ بمعنی یقتوا الملوک یعنی بادشاہون کی خدمت کرتا ہے،

اس کتبہ کے اندر مذکور ریاح کو کتبہ نویس کی قوم نے اس وقت نہایت ذلیل کرکے اپنے علاقہ سے نکال دیا، جب کہ حاکہ، شاس اور یمین مین یسار اور ذو یالیل کی فوجون نے شکست کھائی اور ریاح کے اس انجام کو دیکھ کر قوم مہرہ اور زندفود کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی،

ذوقوش سمبق، ذونین، ذوشرح، ذویالیل، یسار اور تسیل مین سے کوئی بھی یمن کا بادشاہ نظر نہین آتا، یہ سب کے سب بادشاہ کے ماتحت امراء نظر آتے ہین، کتبہ کے بیان کے مطابق جب یمن کے باشندون اور اُن کے معاونون نے بغاوت کر دی تھی اس وقت ایک ذویقتہ جس کا نام ریاح تھا حضرموت مین بادشا وقت کی نیابت یا بالفاظ قدیم ردافت کے فرائض انجام دے رہا تھا، یمن یعنی مدینہ منورہ کے پاس جب

شاہی فوجون نے شکست کھائی، توحضرموت والون نے بھی شاہ وقت کے ردیف یا قدیم ترلفظون مین ذوبیقتہ ریاح کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، ذوبیقتہ ریاح جس بادشاہ کا ردیف تھا غالباً اسی کا ذکر ذونوش کے لقب سے آیا ہے یعنی ذونوش ذوشرح وغیرہ کا بھی بادشاہ ہوگا، جہان تک میرے علم کی رسائی ہے ذونوش لقب رکھنے والے کسی شاہ مین کا عربی لٹریچر مین ذکر نہین ملتا، البتہ بلقیس بنت ہداد بن (ذو) شرح بن شرحبیل بن ذوسحر کے خاندان مین ایک بادشاہ ذوبوس بن ذوسحر کا نشوان نے ذکر کیا ہے، مگراس کا زمانہ اس کتبہ کے زمانہ سے بہت پیشتر گذرا ہے لیکن ہوسکتا ہے ذوبوس دراصل ذونوش ہی کی تصحیف ہو، اوراس کتبہ مین ذوبوس اول کے کسی جانشین کا ذکر ہو، بہرحال ریاح جس کا ذکراس کتبہ مین ہے، ذونوش ہی کا ذوبیقتہ یعنی ردف اورقائم مقام نظرآتا ہو، ذونوش نے جب دیکھا کہ صبن کا راج جاتا رہا، یمن والون کی بغاوت نے حجاز کو بھی آزاد کرادیا، حضرموت والون نے ریاح کو لات مارکر اپنے علاقہ سے نکال دیا، تو

ذونوش رضا حبشتا شدسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا اور وہ نادم ہوگیا

تنوذ | آخری نام اس کتبہ مین ایک شخص تنوذ کا ہے جواس قوم کرد کا ایک فرد تھا، جوازد کے خاندان بنوعمرو بن عامر مین دخیل ہوگئے تھے، اس سے زیادہ اس شخص کا حال معلوم نہین، اس کتبہ کے مطابق ذونوش نے حبشیون کی امداد حاصل کی تیسر بھی بغاوت فرو نہین ہوئی، بلکہ کرد اور بنوشارح نے مقابلہ کیا، جس مین کردون اور بنوشارح کو فتح حاصل ہوئی،

مضمون کتبہ | اماکن، اقوام، اور رجال سب کو پہچان لینے کے بعد اب ایک بار پھر کتبہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۳۳۰ء کے ایام مین جب کہ شاہ مین حضرموت سے لے کر صبن یعنی سرحد مصر تک حکومت کرتا تھا، بادشاہ وقت کہین غائب تھا، اسکی جگہ ریاح اس کے فرائض انجام دیتا تھا، یمنی، ذونین، اور

ذوشرح کی بدانتظامی کی بدولت زراعت مرجھا گئی تھی، ان دنون یسل نام ایک امیر جو کنغرشی طواہر کی ایک شاخ کا مورث تھا، اکال وصول کرنیکے لئے مدینہ کے پاس یمین نام ایک وادی مین پہنچا یہان اُس نے ایک عورت کی آبروریزی کرنی چاہی، عورتون نے اُس کی ناک اور کان کاٹ لئے، اس پر برہم ہو کر سینا سے یمنیون کی ایک فوج لیکر یسار نے اور ین کی طرف سے ذو یالیل نے یمین والون پر حملہ کر دیا لیکن باغیون کو کامیابی ہوئی صین کے علاقہ اور حجاز سے اہل یمن کی حکومت اٹھ گئی حضرموت والون نے بھی ریاح کو اپنے دیار سے نکال دیا، ذونوش نسجوان دنون شاہ یمن تھا، اہل حبش کو راضی کرکے ان کو نوکر رکھا تا کہ کھوئی ہوئی حکومت حاصل ہو، مگر نبو واشح، نبو فہرہ، اور کردون نے اُن کا مقابلہ کیا، اور یہ کامیاب رہے، اور تو ذکر ذحا کم یمن ہوا،

نقوش زیرین اس کتبہ کے نیچے دائین طرف دو نقوش ہین، ان کے نیچے دو اور نقوش ہین، جن کے بالمقابل بائین طرف چھ نقوش ہین، ان پر بھی غور کر لینا ضروری ہے نقوش کی کشش اور گہرائی شاہد ہے کہ نقوش زیرین دو مختلف شخصون نے کندہ کئے، جو دہ سطری نقوش کے کندہ کار نہین تھے،

فارسٹر کی ادعا فارسٹر کے نزدیک دائین طرف کے نقوش لایعنی ہین، بائین طرف کے چھ نقوش کو طغرا قرار دے کر انھین گیارہ نقوش مین تحلیل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے،

[illegible]

ہ ء س ا ہ ا ی س ب س

تشریح کتبہ کے عمل (ج ۲ ص ۳۰۱) پر ان نقوش مین سے کسی کی آواز نہین بتائی ہے، لیکن ج ۲ صنہ و صنہ سے ہم نے دس نقوش کی آوازین نقل کی ہین، ۲ کی آواز نہین معلوم پادری صاحب کے ذہن مین کیا تھی، اس نقش کو ج ۲ ص ۱۰۳ کے حاشیہ پر حبشی نقش بتایا ہے، اور اس سے اس تحریر کے زمانہ پر استدلال

کیا ہے کہ اسل کتبہ سے وصہ بعد کی ہے خود اپنی تبائی ہوئی آوازون کے مطابق انھین پڑھنا چاہئے تھا،

صر ہ ساہ ای سبس

لیکن ان نقوش کو انھون نے پڑھا ہے،

Harelh or Hare Ikah The Sabean

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بو العجبی است

صحیح قرات | ہمدانی نے اکلیل مین سین کی ایک صورت ایسی بتائی ہے داہنی طرف کے نقش اول اور

بائین طرف کا نقش دوم اسی کی بدلی ہوئی صورتین ہین، داہنی طرف کا نقش دوم، اور بائین طرف کا نقش

چہارم نشوانی عا ہ کی بدلی ہوئی صورت ہے، داہنی طرف کے نقش سوم اور بائین طرف کے نقش پنجم کو فارسی

کے علاوہ سب علمائے مندرنے کاف خیال کیا ہے،

داہنی طرف کے چوتھے اور بائین طرف کے چھٹے نقش کو پادری صاحب نے ۳ اور ۴ مین تحلیل کیا ہے

درحقیقت یہ نقش ایک تپائی پر رکھے ہوئے تین چراغون کے فتیلہ سوز کی صورت ہے، جو روشنی کا

مفہوم اور شین کی آواز دیتا ہے، بائین طرف کے پہلے اور تیسرے نقش کو ایک بار پادری صاحب نے X کی صورت

مین اور دوسری بار X کی صورت مین حل کیا ہے، دراصل X ایک، عا ذ در نقش زاید کے اضافہ کیا تھا X ہے جس

کی آواز زائے ہوز کی سی ہے، میرے نزدیک تحریر کی صحیح قرات حسب ذیل ہے،

سَطَ کُشْ

زُشُ ذَطُ لَوَش

سوط کے معنی ہین کوڑا، اس سے سواط مشتق ہے، صاحب لسان نے لکھا ہے کہ حدیث مین ہے کہ

جہنم میں سب سے پہلے سواط داخل ہون گے سواط سے مراد وہ سرہنگ ہین جو لوگون کو کوڑے مارتے ہین"،

کوش ایک قوم کا نام ہے جس کا ذکر بائبل مین کثرت سے آیا ہے، انگریزی بائبل مین اس نام کو عموماً

ایتھوپیا (حبش) سے بدل دیا گیا ہے، کیونکہ جن دنون یونانی مین بائبل کا ترجمہ ہوا، صرف اہل حبش خود کو کوش کہتے تھے، اس تحریر مین کوش کو اہل حبش کا مرادف سمجھنا چاہئے،

پچھلے مضمون مین بتایا گیا ہے کہ یہ تحریر ۳۳۰ئ کی ہے، ۳۲۵ئ سے ۳۷۰ئ تک یمن اور حضرموت پر اہل حبش نے حکومت کی، اہل حبش کو ذو نوش نے اپنی امداد کے لئے نوکر رکھا تھا، مگر بعد مین وہ خود حاکم بن بیٹھے، ۳۳۰ئ اور ۳۷۵ئ کے درمیان کسی نے وہ سطری کتبہ کے اس مصرعہ کی بنا پر کہ

ذو نوش رضا حبشا شسی

ذو نوش نے اہل حبش کو راضی کیا انھون نے نوکری کر لی۔

دائین طرف کا دو لفظی فقرہ لکھ کر بتایا کہ

کوش نے باغیون کو ہتھوڑے مارے،

نوش عربی مین ذلیل غلام کا مرادف تھا، زیاٹا کے معنی ہین شور مچانا جھگڑا کرنا، بائین طرف کے تین لفظ دو سطری کتبہ لکھنے والی قوم کے کسی فرد نے اہل حبش کی توہین کے لئے بعد مین کندہ کئے اس کا

مطلب یہ ہے،

کوش ایک جھگڑالو ذلیل غلام ہے

ایک قدیم کتبہ | اس کتبہ کی تشریح پر اب مزید لکھنے کی ضرورت نہین رہی لیکن اس سے ایک قدیم روایتی کتبہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا بھی اسی جگہ ذکر کر دیا جائے،

تیجان اور اکلیل مین ہے کہ منبر ہود علیہ السلام کے پاس سے عمرو و والاذ عار کے زمانہ مین ایک لوح برآمد ہوئی تھی جس پر منقوش تھا،

لمن ملک ذمار؟	ملک ذمار کس کا
لحمیر الاخیار	نیک نفس حمیر کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

للحبشۃ الاشرار — شریر الطبع اہل حبش کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

للفارس الاحرار — شریف طینت اہل فارس کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

لقریش التجار — تجارت پیشہ قریش کا

تیجان اور اکلیل کی روایتین یہین ختم ہو جاتی ہین، یاقوت نے معجم البلدان ذکر ذمار مین اس تحریر کی بابت لکھا ہے کہ جس سال قریش نے کعبہ کی عمارت کو (سنہ ۶۰۶ء مین) ڈھایا، اس کی بنیاد سے ایک پتھر نکلا جس پر یہی عبارت منقوش تھی آخر مین یہ بھی تھا کہ

ثم حاد محار — پھر اپنی جگہ لوٹ گیا،

ظفار کے تذکرہ مین اسی کو ذکر قریش کے حذف اور ذمار کی بجائے ظفار کی بابت نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ عبارت ظفار کی ایک دیوار پر لکھی تھی، اور (ثم حاد محار) کی بجائے یہ منقوش تھا کہ

لحمیر ستحار — عنقریب حمیر کے پاس لوٹے گا،

یہ تینون روایتین کچھ نہ کچھ اصلیت رکھتی ہین، ظفار کا کتبہ خانہ کعبہ والے پتھر سے قدیم تھا، جیسا کہ (ستحار) اور (ثم حار) کے فرق سے ظاہر ہے، مبتر ہود والے کتبہ کی روایت مین صرف اتنی بات درست ہے کہ اس تحریر کا تعلق عمرو ذوالاذعار کے زمانہ سے ہے، جو کہ ابرہہ ذوالمنار کی نسل سے اور بلقیس بنت ہدہاد کا حریف تھا، جو کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہم عصر تھی، عمرو ذوالاذعار غالبًا انہی حبشیون سے متعلق جن کی خدمات ذو نواس نے بغاوتین فرو کرنے کے لئے حاصل کی تھین،

اس قدیم کتبہ سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ مین ملک ذمار پر قبضہ کرنے کی جد و جہد چار قومین کر رہی تھین

(۱) حمیر اخیار یعنی خود یمن کا قدیم شاہی گھرانا،

(۲) حبشہ اشرار جن کی بابت زیر بحث کتبہ مین ہے کہ ذو نوش نے حبش والون کو راضی کیا، اور وہ خادم ہوگئے، اور نقوش زیرین کے کندہ کار نے جن کا ذکر کوشش کے نام سے کیا ہے، اور ان کو ذلیل چھکرا لو غلام بتایا ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق اہل حبش نے ۳۴۵ء اور ۵۲۵ء میں یمن پر حکومت کی قدیم کتبہ کی روایت مین پہلی بار کے قبضہ اہل حبش کا ذکر ہونا چاہئے، کیونکہ سنہ ۶۰۰ء مین جو کتبہ خانہ کعبہ کے پاس ملا تھا، اس مین مذکور تھا کہ ملک ذمار اپنی جگہ لوٹ گیا، یعنی حمیر نے اس پر حکومت قائم کرلی، ملک ذمار ملک یمن ہی کا ایک نام ہے،

(۳) فارس احرار زیر بحث کتبہ کی تشریح سے پہلے تک کے معلومات کے مطابق فارس والون نے یمن پر ۵۷۲ء یا ۶۰۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک حکومت کی تھی، اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ قدیم کتبہ مین فارس احرار کے ذکر سے یہی دور مراد ہے، جب کہ یمن مرزبان بہروز (وہرز) کے ورثا حکومت کرتے تھے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ ۶۰۰ء مین خانۂ کعبہ مین جو کتبہ ملا تھا، اس کے مطابق تو اس زمانہ سے پہلے حمیر، حبشہ، فارس اور قریش کی چوکھی ٹکر ختم ہو کر حکومت ذمار اپنے اصلی محور پر لوٹ گئی تھی، اور حمیری حکومت قائم ہوگئی تھی، زیر بحث کتبہ مین تنو ذکر دکے تذکرہ نے مل کر دشواری حل کردی، اسی زمانہ (۳۳۰ء تا ۳۴۵ء) مین حمیر اخیار، حبشہ اشرار اور فارس احرار تینوں گروہ حکومت یمن کے حصول کی کوشش کرتے تھے،

(باقی)

رحمت عالم

مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولفہ جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت للعہ پتہ:- انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی،

نئے اور ترقی پسند ادب کی موافقت اور مخالفت مین بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب تک کسی صاحب نظر ادیب نے اس کا تفصیلی جائزہ نہین لیا، اور غیر جانبدارانہ محاکمہ نہین کیا تھا، اس کام کو اردو کے نامور ادیب پنڈت کشن پرشاد کول نے انجام دیا ہے، اور اس کتاب مین انھون نے نئے ادب کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ کرکے اس کے محاسن و معائب ظاہر کئے ہین، ابتدا مین ترقی پسند ادب کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس کے خیالات و نظریون پر تبصرہ ہے، پھر اس کے افسانون پر اجمالی، اس کے بعد مشہور ترقی پسند افسانہ نگارون کے افسانون اور ناولون پر تفصیلی تنقید کرکے ان کی خوبیان اور نقائص دکھائے ہین، اور آخر مین مشہور ترقی پسند شعراء کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے، اردو مین اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع اور بہتر کتاب نہین لکھی گئی ہے، لائق مصنف نے بڑے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ ترقی پسند ادب کے محاسن و معائب دونون دکھائے ہین جس سے اس کا ہر رخ، سارے خط و خال اور عیب و ہنر سامنے آجاتے ہین، پوری کتاب مصنف کے بلند ادبی ذوق، نکتہ سنجی، دقت نظر اور صحیح تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار اور تنقیدی و ادبی حیثیت سے اصحاب ذوق خصوصاً ترقی پسند ادیبون کے مطالعہ

کے لائق ہے،

درحقیقت ترقی پسند ادب کے بارہ مین اس کے حامی اور مخالف دونون تنگ نظری اور افراط و تفریط مین مبتلا ہین، سویٹ زدہ ترقی پسندون کے نزدیک محض اشتراکی خیالات اور روسی ادب کی نقالی ترقی پسندی کی معراج ہے، انھون نے محض بھوک، پیٹ، روٹی، کسان، مزدور، غریب، سرمایہ دار، انقلاب، آگ اور خون کے الفاظ اور فرائیڈ کے جنسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت، فحاشی، و عریان نگاری اور شعر و ادب مین بے لگام آزادی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، اس کے علاوہ ہر ادب اُن کے نزدیک غیر صحت مند، اور مجموعۂ خرافات ہے، اُن کے مقابلہ مین پرانے ادب کے پرستارون کا طبقہ جو اب بہت کم باقی رہ گیا ہے، پرانے ڈھرے سے ذرا بھی الگ ہونا یا نگاہ و ادب مین سوء ادب سمجھتا ہے، یہ دونون نقطۂ نظر غلط ہین،

ترقی پسندی اور نیا ادب اگرچہ اصطلاحین نئی ہین، لیکن نیا ادب اس زمانہ کی پیداوار نہین ہے، بلکہ ہر زمانہ کے حالات اور ذوق و رجحان کے تغیر کا فطری نتیجہ ہے جس سے کسی زبان و ادب کی بھی تاریخ خالی نہین ہے، اگر اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو فضلی کی دہ مجلس، میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل، اور میر امن کے قصہ چہار درویش سے لیکر موجودہ ترقی پسند ادب تک، ہر زمانہ مین ترقی پسندی اور نئے ادب کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، اس کے ابتدائی دور مین ادب محض مقفی و مسجع عبارت آرائی اور خیالی افسانہ طرازی تک محدود تھا، اس کے بعد جب ترقی کا قدم آگے بڑھا تو افسانہ طرازی باقی رہی لیکن عبارت مین سلاست و سادگی آنے لگی، جس کا نمونہ چہار درویش ہے، اور کم و بیش ۵۷ء کے انقلاب تک یہ طرز قائم رہا، اس کے بعد جب حکومت کے ساتھ پرانی تہذیب کی بساط الٹی اور جدید تعلیم و تہذیب سے مذاق و خیالات مین تغیر پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ادب بھی بدلنا شروع ہوا، اور خیالی افسانہ طرازی کی جگہ حقیقت پسندی، ذہنی تفریحی ادب کے بجائے مفید سنجیدہ علمی و اصلاحی لٹریچر اور عبارت آرائی کے بجائے سادگی شروع ہوگئی، اور ادب سے محض ذہنی تفریح کے بجائے زندگی کے تقاضون کی تکمیل کا کام لیا جانے لگا، سر سید، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور مولوی

چراغ علی وغیرہ کی تصانیف اس کا ثبوت ہیں، بلکہ خالص ادب یا افسانوں میں بھی واقعیت و مقصدیت پیدا ہو گئی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی راشد الخیری کے اصلاحی افسانے اُس کے شاہد ہیں، اور ترقی پسندی کی یہ رفتار برابر قائم رہی، اور حالات و ضروریات کے مطابق اردو ادب کا رنگ بدلتا اور ہر قسم کا لٹریچر پیدا ہوتا گیا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بعد سے اس وقت تک اردو میں اچھا خاصہ سیاسی لٹریچر بھی پیدا ہو گیا ہے،

اسی قسم کے تغیرات نظم میں بھی ہوئے، غدر کے بعد ہی سے اردو شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا، سب سے پہلے غالب نے نیا راگ چھیڑا، اور خیالات اور طرز ادا دونوں میں وسعت و تغیر پیدا کیا، اُن کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، انھوں نے اردو شاعری کو اُس کے قدیم تنگ کوچہ سے نکال کر نئے خیالات و تصورات سے آشنا کیا، مولانا حالی نے اس سے پسماندہ کاروان ملت کے لئے حدی کا کام لیا جس کا نمونہ مسدس حالی اور اُن کی دوسری نظمیں ہیں، اور پرانی شاعری کی عام اصلاح کے لئے مقدمہ شعر و شاعری لکھا، اُن کے بعد اکبر الٰہ آبادی نے شاعری کے مقاصد میں اور زیادہ وسعت پیدا کی، اور اس سے گوناگون اصلاحی و تنقیدی کام لئے، اور اقبال نے اس کو محشرستان حیات کا صور اور جہاد زندگی کی تکبیر بنا دیا، قوموں کے عروج و زوال ترقی و تنزل اور موت و حیات کا وہ کون سا اصول و فلسفہ ہے جو اس میں نہیں ہے اور بعد کے سارے واقعی ترقی پسند شعراء درحقیقت اُنہی کے خوشہ چیں ہیں، غرض غدر کے بعد اردو نظم و نثر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے اس میں ترقی پذیری، حقیقت پسندی اور مقصدیت نظر آئے گی، اسلئے یہ سمجھنا کہ ترقی پسندی موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء اور ادیبوں کا کارنامہ ہے سراسر غلط ہے، البتہ زمانہ کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ترقی پسندی کا رُخ بدلتا رہتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں سیاسی و معاشی و سماجی مسائل کے متعلق بھی اردو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، ترقی پسندی کو محض اشتراکی ادب کی نقالی پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک میں محدود کر دینا درحقیقت ترقی پسندی نہیں بلکہ تنزل ہے، اس کے علاوہ

بھی زندگی کے بہت سے مسائل ہین، جو اُن سے کم اہم نہین،

پرانے ادب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی سے دور ہے اسمین ان کی زندگی کی عکاسی اور اُن کے مذاق کی چیزین نہین ہین، اور وہ محض ذہنی و دماغی تفریح کا ذریعہ ہے، اس مین زندگی کے مشکلات و مسائل کا حل نہین ہے، ان اعتراضات کے جوابات کے لئے ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ پرانا ادب عوام کی زندگی سے دور ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ مین عوام کی اتنی اہمیت ہی نہین تھی، اور نہ عوامی مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کا بڑا حصہ تعلیم سے بیگانہ تھا، اور وہ زیادہ تر خواص تک محدود تھی، اس لئے پرانا ادب خواص کے طبقہ مین محدود رہا۔ اور انھی کے اثرات بھی اس مین آئے لیکن اس سے مراد اردو ادب ہے، اردو زبان نہین،

لیکن اس کے باوجود کہ اردو ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس مین ان کے ذوق اور اُن کی ذہنی تفریح کا پورا سامان موجود تھا خصوصاً شہری عوام کے لطف و تفریح کا بڑا ذخیرہ ہے، قصہ چہار درویش، آرایش محفل، الف لیلہ، قصہ لیلیٰ مجنون، نل دمن، گل بکاولی، نورتن، سنگھاسن بتیسی، بتیال پچیسی، قصہ مادھونل، اور اندرسبھا امانت وغیرہ بیسیون کتابین موجود تھین جن سے عوام ایسی ہی لطف و تفریح حاصل کرتے تھے جیسی موجودہ زمانہ کا ایک تعلیم یافتہ شخص اچھے سے اچھے ناول کے مطالعہ سے حاصل کرتا ہے، فرصت کے اوقات مین چند ہم سن و ہم مذاق ایک جگہ جمع ہو جاتے، حقہ کا دور چلتا، ایک خواندہ شخص ان مین سے کوئی کتاب پڑھتا، اور تمام سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے، آج بھی لکھنؤ کے زردوزون، سادہ کارون اور دوسرے اہل حرفہ مین اس قسم کے ادبی اجتماع عام ہین، بلکہ ان مجلسون مین فسانۂ آزاد اور داستان امیر حمزہ تک کا دور چلتا ہے شہرون کے علاوہ بڑے قصبات تک مین اس قسم کے تفریحی اجتماع ہوتے ہین،

البتہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ کسانون کی تفریح کا سامان اردو ادب مین موجود نہین ہے، یہ طبقہ اردو کی ادبی زبان ہی نہین سمجھ سکتا تھا تو اس کے لئے لٹریچر کہان سے پیدا ہوتا، لیکن اُن کے ذوق و دلچسپی اور لطف و تفریح

کے لئے برج بھاشا میں بہت سی کتابیں قصے اور کہانیاں موجود تھیں اور جن کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں ان میں نورتن سنگاسن بتیسی، بتیال پچیسی، قصہ نل دمن وغیرہ اور دوسری بہت سی کتابیں برج بھاشا میں بھی ہیں ان کے علاوہ ہفت جواہر، اسلام کمنڈ، آلھا اودل کا قصہ، بارہ ماسے اور بہت سی داستانیں اور حکایات موجود ہیں، جو آج بھی دیہاتوں میں بڑے ذوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی ہیں،

ان کے مقابلہ میں آج بھی دیہاتی عوام عوامی نئے ادب کے فیض سے محروم بلکہ اس کے نام تک سے واقف نہیں، پرانے ادب کی تفریحی کتابوں سے کم از کم وہ ذہنی تفریح تو حاصل کر لیتے تھے، نئے ادب نے تو اُن کو اس سے بھی محروم رکھا ہے، اور وہ محض شہری تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشق سخن اور تفریح کا ذریعہ ہے، البتہ زبانوں پر عوامی ادب کی فیض بخشی کا شور ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ادب میں دیہاتی زندگی کی عکاسی نہیں ہے اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دور میں اُن کی اتنی اہمیت نہیں تھی، دیہاتوں میں تعلیم نہ تھی لکھنے والے سب شہری تھے، مختصر افسانوں کا رواج نہ ہوا تھا، اور اس زمانہ میں اردو کی عمر ہی کیا تھی، کہ اس میں ہر قسم کا لٹریچر موجود ہوتا، اس قسم کے مختصر افسانے تو مغربی زبانوں میں بھی ان کے انتہائی عروج، بلکہ زمانۂ حال میں پیدا ہوئے، ایسی حالت میں اردو میں ان کا وجود کہاں سے ہوسکتا تھا لیکن اسکی ترقی کے ساتھ سب چیزیں رفتہ رفتہ آرہی ہیں، اس کے علاوہ ان معترضین سے یہ سوال ہے کہ اُن کے عوامی ادب اور عوامی زندگی کی عکاسی سے خوان غریب دیہاتی عوام کو کیا فائدہ پہنچا، وہ اس کے علمی و عملی دو فائدہ دونوں سے محروم ہیں، ان میں اتنی استعداد و صلاحیت نہیں کہ وہ کم سے کم انھیں پڑھکر ذہنی تفریح ہی حاصل کر سکیں، اُن کی پرمحن زندگی جیسے پہلے تھی اب بھی ہے، ان کو جو فائدہ پہنچا بھی ہے، وہ سیاسی حالات نے پہنچایا ہے، عوامی ماننے ادب کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ویسے ہی محض تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہے، جیسے پرانا ادب ہے، روس میں عوامی ادب اس وقت پیدا ہوا جب عوام کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہوگیا، یہاں حال یہ ہے کہ دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ بلکہ تقریباً کل کا کل جاہل مطلق ہے، اور اس کی ضیافت کے لئے عوامی ادب کا خوان موجود ہے،

جس کی خبر بھی ان بیچاروں کو نہیں ہے، یہ تو ویسی ہی ستم ظریفی ہے کہ غریب کسانوں کو آج بھی پیٹ بھر کھانا اور تن کا کپڑا میسر نہیں لیکن اُن کی ترقی کے لئے دیہاتوں میں بجلی اور ریڈیو رائج کرنے کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی ادب سے عوام کو عملاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ایسی حالت میں اس کا نام محض عوامی ادب رکھ دینے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا،

ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا بھی نہایت مہمل ہے، یہ دونوں قسمیں ہر زمانہ اور ہر زبان میں موجود رہی ہیں، گو یہ اصطلاحیں نہ رہی ہوں، البتہ اب ادب برائے زندگی کا تصور محدود ہو گیا ہے، پہلے زندگی نام تھا اس کے مادی، اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا اور اب وہ سمٹ کر محض پیٹ اور جنسی بھوک میں محدود ہو گئی ہے، زندگی کے صحیح اور جامع تصور کے مطابق اس کے ہر پہلو کی ہدایت و رہنمائی کے لئے عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی وغیرہ ہندوستان کی تمام رائج زبانوں میں حکیمانہ و فلسفیانہ کتابیں، سبق آموز حکایات، حکیمانہ مقولے، اور ضرب الامثال موجود ہیں، اردو ایک نئی زبان ہے، اس لئے اس موضوع پر اس میں کم کتابیں لکھی گئیں، لیکن دوسری زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، سنسکرت اور ہندی کے ترجموں کا راقم کو پورا علم نہیں ہے، لیکن انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ، گلستان سعدی، بہار دانش، اخوان الصفا، کیمیائے سعادت، مثنوی مولانا روم اور دوسری بہت سی حکیمانہ کتابوں کے جن سے زندگی کے ہر شعبہ میں سبق حاصل ہوتا ہے، ترجمے ہو چکے ہیں، اور یہ سب کتابیں تو ہمارے پرانے نصاب میں داخل تھیں یعنی زندگی کے جملہ مادی، روحانی و اخلاقی معاملات و مسائل کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، ایسی حالت میں پرانے ادب کو محض ادب برائے ادب میں محدود سمجھنا ناواقفیت کا ثبوت ہے،

خالص ادب یعنی ادب برائے ادب بھی زندگی کی ضروریات میں اور تہذیب و کلچر کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ دہقانی زندگی بھی اس سے خالی نہیں، انسان محض جانور یا مشین نہیں ہے، کہ وہ محض مادی ضروریات فراہم کرنے کا آلہ ہو، یا اس کی ضرورت محض پیٹ اور بھوک تک محدود ہو، بلکہ وہ مادی حوائج

ضروریات کے ساتھ کچھ لطیف جذبات و احساسات اور پاکیزہ تصورات بھی رکھتا ہے، زندگی مشقتوں اور جد و جہد کے بعد اس کو سکون کے کچھ لمحات اور دماغی و ذہنی لطف و تفریح کا سامان بھی درکار ہے، عملی سے عملی آدمی کو بھی ایسے لمحات کی ضرورت ہوتی ہے، دیہات کے کسان بھی اس سے خالی نہیں ہیں، دن بھر کی محنت و مشقت کی تکان کے بعد اُن کو بھی ذہنی و دماغی سکون و تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات میں دیہاتی قصص و حکایات و افسانوں کو سن کر لطف و تفریح حاصل کرتے ہیں اور جس قدر تہذیب و کلچر بڑھتا جاتا ہو گی، اس قسم کے لٹریچر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، دل و دماغ کی تفریح و جلا کے لئے ادب برائے ادب ضروری اور تھکے ہوئے دماغ کی غذا ہے جس سے دماغ تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے، اس کے بغیر دماغ کند اور ذہن غبی ہو جاتا اور زندگی کی بہت سی لطافتیں اور رعنائیاں ختم ہو جاتی ہیں، اس لئے انسانی زندگی کے لئے ادب برائے ادب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ادب برائے زندگی، اگر ادب و شاعری کا حصہ زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو وہ یکسر بے رنگ و بو ہو جائے،

نئے ادب کے بعض اصلاحی پہلوؤں کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، ترقی پسند ادیبوں میں ایسے اصحاب قلم بھی ہیں جن کی کوششیں، ادبی و اصلاحی دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، جم غفیر ان نوآموزوں کا ہے جن کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے، اور وہ ترقی پسند محض اس لئے کہلاتے ہیں کہ الٹے سیدھے اشتراکی خیالات کی نقالی کرتے ہیں، اُن کا سب سے بڑا عیب عریاں نگاری ہے، بلکہ پختہ کار ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانے بھی اس سے یکسر پاک نہیں، سماجی اصلاح کی ضرورت مسلّم ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ صرف عریاں نگاری ہے، اگر بالفرض کسی خاص صورت میں کسی درجہ میں اس کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے، تو اس کو مزے مزے سے لیکر بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے تو خود ان ادیبوں کی جنسی بیماری کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے فحاشی اور عریاں نگاری کو نوجوانوں میں اپنی شہرت و مقبولیت اور تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہے، ورنہ یہ کام شایستہ طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے، بعض پرانے ادیبوں نے بھی اس موضوع پر

پر لکھا ہے، مرزا رسوا اور قادری سرفراز حسین نے طوائفون تک کی سرگزشت بیان کی ہے، لیکن کس شائستگی کے ساتھ خود قاضی عبد الغفار صاحب جو پرانے اور نئے دونون ادب کے مجمع البحرین پرانے ادب کے نامور ادیب اور ترقی پسند ادیبون کے مقتدا ہیں، ان کی کتابین لیلیٰ کے خطوط اور مجنون کی ڈائری اصلاحی ترقی پسند ادب کا اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ ہین، لیکن اس کے لئے بڑے سلیقہ، حسن مذاق اور اس سے بھی بڑھ کر حسنِ نیت کی ضرورت ہے جس کا نئے ادیبون مین عموماً فقدان ہے،

یہ تو نئے اور پرانے ادب کے ایک حصہ یعنی نثر کا تجزیہ تھا، نظم کا حال بھی یہی ہے، نہ ترقی پسند شاعری سراسر خیر ہے، اور نہ پرانی شاعری محض دفتر پارینہ، شاعری ہی نے اردو جیسی نومولود بولی کو مستقل زبان بنایا، اور شعراء اور ادیبون کو زبان و بیان کے جوہر عطا کئے، ورنہ وہ ع

اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے انکار نہین کہ اردو کی قدیم شاعری کا بڑا حصہ عشق و عاشقی کے جذبات اور ہجر و وصال و گل و بلبل کی داستان پر مشتمل ہے، لیکن حسن مذاق اور لطافت کے ساتھ یہ چیزین شاعری کا عیب نہین، بلکہ ہنر ہین، کس زبان کی شاعری اس سے خالی ہے، بلکہ شاعری کا آغاز ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا، اسکو خارج کر دینے کے بعد شاعری مین رہ کیا جاتا ہے، البتہ اعتدال و سلامتِ مذاق ضروری شرط ہے، یہ صحیح ہے کہ آخری دور کے شعراء خصوصاً لکھنؤ کے شعراء نے شاعری مین بڑا ابتذال و رکاکت پیدا کر دی اور اس کو سفلہ جذبات کا چٹکلہ اور الفاظ کا کھیل بنا دیا، لیکن یہ اس دور کی زوال پذیر سوسائٹی کا قصور ہے، تاہم کوئی دور بھی بلند پایہ شعراء سے خالی نہین رہا، غزل مین میر، مومن، ذوق، غالب، آتش اور انیس و دبیر بھی تھے جن کا کلام اردو شاعری کا لائقِ فخر سرمایہ ہے، خصوصاً انیس و دبیر نے اردو شاعری کا دامن نہایت وسیع کر دیا، انیس نے بالکل صحیح کہا ہے،

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر مگر مین نے پلّہ گران کر دیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری کا دامن محض عشق و محبت کی واردات سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس کا

سے بلاشبہ اردو شاعری کا گلہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن وہ دوسرے جذبات و خیالات سے یکسر خالی نہیں ہے خود غزل میں بھی جو اس حیثیت سے سب سے زیادہ مطعون کی جاتی ہے، بہت سے اخلاقی و حکیمانہ خیالات پائے جاتے ہیں، بلکہ رباعی کے بعد غزل کے فرد اشعار ہی اس کے لئے موزون ہیں جس سے کسی غزل گو کا کلام بھی خالی نہیں ہے، رباعی اور قطعات حکیمانہ خیالات کے لئے مخصوص ہیں، جن کا بڑا ذخیرہ اردو میں ہے، مسلسل نظم کے لئے مثنوی ہے جس میں ہر قسم کے واقعات اور خیالات و جذبات نظم کئے جا سکتے ہیں، اور اردو مثنویوں میں اس کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں، اس لحاظ سے مرثیہ کا دامن بھی جن کا موضوع اگرچہ محدود ہے ہر قسم کے جذبات و خیالات، مناظر اور واقعہ نگاری کے لئے نہایت وسیع ہے اور اس کی بہتر سے بہتر مثالیں انیس و دبیر کے مراثی میں موجود ہیں جن کی نظیر جدید اردو شاعری میں اب تک نہیں مل سکتی؛ یہ تو پرانی شاعری کا حال ہے جدید دور کی شاعری میں ہر قسم کی نظمیں اس کثرت سے ہو گئی ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے، البتہ موجودہ نقطۂ نظر سے قدیم شاعری زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے خالی ہے لیکن ایسے دور انحطاط کی شاعری میں جس کا نشو و نما حکومت کی تباہی، سوسائٹی کے فساد اور لکھنؤ کے گہوارۂ تعیش میں ہوا ہو زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار میں ہمایوں اور بابر کی تلوار کے جوہر اور جہانگیر و شاہجہان کی عالم پناہ کے محل میں خون جگر تلاش کرنا، لیکن جب سے اردو شاعری کا قدیم رنگ بدلا ہے، اس میں قومی، ملی، معاشی اور سیاسی مضمون کا بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جدید شاعری کے سرگروہ حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خان، اکبر اور اقبال سب کے سب پرانے مکتب شاعری کی پیداوار تھے، انہی نے جدید شاعری کا آغاز کیا، اور اس کو کمال کے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، خود ترقی پسند شعراء کے امام جوش ملیح آبادی بھی شاعری کے پرانے اسکول کی پیداوار ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پسندی کے رائج الوقت سکہ کا ٹھپہ لگا دیا ہے لیکن وہ اسی پرانی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے اسی لئے اس میں کھوٹ نہیں ہے اور کمال فن اور محاسن شاعری کے اعتبار سے استادانہ ہے، اس لئے پرانی شاعری کا دفتر بالکل پارینہ نہیں ہے، البتہ اس کے بعض پہلو قابل اصلاح ضرور ہیں جن کی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

اس کے مقابلہ میں ترقی پسند شاعری کی ابھی کوئی حیثیت ہی قائم نہیں ہوئی ہے اور ترقی پسند شعرا میں جوش، مجاز، علی جواد زیدی، فراق اور اس قسم کے دو چار شعراء کو چھوڑ کر جن کی شاعری کا قالب وہی پرانا ہے، اور جو درحقیقت شاعری کہی جا سکتی ہے، باقی نظم منثور لکھنے والے کسی شمار میں نہیں ہیں، اور اُن کی حیثیت اشتراکی ادب کے بھونڈے نقال سے زیادہ نہیں، اگر پرانی شاعری محض عشق و محبت، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے افسانوں تک محدود تھی تو جدید ترقی پسند شاعری محض پیٹ، روٹی، انقلاب، مزدور، سرمایہ دار اور فرائڈ کی جنسیات تک محدود ہے،

ترقی پسند نثر اور نظم دونوں کے عیوب و نقائص قریب قریب یکساں ہیں نظم میں دو عیب مزید ہیں، ایک شاعری کے قواعد سے آزادی، دوسرے ابہامیت یا رمزو کنایہ قواعد سے آزادی کے لئے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ وہ خیالات کے تنوع اور وسعت کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے اُن کا توڑنا ضروری ہے لیکن یہ محض عذر لنگ اور عجز بیان کا ثبوت ہے رامائن، مہابھارت، شاہنامہ مثنوی مولانا روم وغیرہ دنیا کی بہت سی غیر فانی کتابیں پابند نظم میں لکھی گئی ہیں، اور ان میں مختلف النوع جذبات و خیالات، افکار و تصورات، واقعات و حالات، فلسفہ و حکمت، اخلاق و روحانیات وغیرہ کا ایک عالم موجود ہے، اور اُن کے نظم کرنے میں شاعری کی پابندیاں حائل نہ ہو سکیں، خود اردو جیسی نو عمر زبان میں غالب، انیس و دبیر اور اقبال کے کلام میں کیا کچھ نہیں ہے، اقبال سے زیادہ بلند و دقیق کس کے خیالات ہونگے لیکن اُن کو کبھی قواعد شاعری کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑی، خود ترقی پسند شعراء میں جوش، مجاز، فراق، علی جواد زیدی جاں نثار اختر کو جن کا کلام درحقیقت شاعری کہلانے کا مستحق ہے شاعری کے قواعد کی تنگ دامانی کا شکوہ کبھی نہیں ہوا، خصوصاً جوش کا کلام تو قادر الکلامی کا نمونہ ہے، اور اسی لئے اُن کے کلام میں جان ہے کہ اس کا قالب پرانا ہے،

بحر، ردیف اور قافیے کی پابندیاں محض لایعنی نہیں ہیں، بلکہ اُن سے کلام میں حسن و اثر پیدا ہوتا ہے، ایک ڈھلا ہوا شعر سامعہ اور ذوق دونوں کو متاثر کرتا ہے، قوت حافظہ بھی اسے جلد اور آسانی کے ساتھ محفوظ کر لیتی ہے، اس لئے تبلیغی مقصد کے لئے بھی پابند شاعری زیادہ مفید ہے، اس حد تک تو تسلیم ہے کہ ان تمام

قوانین کی پابندی کی ضرورت نہین جن سے شاعری محض صنعت گری بن جائے لیکن موٹی موٹی باتون مثلاً بحر و وزن اور قوافی کا لحاظ جن سے شعر کا قالب بنتا ہے ضروری ہے، ورنہ وہ شعر شعر نہین رہ جائے گا، ایسا تو نہ ہو کہ ایک نظم کا ہر مصرع دوسرے سے مختلف ہو، اور نثر و نظم مین امتیاز کرنا دشوار ہو جائے، بلکہ نظم منثور کے فقرے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہ ہون، انگریزی کے بلینک ورس کی شوق سے تقلید کی جائے لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ، ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو دوسری زبانون کی بجنسہٖ نقل و تقلید کا متحمل نہین ہو سکتا، ایک ماہر و مبصر ادیب کا یہ کام ہے کہ دوسری زبانون کے ادب کی نقل و ترجمہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، ورنہ ایک کی روح دوسرے کے قالب مین بالکل اجنبی نظر آئے گی، اس قسم کے تصرفات خود عربی فارسی اور اردو کی بحرون مین جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہین کئے گئے ہین، اس لئے کہ بجنسہٖ ایک زبان کے قوانین شاعری دوسری زبان کی شاعری کیلئے موزون نہین تھے، ایسی حالت مین انگریزی جیسی اجنبی زبان کی شاعری کی نقل و تقلید مین تو ترمیم اور تصرف کی بھی زیادہ ضرورت ہے،

دوسرا عیب ابہامیت یا رمز و کنایہ ہے، اردو شاعری مین بھی استعارہ و کنایہ ہے لیکن اس کا استعمال خاص خاص مواقع پر اس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کلام کے حسن و اثر دونون مین اضافہ ہو جاتا ہے، اور شاعر کا مفہوم و مقصد، تصریح سے زیادہ بلیغ طریقہ سے ادا ہو جاتا ہے، الکنایۃ ابلغ من التصریح مشہور مقولہ ہے، لیکن جدید شاعری کی ابہامیت ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

کی مصداق ہے اور اس کا مفہوم و مقصد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، ترقی پسند شاعری کا بڑا مقصد خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور اس قسم کی ابہامیت اس کے بالکل منافی ہے، اس لئے سنجیدہ ترقی پسندون کو ان نقائص کے اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ترقی پسند ادب کا اصل منشا پورا نہین ہو سکتا اور اس کی زندگی بھی بہت تھوڑی ہو گی،

مطبوعات جدید

مسدس بے نظیر مصنفہ جان صاحب، مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ/ پتہ:۔ خسرو باغ، روڈ ریاست رامپور،

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے بڑے قدردان و سرپرست تھے اس دور کے بہت سے نامور علما، وشعراء اور ادبا، دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ مین بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اسی سلسلہ مین انھون نے اپنی تخت نشینی کی یادگار مین ۱۸۶۶ء مین ایک میلہ قائم کیا تھا، یہ رامپور کا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام مین باغ بے نظیر مین لگتا تھا، نواب ممدوح خود بنفس نفیس اس مین شریک ہوتے تھے اور ہر فن کے باکمال اس میلہ مین اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعر وادب کی محفل بھی جمتی تھی، چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے متوسل شعراء نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف مین اشعار کہے تھے، مشہور ریختی گو جان صاحب نے ایک مستقل مسدس مسدس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہین چھپا ہی، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ مین موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو مبسوط مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے، مسدس تو کل ۳۳ صفحون کا ہی لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہی، اس مین لائق مصنف نے بڑی تلاش و جستجو سے تاریخی وادبی ماخذ ون شعراء کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگون کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہین، اور جان صاحب کے مسدس اور دوسرے شعراء کے کلام مین جن لوگون کے نام یا جو اشارات آئے ہین اُن کے مختصر حالات اور اُن کی تشریحات تحریر کی ہین، اس طرح اس مقدمہ مین اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے جس کا اب صرف تاریخون مین ذکر ملے گا،

"م"

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے تمام موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- ہے

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی سرپرستی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری سلطنت کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت:- ۴۱۵ صفحے،

قیمت:- صہ

منیجر

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک وہ ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

(حافظ محمد ناظر صدیقی ادمد) "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۸ اے

دسمبر ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۹۵ صفحے قیمت: [illegible]

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- [illegible]

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۴۳۲ صفحے

قیمت:- [illegible]

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۰ سنہ عیسوی عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

آثار علمیہ و ادبیہ

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا، اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا، لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہین کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہوجاتا ہے، انھی مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف وخصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے مین نہ آئین گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ مین بھی ان اوصاف مین منفرد تھے، اُن کی ذات سے فضل وکمال، علم دوستی وعلماء نوازی، تقویٰ ودیانت، تہذیب وشرافت، سیرت کی استواری ووضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف وکمالات اور علم وفن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دارالمصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط وتعلق اُن کی یادگار دارالمصنفین کی جانب منتقل ہوگیا، چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان وہواخواہ، مجلس دارالمصنفین کے رکن رکین اور اُس کے صدر نشین تھے، اسلئے دارالمصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا، جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل مین ادا کرسکتا تھا،

اس نمبر مین اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور ان کی نمایان خصوصیات سامنے آجائین، چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحاب علم وقلم کے ہین جن کو برسون مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو زیادہ قریب سے مسلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے، حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا، لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو سر مقالہ رکھنا ضروری تھا، اس سے صرف چند ابتدائی صفحون کے ہندسے مکرر ہوگئے ہین، باقی اور کوئی فرق نہین آیا، ہم ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور ان کی علمی یادگار ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کرتے ہین،

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، مین نے مرحوم کی زندگی ہی مین اُن کے واقعات اور خاندانِ شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین مین رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر مین بتاریخ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہین کہا جا سکتا کہ اس کو کہان سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، مین نے موصوف کو سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۰ء مین نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسے کے ہر اجلاس مین نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھین اُٹھ جاتین انگلیان اشارہ کرتین، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح مین نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

کے ایک رئیس عالم ہیں،

۱۹۰۱ء میں جب میں ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے، اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے، ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے دستار اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ میں مولانا شروانی شریک تھے، تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولینا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں، ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدت تعلق کی بنا پر جو اُن دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اِس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے"، ۱۸ر نومبر کو مولانا نے وفات پائی' اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا۔ جب تک اُن کی قوتِ حافظہ اور عام قوتِ جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڈہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا' میں نے دیکھا کہ اُن کا نیر سا قد خمیدہ کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستون سے بزرگداشت کا تعلق رکھون اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھون، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین انھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے۔ دار المصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دار المصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے توسب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، مین نے جب انھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر ایک سے حسب استعداد کسب فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سند حدیث حاصل کی، قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر پر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۹ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف ہے،

اور دوسرے کا نام ماہنامہ علی ، یہ دونوں ، نیسویں صدی کی یادگار ہیں ، ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا ، تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے ، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں اُن کا مضمون چھپا تھا ۱۹۰۸ء میں الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوئے ، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے ،

علی گڈھ کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں الصدیق لکھ کر پیش کی حیدرآباد کی میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے ، اُن میں سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے ، جو چھپے اور پھیلے ، معارف میں اُن کے مضامین اور اُن کی غزلیں اکثر زیب اوراق رہیں ،

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا حسرت تخلص کرتے تھے ، اردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتے تھے ، اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے ، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے ،

اُن کے اخلاقی فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی ، جس سے جتنا ملتے تھے ، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے ، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے ، اور تمام عمر میں کبھی اس وضع میں فرق نہیں آیا ، پھر اس قیام میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا ، اسی طرح وہ جا کر ملتے ، اور اتنی دیر بیٹھتے ، لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ میں ضرور حاضر ہوتے ، اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا ، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے نسبت رکھتی تھی ، یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا ، اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان میں تھے ، جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی ، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے ، اور یہیں اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی جس کے بعد اُن کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا ، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح میں اُن کی مساعی مشکور رہیں حیدرآباد

کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں، مرحوم کو قومی اداروں میں سے علی گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۴ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبد الحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں میں نے اُن کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کر دیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا سازگار آیا، اور اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ اُن کو یاد رہا، اور نہ میں نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور اُن کی پسند سے کتابیں خریدا کرتے، لکھنؤ میں عبد الحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو اُن کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کر لے جاتے، یوں بھی کتابیں اُن کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں اور بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڈھ مین بھیکم پور مین تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤن آباد کیا تھا، وہین زنانہ اور مردانہ مکانات، مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ مین ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ مین سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ مین تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک مین مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا، تو جواب مین لکھا کہ کیا رمضان مسلمانون کے کام مین مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ مین وہ چائے کے بجائے اوولٹین پیتے تھے، مین کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری مین یہ تینون شراب الصالحین لائی جاتین، اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتون مین اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب فرتل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، مرحوم دونون کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڈھ مین حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھون نے جو مشورہ دیا اس مین سے سامنے کی رو کار عمارت ہی فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتین عجیب تھین، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کو تعلق ہوتا وہ

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اوسکی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا،
حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار
سے تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے کہین بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابوالکلام
سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست
کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین، جن مین سیاست بھی ہی، مگر کبھی کسی خط مین
نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا
بھی تو اوڑا دیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ کنایہ مین کہتے
کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر
اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۳ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دار المصنفین آئے
تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، اُن
کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلّا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا
مُلّا جی یہ تو پٹھانون کا مال ہے ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کر دیا کہ شاہان بشاہان می زیبند
فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ معصود کی فقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس مین بیان
فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ
تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پرتاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی
کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری، تصنع سے خالی، اور آورد سے پاک بزرگون

ذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوتی تھی، لہجہ میں سختی اور آواز میں
ئی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق میں بڑے نرم، مرنج و مرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اُس سے
تے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علٰحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انھوں نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہبازِ ہمتم را بیطے بدست شاہ داشت
دست دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابنِ رئیس ہونے کے اور حکامِ ضلع سے
تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلما
خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے
یدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش
تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے ز
باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونوں سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد
حت کا زمانہ آیا تو وہ سب آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے
کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابطہ اور تحمل ایسے تھے کہ کبھی
داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا، اور کئی قوٰی میں سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر
بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں اُن کا یہ بیان پڑھکر
بڑی حیرت ہوئی، کہ ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفرِ عراق کو نکلے تھے

تفصیلات اب معلوم ہوئین، مین نے انھین لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۷ئہ مین) دو نو جوان عراق کے سفر کو نکلے تھے، جن مین سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابوالکلام نہیں بلکہ حافظ عبدالرحمن امرتسری تھے، اور اوس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر مین وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق مین انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل مین اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا، اخیر مین مین نے لکھا کہ آپ کی اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہین دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہین چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگون کی یادگارون سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ مین دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ مین ایک ایسا پر عظمت جوش علماء مشائخ صلحا اور عامہ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا، وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھون سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے،

اُن کے اخیر دور کی یادگارون مین استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، امام علیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف مین چھپے ہین، اور الگ بھی شائع ہوئے، انھون نے

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ میں فقیر کی تصنیف عرب وہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو میں نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتوں میں سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف میں شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ میں اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپ کار آمد علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبداللطیف کی قیامگاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی،

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ میں ہوائیں اور سمت کی چل رہی ہیں، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلما کے آرگن اور مجلہ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوہ کی ترتیب و ادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، راجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دکھایا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو ظل پدر یا پدری شفقت کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری چیز سمجھ مین نہین آتی، آہ! سے

ع قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

تقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدر آباد پہنچا یا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچا یا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومت آصفیہ کی جدید

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہو گئی، ملک کے طول و عرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایانِ شان ہمہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڈہ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی اُن کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، دُرباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ،

الغرض حکومتِ آصفیہ کے وزیر مذہبی کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

آبا عن جدٍ پشتہا پشت سے جسکے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے "تلغرافی پیام حیدرآباد سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے، تار میں غالباً "ناظم امور مذہبی" کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا، ناظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، اور اختیارات جو ملتے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے "نوکری" کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجوم خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمینِ ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہیں

میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہو کر اس موقع سے

تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"،

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے مین جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا، اور جب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ ناظم کی وجہ سے شروع مین مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر بارگاہ خسروی سے جب تصریح ہوگئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام ہوگا جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، چھٹ کر صاف ہوگیا، "ناظم امور مذہبی" کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہوگئے۔

نواب مویدالملک سر علی امام مرحوم نے جب "باب حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو باب حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور اراکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہوگیا،[1]

---

[1] قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل مین اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) اور ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا، یہی معتمد ہی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزراء کو معین المہام کہتے تھے، باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی مین صدر الصدور کی حیثیت کیا ہوگی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی، جس کا رتبہ صدر اعظم اور وزرائے کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہین بنایا گیا، اور محکمہ مذہبی کی نمایندگی کے لئے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغون کے ساتھ

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہو گیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی، اس لئے سن و سال وضع و قطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا، لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ درِ دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریزی کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی میں مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں اونچے نیچے سرکاری غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے اُن کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے:-

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہو گیا پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ضم کر دی گئی، ابتدا میں اس عجیب و غریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، "تلك امة قد خلت لها ما كسبت و لكم ما كسبتم يغفر الله لنا ولهم اجمعين" (۱۲)

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت وعطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے تصنوں کی ضرورت نہین، جب آنا ہو بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ مین حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی مین خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی مین قیام فرما تھے، خلد آباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع مین استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مین وطن (اعظم گڈھ) جا رہا ہون خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہون مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی حضرۃ الاستاذ وہین سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دارالامارہ مین مقیم تھا، حکم دیا گیا کہ شہر مین گھوم گھوم کر قلمی کتابون کا پتہ چلاؤن، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشا کو پاکر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہرایک نے دی، اس سفر مین بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت مین حیدر آباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی مین فقیر بھی اُن سے مانوس ہو گیا، اور اُن کے لطف وکرم کی موسلادھار بارشون کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنون تک برستا ہی [illegible] انت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ ونور ضریحہ،

کم وبیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدر آباد کی زندگی گذری، اس عرصہ مین سرکاری غیر سرکاری شعبون مین اُن کے کارنامون کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہان سرسری طور پر بعض نمایان خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہین تذکرہ کرنا چاہتا ہون

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسون کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانون کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جا رہا ہے، کچھ ایسے لب و لہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے، کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی،

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے، جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق اُن کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان و خطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین و سنجیدہ معلومات اُن کے نکھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوؤن پر مسلسل پر مغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ یہ ہے کہ بھلائے

نہین جا سکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم و انتظام فرش نہ فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین مجھے کتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون چھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرون کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت و آرام کی زندگی کے قدرتہً عادی تھے، لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بارہ بجے تک کبھی وہ بیٹھی ہوتی لیکن مین نے کبھی اُن کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[ل]

ل خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریبًا لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپکے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے شرم سے گردن جھک گئی،

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہرایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریرون سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہین ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا، لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہین ہوئی، فہمایش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہین ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے فیصلون پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلون کے حدود سے سر مو متجاوز نہ ہوتے تھے، مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی اُکی باتون سے کسی قسم کی گرانی پیدا ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امور مذہبی" کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے آثر کے ساتھ ہندؤون، عیسائیون، پارسیون کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت مین حاضر ہوتے، اپنے درد دکھ کے قصے سُناتے، ہرایک کی بات سنتے، اور حُسنِ سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے، کہ ہرایک آپ کا مداح ہوکر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے ہیرو کو آپ سا کی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شہروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ

اور اُن کے خلفاء و جانشینون کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشون مین ایک بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون سے اُن کی راہ و رسم لوگون کے لئے باعثِ حیرت کبھی بن جاتی ہے، مگران مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب و غریب خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اُسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان اُن کے علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی بھپتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی، چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی، کہتے ہین کہ "جامعہ" کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر تک کسی مین نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدر الصدور کے توسط اور معائنہ

کے بعد پیش ہوں،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی، اور مولانا انوار اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار والاتبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی" کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیۃً مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں، اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دیں گے، بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہوگیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو و نما کا کام بھی اس "جامعہ" سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کرکے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی اُن کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ "مضمون" کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالبہ کے لئے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کردی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دیجا سکتی، خدا خدا کرکے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک جبری عنصر جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے بزور داخل کرادیا

گیا تھا، اسی لئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں، وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے تعلق میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے بڑھ جانے سے ان کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی ان کی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کرکے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کال یک جگ یا قرن میں اور ادرکیا کیا نقشے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر غایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو ہر موقع پر ان کے قدم کا رُخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزامات کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے، مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابو حنیفہ "ابتلیت بہ فصبرت" انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر ان کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں "نہیں" کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پرلطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مختص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے مگر جیب ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے، اور مسکراتے کہ میم صاحبہ نے عجیب بات پوچھی،

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دیئے جاتے تھے، ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دلچسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ "نیر و مائنڈ" کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں مگر ایک پہلو ان کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے، لیکن اُن کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے، اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی، اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی کا ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا، لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہیں ہوتی تھی، نیز سرکاری دفاتر میں بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دی جائے، بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم و امتحان تینوں شعبوں کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے مگر نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی چیز کو منظور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کو طے کرا کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،

قدامت وجدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائیں
باغ میں ورد و وظائف و تلاوت میں بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے
کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ میں مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ
نہیں تھے لیکن کریم النفس، فیاض، امیر بازل ہونے میں بھی شک نہ تھا، حیدرآباد میں اُن کو دو ہزار ماہوار
کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی لیکن جہاں تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی
تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی
ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتوں کا سلسلہ موسم سرما میں
مہینوں جاری رہتا، ہر شب میں ایک ایک ٹولی ہم مذاقوں کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی پھولوں
کا ذکر کام و دہن میں یاروں کے ہلچل پیدا کر دیتا ہے،

میں اس سلسلہ میں دوسروں کا ذکر کیا کروں ملازمت کے ابتدائی سالوں میں مجھ پر ایک سخت
مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی میں تھا، میں تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے مجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی
مدظلہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب
میں صرف استمزاج کا خط ہی نہیں آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی
گئی، خط میں میرے بھائی کو انھوں نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج میں مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے
روپیے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمداللہ نہ ہوئی لیکن اُن کے شریفانہ
برتاؤ کی یاد دل میں جب کبھی آجاتی ہے چشم پُر آب ہو جاتا ہوں، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے
بزرگوں کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہاں پائیں گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت میں خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری
و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ میں رچ گئے، انھوں نے انسانی زندگی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدری کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور ہے رو رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپ کے امام ابوحنیفہ جیل میں کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلا وطنی کی سزا کیا ان ہی دنوں میں بھگتنی نہیں پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانوں ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگوں نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہیں رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہولے، مولویوں کے لئے بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کے دروازے کھل جائیں، تب کام کریں گے، اس دن کچھ ایسے انداز میں تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں میں نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدرآباد کی مسجد چوک میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ میں تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجدد کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلوں کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجدد کے بعد شاہ جہان و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر میں کیا بتاؤں کہ اس سلسلہ میں انھوں نے معلومات کے کن خزینوں کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلس بھی علم و ادب کی مجلسیں تھیں، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے میں محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گو یا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو اُن سے مجھے نہیں ملا، لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہیں، مجھے اس پر فخر ہے

ن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہو،

وہ بڑے صاف ستھرے اعلیٰ زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدرآباد میں کوئی دوسرا آدمی اُن کا مد مقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سواچی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں کو ان کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر میں تھا، باطن میں اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفر حج کا عزم جب فرمالیا گیا، تو فقیر کو علی گڈھ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہاں حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہاں خانہ میں گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے :-

"بار الہا! یہ حبیب الرحمن خان شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

"بار الہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے

"بار الہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، الٰہی

گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمٰن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائیں اور غریب وہان تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال و جواب میں یہ بے چارہ ثابت قدم رہے؛"

بارِ الٰہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہون، تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہون کو بخش دے؛ بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائیں؛"

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہٖ اُن کے الفاظ تھے، لیکن بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہین، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسّم گریہ و بکا بنا ہوا تھا، آخر میں فرمایا کہ

آے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما؛"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتوں کی تصویر مرد عاقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم میں ہیں، جہان نہ اُن کے اعزہ ہیں، نہ اقربا، نہ احباب ہیں، اور نہ دوست، نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہون گے، نئے حالات ہون گے آدمی خواب میں بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) میں کچھ یہی صورت اُن لوگوں کے سامنے پیش آتی ہے، جو اس دنیا والون سے تو الگ ہو جاتے ہیں، لیکن نئی دنیا میں نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے؛ فاللّٰھُمَّ اغفر لَہٗ وارحمہٗ وکن اللّٰھُمَّ انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء والاولیاء رفیقا،

قلم ہاتھ میں آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرء القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ؂

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر میں اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں،

"مجلس مذاکراتِ علمیہ" اُن ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی جس میں شہر کے ممتاز اہل علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس میں اپنی زبانِ مبارک سے اردو کی یہ غزل سُنائی تھی، اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھوں نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رُخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کر کے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری   خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

رہیں صحن گلستان نہیں دل افزائی   شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

اُس "کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہاں آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے، انھوں نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین
بوقتِ مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا

خیال لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین
سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا "شنیدہ" انشاء اللہ الملک الکریم الجواد "دیدہ" بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ وطاب ثراہ،

---

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والون سے پہلی بات یہ پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذا الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، حسرت کا سارا ساز و سامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت:- ۲۱۴ صفحے، قیمت:- عہ

"منیجر"

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر میں معارف صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اول تو خلوص مجھکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی وہ دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جاسکتی، چنانچہ جو کچھ ہو سکتا ہے مختصراً حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئیگا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان درگذر کی جائین گی، کیونکہ مین اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو پیش نظر آرہا ہے،

اوّلین واقفیت | جن دنون مین استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خان شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چند ہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پاگئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہو رہا ہوتا یا فوراً ہو چکا ہوتا، الغرض مجھکو ان کے متعلق اس طور پر معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجھکو اس سے زیادہ نہ

جانتے ہون گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہین کہ معذوری کی حالت مین بھی اس کو پڑھا رہے ہین، اس دوران مین کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمن خانصاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ مین کلام لطف کے مقدمہ مین لکھ چکا ہون، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوئے تو مین نے خود دیکھا کہ جس مکان مین حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی مین کھڑے ہوکر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہوگئے کہ رونے مین آواز بلند ہوگئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط وکتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تاآنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی مین نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلما کے سوانح حیات کا معارف مین شائع فرمایا جو بعد مین بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا، اس مین میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت مین مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے مین ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو مین اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ مین نقل کر چکا ہون، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دہراتا ہون،

"میان مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہین تو مین اپنی تکلیفین بھول جاتا ہون اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہون ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہے"،

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ مین ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب مین شرح المختار پر کام کر رہا تھا، جس وقت مین پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کرکے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد و رفت قائم نہین ہوا، تاہم جب اور جہان ملاقات ہوتی، بہت شفقت

اتے، اسی زمانہ مین اورنٹیل کانفرنس کا جلسہ لاہور مین تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو تشریف
لے گئے تھے، اور مین انٹرمیڈیٹ کالج کے نمایندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ مین
ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہوکر مجھسے باتین کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہوجانے پر مجھے آگے بڑھا کر نماز پڑھی،

ملاقات مین استحکام | غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، مین جب شہر کی سکونت چھوڑ کر یونیورسٹی کے احاطے مین
قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی مین قیام مبارک ہو" اس احاطے مین مقیم ہو کر
مین نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیامگاہ تھی، مولوی صاحب
میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہوجانے کے بعد اکثر میری آمد و رفت ان کے یہان
ہونے لگی تھی، اب پڑوس مین آکر روزانہ عصر و مغرب کے درمیان مین نے وہان حاضری کا معمول مقرر کر لیا،
یہ سلسلہ بھی بے غرض اور خلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلا گیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا
ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم بر سر مطلب۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن
بھی علی گڈھ مین قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہان تشریف لاتے،
علمی و دینی مسائل، بزرگون کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب
نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ مین نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر مین،
بعد مین یہی ترتیب مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہان اور حبیب منزل مین بھی قائم رہی کہ وسط مین نواب صاحب،
ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر مین،

استاد سے عشق | نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز مین اس عنوان سے کر رہا ہون جو کہ
مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس مین استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماءؒ کی شاگردی
پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے،
میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہو چکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت میں بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں یہ جملہ زبان پر لاتے
حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہاں سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ
العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا، جب ادھر سے گذر ہوتا فرماتے تھے کہ استاد سے تعلق پلکھنہ کی طرف
جاذب توجہ ہو جاتا، وہاں تقریبات میں شریک ہونا اور علما کے مجمعوں کا سماں نگاہ کے سامنے آ جاتا،
ادھر آخر میں کئی بار اس مقام پر پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہو جاتے تھے، جو کبھی
حبیب گنج سے بذریعۂ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پر لکھ کر
مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحریریں موجود ہیں، جنکو میں یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہوں،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نور شمس معارف کیا جس نے پر نور عالم سراسر
پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے،" مبالغہ نہیں، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان
تقریب شادی میں علما کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہوں کا، ایک عالم سرحد نے کہا کہ
ایک بار ایک اہل علم کے جلسے میں صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے،
تو تین سو شمار میں آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالبعلم اقلاً رکھے جائیں تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی
گنجائش کہاں ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا، آج بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ" ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہوں، فیض پلکھنہ فی البداہتہ

پلکھنے کا ہو وصف، کب ہے یہ امکان یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان
وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ نومبر ۱۹۴۷ء

(۳) پالکھنہ وہ معمور لطفِ لدنی منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پلکھنے مین برسے ہین انوار حکمت درخشان وہان پر ہے نور تجلی

مرشد سے عقیدت | مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہان پور کے شاہ عبد الغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان مین کبھی کسی کا نام رحمان پر نہین ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونون ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن کے نامون سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو" عرض کیا "جانتا ہون" فرمایا "خدمت کرتے ہو" عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہین" اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بیعت کی، آخر مین استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقتِ بزرگانہ | جیسا کہ مین لکھ چکا ہون، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد مین اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطۂ تحریر مین لانا ممکن نہین، استحکام کی دو وجہین معلوم ہوتی ہین، پہلی جو آغاز مین کارفرما تھی علمی اور ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر یہ بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیون اور حکام سے دور رہنا مجھ کو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کر دیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمۃ اللہ کی خدمت مین، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہو جانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

کرتا ہوں، میرے یہاں تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جا رہے ہیں شریک نہ ہوں گے میں فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائیں، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے تو مخصوص جلسہ میں مبتلا کہ جب میں رونے کے لئے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب کہاں تھی کہ شرکت نہ کرتے اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف خدمت زبدۃ العلما، مولوی بدر الدین سید رسما ر کما ل مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات | اہل علم سے بہت رغبت تھی محض علمی فضل کی بنا پر لوگوں سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اچھے اچھے علما کو یونیورسٹی میں جمع کر لیا۔ اہل علم کے ساتھ ہم نشینی کا خاص ذوق تھا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبد اللطیف صاحب کے ن یہ روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لاکر گھنٹوں بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسیں بڑی پاکیزہ ہوتی تھیں جن میں معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہیں، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو رہتی تھی، یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعوں پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرتا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچکر لازم تھا، ایک بار وہاں کوئی دعوت تھا، نواب فضل اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونوں صاحب مقیم ہوئے، دوسرے صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہاں گئے

اور نواب مزمل اللہ خانصاحب حکام سے ملے، جاے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خانصاحب نے جو چچیرے چچازاد بھائی اور عمر مین بڑے تھے، ذرا تیز ہوکر پوچھا "کہان چلے گئے تھے"، جواب سننے پر انھون نے پھر تیز ہوکر کہا کہ "ان لوگون سے ملنے آئے ہو یا دربار کے لیے"، اس کا جواب یہ تھا، کیا کیا جائے ایک خبط ہے" اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خانصاحب نے گرم ہوکر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہان شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہان"۔ اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے"۔ یہان ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی مین کوئی تقریب تھی، لائبریری مین ممبران کورٹ اور ممبرانِ اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھتے جارہے تھے، اسٹاف کے سلسلہ مین مین بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدریار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر ادھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھکر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہان ان کی جگہ نہ تھی، جب تک لائبریری مین اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے اور برابر باتین کرتے رہے،

درویشی اور تواضع | باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج مین درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر ہر شخص نے دیکھے ہین، مین سمجھتا ہون کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شانِ درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہرگز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوتی، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی | نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم مین کمزوری پیدا نہ کرسکا، شاید ہی کوئی شخص شناساؤن مین ایسا ہو جس کے خیال مین اس کی مثالین نہ ہون، وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی نہ مانۂ قیام علی گڈھ روزانہ عصر کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان جو معمول آنے کا تھا اس مین کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھئے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ مین نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہو جاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

ومن مذھبی حب الدیار لاھلھا — وللناس فیما یعشقون مذاھب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہو گئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، بیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات بھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات | بھیکم پور عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانا اور اوراد و وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہو کر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بار گراں مجھ کو سپرد ہو گیا تھا،

حیدر آباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمت اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دوران قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے ۔۔۔ سچی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا،

علمی ذوق | نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھر میں پیدا ہو کر پورے ماحول سے جداگانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبدالشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور درویشانہ زندگی بسر کرتے لیکن

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خاں صاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ | اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا جن میں سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کر کے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شیروانی" میں معارف سے منقول ہو کر درج ہے،

"ان کے لڑکپن میں ایک کتاب فروش بچوں کی کتابیں بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابیں فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانخانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بنا کر کتابیں بیچا کرتے، بیویاں اس کھیل کو دیکھ کر ہنستیں اور تعجب کرتیں، بچپن میں کتابیں بیچنے کا شوق آئندہ کتابیں خریدنے میں تبدیل ہو گیا، پہلے اردو دیوانوں کے نسخے خریدے، جو صندوقوں میں پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہاں قلمی کتابیں خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجے پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفروں میں قلمی کتابوں کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد میں بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابوں کا فراہم ہوا جن میں ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبدالحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابوں کی بلکہ نایاب چیزوں کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابیں ہی نہیں ہر قسم کے نوادر جمع کر لیے جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہیں، کتبخانہ کی چند خاص باتیں قابل ذکر ہیں، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہیں کی جتنی کتابیں فراہم کیں سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہو کر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف و تالیف | علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف و تالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ مین حیدر آباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بابر پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جو اب علٰحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کین، مضامین لکھے، سارے ملک مین علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال مین شائع ہو چکا ہے، جس کے ۸۰، ۴ صفحات ہین، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ مین المامون پر ریویو نہین شامل ہو سکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف مین "سیرۃ الصدیق" انگریزی مین بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس ۳۰ سے متجاوز ہین،

ایثار اور وقار | ملک مین جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۳۰ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسون کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک مین حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رکنِ رکین سرسید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکٹیو کاؤنسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق | اب مین نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہون، جس زمانہ مین حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بتقریب شادی میرا اور نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلائین" حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حروف مین امرؤ القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یون کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیاحبذا ذکری حبیب منزل

اس تصرف کو مین نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہو کر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، مین ان دنون شہر مین رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کر دو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیام گاہ

کے قریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو اثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹون کے غور کے بعد بے اختیارانہ تضمین ہوگئی، جو درج ذیل ہے۔

بناء عظیم للحبیب بکوئل عن النقص والاخلال صار بمعزل

فیبقی علی الایاء ذکری کلیهما فیاحبذا ذکری حبیب ومنزل

اسی دن یا دوسرے دن مین نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت مین پیش کر دیا جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہون

"مصرعے بلیغ ہین، کوئل کا قافیہ غنیمت باردہ ہے، امرء القیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعۂ اولی کے پایہ کا نہین، آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپان اور ہمپایہ ہے"،

اسی خط مین مولوی حبیب الرحمن خانصاحب کی سفر حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھکر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، مین نے اس پر عربی مین مصرعے لگاکر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے یہ تاریخ کہی ہے نظم مین ظاہر کر دیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجۂ ذیل کلمات مین فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے کمی پوری ہوگئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کر لیتا ہے"

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریرون مین انتہا درجے کے بلیغ ہین، مثلاً نزہۃ المعانی کے مقدمہ مین اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہین" جو حاصل ہوا فیض استادے جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے"۔ رسالہ استاذ العلماء مین مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھکر تحریر فرماتے ہین" باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہین، پڑھا اور پڑھایا"۔ مقدمۂ دیوان درد مین لکھتے ہین" شہروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے"۔ یہ تین نمونے اس وقت دماغ مین موجود تھے جن کو پیش کر دیا، بیسیون جملے اسی قسم کے انکی تحریرون مین موجود ہین،

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی
دتی ہو جس مین ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہون، جب مین حاضر ہوتا اس قسم کی گفتگو مین روے سخن
ہری طرف کر لیتے اردو اور فارسی دونون زبانون کے دیوان طبع ہو چکے ہین، کبھی خود اپنے اشعار سناکر
اضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی اساتذہ کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا
تی اسکو احاطۂ تحریر مین لانا ممکن نہین، یہان مین اس تحریر مین جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہون

اردو | جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستان ہو گیا — تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیابان ہو گیا
آنکھ جب بند ہوئی تب کھلین آنکھین اپنی — بزم یاران جسے سمجھے تھے وہ زندان نکلا
پھول فرقت مین تری خار ہوئے جاتے ہین — ہلکے پھلکے ہین مگر بار ہوئے جاتے ہین
کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہان فرصت کہ بیٹھون چاک کرنے مین گریبان کو
حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل — تمھارے بھی ہین پاسبان کیسے کیسے
تاب نظارہ تو جب ہو کہ رہین ہوش بجا — پھر کہان ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی | دل بری روئے اگر بردہ ز من نیست عجب — اہرمن بردہ ز کف مہر سلیمانے را
ہمت ما سر تہی آرد بہ مال و زر فرود — دولت مایس بود آن شوخ سیم اندام ما
دلم با ساغر و مینا تہی کش حسرت — کہ بردہ نرگس مستانۂ ز خود ما را
فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد — نثار درد تو سازم ہزار درمان را
در اقلیم مملکت عشق دیار یست غریب — کہ شہنشاہی محمود غلام است اینجا
ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگارم نیست — جدا ز کوئے تو ذوقے بہ نوبہارم نیست
باد چمن علاج تپ دل نمی کند — عیسی دمے ز گوشۂ دامانم آرزوست
زند بن ہر موے حسرت نالہ سر می زند — نغمہ ہائے دلکشا در بند چوب تارنیست

ز بدخشان لعل و از عمان گہر | جوہر طبعم ز کانے دیگر است
منت رائحہ نافہ و غنچہ نہ کشند | سر خوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند
شاہباز ہمتم ربطے بدست شاہ داشت | خوش نہ کردہ بند دست دیگران پرواز کرد
ز چشم مست تو مستم شراب را چہ کنم | ز تاب حسن تو سوزم کباب را چہ کنم
نکرد جلوہ بت شوخ باختم دل و دین | اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم
در حریم وصل جانانم وطن خواہد شدن | شمع بزم انس آن ماہ ختن خواہد شدن
نگاہ شوخ بچشم سیہ بدان ماند | کہ مست ناز خرامد بتے بہ بت خانہ
اے کہ از غایت لطافت طبع | سحر نو بہار رعنائی
ربودہ ہوش و قرارم غزال رعنائے | نگار مست خرامے بلند بالائے
مداوائے مریض عشق قانون دگر خواہد | طبیب درد دل آن نرگس بیمار بایستے

مجموعی حیثیت سے ایک نظر | خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سیدھے سادے سچے آدمی تھے، ایک پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پُر تھی، اس زمانہ میں ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایاں ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجۂ اتم تھی، گفتگو میں وہ لطف تھا کہ مجلس کے مقررہ وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کاموں کو چھوڑ اس میں شرکت کے لیے مستعد ہو جایا کرتا کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ میں مفقود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت بریں میں بلند درجات پر فائز کرے، ویرحم اللہ عبدا قال آمینا

اب میں اس تحریر کو متمم بن نویرہ کے دو حسب حال بیتوں پر ختم کرتا ہوں،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ | من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا كأني ومالكا لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہاں موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبداللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائیں کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی، لیکن انھوں نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہیں، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتیں مجھے بتلا دیں جنکو میں لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر میں شامل کردوں، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا وہ درج ذیل ہے، لیکن قبل اس کے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم، مفتی صاحب اور میں تینوں ایک ایسے لازوال رشتے میں منسلک ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، اور جس کی طرف میں نے اپنی ایک عربی تحریر میں یا ان الفاظ اشارہ کیا تھا،

ولیعلم أننا أغصان شجر واحد و تلامیذ أستاذ ماجد

سنہ ۱۳۰۸ھ میں مفتی صاحب استاذ العلی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی مرحوم بھی درس میں شریک ہوئے، اور اس طور پر کئی سال تک دونوں صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اسٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات میں شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالبعلمی میں ساتھ رہا، ندوۃ العلماء میں ساتھ رہا، حیدرآباد میں ساتھ رہا، اور آخر میں علی گڑھ میں ساتھ رہا، سفروں میں بھی بار بار رفاقت رہی، غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر میں اوپر گذر چکا ہے، مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اب اکثر یہ شعر انکے ورد زبان رہتا ہے،

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند
در گلستان مشتِ خاکے و اشتم نہ گذاشتند

کہے دوست کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہین کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالبعلمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابین ہاتھ مین لیے ساتھ ہوتا، کیسی ہی لو، دھوپ یا بارش ہوتی، ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت مین پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابین اپنی بغل مین لیتے اور استاد کی خدمت مین ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روز نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے، جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذرا اور بعد فراغت، مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان مین قدم رکھا، استعداد پختہ تھی نتیجہ یہ کہ تحریر مین وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطالب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر مین وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریرون سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور، ایک بار پٹنہ مین ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہوگا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام جسٹس شرف الدین حسن امام وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہو گیا خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھون نے انجام دیا وہ انکا کتبخانہ ہے شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یوپی کے اندر نہین، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھون نے پورے یوپی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمین جمع کیے گئے ہین،

علم کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج میں کجروی بالکل نہ تھی اور غلطیاں ہرگز نہ مانتے تھے، مفتی صاحب سے استاد بھائی ہونے کے علاوہ پیر بھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طرح پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بے چینی میں کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے، صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہوگئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبد الشکور خانصاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہیں لیا، آمدنی میں خدا نے ایسی برکت دی کہ امور خیر بھی جاری رہے اور لاکھوں روپیہ کی جائداد خریدی، برادری میں اس طور پر لوگوں کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہو جاتا وہ اپنی جائداد ان کے ہاتھ میں دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کر کے جائداد واپس کر دیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلوں کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک بار خطاب کی سفارش گورنمنٹ میں گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کر کے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلوں کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتیں ہیں، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات میں بے نظیر تھے۔

آخر میں یہ شعر پڑھا،

اندکے با تو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بکس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیسا کہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھوں نے آج سے ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد میں معارف میں اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہیں آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار میں کام آئے۔ اسیلے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر میں شائع کیا جاتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے میں نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدۂ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امور مذہبی پر کام کر چکنے کے بعد میں اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی عینی شہادت بطور وصیت کے تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں جس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ اعتراف میں نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ درد انگیز خیال تھا کہ قاعدۂ قدرت کے موافق وہ ذاتِ گرامی ایک دن اس دارِ فانی سے اٹھ جائیگی، اور میں بھی نہ رہوں گا، پس اس ذاتِ گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ میں دکھایا نہ جاسکے، میں نے اس اعتراف کی تمہید میں لکھا تھا "میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ میں یہ اعتراف لکھ رہا ہوں نہ اس ذات گرامی سے میرا کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاء اللہ پاک ہے۔"

لیکن ان پچھلے چار سال میں حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہاں کیا ہورہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال میں ایک ہی کوٹھی میں رہ چکا تھا، وجس کا میں سب سے بڑا سر رشتہ دار تھا کسی قسم کی خط وکتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفیٰ کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدر آباد سے تعلق قطع کر لیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جبکہ میں زندہ ہوں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کردوں، میرا مدعاے اصلی اس طرح پورا ہوجائے گا یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی تو معارف ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذات گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کی ہے، جس سے اس اعتراف میں مجھے بحث کرنی ہے، میں اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دوں گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس میں باہمی ربط و قدر دانیوں نے کیا منزلیں طے کیں؛ اسلئے اصل مدعا کی طرف آتا ہوں،

انتیس ۲۹ برس سررشتۂ تعلیمات میں کام کرنے کے بعد میں نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکریٹری ہوا، ڈیلی کالج اندور میں نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے میں پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ میں شروانی صاحب حیدر آباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہوئے، میں باؤنی میں دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدر آباد میں اپنے دفتر منشی کا، سرکار آصفیہ

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۱۰ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب میں اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھوں جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہوں گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو، میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلد دن میں یہ پہلو برابر قلمبند کیے ہوں،

اب میں چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف میں نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہوں کہ میں نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ میں شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ میں نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق میں سب سے زیادہ سخت جج وہی ہوں گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین وہی کریں گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق میں آگے لکھتا ہوں میں ان کو ایسا ہی جانتا ہوں، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع شکل وصورت صحیح مسلمانہ وضع قطعی مشرقی، حسن صورت ہزاروں میں ایک، حیدر آباد کے عظیم الشان جلسوں میں میں نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر ناظرین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی، جمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی کسی سرکاری تقریب میں بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی میں مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشاء شروانی صاحب کی انشا میں ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گراں پایہ شاعر ہیں

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہین کرتے، اس لیے نثر مین شاعرانہ تخئیل داخل ہو کر نثر کا پایہ نہایت بلند کر دیتی ہے، جملے چھوٹے چھوٹے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک، لیکن آمد مضامین کی رَو مین کبھی توالی کا واقعہ ہو جاتا یا کہین پر خفیف عرقِ ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، مین نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہین، ان کی نثر کا اسلوب مین جانتا ہون، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی مین نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا، انھون نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھون نے قبول کر لیا، اگر مین غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہو گئی، ان کے انشا مین بیکار اور زائد باتون کا دخل نہین،

تقریر مین نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدر آباد مین سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلون سے استغاثہ کرنے والا، مذہبی تقریرین رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر مین اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی، اور تقریر کا منتہاے کمال یہی ہے، اعلحضرت سلطانِ دکن مدظلہ العالی کی موجودگی مین بھی مین نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور مین فرق نہین آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات رواجی واہیات اشغال مین اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے مین نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج مین فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیون اور مسافرون کو رقمین دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پر تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزاپوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ مین ضرور ہوتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی حتیٰ کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ مین لے جاتے، حیدر آباد مین بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا لیکن یہان مسافرون اور پردیسیون کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہو جاتی تھی،

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے
ور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہو کر چائے پیتے اور خطوط لکھنے شروع
کر دیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آجاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک
مثل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند
آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی، نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ
چائے پیتے تھے، حیدر آباد مین نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیون سے
ملاقات ہوتی یا موٹر مین سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے، عموماً مین ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی
اپنی بہار پر ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے، لیکن اگر کوئی اور صاحبِ عبا و عمامہ موجود ہوتے
انھین کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز مین اور اُس نماز مین جو وہ سنت یا نفل کی صورت مین
تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قرأت مختصر اور ارکان نہایت معتدل
ہوتے، مقتدیون پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے، صحت ارکان
کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جا نماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، بس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب
کو نماز پڑھتے ہوئے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک
لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت مین بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیون کے بعد مسجد سے باہر آتے،
مغرب کی نماز کے بعد حیدر آباد مین وہ ملاقات کے کمرہ مین بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ
اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہین کہا جا سکتا
کہ کب تک ہوتا رہتا، انھین اوقات مین کمیٹیون کی شرکت، مدارس مین دینیات کے معائنے، تقریبات
دعوتون، تقریرون، وعظون غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ | مین نے حیدر آباد مین اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

کرہے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سر رشتہ تعلیمات سے تعلق تھا، ان میں ایسے بھی تھے کہ ولایت میں انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بےغم مغرب کی جماعت میں شریک ہونے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے شروانی صاحب سے کہا کہ آپ ان مسلمانوں کو ہدایت کیوں نہیں فرماتے کہ نماز کا احترام کریں، اور جماعت میں شریک ہوا کریں"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگوں کو ابھی ٹھوکر نہیں لگی ہے، ایک ٹھوکر میں یہ سیدھے ہو جائیں گے کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں"، اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد میں نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل میں بھی ان کی تسبیح اور جا نماز کا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے۔

کثرت مشاغل | شروانی صاحب کی تحریر دن کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا، ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام اور تجویزیں اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات میں ججوں کے افسر بنائے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کے وہ رکن تھے، کتب خانہ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ، شعبۂ تالیف و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، امکنۂ مذہبی کی جانچ پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسوں میں وعظ، ادھر ہندوستان میں وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے شعبوں کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے اہم امور میں عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت، سلسلۂ تالیف، دیوانوں، تذکروں اور مثنویوں پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے بنا دینا، رسالوں میں مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابوں کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام میں

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لائق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے مین نے بہت دفعہ کتابین لین، کھولین اور بہت سی پڑھی بھی لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس مین پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہون، ان کی معیت مین چھ سات سال کے دوران مین ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر مین ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزانہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانہ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر مین برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی حیدرآباد مین سرکاری کام مستثنیٰ کر کے اپنے خانگی اور نجی کام مین شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر مین کسی اہل معاملہ کو بھی یہ ہمت نہ ہوسکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو در کنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا،

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب مین جہان رقص و سرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہان ایسا احتمال ہوتا وہان دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہین ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امرار کو یہ بات معلوم ہوگئی تو ایسی تقاریب مین جہان یہ خرافات ہونے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنرون، دعوتون اور جلسون سے جہان کوٹ پتلون، لیڈیان، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، مین نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتون سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علما سے ملاقات مین آیا کرتا تھا،

بزرگان دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، گلبرگہ شریف مین حضرت باباگیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور بہار شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلد آباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہوجاتے،

جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نماز جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے، پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھر جانے پر وہ مسجد مین پہنچے تو پھر مصلیون کو چیرا ور پھاند کر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہوجاتے کہ مسافر، نو مسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بناتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو بڑے گفتن پڑانے کہہ پیچھے تقسیم کر دیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالمون کے وہ سب سے بڑے قدر دان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب، پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کہ کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

منتظم صاحب، یہ کتابین میری چالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہین"

تمامی عمر مین شروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہین، خانۂ خدا ہے، حبیب گنج مین جا کر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو، خصوصاً جبکہ بھادون کی بھرن برس رہی ہو، اور کالی گھٹائین چڑھی ہون، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات مین،

رمضان المبارک مین شروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ مین ہمیشہ بہترین حافظون سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظون کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت مین ان سے بائین ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر مین ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز حس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو چھینکین آنے لگتین، یہی حالت افطار کے موقعون پر ہوتی، اور افطار کے جلسہ مین سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ نہ تمباکو کھاتے ہین نہ حقہ پیتے ہین،

ربیع الاول شریف مین مجالس عید میلاد شروع ہوتین، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدر آباد مین جاری رہتا اور جن پیمانون پر یہ مجالس ہوتین حیدر آباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہین ہوئی تھی، شروانی صاحب ان جلسون کے صدر ہوتے، ان جلسون مین انھون نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کیے، اعلیحضرت بھی بعض جلسون مین شرکت فرماتے، شروانی صاحب ان ایام مین حیدر آباد کے مسلمون مین محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین مین راتون کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانون سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا، بعض مجالس کے حالات مین نے منظوم کیے ہین، اور اکثر وعظون کے نوٹ میرے روزنامچون مین محفوظ ہین،

حیدر آباد مین خدمات کا مختصر کارنامہ	جن لوگون نے شروانی صاحب سے پہلے حیدر آباد کے محرم، رمضان، اور

ربیعین وغیرہ دیکھے ہین اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدر آباد کو شروانی صاحب کی صدالصدور

کے زمانہ میں دیکھیں اور دونوں حالتوں کا مقابلہ کریں اگر صدالمہام فینانس جو ایک مسلمان ہے مسٹر گلانسی عیسائی انگریز سابق صدرالمہام فینانس کی طرح مالی معاملات میں صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتا تو میں بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ میں اسی امور مذہبی کے صیغہ کا سب سے بڑا سررشتہ دار تھا، اور ہر بات میرے ہی ہاتھوں سے ہوتی تھی، لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت میں شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانوں کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا، تاڑی سیندھی کے نشہ میں چور، ہجوم و ہنگامہ آرائیاں اور بدمستیاں کرنا، عورتوں کی اس مستی میں بے حرمتی کر ڈالنا وغیرہ ایسی سب باتوں کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتوں کا عود کرنا قطعی ناممکن ہوگیا، تاڑی اور سیندھی پیتے جانا اور اسی حالت میں میلاد خوانی کرنا، کھنی بنوٹی اور دمین نعت خوانی، بانی مجلس کا تاڑی اور سیندھی دیکر ان بدبخت میلاد خوانوں کو رات بھر تنہا الٹے چھوڑ دینا اور خود گھر میں جاکر سو رہنا معدوم کر دیا گیا، یہ اس طرح کیا گیا کہ ان میلاد خوانوں کے طائفے صدارت العالیہ میں طلب کیے گئے، انکی جانچ کی گئی، اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دی گئی، اور نا اہلوں کو تعلیم ممانعت کر دی گئی، سیندھی، تاڑی، شراب وغیرہ کی دکانیں شہر پناہ سے باہر نکالدی گئیں، اور شہر پناہ کے اندر سرکارت کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گیا،

اہالیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندیں دی گئیں، ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں بھیجے اور دارالاقامہ میں رکھے گئے، قاضیوں کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا، مسجدوں میں تنخواہ دار اماموں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا، مؤذن، جاروب کش، جانماز دن، بدنی مکھون پانی کے ملون، حوضوں، طہارت خانوں غسل خانوں، بڑی مسجد میں تنخواہ دار خطیبوں وغیرہ کا اضافہ کیا گیا، عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہاں اب بیس بیس ہزار مصلیوں کا عید کی نماز میں ہجوم ہونے لگا، اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری میں یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلحضرت نظام دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ نے عید کے دوگانے اسی عیدگاہ میں ادا کرنے شروع کیے، اور امراء

دارکین سلطنت عید کی نماز کو یہاں حاضر ہونے لگے، اضلاع میں دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنیں قائم
کی گئیں، انگریزی مدرسوں میں دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے،
جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے
جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، محکمۂ مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ
کے ساتھ لوگوں کو دی گئیں یا نگرانی سرکار میں لی گئیں، متہم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے،
درگاہوں کی آمدنیا خائن متولیوں سے نکالی گئیں، ماہ صیام میں چائے خانے، آبکاری خانے اور ہوٹل دن
میں بند کر دیے گئے، مسلخوں میں ذبیحہ کی نگرانی کی گئی، حاجیوں کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا
اور سہولتیں بہم پہنچائی گئیں، غیر آباد مساجد بند کر کے بے حرمتی سے بچائی گئیں، مختصر یہ کہ شروانی
صاحب کی صدر الصدوری میں مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے
جج اور حکیموں نے ججی کے فیصلوں اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد میں خوب خوب تقریریں کیں،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ میں جیسا کہ تھا، تمام مذاہب
کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ میں لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی
آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت | مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت میں ایک خاص فلسفیت کا
بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہیں، کسی فوری جذبہ سے ان میں تبدیلی
نہیں ہوتی، اکثر باتیں وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ کسی بڑی خوشی کے موقع پر وہ
از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ
مزاج کی پرواز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، یا درچی خانہ،
روزمرہ کا دسترخوان اور تمام حیدرآباد کے خانگی انتظاموں میں چیخ پکار، غصہ، غضب، اعتراض اپنی

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین"۔ لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابلِ التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہوگئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرونِ اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) حمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوانِ مطلق یقین کرتے۔

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا ہو اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑا ہے، ہمارا روے سخن ایسے ملم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زیر و توبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور درازدستی

سے امن مین نہین ہے،

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی | حیدر آباد مین مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ چاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز مین انھون نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججون کے اصرار پر کہ ایک فقرے مین ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "رائے ایک دفعہ دیجاتی ہے، تجویز اعلیٰحضرت معظم کے ملاحظہ مین بھیج دیجائے"، اور اپنی رائے مین جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، ایسا تارحبیب گنج سے حیدر آباد کے ججون کو حسب الحکم مین نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین مین ایک طرف تو اعلیٰحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے، یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق مین اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہین، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے، لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل اعلیٰحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہین، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہین، اور بصیغۂ اشد راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے مین اسے صاف کرتا ہون اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سربمہر لفافہ مین یہ تجویز مع مثل کے اعلیٰحضرت معظم کو بھیجدیتا ہون، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسون فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیون نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے بیوہ کے حق مین ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف مین حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے، آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے، آیندہ اختیار سلطانی"۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

کا کام نہیں، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار عالی مین شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرما دیا لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین کیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لایق عالم تقریظ نگار کو بلا کر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

درت کی صنعت کاری کا اثر | اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حسَن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آئے ہے   اس سے اخلاقِ حسَن کی کیا توقع کیجیے

شعر بھی نیچر کی سحر کاریون مین سے ایک سحر کاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ٹول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھ

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمایشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے، خود داری اس سے معدوم کر دیتی، اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو مین نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے مین جاتے ہین، مین ساتھ ہون، بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ مین تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہین، راہ مین ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہین، آخر مین جب ہم بڑی بلندی پر پہنچے ہین شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف مین پانی بھرا پاتے ہین جس مین نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہین، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی پھر یہان پانی، پانی مین نیلوفر، نیلوفر کی شادابی پر حیرت مین ڈوب جاتے ہین، ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب موثر پیرایہ مین گفتگو کرتے ہین،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن مین وہ ٹہل رہے ہین، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب ایسا کھلا ہوا ہے، کہ چمن مین گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگون اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال مین غرق ہو جاتے ہین، پھر مجھکو ایک ایک باریکی اور مصور قدرت کی قلم کاری سمجھاتے ہین، اور اسی حال مین مین سودا کا یہ شعر پڑھتا ہون ؎

رنگ گل بے طرح دھکے ہے سن لے ابر بہار　　　آشیان میرا چھڑک، لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل مین بس فوراً صانع حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

ہم کو سرسون کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرمارہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے احاطہ مین عزیزی عبدالوحید خان نے چھرے سے ایک دفعہ ایک چڑیا ماردی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندستان مین نہین ہوتی، اس شہید بے گناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا" وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹادے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبدالوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا، لیکن میرا جاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالبًا ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کرون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور تو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کہ غریب بچون کو حبیب گنج کی گڑھی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین، یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق

شروانی صاحب کو رودا بھی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبیدالرحمٰن خان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین مین نے نہ دیکھا، شمس العلماء کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتدا ہی مین نامنظور

کر دی، سرکار آصفیہ کے خطاب "نواب صدر یار جنگ" کی انھون نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہین احسان کر کے نہ احسان جتاتے ہین نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے ہین تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث مین شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھون نے بے کار مطالعہ نہین کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس مین ریا اور نمایش کو دخل نہین اور اس زمانہ مین سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے جو کسی کی جا سکتی ہے، ان کی نیکیون مین ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہین اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر مین یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہین، فرشتہ نہین، دنیا مین جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہین اٹھتی ہین اور اس گروہ مین ایک بھی انسان ایسا ہم کو تاریخ مین نہین ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے، وربے غرض، لوگ اچھا کہین، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک، وحسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے، جس سے نورانی چیزین صاف نظر نہین آتین بلکہ دھندلی اور گرد آلود نظر آتی ہین، پس خطا نورانی چیزون کی نہین ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف مین جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت وراستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر کبیر مسلمانون سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہون شیروانی صاحب کا مقابلہ کرین اور اگر یہ مقابلہ وموازنہ کرنے والے انصاف

فرمائیں گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائیں گے،

آخر میں نازک خیالوں سے میری یہ گذارش ہے کہ میں نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہوں، امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہیں، لیکن میں امراء سے بہت ڈرتا ہوں، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہیں، میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھوں نے خوب دیکھی ہے، صرف ادائے فرض کو میں نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے، لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بہت مہربانیاں فرمائی ہیں، پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے میں نے لکھا ہے کہ کچھ تو ادائے شکرگذاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھیں کہ بڑے فضل و علم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے، امراء کو میں اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہوں جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ میں نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھوں نے حیدر آباد کی ایک عظیم الشان مجلس میں اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا "صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئیں خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

مولانا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ میں

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم و تہذیب کے اُن نمونوں میں تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی اُن میں علم و عمل، دین و تقویٰ، اخلاق و شرافت، وقار و متانت وغیرہ قدیم تعلیم و تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں،

وہ صاحبِ علم، علم دوست، علما نواز، ہر علم و فن کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی و تعلیمی خدمات و مشاغل میں گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانوں کی تمام مفید علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے حامی و مددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی علمی و اخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے اُن کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل نہ ایک مضمون میں سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہی، یہ مرحوم کے ان رفقار اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر لکھ بھی نہیں سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریریں برابر نظر سے گذرتی رہیں جن میں اُن کے بہت سے خیالات و رجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے، اس مضمون میں اسی آئینہ میں اُن کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

مسلمانوں کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی — مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالمِ باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھوں نے علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الٰہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد و ہوا خواہ تھے، مسلمانوں کی قدیم تعلیم اور اُن کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت میں دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کرتے ہیں:

"ہمارے علماء کی یہ شان رہی ہے، کہ انھوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھوں نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دنیویہ جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا، اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرین تاریخ کا کار نامہ ہے، کہ جب بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، اور وہاں علماء کے گران قدر مشاہرے اور طلبہ کے مستقل وظائف اور سامان آسائش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۳)

مسلمان علماء کے حالات میں علمائے سلف اور دنیا علماء دو کتابیں لکھیں، اول الذکر میں علمائے سلف کے دینی، تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہیں، جس کا اندازہ ذیل عنوانوں سے ہوگا:

طلب علم، افلاس و تنگدستی، دشواریاں، سفر کی مشقتیں، کتابوں کی نقل و کتابت، توجہ کامل، ذوق و شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ میں صرفہ، مسلمانان سلف کا علمی ذوق، امراء میں علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید جس میں یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے، اختلاف رائے صحابہ کے زمانہ میں عمل آیا، اہل سنت و جماعت کا برتاؤ مخالف عقیدہ کے علماء کے ساتھ، مختلف مذہب کے علمائے اہل سنت کا آپس میں برتاؤ، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہل سنت

جماعت باہم کس طرح مخالف ہو گئے،

حق پسندی و راست گوئی حق پسندی حکام کے مقابلہ میں معاصرین و ہم چشموں کے مقابلہ میں اپنے نفس کے مقابلہ میں،

حسن معاشرت کسب معاش، تجارت، حرفت، تمول، علما کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ اور ان کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقوں کی محبت علما کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگوں کی محبت علما کے ساتھ علما کی معاشرت کے بعض اور حالات لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب میں قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤں علما کی حیثیت ان کے فرائض، ذمہ داریوں اور ان کے اصلاح طلب امور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

علم جدید میں دینی روح کی ضرورت | مولانا زمانہ کے حالات و ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے اور ابتدا سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون و مددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنوں تک جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے، لیکن ان کا دینی جذبہ جدید تعلیم میں بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سرسید احمد خان کی تعلیمی و اصلاحی کوششوں کے معترف و مداح اور ان کے معاون و مددگار رہے، لیکن ان کے مذہبی خیالات سے ان کو سخت اختلاف تھا اور علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریروں اور تحریروں سے ملتا ہے، حیات جاوید کے ریویو میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس میں انھوں نے سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہیں، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۸۴)

اسی ریویو میں کالج میں مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے، مولانا حالی نے حیات جاوید میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج میں مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا، مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظ

پر تحریر فرماتے ہین،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج مین عہد سرسید مین رہی، مین نہین سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے،...... افسوس ہے کہ سرسید کے عہد ٹرسٹی شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ مین کالج مین جو چیز سب سے زیادہ غیر مہتم بالشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہن نشین ہوتی، اور نہ وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ مین دماغون مین جاگزین ہوتا، ہماری سمجھ مین نہین آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سرسید تحریر و تقریر مین ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے لیکن عالم عمل مین آئے تو معلوم نہین ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے"

(مقالات شروانی صفحہ ۲۶)

نان کواپریشن کے زمانہ مین ٹرسٹیون کے ایک جلسہ مین کالج کے طلبہ کی مذہبی بے پروائی پر ان الفاظ مین تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات مین علی گڈھ اس خوشی کے خیال کو لے کر آیا تھا کہ حالیہ تحریک (نان کواپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ مین مذہب کا جلوہ دیکھون گا، جس کی تمنا برسون سے دل مین تھی، پر باوجود گوناگون کوششون کے اب تک حاصل نہ ہوسکا، لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی،...... رات مین نے عشا کی نماز کالج کی مسجد مین جماعت کے ساتھ پڑھی، میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ مین سرایت کر چکی ہے، (نان کواپریشن کے اثرات مراد ہین) تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گی، اور کم از کم ایک پوری صف مین طلبہ کو دیکھون گا، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے،" (مقالات شروانی ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

مسلم یونیورسٹی میں اسلامی آرٹ کے سلسلہ میں ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہے، سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے جو عالم انسانی میں خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن زیبائی پیدا کی جبیب کبریا روحی فداہ کی حیات حسن و جمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اشرف و اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہیں، پھر اسلامی تاریخ ہے جو دلوں پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالوں سے معمور ہے ... اس کے بعد شاعری ہے پھر عمارت و صنعت ہے پھر خطاطی، سب سے آخر میں مصوری چونکہ تصویر بنانا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کمتر طبیعتیں اس کی جانب مائل ہوئیں، مگر اہل کمال نے حرفوں کے نقوش میں عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنر بین کی نگاہ میں وہی ذوق بخشتا ہے جو ایک کامل مصور کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریروں اور تحریروں میں بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہیں، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے، اس لئے تفصیل میں نہ پڑیں گے،

مسلمانوں کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون سے ذوق و شیفتگی: اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر ان کی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر مشکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہیں:-

"اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری میں ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس میں کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی، تابعین ہی کے طبقہ میں عرب کی جگہ عجمیوں نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث میں ارشاد ہے "الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا اخذ ھا" اس گم شدہ

کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، جہاں سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو ...... جن ممالک میں مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ما وراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ، شرق الہند کے جزائر، ہندوستان، غرض وہ کون ملک تھا جہاں مسلمان گئے، اور وہ دار العلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے در کنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشا پور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنو، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ میں اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہیں، خود علماے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانوں کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے ساتھ اُن کے علم، دولت، اور اعمال واخلاق پر بھی زوال طاری ہو گیا تھا، اور نااہل اخلاف کے ہاتھوں اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزاروں بیش بہا قلمی اور نادر کتابیں کوڑیوں کے مول بک کر یورپ پہنچ گئیں، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سرسید احمد خان نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد میں نادر قلمی کتابوں کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھوں میں آئی، تو انھوں نے دوبارہ اس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۹ء میں قلمی کتابوں کی حفاظت کیلئے علمی خزانوں کی بربادی کے عنوان سے ایک دردانگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں،

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہاں مسلمانوں کی دولت و ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، ان کی جاگیریں، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتیں بھی فنا ہونا شروع ہوئیں، اسی کے ساتھ ساتھ علم وفضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مسندِ علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھوں نے ان انمول موتیوں کی سنگریزوں کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہیں گذری اہلِ بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ میں شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے، جہاں یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمد آباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم وعمل کے ڈسا ور تھے، جس میں متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت وفلسفہ، اور عربی و فارسی ادب کی کتابیں نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخوں مشہور خطاطی کے استادوں کے قطعات اور قلمی مرقعوں کی شکل میں انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریاں اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانوں کا یہ عالم تھا کہ جہاں آج مکانات کی زینت اور آرائش میں یورپ کی نت نئی اشیاء نے جگہ حاصل کی ہے، وہاں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانوں کے دیوان خانوں اور گھروں کے معمولی سے دالانوں کی آرائش میں جو چیزیں دیگر اشیاء نمائش میں نمایاں نظر آتی تھیں، وہ ان خوش نویس صاحبِ کمال خطاطوں کی وصلیاں اور طغرے ہوتے تھے، جن میں نہایت پُر معنی اور پُر کیف بیتیں پُر نصیحت قطعے، پُر اخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیت مبارکہ کے پُر تاثیر جملے اس خوبی اور کمالِ تحریر کے ساتھ چوکھٹوں میں رکھکر آویزاں کئے جاتے تھے، جن کے در و دیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی حکمت پڑھی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے میں مصروف

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانون کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلون تک کی زندگی کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزون کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامنِ امید مین ان موتیون کو بھرنا شروع کیا آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر و نایاب کتابون کا مسلمانون کے علوم و فنون سے دلچسپیون کا بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیون کا میدانِ علم کی تلاش و جستجو مین اُن کے پرمغز کارنامون کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا کہین اور نہین ملے گا، جب قوم مین قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہین رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہون گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا مین اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم مین رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانون کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فنِ خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی انشا کے طور و طریق کے نمونون کو قدیم خزاین کو آیندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہانتک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل مین نہین لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جا رہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر اکٹھا کیا جائے، اور اس کو درست حالت مین رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے" (مقالات ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے

کہ مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا، گو یہ اپیل بھی زیادہ کارگر نہیں ہوئی لیکن انھوں نے خود اپنی محنت تلاش سے بڑی دولت صرف کر کے نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخوں کے اعتبار سے ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت و وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایاں پہلو قدامت و وضعداری ہے، وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریریں اس ذکر جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھیں، اُن کے تاریخی مضامین میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہاں ہندوستان کی قدیم اسلامی سوسائٹی، پرانی وضعداریوں یا کسی پہلو سے پرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہاں اُن کے قلم کی بزم آرائی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریروں میں پُرانی صحبتوں، پُرانے بزرگوں کی وضعداریوں، قدیم تہذیب و آداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہیں، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند میں پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے، ہندو مسلم شیعہ سُنّی، سب کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہیں جمعیت و یک جہتی کا تھا، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی نبض میں جنبش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہیں، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ بے رنگی کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو مثنین یہاں بر سبیل تنزل سبق آموز ہوں گی،

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، ۔۔۔ موسی و فرعون اندر جنگ شد

چونکہ بے رنگی رسی کان داشتی ۔۔۔ موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی، وہ فضا ہی مٹ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین، نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانۂ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین، ...... اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۳۴۱)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال اشکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو علاوہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنون لطیفہ، خوش نویسی تصویر کشی وغیرہ دائرۂ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی، جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنو کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنو کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، میرے یہ لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالائی

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات و سکنات میں عیاں نظر آتا، مراتب پذیرائی کے بعد بیٹھتے باتیں کرتے،
چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بنائے، چائے میں زعفران ضرور پڑتی تھا، تمام
کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف میں وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر
باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا
کہ گویا نہیں ہوا، ہاں دوسروں کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا،
ناممکن ہے کہ ان صحبتوں کا ذکر ہو، اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے
بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسوں گذر جانے کے بعد بھی
آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب بااوقات وعبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور شرب کی وسعت اُن کے
جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیاں ہوتی تھی، مشک آنست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیرچشم
تھے، کسی کا بار احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے، بعض دفعہ دستی
بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک میں بھیجا، باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنار کے نہایت ملنسار
اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب و فرقہ
کی قید سے بالا تر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو، سنی شیعہ سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے، محض ظاہری
اخلاق نہیں، بلکہ وہ اخلاق جس کا دل پر اثر پڑتا، عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا

پس چنان زی کہ بعد مردن تو
همہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات میں لکھتے ہیں،

جب اس خاکدان سفلی میں اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اس کے فیض سے ایشیا اخر تقریبا

اور یورپ تینوں بر اعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالک اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جن سے شہر خصوصاً دارالسلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سرِ نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں،

اُن کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے :-

"نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے لیکن خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے حسب عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اوّل ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو، یہ واقعہ اب کہاں دیکھنا درکنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حافظ سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزت سے پانی ڈلوایا اور اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے سقاہ اللہ تعالیٰ کا سا دیا قا"

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپور ہی فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ

یون کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ مین تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا، اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکر گذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا مین نے کیا کرم کیا، مجھ کو دو پہر کہین بسر کرنی تھی، وہین چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤن دُھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آمدم بر سر مطلب مزاج شگفتہ تھا، با مذاق تھا، تکلف سے بَری تھے، خاص صحبتون مین مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتون مین شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیون جاری رہتا اشعار لطیف پڑھتے، لطفِ خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکسان ذوق تھا،..... گفتگو ہر شخص سے علی قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کرکے محظوظ ہوتا، تعلی یا ادّعا کا شائبہ بھی کلام مین نہ پایا جاتا، تقدس آبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیئے مین فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ مین بھی زبان سے نہ نکلتے (انتہا ذالعلما ص ۱۳ تا ۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور باخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریون سے پاک اور صاف تھے، اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر مین بلندی تھی، مزاج مین استغنا، حوصلے مین عزم تھا، مزاج مین نفاست تھی،.... صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتون سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیان نظر آتین، عقلی برتری مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتین اُن کی زبان سے مین نے کبھی نہین سنین،.....

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا، دوسرے بھائی (مولوی اسحٰق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں میں اور وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں میں ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے، نمک کھانے میں تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کانمذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے، ع

سخن ہائے شیرین بہ از قند است،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی، فرماتے تھے، میں نے یہیں ہتھیار ڈالے ہیں،...... نیز پانی تیز وسرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی وگرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے نہالی خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر وسخن کے یادگار رہیں گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی" (مقالات ص ۱۷۷ و ۱۷۸)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

"میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم وچراغ اور

نامور و مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات میں دونوں کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شائستگی کا لباس تین، کھانے میں، نشست و برخاست میں، معاشرت میں، گفتگو میں پورا جلوہ شائستگی کا نمایاں بلکہ تابان تھا لباس میں وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا جاڑوں میں شال اور جامہ وار کے جلوے اُن پر نظر آتے، گرمیوں میں جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہیں شال جواہرات وعطر وغیرہ کی شناخت اسکے مالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ میں اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خربوزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھروں سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر لے آتا ہے جب ایسا موقع ہوتا، تو میں ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسوں دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور زعفرتک اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد سبھی ہوتے سب کی نشست مدارات یکسان بلا فرق ہوتی، کھانے میں منشی صاحب کی شگفتگی لطف پروری جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات میں منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شایستہ اور پختہ وضع، میں نے باون برس کی مسلسل رفاقت میں کبھی کوئی فرق کسی عادت میں نہیں پایا، بے تکلف اور مخلصانہ صاف گوئی، کلام میں تھی، رائے میں پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع یا خاطر داری سے مرعوب واثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اد ووظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد میں مستحکم پر اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا"

نہایت فیاض تھے، عزیزون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربار و مساکین کی خدمت
مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصّہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ
کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان
دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصّہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی دوستی
اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ
مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسّم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اور
قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق
وضعداری حسن مذاق شائستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۹۹۳ تا ۴۰۲)"

چودھری نور اللہ خان رئیس سہاور کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین،

"چوہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک کارنامہ
زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصّون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے
انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات و حرکات
مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بیحد مستحکم اور منضبط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی اس
پر بیٹھی گدا اور تکیہ لگا رہتا، صبح کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی
تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہل حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو
کیسی ہی سردی و گرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف
لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۱۵۰)"

ذوق ادب وانشاء فطرۃً لطیف الطبع نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون کے شعر وادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحب طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین حسن انشاء کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریریتین اور باوقار ہوتی تھی لیکن اس مین ادب وانشاء کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین:-

"ایام طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول بلاغت مین پڑھا تھا، کمال بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون، اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہذا میدان تنگ ہے، اور افسانہ وخیالی مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ ومضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا، لکھنے کا شوق واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خودستائی معیوب ہے، تاہم بعض نکتہ سنج ارباب ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مین بحمد اللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھایئے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصاً شعر وادب کے مضامین مین جوہر بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون ولیلی کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید وتصحیح کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین، لیکن یہ سب بہت طویل ہین اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدرآباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۳۰ سال

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزاں آچکی تھی، کتابی صورت میں شائع ہوا، اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"جون ۱۹۰۵ء سے ستمبر سنہ مذکور تک مضمون بالا رسالہ حسن میں شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۲۱ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدوں کے پھول سے دل و دماغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دور عزیز کی امانت ہے، اور امانت میں دست اندازی ناروا، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یاد رہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہوں،

"فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس میں بھی تقریباً متحد ہیں لیکن یہاں (اردو غزل) سے وہاں (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے، یعنی خیال، اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلوؤں کی انتہا نہیں، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفت روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یا دوسرے،

عربی فارسی میں جس چیز نے شور محشر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے، فارسی عربی گویوں میں بہت سے با کمال ایسے ہوئے جن کے سینوں میں عشق حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی، یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے" (مقالات ص ۸۶، ۸۷)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

"رباعیون کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہو نادر ہو، توحید، حکمت یا عشق کا نچوڑ اس مین ہو، ان قیود کے ساتھ چارون مصرعے باہم ایسے مربوط ہون کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیان معلوم ہون، قلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی مین کھپانی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ، قصیدے کی متانت، مثنوی کا تسلسل رباعی مین ہو، اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کرکے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے،

مینا پور کے میخانہ قدیم مین ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام مین حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہوکر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادۂ شیراز مین ہے،

از ان افیون کہ ساقی درمے افگند   حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جام اول مین بیخود ہو گیا، افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا، یعنی مینا پوری شراب اردو کے ساغر مین انڈھالی، اس مے دوآتشہ سے نشہ کی رسائی دوبالا ہوگئی، اسی مے دوآتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے، مبادا امن صدارت پر دھبہ لگے، (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اول ایک شعر سنا دیتا ہون :-

نہ من تنہا درین میخانہ مستم   جنید و شبلی و عطار شد مست"

(دیباچہ مے دوآتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید مین ارقام فرماتے ہین :-

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب، ملک عرب کو گئے، اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک مین پھیلا اور سرد دلون کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلانے لگی، (مقالات ص ۳۹۵)

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد، محمد ناصر عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ محمد، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی، خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ میں یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں، :-

"دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا، گلشن نے نامۂ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا، درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است   این خانہ تمام آفتاب است،"

الندوہ کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے :-

"جب اس رسالہ کے اجراء کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری میں میرا نام اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکاچوند کو کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا، (مقالات ص ۲۰)"

علی گڈھ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ سے تعبیر کی ہے،

"یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہیں"

مولانا شبلی کو شیرنی بہت مرغوب تھی، کچھ نہیں تو شکر کے دانوں ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ میں اظہار کیا ہے،

شیرینی محلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے، ع

ع سخنہاے شیرین بہ از قند ہست"

خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور "خاموش تھے، ان مین شیرین بیانی نہین تھی، دیکھئے یہ عیب حُسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے،

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خود ستائی سے کوسون دور اسلئے گفتگو مین خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

ورائے شاعری چیزے دگر بود

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا"،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریرون مین بکثرت ملتے ہین بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہین جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ مزید مثالین اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہین، درحقیقت دوسرے صاحب طرز ادیبون کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انھی پر ختم ہوگیا،

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلین مین تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار تھے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے، چند ہی روز مین دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنو) کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے ـــــ ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی،

الندوہ مین شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو بڑے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسون چھپتا رہا ـــــ کچھ ہم رنگی اس باب مین مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے توکسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہین! مضمون شاید چند سال کی مدتِ ادارت مین ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبرون مین، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن مین خوب جم گیا ـــــ دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ مین جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت مین رہنے لگی، تو معلوم ہوا یہ کہ کم از کم جہانتک معاملات ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے؛

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم! ــــ علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتۂ توافق و اتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری، ہملوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگر کسی موقعہ پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے ــــ اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا۔ تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ــــ یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلائین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فرقیانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغو سی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفۂ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی مین بہ طور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین نہ تلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدالصدور امور مذہبی ہو کر نئے نئے پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بجا طور پر رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پر حیدرآباد

کے مسلم پریس کی زد میں آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہیں اونچے مرتبہ پر، پہلی مرتبہ حاضری کی نوبت اتنے مخالف حالات میں آگیا تو بہت ڈرتے ڈرتے، لیکن پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ ہی نہیں پڑنے دیا کہ میری بد مذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقتوں اور عنایتوں کی راہ میں کچھ بھی حائل ہو رہی ہے۔ — اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور حیدر آباد میں ہوا، شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا،

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی میں سرامین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰ حضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہاں رہیگا، جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام میں مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت (جس میں تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کہ خشکی سے ناآشنا تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی، مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا، اور ایک ایک چیز دل میں اتر گئی،

اعلیٰحضرت کے یہاں باریابی، اور پھر میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلوں میں مرحوم جس شفقت اور [illegible] کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،

اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے، اور ملاقاتیں کبھی لکھنؤ میں ہوتی رہیں، کبھی علی گڈھ میں، اور کبھی حیدر آباد ہی میں، —

مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ میں شریک ہوتے، علی گڈھ سے سفر کر کے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوری مرحوم

کے ہاں ان کی خیابانی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں نہ فرق آنے پایا، اور علی گڈھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں، ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خان کا طوطی بول رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خان ہاتوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "ان" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ — شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسرپیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، اور علی برادران اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ، ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڈھ دونوں زد پر اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڈھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمٰن" سے "حبیب الشیطان" مشہور ہوئے! — یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴ سال قبل جب ابوالکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں مبتدیوں میں تھا،

اور مولانا شروانی کے ہاں ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہین قائم ——— ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہین، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہین، اور شروانی پٹھانون ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھون نے پٹھانون کو حلم و متانت سے یکسر معری قرار دیا ہے، انھون نے کلیہ قائم کرنے مین جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کہو ایک سا خیال
پاتے ہین حلم[۱] بھی کبھی شروانیون مین ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش مین ارادہ عرس اجمیر مین شرکت کا کر لیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا، ان پر با وجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریان ہوئین، شروانی صاحب بھی یہان آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر ہر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی، لیکن یہان اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے بھی، مملکت حیدر آباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھون ہاتھ لیے جا رہے تھے، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع مین دیکھا، عام لوگون کی صف مین مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہین بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جا سکتی تھی، لیکن طبیعت مین یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

---

۱ اصل شعر مین بجائے 'حلم' کے 'عقل' ہے

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہیں! ——— غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدرآباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ میں خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں علی گڈھ میں کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی میں مولانا شیروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا، "انٹرویو" کے وقت جب مختلف علماء آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا، کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسی صدارت چھوڑ اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! میں تو شرمندگی سے گڑا جاتا تھا، لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ——— اور آخر زمانہ میں جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے میں آیا کہ لکھنؤ میں ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہیں!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجئے، اور گھنٹوں اس مجلس سے سیری نہ ہو گی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑوں کے موسم میں شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت میں جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتوں نہ بھولتا ——— تحریر میں ادب سے بڑھ کر انشاء پردازی کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر ادائے مطلب کے لیے ضروری ہوتے، گویا ہوشیار اور فن کار معمار عمارت میں گڑھی ہوئی اینٹیں چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! ——— اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونوں میں، میدان میں خطاب عام ہو تو اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، ۱۹۳۶ء میں جب حج و زیارت سے واپس آئے ہیں تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے،

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، ۱۹۲۳ء یا ۱۳۴۱ھ میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر ابھار رکھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ تو جون تون کرکے ہو گیا، شروع ۱۹۲۳ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ آگئی ــــــ بیچارہ نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا،

ابھی چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۵۲ سال قبل ہمارے حوارین ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین و شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڈھ میگزین وغیرہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے، اور ہم لوگ بھی داد دے دیتے، جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کو اسکی ہمت افزائی کے خیال سے داد دیدی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ ۱۹۲۲ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک ناتمام ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا، اور علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کونسی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے بادب تمام یونیورسٹی کے استادون

کی خدمت مین عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی، ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہان سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۴۳ء مین ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی، جس کے صدر موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوایا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ نومبر ۴۳ء مین اس کے ڈھائی تین کالمون مین درج ہو چکی ہے، یہان اس کے چند اقتباسات کافی ہون گے :-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین مین نہ تھا، اس مین مضامین کی اشاعت کسی بلندیٔ خیال یا پاکیزگیٔ ادب کی ضامن نہین ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد صاحب فلسفہ، اخلاق، مذہب سب ہی سے بیزار ہین، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ مین بزعم خیال خود خاتمہ کر دیا ہے، گویا ان کے یہان کوئی اصول زندگی نہین ہے، اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہان تین محبوب ہین، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک عزق شباب تحیہ جو کسی کمرہ پر داد عیش دے رہی ہو، وفا در پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف مین ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہین، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث ننگ انسانیت ہے،

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، مگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظون کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہان کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کو سراہا ہی، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدایش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ مین انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے "ڈرانا" و "زجر" کا خدا بھی پست و بے قدر و قیمت

ہین، حضرت جبرئیل اور دوسرے مقرب فرشتون کی جس طرح اس ڈراما مین شیطان کے مقابلہ مین تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، روزِ جزا مین جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ مین کم فہمی جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے،........ بہرحال میری رائے مین محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور نہ تخیل اور نصب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس مین رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہین رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدر دانون نے دو تین لفظون مین بیان فرما دیے ہین، "شعلہ مستعجلہ" تململایا اور جگمگایا"۔ بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا یا تململایا، تھوڑی دیر مین شعلۂ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا"۔

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق مین وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریرین ادب دین اور ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھین، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہان نظر آئے گی؟ ـــــ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سیکڑون بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ۱۲/-

"مینجر"

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی
محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی
ہر نوا جنکی تھی پیغام نقیب شبلی
دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی

قدردان ادب و فلسفۂ نعمانی
سرپرست ہنر کہنہ و نو شروانی

آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشین
آج قائم تھا انھین سے شرف دانش و دین
جن سے اس دور مین تازہ تھی سلف کے آئین
شکل دیکھو تو زسر تا بہ قدم نور یقین

ہو گیا ختم وہ دور رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلس دو شین افسوس

کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویز قلم
کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریز قلم
نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیز قلم
گہر افشان، گہر آرا، گہر انگیز قلم

جس کے ہر نقش مین رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف مین صد حسن و دل آرائی تھی

اٹھ گیا بزم سے جو ساقیٔ صہبائے کہن
آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن

ہوگیا نذر خزان حکمت وعرفان کا چمن   وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھئے جن کو شریک غم و ماتم ہین سبھی

مجلسِ علم "بھی" "دانش کدۂ قومی" بھی

آہ تنہا نہین یہ شعر و سخن کا ماتم   آہ تنہا نہین یہ حکمت و فن کا ماتم

ہے حقیقت مین یہ تہذیبِ کہن کا ماتم   سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا

غم ہے سرِ دفتر "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہان اٹھتے ہین اس وضع کے اربابِ کمال   اب کہان دولتِ تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال

قد والا تھا کہ سر تا بقدم سروِ جلال   جس مین تھا صورت و معنی کا دل آویز جمال

مظہرِ علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب

جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات   اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات

کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات   صرف اک ذاتِ گرامی کی نہین ہے یہ وفات

کاروانِ حکمت و دانش کا روان ہوتا ہے

قافلہ فضل کا آنکھون سے نہان ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے   ثانیِ شبلیِ مرحوم کی رخصت یہ ہے

دفن سر تا قدم اسرار کی دولت یہ ہے   علم کے گنجِ گران مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۲؎ غیر مجلد عا؎ پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ۔

آج مسلمانوں کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے ناآشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہو، اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا، یا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لینے اور روزہ و نماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل میں ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء، توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، تقویٰ و پرہیزگاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق و فرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت، اس کی خدمت و نصرت و حمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت و دوزخ، ذکر اللہ، توبہ و استغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان و احسان اور اسلامی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت مؤثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کر دی ہے، اور انکا یہ لکھنا بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات سبق اسباق کی شکل میں جمع کر دی گئی ہیں جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عامی مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے،
بلکہ اس مین اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلمون کے بھی مطالعہ کے لائق ہے
جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہین، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکین

مترجمہ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج،
تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے ۔ پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ
معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ بینس سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان صحیح جمہوریت کے علمبردار،
انسانی برادری مین حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہین، اس مقصد کے حصول کیلیے انھون نے
چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانون مین ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہے، جمہوریت
بلا امتیاز رنگ و نسل تمام انسانون اور قومون مین آزادی و مساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ
و پاسبان سمجھی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظامون مین بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن
یورپ مین جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس مین ایسے بنیادی نقص
ہین کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق و برتری، قومی و جغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم،
معاشی ناہمواری، سیاسی کشمکش اور جنگ و خونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بناپر اس کے متوازی
اشتراکیت، ٹریڈ یونین اور آمریت کی تحریکین پیدا ہوگئین اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ و جدال
کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا، اور
اس کے انسداد کی جتنی تدبیرین اختیار کی گئین وہ سب بنیادی خرابیون کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکین اور آج
پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشان کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب مین انقلاب فرانس سے
لیکر جب سے یورپ مین جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپین

قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیوں، مختلف سیاسی نظریوں اور تحریکوں کی روشنی مین جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیوں کا پورا سیاسی مد و جزر اور اسکے اسباب و نتائج سامنے آجاتے ہین، کتاب کے آخر مین مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ مین جو حقیقی آزادی و مساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا مین امن و امان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاست سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،

قیمت عہ، پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن:

اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اس مین ہر زمانہ کے نامور شعراء و ادیبوں کی کوششین شریک رہی ہین، اس کتاب مین یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی و غواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھتیس شعراء اور ادیبوں کے حالات جنکا اردو کی تعمیر و ترقی مین حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریرون سے لیکر مرتب کیے گئے ہین، لیکن یہ سمجھ مین نہین آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہین، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی قدر و منزلت زبان مسلم ہو یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہون، لیکن ان دونون اصولون کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعراء، ادیبوں اور اردو کے معمارون کے حالات چھوٹ گئے ہین، پرانے اساتذہ مین، مومن، آتش اور دبیر جیسے معماران اردو کے حالات نہین ہین، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہین ہے، حالانکہ ان سب کے حالات ممتاز ادیبون کے قلم سے موجود ہین، یہ صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہین، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعرا خصوصاً نثر نگارون کے حالات نہین لیے گئے ہین، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعرا اور ادیب چھوٹ گئے ہین، تاہم اس کتاب مین ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع مین اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

حج بیت اللہ از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۰ صفحے،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: شوقی برادران، مالیگاؤں ضلع ناسک،

اردو میں حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابیں موجود ہیں، حج بیت اللہ اس موضوع پر نئی جامع کتاب ہے، اس میں عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار و مقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار و حکم کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی و تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے اوقات اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیدیے گئے ہیں،

تلقین حق از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم، اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۰۰ صفحے،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۰ر، پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفوں پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھوں نے بچوں کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس میں دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیوں کے مقابلہ میں اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے سامان، وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفوں کے مقابلہ میں کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین سزا و جزا، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر و نواہی، حلال و حرام، اخلاق حمیدہ و رذیلہ وغیرہ اسلام کے عقائد و اعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق ہے،

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پھر فارسی پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ حیات تعلیم، سیاست، صنف لطیف یعنی عورت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۷۰۰ صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آراستہ کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تولوایا، عالمگیر نے بھی ذوق اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت :- ۵۱۰ صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر